فتاویٰ علماء ہند

جلد-۱

تیار کردہ

منتخب علماء ہند

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مفتی انیس الرحمن قاسمی

زیر نگرانی

حضرت مفتی محمد اسامہ شمیم الندوی

باھتمام

منظمۃ السلام العالمیۃ

ممبائی-الہند

نام کتاب	:	فتاویٰ علماء ہند (جلد-۱)
زیر سرپرستی	:	حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب
زیر نگرانی	:	حضرت مولانا محمد اُسامہ شمیم الندوی صاحب
سن اشاعت	:	جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق مارچ ۲۰۱۴ء
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
کمپوزنگ و ڈیزائننگ	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
ناشر	:	منظمة السلام العالمية، ممبائی، الهند

یہ کتاب "منظمة السلام العالمية" کی
طرف سے ہدیہ ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے
وقف ہے، اس کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

منظمة السلام العالمية

Global Peace Organisation (GPO)

Email: gpo.org@yahoo.com Mob. : +91-7303 7076 05

بسم اللّٰہ الرَّحمن الرَّحیم

قال اللّٰہ جل شانہ

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ".

(سورۃ التوبہ:۱۲۲)

سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تا کہ سمجھ پیدا کریں دین میں۔

قال رسول اللّٰه صلی الله علیه و سلم

”من تفقه فی دین اللّٰه

کفاه اللّٰه همه ورزقه من حیث لایحتسب“.

(مسند ابی حنیفہ حدیث نمبر: ۲۰، کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۸۸۵۵)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین میں سمجھ حاصل کرتا ہے

اللہ تعالیٰ اس کی فکر و تردد سے کفایت کرتا ہے

اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے

جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

فہرست

تصوف کی حقیقت (٧٠-٨٦)

نمبر شمار	عناوین	صفحات

قرآن حکیم (۸۷۔۸۹)

قرآن فہمی کا طریقہ (۹۰۔۹۳)

سنت (۹۴۔۱۰۱)

اجماع (۱۰۲۔۱۲۹)

تدوین فقہ اور امام ابوحنیفہ (۱۶۸۔۱۸۶)

فقہ اسلامی کے ادوار (۱۸۷۔۲۱۰)

افتاء واستفتاء (۲۱۱۔۲۲۵)

افتاء کی اہمیت اور مفتی کی صفات (۲۲۶۔۲۵۱)

نمبر شمار	عناوین	صفحات

نمبر شمار	عناوین	صفحات

نمبر شمار	عناوین	صفحات

فتویٰ کے احکام وآداب (۲۵۲۔۲۶۹)

استفتاء کے آداب واحکام (۲۷۰۔۲۷۳)

نمبر شمار	عناوین	صفحات

ہندو پاک کے علماء کی فقہی خدمات (۲۷۴۔۲۷۹)

دارالافتاء (۲۸۰۔۲۹۰)

کتب فتاویٰ (۲۹۱ـ۳۰۲)

مفتیان کرام (۳۰۴۔۳۸۷)

فرائض وضو (۳۹۱۔۴۳۱)

سنن وضو (۴۳۲۔۴۶۶)

صفحات	عناوین	نمبر شمار

نمبر شمار	عناوین	صفحات

مکروہات وضو (۴۸۹۔۴۹۶)

نواقض وضو (۴۹۷۔۵۶۶)

کلمۃ الشکر

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم!

یہ بندہ نہ عالم ہے، نہ عامل، گمنامی میں پڑا ہوا ایک شخص ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر ومحنت میں لگا رہنا چاہتا ہے۔ بندہ نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دعوت وتبلیغ کی محنت سب سے پہلے بہار میں بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ بنگلہ والی مسجد، بستی حضرت نظام الدین سے لے کر آئے اور فرمایا کہ میں دہلی سے ایک تحفہ لایا ہوں۔ ہمارے شیخ مربی ومرشد داعی الی اللہ حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ العالی کے بزرگوں کا تعلق امارت شرعیہ سے رہا ہے۔ اسی سبب سے بندہ بھی امارت شرعیہ سے دیرینہ تعلق رکھتا ہے۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب ''ناظم امارت شرعیہ'' ہمارے دوستوں میں ہیں اور رشتہ دار بھی، مولانا موصوف چیرمین حج کمیٹی، بہار کی حیثیت سے ممبئی حج ہاؤس تشریف لے آئے۔ غریب خانہ پر تشریف آوری ہوئی، مولانا نے مزاحیہ انداز میں فرمایا کہ جھولی میں لاکھ، ڈیڑھ لاکھ روپئے ڈال دیجئے اور پھر ''فتاویٰ علماء ہند'' کا تعارف کرایا، اس کوشش کی اہمیت کو بندۂ ناچیز نے سنجیدگی سے لیا کہ یہ ذخیرہ ہمارے اکابرین کی کوششوں کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ جس کی حیثیت ایک موسوعہ کی بفضلہ تعالیٰ ہوسکتی ہے۔

مجھے یہ خیال ہوا کہ دعوت وتبلیغ کی نسبت کی برکت سے پوری امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت کا جو عمومی محنت کا میدان قائم ہے اور آزاد ذہنوں کی تعمیر جو دینی بنیادوں پر ہورہی ہے ایسے ماحول میں یہ کتاب امت کی دینی رہبری میں ایک عظیم کردار ادا کرسکتی ہے۔ نیز اسکا ترجمہ عربی، انگریزی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوجاتا ہے تو صدیوں تک امت اس سے استفادہ کرسکتی ہے۔ عربی ترجمہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی کافی مفید معلوم ہوتی ہے کہ عمومی طور پر عربوں کا علمی حلقہ ہمارے اسلاف کے علمی کمالات سے واقف نہیں ہے، جس کی وجہ سے

بہت سارے وہ لوگ جو امت کو مسلکی بنیادوں پر بانٹنا چاہتے ہیں انکو گنجائش مل جاتی ہے۔اگر یہ موسوعہ عرب دنیا کے علمی حلقہ میں پہنچتا ہے تو امت کی اجتماعیت کا ایک بہترین ذریعہ اللہ کے فضل وکرم سے بن سکتا ہے۔

ناظم صاحب کے مطابق اس کا صرفہ کروڑوں روپیوں سے تجاوز کرسکتا ہے۔مگر اس ناچیز نے اپنی کم مائے گی کو سامنے رکھ کر اور اللہ تعالیٰ کے لامحدود خزانے پہ نگاہ رکھ کر اس خدمت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس کی نشر واشاعت وطباعت کے لئے ''منظمۃ السلام العالمیہ'' کا انتخاب کرلیا۔حقیقت یہ ہے کہ کام کوئی کرتا نہیں ہے، مالک حقیقی کام لے لیتا ہے۔شکر ہے اس مالک کا جس نے اپنے لطف کے فیضان سے اس فقیر کو اس خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔اللہ تعالیٰ اس کو میرے لئے آسان کردے اور قبول فرمالے۔(آمین)

مورخہ: ۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
مطابق ۲۰؍جون ۲۰۱۳ء

بندہ شمیم احمد
سرپرست
منظمۃ السلام العالمیۃ، ممبائی، الہند

حرف آغاز

الحمدلله رب العالمين والصلوٰةوالسلام على سيدنامولانامحمدصلى الله عليه وسلم وعلى آله وصحبه ومن تبعهم الى يوم الدين؛امابعد!

عام مسلمانوں کے لیے استفتاء (حکم شرعی معلوم کرنا) اور اہل علم کے لیے کار افتاء ایک دینی فریضہ اور اہم شرعی ذمہ داری ہے، ہر مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گذارے، زندگی کے تمام معاملات میں شریعت کا حکم معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔ اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے پوچھو: "فَسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْن". (سورۃ النحل:۴۳) (یعنی جو تم نہ جانتے ہو، جانکاروں سے دریافت کرلو۔) یعنی اہل علم سے حکم شرع معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "انما شفاء العى السؤال". (یعنی شریعت کے احکام سے ناواقف شخص کا علاج سوال کرنا ہے۔)

فتوے کی ابتدا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوگئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام نے اس حساس اور ناگریز شرعی ذمہ داری کو سنبھالا اور احسن طریقہ سے انجام دیا، صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور فقہ و فتاوی میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، ائمۂ مجتہدین اور بعد کے فقہاء نے ان فتاوی سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، دوسری صدی ہجری فقہ وفتاوی اور اجتہاد و استنباط کے لحاظ سے زریں دور رہا ہے، اس میں ایسے ائمۂ مجتہدین پیدا ہوئے جنھوں نے فقہ وفتاوی کا نہایت ہی نمایاں کام انجام دیا اور امت کے سواد اعظم نے ان کی اتباع و پیروی کی، شریعت اسلامیہ میں فقہ وفتاویٰ کی فضیلت ایک مسلمہ حقیقت ہے، ارشاد ربانی ہے:

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ". (سورۃ التوبہ:۱۲۲۔)

سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں۔

فقہ کے حصول میں مصروف رہنے کی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے رزق کا وعدہ کیا گیا ہے:

"من تفقه فى دين الله كفاه الله همه ورزقه من حيث لايحتسب". (کنز العمال، حدیث نمبر:۲۸۸۵۵)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین میں سمجھ (فقہ) حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی فکر و تردد سے کفایت کرتا ہے اور اس کو ایسی جگہ

سے روزی دیتا جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک ہندوستان اور تقسیم کے بعد پاکستان کے دینی کاموں کی عمومی زبان اردو ہے، علماء ومفتیان کرام نے اسی زبان میں فقہ وفتاویٰ کی اہم ذمہ داری ادا کی ہے۔اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہاں فارسی زبان زیادہ رائج تھی، فقیہ العصر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اسی زبان میں فقہ وفتاویٰ اور تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ان کے بعد فقہ وفتاویٰ کا یہ سلسلہ اردو زبان میں رائج ہوا، جس کا سب سے بڑا ذخیرہ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کی شکل میں ہے اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے بیشتر کتابیں اسی زبان میں ہیں۔اگر اردو زبان میں فتاویٰ کی کتابوں کو اکھٹا کیا جائے تو اس کے لیے ایک لائبریری کی ضرورت پڑے گی۔ ہندوستان و پاکستان کے اکثر علاقوں کے حالات اور مسائل یکساں ہیں، اس لئے فطری طور پر فتاویٰ کے ان مجموعوں میں خاصی تکرار پائی جاتی ہے، اس لئے ایک ایسے مجموعہ کی ضرورت تھی، جس میں مکررات کو حذف کر کے اہم فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہو، تاکہ فقہ وفتاویٰ کا یہ سمندر کوزہ میں آجائے اور اصحابِ نظر کے لئے استفادہ آسان ہوجائے۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کو اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے کہ ان کے قلب میں اس اہم خدمت کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے چالیس سے زائد کتب فتاویٰ سے اس مفید اور رہنما کتاب ''فتاویٰ علماء ہند'' کی ترتیب کام شروع کیا ہے، فتاویٰ کی جمع وترتیب کا کام انتہائی محنت طلب، نازک، دشوار اور مشکل ہے، پھر اس پر قیمتی حواشی کا چڑھانا اس کام کو مشکل ترین کر دیتا ہے، اس کے لیے مرتب کی فقہی صلاحیت کا مضبوط ہونا ضروری ہے، ہمیں خوشی ہے کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو پوری فقہی بصیرت اور خداداد صلاحیتوں کے ساتھ نبھایا ہے۔اللہ تعالیٰ علم میں مزید برکت دے اور اس مجموعہ کو قبول عام عطا کرے اور اس کا پورا پورا نفع امت مسلمہ کو پہونچے۔(آمین)

(مولانا) سید نظام الدین (صاحب)
امیر شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

۱۹ر رمضان ۱۴۳۴ھ
۲۹ر جولائی ۲۰۱۳ء

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلاۃ والسلام علی أشرف المرسلین محمد و علی آلہ و أصحابہ أجمعین؛أما بعد!

برادر مکرم جناب مولانا محمد اسامہ شمیم الندوی (حفظہ اللہ) نے مجھے مطلع فرمایا کہ وہ ''فتاوی علماءِ ہند'' کے نام سے ایک ایسی کتاب کی نگرانی فرمارہے ہیں، جس میں پچھلے دو سو سال کے دوران ہندوستان ، پاکستان کے علماء اور اہل افتاء حضرات کی طرف سے فتاویٰ کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کو یکجا جمع کیا جارہا ہے، چنانچہ پندرہ فتاویٰ کے مجموعے مکمل طور سے اس کتاب میں شامل کئے جارہے ہیں، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان فتاویٰ کی ترتیب، تخریج و تعلیق کا کام مولانا مفتی انیس الرحمٰن قاسمی صاحب مدظلہم (ناظم امارت شرعیہ) کے ذریعے ہورہا ہے۔ اب انہوں نے اس کام کی جلد اول ای میل کے ذریعے مجھے بھیجی ہے۔ اس کتاب سے بتمام وکمال تو فائدہ اٹھانے سے معذور تھا، لیکن جو فتاویٰ جمع کئے گئے ہیں وہ سب ہندوستان کے مستند اور معتمد مفتی حضرات کے فتاوی ہیں۔

امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجموعہ نافع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور علماء اور عام مسلمانوں کو اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔۔۔۔۔۔(آمین)

بندہ محمد تقی عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلىٰ اٰله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين. وبعد!

اسلام پیغام الٰہی ہے، مسلمان اسکو قائم کرنے والی جماعت ہے، جس میں تمام انسانوں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ خالق کائنات نے جس کے لئے اپنا دستور نازل کیا، اسکے مخصوص بندے (انبیاء علیہم السلام) اس پیغام کو نافذ کرنے کے لئے پوری زندگی متفکر اور متحرک رہے اور اپنے اصحاب کو بھی متفکر اور متحرک رکھا، اس لئے کہ حرکت زندگی اور جمود موت ہے، پیغمبرؑ اپنے پیغام میں انسانوں کے دنیا وآخرت کی فلاح و بہبود کی بصیرت رکھتا ہے۔ یہی بصیرت والا یقین ایمان ہے، اسی کا جاننا علم اور برتنا عمل ہے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں امت مسلمہ نے علماء کرام کی قیادت میں اس عظیم پیغام کو مقصد بنا کر جدوجہد کی اور خیر امت ہونے کا ثبوت پیش کیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" ٥ (سورۃ آل عمران: ۱۱۰)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیادت کی تمام تر ذمہ داریاں علماء امت کے ذمہ آئیں، جن میں اہم ترین ذمہ داری شرعی احکام ومسائل کی رہنمائی ہے جسکو علماء فتویٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

فتویٰ قران وسنت کا عصیر ہے، اللہ تعالیٰ نے جن کو تفقہ کی صلاحیت عطاء فرمائی انہوں نے ہر دور میں امت کی رہبری کا کام انجام دیا اور تمام حالات ومشکلات میں انفرادی واجتماعی امور میں واضح اور ٹھوس رہنمائی پیش کی۔

فتویٰ دینا ایک نہایت نازک عمل ہے، جسکے لئے مصادر شرعیہ سے واقفیت، اصول وقواعد سے آگاہی، فقہاء کے اجتہادات کا وسیع مطالعہ، امت وانسانیت کا دردوغم، زمانہ کے حالات سے آگاہی لازمی اور ضروری ہے۔

اب آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کی جانب ذرا غور فرمائیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہجرت سے قبل اپنے ستائے ہوئے ساتھیوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کیلئے نصیحت فرما رہے ہیں کہ وہاں ایک بادشاہ ہے، جسکے یہاں کوئی مظلوم نہیں ہوتا.......... ذرا ہم غور کریں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے کس قدر واقفیت تھی اور کیسی دور اندیشی جس کی بناء پر آپ نے نجاشی کا ملک اختیار کیا اور روم اور فارس کو چھوڑ دیا۔

شرعاً فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے اور یہ ایک ایسا عظیم عمل ہے جس کو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے پہلے مفتی ہیں، پھر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین پھر تمام عہود میں، بلاکسی انقطاع کے یہ کام ہوتا رہا اور انشاء اللہ قیامت تک ہوتا رہے گا۔

فتویٰ اطاعت واتباع میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے کبھی مفتی اور قاضی اور کبھی مشفق ومربی ہیں، اپنی تمام تر بلندیوں سے نیچے آکر لوگوں کی بھلائی کے خواہاں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی مزاج شریعت پر رہے اور اپنی امت کو حدود شریعت کی وسعت دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے اصحاب کو آسانی پیدا کرنے کی تلقین کرتے رہے اور فرمایا:

''یسروا ولاتعسروا''۔ (صحیح البخاری کتاب الأدب، باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ''یسروا ولاتعسروا'')

زیر نظر کتاب ''فتاویٰ علماء ہند'' آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں پچھلے دوسو سال میں دئے گئے علماء ہند وپاک کے فتاوے شامل ہیں، جسے قدیم عربی فقہی کتابوں کی عبارتوں اور قران وسنت کے حوالہ جات سے مزین کیا گیا ہے۔ جو تقریباً ساٹھ جلدوں میں تیس ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا انشاء اللہ اور اس کی تعریب بھی ''الفتاویٰ الہندیۃ المعاصرۃ'' کے نام سے قریب ساٹھ جلدوں میں متوقع ہے۔ جو عنقریب شائع ہوگی۔

یہ ایک ایسا علمی کارنامہ اور وقتی ضرورت ہے جس کا برسوں سے علماء عالم عربی وعالم اسلامی کو انتظار تھا۔

استفادہ عام کے لئے انگریزی ترجمہ کی کوشش جاری ہے۔ چونکہ خود ہندوستان کے اہل قلم ودانش بھی اسکی افادیت کو محسوس کررہے ہیں بلکہ مصر ہیں۔ خاص طور پر قانون داں حضرات نے بھی اس کوشش کی ستائش کی ہے۔ جس کی تعداد بھی قریب اسّی (۸۰) جلدوں تک پہنچ جائے گی۔

اب اصل وترجمہ کے لحاظ سے یہ علمی مجموعہ دوسو جلدوں سے متجاوز ہوسکتا ہے۔

یہ علمی مجموعہ اپنے مضامین میں موسوعہ (انسائکلو پیڈیا) کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے ترتیب وانداز میں ایک انوکھی مثال ہے جو دو دفتیوں کے بیچ علمی سمندر کو کوزہ میں سمیٹے ہوئے ہے۔

درحقیقت یہ علمی کارنامہ ہمارے حضرت مولانا مفتی انیس الرحمٰن صاحب قاسمی مدظلہ العالیٰ ''ناظم امارت شرعیہ، بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ'' کے علمی وتحقیقی کمالات کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل، اوصاف وکمالات، فقاہت وبصیرت، زہد وتقویٰ، عبدیت وتواضع کا جامع بنایا ہے۔ یہ حضرت مولانا محترم کی ذرہ نوازی ہے کہ انہوں نے اس بار امانت کو ادا کرنے کے لئے مجھ ناتواں پر اپنا اعتماد ظاہر کیا اور اعلیٰ تعلیم کی حصول یابی کے بعد مصر سے ہندوستان واپسی پر اپنے گراں قدر مراسلہ کے ذریعے مجھے اس پورے پروجیکٹ کی ذمہ داری دی اور اس کا نگراں مقرر کیا، جس کا متحمل یہ

بندہ ضعیف نہ تھا، مجھے اپنی کم مائے گی کا بخوبی ادراک ہے۔مجھ بے بضاعت کواس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تأمل نہیں کہ دریائے علم کا جوقطرہ اس حقیر کے حصہ میں آیا ہے وہ کسی تشنہ لب کوتو کیا سیراب کرتا خود اپنی تشنگی دور کرنے کے لئے کافی نہیں مگر جس کوارباب فضل مخدوم ومطاع مانتے ہیں اسکے حکم کی سرتابی اور تعمیل ارشاد سے پہلوتہی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔

اب میں اخیر میں اپنے تمام دوستوں اور بزرگوں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے اس مجموعہ کی تیاری میں کسی بھی جہت میں حصہ لیا۔ہم دعاء گوں ہیں کہ اللہ اس مجموعہ سے تمام انسانوں کونفع پہنچائے اوراپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اوراسکو میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔(آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلُ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيُعُ الْعَلِيُمُo

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں انکے دامن کیلئے

۲۲؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
مطابق ۳؍مئی ۲۰۱۳ء

محمد اسامہ شمیم الندوی
رئيس المجلس العالمي للفقه الإسلامي

مقدمہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدالله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيدالمرسلين خاتم النبيين سيدنامحمدوعلى آله وصحبه الغرالميامين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ودعابدعوتهم اجمعين. امابعد!

قرآن وحدیث اسلامی شریعت کی تشکیل کی اصل بنیاد ہیں اوران ہی دونوں سے فقہ وفتاویٰ وابستہ ہیں، یہ تینوں ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ ہیں قرآن مجید آسمانی کتاب ہے، آسمانی احکام اولاً اس کے ذریعہ انسانوں کو عطا کئے گئے اور مزید وحی کے ذریعہ احکام شریعت کی وضاحت اوران پر عمل کرنے کے لیے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایات ملیں، پاکیزہ زندگی گذارنے کے یہ احکام قرآن وحدیث کے خشک اور محض قانونی عبارت میں نہیں عطا کئے گئے، بلکہ ذہن کو مطمئن کرنے والے اسلوب اور دل نشیں زبان میں دئے گئے، ان میں انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیات کا پورالحاظ اورانسانوں کے ساتھ مخاطبت میں ان کی زندگی کے مختلف مواقع اورحالات کے فرق کا بھی لحاظ رکھا گیا، اس کے ذریعہ دیئے ہوئے احکام کوان کو عین مطابق عمل کرانے کے لیے علوم دینیہ کے ماہر ذی علم شخصیتوں نے امت کے عام افراد کے لیے ان احکام کا تشریعی عمل انجام دیا، انہوں نے مسائل کی وضاحت فقہ وتشریح شریعت کے عنوان سے کیا، جو عظیم المرتبت علماء کی کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہی انجام دیا گیا ہے، فقہ کا لفظ کوئی نئی تعبیر یا نئی اصطلاح نہیں ہے، یہ عہد اول سے استعمال میں رہا ہے اور وہ مفہوم ہے بات کو ٹھیک سے سمجھنا، قرآن مجید میں یہ لفظ اسی طرح آیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ".

یعنی ہر جماعت میں سے کچھ لوگ نکلیں جو دین کے سلسلہ کی بات کو سمجھیں، یعنی دین کا علم صحیح طور پر سمجھیں، لہذا فقہ کے عنوان سے دین کے مسائل کو صحیح طور رسمجھنا ہوتا ہے۔

اس عنوان سے علماء سلف اوران کے بعد علماء خلف نے قرآن مجید اورحدیث شریف سے مستنبط مسائل کو سمجھا کر بتانے کا کام خاصے بڑے پیمانے پرانجام دیا اوراس طرح قرآن مجید واحادیث شریفہ سے حاصل کردہ

مسائل کا اچھا سرمایہ طالبان علم کے لیے مہیا کر دیا، پھر حالات کے لحاظ سے زندگی کے جو سماجی و تمدنی نشیب و فراز پیش آتے رہے ہیں ان کے اثر سے نئے سوالات کے سامنے آنے پر ان کی وضاحت اس زمانے کے علماء نے کی، ان کے اس عمل کو فتوے کا نام دیا گیا، جو قرآن و سنت کی روشنی میں علماء نے انجام دیا، جو فتاویٰ کے عنوان سے انجام پایا اور یہ کام دراصل ان حضرات کے لیے کیا گیا جو خود قرآن وسنت سے مسئلہ کو واضح طور پر اخذ نہیں کر سکتے، فتاویٰ کا یہ کام خاص طور پر اس برصغیر میں مدت گذرنے پر ایک معتبر ترین علمی و دینی ذخیرہ کی شکل اختیار کر گیا، جو مختلف مجموعات فتاویٰ میں کتب خانوں کی مختلف جگہوں میں ملتا ہے، ان سب تک پہونچنا ہر طلبگار علم کو آسان نہیں تھا، خوشی کی بات ہے کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ایک فقہی موسوعہ کے طور پر قابل حصول بنا دینے کا کام حضرت مولانا انیس الرحمٰن صاحب قاسمی ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ نے انجام دیا اور اپنے علمی معاونین کے تعاون سے مختلف جلدوں میں مشتمل کتاب تیار کر دی ہے، کہ کوئی بھی اردو داں اپنے کسی مطلوبہ مسئلہ کے سلسلہ میں اس مجموعۂ فتاویٰ میں اپنی ضرورت کی وضاحت حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح صحیح حکم شرعی پر عمل کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نے اس کام میں اپنے جن خورد معاونین سے کام لیا ان میں سرفہرست مولانا امتیاز احمد قاسمی اور مولانا محمد رضاء اللہ قاسمی ہیں اور مولانا محمد اسامہ شمیم ندوی کو عمومی نگرانی کی ذمہ داری دی، جو کہ ایک بڑا ذمہ دارانہ علمی کام ہے، اس طرح یہ ضرورت پڑنے پر مسائل شریعت کو معلوم کرنے کا ایک اچھا ذریعہ بن گیا، اس مجموعہ میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس میں ہندوستان پاکستان کے ممتاز ترین فقہاء کے فتاویٰ کو لیا جائے، ان کے ناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے چالیس معتمد فتاویٰ کے نام لکھے ہیں جو اہم ترین کتب فتاویٰ ہیں اور ان میں پندرہ کتب فتاویٰ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ مکمل طور پر اس میں شامل ہیں اور لکھا ہے کہ دوسوسالہ قدیم و جدید برصغیر کے علماء کے فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب حنفی فقہ کے فتاویٰ کی ایک موسوعہ کتاب بن گئی ہے۔

مجھ سے اس مجموعہ کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی فرمائش کی گئی ہے، اس اہم اور وسیع ترین کام پر قدردانی کا اظہار کرتا ہوں اور مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب ناظم امارت شرعیہ بہار کو اس اہم کام پر مبارکباد دیتا ہوں، اسی طرح ان کے معاونین خصوصی مولانا محمد اسامہ شمیم ندوی کی معاونت خصوصی کو قابل قدردانی سمجھتا ہوں۔ اللہ اس کام کو قبول فرمائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(آمین)

محمد رابع حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم/جولائی ۲۰۱۳ء
۲۰/شعبان ۱۴۳۴ھ

تقدیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یُرِیْدُوْنَ أَنْ یُّطْفِؤُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِأَفْوَاھِھِمْ وَیَأْبَی اللّٰہُ إِلَّا أَن یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ، ھُوَالَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ. (التوبۃ:۳۲-۳۳)

وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منھ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے ہی رہیں گے، اگر چہ کفر کرنے والوں کو ناپسند ہو، وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے، تا کہ اسے تمام مذاہب پر غلبہ عطا فرمائے، اگر چہ شرک کرنے والوں کو یہ پسند نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تین باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ کفر وشرک کی طاقتیں ہمیشہ اسلام کا راستہ روکنے اور حق وہدایت کے چراغ کو بجھانے کی کوشش کریں گی، دوسرے: یہ طاقتیں مادی اعتبار سے کتنی بھی بڑی ہوں، اسلام کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوں گی، حق وہدایت کی روشنی پھیلتی جائے گی اور کفر وشرک کی گھٹائیں چھٹتی جائیں گی، اس لئے مسلمانوں کو ایسے حالات سے مایوس و نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں، تیسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ’’دین‘‘ کو غلبہ عطاء فرمائیں گے؛ اس لئے یہ تو ہوسکتا ہے کہ دین حق کے حاملین مغلوب ہو جائیں؛ لیکن دین کبھی مغلوب نہیں ہوسکتا، اہل دین کے غالب اور مغلوب ہونے کا تعلق فوجی اور عسکری طاقت سے ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک قوم معرکۂ کارزار میں تو مغلوب اور شکست خوردہ ہو، لیکن فکر ونظر کے میدان میں فتح یاب اور غالب ہو، اس کی مثال مختلف افکار و مذاہب کی تاریخ میں ملتی ہے اور اسلام کی تاریخ میں نسبتاً زیادہ ملتی ہے، چنانچہ تاتاریوں کی تاریخ سامنے ہے کہ انھوں نے جنگ کے میدان میں مسلمانوں کو ایسی شکست دی کہ نہ ان سے پہلے ایسی نظیر ملتی ہے اور نہ ان کے بعد، لیکن فکر ونظر کے معرکہ میں خود انھوں نے شکست کھائی اور دل ودماغ کی مملکت کو ہار گئے۔

اسلام کو تمام افکار و مذاہب پر غالب فرمانے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو ہمیشہ فکری اور استدلالی اعتبار سے برتری حاصل رہے گی، چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانونِ فطرت سے ہم آہنگی، عقل ومصلحت کی موافقت، معقولیت اور توازن واعتدال کی وجہ سے ہزار مخالفتوں کے باوجود اسلام کو جو مقبولیت حاصل ہے، جس طرح وہ اپنے ماننے والوں

کے لئے روح کا سکون اور قلب کی تسکین کا سامان ہے، اور جس طرح وہ نہ ماننے والوں کے دل و دماغ کو بھی، تیزی کے ساتھ فتح کر لیتا ہے، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ دنیا میں جتنے مذہبی گروہ ہیں، انھوں نے مذہب سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے، مذہبی صحائف سے ان کا محض رسمی تعلق رہ گیا ہے، انسانی زندگی میں ان صحائف کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، کچھ مذہبی تہوار ہیں، جن کو ڈھیر ساری آمیزشوں اور ملاوٹوں کے ساتھ زیادہ تر موج مستی کے لئے منا لیا جاتا ہے، عام لوگوں کو اس بات کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان تہواروں کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اسی لئے ان کے یہاں حلال وحرام کی حدود باقی نہیں ہیں اور انسان کو اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی حاصل ہے، یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس کے ماننے والوں کو اپنے دین سے عشق ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر مر مٹنے کو تیار رہتے ہیں، اگر شریعت کا کوئی حکم ان سے ٹوٹ جاتا ہے تو ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے، وہ محض خدا کی خوشنودی اور قانون الٰہی کی اتباع کے جذبہ سے بڑے بڑے مادی فائدوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور غیر معمولی نقصانات کو سہہ جاتے ہیں، جو واقعات رات کے اندھیرے اور کمروں کی تنہائیوں میں پیش آتے ہیں اور جن کا ذکر والدین و اولاد اور شوہر و بیوی ایک دوسرے کے سامنے کرنا نہیں چاہتے، ایک عام مسلمان بھی علما اور اصحابِ افتا کے سامنے حاضر ہو کر ان سچائیوں کو اُگلتا ہے، کیوں کہ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے، جو شریعت کے خلاف ہے، حالاں کہ نہ کسی آنکھ نے اس کو دیکھا تھا، نہ کسی کان نے اس کو سنا تھا، نہ کسی انٹلیجنس ایجنسی نے اس کی تفتیش کی تھی اور نہ کسی پولیس یا عدالت میں اس کے خلاف کوئی عرضی دائر کی گئی تھی---اس سے بڑھ کر دین حق کے غلبہ کی مثال اور کیا ہوگی، جس نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا ہو اور قلب و نظر کی مملکت پر اپنی کامیابی کا جھنڈا نصب کر دیا ہو۔

حلال وحرام کے احکام جاننے کے لئے علماء راسخین کا مرجع تو قرآن وحدیث اور کتب فقہ ہیں، لیکن عوام کے لئے وہ علما ہیں جن کی فقہ پر نظر ہو اور جو کارِ افتا انجام دیا کرتے ہوں، یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے مروج رہا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ کو اہل علم نے جمع کیا ہے، امام مالکؒ کی فقہی آراء کا سب سے مستند مجموعہ ''المدونۃ'' ہے، جو سوالات وجوابات کا مجموعہ ہے، بعد کو ''فتاویٰ'' کی اصطلاح دو طرح کے فقہی ذخیرہ کے لئے استعمال ہونے لگی، ایک وہ کتابیں جن میں اصحابِ مذہب کے علاوہ اس مذہب کے مشائخ اور متبعین کے اجتہادات بھی جمع کئے گئے، اکثر فتاویٰ کے نام سے جو قدیم کتابیں ملتی ہیں، جیسے: فتاویٰ ابواللیث سمرقندیؒ (متوفی: ۳۷۳ھ)، فتاویٰ ولوالجیہ (ابوالفتح ظہیر الدین ولوالجیؒ، متوفی: ۵۴۰ھ)، خلاصۃ الفتاویٰ (علامہ طاہر بخاریؒ، متوفی: ۵۴۲ھ)، فتاویٰ سراجیہ (علی بن عثمان بن سراج الدینؒ، متوفی: ۵۶۹ھ)، فتاویٰ قاضی خاں (حسن بن منصور اوزجندیؒ، متوفی: ۵۹۰ھ) وغیرہ، وہ اسی نوعیت کی کتابیں ہیں، لیکن موجودہ دور میں فتاویٰ کی اصطلاح کا غالب استعمال ان فقہی کتابوں کے لئے کیا جاتا ہے، جو عام مسلمانوں کے سوالات اور اہل علم کے جوابات پر مشتمل ہوں،

مسلم ملکوں میں عام طور پر اس کے لئے سرکاری ادارے قائم ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تحریر اور ٹیلی ویژن کے ذریعے انفرادی اور شخصی فتاویٰ بھی جاری کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس انداز کا نظام افتا زیادہ تر مسلم حکومتوں کے خاتمہ کے بعد شروع ہوا، مگر مسلم آبادی کی کثرت اور برصغیر کے مسلمانوں کی مذہب سے گہری وابستگی کی بنا پر بہت تیزی کے ساتھ اس نظام کو ترقی اور وسعت حاصل ہوتی گئی، بہت سے ممتاز اہل علم نے اُمت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے انفرادی طور پر مسلمانوں کی رہنمائی کی، نیز ملک کے بڑے اور ممتاز تعلیمی اداروں نے اسے اپنے کاموں میں شامل کیا اور از راہ احتیاط ایسا نظام قائم کیا کہ ایک شخص فتویٰ لکھے اور ایک یا اس سے زیادہ افراد اس پر نظر ثانی کریں جس کو اصطلاح میں ''تصحیح فتویٰ'' کہا جاتا ہے، مسلم عہدِ حکومت کے بعد غالباً فتاویٰ کا سب سے قدیم مجموعہ خانوادۂ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (متوفی: ۱۷۴۶ء) کا ہے، جو فارسی زبان میں ہے اور اس کے متعدد اُردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں، اس کے بعد ممتاز فقیہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (متوفی: ۱۳۰۴ھ) کے فتاویٰ ہیں، جو ''مجموعۃ الفتاویٰ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ میں عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں فتاویٰ کے جوابات شامل ہیں، مولانا خورشید عالم صاحبؒ (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) نے عام فہم ترجمہ کے ساتھ اسے بہتر طور پر مرتب کر دیا ہے، ''مجموعۂ فتاویٰ'' ہی کے نام سے مولانا فرنگی محلیؒ کے ہم عصر نواب صدیق حسن خاںؒ (متوفی: ۱۳۰۷ھ) کے فتاویٰ کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مسلمانوں کے تین اہم مکاتبِ فکر دیوبندی، بریلوی اور غیر مقلدین کے اہم ترین فکری مقتداؤں کے فتاویٰ منظر عام پر آئے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی: ۱۹۱۳ء) کی فتاویٰ رشیدیہ، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی (متوفی: ۱۹۲۱ء) کی فتاویٰ رضویہ اور مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ (متوفی: ۱۹۰۲ء) کی فتاویٰ نذیریہ، اس کے بعد فتاویٰ کے بہت سے مجموعے مرتب اور شائع ہوئے، جن میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (متوفی: ۱۹۲۸ء) کے فتاویٰ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند''، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی: ۱۹۴۳ء) کی ''امداد الفتاویٰ'' اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (متوفی: ۱۹۵۲ء) کی ''کفایت المفتی'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، ماضی قریب میں شائع ہونے والی فتاویٰ کی کتابوں میں فتاویٰ امارت شرعیہ، فتاویٰ مظاہر علوم (مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، متوفی: ۱۹۴۴ء)، فتاویٰ محمودیہ (مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، متوفی: ۱۹۹۷ء)، نظام الفتاویٰ (مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ، متوفی: ۲۰۰۰ء)، فتاویٰ رحیمیہ (مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ، متوفی: ۲۰۰۱ء)، احسن الفتاویٰ (مفتی رشید احمد صاحبؒ، متوفی: ۲۰۰۲ء) خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، اسی سلسلے کی ایک کتاب مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی: ۲۰۰۳ء) کی تالیف ''آپ کے مسائل اور ان کا حل ہے'' غرض کہ اُردو زبان میں اگر چہ فتاویٰ نویسی کے کام کا باضابطہ سلسلہ سوتا ڈیڑھ سو سال پہلے ہی شروع ہوا، لیکن اس مختصر عرصہ میں اس موضوع سے متعلق

ایک پورا کتب خانہ وجود میں آچکا ہے۔

یہ یقیناً اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے، لیکن چوں کہ ہندوستان کے اکثر علاقوں کے حالات یکساں ہیں اور بہت سے مسائل وہ ہیں جو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے فطری طور پر فتاویٰ کے ان مجموعوں میں خاصی تکرار پائی جاتی ہے، اس لئے ایک ایسے مجموعہ کی ضرورت تھی، جس میں مکررات کو حذف کر کے اہم فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہو، تاکہ فقہ و فتاویٰ کا یہ سمندر کوزہ میں آجائے اور اصحابِ نظر کے لئے استفادہ آسان ہوجائے، میرے علم کے مطابق اس طرح کی کوشش سب سے پہلے مفتی مہربان علی بڑوتویؒ نے ''جامع الفتاویٰ'' کے نام سے شروع کی تھی اور اس میں علماء دیوبند کی سترہ ۱۷ر کتبِ فتاویٰ کو شامل کیا تھا، مگر ابھی اس کی تین ہی جلدیں آپائیں کہ مؤلف عالم بقاء کو رخصت ہوگئے اور یہ قرض اہل علم کے لئے چھوڑ گئے۔

مشہور فاضل، صاحبِ نظر عالم اور مصنف محبّ گرامی حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی کو اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے کہ ان کے قلب میں اس اہم خدمت کا داعیہ پیدا ہوا اور انھوں نے چالیس فتاویٰ کی کتابوں سے اس مفید اور رہنما کتاب کی ترتیب وتبویب اور حذف مکررات کے ساتھ جمع کرنے کا کام شروع کیا ہے، انشاءاللہ جب یہ کام مکمل ہوگا تو یہ اُردو زبان میں فتاویٰ کی انسائیکلو پیڈیا ہوگی اور اہل علم کی آنکھوں کا سرمہ بنے گی، اس کتاب کے ذریعے ہمارے سلف کی زریں خدمات بھی محفوظ ہوجائیں گی اور اُمت کو ایک ایسا گلدستہ ہاتھ آجائے گا جو مختلف رنگ کے پھولوں سے مزین ہوگا؛ لیکن ان کا مشترک مقصد دین کی تعبیر وتشریح اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی ہوگی، میں نے اس کتاب کے مسودہ کے مختلف حصے دیکھے ہیں، جن سے اندازہ ہوا کہ اس مجموعہ میں جہاں اصحابِ فتاویٰ کے علم وتحقیق کی روشنی جلوہ فگن ہے، وہیں مرتب کی دیدہ وری، حسن انتخاب، وسیع النظری اور خوش مذاقی کے نقوش بھی ثبت ہیں۔

مرتب گرامی ایک معتبر عالم دین ہیں، کارقضا کا تجربہ رکھتے ہیں، امارت شرعیہ جیسی اہم تنظیم کے قافلہ سالاروں میں ہیں، ان کے اندر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی بالغ نظری اور امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کی حسن تدبیر دونوں کا عکس جمیل پایا جاتا ہے، حج کمیٹی بہار کے چیرمین ہیں اور بعض عصری تعلیمی اداروں کے بانی ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے معزز ارکان میں ہیں، ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آکر مقبول خاص وعام ہوچکی ہیں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، ان کی اس کاوش کو شوق کے ہاتھوں لیا جائے اور اس کو عند اللہ اور عند الناس قبولیت حاصل ہو، **واللہ ھو المستعان**۔

خالد سیف اللہ رحمانی　　۲۰ر جمادیٰ الثانی ۱۴۳۴ھ

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)　　مطابق ۱ر مئی ۲۰۱۳ء

حرف چند

بسم الله الرحمن الرحیم

اسلامی علوم کی فہرست میں فقہ اسلامی کی بڑی اہمیت ہے، یہ انسانی زندگی سے مربوط ایسا زندہ و متحرک علم ہے جس میں روز پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں مستنبط کیا جاتا ہے اور جو ثوابت و متغیرات کے حدود کی رعایت کرتے ہوئے زمانہ کے دوش بہ دوش قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت سے معمور ہے، یہی وجہ ہے کہ چودہویں صدی گذرنے کے باوجود امت مسلمہ کو اسلامی احکام ومسائل کی تطبیق اوران پرعمل آوری میں کہیں کسی توقف کا سامنا نہیں کرنا پڑا، ہر دور اور ہر زمانہ میں شریعت کے احکام ومقاصد سے واقف ماہرین علماء نے فقہ اسلامی کو اپنا میدان فکر وتحقیق بنایا ہے اور کتاب وسنت کی روشنی میں انسانی زندگی سے مربوط شرعی احکام کی وضاحت فرمائی ہے۔

علماء وفقہاء کی ان کاوشوں کا ذخیرہ آج امت مسلمہ کے لیے خضر طریق کا درجہ رکھتا ہے، ان علمی ذخائر میں ایک قسم ''فتاویٰ'' کی ہے، یہاں فتاویٰ سے مراد ان سوالات کے شرعی جوابات ہیں جو مفتیان کرام سے دریافت کئے جاتے ہیں، ہندوستان میں علماء نے فتویٰ نویسی کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ قدیم زمانہ سے انجام دیا ہے، البتہ بارہویں صدی ہجری میں اس کا باضابطہ آغاز شاید شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (متوفی:۱۱۸۹ھ) کے فتاویٰ عزیزی سے ہوتا ہے، پھر ہر دور میں اس جانب خاص توجہ دی گئی اور امت کو شرعی مسائل سے باخبر کرنے کے لیے یہ سلسلہ پھیلتا گیا، اس لیے آج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں علماء کے فتاویٰ پر مشتمل کتابیں اسلامی لائبریری کا ایک وسیع رکن بن چکی ہیں جن کے بغیر لائبریری کا تصور نامکمل ہے۔

اسلاف کے ان گراں قدر خدمات اوران کی علمی کاوشوں سے علماء وفضلاء مدارس اور ریسرچ اسکالرس کو مستفید کرانے کے لیے بہت شدت سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اسلاف کے فتاویٰ کا ایسا جامع موسوعہ تیار ہوجائے جس میں زیادہ سے زیادہ مسائل کے تحقیقی جوابات بلاتکرار شامل ہوں تاکہ یہ موسوعہ اسلاف کے علوم کا جامع بھی ہو، نیز آسانی سے میسر بھی ہوجائے اوراس سے استفادہ بھی آسان ہو، ظاہر ہے یہ کام بڑا ہی نازک اور محنت طلب ہے کیوں کہ مسائل اور پھر ان مسائل سے متعلق فتاویٰ کی ان کتابوں میں موجود جوابات میں سے کسی

ایک کا انتخاب انتہائی دشوار گذار مرحلہ ہے، جس کے لیے اجتماعی محنت وکاوش ہی ثمر آور ہو سکتی تھی، چنانچہ بڑی خوشی اور شکر کا موقع ہے کہ مولانا مفتی انیس الرحمٰن قاسمی صاحب ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ (جنہیں اللہ تعالیٰ نے گوناگوں خصوصیات وامتیازات سے نوازا ہے اور جو گہرے علم اور فتویٰ نویسی کے میدان کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں) نے اس علمی پروجیکٹ پر کام کرنے کا منصوبہ بنایا، جس میں ہندوپاک کے تمام مستند اہل علم کے مطبوعہ فتاویٰ کو علمی انداز میں ایک جگہ مرتب کر کے شائقین اور علماء کے درمیان پیش کیا جاسکے تاکہ مناسب ترتیب، تکرار کے حذف اور تشفی بخش جواب کے انتخاب کی وجہ سے یہ مجموعہ ہر خاص وعام کے لیے ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھے۔

آج یہ لکھتے ہوئے انتہائی خوشی ہو رہی ہے کہ فقہی انسائیکلوپیڈیا پر مشتمل یہ منصوبہ بڑی تیزی کے ساتھ زیر ترتیب ہے، طہارت سے متعلق مسائل کا انتخاب تین جلدوں میں کیا گیا ہے، باقی جلدوں کی ترتیب کا کام جاری ہے، مسائل کی ترتیب اور جوابات کے انتخابات کے لیے تجربہ کار اور صاحب علم مفتیان کرام کی خدمات حاصل کی گئی ہیں تاکہ ایک ہی سوال کے جواب میں مفتیان کرام کے مختلف جوابات میں سے علم وتحقیق اور مقاصد شریعت سے ہم آہنگ جواب کا انتخاب کیا جاسکے، اس علمی منصوبہ کی تکمیل تقریباً ساٹھ ضخیم جلدوں میں متوقع ہے۔ (ان شاء اللہ) جس کی تکمیل کے بعد فتاویٰ کی دنیا میں یقیناً ایک علمی انفجار نظر آئے گا، جس سے ہر صاحب ذوق متاثر ہو کر رہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علمی منصوبہ کی ترتیب میں اخلاص عطا فرمائے اور اپنے خاص رحم وکرم سے اسے جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہونچائے اور اس علمی منصوبہ کے تمام شرکاء کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے لیے اس مجموعہ کو باقیات صالحات بنائے۔ واللہ ھو الموفق والمعین۔

محمد قاسم غفرلہ

قاضی شریعت دار القضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

ناظم مدرسہ طیبہ منت نگر مادھوپور، مظفرپور، بہار

۲۷؍شعبان ۱۴۳۴ھ

مطابق ۷؍جولائی ۲۰۱۳ء

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین الذی قال فی الکتاب:"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ"،وصلی اللّٰہ علٰی نبیناسیدناومولانامحمدالذی قال:"من یرداللّٰہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین"وعلٰی اٰلہ وصحبہ وعلٰی من تبعھم إلٰی یوم الدین:أمابعد!

اسلام دین فطرت ہے اوراس کے بنیادی حصے ہرزمانے میں یکساں رہے ہیں،ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، حضرت آدم ونوح علیہماالسلام سے لےکرآخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک یہی رہا:

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ".(۱)

راہ ڈال دی تمہارے لیے دین میں،وہی جس کاحکم کیاتھانوح کواورجس کاحکم بھیجاہم نے تیری طرف اورجس کاحکم کیاہم نے ابراہیم کواورموسیٰ کواورعیسیٰ کویہ کہ قائم رکھودین کواوراختلاف نہ ڈالواس میں۔

تمام انبیاءعلیہم السلام کااتفاق ہے کہ ساری امت ایک ہےاوراس کارب بھی ایک ہی ہے:

"اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً، وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ".(۲)

یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پراورمیں ہوں تمہارارب سومیری بندگی کرو۔

جس طرح رب ایک ہے،اسی طرح اس کادین بھی ایک ہےاوروہ ایک دین"دین اسلام"ہی ہے۔ارشادخداوندی ہے:

"اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ".(۳) بیشک دین جوہےاللہ کے ہاں سویہی اسلام ہے۔

حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانی یہ حکم ملا:

"وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ".(۴) اورمجھ کوحکم ہے کہ رہوں فرماں بردار۔

(۱) سورۃ الشوریٰ:۱۳۔

(۲) سورۃ الانبیاء:۹۲۔

(۳) سورۃ آل عمران:۱۹۔

(۴) سورۃ یونس:۷۲۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو امت مسلمہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے رب سبحانہ وتعالیٰ سے یہ دعا کی:

"رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ". (۱)

اے پروردگار ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک جماعت فرمانبردار اپنی۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا تھا:

"نَحْنُ اَنْصَارُاللّٰهِ اٰمَنَّابِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ". (۲)

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم ایمان لائے اللہ پر اور تو گواہ رہ بے شک ہم مسلمان ہیں۔

دین کے بنیادی احکام جیسے توحید، قیامت، جزاوسزا، اخلاص، تقویٰ، عجز وانکساری، شرم وحیا، صدق وامانت، عدل وانصاف، اللہ اور اس کے شعار کی تعظیم، انسانی جان اور عزت وآبرو کے احترام کا حکم ہر دور میں رہا ہے۔ اکثر نبی ایسے رہے جو دوسرے رسولوں کو دی ہوئی شریعت ہی کو نافذ کرنے کے لیے آئے۔ مگر ان انبیاء ورسولوں کی وفات کے بعد ان کی امت نے دین میں تحریف کی اور الگ الگ طریقے پیدا کر لیے اور ہر گروہ یہ سمجھنے لگا کہ دین کا تحریف شدہ ناقص حصہ جو اس کے پاس ہے وہی صحیح ہے۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا، كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ". (۳)

سو ان لوگوں نے اپنے دین میں اپنا طریقہ الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کر لیا، اور ہر گروہ کے پاس جو کچھ دین ہے وہ اسی سے خوش ہے۔

جب دین کی بنیادی چیزیں مٹ گئیں اور یہود و نصاریٰ نے توراۃ وانجیل کو بدل دیا تو اللہ جل شانہ نے اس کو منسوخ کر کے دین اسلام آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا اب یہی دین، حقیقی دین ہے۔ جس میں قیامت تک کے انسانی احوال اور ضرورتوں کی رعایت کرتے ہوئے اللہ نے احکام دیئے ہیں اور اسے انسانی فطرت کے مطابق بنایا ہے:

"اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ، وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ". (۴)

بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے، اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو معلوم ہو چکا آپس کے ضد اور حسد کی وجہ سے، اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا، سو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

(۱) سورۃ البقرہ: ۱۲۸۔ (۲) سورۃ آل عمران: ۵۲۔
(۳) سورۃ المومنون: ۵۳۔
(۴) سورۃ آل عمران: ۱۹۔

اس آخری دین کے بعد اگر کوئی دوسرے مذہب اور دین کو اختیار کرے گا تو وہ اللہ کے نزدیک نافرمان شمار ہوگا اوراس کے اعمال غیر مقبول ہوں گے۔اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ". (۱)

اور جوشخص اسلام کے علاوہ دین اختیار کرے گا وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

نجات صرف دین اسلام کی اتباع میں ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلاَمَ دِيْناً". (۲)

آج میں نے تمہارے لئے دین کومکمل کر دیا ہےاوراپنی نعمت تم پرتمام کردی ہےاورتمہارے لیےاسلام کوتمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔

اس دین کو اللہ نے مکمل کر دیا ہے اوراس میں ایمان وعقائد،ارکان اسلام،معاشرت،اخلاق،معاملات اور سیاسیات وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ فرائض وواجبات،حلال وحرام،مستحب ومباح اور مسنون ومکروہ کے احکام بیان کردیئے ہیں اوراس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ سفر وحضر،صحت وبیماری،عورت ومرد،بچوں اور بوڑھوں کے حالات کے اعتبار سے کون سے احکام ہوں گے اور کیا سہولتیں اللہ نے ان کو دی ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی واضح ہدایتیں بیان فرمادی ہیں اورایسے اصول وضوابط کی نشاندہی کردی ہے جن کی روشنی میں قیامت تک نئے نئے مسائل کا حل ہوتا رہے گا۔اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ آپ کے بعد آنے والوں میں ایسے عادل علما اس علم کو حاصل کریں گے،جواس دین کو پوری طرح بعد والوں کو پہنچائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوں گے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"وإن العلماء ورثة الأنبياء وإن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولادرهما،إنما ورثوا العلم فمن أخذه أخذ بحظ وافر". (۳)

علما،انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اورانبیاء درہم ودینار کے وارث نہیں بناتے ہیں بلکہ وہ علم کے وارث بناتے ہیں جس نے اس کولیا اس نے مکمل طور پر لیا۔

یہی علماء ربانی اب اس دین کی حفاظت اوراس کی اشاعت کا کام انجام دیں گے اورانسانوں کوصحیح راستہ دکھائیں گے۔اصحاب علم کے اس طبقہ میں سرفہرست مفسرین ومحدثین اورفقہاء کرام کی جماعت ہے،جنہوں نے قرآن کریم کو سمجھا،قرآنی آیات سے متعلق احادیث اورآثار صحابہ میں غور وخوض کیا،منصوص وغیر منصوص مسائل کاادراک کیا اور اس کے احکام کوفرض وواجب،سنت ومستحب کی شکل میں پیش کیا،جس کی وجہ سے دین پر چلنا آسان ہوا۔

(۱) سورۃ آل عمران:۸۵۔

(۲) سورۃ المائدہ:۳۔

(۳) سنن الترمذی،باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔

ان فقہاء کرام میں سرتاج المحدثین والفقہاء امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ذات گرامی ہے، جن کے ذریعہ فقہ اسلامی کی تدوین کا عظیم الشان کام انجام پایا، آج اس فقہ پر عمل کرنے والے دنیا کے مختلف حصوں بالخصوص ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افریقی ممالک، چین، قزاکستان، ازبکستان، افغانستان، شام، مصر، ترکی، خلیج، ایران، یورپ و امریکہ میں موجود ہیں۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی آمد ہوئی تو ابتدا میں علم حدیث پر زیادہ توجہ دی گئی، خاص طور پر سندھ اور گجرات کے ساحلی شہروں میں۔ اس کے بعد اہل علم کی فکر و توجہ کا مرکز علم فقہ بن گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں یہاں کے علما و مفتیان نے فقہ و فتاویٰ کی جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا سلسلہ تاریخی طور پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ بلکہ یہاں کے علما نے گذشتہ دو صدیوں میں عالم اسلام کی فقہی اعتبار سے رہنمائی کی ہے اور اپنے فتاویٰ کے ذریعہ پیدا ہونے والے مسائل کا حل پیش کیا ہے، اس لیے ان کی اہمیت پورے عالم اسلام کے موجودہ عہد کے فقہ و فتاویٰ کے باب میں غیر معمولی ہے، یہ فتاوی ہند و پاک کے مدارس اور دینی و ملی اداروں کے دارالافتاء میں محفوظ ہیں، جن کے منتخبات مختلف عہد میں اردو اور فارسی زبانوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ فتاویٰ کی بعض کتابیں ایسی ہیں جو ایک دفعہ کی اشاعت کے بعد دوبارہ نہیں چھپی ہیں، نیز فتاویٰ کی تمام کتابیں ہر شخص کے پاس موجود بھی نہیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے استفادہ میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان تمام فتاویٰ کو جدید ترتیب کے ساتھ یکجا کر کے قرآن وسنت کی دلیلوں و فقہی کتابوں کے حوالہ سے مزین کر کے محفوظ کر دیا جائے اور ترتیب کو سہل و آسان رکھا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس مجموعہ سے ان غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوگا جو بعض طبقے کی طرف سے ناواقفیت کی بنیاد پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں قدیم ہندوستان اور جدید برصغیر ہند و پاک کے علما کے فتاوی شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں دو سو سالہ عہد کے قدیم ہندوستان اور موجودہ دور کے حنفی مسلک پر عمل پیرا جن اہم مفتیان کرام نے فتاویٰ دیئے ہیں اور انہیں یکجا کر کے شامل کیا گیا ہے۔ ان کتب فتاویٰ اور مفتیان کے نام حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	کتب فتاویٰ	مفتیان کرام	مطبع
(۱)	فتاویٰ عزیزی	حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	ایم ایچ سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی
(۲)	فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	محمد اسحاق صدیقی اینڈ سنز، تاجران کتب، و مالکان کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند، سہارنپور، انڈیا
(۳)	تالیفات رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	مکتبۃ الحق ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی ۱۰۲
(۴)	باقیات فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی، انڈیا
(۵)	عزیز الفتاویٰ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۶)	فتاویٰ دارالعلوم دیوبند	مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا

(۷) امداد الفتاویٰ	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۸) الحیلۃ الناجزۃ	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	مکتبہ رضی دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۹) امداد الاحکام	مولانا ظفر احمد عثمانیؒ مولانا عبد الکریم گمتھلویؒ	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۱۰) آلات جدیدہ کے شرعی احکام	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ	مکتبہ تفسیر القرآن، نزد چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی
(۱۱) جواہر الفقہ	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ	مکتبہ تفسیر القرآن، نزد چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی
(۱۲) امداد المفتیین	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۱۳) مجموعۂ فتاویٰ عبد الحئ	مولانا ابو الحسنات عبد الحئ لکھنویؒ	مکتبہ تھانوی، دیوبند، یوپی، انڈیا
(۱۴) فتاویٰ مظاہر علوم	مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ	شعبۂ نشر واشاعت مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۱۵) فتاویٰ محمودیہ	مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	مکتبہ شیخ الاسلام دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۱۶) فتاویٰ امارت شرعیہ	مولانا ابو المحاسن محمد سجاد وغیرہ رحمہم اللہ	شعبۂ نشر واشاعت امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
(۱۷) کفایت المفتی	مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ	حفیظ الرحمٰن واصف، کوہ نور پریس، دہلی، انڈیا
(۱۸) فتاویٰ باقیات صالحات	مولانا شاہ عبد الوہاب قادری ویلوریؒ	جامعہ باقیات صالحات، ویلور، بنگلور، انڈیا
(۱۹) فتاویٰ احیاء العلوم	مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوریؒ	جامعہ احیاء العلوم، مبارکپور، یوپی، انڈیا
(۲۰) منتخبات نظام الفتاویٰ	مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ	ایفا پبلیکیشن، جوگا بائی، نئی دہلی، انڈیا
(۲۱) نظام الفتاویٰ	مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ	ایفا پبلیکیشن، جوگا بائی، نئی دہلی، انڈیا
(۲۲) خیر الفتاویٰ	مولانا خیر محمد جالندھریؒ	مکتبہ الحق ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی ۱۰۲
(۲۳) فتاویٰ شیخ الاسلام	حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ	مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، یوپی، انڈیا
(۲۴) فتاویٰ حقانیہ	مولانا عبد الحق صاحبؒ پاکستانی	دکن ٹریڈرس بک سیلر اینڈ پبلیشرز، نزد واٹر ٹینک مغل پورہ، حیدرآباد
(۲۵) احسن الفتاویٰ	مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ پاکستانی	زکریا بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، یوپی، انڈیا
(۲۶) فتاویٰ عثمانی	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب پاکستانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی، اندیا
(۲۷) فتاویٰ قاضی	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	ایفا پبلیکیشن، جوگا بائی، نئی دہلی، انڈیا
(۲۸) فتاویٰ رحیمیہ	مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ	مکتبہ رحیمیہ منشی اسٹریٹ، راندیر، سورت، گجرات
(۲۹) کتاب الفتاویٰ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی، اندیا
(۳۰) محمود الفتاویٰ	مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب	مکتبہ نور، محمود نگر، متصل جامعہ، ڈابھیل
(۳۱) حبیب الفتاویٰ	مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب	سمیع پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، دریا گنج، نئی دہلی

(۳۲) فتاویٰ فرنگی محل	مولانا محمد عبدالقادر صاحب فرنگی محلیؒ	مطبع نامی نخاس لکھنؤ، یوپی، انڈیا
(۳۳) فتاویٰ ندوۃ العلماء	مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب	مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء مارگ، پوسٹ باکس نمبر ۹۳ لکھنؤ، انڈیا
(۳۴) فتاویٰ بینات	مفتیان جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، پاکستان	مکتبہ بینات، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی، پاکستان
(۳۵) فتاویٰ دارالافتاءوالقضاء	مفتیان جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، پاکستان	دارالافتاء والقضاء، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی، پاکستان
(۳۶) فتاویٰ فریدیہ	مولانا مفتی محمد فرید صاحب پاکستانیؒ	مولانا حافظ حسین احمد صدیقی نقشبندی مہتمم دارالعلوم صدیقیہ زروبی ضلع صوابی، پاکستان
(۳۷) فتاویٰ مفتی محمود	مولانا مفتی محمود صاحب پاکستانیؒ	جمعیت پبلیکیشنز وحدت روڈ، لاہور، پاکستان
(۳۸) آپ کے مسائل اوران کاحل	مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ	مکتبہ لدھیانوی ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان
(۳۹) مرغوب الفتاویٰ	مولانا مفتی مرغوب الرحمٰن صاحب لاجپوریؒ	جامعۃ القرأت کفلیتہ، مولانا عبدالحئی نگر، سورت، گجرات
(۴۰) فتاویٰ دارالعلوم زکریا	مولانا مفتی رضاء الحق صاحب، افریقہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔۶، انڈیا
(۴۱) فتاویٰ شاکرخان	مولانا مفتی شاکرخان صاحب پونہ، انڈیا	مدرسہ بیت العلوم کونڈوا، خردسروے نمبر ۱۴۲، شوکا میوز کے پیچھے، پونہ ۴۸، انڈیا

مکمل طور پر شامل کتب فتاویٰ:

مذکورہ بالا فتاویٰ کی کتابوں میں سے مندرجہ ذیل سولہ ایسی کتابیں ہیں جنہیں مکمل طور پر اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ البتہ اگر ان میں کوئی مسئلہ مکرر ہے تو ایک مسئلہ کو متن میں اور دوسرے کو حاشیہ میں دے دیا گیا ہے، دیگر فتاویٰ کی کتابوں سے ایسے مسائل لیے گیے ہیں جو ان کتابوں میں نہیں ہیں اور اگر وہ مسائل دونوں طرح کی کتابوں میں ہیں تو ایک کتاب سے لیا گیا ہے اور باقی کتابوں کے حوالے دے دیئے گئے ہیں:

(۱) فتاویٰ عزیزی	حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	(م ۱۲۳۹ھ)
(۲) فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	(م ۱۳۲۳ھ)
(۳) تالیفات رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	//
(۴) باقیات فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	//
(۵) فتاویٰ مظاہر علوم	مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوریؒ	(م ۱۳۴۶ھ)
(۶) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ	(م ۱۳۴۷ھ)

(۷)	مجموعۂ فتاویٰ عبدالحیٔ	مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ لکھنویؒ	(م۱۳۰۴ھ)
(۸)	فتاویٰ امارت شرعیہ	مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد وغیرہ رحمہم اللہ	(م۱۳۵۹ھ)
(۹)	امدادالفتاویٰ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	(م۱۳۶۲ھ)
(۱۰)	کفایت المفتی	مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ	(م۱۳۷۲ھ)
(۱۱)	فتاویٰ شیخ الاسلام	شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ	(م۱۳۷۷ھ)
(۱۲)	امدادالاحکام	مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (م۱۳۹۴ھ) / مولانا عبدالکریم گمتھلوی	(م۱۳۶۸ھ)
(۱۳)	امدادالمفتیین	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ	(م۱۳۹۶ھ)
(۱۴)	فتاویٰ محمودیہ	مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	(م۱۴۱۷ھ)
(۱۵)	منتخبات نظام الفتاویٰ / نظام الفتاویٰ	مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ	(م۱۴۱۸ھ)
(۱۶)	فتاویٰ قاضی	مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ	(م۱۴۲۲ھ)

طریقۂ ترتیب

(۱)　علما ومفتیانِ ہند کے مراکز ودارالافتاء میں جو فتاویٰ موجود ہیں اکثر قدیم دارالافتاء ومفتیانِ ہند کے انتخاب کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے مگر یہ متفرق طور پر اور مختلف ابواب میں بکھرے ہوئے ہیں بلکہ فتاویٰ کے چند مجموعوں میں ایسا بھی ہے کہ ہر جلد میں تمام ابواب کے مسائل درج ہیں جس کی وجہ سے استفادہ مشکل ہو گیا ہے اس لیے اس مجموعے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر باب اور فصل کے مسائل آسان اور سہل عناوین کے تحت جمع کر دیئے جائیں تا کہ کسی شخص کو مسائل کی تلاش میں دشواری نہ ہو۔

(۲)　اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مسائل کے اندراج میں تکرار نہ ہو۔

(۳)　چالیس سے زائد فتاویٰ کے مجموعوں میں سے سولہ فتاویٰ کی کتابیں ایسی ہیں جن کے تمام ہی مسائل کو اس مجموعے میں لے لیا گیا ہے اگر ان مسائل میں آپس میں کہیں کوئی تکرار ہے اور ایسا بہت کم ہے تو ایک مسئلہ کو اصل کتاب کے متن میں رکھا گیا ہے اور اگر وہی مسئلہ کسی دوسرے فتوے کی کتاب میں بھی ہے تو اسے حاشیہ میں دے دیا گیا ہے۔

(۴)　مذکورہ بالا سولہ کتابوں کے علاوہ دیگر فتاویٰ کے مسائل کو بھی اس طرح لیا گیا ہے کہ ان میں آپس میں تکرار نہ ہو اگر ایک مسئلہ ایک سے زائد کتابوں میں ہے اور سوال وجواب کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے تو ایک فتوے کی کتاب سے اس مسئلے کو درج کر دیا گیا ہے اور باقی کتب فتاویٰ کے حوالے لفظ کذا کے ساتھ دے دیئے گئے ہیں۔

(۵)　ہر فتوے کے سوال وجواب کو مکمل طور پر بعینہٖ لیا گیا ہے اس کا اختصار نہیں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی حسب ضرورت ہر باب کے دیگر اہم مفتیٰ بہ مسائل کا بھی اضافہ حاشیہ میں کیا گیا ہے تا کہ ہر باب مسائل کے اعتبار سے بھی جامع ہو اور ایک ہی جگہ تمام مسائل مل جائیں۔

(۶)　ہر فتوے کے حوالے حاشیہ میں کتب فقہیہ سے درج کئے گئے ہیں، ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جو مسائل منصوص ہیں ان کے حوالوں کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے براہ راست درج کر دیئے جائیں اور جو مسائل مجتہد فیہ ہیں ان کے حوالے میں صرف معتبر فقہی کتابوں کی عبارتیں درج کی گئی ہیں۔ بعض فتاویٰ کی کتابوں کے حواشی محققین علما نے لکھے تھے، اس کتاب میں ان حواشی کو باقی رکھا گیا ہے، جیسے فتاویٰ امارت شرعیہ، فتاویٰ دارالعلوم، فتاویٰ محمودیہ وغیرہ کے حواشی۔

(۷)　موجودہ دور میں نئے مسائل کی رفتار تیز ہوگئی ہے، جدید مسائل کے حل کی کوشش میں سب سے زیادہ توجہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی رہی، اس کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا، حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ کے یہاں بھی جدید مسائل پر بھرپور توجہ دی گئی، مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ اور حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلامؒ کے یہاں جدید مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں نئے مسائل کو خصوصیت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

(۸)　ان فتاویٰ کی خصوصیتوں میں یہ بھی ہے کہ مفتیان کرام کے جواب ٹھوس و مکمل اور ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر سوال حذف کر دیا جائے تو بھی جواب سے مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے، انداز تحریر صاف اور سلیس ہوتا ہے مسائل کے جواب میں عرف زمانہ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ استفتا کے جواب میں ہمیشہ مفتیٰ بہ قول کو اختیار کرتے ہیں الّا یہ کہ انسانی ضرورت عدول کا تقاضا کرتی ہو تو ایسی صورت میں ضرورتاً غیر مفتیٰ بہ قول کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں دو مختلف مُفتیٰ بہ قول ہیں تو ایسے موقع پر سہل و آسان قول کو اختیار کرتے اور اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو۔

(۹)　فتاویٰ کی ترتیب کے وقت اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ فقہ کی تعریف، اس کے مشمولات اور دلائل اربعہ (کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع و قیاس) امام ابوحنیفہؒ ودیگر فقہا کی خدمات، فقہاء ہندوپاک اور فتوے کی اہمیت، دارالافتاء اور مفتیانِ ہند کی شخصیت جیسے موضوعات پر بھی تحریر کیا جائے چنانچہ ایک مبسوط مقدمہ مذکورہ عناوین پر تحریر کیا گیا ہے جس میں فتاویٰ دارالعلوم، امدادالاحکام، کتاب الفتاویٰ وغیرہ کے مقدمات کے اہم مباحث کو بھی شامل کیا گیا ہے جنہیں آئندہ صفحات میں آپ پڑھیں گے۔

(۱۰)　اس مجموعہ کی ترتیب میں دیگر جن علما نے خدمت انجام دی ہے ان میں مولانا مفتی امتیاز احمد قاسمی اور مولانا مفتی محمد رضاء اللہ قاسمی نے خصوصی طور پر حصہ لیا ہے اور اس پر نظر ثانی مولانا مفتی سعیدالرحمٰن قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا مفتی وصی احمد قاسمی نائب قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا محمد مفتی انظار عالم قاسمی نائب قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مفتی سہیل احمد

قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، نے کی اور نظر نہائی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری قاضی شریعت امارت شرعیہ اور مولانا قاضی عبدالجلیل صاحب قاسمی قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے کی ہے اور اس کی تصحیح وغیرہ میں جن علما نے حصہ لیا ہے ان میں مولانا مفتی راشد العزیزی ندوی، مولانا مفتی مجیب الرحمٰن قاسمی بھاگلپوری، مولانا مفتی عبداللہ محی الدین قاسمی، مولانا مفتی عتیق اللہ قاسمی، مولانا بدر انیس قاسمی، مولانا فیاض احمد قاسمی اور مولانا عادل فریدی قاسمی وغیرہ ہیں۔

(۱۱) میرے علم کے مطابق اس طرح کا مجموعہ اردو یا عربی میں اب تک کوئی دوسرا مرتب ہو کر سامنے نہیں آیا ہے۔ بعض علما نے اختصار کے ساتھ ایک مجموعہ کچھ کتابوں کا تیار کیا تھا جس میں سوال و جواب مکمل نقل کرنے کے بجائے اس کا خلاصہ دیا گیا اور حوالہ جات فقہیہ اور نصوص کے حوالوں کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ اس مجموعہ میں اختصار کے بجائے سوال و جواب کو مکمل دیا گیا ہے اور ہر فتویٰ کے حوالہ میں قرآن وسنت اور فقہی عبارتوں کو دیا گیا ہے۔

(۱۲) تحقیق وترتیب کا یہ کام گذشتہ چند سالوں سے ''ابوالکلام ریسرچ فاؤنڈیشن'' کے تحت کیا جارہا ہے، اندازہ ہے کہ یہ فقہی ذخیرہ ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوگا، اردو کے ساتھ عربی زبان میں بھی اس کی تعریب ہوگی اور اس کے مسائل کو اختصار کے ساتھ www.islamicshariah.in پر اردو، انگریزی اور ہندی زبان میں لانے کا کام جاری ہے۔

(۱۳) فتاویٰ کے اس مجموعے کی ترتیب میں جب کتاب الطہارت کا کام مکمل ہوگیا تو اس کی طباعت سے پہلے اپنے بزرگوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے میری گذارش پر اپنے مفید کلمات وتأثرات تحریر فرمائے اور مفید مشورے دیئے، میں اپنے ان تمام اکابر اور بزرگوں کا شکر گذار ہوں۔

میں شکر گذار ہوں اپنے ان احباب اور مفتیانِ کرام کا جنہوں نے اس کی نظر ثانی میں دلچسپی لی اور وقت دیا۔ اسی طرح میں شکر گذار ہوں **''مولانا محمد اسامہ شمیم ندوی''** رئیس المجلس العالمی للفقه الإسلامی کا جنہوں نے اس پروجیکٹ کی تکمیل ونگرانی کی ذمہ داری قبول کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر رسا، قلب سلیم اور دردمند دل عطا کیا ہے، اپنے علم کے ساتھ عمل کے جوہر سے بھی آراستہ ہیں، اللہ انہیں اس دنیا وآخرت میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

اسی کے ساتھ میں خاص طور پر شکر گذار ہوں محبّ محترم داعی الی اللہ جناب انجینیر شمیم احمد صاحب کا جنہوں نے اس عظیم علمی سرمایہ کو منصۂ شہود پر لانے کا عزم کیا، ان کے مشوروں سے بڑا فائدہ پہنچا اور ان کی توجہ سے یہ فقہی ذخیرہ لوگوں تک پہنچ پارہا ہے۔

اخیر میں دعا گو ہوں کہ اللہ جل شانہ اپنے خصوصی فضل سے اسے قبول فرمائے اور ہماری لغزشوں کو معاف کرے اور امت کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (آمین یارب العالمین)

۲؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ انیس الرحمٰن قاسمی

مطابق ۱۴؍مئی ۲۰۱۳ء ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

فقہ اسلامی

فقہ:

(۱)فقہ کے لغوی معنی: لغت میں فقہ ''فہم، سمجھداری اور ذہانت'' کو کہتے ہیں اور فقیہ، ذہین اور سمجھدار شخص کو کہا جاتا ہے۔(۲)اور تفقہ، فقیہ ہونے (۳)، فقہ حاصل کرنے اور اس میں غور خوض کرنے کا نام ہے۔

فقہ کے قدیم اصطلاحی معنی:

اسلام کے قرون اولیٰ (قرون اولیٰ سے مراد عہد رسالت اور اس کے بعد تابعین تک کا زمانہ ہے) کی اصطلاح میں فقہ سے مراد ''پورے دین کی گہری سمجھ'' ہے، یعنی دین کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبۂ زندگی سے ہو ان کی گہری بصیرت ومہارت کو ''فقہ'' کہا جاتا تھا اور فقیہ اس شخص کو کہتے ہیں جو پورے دین کی گہری بصیرت ومہارت رکھتا ہو اور اپنی پوری زندگی کو دین کے سانچہ میں ڈھال چکا ہو۔

دینی احکام کی قسمیں:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ امت کو قرآن وسنت میں جو احکام دیئے گئے ان کی تین قسمیں ہیں۔

اول:

وہ احکام جن کا تعلق عقائد سے ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور توحید پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان، یوم آخرت اور اچھی بری تقدیر پر ایمان اور ہر قسم کے کفر وشرک سے اجتناب وغیرہ۔

دوم:

وہ احکام جن کا تعلق بندے کے ان افعال سے ہے جو جسم کے ظاہری اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، حلق،

(۱) مقدمہ امداد الاحکام جلد اول از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب پاکستان۔

(۲) الصحاح للجوہری: ج ۶ ص ۲۲۴۳۔

(۳) ردالمحتار: ج ۱ ص ۳۸۔

زبان وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد اور نکاح وطلاق، قسم وکفارہ اور جیسے معیشت وتجارت، سیاست وحکومت، میراث ووصیت، دعویٰ اور قضا وشہادت وجرائم اور ان کی سزائیں اور جیسے سلام وکلام، کھانا پینا، سونا، اٹھنا، نشست وبرخاست، مہمانی ومیزبانی وغیرہ۔

سوم:

وہ احکام جن کا تعلق باطنی اخلاق وعادات سے یعنی بندے کے ان اعمال سے ہے جو وہ اپنے باطن اور قلب سے انجام دیتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اسے یاد رکھنا، دنیا سے محبت کم کرنا، اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنا ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے لئے نیت کو خالص رکھنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی سے پرہیز کرنا، صبر کرنا اور غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ۔(۱)

قرآن وسنت میں ان سب قسموں کا بیان:

چونکہ یہ تینوں قسم کے احکام دین کے لازمی اجزاء باہم مربوط اور ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، اس لئے قرآن حکیم نے ان کو الگ الگ قسموں میں بیان کرنے کے بجائے ایک ساتھ ملا جلا کر بیان کیا ہے، یہ نہیں کیا کہ ہر ایک قسم کو دوسری سے ممتاز کرنے کے لئے قرآن شریف کے الگ الگ تین حصے مقرر کردیئے گئے ہوں اور ہر حصہ میں صرف ایک ہی قسم کے احکام بیان کئے گئے ہوں، بہت سے مقامات پر تو ایک ہی آیت میں تینوں قسم کے احکام حسب موقع ذکر فرما دیئے گئے ہیں، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ“. (سورۃ العصر)

قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔

اس میں ”ایمان“ کا تعلق قسم اول سے ”اچھے کام“ کا تعلق قسم دوم سے ”حق پر قائم رہنے“ کا تعلق تینوں قسموں سے اور ”صبر“ کا تعلق قسم سوم سے ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں تینوں قسموں کے احکام ملے جلے تھے، جو آپ نے حسب ضرورت صحابۂ کرامؓ کو تعلیم فرمائے، بسا اوقات ایک ہی حدیث میں کچھ احکام عقائد سے متعلق ہوتے ہیں، کچھ

(۱) خلاصہ تسہیل قصد السبیل، ص ۶، البحر الرائق: ج ا ص ۶۔

ظاہری اعمال سے اور کچھ باطنی اخلاق و عادات یعنی اعمال قلب سے۔

دین ان تینوں قسموں کے احکام کو بجالانے کا نام ہے، چنانچہ صحیح مسلم شریف کی سب سے پہلی حدیث میں جو ''حدیث جبرئیل'' کے نام سے معروف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں پر عمل کو ''دین'' قرار دیا ہے۔

پس ان میں سے کسی ایک قسم کے احکام کو نظر انداز کر دینے سے دین مکمل نہیں ہوسکتا اور انہی تینوں قسم کے احکام میں گہری بصیرت و مہارت کو قرون اولیٰ میں ''فقہ'' کہا جاتا تھا۔

فقہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک:

اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو تابعین (۱) کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں فقہ کی تعریف یہ کی ہے:

''ھو معرفة النفس مالھا وماعلیھا''. (۲)

یعنی فقہ ان امور کی بصیرت کا نام ہے جو بندے کے لئے جائز یا ناجائز ہیں۔

یہ تعریف علم دین کی تینوں اقسام کو شامل ہے، چنانچہ امام صاحب موصوفؒ نے جو کتاب عقائد پر تصنیف فرمائی تھی اس کا نام ''الفقه الأکبر''، رکھا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی علم عقائد فقہ ہی کا ایک اہم ترین شعبہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت کو ''فقہ'' کہا جاتا تھا اور ''فقیہ'' اس شخص کو کہتے تھے جو پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت رکھتا ہو، اور اپنی پوری زندگی اس کے سانچہ میں ڈھال چکا ہو۔

فقہ، حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک:

مشہور تابعی اور فقیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے کہا کہ فلاں مسئلہ میں فقہا آپ کے خلاف کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا:

''وھل رأیت فقیھاً بعینک؟إنماالفقیه الزاھد فی الدنیا الراغب فی الآخرة،البصیر بدینه،المداوم علیٰ عبادة ربه،الورع،الکاف عن أعراض المسلمین،العفیف عن أموالھم،الناصح لجماعتھم''. (۳)

تم نے آنکھ سے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو، آخرت کا طلب گار ہو، اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہو، اپنے رب کی عبادت میں لگا رہے، متقی ہو، مسلمانوں کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے سے پرہیز کرتا ہو، ان کے مال و دولت سے بے تعلق ہو، اور جماعت مسلمین کا خیر خواہ ہو۔

---

(۱) جامع بیان العلم لابن عبدالبر المالکیؒ۔

(۲) التوضیح فی شرح التنقیح: ج او ل، ص ۱۰ (مطبوعه مصر) اور البحر الرائق: ج ا ص ۶۔

(۳) رد المختار: ج ا ص ۳۵، ومرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ج ا ص ۲۶۷۔

معلوم ہوا کہ ''فقیہ'' ہونے کے لئے تمام دینی احکام کا محض علم بمعنی ''دانستن'' کافی نہ تھا بلکہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا بھی فقیہ کی تعریف میں شامل تھا جس کے بغیر کوئی خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو ''فقیہ'' کہلانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ احادیث میں فقہ اور فقیہ کے جو فضائل آئے ہیں وہ اسی قدیم معنی کے فقہ اور فقیہ سے متعلق ہیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''من یرد اللّٰہُ به خیراً یفقّهه فی الدین''. (۱)

جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فقہ (سمجھ) عطا فرما دیتا ہے۔

اس میں دین کے کسی شعبہ کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ علم دین کی تینوں اقسام کی فضیلت بیان کی گئی ہے، لہذا یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ احادیث میں فقہ اور فقیہ کے فضائل صرف اسی جدید اصطلاحی معنی کے ساتھ خاص ہیں جو اب معروف ہیں اور جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مسائل کی کثرت اور مباحث کا پھیلاؤ:

قرآن وسنت میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حکم الگ الگ صریح طور پر بیان نہیں کیا گیا، فروعی اور جزئی احکام وہی بیان کئے گئے ہیں جن کی عہد رسالت میں ضرورت تھی۔ البتہ ایسے اصولی احکام بیان کر دیئے گئے ہیں جو قیامت تک کی ضرورت کے لئے کافی ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانہ اور ہر حالت کے فروعی احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

عہد رسالت کے بعد جب اسلام کی فتوحات دنیا میں پھیلیں، بڑے بڑے متمدن ممالک اسلام کے زیر حکومت آئے، دوسری قوموں کے بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے، مسلمانوں کو مختلف تہذیبوں سے واسطہ پڑا، نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں، اور نت نئے حالات ونظریات سامنے آئے تو ہر زمانہ کے فقہاء مجتہدین نے ان کے شرعی احکام قرآن وسنت ہی کے ابدی اصولوں سے مستنبط کئے، اور امت کو بتائے، اس طرح ہر زمانہ میں قرآن وسنت سے حاصل کئے ہوئے جزئی اور فروعی احکام میں اضافہ ہوتا رہا۔

چونکہ قرآن وسنت سے نئے مسائل کا حکم معلوم کرنے اور اس کے طریق کار میں فقہا کا بہت سے مواقع میں اختلاف رائے بھی ہوا، جو شرعی دلائل پر مبنی ہوتا تھا، اور عقل ودیانت کی رو سے ناگزیر تھا، اس لئے ہر حکم کے شرعی دلائل کو بھی خوب خوب واضح کرنا پڑا، اس طرح تینوں قسم کے احکام ومسائل میں دلائل اور متعلقہ مباحث کا اضافہ بھی قرآن وسنت کے ہی بیان کردہ اصولوں کی بنیاد پر ہوتا رہا، اور علم دین کا نہایت قیمتی ذخیرہ جمع ہوتا گیا جسے منضبط کرنا بعد کے لوگوں کے لئے آسان نہ تھا۔

(۱) صحیح البخاری حدیث نمبر: ۷۱۔ انیس

دینی احکام کی تدوین:

اب ضرورت ہوئی کہ تمام دینی احکام کو دلائل اور متعلقہ مباحث کے ساتھ مرتب اور مدون کر دیا جائے تا کہ بعد کی نسلوں میں ان کی تعلیم وتدریس آسان ہو، یہ کارنامہ متأخرین یعنی تابعین کے بعد آنے والے علماء کرام نے انجام دیا۔

دینی احکام کی تقسیم تین الگ الگ فنون کی حیثیت سے:

ان حضرات نے سہولت پیدا کرنے کے لئے دینی احکام کی تینوں قسموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر کے الگ الگ مرتب کیا، کچھ حضرات نے صرف عقائد اور متعلقہ مباحث پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں، کچھ علما نے صرف ظاہری اعمال کے احکام اور متعلقہ مباحث کو اپنی کتابوں میں مرتب کیا، اور کچھ بزرگوں نے باطنی اعمال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور اس کے احکام ومباحث کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا، اس طرح رفتہ رفتہ دینی احکام کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ علم وفن کی حیثیت اختیار کر گئیں، یعنی علم فقہ تین علوم میں تقسیم ہو گیا اور ہر علم کا الگ نام رکھ دیا گیا۔

علم کلام، فقہ، تصوف:

عقائد اور متعلقہ تفصیلات ومباحث کے علم کا نام ''علم کلام'' رکھ دیا گیا، اعمال ظاہرہ، نماز، روزہ، نکاح وطلاق، تجارت وسیاست اور معاشرت وغیرہ کے احکام ودلائل کے علم کا نام ''فقہ'' رکھ دیا گیا اور اعمال باطنہ، تقویٰ وتوکل، اخلاص وتواضع، صبر وشکر اور زہد وقناعت وغیرہ کی بصیرت ومہارت کو ''تصوف'' اور ''سلوک'' اور ''طریقت'' کہا جانے لگا۔(۱)

---

(۱) البحر الرائق: ج اول، ص ۶، والتوضیح مع التلویح: ج اول، ص ۱۱ (مطبوعہ مصر) ورد المحتار: ج ا ص ۳۴ (نسخہ استنبول)

علم کلام کی تعریف: علم کلام اس فن کا نام ہے جس میں عقائد اسلام سے متعلق بحث ہوتی ہے اور مخالفین مذہب کے اعتراضات وشکوک وشبہات کا جواب دیا جاتا ہے اور عقائد حقہ کو عقلی ونقلی دلیلوں سے ثابت بھی کیا جاتا ہے، قدیم علم کلام جس میں عقائد اسلام سے متعلق بحث ہوتی تھی اس زمانہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات، اللہ کے وجود، ذات وصفات، قیامت، جنت، دوزخ، فرشتے، تقدیر اور نبوت، دنیا کے وجود اور قدامت سے متعلق ہوتے تھے، قدیم علم کلام پر بحث کرنے والوں میں متکلمین ائمہ کی ایک بڑی جماعت ہے جیسے امام ابو منصور ماتریدی، ابوالحسن اشعری، امام طحاوی، امام ابو مسلم اصفہانی، امام غزالی، علامہ ابن حزم، علامہ قفال، راغب اصفہانی، علامہ ابن رشد، امام رازی، امام ابن تیمیہ وغیرہ، ان میں سے بعض متکلمین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ملحدین ومنکرین کے اعتراضات وشبہات کو اولاً نقل کرتے ہیں پھر ان کا ایک ایک کر کے جواب دیتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ کو مثبت انداز میں عقلی ونقلی دلیلوں سے اس طرح لکھتے ہیں کہ شکوک وشبہات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح فقہ میں حالات وزمانہ کے اعتبار سے نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں اسی طرح مذہب اسلام پر اعتراضات وشکوک وشبہات کے طریقے بھی بدلتے رہے ہیں، قدیم زمانہ میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے تھے وہ عقائد ہی کے متعلق تھے لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی اور قانونی حیثیت سے بھی مذہب کو جانچا جاتا ہے، چنانچہ اس زمانہ میں عقائد کے علاوہ جہاد، غلامی، نکاح وطلاق، تعدد ازدواج، گھوس خوری وغیرہ پر بھی بحث ہوتی ہے اور ان امور کے بارے میں اسلامی احکام پر شکوک وشبہات کر کے مذہب کے بارے میں شک وارتیاب پیدا کیا جاتا ہے، قدیم طریقہ علم کلام میں منطقی مقدمات، اصطلاحات اور دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا۔ ==

فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف:

اس تقسیم میں دینی احکام کی دو قسمیں چونکہ فقہ سے الگ کردی گئیں، لہذا فقہ کا موضوع اور دائرۂ کار نسبتاً کافی محدود ہوگیا اسی وجہ سے متأخرین کو ایک مستقل علم وفن کی حیثیت سے فقہ کی تعریف بھی از سرنو کرنی پڑی، اب ''فقہ'' کی اصطلاحی تعریف یہ ہوگئی کہ:

''فقہ'' ظاہری اعمال کے متعلق تمام احکام شرعیہ کا علم ہے جو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے۔(۱)

جدید اصطلاح کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت جامع، مانع اور مکمل تعریف ہے، اور اب فقہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسے پوری طرح سمجھنے اور سمجھانے کے لئے فقہاء کرام نے تو اپنی عادت کے مطابق نہایت باریک بینی اور خوب تفصیل سے یہ کام لیا ہے، کئی کئی صفحات میں اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا، یہاں اس تعریف کے اہم حصوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

تشریح:

ظاہری اعمال: اس سے مراد وہ اچھے یا برے کام ہیں جو بدن کے ظاہری اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، حلق وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوت، کھانا، پینا، سونگھنا، چھونا، پہننا، زنا، چوری وغیرہ۔

''ظاہری اعمال'' کے لفظ سے فقہ کو تصوف اور علم کلام سے ممتاز کرنا مقصود ہے، کیونکہ علم کلام میں عقائد کا بیان ہوتا ہے اور تصوف میں باطنی اعمال کا، برخلاف فقہ کے کہ اس میں صرف ظاہری اعمال کے احکام بتائے جاتے ہیں، اس میں اگر کہیں عقائد یا باطنی اعمال کا ذکر آتا بھی ہے تو ضمناً آتا ہے اصل مقصود ظاہری اعمال کا بیان ہوتا ہے۔

== اس زمانہ میں سائنسی طریقہ کے مشاہدات اور تجربات کو پیش کیا جاتا ہے اور دلائل و براہین حکیمانہ طریقے پر صاف اور سادہ طریقہ پر بیان کئے جاتے ہیں جیسا کہ آخری دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حکیمانہ طریقہ پر علم کلام کے مسائل کو بھی دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے۔ علم کلام سے متعلق چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔کتاب الإبانة لأبی الحسن الأشعریؒ ۔۲۔کتاب التوحید لأبی منصور الماتریدیؒ ۔۳۔العقیدۃ الطحاویة لابی جعفر الطحاویؒ ۔۴۔شرح العقائد للنسفیؒ ۔۵۔الذریعة للإمام راغب الأصفهانیؒ ۔۶۔إحیاء علوم الدین لأبی حامد محمد بن محمد الغزالیؒ المتوفی ۵۰۸ھ ۔۷۔التفرقة بین الإسلام والزندقة لأبی حامد الغزالیؒ ۔۸۔حجة اللّٰہ البالغة لشاہ ولی اللّٰہ الدھلویؒ ۔۹۔معارف فی شرح الصحائف ۔۱۰۔کشف الأدلة لابن رشد المالکیؒ ۔(انیس)

(۱) عربی میں تعریف کے الفاظ یہ ہیں: هو العلم بالأحكام الشرعية العملية المكتسبة من أدلتها التفصيلية ''فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ اس تعریف کے لفظ ''العملیة'' میں اعمال سے مراد ''ظاہری اعمال'' ہیں، اسی لئے احقر نے اردو میں لفظ ''ظاہری'' کو صریح طور پر ذکر کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، التوضیح مع التلویح ، ج۱ص۱۹، اور البحر الرائق: ص۳ تا ۶ مع حاشیة منحة الخالق، وتسهیل الوصول :ص۳ تا ص۱۰، وردالمحتار مع الدر المختار : ج۱ص۳۴ تا ۳۶۔

احکام شرعیہ کا علم:

''احکام''، حکم کی جمع ہے اور ''شرعیہ'' شریعت کی طرف منسوب ہے، ''احکام شرعیہ'' ان احکام کو کہا جاتا ہے جو شریعت کی طرف منسوب یعنی شریعت سے ماخوذ ہوں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ شریعت میں انسان کے سب کاموں کی کچھ صفات مقرر کردی گئی ہیں جو کل سات ہیں: فرض، واجب، مندوب، (مستحب) مباح(۱)، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، ان صفات کو ''احکام شرعیہ'' کہا جاتا ہے، انسان کے ہر کام کے لئے ان میں سے کوئی نہ کوئی حکم شرعی ضرور مقرر ہے، یعنی بندے کا ہر عمل شریعت کی رو سے یا فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح، یا حرام یا مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی، پس ہر اچھے برے کام کے متعلق جاننا کہ اس پر شریعت نے ان میں سے کونسا حکم لگایا ہے، یہ'' احکام شرعیہ کا علم'' ہے مثلاً یہ جاننا کہ زکوٰۃ فرض ہے، سلام کا جواب دینا واجب ہے، کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا مندوب و مستحب ہے، ریل میں سفر کرنا مباح (جائز ہے)، چوری کرنا حرام ہے، بازار میں جب عام اشیاء ضرورت کی قلت ہو تو انکی ذخیرہ اندوزی مکروہ تحریمی ہے، کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے، اسی طرح تمام اعمال کے متعلق ان کا الگ الگ شرعی حکم جاننا ''احکام شرعیہ کا علم'' ہے احکام اگرچہ صرف سات ہیں، مگر انسان کے اعمال بے شمار ہیں ، اور ہر عمل کے لئے ان سات میں ایک حکم مقرر ہے اس لئے اعمال کی نسبت سے شریعت کے احکام بھی بے شمار ہو جاتے ہیں۔

تفصیلی دلائل:

''دلائل''، دلیل کی جمع ہے، یہاں احکام شرعیہ کی دلیلیں مراد ہیں، علم کبھی دلیل سے حاصل ہوتا ہے، کبھی بغیر دلیل کے، احکام شرعیہ کا علم اگر دلائل کے بغیر ہو جیسے بہت سے لوگوں کو ہزارہا شرعی احکام کا علم فقہا سے سن کر یا ان کی کتابوں میں پڑھ کر حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ فقہ نہیں، فقہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا گیا ہو، عوام کو بلکہ بہت سے علما کو بھی ''فقیہ'' اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے یہ علم ''احکام شرعیہ کے دلائل'' سے مستنبط نہیں کیا۔

''احکام شرعیہ کے دلائل'' صرف چار ہیں؛ قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ ہر عمل کا حکم شرعی انہی چار میں سے کسی نہ کسی دلیل سے ثابت ہوتا ہے یعنی انسان کے کسی بھی عمل کے متعلق یہ بات کہ وہ فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح یا حرام یا مکروہ، ثابت کرنے کا ذریعہ یا تو قرآن حکیم ہے یا سنت نبویہ یا اجماع یا قیاس، ان کے علاوہ حکم شرعی ثابت یا مستنبط کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، ان چاروں دلائل کا تعارف آگے آئے گا۔

(۱) مباح وہ عمل ہے جس کے کرنے میں کوئی ثواب نہیں اور ترک کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ (رفیع)

فقہ کی تعریف میں دلائل کی قید لگا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی فقیہ (مجتہد) کے علم وتقویٰ پر اعتماد کر کے اس کی تقلید کرنے والے عوام یا علما کو جو احکام شرعیہ کا علم ہوتا ہے ان کے اس علم کو فقہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ انہوں نے یہ علم قرآن، سنت، اجماع یا قیاس سے خود مستنبط نہیں کیا، بلکہ جس امام مجتہد کی وہ تقلید کرتے ہیں اس کے بتانے سے حاصل ہوا ہے، حالانکہ فقہ، شرعی احکام کے صرف اسی علم کو کہا جاتا ہے جو احکام شرعیہ کے دلائل سے حاصل کیا جائے۔

یہاں قارئین کرام کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ عوام کے حق میں تو یہ بات درست ہے، کیونکہ انہیں دلائل معلوم نہیں ہوتے، مگر علماء دین اگر چہ کسی امام مجتہد کی تقلید کرتے ہوں، مگر انہیں تو احکام شرعیہ کے دلائل بھی معلوم ہوتے ہیں، لہذا ان کو فقیہ اور ان کے علم کو فقہ کہنا چاہئے؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے جاننا اور چیز ہے، اور دلائل سے احکام شرعیہ کو معلوم کرنا اور مستنبط کرنا بالکل دوسری چیز، تقلید کرنے والے علماء کرام کو احکام شرعیہ کا علم دلائل کے ساتھ تو ہوتا ہے، مگر دلائل سے حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا، یعنی احکام شرعیہ کا علم تو انہیں صرف امام مجتہد کے قول سے حاصل ہو جاتا ہے، پھر وہ تحقیق کرتے ہیں کہ ان کے امام نے یہ حکم کس دلیل شرعی سے حاصل کیا ہے؟ تو احکام کے بعد دلائل کا علم بھی حاصل کر لیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ احکام شرعیہ کو خود انہوں نے قرآن وسنت یا اجماع وقیاس سے مستنبط کیا ہو، برخلاف مجتہد کے کہ وہ براہ راست ان چاروں دلائل سے احکام کو مستنبط اور معلوم کرتا ہے، یعنی وہ دلائل کو پہلے سمجھتا ہے اور پھر گہرے غور وخوض کے بعد یہ معلوم کرتا ہے کہ ان سے کیا کیا شرعی احکام ثابت ہوئے، اور عالم مقلد پہلے احکام معلوم کرتا ہے پھر دلائل کی تحقیق کرتا ہے، لہذا عالم مقلد کو حقیقۃً فقیہ نہیں کہہ سکتے۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فقیہ درحقیقت صرف مجتہد ہی کو کہہ سکتے ہیں، غیر مجتہد کو خواہ ہزار ہا احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے معلوم ہوں تب بھی وہ فقیہ نہیں، یہ اور بات ہے کہ عرف عام میں ایسے عالم مقلد کو بھی فقیہ کہہ دیتے ہیں، مگر یہ کہنا مجازاً ہے حقیقۃً اور اصطلاحاً وہ فقیہ نہیں۔(۱)

تعریف میں ''دلائل'' کے ساتھ تفصیل کی قید لگی ہوئی ہے، کیونکہ دلیل کی دو قسمیں ہیں اجمالی اور تفصیلی۔ ''دلیل اجمالی''، مبہم اور نامکمل دلیل کو کہتے ہیں مثلاً نماز قائم کرنا فرض ہے یہ ایک حکم شرعی ہے، اس کی دلیل کے طور پر صرف اتنا معلوم کر لیا جائے کہ یہ حکم قرآن شریف سے ثابت ہے۔

وہ آیت اور لفظ متعین نہ کیا جائے جس سے یہ حکم ثابت ہوا ہے، نہ یہ تحقیق کی جائے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟ اور فرضیت اس سے کیونکر ثابت ہوئی، نہ یہ تحقیق کی جائے کہ فرضیت صلوٰۃ کے خلاف کوئی اور آیت یا حدیث مشہور تو موجود نہیں، ظاہر ہے کہ ایسی نامکمل اور مبہم دلیل سے کوئی حکم ثابت نہیں ہو سکتا اور ایسی دلیل سے بالفرض کوئی

(۱) ردالمحتار: ج اول، ص ۳۵ نسخہ استنبول، والبحر الرائق: ج اول، ص ۷۔

علم حاصل ہو بھی تو اسے فقہ نہیں کہا جا سکتا۔

اور ''دلیل تفصیلی'' وہ ہے جس میں مذکورہ بالا تفصیل بدرجہ اتم موجود ہو، مثلاً فرضیت صلوٰۃ کی دلیل یوں بیان کی جائے کہ:

''قرآن حکیم کے ارشاد ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ'' کے معنی ہیں ''نماز قائم کرو'' اس میں لوگوں سے نماز قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور جس کا مطالبہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہو وہ فرض ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مطالبہ منسوخ نہ ہوا ہو اور فرضیت کے منافی کوئی اور آیت یا حدیث مشہور موجود نہ ہو، اور اس ارشاد قرآنی کا یہی حال ہے کہ نہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل ہے، نہ فرضیت صلوٰۃ کے منافی کوئی آیت پورے قرآن حکیم میں موجود ہے، نہ کوئی حدیث مشہور پورے ذخیرۂ احادیث میں اس کے منافی موجود ہے۔ لہذا نماز قائم کرنا فرض ہے''۔(۱)

''دلائل'' کے ساتھ تفصیل کی قید لگا کر یہی بتانا مقصود ہے کہ ظاہری اعمال کے متعلق احکام شرعیہ کے صرف اسی علم کو فقہ کہا جائے گا جو احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے ''اجمالی دلائل'' سے اول تو علم حاصل ہوتا نہیں، اگر حاصل ہونا فرض کر لیا جائے تب بھی وہ فقہ نہیں۔

تعریف وتشریح کا حاصل:

فقہ کی تعریف تو مختصر تھی، تشریح میں بہت سی دقیق بحثوں کو چھوڑنے اور اختصار کی حتی الامکان کوشش کے باوجود تشریح خاصی طویل ہوگئی ہے، مجبوری یہ تھی کہ فقہ کی تعریف کو ضروری حد تک سمجھنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا، بہر حال اب فقہ کی تعریف وتشریح کا حاصل یہ نکل آیا کہ:

''بندے کے ظاہری اعضا سے ہونے والے ہر کام کے متعلق قرآن، سنت، اجماع یا قیاس کے مفصل دلائل کے ذریعہ، یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا حرام یا مکروہ (تحریمی یا تنزیہی)۔

فقہ کا موضوع:

کسی علم میں جس چیز کے حالات وصفات سے بحث کی جاتی ہے، وہی چیز اس علم کا موضوع ہوتی ہے اور بحث کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان حالات وصفات کو موضوع کے لئے ثابت کیا جاتا ہے۔

علم طب میں بدن انسانی کے ان حالات سے بحث کی جاتی ہے جن کا تعلق اس کی صحت اور بیماری سے ہے، اس لحاظ سے علم طب کا موضوع انسانی بدن ہے۔

اسی طرح فقہ میں چونکہ انسان کے ظاہری افعال کی کچھ صفات (احکام شرعیہ) سے بحث کی جاتی ہے، لہذا فقہ

(۱) تسہیل الوصول ،ص ۷۔

کا موضوع انسان کے ظاہری افعال ہیں۔(۱) یعنی انسان (۲) کے صرف ظاہری افعال کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے شرعی احکام کیا ہیں۔

غرض فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی رو سے نہ عقائد فقہ کا موضوع ہیں نہ باطنی اعمال و اخلاق، بلکہ عقائد علم کلام کا موضوع ہیں اور باطنی اعمال و اخلاق تصوف کا، فقہ کا موضوع انسان کے صرف ظاہری افعال ہیں۔(۳)

(۱) ردالمحتار: ج اول، ص ۳۴ تا ۳۶، و البحر الرائق: ج اول، ص ۷۔

(۲) یہاں انسان سے صرف عاقل، بالغ مراد ہے، مجنون یا نابالغ پر چونکہ شرعی احکام کی ذمہ داریاں نہیں لہٰذا ان کے اعمال فقہ کا موضوع نہیں، یعنی ان کے کسی فعل کو فرض واجب یا حرام و مکروہ نہیں کہہ سکتے اور فقہ میں جو مسائل مجنون یا نابالغ کے افعال سے متعلق ذکر کئے جاتے ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان افعال کی بنا پر اس کے ولی اور سرپرست کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

(۳) فقہ کی تقسیم: فقہ کی مختلف اعتبار سے مختلف قسمیں ہیں، ہم یہاں ذیل کی تقسیموں پر اکتفا کرتے ہیں:

(الف) دلائل کے اعتبار سے فقہی مسائل کی تقسیم:

اس اعتبار سے فقہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک فقہ وہ ہے جس کی بنیاد ان دلائل پر ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ بھی ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کی صاحب استطاعت پر فرضیت، اور سود و زنا، نیز شراب پینے کی حرمت اور پاکیزہ رزق کی اباحت۔

دوسری قسم کا فقہ وہ ہے جس کی بنیاد ظنی دلائل پر ہے، جیسے مسح رأس کے مقدار کی تعیین، نماز میں متعین قراءت کی مقدار، اور حیض والی مطلقہ کی عدت کی تعیین کہ طہر سے ہوگی یا حیض سے، اور یہ کہ کیا خلوت صحیحہ مکمل مہر اور عدت کو واجب کرتی ہے؟ اور اس کے علاوہ دیگر مسائل۔

اور جیسا کہ پچھلے صفحات میں ذکر کیا گیا کہ وہ احکام جو ایسے قطعی دلائل سے ثابت ہیں جو دین میں بدیہی طور پر معلوم ہیں، علمائے اصول کے نزدیک وہ فقہ میں داخل نہیں ہیں گو کہ وہ فقہا کے نزدیک فقہ میں داخل ہیں۔

(ب) موضوعات کے اعتبار سے فقہ کی تقسیم:

چوں کہ علم فقہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ بندوں کے افعال کے سلسلہ میں خدائے تعالیٰ کے احکام معلوم کئے جاتے ہیں خواہ وہ احکام اقتضائی (یعنی مطالبہ والے) ہوں یا تخییری (یعنی اختیار والے) ہوں یا وضعی (یعنی کسی دوسرے حکم کیلئے محرک وغیرہ) ہوں، اس اعتبار سے علم فقہ بندوں سے صادر ہونے والے سارے افعال کا احاطہ کر لیتا ہے، اور اس طرح اس کے موضوعات بھی متعدد ہیں، چنانچہ وہ احکام جو اللہ کے ساتھ بندے کے تعلق کو مربوط و مضبوط کرتے ہیں انہیں عبادات کہا گیا ہے، چاہے یہ عبادتیں صرف بدنی ہوں جیسے نماز و روزہ، یا خالص مالی ہوں جیسے زکوۃ، یا بدنی اور مالی دونوں ہوں جیسے حج، اور وہ احکام جو خاندان کو مربوط و منظم کرتے ہیں یعنی شادی، طلاق، نفقہ، پرورش، ولایت، نسب وغیرہ، ان چیزوں سے متعلق احکام کو اس وقت عائلی فقہ (پرسنل لا) کہا جاتا ہے، علما نے انہیں احکام سے وصیت اور وراثت کو بھی جوڑ دیا ہے کیونکہ ان کا عائلی احکام سے گہرا تعلق ہے۔

اور وہ احکام جو لوگوں کے معاملات کی تنظیم کرتے ہیں، جیسے خرید و فروخت اور شرکت (اس کی تمام شکلوں کے ساتھ)، رہن، کفالت، وکالت، ہبہ، عاریت، کرایہ داری وغیرہ کو اس وقت شہری (دیوانی) یا تجارتی قانون کہا جاتا ہے۔

اور وہ احکام قضا کو اور اس کے متعلقات یعنی دعویٰ و ثبوت وغیرہ کے ذرائع کو منظم کرتے ہیں، انہیں قانون کو مقدمات (مرافعات) کہا گیا ہے۔

اور وہ احکام محکوم کے ساتھ حاکم کے تعلقات اور حاکم کے ساتھ محکوم کے تعلقات کو استوار کرتے ہیں، انہیں اس وقت دستوری قانون کہا جاتا ہے۔

اور وہ احکام جو امن و جنگ کی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کو استوار کرتے ہیں انہیں فقہائے متقدمین ''سِیَر'' کہتے تھے، لیکن عصر حاضر کے فقہا انہیں بین الاقوامی قانون کہتے ہیں۔

اور وہ احکام خورد و نوش اور پہننے اوڑھنے اور رہن سہن کے بارے میں بندوں کے اعمال سے متعلق ہیں انہیں فقہا نے ''حظر و اباحت کے مسائل'' کا نام دیا ہے۔

اور وہ احکام جو جرائم اور سزاؤں کی تعیین کرتے ہیں انہیں ہمارے فقہاء متقدمین حدود و جنایات اور تعزیرات کہا کرتے تھے، لیکن عصر حاضر کے فقہا نے انہیں ''قانون جزائی'' یا ''قانون جنائی'' کا نام دیا ہے۔ ==

قدیم اصطلاحی فقہ کا موضوع:

مگر ظاہر ہے کہ یہ سب تفصیل فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی بنیاد پر ہے، جس میں عقائد اور تصوف کو فقہ سے الگ

== اس مختصر بیان سے یہ بات بخوبی عیاں ہوگئی کہ فقہ انسان کے متعلق ساری باتوں کا احاطہ کرتی ہے، لہذا بعض لوگوں کے دعویٰ کے مطابق اس کا عمل ودخل اللہ کے ساتھ بندے کے تعلق کی تنظیم کے دائرہ میں محدود نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، پس جو شخص ایسی رائے رکھتا ہو وہ یا تو علم فقہ اور اس کے موضوعات سے بالکلیہ نا آشنا ہے یا دانستہ اس سے بے خبری کا اظہار کرتا ہے۔

(ج) حکمت کے اعتبار سے فقہ کی تقسیم:

احکام فقہ اس اعتبار سے کہ ان کی تشریع کی حکمت معلوم ومدرک ہے یا نہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ایسے احکام کی ہے جن کا مقصد سمجھ میں آجاتا ہے، انہیں کبھی احکام معلّلہ (یعنی وہ احکام جن کی علت معلوم ہے) کہا جاتا ہے، ان احکام کی تشریع کی حکمت یا تو اس لئے معلوم ہوجاتی ہے کہ نصوص میں حکمت کی صراحت ہوتی ہے یا نصوص سے حکمت کا استنباط آسان ہوتا ہے، شرعی قانون میں اس طرح کے مسائل کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے کہ:

لم یمتحنا بما تعیی العقول به حرصاً علینا فلم نرُتَبُ و لم نَهِم (ہماری رعایت میں اس نے (باری تعالیٰ نے) عقلوں کو عاجز کردینے والے احکام کے ذریعہ ہمارا امتحان نہیں لیا، چنانچہ نہ تو ہمیں شک وشبہ سے دوچار ہونا پڑا اور نہ ہم حیران ہوئے)۔

جیسے نماز، زکوۃ، اور حج کی فی الجملہ مشروعیت اور جیسے نکاح میں مہر، اور طلاق ووفات میں عدت کے وجوب، اور بیوی، اولاد اور اقارب کے لئے نفقہ کے وجوب کی مشروعیت، اور جیسے ازدواجی زندگی کے پیچیدہ ہوجانے کے وقت طلاق کی مشروعیت اور اس طرح کے ہزاروں فقہی مسائل۔

دوسری قسم: احکام تعبدی کی ہے، یہ وہ احکام ہیں جن میں عمل اور اس پر مرتب ہونے والے حکم کے درمیان مناسبت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، جیسے نمازوں کی تعداد، رکعتوں کی تعداد اور حج کے اکثر اعمال، اور خدائے تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس طرح کے احکام ان احکام کی بہ نسبت تھوڑے ہیں جن کی علت معلوم کی جاسکتی ہے۔

اس طرح کے تعبدی احکام کی مشروعیت کے ذریعہ بندوں کا امتحان لیا گیا ہے کہ آیا وہ واقعتاً مومن ہیں؟ اس جگہ یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت نے اپنے اصول وفروع میں کوئی ایسی بات نہیں بتائی ہے جو عقل انسانی کیلئے قابل قبول نہ ہو، لیکن وہ بسا اوقات ایسے احکام بیان کرتی ہے جنہیں عقل انسانی سمجھ نہیں پاتی اور ان دونوں مسئلوں کے درمیان بڑا فرق ہے، اس لئے اگر ایک انسان عقلی طور پر اس بات سے مطمئن ہوجائے کہ خدا موجود ہے، اور یہ کہ وہ حکیم ہے، اور تنہا وہی مستحق ربوبیت ہے، اور اپنے مشاہدہ میں آنے والے معجزات ودلائل کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور خدا کی طرف سے آپ کے پیغمبر ہونے پر عقلی طور پر مطمئن ہوجائے، تو اس نے اپنے اِس اطمینان کے ذریعہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے حاکمیت وربوبیت کا اقرار کرلیا اور اپنے بندہ ہونے کا اعتراف کرلیا، اب اگر اس کو کسی کام کے کرنے یا کسی کام کے نہ کرنے کا حکم دیا جائے اور وہ کہنے لگے کہ میں اس وقت تک تعمیل حکم نہیں کروں گا جب تک کہ امر ونہی کی حکمت نہ معلوم کرلوں، تو وہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے کے اپنے دعویٰ کو خود ہی جھٹلانے والا ہوگا، یہ اس لئے کہ عقل کے ادراک کی ایک متعین حد ہے جیسا کہ حواس کے عمل کی ایک حد ہے اور اس حد سے آگے حواس کام نہیں کرپاتے۔

خدائے تعالیٰ کے تعبدی احکام سے سرکشی کرنے والے کی مثال اس مریض کی ہے جو کسی ماہر فن اور معتمد طبیب کے پاس جائے، وہ اس کے لئے مختلف قسم کی دوائیں تجویز کردے اور بتادے کہ فلاں دوا کھانے سے پہلے، فلاں دوا کھانے کے درمیان اور فلاں دوا کھانے کے بعد لینی ہے اور دوا لینے کی مقدار بھی مختلف بتادے، اب مریض طبیب سے کہے کہ جب تک آپ مجھ سے یہ حکمت نہ بیان کردیں کہ فلاں دوا کھانے سے قبل، فلاں کھانے کے بعد اور فلاں کھانے کے دوران کیوں لی جائے گی؟ اور یہ کہ بعض دواؤں کی خوراک زیادہ اور بعض کی کم کیوں ہے؟ میں آپ کی دوا استعمال نہیں کروں گا۔

آپ ہی بتایئے کہ کیا اس مریض کو اپنے ڈاکٹر پر واقعۃً اعتماد ہے؟ یہی حال اس شخص کا ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر جن احکام کی حکمت اس کی سمجھ میں نہیں آتی ان سے سرتابی کرتا ہے، اس لئے کہ مومن برحق کا شیوہ یہ ہے کہ جب بھی اس کو کسی کام کے کرنے یا کسی کام کے نہ کرنے کا حکم کیا جاتا ہے تو فوراً وہ سمع وطاعت کے لئے تیار ہوجاتا ہے، خصوصاً اس کے بعد کہ ہم نے ابھی بتایا کہ شریعت اسلامی میں ایسے احکام مطلقاً نہیں جنہیں عقل سلیم قبول نہ کرے، اور کسی چیز کا نہ جاننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، چنانچہ بہت سے احکام ایسے ہیں کہ ماضی میں ان کی حکمت ہم سے مخفی رہی پھر ان کی زبردست حکمت ہمارے اوپر واضح ہوگئی، چنانچہ لحم خنزیر کی حرمت کی حکمت سے بہت سے لوگ ناآشنا تھے، پھر ہمارے اوپر وہ خبیث امراض وصفات منکشف ہوگئے جو اس پلید جانور میں موجود ہیں اور جن سے خدائے کریم نے اسلامی معاشرہ کو بچانا چاہا ہے، اسی طرح کی بات کتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے، جن میں ایک مرتبہ مٹی سے دھونا بھی شامل ہے، کے سلسلہ میں کہی جاتی ہے، اس کے علاوہ بہت سے احکام ہیں جن کے اسرار ورموز رفتہ رفتہ ہم پر عیاں ہورہے ہیں اگرچہ آج تک وہ ہم پر مخفی رہے۔ (بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ اردو: ۱/۷۸-۸۱۔ انیس)

کر دیا گیا ہے ورنہ جہاں تک قدیم اصطلاحی فقہ پورے دین کی گہری بصیرت ومہارت کا تعلق ہے، اس میں نہ عقائد و اعمال کی تفریق ہے نہ ظاہر و باطن کی، عقائد ہوں یا اعمال، اعمال بھی ظاہر کے ہوں یا باطن کے، سب ہی میں شریعت کے احکام کو بجالانا ''دین'' ہے، اوران سب کے شرعی احکام کو دلیل سے جاننا علم دین، اسی علم دین کو قرآن وسنت میں ''فقہ'' اور ''تفقہ فی الدین'' کا نام دیا گیا ہے اوراس کا موضوع صرف ظاہری اعمال نہیں بلکہ عقائد اور تمام ظاہری و باطنی اعمال اس کا موضوع ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جدید اصطلاحی فقہ پورا علم دین نہیں بلکہ علم دین کا تہائی حصہ ہے، اور یہ تہائی بھی عقائد اور تصوف کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ اگلے مباحث سے معلوم ہوگا۔

تفقہ فی الدین فرض کفایہ ہے:

پورا علم دین قدیم اصطلاحی فقہ ہے، جسے قرآن حکیم نے ''تفقہ فی الدین'' پورے دین کی سمجھ بوجھ، کے لفظ سے تعبیر کی ہے اور فرض کفایہ قرار دیا ہے، (۱) ارشاد ربانی ہے:

''فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ''. (۲)

ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے، تا کہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے رہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے جس فقہ کی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ''**اللّٰهم فقهه في الدين**''. (۳) اے اللہ ان کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما۔

وہ بھی یہی ''تفقہ فی الدین'' ہے جس کی وسعت دین کی تینوں شاخوں عقائد، تصوف اور ''جدید اصطلاحی فقہ'' کو سمیٹے ہوئے ہے، دور تابعین تک فقہ کا لفظ اسی وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، بعد میں متأخرین نے محض درس و تدریس وغیرہ میں سہولت کے لئے دین کی ان تینوں شاخوں کو الگ الگ مرتب اور مدون کر کے ہر شاخ کا الگ الگ نام رکھ دیا، جس کے نتیجہ میں ہر شاخ کی تعریف بھی الگ الگ کرنی پڑی، چنانچہ اس مضمون میں بھی آگے لفظ فقہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوگا جو متأخرین کی اصطلاح ہے۔ (۴)

(۱) معارف القرآن ج۴ ص۴۸۹۔

(۲) سورۃ التوبہ: ۱۲۲۔

(۳) صحیح البخاری: ج اول، ص۲۶، باب وضع الماء عند الخلاء، کتاب الوضوء۔

(۴) **فقہ کی لغوی تعریف:** لغت میں فقہ کے معنی مطلقاً سمجھنے کے ہیں، سمجھنے کا تعلق کسی ظاہری شئ سے ہو یا کسی مخفی شئ سے، ''القاموس'' اور ''المصباح المنیر'' کی عبارت سے یہی مترشح ہے، اہل لغت نے اس معنی کے سلسلہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''قَالُوْا يَاشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْراً مِّمَّا تَقُوْلُ'' (سورۂ ہود: ۹۱) (وہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیبؑ! بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں)، اور ارشاد باری ہے: ''وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلاَّ يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ'' (سورۂ اِسراء: ۴۴)، (اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو نہیں سمجھتے ہو)، چنانچہ دونوں آیتیں مطلق فہم کی نفی کو بتا رہی ہیں۔ ==

تصوف کی حقیقت

تصوف بھی چونکہ دین کا ایسا ہی اہم شعبہ ہے جیسا کہ فقہ اور دونوں میں ربط اتنا گہرا ہے کہ فقہ پر عمل تصوف کے بغیر

== بعض علما کی رائے ہے کہ فقہ کا لغوی معنی کسی باریک بات کو سمجھنا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: "فقهت كلامك" (میں نے تیری بات سمجھ لی) تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے تیری گفتگو میں پنہاں مقاصد و اسرار سمجھ لئے، اسی لئے "فقهت السماء و الأرض" (میں نے آسمان و زمین سمجھ لیا) نہیں کہا جاتا۔ قرآنی آیات کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لفظ "فقہ" صرف باریک شئ کے سمجھنے کو بتانے کے لئے ہی آیا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَهُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ، فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ" (سورۂ انعام/۹۸)، (اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا، پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی، بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں)، سابقہ دونوں آیتوں میں بھی فہم مطلق کی نفی نہیں ہے، بلکہ شعیب علیہ السلام کی قوم کی گفتگو میں ان کی دعوت کے رموز کے سمجھنے کی نفی کی گئی ہے، کیونکہ ظاہری دعوت کو وہ سمجھ رہے تھے، اسی طرح آیت اسراء میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہر چیز کی تسبیح کے رموز کے سمجھنے کی نفی کی گئی ہے، ورنہ ذرا سی فہم والے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ رضامندی سے یا مجبوراً دنیا کی ہر شئ تسبیح خداوندی کرتی ہے، کیونکہ ساری اشیاء اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، بہرصورت ہمارا مقصد تو دراصل علماء اصول و علماء فقہ کی اصطلاح میں معنیٔ فقہ سے بحث ہے کیونکہ اس وقت یہی ہمارا موضوع ہے۔

فقہ کی تعریف علماء اصول کے نزدیک:

علماء اصول کی اصطلاح میں فقہ تین ادوار سے گذرا ہے:

دور اول: اس دور میں فقہ لفظ "شرع" کا مترادف ہے، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تمام باتوں کا جاننا، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو، یا اخلاق یا افعال و جوارح سے، اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف میں فرمایا ہے: "نفس کا جان لینا اپنے حقوق و اختیارات اور فرائض و واجبات کو"، اسی لئے انہوں نے عقائد کے موضوع پر اپنی کتاب کا نام "الفقه الأكبر" رکھا۔

دور ثانی: اس دور میں "فقہ" کے لفظ میں قدرے تخصیص پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ علم عقائد کو اس سے مستثنیٰ کر کے اسے باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی گئی، اور اسے علم توحید، علم کلام یا علم عقائد کا نام دے دیا گیا، اس دور میں فقہ کی تعریف یہ کی گئی: "فقہ ادلۂ تفصیلیہ سے مستنبط فرعی شرعی احکام کا جاننا ہے"۔

فرعیہ سے مراد احکام اصلیہ کا استثنا ہے جو عقائد ہیں، کیونکہ عقائد شریعت کی اصل اور سارے احکام کی اساس ہیں، اس تعریف میں وہ تمام شرعی عملی احکام سمٹ آئے ہیں جن کا تعلق افعال جوارح سے ہے، اور ساتھ ہی وہ تمام شرعی اور فروعی احکام بھی جو قلب سے متعلق ہیں، جیسے ریا، کبر، حسد اور خود بینی کی حرمت، اور جیسے تواضع اور دوسروں کے لئے خیر خواہی کے جذبہ کی حلت، اور ان کے علاوہ دیگر اخلاق سے متعلق احکام۔

دور ثالث: تیسرا وہ دور ہے جس پر علما کی رائے تاہنوز قائم ہے، اس دور میں فقہ کی تعریف یوں کی گئی ہے: "فقہ ادلۂ تفصیلیہ سے ماخوذ شرعی، فرعی، عملی احکام کا جاننا ہے"، اس تعریف میں اعمال قلب سے متعلق شرعی فرعی احکام کو شامل نہ کر کے اسے مستقل علم کی حیثیت سے علم تصوف یا علم الاخلاق کا نام دیا گیا ہے۔ فقہ کی آخری تعریف سے کچھ باتیں سامنے آتی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے:

(الف) ذوات و صفات کے علم کو فقہ نہیں کہا جائے گا، اس لئے کہ یہ "احکام" کا جاننا نہیں ہے۔

(ب) اسی طرح عقلی، حسّی، لغوی اور وضعی (اصطلاحی) احکام (جن پر کسی علم و فن کے علما متفق ہو جایا کرتے ہیں) کے جاننے کو فقہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ "شرعی احکام کا جاننا" نہیں ہے۔

(ج) شرعی اعتقادی احکام جو دین کی اصل ہیں، یا وہ شرعی احکام جن کا تعلق قلب سے ہے، جیسے حقد و حسد، ریا و تکبر اور دوسروں کے لئے جذبۂ خیر خواہی، فقہ کی آخری تعریف والے علما کی اصطلاح میں فقہ میں سے نہیں ہیں، اسی طرح ان شرعی احکام کا جاننا جو علم اصول فقہ میں شامل ہیں، جیسے خبر آحاد پر عمل کا وجوب یا قیاس کی پابندی کا وجوب وغیرہ بھی علم فقہ میں شامل نہیں ہے، انہیں علم فقہ میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا ہے کہ یہ عملی احکام نہیں ہیں بلکہ یہ علمی قلبی یا اصولی احکام ہیں۔ ==

اور تصوف پر عمل فقہ کے بغیر ممکن نہیں، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، بلکہ جو فقہ قرآن وسنت کا مطلوب ہے وہ تو تصوف کے ==

(د) جبریل علیہ السلام یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی کے ذریعہ کسی بات کو جاننا، فقہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ استخراج واستدلال کے ذریعہ حاصل کردہ علم نہیں تھا، بلکہ اس علم کا سرچشمہ کشف ووحی الٰہی تھا، لیکن اجتہاد کی راہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بات کو جاننا ''اجتہاد'' کہا جاسکتا ہے۔

(ہ) اسی طرح بدیہی دینی احکام کے جاننے کو ''فقہ'' نہیں کہا جائے گا، جیسے نماز، زکوۃ، رمضان کے روزے اور مستطیع پر حج کی فرضیت، اور جیسے سود، زنا، شرب خمر، جوا وغیرہ کی حرمت کا علم، کیونکہ یہ احکام بذریعہ استنباط حاصل کردہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا علم بدیہی ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ انہیں عوام، عورتیں، باشعور بچے اور دارالاسلام میں پروان چڑھنے والا ہر شخص جانتا ہے، ان احکام کو علم عقائد میں شمار کیا جانا بھی خارج از امکان نہیں، اس لئے کہ ان میں سے کسی بات کے منکر کو کافر کہا جائے گا۔

(و) اسی طرح علما کا تقلید کے ذریعہ شرعی فرعی عملی احکام کا جاننا بھی فقہ میں شمار نہیں ہوگا، جیسے کسی حنفی کا چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت کا جاننا، یا نماز وتر وعیدین کے وجوب کا جاننا، اور اپنی جگہ سے خون اور پیپ کے بہہ نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا وغیرہ کا علم، یا کسی شافعی کا وضو میں سر کے کچھ حصہ کے مسح کے کافی ہوجانے کا جاننا، یا جیسے اس کا یہ جاننا کہ جو عورت اس کے لئے مطلقاً حلال ہے اس کو چھونا بھی وضو کو توڑ دیتا ہے، یا اس کا یہ جاننا کہ عقد نکاح میں ولی اور دو گواہوں کی حاضری واجب ہے، اسی طرح دیگر وہ احکام جو جزئیات فقہ کی کتابوں میں مفصل ذکر کردہ ہیں، اس طرح کے سارے احکام کا علم فقہاء (مقلدین) کو بذریعہ استنباط نہیں بلکہ بذریعہ تقلید معلوم ہوتے ہیں۔

(ز) اس تعریف سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ علماء اصول کے نزدیک ''فقیہ'' کا اطلاق ''مقلد'' پر نہیں ہوسکتا خواہ کتنا ہی علم فقہ اور اس کی جزئیات کے علم سے بہرہ ور ہو، بلکہ ''فقیہ'' علمائے اصول کے نزدیک وہ شخص ہے جو ملکۂ استنباط رکھتا ہو، اور ادلۂ تفصیلیہ کے ذریعہ استخراج احکام کی قدرت رکھتا ہو، اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام فرعی احکام کا علم رکھتا ہو، بلکہ یہ کافی ہے کہ وہ استخراج کا ملکہ رکھتا ہو، ورنہ تو اکثر مشہور ائمہ نے بعض مسائل میں توقف کیا ہے، یا تو اس لئے کہ ان کے نزدیک دلائل میں اس قدر تعارض تھا کہ ایک دلیل کو دوسری دلیل پر ترجیح دینا مشکل تھا، یا اس لئے کہ جن مسائل میں انہوں نے توقف کیا ان کے سلسلہ میں انہیں دلائل نہیں مل سکے۔

فقہ کی تعریف فقہا کے نزدیک:

فقہا کے نزدیک فقہ کا اطلاق دو معنوں میں سے کسی ایک پر ہوا کرتا ہے:

اول: کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں موجود شرعی عملی احکام یا ان شرعی عملی احکام کے ایک حصہ کا حفظ جن پر اجماع ہو چکا ہے، یا جو نگاہ شریعت میں معتبر قیاس کے ذریعہ مستنبط ہوں، یا کسی اور ذریعہ سے جن کی اساس مذکورہ بالا دلائل ہوں، خواہ یہ احکام دلائل کے ساتھ یاد کئے جائیں یا بغیر دلائل کے، اس لئے کہ علماء اصول کے برعکس فقہا کے نزدیک ''فقیہ'' کا مجتہد ہونا ضروری نہیں۔

''فقیہ'' کہے جانے کے لئے ایک شخص کو کم از کم کتنے مسائل یاد ہونے چاہئیں؟ اس سلسلہ میں فقہا نے کلام کیا ہے، اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس قدر قلیل کی تعیین عرف ورواج سے کی جائے گی، اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کا عرف یہ فیصلہ دیتا ہے کہ کسی شخص کو ''فقیہ'' اسی وقت کہا جائے گا جو فقہ کے مختلف ابواب میں مذکور احکام کے مواقع اور محل سے اس درجہ واقف ہو کہ اس کے لئے ان تک رجوع آسان ہو۔

بعض اسلامی ممالک کے عوام عموماً ''فقیہ'' ہر اس آدمی کو کہتے ہیں جو قرآن پاک کا حافظ ہو، خواہ اس کے معانی سے مطلقاً جاہل ہو۔

فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ ''فقیہ النفس'' اسی شخص کو کہا جائے گا جو وسیع المعلومات، قوی الادراک اور صحیح فقہی ذوق رکھتا ہو، خواہ وہ مقلد ہی ہو۔

دوم: یہ کہ ''فقہ'' شرعی عملی احکام ومسائل کے مجموعہ کو کہا جائے گا، اور یہ اطلاق، مصدر بول کر حاصل مصدر مراد لینے کے قبیل سے ہے، جیسے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے: ''هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ''. یہ اللہ کی مخلوق ہے۔ (سورۂ لقمان: ۱۱)

وہ الفاظ جن کا لفظ ''فقہ'' سے تعلق ہے:

۱۔ لفظ ''دین'': ''دین'' لغت میں مختلف معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ لفظ ''مشترک الفاظ'' میں سے ہے، ہم یہاں صرف بعض ان معانی سے تعرض کریں گے جن کا ہمارے موضوع سے تعلق ہے، ان معانی میں سے ایک تو ''جزا'' ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' (سورۂ فاتحہ: ۴) (وہ یوم جزا کا مالک ہے)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ، يَقُوْلُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ، أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً وَّعِظَاماً أَإِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ'' (سورۂ صافات: ۵۳-۵۱) ==

== (ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ملاقاتی تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو بھی (حشر کے) معتقدین میں سے ہے، تو کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو جزاوسزا دیئے جائیں گے)، یہاں "مدینون" مجزیون یعنی بدلہ دیئے ہوئے کے معنی میں ہے۔"دین" کے معنی طریقہ کے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دین اسی معنی میں مستعمل ہے:"لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنٌ" (سورۂ کافرون/۶) (تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ)،"دین" حاکمیت کے معنی میں بھی آتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لاَ تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" (سورۂ انفال/۹۳) (اور تم ان سے لڑو یہاں تک کہ فساد (عقیدہ) باقی نہ رہ جائے اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہوجائے)، یعنی صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہوجائے اور تنہا اس کا قانون چلے، کبھی لفظ دین کے معنی قواعد اور قانون کے بھی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلاَ بِالْیَوْمِ الآخِرِ وَلاَ یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلاَ یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ أُوْتُوا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ" (سورۂ توبہ/۹۲) (لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا ان لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہوکر)، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحاً وَّ الَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ" (سورۂ شوریٰ/۳۱) (اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کیا ہے)، مذکورہ دونوں آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ "دین" سے مراد خدا کا اپنے بندوں کے لئے پسند کردہ قانون ہے۔

اصطلاحاً لفظ "دین" جب مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد وہ احکام ہوا کرتے ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنائے ہیں، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو یا اخلاق سے یا احکام عملی سے۔

یہ معنی لفظ فقہ کے دور اول کے مدلول سے ہم آہنگ ہے جس کی طرف آغاز موضوع میں اشارہ کیا گیا تھا، اس لحاظ سے دونوں الفاظ مترادف ہوں گے۔

۲۔لفظ "شرع": "شرع" کا لفظ "شَرَعَ لِلنَّاسِ کَذَا" کا مصدر ہے، یعنی اس نے لوگوں کے لئے فلاں قانون بنایا، پھر مصدر "شرع" اسم مفعول "مشروع" کے معنی میں استعمال کیا گیا، چنانچہ کہا جاتا ہے:"ھٰذَا شَرْعُ اللّٰہِ" یعنی یہ اپنے بندوں کے لئے خدا کا بنایا ہوا قانون وطریقہ ہے، اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد میں "شرع" کا لفظ قانون وطریقہ بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے: "شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحاً وَّ الَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ" (سورۂ شوریٰ/۳۱) (اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کیا ہے)، علمائے اسلام کی اصطلاح میں شرع سے مراد وہ احکام ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنائے ہیں، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو، عمل سے یا اخلاق سے۔

اس سے یہ واضح ہوگیا کہ مذکورہ حیثیت سے لفظ "شرع" دین اور فقہ کے الفاظ کا مترادف ہے، ہر چند کہ متأخرین علمائے اصول وفقہ کے نزدیک جو معنی متعین ہوچکا ہے اس کے اعتبار سے "شرع" اور "دین" کے الفاظ بمقابلہ "فقہ" کے عام سمجھے جائیں گے۔

لفظ "شریعت اور شرعت":

لغت میں "شریعت" کے معنی چوکھٹ اور گھاٹ کے ہیں، اور انہی معنوں میں "شِرعۃ" کا لفظ بھی آتا ہے، علمائے اسلام کے نزدیک ان کا اطلاق اسی معنی میں ہوتا ہے جس پر "شرع" کا لفظ بولا جاتا ہے، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلاَ تَتَّبِعْ أَھْوَاءَ الَّذِیْنَ لاَ یَعْلَمُوْنَ" (سورۂ جاثیہ/۸۱)، (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا سو آپ اسی پر چلے جایئے اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے)، نیز ارشاد ہے:"لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجاً" (سورۂ مائدہ/۸۴) (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی تھی)۔

لیکن عصر حاضر میں لفظ شریعت کا اطلاق عام طور پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ عملی احکام پر ہونے لگا ہے، لہٰذا لفظ "فقہ" (باستعمال متأخرین) اور لفظ "شریعت" مترادف قرار پاتے ہیں۔

شاید اس جدید عرفی اطلاق کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:"لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجاً" (سورۂ مائدہ/۸۴)، اس لئے کہ یہ بات یقینی ہے کہ آسمانی شریعتیں صرف عملی اور جزوی امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ورنہ بنیادی احکام سبھی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

اسی جدید عرفی اطلاق کی بنیاد پر احکام شریعت کی تعلیم دینے والے کالجوں کو "کلیۃ الشریعۃ" (شریعہ کالج) کہا جاتا ہے۔ ==

فقہ کا تعارف بھی تشنہ ہی رہے گا۔

تصوف کے کئی نام ہیں، علم القلب، علم الاخلاق، احسان، سلوک اور طریقت، یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں، قرآن وسنت میں اس کے لئے زیادہ تر ''احسان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور ہمارے زمانہ میں لفظ ''تصوف'' زیادہ مشہور ہوگیا، بہرحال حقیقت ان سب کی ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے افعال جس طرح ہمارے ظاہری اعضا سے انجام پاتے ہیں، اسی طرح بہت سے اعمال ہمارا قلب انجام دیتا ہے، جن کو ''اعمال باطنہ'' کہا جاتا ہے جس طرح ہمارے ظاہری افعال شریعت کی نظر میں کچھ اچھے اور فرض وواجب ہیں اور کچھ ناپسندیدہ اور حرام ومکروہ، اسی طرح باطنی اعمال قرآن وسنت کی نظر میں کچھ پسندیدہ اور فرض وواجب ہیں، جیسے تقویٰ، اللہ کی محبت، اخلاص، توکل صبر وشکر، تواضع، خشوع، قناعت، حلم، سخاوت، حیا، رحم دلی وغیرہ ان باطنی پسندیدہ اخلاق کو ''فضائل'' اور ''اخلاق حمیدہ'' کہا جاتا ہے اور کچھ باطنی اعمال برے اور حرام ہیں(۱) جیسے تکبر، عجب، غرور، ریا، حب مال، حب جاہ، بخل، بزدلی، لالچ، دشمنی، حسد، کینہ، سنگدلی اور بے محل یا حد سے زیادہ غصہ وغیرہ ان کو ''رذائل'' یا اخلاق

== لفظ ''تشریع'': ''تشریع'' شَرَّعَ کا مصدر ہے، یعنی اس نے قانون اور قاعدے بنائے۔ اصطلاح میں تشریع، بندوں سے متعلق خدا کا خطاب ہے، خواہ یہ خطاب طلب ہو یا تخییر یا وضع۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ تشریع صرف خدا کا حق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ'' (سورۂ انعام: ۵۷) (حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کے، وہی حق کو بتلاتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے)، لہٰذا کسی شخص کو چاہے جس مقام و مرتبہ کا ہو کسی حکم کی تشریع کا حق نہیں ہے، نہ حقوق اللہ سے متعلق اور نہ حقوق العباد سے متعلق، اس لئے کہ یہ خدا پر بہتان ہے اور خدا سے اس کا خصوصی حق چھین لینے کی کوشش کے مترادف ہے، ارشاد باری ہے: ''وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلاَلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، إِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لاَ يُفْلِحُوْنَ، مَتَاعٌ قَلِيْلٌ، وَّلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ'' (سورۂ نحل: ۱۱۶-۱۱۷) (اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے ان کی نسبت یوں مت کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دو گے، بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمتیں لگاتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے، یہ چند روزہ عیش ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے)۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے علو مرتبہ کے باوجود حق تشریع نہیں رکھتے، بلکہ ان کو محض بیان ووضاحت کا حق حاصل ہے اور تبلیغ کی ذمہ داری عائد کی ہوئی ہے، ارشاد خداوندی ہے: ''يَا أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ'' (سورۂ مائدہ: ۶۷)، (اے ہمارے پیغمبر جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے یہ سب آپ لوگوں تک پہنچا دیجئے، اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں)، نیز ارشاد باری ہے: ''وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلاَّ لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' (سورۂ نحل: ۶۴)، (اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ لوگوں پر اس کو ظاہر فرما دیں، اور ایمان والوں کی ہدایت اور رحمت کی غرض سے (نازل کیا ہے)، اور ارشاد ہے: ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ'' (سورۂ نحل: ۴۴)، (اور آپ پر یہ قرآن اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں پر ظاہر کر دیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیا کریں)۔

اس مسئلہ پر تمام مسلمانوں بلکہ تمام آسمانی شریعتوں کا اجماع ہے، اس اجماع سے صرف وہی لوگ کنارہ کش ہیں جو خدائی شرائع واحکام کی تابعداری سے دامن کش ہیں۔ (ماخوذ از الموسوعۃ الفقہیۃ اردو: ۱/۴۵-۵۱۔ انیس)

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار ج اول، ص ۴۰۔

رذیلہ'' کہا جاتا ہے۔

''فضائل''اور''رذائل'' دونوں کا تمام تر تعلق قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے مگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے یہی قلبی احوال اور اندرونی کیفیتیں درحقیقت ہمارے انہی افعال کی بنیاد اور اساس ہیں، ظاہری اعضا سے ہم اچھا یا برا جو کام بھی کرتے ہیں درحقیقت وہ انہی باطنی ''فضائل یا رذائل'' کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مثلاً تقویٰ (خوف خدا) اور اللہ کی محبت یہ قلب کی اندرونی کیفیتیں ہیں، مگر ان کا اثر ہمارے تمام ظاہری اعمال پر پڑتا ہے، ہماری ہر عبادت نماز، روزہ وغیرہ انہی دو باطنی اخلاق کی پیداوار ہے، ہم نفسانی اور شیطانی تقاضوں کے باوجود اگر بدنظری، لڑائی جھگڑے اور جھوٹ وغیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں تو اس اجتناب کا اصل محرک بھی یہی تقویٰ اور اللہ کی محبت ہے۔

اسی طرح ظاہری اعضا سے ہم جو گناہ بھی کرتے ہیں اس کا سبب بھی کوئی نہ کوئی باطنی خصلت ہوتی ہے، مثلاً مال کی محبت یا جاہ پسندی یا عداوت یا حسد یا غصہ یا آرام طلبی یا تکبر وغیرہ۔

تمام ظاہری اعمال کا حسن وقبح اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مقبول یا مردود ہونا بھی ہمارے باطنی اخلاق پر موقوف ہے، مثلاً اخلاص وریا یہ قلب ہی کے متضاد اعمال ہیں، مگر ہمارے تمام ظاہری اعمال کا حسن وقبح ان سے وابستہ ہے، کوئی بھی عبادت نماز، حج وغیرہ جو محض ریا کے طور پر دنیا کی شہرت حاصل کرنے کے لئے کی جائے عبادت نہیں رہتی اور تجارت ومزدوری جو اپنی اصل کے اعتبار سے دنیا داری کا کام ہے مگر حکم خداوندی کی تعمیل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے کی جائے تو یہی تجارت ومزدوری باعث اجر وثواب اور عبادت بن جاتی ہے، یہ ریا اور اخلاص ہی کا کرشمہ ہے جس نے عبادت کو دنیا داری اور دنیا داری کو اللہ کی عبادت بنا دیا ہے یہی مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ:

''إنما الأعمال بالنيات''.(۱) تمام اعمال کا ثواب نیتوں پر موقوف ہے۔

تقریباً یہی حال تمام باطنی ''فضائل ورذائل'' کا ہے کہ ہمارے ظاہری اعمال کے حسن وقبح، ردوقبول اور اجر وثواب، بلکہ بہت سے اعمال کا وجود بھی انہی کا رہین منت ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کی نشان دہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ:

''ألا إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب''.(۲)

ہوشیار رہو کہ بدن کے گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہوشیار رہو کہ وہ دل ہے۔

---

(۱) یہ مشکوۃ شریف کی سب سے پہلی حدیث ہے۔

(۲) الصحيح للبخاري، كتاب الإيمان باب فضل من استبرء لدينه، وصحيح مسلم، باب أخذ الحلال وترك الشبهات۔

اسی لئے تمام علما فقہا کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ ’’رذائل‘‘ سے بچنا اور ’’فضائل‘‘ کو حاصل کرنا ہر عاقل بالغ پر فرض ہے(۱) یہی فریضہ ہے جس کو اصلاح نفس یا تزکیۂ نفس اور تزکیۂ اخلاق یا تہذیب اخلاق کہا جاتا ہے اور یہی تصوف کا حاصل و مقصود ہے۔(۲)

تزکیہ:

دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت ہر مذہب کی جان اور نبوتوں کا مقصود رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو چار مقاصد قرآن حکیم میں بتائے گئے ان میں دوسرا یہ ہے کہ ’’وَیُزَکِّیۡهِمۡ‘‘. (سورۃ البقرہ:۱۲۹، آل عمران:۱۶۴، سورۃ الجمعہ:۲) ’’آپ مسلمانوں (کے اخلاق و اعمال) کا تزکیہ فرماتے ہیں۔

قرآن نے ہر انسان کی کامیابی و نامرادی کا مدار بھی اسی تزکیۂ نفس پر رکھا ہے:

’’قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا، وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا‘‘. (سورۃ الشمس:۹،۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اسے (رذائل میں) دھنسایا۔

اور بتایا کہ گناہ ظاہری اعضا ہی سے نہیں ہوتے، بلکہ باطن کے بھی گناہ ہیں دونوں سے بچنا فرض عین ہے اور ہر گناہ موجب عذاب ہے، خواہ ظاہر کا ہو یا باطن کا۔ ارشاد ربانی ہے:

’’وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ، اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَيُجۡزَوۡنَ بِمَا كَانُوۡا يَقۡتَرِفُوۡنَ‘‘(سورۃ الأنعام:۱۲۰)

تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی بلاشبہ جو لوگ گناہ (ظاہر کا یا باطن کا) کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی سزا عنقریب ملے گی۔

باطنی گناہ قلب کے وہی گناہ ہیں جن کے متعلق پیچھے عرض کیا گیا ہے کہ وہ ہمارے تمام ظاہری گناہوں کا منبع ہیں، ہمارے ہر گناہ کا سوتا وہیں سے پھوٹتا ہے، تصوف کی اصطلاح میں انہی کو ’’رذائل یا اخلاق رذیلہ‘‘ کہا جاتا ہے، ان کے بالمقابل دل کی نیکیاں اور عبادتیں ہیں جو ہماری تمام ظاہری عبادتوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہیں، ہر عبادت اور ہر نیکی انہی کی مرہون منت ہے، قلب کے ان نیک اعمال کو تصوف کی اصطلاح میں ’’فضائل یا اخلاق حمیدہ‘‘ کہا جاتا ہے۔

جس طرح اچھے برے ظاہری اعمال کی ایک طویل فہرست ہے جن کے شرعی احکام فقہ میں بتائے جاتے ہیں، اسی طرح باطنی اعمال یعنی ’’رذائل اور فضائل‘‘ کی تعداد بھی بہت ہے جو تصوف کا موضوع ہیں، یہاں چند فضائل اور چند رذائل بطور مثال ذکر کئے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ قرآن وسنت نے فضائل کی تاکید اور رذائل کی ممانعت کتنے شد و مد سے کی ہے اور یہ تاکید کسی طرح اس تاکید سے کم نہیں جو ظاہری اعمال کی اصلاح کے لئے قرآن وسنت میں کی گئی ہے۔

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار: ج اول ص۴۰۔

(۲) تصوف کے مشہور امام حضرت عبدالقادر سہروردیؒ نے اپنی کتاب ’’عوارف المعارف‘‘ میں تصوف کی جو حقیقت تفصیل سے بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے۔(دیکھئے: عوارف المعارف: ج اول، ص۲۹۰، بہ حاشیہ إحیاء العلوم للغزالیؒ)

فضائل:

تقویٰ: ایک باطنی عمل ''تقویٰ'' ہے، قرآن حکیم نے اپنی دوسری ہی سورت میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں۔ ارشاد ہے:

''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ''. (سورۃ البقرہ:۲) یہ کتاب (قرآن) تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ والوں کے لئے آخرت کی لازوال نعمتوں کی جگہ جگہ بشارت ہے، مثلاً:

''اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ''. (سورۃ الطّور:۱۷) بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔

قرآن نے جا بجا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ سچے لوگوں کی معیت وصحبت اختیار کرو۔

''يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ''. (سورۃ التوبہ:۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ یعنی ایسے لوگوں کے ساتھ رہو جو نیت اور بات میں سچے ہیں۔

اللہ کے نزدیک ہر عزت وبرتری کا معیار بھی یہی تقویٰ ہے۔ ارشاد ہے:

''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ''. (سورۃ الحجرات:۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو۔

یہ چند آیات محض بطور نمونہ ہیں، سب آیات جمع کی جائیں تو کئی ورق درکار ہوں گے۔

اخلاص: اسی طرح ''اخلاص'' دل کا عمل ہے، قرآن حکیم نے اس کی تاکید میں بھی کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ:

''فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ''. (سورۃ الزمر:۲)

سو آپ اللہ کی عبادت کیجئے، اسی کے لئے عبادت کو خالص کرتے ہوئے۔

''قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَاللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ''. (سورۃ الزمر:۱۱)

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھوں۔(۱)

قرآن پاک میں سات جگہ یہ ارشاد ہے:

''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ''.(۲) اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے۔

توکل: اسی طرح ''توکل''، جو نفس کا اندرونی عمل ہے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا اور ساتھ ہی بشارت سنائی گئی کہ:

---

(۱) تفسیر معارف القرآن: ج۷ص۵۴۴۔

(۲) سورۃ البینۃ:۵۔

’’فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ‘‘. (سورۃ آل عمران؛۱۵۹)

تو آپ اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

سب مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ:

’’وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ‘‘. (سورۃ آل عمران:۱۲۲)

پس مسلمان تو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

قرآن پاک نے بتایا کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی اپنی امتوں کو توکل کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا کہ:

’’یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُسْلِمِیْنَ‘‘. (سورۃ یونس:۸۴)

اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اصول کا اعلان عام فرما دیا ہے کہ:

’’مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ‘‘. (سورۃ الطلاق:۳)

جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔

صبر: اسی طرح ’’صبر‘‘ باطنی فضائل میں سے ہے جس کے معنی ہیں ’’طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنے پر نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور ثابت قدم رکھنا‘‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اس صبر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، قرآن حکیم میں آپ کو ہدایت کی گئی کہ:

’’فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ‘‘. (سورۃ الاحقاف:۳۵)

تو آپ (ویسا ہی) صبر کیجئے جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا تھا۔

مسلمانوں کو بتایا گیا کہ:

’’وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ‘‘. (سورۃ النحل:۱۲۶)

صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے۔

اور حکم کے ساتھ بشارت دی گئی ہے:

’’وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ‘‘. (سورۃ الانفال:۴۶)

اور صبر کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

جنت کی نعمت عظمیٰ بھی صبر کرنے والوں ہی کا حصہ ہے، ارشاد ہے:

’’اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ‘‘. (سورۃ آل

عمران:۱۴۲)

کیاتم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہوگے؟ حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کو(آزما کر) نہیں دیکھا، جنھوں نے خوب جہاد کیا ہو اور جو صبر کرنے والے ہوں۔

یہ صرف چار فضائل کے متعلق آیات قرآنیہ کی چند مثالیں ہیں، تمام آیات واحادیث جمع کی جائیں تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے، ان مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے کہ شرعی فرائض صرف ظاہری اعمال میں منحصر نہیں، فضائل کا حاصل کرنا بھی نماز روزہ وغیرہ کی طرح فرض ہے، بلکہ خود نماز، روزہ وغیرہ بھی ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔

رذائل:

رذائل وہ ناپاک باطنی اخلاق واعمال ہیں جن کو قرآن وسنت میں حرام قرار دیا گیا ہے، ان کی بھی یہاں فہرست دینا نہ ممکن ہے نہ مقصود، چند مثالیں یہ ہیں۔

تکبر کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ:

''اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ''.(۱) بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اور جسے اللہ پسند نہ کرے اس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہاں ہوگا؟ چنانچہ ارشاد ہے:

''أَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ''. (سورۃ الزمر:۶۰) کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟

شافع محشر رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ:

''لایدخل الجنة من كان فی قلبه مثقال ذرة من كبر''.(۲)

جس شخص کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

ریا:

ایسا خطرناک باطنی رذیل ہے کہ وہ انسان کی بہتر سے بہتر عبادت کو تباہ کرتا بلکہ الٹا عذاب میں گرفتار کرا کے چھوڑتا ہے۔قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ:

''فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ، الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ''. (سورۃ الماعون:۴-۶)

بڑا عذاب ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے ریا کو''چھوٹی قسم کا شرک'' قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

---

(۱) سورۃالنحل:۲۳۔

(۲) مسلم شریف، کتاب الإیمان، باب تحریم الكبر وبیانه:۶۵/۱۔

”إن أخوف ما أخاف عليكم الشرك الأصغر،قالوا:وماالشرك الأصغريارسول الله؟ قال: الرياء يقول الله عزوجل يوم القيامة إذاجازى العباد بأعمالهم:إذهبوا إلى الذين كنتم تراء ون فى الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم الجزاء“.(۱)

تمہارے متعلق جن چیزوں کا مجھے ڈر ہے ان میں سب سے زیادہ خوفناک ”چھوٹا شرک“ ہے صحابہؓ نے دریافت کیا ”چھوٹا شرک“ کیا ہے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: ریا، قیامت کے دن جب اللہ عزوجل اپنے بندوں کوان کے کاموں کا ثواب عطا فرمائے گا تو دکھاوے کے لئے کام کرنے والوں سے فرمائے گا کہ: جاؤان لوگوں کے پاس جنھیں دکھانے کے لئے تم دنیا میں کام کرتے تھے، اور دیکھواس سے تمہیں ثواب ملتا ہے یا نہیں۔

حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ نے شرح احیاء العلوم میں کہا ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔(۲)

حسد:

وہ باطنی بیماری ہے کہ اس کا بیمار دنیا میں تو چین پاتا ہی نہیں، اس کی آخرت بھی برباد ہوکر رہتی ہے، قرآن شریف کے بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا، اور یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین پر کیا گیا(۳) کیونکہ آسمان پر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، اور زمین پر سب سے پہلا قتل جو قابیل نے ہابیل کا کیا تھا وہ بھی اسی حسد کا شاخسانہ تھا۔ حاسد کا شر اتنا خطرناک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی کہ آپ اس کے شر سے پناہ مانگیں:

”وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ“. (سورۃ الفلق:۵) اورآپ کہئے کہ میں پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کے شر سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ:

”إياكم والحسد فإن الحسد يأكل الحسنات كما تأكل النارالحطب“.(۴)

تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کواس طرح کھاجاتا (برباد کردیتا) ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاجاتی ہے۔

بخل:

اسی طرح بخل باطن کی وہ رذیل خصلت ہے جو انسان کو ہر مالی ایثار وقربانی سے روکتی ہے، اس باطنی بیماری کا ذکر قرآن حکیم نے ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو کافروں کا خاصہ ہیں، ارشاد ہے:

”وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى، وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى، وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ

---

(۱) مسند أحمد، طبرانی، بیهقی فی شعب الإیمان۔

(۲) دیکھئے: إحیاء العلوم مع الشرح: ج۳ص۲۵۴۔

(۳) إحیاء العلوم: ج۳۔

(۴) أبو داؤد، کتاب الأدب، باب فی الحسد: ج۲ص۶۷۲، أصح المطابع۔

اِذَا تَرَدّٰی"۔ (سورۃ اللیل: ۸۔۱۱)

اور جس نے بخل کیا، اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، ہم اس کو رفتہ رفتہ سختی میں پہنچا دیں گے، اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا جب وہ (جہنم) کے گڑھے میں گرے گا۔

جس شخص کا بخل اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ شریعت نے جو مالی واجبات اس کے ذمہ کئے ہیں ان کی ادائیگی سے بھی محروم ہو جائے، اس کے لئے قرآن حکیم میں سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

"وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ"۔ (۱)

جو لوگ ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے، ان لوگوں کو قیامت کے دن ان کے مال کا (سانپ بنا کر) طوق پہنایا جائے گا، جس میں انہوں نے بخل کیا تھا۔

بخل کا بیمار دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ در حقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے، اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

"فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ"۔ (سورۃ محمد: ۳۸)

پس تم میں سے بعض وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔

بخل ہی کے بدترین درجہ کا نام "شح" ہے، قرآن پاک نے بتایا کہ فلاح و کامیابی انہی لوگوں کا مقدر ہے جو "شح" سے محفوظ ہوں:

"وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"۔ (سورۃ الحشر: ۹)

اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تصوف اور علم تصوف کی اصطلاحی تعریف:

غرض "فضائل" اور "رذائل" کی ایک طویل فہرست ہے، تمام باطنی خصلتوں کا الگ الگ بیان، ہر ایک کی حقیقت و ماہیت اس کے اسباب و علامات، فضائل حاصل کرنے کے طریقے اور رذائل سے چھٹکارا پانے کی تدابیر، یہ تفصیلات تو تصوف کی کتابوں (۲) اور صوفیاء کرام کی مجلسوں میں ملیں گی، یہاں ان مثالوں سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جس

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۸۰۔

(۲) مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی "إحیاء العلوم، جلد ثالث"، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "التشرف" اور "تعلیم الدین" اور "روح تصوف" و "قصد السبیل" وغیرہ۔

طرح ظاہر کے کچھ اعمال فرض عین اور کچھ حرام ہیں اسی طرح باطن کے اعمال میں بھی کچھ فرض عین ہیں، اور کچھ حرام، اور ان باطنی فرائض پر عمل کرنا اور باطن کی حرام خصلتوں سے اجتناب کرنا ہی تصوف ہے، چنانچہ علم تصوف کی اصطلاحی تعریف جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ(۱) نے تفصیل سے بیان کی ہے، اس کا جامع مانع خلاصہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ:

''هو علم يعرف به أنواع الفضائل و كيفية اكتسابها وأنواع الرذائل و كيفية اجتنابها''. (۲)

تصوف وہ علم ہے جس سے اخلاق حمیدہ کی قسمیں اور ان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اخلاق رذیلہ کی قسمیں اور ان سے بچنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

'فقہ' کی طرح 'علم تصوف' کا بھی ایک حصہ 'فرض عین' اور پورا علم حاصل کرنا 'فرض کفایہ' ہے:

جس طرح ہر مرد و عورت پر اپنے اپنے حالات و مشاغل کی حد تک ان کے فقہی مسائل جاننا فرض ہے اور پورے فقہ کے مسائل میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا اور مفتی بننا سب پر فرض نہیں بلکہ کفایہ ہے۔(۳) اسی طرح جو اخلاق حمیدہ کسی میں موجود نہیں انہیں حاصل کرنا اور جو رذائل اس کے نفس میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بچنا، تصوف کے جتنے علم پر موقوف ہے اس کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے(۴) اور پورے علم تصوف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا کہ دوسروں کی تربیت بھی کر سکے، یہ فرض کفایہ ہے۔

صوفی و مرشد:

جس طرح فقہ کے ماہر کو ''فقیہ، مفتی'' اور ''مجتہد'' کہتے ہیں اسی طرح تصوف و سلوک کے ماہر کو ''صوفی، شیخ، مرشد'' اور عام زبان میں ''پیر'' کہا جاتا ہے، جس طرح قرآن و سنت سے فقہی مسائل و احکام نکالنا اور حسب حال شرعی حکم معلوم کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں، بلکہ رہنمائی کے لئے استاذ یا ''فقیہ اور مفتی'' کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اسی طرح باطنی اخلاق کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنا ایک نازک اور قدرے مشکل کام ہے جس میں بسا اوقات

---

(۱) دیکھئے: إحياء العلوم، ج اول، ص ۱۹ (مطبوعہ مصر)

(۲) ردالمحتار مع الدر المختار: ج اول، ص ۴۰۔

(۳) فرض کی دو قسمیں ہیں؛ فرض عین اور فرض کفایہ، فرض عین: اس فرض کو کہا جاتا ہے جس کا ادا کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر ضروری ہے، بعض مسلمانوں کے کر لینے سے باقی مسلمان سبکدوش نہیں ہوتے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، اور فرض کفایہ: وہ فرض ہے جو بعض لوگوں کے بقدر ضرورت ادا کرنے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، جیسے مسلمان میت کے کفن دفن کا انتظام، نماز جنازہ اور جہاد وغیرہ، پورے فقہ اور پورے علم تصوف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا بھی فرض کفایہ ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہو جو وہاں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شرعی مسائل بتائے اور ان کے تزکیۂ اخلاق کا کام بقدر ضرورت کر سکے تو اس بستی کے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر اس شہر میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگوں پر فرض ہے کہ ایسا عالم اپنے یہاں تیار کریں یا کہیں اور سے بلا کر رکھیں، ورنہ سب اہل شہر گنہگار ہوں گے (تفسیر معارف القرآن؛ ج ۴ ص ۴۸۷ تا ۴۹۰)

(۴) ردالمحتار مع الدر المختار: ج اول، ص ۴۰، و تفسیر معارف القرآن: سورۂ توبہ، آیت ۱۲۲، ج ۴ ص ۴۹۰۔

مجاہدوں، ریاضتوں اور طرح طرح کے نفسیاتی علاجوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور کسی ماہر کی رہنمائی کے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا، اس نفسیاتی علاج اور رہنمائی کا فریضہ ''شیخ ومرشد'' انجام دیتا ہے۔

اسی لئے ہر عاقل و بالغ مرد وعورت کو اپنے تزکیۂ اخلاق کے لئے ایسے شیخ ومرشد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو قرآن و سنت کا متبع ہو، اور باطنی اخلاق کی تربیت کسی ''مستند شیخ'' کی صحبت میں رہ کر حاصل کر چکا ہو۔(۱)

''بیعت'' سنت ہے، فرض و واجب نہیں:

''بیعت'' کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مرشد اور اس کے شاگرد (مرید) کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، مرشد یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گذارنا سکھائے گا اور مرید وعدہ کرتا ہے کہ مرشد جو بتائے گا اس پر عمل ضرور کرے گا، یہ بیعت فرض و واجب تو نہیں، اس کے بغیر بھی مرشد کی رہنمائی میں اصلاح نفس کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے، لیکن بیعت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی سنت ہے اور معاہدہ کی وجہ سے فریقین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی قوی رہتا ہے، اس لیے بیعت سے اس مقصد کے حصول میں بہت برکت اور آسانی ہو جاتی ہے۔

''کشف وکرامات'' مقصود نہیں:

جب اصلاح نفس کا مقصد ضروری حد تک حاصل ہوجاتا ہے، یعنی اپنے ظاہری اور باطنی اعمال قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی زندگی کے ہر ہر گوشہ میں ہونے لگتی ہے، تو ایسے بعض لوگوں پر بعض حالات میں کشف والہام اور کرامات کا ظہور بھی ہوجاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے، جیسا کہ متعدد صحابۂ کرامؓ اور اولیاء اللہؒ کے واقعات معروف ہیں، مگر یہ کشف وکرامات نہ فقہ کا مقصود ہیں نہ تصوف کا، نہ ان پر دین کا کمال موقوف ہے نہ علم دین کا، بلکہ بعض پوشیدہ یا آئندہ پیش آنے والی باتیں معلوم ہوجانا یا عجیب وغریب واقعات کا پیش آجانا تو کمال دین کی دلیل بھی نہیں، کیونکہ اس قسم کی چیزیں تو مشق کرنے سے بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی پیش آجاتی ہیں جو دین کے پابند نہ ہوں، مسمریزم اور جادو کرنے والوں کی شعبدہ بازیاں بھی دیکھنے میں تو عجیب وغریب ہی ہوتی ہیں، مگر ان کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، خلاصہ یہ کہ کشف وکرامات شعبدہ بازی نہیں ہوتی، بلکہ محض اللہ جل شانہ کا عطیہ ہے جو وہ اپنے کسی نیک بندے کو بعض حالات میں دیدیتا ہے، مگر یہ تصوف کا مقصود نہیں اور دین کا کوئی کمال اس پر موقوف نہیں۔

---

(۱) شیخ میں کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اس کے لئے ملاحظہ فرمایئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا رسالہ ''قصد السبیل''، ہدایت سوم ص ۵۔

مقصود صرف ''اتباع شریعت''اور''اللہ کی رضا'' ہے:

دین کا کمال تو اپنے ظاہر و باطن میں شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے میں ہے،اسی سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور یہی فقہ اور تصوف کا حاصل و مقصود ہے، یہ مقصود نہ فقہ پر عمل کے بغیر حاصل ہوسکتا ہے نہ تصوف کے بغیر،تصوف کا مقصود نہ بیعت ہے نہ ریاضتیں اور مجاہدے ہیں اور نہ کشف و کرامات ، بیعت اور مجاہدے مقصود حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔اور کشف و کرامات،مقصود حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف سے ایک قسم کا مزید انعام ہے، کسی کو یہ انعام ملتا ہے کسی کو کسی اور انعام سے نواز دیا جاتا ہے، بالفرض جسے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بغیر ہی اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح نصیب ہو جائے اور زندگی بھر ایک بار بھی سچا خواب نظر نہ آئے، نہ کسی کشف و کرامت کا ظہور ہو اس کے بھی ولی اللہ اور مومن کامل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس سے کشف و کرامت کا ظہور ہوتا ہو وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ کامل و افضل ہو۔ مدار کمال و افضیلت تو صرف اور صرف تقویٰ پر ہے جس میں زیادہ تقویٰ ہے وہی زیادہ افضل اور اللہ عزوجل کا زیادہ مقرب ہے،قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ:

''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ''. (سورۃ الحجرات:۱۳)

اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا اشریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

تصوف کی حقیقت جو ان صفحات میں بیان کی گئی،تصوف کی تمام مستند کتابیں اسی اجمال کی تفصیل ہیں،تمام فقہا اور صوفیاء کرام اسی کی تعلیم و تربیت کرتے رہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اسی تصوف اور اسی فقہ پر عمل کا نمونہ ہے،اور یہی ایمان کے بعد قرآن و سنت کی تعلیمات کا حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں افراط و تفریط اور گمراہیاں:

فقہ اور تصوف کی جو حقیقت پچھلے صفحات میں بیان ہوئی اور ان میں جو گہرا ربط قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے اتنا صاف اور واضح ہے کہ امت کے تمام مفسرین و محدثین اور تمام صوفیا و عارفین کا اس پر اجماع و اتفاق چلا آرہا ہے،جس نے قرآن و سنت یا فقہ و تصوف کا مطالعہ کیا ہو اس کے لئے اس میں کسی شبہ یا تردد کی گنجائش نہیں۔

مگر نہ جانے کیوں فقہ اور تصوف کے سلسلہ میں مسلمانوں کا خاصا بڑا طبقہ افراط و تفریط بلکہ طرح طرح کی گمراہیوں کا شکار ہو گیا،ان لوگوں نے فقہ اور تصوف کو سمجھے بغیر ان کے بارے میں عجیب و غریب مزعومات قائم کر لئے جنہیں صرف فقہ کی کتابیں ہاتھ لگیں مگر نہ علما و صلحا کی تعلیم و تربیت ملی ، نہ تصوف کی مستند کتابوں تک رسائی ہوئی ، بلکہ جاہل مدعیان تصوف کی خود ساختہ غلط روش دیکھ کر اس کو تصوف سمجھ بیٹھے انہوں نے دین اور احکام دین کو صرف فقہ میں منحصر کر کے سرے سے تصوف ہی سے بیزاری اختیار کر لی ،اور تصوف کو دین سے خارج بلکہ الحاد و زندقہ قرار دیدیا یہ ایک شدید گمراہی ہے جو خاصے بڑے طبقہ میں پائی جاتی ہے۔

ایک اور گمراہی اس سے کم درجہ کی ہے مگر اس لحاظ سے نہایت تشویشناک ہے کہ وہ علم دین کے بعض طلبہ بلکہ بعض نام نہاد اہل علم میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے تصوف کو دین سے خارج تو نہیں سمجھا، مگر نہ جانے کیوں کر یہ خیال کر بیٹھے کہ اس کا حاصل کرنا محض مباح یا مستحب ہے، شرعاً فرض وواجب نہیں، اصلاح باطن بھی ہوگئی تو جنت میں درجات بڑھ جائیں گے نہ ہوئی تو جنت میں جانے کے لئے ظاہری اعمال کافی ہیں۔

دوسری طرف جاہل مدعیان تصوف کی گرم بازاری ہے، جنھوں نے تصوف وطریقت کی اہمیت کو تو تسلیم کیا مگر اس کی حقیقت کو گم کرڈالا، کسی نے کہا ''طریقت اور ہے شریعت اور، فلاں بات اگرچہ شرع میں ناجائز ہے مگر فقیری میں جائز ہے''۔ ان لوگوں نے تصوف کو ''راز سینہ بسینہ'' قرار دے کر اس ''من گھڑت راز'' کی بنیاد پر دین کے کتنے ہی حرام کاموں کو حلال کرڈالا اور دین وتصوف کے نام پر الحاد و بے دینی کے شکار ہوگئے۔

کسی نے تعویذ گنڈوں کا اور کسی نے مریدوں سے نذرانے وصول کرنے کا نام تصوف رکھ لیا، کسی نے پیر صاحب سے بیعت ہونے ہی کو جنت کا پروانہ سمجھا، اور اصلاح نفس واعمال سے غافل ہوکر مطمئن ہوگئے، کہ ''پیر صاحب بخشش کرادیں گے''، کسی نے دل کی خاص قسم کی دھڑکنوں کو اور کسی نے ''غیب کی باتیں'' بتلانے کو تصوف کا کمال سمجھ لیا، کسی نے صرف تسبیحات ووظائف اور نوافل کو تصوف وطریقت کا نام دے لیا، اور ظاہر وباطن کی اصلاح سے بے فکر ہوکر کتنے ہی فرائض اور حقوق العباد کو پامال کرڈالا کسی نے مجاہدوں، ریاضتوں، چلہ کشی، رہبانیت اور ترک دنیا کو طریقت وسلوک کی معراج قرار دے کر بال بچوں، ماں باپ اور اعزہ واقارب سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور جنگلوں اور غاروں میں زندگی گذارنے ہی کو دین کا مقصود سمجھ بیٹھے۔

غرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی گمراہیاں تصوف اور فقہ کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، انتہا پسندی کا دور دورہ ہے، ایک جانب افراط ہے دوسری جانب تفریط اور رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین افراط وتفریط کے بیچوں بیچ راہ اعتدال ہے، وہ ترک دنیا کو دین نہیں کہتا، بلکہ دنیا کے تمام کاروبار کو شریعت کے قالب میں ڈھال کر تصوف کی راہ سے کار ثواب بنادینا چاہتا ہے، وہ شریعت وطریقت کے تضاد کو نہیں مانتا، بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہے، شریعت جسم ہے تو طریقت اس کی روح، تصوف فقہ کے بغیر ناکارہ ہے اور فقہ تصوف کے بغیر بے جان، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ:

''شریعت بغیر طریقت کے نرا فلسفہ ہے، اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ والحاد''۔(۱)

مشہور مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو بڑے درجہ کے صوفی بھی ہیں، فرماتے ہیں کہ:

''جس شخص کا ظاہر پاک نہ ہو اس کا باطن پاک ہو ہی نہیں ہوسکتا''۔

(۱) تسھیل قصد السبیل: ص۸۔

چھٹی صدی ہجری کے تصوف کے مشہور امام شیخ عبدالقادر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (یہی بانیٔ سلسلۂ سہروردیہ ہیں) نے حضرت سہل بن عبداللہ کا یہ ارشاد اپنی کتاب میں نقل فرمایا ہے کہ:

''کل وجد لایشهد له الکتاب والسنة فباطل''.(۱)

جس وجدی کیفیت کی کوئی شہادت قرآن وسنت میں موجود نہ ہو وہ باطل ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کے برملا اظہار کے لئے ہمیں فقہ کے تعارف میں تصوف کا تعارف بھی خاصی تفصیل سے کرانا پڑا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو افراط وتفریط کی بھول بھلیاں سے محفوظ و مامون فرمائے، اور قرآن وسنت کی صراط مستقیم پر گامزن فرما کر جنت کی لازوال نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ (آمین) (۲)

آمدم برسر مطلب:

اب ہم اپنے اصل موضوع ''فقہ'' کی جانب لوٹتے ہیں، فقہ کی تعریف پیچھے ضروری تفصیل کے ساتھ سامنے آچکی ہے، جس کا حاصل متأخرین کی اصطلاح کی رو سے یہ ہے کہ:

''انسان کے ظاہری اعضا سے کئے جانے والے ہر کام کے متعلق قرآن وسنت اجماع یا قیاس کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ، یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا مباح یا حرام یا مکروہ''۔

موضوع بھی پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ ''انسان کے ظاہری اعمال'' فقہ کا موضوع'' ہیں۔

---

(۱) عوارف المعارف برحاشیہ إحياء العلوم: ج اول، ص ۲۸۰، مطبوعہ مصر۔

(۲) (تصوف سے متعلق علما کی تصانیف: تصوف کے ایسے ائمہ جو شریعت وطریقت کے جامع اور فقہ، حدیث وقرآن کے شناور رہے ہیں ان میں سے چند کی مندرجہ ذیل اہم کتابیں یہ ہیں:

۱) الرسالۃ القشیریۃ، شیخ ابوالقاسم عبدالکریم القشیریؒ المتوفی ۴۶۵ھ۔
۲) شرح الرسالۃ القشیریۃ، شیخ الاسلام زکریا الانصاریؒ
۳) فتوح الغیب، شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ المتوفی ۵۶۱ھ
۴) شرح فتوح الغیب، شیخ عبدالحق المحدث الدہلویؒ المتوفی ۱۰۵۲ھ
۵) احیاء علوم الدین، ابوحامد محمد بن محمد الغزالیؒ المتوفی ۵۰۵ھ
۶) نتائج الافکار القدسیۃ، سید مصطفیٰ العروشیؒ
۷) عوارف المعارف، شیخ عبدالقادر السہروردیؒ
۸) الانوار القدسیۃ فی بیان اعباد العبودیۃ، الامام الاشعرانیؒ
۹) مکتوبات صدی، حضرت مولانا شرف الدین یحییٰ منیریؒ
۱۰) مکتوبات مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ
۱۱) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ المحدث الدہلویؒ
۱۲) رسائل، شاہ ولی اللہ المحدث الدہلویؒ
۱۳) ذخیرۃ الملوک، مولانا سید کبیر علی ہمدانیؒ
۱۴) فیوض رحمانی، مولانا محمد علی مونگیریؒ
۱۵) ارشاد رحمانی، مولانا محمد علی مونگیریؒ
۱۶) التشرف، مولانا اشرف علی التھانویؒ
۱۷) قصد السبیل، مولانا اشرف علی التھانویؒ
۱۸) تسہیل قصد السبیل، مولانا اشرف علی التھانویؒ
۱۹) روح تصوف، مولانا اشرف علی التھانویؒ
۲۰) انفاس عیسیٰ، مولانا اشرف علی التھانویؒ
۲۱) سلوک سلیمان، مولانا اشرف علی خانؒ
۲۲) تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ
۲۳) قرآن اور تصوف، ڈاکٹر ولی الدین
۲۴) تصوف کیا ہے؟ مولانا محمد منظور نعمانیؒ
۲۵) ذکر الٰہی، مولانا مسیح اللہ خانؒ
۲۶) شریعت وتصوف، مولانا شاہ مسیح اللہؒ۔ (انیس)

فقہ کے مآخذ یعنی احکام شرعیہ کے دلائل:

فقہ کی تعریف کے ذیل میں کئی ورق پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ احکام شرعیہ کے دلائل صرف چار ہیں، قرآن وسنت، اجماع وقیاس، تمام شرعی احکام انہی میں سے کسی نہ کسی دلیل سے حاصل کئے جاتے ہیں، اسی لئے ان کو ''فقہ کے مآخذ'' بھی کہا جاتا ہے، یہاں ان چاروں مآخذ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔(۱)

---

(۱) **مصادر شرع اسلامی:**

ائمۂ مجتہدین نے اجتہاد کے پختہ اور منضبط اصول وضع کئے ہیں اور انہوں نے بحث ونظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جہاں اپنے بعد آنے والوں کے لیے رہ نمائی کے نقوش ثبت نہ کر دیئے ہوں اس سلسلہ میں پہلی بحث یہ ہے کہ قانون کا سرچشمہ کیا ہے؟ اسلام جس عقیدہ کی دعوت دیتا ہے وہ ہے ''عقیدۂ توحید''۔ یعنی اللہ رب العالمین پر ایمان جو سارے جہاں کا خالق و مالک ہے وہی صاحب امر ہے اسی کا حکم ''حکم'' ہے۔

''اَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ''. (سورۃ الأعراف: ۵۴) ''اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰهِ''. (سورۃ یوسف: ۴۰)

اس کا حکم واجب الاطاعت ہے وہی بندوں کے مصالح کو جانتا ہے ان کی کمزوریوں کو جانتا ہے نہ انہیں سدیٰ (بیکار۔ آزاد، جس پر کوئی ذمہ داری نہ ہو) بنا کر پیدا کیا ہے اور نہ ایسے احکام کا انہیں پابند کرتا ہے جو ان کے بس سے باہر ہوں۔

''اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدیً''. (سورۃ القیامۃ: ۳۶) ''لاَ یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَهَا''. (سورۃ البقرۃ: ۲۸۶)

پس قانون کا اصل مصدر اور اس کا حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہونچانے والے رسول ہیں اور رسول تک حکم الٰہی ملائکہ کے ذریعہ پہنچا یہی حکم الٰہی جو رسول کے ذریعہ ہم تک پہنچا، یا تو کلام اللہ ہے جو بصورت قرآن کریم بطریقۂ تواتر ہم تک پہنچا، یا منطوق رسول ہے جو احادیث کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے، احادیث رسول بھی وحی الٰہی کا ایک حصہ ہیں اگرچہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔ حجت، دین کے باب میں دونوں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ قرآن کی نقل بطریقۂ تواتر ہے جو ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے اور علم قطعی کو موجب ہے۔ حدیث اس حیثیت سے کہ ارشاد رسول ہے حجت قطعی ہے البتہ رسول سے ہم تک پہنچنے میں جو درمیانی وسائط ہیں ان کی وجہ سے احادیث کا ثبوت اس درجہ قطعی نہیں رہتا، جس درجہ کی قطعیت قرآن کو حاصل ہے اسی لیے کتاب اللہ سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے اور احادیث سے علم ظنی اسی لیے کتاب اللہ اور سنت رسول کے حجت اور مصدر شریعت ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ (بحوالہ اسلامی عدالت، مصنفہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: ۸۵،۸۶۔ انیس)

قرآن حکیم

قرآن حکیم کے نام یوں تو بعض علماء کرام نے نوے سے بھی اوپر بتائے ہیں (۱) مگر مشہور نام جو خود قرآن نے بتائے، پانچ ہیں:

''القرآن، الفرقان، الکتاب، الذکر، التنزیل'' . ان میں بھی سب سے زیادہ مشہور نام ''القرآن'' ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو کم از کم اکسٹھ مقامات پر اسی نام سے یاد کیا ہے، مگر اصول فقہ کی کتابوں میں جس نام کا زیادہ استعمال ہوا وہ ''الکتاب'' ہے۔

جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن نے سورۂ فاتحہ کے بعد سب سے پہلی سورت کے بالکل شروع میں اپنا یہی نام بتایا ہے، ارشاد ہے:

''ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ''. (سورۃ البقرۃ:۲) یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

قرآن حکیم اس کائنات کی مشہور ترین کتاب ہونے کے باعث درحقیقت کسی تعارف کا محتاج نہیں، مگر علماء اصول فقہ جن کا منصب ہی یہ ہے کہ جو بات بھی فقہ کے دلائل سے متعلق ہو اسے قاعدہ ضابطہ میں لے آئیں جو بات کہیں، بچی تلی ہو، انہوں نے قرآن حکیم جیسی بدیہی کتاب کی بھی تعریف کی ہے، تعریف بیان کر دینے میں بعض مصلحتیں ان کے پیش نظر تھیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں فائدہ نہیں، بہرحال قرآن حکیم کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

''قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظ بہ لفظ نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا اور آپ سے بغیر کسی شبہ کے تواتر کیساتھ منقول ہے''۔(۲)

وحی کی دو قسمیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھیجی گئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو یہی قرآن حکیم جس کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہیں یعنی جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی

---

(۱) مناھل العرفان فی علوم القرآن للزرقانی: ج اول، ص۸، مطبوعہ مصر۔

(۲) التلویح مع التوضیح: ج اول، ص۲۶، مطبوعہ مصر۔

بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، الفاظ کے انتخاب، ترکیب، یا اسلوب وانشاء میں یہ ''وحی متلوّ'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، وحی کی یہ قسم پوری کی پوری حفاظ قرآن کے سینوں میں اور قرآنی مصاحف میں ہمیشہ کیلئے اس طرح محفوظ کردی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بلکہ کوئی نقطہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے۔

دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن پاک کا جز بنا کر نازل نہیں کی گئی، اس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی تعلیمات اور شریعت کے احکام اس طرح بتائے گئے ہیں کہ آپ کے قلب مبارک پر صرف معانی ومضامین کا القاء ہوتا تھا، الفاظ اس کے ساتھ نہ ہوتے تھے، ان معانی ومضامین کو آپ نے صحابۂ کرام کے سامنے کبھی اپنے الفاظ سے کبھی اپنے افعال سے اور کبھی دونوں سے بیان فرمایا، وحی کی اس قسم کا نام وحی غیر متلو ہے یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اسی وحی کو ''حدیث اور سنت'' کہا جاتا ہے، جس کا مفصل تعارف آگے آرہا ہے۔

تواتر:

''تواتر'' کسی خبر کے اس طرح پے درپے ہونے کو کہتے ہیں کہ جب سے وہ خبر وجود میں آئی اس وقت سے اسے ہر زمانے میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد بلا اختلاف نقل کرتی چلی آتی ہو کہ عقل یہ باور نہ کرے کہ ان سب نے سازش کرکے جھوٹ بولا ہوگا یا سب کو مغالطہ لگ گیا ہوگا، جو خبر اس طرح سے تواتر کے ساتھ منقول ہو اسے ''متواتر'' کہتے ہیں۔(۱) ایسی خبر دنیا کے تمام قابل ذکر اہل عقل اور ادیان ومذاہب کے نزدیک ہمیشہ قطعی اور ہر شک وشبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے اس سے ایسا ہی یقین حاصل ہوتا ہے جیسا مشاہدہ سے ہوتا ہے، ہم نے شہر نیویارک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر امریکہ کے اس شہر کا ذکر اور اس کی متفرق تفصیلات اتنی بے شمار انسانوں سے سنی ہیں کہ عقل یہ باور نہیں کرسکتی کہ نیویارک، امریکہ کا کوئی شہر ہی نہ ہو اور جتنے لوگوں نے، اخبارات اور رسائل نے ہمیں اس کے حالات بتائے ان سب نے سازش کرکے متفقہ طور پر جھوٹ بولا ہو یا سب ہی کو مغالطہ لگ گیا ہو اور وہ پاکستان کے کسی گاؤں کو امریکہ کا عظیم شہر نیویارک سمجھ بیٹھے ہوں یہ تواتر ہی ہے جس کی بناپر ہم نیویارک کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر امریکہ کا بڑا شہر یقین کرنے پر مجبور ہیں، اس یقین کو اگر ہم اپنے ذہن اور حافظہ سے کھرچنے کی کتنی بھی کوشش کریں تو ظاہر ہے کہ بے سود ہوگی۔

تواتر کی یہی وہ قوت ہے جسے اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے اور ''خبر متواتر'' کے ثبوت کو ہر قسم کے جھوٹ اور بھول چوک کے شبہ سے بالاتر قرار دیا ہے، قرآن کریم بھی حرف تواتر ہی کیساتھ منقول ہے، بلکہ اس کے تواتر کا تو یہ حال ہے کہ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ''اللہ کا کلام'' بتا کر امت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے اب تک اسے جوں کا توں نقل کرنے والوں اور حفظ کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہر زمانہ میں رہی ہے کہ کسی بھی زمانہ میں ان

(۱) مقدمہ فتح الملہم: ج اول، ص ۵، بحوالہ فخر الاسلام بزدوی وعلامہ جزائری۔

کوشمار نہیں کیا جاسکا، ایک نسل دوسری نسل کو اور دوسری تیسری کو اللہ کا یہ پیغام حرف بہ حرف پہونچاتی رہی اور قیامت تک پہونچاتی رہے گی۔(۱)

---

(۱) امداد الاحکام جلد اول صفحہ: ابتدا تا ۵۴۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ "اسلامی عدالت"، ص ۸۶، میں لکھتے ہیں:

کتاب اللہ اولین مصدر قانون اور سرچشمۂ احکام ہے قرآن نظم ومعنی کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ بذریعہ نقل متواتر ہم تک پہنچا ہے۔

"اعلم بأن الكتاب هو القرآن المنزل علىٰ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم المكتوب في دفات المصاحف المنقول إلينا على الأحرف السبعة نقلاً متواتراً". (أصول السرخسي: ۲۷۹/۱)

جاننا چاہیے کہ "الکتاب" وہ قرآن ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے جو احرف سبعہ پر بطریقۂ تواتر ہم تک نقل ہوکر پہنچا ہے۔

اسی لیے قراءت شاذّہ مثلاً قراءت عبداللہ بن مسعودؓ کو عین قرآن قرار نہیں دیا جاسکتا ہے البتہ امام ابوحنیفہؒ اس قراءت کو وضاحت وبیان اور خبر رسول قرار دے کر مفید علم ظنی تسلیم کرتے ہیں۔

"نحن ما أثبتنا بقراءة ابن مسعودؓ كون تلك الزيادة قرآناً وإنا جعلنا ذلك بمنزلة خبر رواه عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لعلمنا أنه ماقرأ بها إلا سماعاً من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وخبره مقبول في وجوب العمل به". (اصول السرخسی: ۲۸۱/۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں جو زائد کلمات ہیں ہم انہیں قرآن نہیں قرار دیتے بلکہ ان کو ان اخبار کا درجہ دیتے ہیں جن کی روایت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں اس لیے کہ ہمیں اس کا علم ہے کہ انہوں نے حضور سے سن کر ہی ان زائد کلمات کو پڑھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وجوب عمل کے باب میں منقول ہے۔

مثلاً آیت قرآن "اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ". (سورة الطلاق: ٦) میں مطلقہ کے لیے سکنی کا حکم دیا گیا ہے امام ابوحنیفہؒ قراءت عبداللہؓ بن مسعود "وأن أنفقوا عليهن من وجدكم" کی وجہ سے سکنیٰ کے ساتھ ساتھ نفقہ کے وجوب کے بھی قائل ہیں، اسی طرح کفارۂ یمین میں تین روزہ کے مسلسل رکھنے کی قید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت "فصيام ثلثة أيام متتابعات" کی روشنی میں لگاتے ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ کی طرف علی العموم یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ان قراءتوں کو سرے سے حجت ہی تسلیم نہیں کرتے ہیں، لیکن تحقیق یہی ہے کہ وہ بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرح ان اضافات کی قرآنیت کے منکر ہیں لیکن جیسے امام ابوحنیفہؒ اسے حجت ظنی تسلیم کرتے ہیں اسی طرح امام شافعیؒ بھی اس کے حجت ظنی ہونے کے قائل ہیں۔ علامہ ابن ہمامؒ نے تحریر الاصول میں لکھا ہے:

"(لاجرم أن) القول (المحرر) أي المستقيم المروي (عنه) أي الشافعيؒ (كقولنا بصريح لفظه) قال: ذكر اللّٰه الأخوات من الرضاع بلا توقيت، ثم وقتت عائشةؓ الخمس وأخبرت أنه مما أنزل من القرآن فهو وإن لم يكن قرآناً يقرء فأقل حالاته أن يكون عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فهذا عين قولنا وعليه جمهور أصحابنا كما نقله الأسنويؒ وغيره حتى احتجوا بقراءة ابن مسعودؓ. فأقطعوا أيمانهما. علىٰ قطع اليمنىٰ". (تیسیر التحریر لمحمد أمین المعروف بامیر بادشاہ علیٰ کتاب التحریر۔ ج ۳ ص ۹۔۱۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام شافعیؒ سے مروی صحیح قول وہی ہے جو ہم لوگوں کا ہے۔ جس پر خود ان کی صریح عبارت دلیل ہے۔ امام شافعیؒ مسئلۂ رضاعت کے بیان میں فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے رضاعی بہنوں کی حرمت بیان فرمائی لیکن حرمت کے لیے کسی خاص مقدار کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس مقدار کو یہ کہہ کر واضح کیا کہ وہ پانچ گھونٹ ہے۔ حضرت عائشہؓ نے خبر دی کہ یہ "خمس رضعات" قرآن کا حصہ ہے جو نازل کیا گیا۔ پس یہ اضافہ اگر چہ قرآن نہیں لیکن کم سے کم اتنی بات تو ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ پس امام شافعیؒ کا یہ قول بعینہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ اور اسی پر ہمارے جمہور اصحاب ہیں جیسا کہ اسنویؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان حضرات نے عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت فاقطعوا أيمانهما سے چوری کی سزا میں داہنے ہاتھ کے کاٹنے پر استدلال کیا ہے۔(اسلامی عدالت از قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: ۸۶ تا ۸۸۔ انیس) ==

قرآن فہمی کا طریقہ

(۱) یوں تو قرآن کریم کا پڑھنا، پڑھانا اور اسے سمجھنا آسان اور سہل ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن کریم نوع انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر نازل یہ دائمی معجزہ ہے جس نے اپنے نزول کے ساتھ ہی دنیا کے رخ کو تبدیل کر دیا، اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے سمجھنے کے راستہ کو واضح کیا جائے۔

قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ''**القرآن یفسر بعضه بعضاً**''. قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی وضاحت کرتا ہے، لہذا قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے کہ اولاً خود قرآن سے ہی رہنمائی حاصل کی جائے، علماء تفسیر نے اس کو اولیٰ اور بنیادی حیثیت دی ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کا سب سے بہتر طریق کیا ہے تو ہمارا جواب ہوگا کہ اولاً قرآن کو ہی سمجھنے کی کوشش کی جائے''۔(۲)

علامہ ابن تیمیہؒ نے متعدد مقامات پر اسی اصول پر زور دیا ہے، چنانچہ آپ نے فتاویٰ میں لکھا ہے:

''اصح طریق یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے تلاش کی جائے کیوں کہ قرآن میں ایک مقام پر اگر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے، اسی طرح ایک مقام پر اختصار ہے تو دوسرے مقام پر اسی مفہوم کو قدرے اطناب (طوالت) سے ذکر فرما دیا گیا ہے''۔

مثلاً! (۱) سورۂ مومن آیت ۲۸ میں ہے:

== **دیگر ادلۂ شرعیہ:** کتاب وسنت، اجماع امت اور قیاس کے علاوہ بھی بعض دلائل ہیں جو احکام شرعیہ کے استنباط کے لیے مجتہدین کے ذریعہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر چہ ان کے دلیل حکم شرعی ہونے کے بارے میں مجتہدین کے درمیان اختلاف آراء ہے۔ مثلاً استحسان، استصلاح، استصحاب، عمل اہل مدینہ، قول صحابی، براءۃ اصلیہ، اخذ بالاخف، تحری، عرف، تعامل، عموم بلویٰ، اخذ باقل ما قیل وغیرہ۔ اصطلاح میں اسے استدلال کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی دلیلیں جو نہ نص ہیں، نہ اجماع اور نہ قیاس۔ استدلال کی ان مختلف اقسام کے بارے میں ائمہ کی رائیں یکساں نہیں۔ مثلاً استحسان امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک معتبر ہے۔ امام شافعیؒ اپنے مشہور قول کے مطابق اسے تسلیم نہیں کرتے۔ امام مالکؒ عمل اہل مدینہ کو حجت مانتے ہیں۔ دوسرے حضرات اس کے قائل نہیں۔ اس طرح یہ ادلہ مختلف فیہ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان مختلف فیہ دلائل میں سے بعض وہ ہیں جو ہر عہد کے مسائل کے مطالعہ، تجزیہ اور مشکلات کے حل میں ممد ومعاون ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان ادلہ پر علما کے لیے نگاہ رکھنا ضروری ہے اور قاضی جو روزانہ نوبہ نو مسائل وحوادث سے دوچار ہوتا رہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جدید مسائل کے حل کے لیے جو طریقے سلف نے استعمال کئے ہیں ان کی حقیقت تک اس کی رسائی ہو۔ (ماخوذ از اسلامی عدالت: ص ۹۱، ۹۲۔ انیس)

(۱) ماخوذ از قرآن فہمی کے بنیادی اصول، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی / ناشر مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، پاکستان۔

(۲) مقدمہ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر: ص ۳۔

’’وَاِنْ یَّکُ صَادِقاً یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ‘‘.

اور اگر یہ سچا ہے تو تمہیں وہ کچھ پہنچ کر رہے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے۔

یہاں پر **بعض الذی** سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے کیوں کہ اسی سورہ کے آخر میں ہے:

’’فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْنَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَایُرْجَعُوْنَ‘‘. (سورۃ المؤمن:۷۷)

اگر ہم تمہیں وہ بعض جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، دنیا میں دکھلا دیں یا اس سے پہلے تمہیں فوت کر لیں تو ان لوگوں کو بہر حال ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔

(۲) سورۂ نساء آیت نمبر ۲۷ میں ہے:

’’وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلاً عَظِیْمًا‘‘.

اور جو لوگ اپنی شہوات کے تابع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بری طرح گمراہ ہو جاؤ۔

’’جو لوگ‘‘ سے مراد اہل کتاب ہیں کیوں کہ اسی سورہ میں ہے۔

’’اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْانَصِیْبًامِّنَ الْکِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَۃَوَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوْاالسَّبِیْلَ‘‘. (سورۃ النساء:۴۴)

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب سے بہرہ ور کئے گئے کہ وہ گمراہی اختیار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔

(۳) سورۂ بقرہ آیت ۳۷ میں ہے:

’’فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ‘‘.　　پس آدم نے اپنے پروردگار سے چند کلمات لے لیے۔

سورۂ اعراف آیت ۲۳ میں ان کلمات کی تفصیل مذکور ہے، یعنی:

’’قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ‘‘.

ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمارا گناہ معاف نہ کیا اور ہم پر رحم کی نظر نہ کی تو ہم خائب و خاسر ہو جائیں گے۔

(۴) اسی طرح آیت: ’’لَاتُدْرِکُہُ الْاَ بْصَارُ‘‘. (سورۃ الأنعام:۱۰۳) کی وضاحت سورۂ قیامہ کی آیت: ’’اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ‘‘ سے اخذ کر سکتے ہیں۔

\------------ تفسیر قرآن بالقرآن کے سلسلہ میں اختلافات قراءت کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ بعض آیات کی تفسیر میں اختلافات قراءت سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الاسراء، آیت ۹۳: ’’اَوْیَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ‘‘. میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ’’من ذھب‘‘ ہے جس سے لفظ زخرف کی وضاحت ہو جاتی ہے، اسی طرح آیت: ’’فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ‘‘. (سورۃ الجمعۃ:۹) کی قراءت: ’’فَامْضَوْااِلٰی ذِکْرِاللّٰہِ‘‘. ہے جس سے سعی کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی قراءات ہیں جن سے نفس آیت کی وضاحت ہوجاتی ہے، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءات وتفسیر کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کو اختیار کرتا ہوں تو میرے بہت سارے سوالات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے استفسار کئے بغیر حل ہوجاتے۔(۱)

بعض علما نے تفسیری ارتقا کے سلسلہ میں اختلاف قراءات کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی، جسے صحابہ وتابعین نے اختیار کیا، مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءات متواترہ تو نصوص قرآن کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن قراءات شاذہ کو ہم تفسیری مراجع میں شمار کرسکتے ہیں۔

قرآن کی تفسیر حدیث نبوی کی روشنی میں:

قرآن فہمی کے سلسلہ میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے بلکہ ائمہ نے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے شرح کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ آیت: ''**وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ**''. (۲) میں قرآن کی تبیین کو اہم ترین فریضۂ رسالت بتلایا گیا ہے۔ اس بنا پر علماء اسلام نے سنت نبوی کی تدوین میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کی حجیت سے انکار دراصل تفسیر بالرائی کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، محققین علما نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لیے اس کو لازم قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ الرسالۃ (رقم:۳۰۳) میں لکھتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ قرآن سے سمجھ کر ہی صادر فرمایا ہے''۔

اس بنا پر علما نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ قرآن فہمی پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

''اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے، کیوں کہ سنت قرآن کی شارح ہے۔ اس بنا پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**ألا إنی أوتیت القرآن ومثله معه یعنی السنة**''. (۳)

اور سنت بھی وحی ہے، جیسا کہ امام شافعی وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ نے اس پر دلائل پیش کئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سنت کو مرجع ثانی کی حیثیت دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

---

(۱)　المذاهب الإسلامية فی التفسیر۔

(۲)　سورۃ النحل:۴۴۔

(۳)　فتاویٰ ابن تیمیہ: ج۱۳ر ص۳۶۳۔۳۶۴۔

''اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیوں کہ سنت قرآن کی شارح ہے''۔(۱)

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر وتوضیح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے..............ابن جریر طبریؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک قرآن میں احکام کا تعلق ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جا سکتے ہیں، لہذا تفسیر قرآن کے اس حصہ کے لیے سنت کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے''۔(۲)

قرآن کی تفسیر اقوال صحابہ کی روشنی میں:

اگر قرآن کریم کی کوئی مشکل خود قرآن وحدیث سے حل نہ ہو رہی ہو تو اقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف رجوع لازم ہے کیوں کہ صحابۂ کرامؓ جاہلی ادب، اہل کتاب کے عادات واطوار اور لغت کے اوضاع واسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن اقوال وظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے تھے اور وہ آیات کے پس منظر سے آگاہ تھے، پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گرد وپیش کی آلائشوں سے منزہ تھے، ان جملہ وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا''۔(۳)

اس بنا پر علما نے قرآن وسنت کے بعد اقوال صحابہ کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے، خصوصاً ان صحابہ میں سے خلفاء اربعہ اور اصحاب علم وفضل کے اقوال سے بے اعتنائی ناممکن سی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وحینئذٍ إذا لم نجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة رجعنا فی ذلک إلٰی أقوال الصحابة فإنهم أدریٰ بذلک لما شاهدوه من القرآن والأحوال التی اختصوا بها ولما لهم من الفهم التام والعلم الصحیح والعمل الصالح ...الخ''.

جب ہمیں کسی آیت کی قرآن وسنت میں تشریح نہ ملے تو ہم صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے کیوں کہ وہ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے، بایں وجہ کہ وہ نزول وحی کے وقت موجود تھے اور ان حالات سے جن میں قرآن نازل ہوا انہیں آگاہی تھی، علاوہ ازیں وہ مکمل فہم وفراست، صحیح علم اور نیک اعمال کی خوبیوں سے متصف تھے۔(۴)

(۱) مقدمہ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر: ص۳۰۔
(۲) جامع البیان فی تفسیر القرآن لابن جریر الطبری: ص۳۴۔
(۳) مقدمہ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر۔
(۴) ماخوذ از قرآن فہمی کے بنیادی اصول، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی رناشر مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، پاکستان۔ انیس

سنت

(۱) لفظ سنت لغت عرب میں طریقہ اور عادت کیلئے اور فقہ میں ایسی عبادت کیلئے استعمال ہوتا ہے جو فرض یا واجب نہ ہو اور علم حدیث اور اصول فقہ کی اصطلاح میں حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو سنت کہا جاتا ہے'' یہاں یہی اصطلاحی معنی مراد ہیں، سنت اور حدیث میں یہ فرق ہے کہ حدیث تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اقوال کا نام ہے اور سنت آپ کے اقوال وافعال دونوں کا، اقوال کی طرح آپ کے افعال بھی حجت ہیں یعنی احکام شرعیہ کی دلیل صرف حدیث نہیں بلکہ سنت ہے جس طرح قرآن حکیم پورا کا پورا وحی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی امور دین کے متعلق سب کی سب وحی ہیں اور آپ کے تمام اعمال واخلاق وحی کے عین مطابق، اس لیے قرآن پاک کے بعد شرعی احکام کا سب سے بڑا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

سنت کو خود قرآن نے حجت قرار دیا ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کے وحی ہونے اور افعال کے ہر غلطی سے پاک ہونے کی شہادت قرآن پاک نے قسم کھا کر دی ہے کہ:

''وَالنَّجْمِ اِذَاهَوٰی، مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَاغَوٰی، وَمَایَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی، اِنْ هُوَاِلَّاوَحْیٌ یُّوْحٰی''. (سورۃ النجم: ۱ تا ۴)

قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے، یہ تمہارے ساتھ رہنے والے (پیغمبر) نہ راہ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہوئے اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد وحی ہے جو ان پر وحی بھیجی جاتی ہے۔ (خواہ الفاظ کی وحی ہو جو قرآن کہلاتی ہے خواہ صرف معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے اور خواہ وحی جزئی ہو یا کسی قاعدہ کلیہ کی ہو جس سے اجتہاد فرماتے ہوں۔)

سورہ نقلم میں بھی آپ کے اخلاق وعادات کی عظمت کا اعلان قسم کھا کر کیا گیا ہے:

''وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ''. (سورۃ القلم: ۴)　　اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

قرآن ہی نے آپ کے پورے طرز زندگی کو سب مسلمانوں کے لئے اللہ کا پسندیدہ نمونہ بنا کر پیش کیا:

''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ أُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ''. (سورۃ الأحزاب: ۲۱)

---

(۱)　　از امداد الاحکام جلد اول، ص ۵۴ تا ۵۹۔

تم لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک عمدہ نمونہ تھا۔

اسی نمونہ کو اللہ کی محبت کا معیار ٹھیرا کر مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا کہ:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ". (سورۃ آل عمران:۳۱)

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

اور صاف الفاظ میں حکم دیا ہے کہ:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ". (سورۃ النساء:۵۹)

اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو۔

اور بتایا کہ آپ کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ". (سورۃ النساء:۸۰)

اور جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔

غرض وحی ہونے کے اعتبار سے قرآن وسنت میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی اطاعت واجب ہے، جو درحقیقت اللہ

(۱) حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اسلامی عدالت: ص ۸۸، میں لکھتے ہیں:

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت ضروریات دین میں سے ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر منطوق وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى". (سورۃ النجم:۳،۴) رسول اپنے جی سے نہیں بولتے۔ وہ تو بس اللہ کے پاس سے آئی ہوئی وحی ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام واجب الاطاعت ہیں:

"اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" (سورۃ النساء:۵۹) اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔

رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ". (سورۃ النساء:۸۰) جس نے رسول کا کہنا مانا اس نے اللہ کا کہنا مانا۔

حکم ہے کہ رسول کی اتباع کرو:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ". (سورۃ آل عمران:۳۱)

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ پھر اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔

اور رسول کی حیات قابل اقتدا نمونہ ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ". (سورۃ الحزاب:۲۱) رسول اللہ میں تمہارے لیے اچھا قابل اقتدا نمونہ ہے۔

فرمایا گیا کہ جو رسول دیں اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جس سے روکیں اس سے باز آ جاؤ:

"مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا". (سورۂ حشر:۷) جو تمہیں رسول دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

اور رسول تو بھیجے ہی گئے ہیں اس لیے کہ ان کی اطاعت کی جائے:

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ". (سورۃ النسآء:۶۴) ہم نے تو رسول بھیجا ہی اس لیے ہے کہ اس کی بات مانی جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے بھیجے گئے کہ وہ آیات قرآنی کا بیان اس کی وضاحت اور اللہ کی مراد ظاہر فرمائیں:

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ". (سورۃ النحل:۴۴) اور ہم نے تمہاری طرف "الذکر" نازل کیا تا کہ تم لوگوں کے سامنے اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی وحی کو کھول کھول کر بیان کر دو۔

==

تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔(۱)

آثار صحابہ کی فقہی حیثیت:

اور کتاب اللہ کی تعلیم یعنی مفاہیم ومرادات الٰہی کی تفہیم اور اپنے عمل اور سنت سے ان احکام کی پختہ عملی تصویر فرائض رسالت میں سے ہے:

"يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ". (سورۃ البقرہ:۱۲۹) رسول کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

پس احادیث وسنت جو رسول کے ارشادات، ان کے اعمال اور ان کی تقریرات کا مجموعہ ہیں، واجب الاطاعت، قابل اتباع اور بیان قرآن ہیں۔ دین کے باب میں حجت ہیں۔ جس سے انکار دراصل قرآن اور اصل دین کا انکار ہے۔

"(حجية السنة)سواء كانت مفيدة للفرض أوالواجب أوغيرهما(ضرورة دينية) كل من له عقل وتمييز حتى النساء والصبيان يعرف أن من تثبت نبوته،صادق فيما يخبرعن الله تعالىٰ ويجب اتباعه". (التيسيرعلى التحرير: ج۳ص۲۲)

سنت رسول اللہ کا حجت ہونا (چاہے مفید فرضیت ووجوب ہو یا کچھ اور) ان امور دینیہ میں سے ہے جن کا علم بالبداہت حاصل ہے کہ ہر وہ شخص جو صاحب عقل وتمیز ہو یہاں تک کہ عورتیں اور بچے بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ جس کی نبوت ثابت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خبر دیتا ہے، اس میں سچا ہے اور اس کی اتباع واجب ہے۔ (اسلامی عدالت: ص۸۸تا۹۰۔انیس)

سنت کی تشریعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے الموسوعۃ الفقہیہ میں لکھا ہے:

پہلا مسئلہ: سنت سے متعلق:

بعض لوگوں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ حدیث تشریع کا سرچشمہ نہیں ہے، یہ لوگ اپنے کو اہل قرآن کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمارا پیشوا قرآن ہے، ہم اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام مانیں گے، ان کے بقول سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں ملا دی گئی ہیں، یہ لوگ اس جماعت کی ایک کڑی ہیں جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پیشگی خبر دے دی تھی، چنانچہ احمد، ابوداؤد اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت مقدامؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يوشک أن يقعد الرجل متكئاً علىٰ أريكته يحدّث بحديث من حديثي فيقول بيننا وبينكم كتاب الله،فما وجدنا فيه من حلال استحللناه،وما وجدنا فيه من حرام حرّمناه،ألا وإن ما حرّم رسول الله مثل ما حرّم الله". (عنقریب ایک آدمی اپنی مسہری پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا، اس کے سامنے میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ یہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے، اس میں جو چیزیں حلال کی گئی ہیں اسے ہم حلال سمجھیں گے، اور جو حرام کی گئی ہیں اسے حرام سمجھیں گے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے وہ بالکل اسی طرح حرام ہے جس طرح خدا کی حرام کردہ چیزیں)، (فتح القدیر:۳/۴۳۸، الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس حدیث کی روایت ترمذی نے بھی کی ہے اور کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (سنن الترمذی بشرح ابن العربی:۱۰/۱۳۲، طبع الصاوی)۔

یہ لوگ "اہل قرآن" نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ قرآن کریم نے تو تقریباً ایک سو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے اور رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا ہے:

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَد أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظاً" (سورۃ النساء/۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی اور جو کوئی روگردانی کرلے سو ہم نے آپ کو ان پر نگراں کر کے نہیں بھیجا ہے۔

اس سے زیادہ یہ کہ قرآن پاک نے، جس پر عمل پیرا ہونے کے یہ لوگ دعویدار ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار کرنے والے اور آپ کے فیصلہ کو نامنظور کرنے والے کو خارج از ایمان قرار دیا ہے:

"فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِى أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً". (سورۃ النساء/۶۵) سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حَکَم نہ بنالیں، اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ بعض شرائط کے ساتھ صحابۂ کرام کے آثار یعنی اقوال و

== اوران کی یہ بات کہ سنت میں بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثیں ملا دی گئی ہیں، بالکل ہی نا قابل التفات ہے، اسلئے کہ اس امت کے علمانے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک کرنے کے لئے غایت درجہ محنت کی ہے، اور کسی راوی کی سچائی میں شک یا اس کے حق میں سہو کے احتمال کو حدیث کے رد کر دینے کے سبب، سنت کو قانون سازی کے سرچشمہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، لیکن امور دنیا سے متعلق قوانین واحکام کے سلسلہ میں وہ ہمارے لئے حجت نہیں ہے، یہ لوگ اس سلسلہ میں ایک کمزور شبہ سے استناد کرتے ہیں، یعنی تابیر نخل (درخت خرما کو گابھا دینے) کے واقعہ سے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا کہ مدینہ والے کھجور کے درخت کو گابھا دیتے ہیں، یعنی درخت خرما کے مادہ کونر کے شگوفہ سے جوڑ دیتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو بھی ٹھیک رہے گا، چنانچہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کیا لیکن درختوں نے ردی کھجور دیئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان لوگوں کے پاس سے گذر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے یہ درخت ایسے کیوں ہوگئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی تو تابیر سے منع فرمادیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''**أنتم أعلم بأمر دنیاکم**''. تم لوگ اپنے دنیا کے معاملات سے زیادہ واقف ہو۔ (حدیث کی روایت امام مسلمؒ نے مختلف الفاظ سے کی ہے، ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ماأظن ذلک (یعنی التلقیح) یغني شیئاً**. (میں نہیں سمجھتا کہ یہ یعنی تابیر نخل کچھ فائدہ دے سکتا ہے)، راوی کا کہنا ہے کہ یہ بات لوگوں کو بتائی گئی تو انہوں نے کھجوروں کے درختوں کا گابھا دینا چھوڑ دیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (اس عمل کے چھوڑ دینے سے رونما ہونے والے نقصانات کی) خبر دی گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إن کان ینفعهم ذلک فلیصنعوہ فإني إنما ظننت ظناً فلا تؤاخذوني بالظن ولکن إذا حدثتکم عن اللّٰه شیئاً فخذوا به فإني لن أکذب علی اللّٰه عزوجل**. (اگر یہ عمل ان کے لیے مفید تھا تو انہیں اسے کرتے رہنا چاہیے، اس لیے کہ میں نے محض ایک خیال کی بنیاد پر بات کہی تھی، لہٰذا تم لوگ میرے خیال کے سلسلہ میں میری گرفت مت کرو، لیکن اگر میں اللہ کی طرف سے کوئی بات تم لوگوں سے بیان کروں تو اس پر عمل کیا کرو، اس لیے کہ میں خدا کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہیں کرسکتا) (صحیح مسلم: ۴/۱۸۳۵۔۱۸۳۶ تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی، طبع عیسیٰ الحلبی)

اس خبر سے اگر کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو صرف یہ کہ ایسے دنیوی معاملات جن کا تعلق حلال وحرام یا صحت وفساد کے اعتبار سے اسلامی شریعت سے نہیں، بلکہ ان کا تعلق تجرباتی امور سے ہے، ایسے امور اپنے رب کی طرف سے پیغامبر ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں داخل نہیں ہیں، بلکہ مذکورہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے معاملات تجربہ کے تابع ہوا کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعہ نمونہ بن کر ہمیں اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ معاملات جو کلی طور پر دنیوی ہیں اور ان کا تعلق اسلامی قانون سے نہیں ہے ان کے سلسلہ میں مفید ومناسب کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں جستجو کرنی چاہئے، اس واقعہ کے درمیان اور اس بات کے درمیان بہت فرق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ وارد ہو کہ یہ حلال یا حرام ہے، یا یہ مسئلہ مستوجب سزا ہے یا نہیں ہے، یا یہ بیع صحیح ہے یا نہیں ہے، کیونکہ یہ معاملات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص فرائض منصبی سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر ان تمام امور میں فرض قرار دیا ہے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے ہم تک پہونچاتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ، سنت سے متعلق:

آج کل وقتاً فوقتاً اسلامی قانون سازی میں مصلحت کو بنیاد بنانے کی بات اٹھتی رہتی ہے، دلیل اس سلسلہ میں یہ دی جاتی ہے کہ اسلامی شریعت چونکہ انسانیت کی فلاح و بہبود ہی کیلئے اتری ہے، اس لئے جو بات فلاح و بہبود کی ہو اس پر ہمیں عمل کرنا چاہئے، اور جو باعث نقصان ہو اس سے ہمیں اعراض کرنا چاہئے، لیکن یہ ایسی حق بات ہے جس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے، اسلئے کہ اسلامی شریعت میں کلی طور پر خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، انسانوں کی مصلحت کی ہی رعایت کی گئی ہے، لیکن ''مصلحت'' ہے کیا؟ کیا مصلحت یہ ہے کہ خواہشات کا ساتھ دیا جائے اور بے لگام لوگوں کو خوش کیا جائے؟ یا حقیقی مصلحت وہ ہے جس سے لوگوں کے معاملات میں استواری پیدا ہوتی ہے؟ پھر یہ کہ حقیقی اور موہوم مصلحتوں کے مابین ہم کس طرح خط کھینچ سکتے ہیں؟

علم وتجربہ سے ہم جانتے ہیں کہ لوگوں کے طبائع مختلف ہیں، کسی بات کو ایک آدمی پسند اور اسی کو دوسرا آدمی ناپسند کرتا ہے، اور جس کو دوسرا ناپسند کرتا ہے پہلے شخص کی وہی عین پسند ہوتی ہے، جو شخص کسی چیز کو پسند کرتا ہے اس میں اس کو صرف بھلائی اور مصلحت ہی کا پہلو نظر آتا ہے جب کہ ناپسند کرنے والے شخص کو صرف برائی اور نقصان کا پہلو نظر آتا ہے، عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے: ==

افعال سے بھی شرعی احکام ثابت کرنے میں ایک حد تک استدلال کیا جاتا ہے، مگر ان کے سب اقوال وافعال مکمل دلیل فقہ کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں کچھ تفصیل ہے جو اصول فقہ اور اصول حدیث کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے، چونکہ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں بلکہ سنت ہی کے تابع ہے، لہذا اس دلیل کو الگ شمار نہیں کیا جاتا۔

قرآن اور سنت کے درمیان درجہ کا تفاوت:

یہ بات پیچھے واضح ہوچکی ہے کہ وحی ہونے کے اعتبار سے قرآن وسنت میں کوئی فرق نہیں، ان دونوں ہی کی اطاعت لازم ہے، مگر اس کے باوجود دو بنیادی فرق ایسے ہیں جن کا اثر فقہ کے بہت سے احکام پر پڑتا ہے۔

== و عین الرضا عن کل عیب کلیلة کما أن عین السخط تبدی المساویا

(رضامندی کی نگاہ سارے عیوب سے اندھی ہوتی ہے، جب کہ چشم عداوت کو صرف برائیاں نظر آتی ہیں)۔

خدائے تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس دنیا میں خیر وشر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، اس لئے ایک مصلحت کو دوسری پر، یا ایک برائی کو دوسری برائی پر ترجیح دینے یا نقصانات کا مفادات سے موازنہ کر کے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ اس سلسلہ میں دار ومدار ایسی ذات ہو جو خواہشات واغراض سے منزہ ہو، اور ایسی ذات صرف خدائے تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اس لئے کہ وہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے آسانی ہی چاہتا ہے اور دشواری نہیں چاہتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مصالح تین ہیں: ایک مصلحت وہ ہے جس کا شارع نے اعتبار کیا ہے اس کے باوجود کہ اس میں کچھ معمولی نقصانات بھی ہیں، اس لئے کہ اس میں خیر کا پہلو راجح تر ہے، جیسے روزہ کی مصلحت کہ اس میں کچھ مشقتیں بھی ہیں، اور جیسے جہاد کی مصلحت کہ اس میں مال اور جان دونوں ہی لگتے ہیں، اسی طرح کی بات حج وغیرہ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔

بعض مصلحتیں ایسی ہیں جن کو شارع نے پورے طور پر مسترد کر دیا ہے کیونکہ ان میں نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہیں، جیسے شراب وجوے کی مصلحت، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا". (سورۃ البقرہ/۲۱۹) لوگ آپ سے شراب اور قمار کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور ان کا گناہ ان کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

اور جیسے ربا کی مصلحت، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کی تمام صورتوں اور شکلوں کو حرام کر دیا ہے:

"وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو" (سورۃ البقرہ/۲۷۵) حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

اور اسی طرح ارشاد باری ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ". (سورۂ بقرہ/۲۷۸، ۲۷۹) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر کسی کا ظلم ہوگا۔

اور کچھ مصالح ایسی بھی ہیں کہ شارع نے ان کے بارے میں سکوت کیا ہے، چنانچہ نہ تو ان کا اعتبار کیا ہے اور نہ ہی خصوصیت سے ان کو صراحۃً مسترد کیا ہے، اس طرح کے مصالح کی تعیین صرف ان حضرات کا کام ہے جن کو فقہی بصیرت وگہرائی حاصل ہو اور ان کو کسی طرح کا لالچ یا خوف دامنگیر نہ ہو، پھر یہ کہ اس سلسلہ میں قطعی فیصلہ کا حق جماعت کو ہوگا افراد کو نہیں، نیز ان مصالح کا تجربہ کے تابع ہونا شرط ہے کیونکہ اس طرح کے مصالح زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں بلکہ ملکوں کے اختلاف سے بھی وہ مختلف ہوجایا کرتے ہیں۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ اردو: ۱/۷۶ تا ۷۸۔ انیس)

(۱)　ایک یہ قرآن کریم ''وحی متلو'' ہے اور سنت ''وحی غیر متلو'' یعنی جیسا کہ پیچھے بیان ہوا قرآن کریم کے الفاظ اور معنی دونوں وحی ہیں اور سنت کے صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کئے گئے ہیں، الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو بلا وضو چھونا جائز نہیں، جب کہ حدیث شریف کو بلا وضو بھی چھویا جا سکتا ہے، اگر چہ بہتر یہی ہے کہ باوضو ہو کر چھویا جائے، نیز قراءت قرآن جو نماز میں فرض ہے وہ فرض، حدیث کے پڑھ لینے سے ادا نہیں ہوسکتا۔

(۲)　قرآن وسنت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے ''قطعی الثبوت'' (قطعی اور بالکل یقینی طور پر ثابت شدہ) ہے اور سنت کی تعلیمات چونکہ سب کی سب تواتر سے ثابت نہیں، لہذا اس کی جو تعلیمات تواتر سے ثابت ہوگئیں وہ تو قطعی الثبوت ہیں اور جو تعلیمات ہم تک بغیر تواتر کے ہیں مگر قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہیں وہ ''ظنی الثبوت'' (ظنی طور پر ثابت شدہ) ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم کا تو ایک ایک حرف بلکہ زیر، زبر، پیش بھی ہم تک تواتر سے پہنچا ہے، لہذا اس کے متعلق ہمیں قطعی علم اور پختہ یقین ہے کہ یہی وہ بعینہٖ کلام ہے جسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اللہ کا کلام بتا کر پیش کیا تھا، تواتر کی وجہ سے ہمیں اس کے ثبوت کے لئے سند اور راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں کیونکہ سند اور راویوں کے حالات کی چھان بین کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں روایت کرنے والے تھوڑی تعداد میں ہوں اور جہاں روایت کرنے والوں کی تعداد ہر زمانہ میں تواتر تک پہنچی ہوئی ہو وہاں سند اور راویوں کی تحقیق کا مطالبہ وہی شخص کرسکتا ہے جو خود چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہوا اور لوگوں سے وجود آفتاب کی دلیل مانگ رہا ہو۔

برخلاف سنت کے کہ وہ ہم تک سب کی سب تواتر سے نہیں پہنچی، بلکہ سنت کی کچھ تعلیمات تواتر سے اور کچھ بغیر تواتر کے سند کے ذریعہ پہنچی ہیں، جو تعلیمات بغیر تواتر کے پہنچی ہیں ان کے متعلق یہ علم حاصل کرنے کے لئے کہ یہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تعلیمات ہیں سند کے ایک ایک راوی کے حالات کی مکمل چھان بین اور سند کی نہایت دقیق اور پیچیدہ تحقیقات سے گذرنا پڑتا ہے جن کے اصول علم روایت حدیث، فن اصول حدیث، فن اسماء الرجال اور فن اصول فقہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان تمام تحقیقات میں جو حدیث (غیر متواتر) سند کے اعتبار سے قابل اعتماد ثابت ہو اس سے ایک گونہ یقین اس بات کا حاصل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، مگر اس ''ایک گونہ یقین'' کے باوجود بھی ضعیف سا احتمال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ سند کے راویوں سے پوری کوشش اور احتیاط کے باوجود بھول چوک ہوگئی ہو، اس لئے ایک گونہ یقین قوت میں اس یقین کے برابر نہیں ہوتا جو قرآن کریم یا

سنت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

ظن غالب کی حقیقت اور اس کا درجہ:

تواتر سے ہونے والے یقین کو علم قطعی کہا جاتا ہے اور اس کا انکار کفر ہے، اور جو یقین تواتر کے بغیر سند سے حاصل ہوا سے اصطلاح میں ''ظن'' کہتے ہیں، اس کا انکار گناہ ہے مگر کفر نہیں۔

عام طور پر ''ظن'' کا اردو ترجمہ صرف ''گمان'' سے کر دیا جاتا ہے، مگر یاد رہے کہ اصول فقہ کی اصطلاح میں ظن سے مراد صرف گمان نہیں، بلکہ ایک درجہ کا یقین مراد ہے، جسے ''ظن غالب'' کہا جاتا ہے، اور ''ظن غالب'' دنیا کے تمام ادیان و مذاہب ہر ایک ملک کے قوانین اور روزمرہ کے معاملات میں قابل اعتماد اور قابل استدلال قرار دیا جاتا ہے، دنیا بھر کی عدالتیں گواہیوں کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ محض دو چار گواہوں کا بیان حد تواتر کو نہیں پہونچتا اور نہ اس کے بالکل سچ اور درست ہونے کا علم قطعی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ یہ احتمال عقلی طور پر موجود رہتا ہے کہ ان چاروں گواہوں نے سازش کر کے جھوٹ بولا ہو یا ان سب کو مغالطہ لگ گیا ہو، لہٰذا ان گواہوں سے حاصل ہونے والا علم ظن غالب ہی ہے علم قطعی نہیں، علم قطعی تو وہ ہے جس میں عقل کے نزدیک جھوٹ یا مغالطہ کا کوئی احتمال سرے سے باقی ہی نہ رہے، غرض دنیا بھر کی عدالتوں میں گواہیوں پر اعتماد کر کے جو فیصلے کئے جاتے ہیں وہ ''ظن غالب'' ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں، اسی طرح جو سنت تواتر سے تو ثابت نہ ہو، مگر ایسی قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہو کہ اس کے درست ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جائے، شریعت میں اس کو حجت (یعنی فقہی دلیل) قرار دیا گیا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ دلیل ظنی ہونے کے باعث قطعی سے کم درجہ کی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن و سنت کے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا کا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے اور سنت کی تمام تعلیمات چونکہ تواتر سے ثابت نہیں، اس لئے سنت متواترہ قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ جو قابل اعتماد سند سے ثابت ہوئی ہو وہ ظنی ہے۔

دلیل قطعی اور دلیل ظنی کے فرق کا اثر احکام پر:

دلیل قطعی اور دلیل ظنی میں چونکہ قوت کے اعتبار سے تفاوت ہے، لہٰذا ان سے ثابت ہونے والے احکام پر بھی اس تفاوت کا اثر ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پیچھے احکام شرعیہ کی جو سات قسمیں بیان ہوئی ہیں، یعنی فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، ان میں سے فرض اور حرام کا ثبوت صرف دلیل قطعی سے ہوسکتا ہے دلیل ظنی کسی فعل کی فرضیت یا حرمت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں، اور باقی پانچ قسم کے احکام یعنی واجب، مستحب، مباح، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کا ثبوت ''دلیل ظنی'' سے بھی ہوسکتا ہے، قرآن کریم اور سنت متواترہ دونوں قطعی الثبوت ہیں،

لہذا ان سے ساتوں قسم کے احکام ثابت ہوسکتے ہیں اور سنت غیر متواترہ دلیل ظنی ہے، لہذا اس سے کسی فعل کا فرض یا حرام ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا، البتہ باقی پانچ قسم کے احکام اس سے بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔

مثلاً نماز اس لئے فرض ہے کہ قرآن کریم میں اس کا مطالبہ صراحت سے کیا گیا ہے، اسی طرح مثلاً ہر نماز میں رکعتوں کی ایک خاص تعداد یعنی فجر کی دو، مغرب کی تین اور باقی تین نمازوں میں چار چار رکعتیں اگرچہ قرآن کریم سے صراحۃً ثابت نہیں، مگر سنت متواترہ سے ان کی پابندی ثابت ہے، لہذا اس تعداد کی پابندی بھی فرض اور اس میں کمی بیشی حرام ہے، اور نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یا چند آیات پابندی سے پڑھنے کا مطالبہ نہ قرآن کریم سے صراحۃً ثابت ہے نہ سنت متواترہ سے، بلکہ اس کا ثبوت صرف سنت غیر متواترہ سے ہوا ہے لہذا یہ واجب ہے فرض نہیں۔

فرض اور واجب میں یہی فرق ہے کہ فرض کا مطالبہ دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے اور واجب کا مطالبہ دلیل ظنی سے لہذا عمل تو دونوں پر ضروری ہے اور خلاف ورزی بھی دونوں کی گناہ ہے، مگر فرض کا انکار کفر ہے، واجب کا انکار کفر نہیں، اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی میں وہ فرق ہے کہ حرام کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہوتی ہے اور مکروہ تحریمی کی ممانعت دلیل ظنی سے، دونوں کا ارتکاب گناہ ہے مگر حرام کی ممانعت کا انکار کفر ہے، مکروہ تحریمی کی ممانعت کا انکار کفر نہیں۔(۱)

(۱) امداد الاحکام جلد اول، ص: ۵۴ تا ۵۹۔

اجماع

فقہ کا تیسرا ماخذ اجماع ہے۔ لغت میں ''اجماع'' متفق ہونے کو کہتے ہیں، لغوی معنی کے اعتبار سے اتفاق اور اجماع ایک ہی چیز ہے، مگر اصطلاح شریعت میں ایک خاص قسم کے اتفاق کو ''اجماع'' کہا جاتا ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر متفق ہوجانا ''اجماع'' ہے۔(۱)

یہ ''اجماع'' فقہ کا تیسرا مأخذ اور احکام شرعیہ کے چار دلائل میں سے ایک ہے، جس مسئلہ کے شرعی حکم پر اجماع منعقد ہوگیا ہے اسے ''اجماعی فیصلہ'' یا ''مسئلہ اجماعیہ'' یا ''مسئلہ مجمع علیہا'' کہا جاتا ہے، اس کی حیثیت احکام شرعیہ کی دلیل اور فقہ کا مأخذ ہونے کے اعتبار سے وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ جس طرح سنت متواترہ دلیل قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ دلیل ظنی، اسی طرح جو اجماعی فیصلہ ہم تک تواتر سے پہنچا ہو وہ فقہی احکام کے لئے دلیل قطعی ہے اور جو تواتر کے بغیر قابل اعتماد روایت سے پہنچا ہو وہ دلیل ظنی۔

اجماع کو خود قرآن وسنت نے حجت قرار دیا ہے:

قرآن وسنت نے مسلمانوں پر اجماع کی پیروی ایسی ہی لازمی قرار دی ہے جیسی وحی سے ثابت شدہ احکام کی پیروی لازم ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر شریعت کے احکام بذریعہ وحی آنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہوجانے والا تھا، ادھر یہ شریعت قیامت تک نافذ رہنے والی اور طرح طرح کے نت نئے مسائل امت کو قیامت تک پیش آنے والے تھے، لہذا آئندہ کے مسائل شرعی اصول پر حل کرنے کا انتظام اللہ جل شانہ نے یہ فرمادیا کہ خود قرآن وسنت میں ایسے اصول اور نظائر رکھ دیئے جن کی روشنی میں غور وفکر کرکے ہر زمانہ کے مجتہدین اس وقت کے پیدا شدہ مسائل کا شرعی حکم معلوم کرسکیں، اور جو فیصلہ قرآن وسنت کی روشنی میں وہ اپنے متفقہ اقوال یا افعال سے کردیں، اس کی پیروی بعد کے تمام مسلمانوں پر خود قرآن وسنت کے ذریعہ لازم اور اس کی خلاف ورزی حرام قرار دیدی گئی۔

قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعزاز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت کو ملا ہے، کہ اس کے

(۱) الإحكام في أصول الأحكام للآمدي: ج اول، ص ۱۰۱ مطبوعہ مصر۔

مجموعہ کو اللہ تعالیٰ نے دینی امور میں ہر خطا ولغزش سے معصوم اور محفوظ فرما دیا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس امت کے کسی فرد سے دینی امور میں غلطی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بات تو ہر وقت مشاہدہ میں آتی ہے کہ اس امت میں بھی ہر قسم کے لوگ ہیں، نیکوکار متقی بھی ہیں، فاسق وفاجر بھی ہر مسلمان سے بلکہ علما وصلحا سے بھی فرداً فرداً بہت سے دینی امور میں غلطی ہوجاتی ہے، لہٰذا امت کا ہر فرد تو خطا ولغزش سے معصوم نہیں، مگر امت کا مجموعہ معصوم ہے، یعنی پوری امت بحیثیت مجموعی متفقہ طور پر کوئی ایسا فیصلہ یا عمل نہیں کرسکتی جو قرآن وسنت اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہو جس طرح قرآن وسنت کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوسکتا، اسی طرح کسی زمانہ کے تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ جو کسی دینی مسئلہ میں ہوا ہو غلط نہیں ہوسکتا، بعد کے تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات قرآنیہ:

چنانچہ قرآن کریم نے بتایا کہ آخرت میں جو سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں کو ملے گی وہی سزا ان لوگوں کو دی جائے گی جو مسلمانوں کا متفقہ دینی طریقہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے، ارشاد ہے:

(۱) ”وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَسَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَ تْ مَصِيْراً“. (سورۃ النساء:۱۱۵)

اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر ظاہر ہوچکا ہو اور سب مسلمانوں کے (دینی) راستہ کے خلاف چلے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے، اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

معلوم ہوا کہ امت کے متفقہ فیصلے (اجماع) کی مخالفت گناہ عظیم ہے۔(۱)

(۲) قرآن کریم نے اس امت کے مجموعہ کو یہ مژدہ سنایا ہے کہ:

”وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً“.

(سورۃ البقرۃ:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی امت بنایا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ بنیں۔

معلوم ہوا کہ اس امت کے جو اقوال واعمال متفقہ طور پر ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست اور حق ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو اس ارشاد کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ”یہ امت نہایت اعتدال پر

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: علامہ آمدی کی ”کتاب الإحکام فی أصول الأحکام، ج:۱، ص:۱۰۳تا۱۰۷“ ”تفسیر معارف القرآن: ج، دوم، ص:۵۴۶، ۵۴۷“۔

ہے'' نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو گواہ قرار دے کر دوسرے لوگوں پر اس کی بات کو حجت قرار دیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اجماع کا حجت ہونا صرف صحابہ یا تابعین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت صرف صحابہ و تابعین نہ تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانہ کے مسلمان اللہ کے گواہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی غلط کاری یا گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے۔(۱)

(۳) قرآن حکیم نے اس امت کو ''خیر الامم'' قرار دے کر اس کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتی اور برے کاموں سے منع کرتی ہے۔ارشاد ہے:

''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ''.(۲)

تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے نفع (ہدایت کے) لئے ظاہر کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی پوری امت سے بحیثیت مجموعی خطاب ہے اور اس میں تین طریقوں سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اس امت کا اجماع شرعی حجت اور فقہی دلیل ہے۔

اول یہ کہ اس امت کو ظاہر ہے کہ بہترین امت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس امت کا مجموعہ دین کی صحیح تعلیمات پر قائم رہے گا، اگرچہ اس کے بہت سے افراد الگ الگ دین میں کمزور بلکہ بہت کمزور ہوں، مگر ہر زمانہ میں اس امت کا مجموعہ مل کر اللہ کے دین کو مکمل طور پر تھامے رہے گا، پورا مجموعہ کبھی گمراہ نہ ہوگا، لہذا ان کا اجماع بھی لامحالہ حجت ہوگا، اس لئے کہ اگر ان سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو وہ اتفاق گمراہی پر ہوگا پھر ایک گمراہ امت بہترین امت کیسے ہو سکتی ہے۔(۳)

دوسرے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے متعلق یہ تصدیق فرما دی ہے کہ ''یہ نیک کاموں کا حکم دیتی ہے''۔معلوم ہوا کہ جس کام کا یہ حکم دے گی وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور نیک کام ہوگا اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ یہ امت متفقہ طور پر جس کام کا حکم دے گی چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے لہذا اس کی پابندی سب پر لازم ہوگی۔

تیسرے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ''امت برے کاموں سے منع کرتی ہے'' معلوم ہوا کہ جس کام سے یہ امت متفقہ طور پر منع کر دے وہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور برا ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: احکام القرآن للجصاص: ج اول، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴، مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ، و تفسیر معارف القرآن: ج اول، ص ۳۷۲، ۳۷۳۔

(۲) سورۃ آل عمران: ۱۱۰۔

(۳) دیکھئے شیخ ابوبکر جصاص رازیؒ کی مشہور کتاب ''احکام القرآن'' ج ۲ ص ۴۱، طبع مصر اور تسہیل الوصول: ص ۲۴۷، طبع ملتان۔

الحاصل اس امت کا اجماعی فیصلہ خواہ کسی کام کے کرنے کا ہو یا کسی کام سے باز رہنے کا، ہر صورت میں وہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔(۱) ورنہ اگر ان کے فیصلہ کو غلط قرار دیا جائے، یعنی جس کام کا اس نے حکم دیا اسے برا سمجھا جائے اور جس کام سے منع کیا اسے اچھا سمجھا جائے تو لازم آئے گا کہ یہ امت برائی کا حکم دینے والی اور اچھائی سے منع کرنے والی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس آیت کے صریح خلاف ہے۔(۲)

(۴)　نیز قرآن کریم کا حکم ہے کہ:

''وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا''. (سورۃ آل عمران:۱۰۳)

اور اللہ کی رسی (دین) کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔

اور ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے متفقہ دینی فیصلے (اجماع) کی مخالفت امت میں پھوٹ ہی ڈالنا ہے جس سے قرآن کریم نے واضح طور پر ممانعت فرمائی ہے۔(۳)

رہا یہ سوال کہ فقہ کے بے شمار مسائل میں فقہا کا آپس میں اختلاف ہوا ہے، لہذا وہ بھی اس آیت کی رو سے ناجائز ہونا چاہئے، جواب یہ ہے کہ فقہا کا اختلاف جن مسائل میں ہوا ہے ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا صریح فیصلہ قطعی طور پر قرآن وسنت سے یا اجماع امت سے ثابت ہو چکا ہو، فقہا کا اختلاف صرف ان فروعی مسائل میں ہوا ہے جن میں قرآن وسنت کا کوئی صریح اور قطعی فیصلہ موجود نہیں تھا، یا جن کے متعلق خود احادیث میں اختلاف پایا جاتا تھا اور ان پر امت کا اجماع بھی منعقد نہیں ہوا تھا، لہذا فقہا کا یہ اختلاف اس آیت کی ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ ان کا اختلاف فروعی مسائل میں اجتہادی نوعیت کا ہے، جو صحابۂ کرامؓ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، خود عہد رسالت میں بھی فروعی مسائل میں صحابہؓ کا اختلاف ہوا ہے، جس کی بہت سی مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کبھی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ ایسے اختلاف کو امت کے لئے رحمت قرار دیا ہے، اور جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو چکا ہو وہ مسئلہ ظنی یا اجتہادی نہیں رہتا، بلکہ قطعی ہو جاتا ہے اس سے اختلاف کرنا فقہاء مجتہدین کو بھی جائز نہیں کیونکہ اس کی مخالفت درحقیقت امت میں پھوٹ ڈالنا ہے جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

(۵) ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ''. (سورۃ التوبۃ:۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

اس آیت میں ہر زمانہ کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ سچے لوگوں ''الصادقین'' کے ساتھ رہیں، جس کا مقصد

(۱)　یہ سب تفصیل بھی شیخ ابوبکر جصاص رازیؒ نے ''احکام القرآن'' میں ذکر فرمائی ہے۔(ج۲،ص۴۱۔)

(۲)　مزید تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ آمدیؒ کی ''الإحكام في أصول الأحكام: ج اول،ص۱۰۹تا۱۱۱،مطبوعہ مصر۔

(۳)　حوالہ بالا: ج اول،ص۱۱۱، وتفسیر قرطبی: ج۴،ص۱۶۴،مطبوعہ مصر۔

ظاہر ہے، یہ ہے کہ اعمال میں ان کی پیروی کی جائے، رہا یہ سوال کہ ''صادقین'' سے کیسے لوگ مراد ہیں؟ تو اس کا جواب خود قرآن کریم ہی نے سورۂ بقرہ کی آیت (نمبر ۱۷۷) ''لَیْسَ البِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ - تا- اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ''. (۱) میں دیا ہے، وہاں ''صادقین'' کی صفات بیان کی گئی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ صادقین، وہ حضرات ہیں جو اعتقاد کے بھی سچے ہوں، قول وعمل کے بھی سچے ہوں اور ظاہر و باطن کے بھی سچے ہوں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ''صادقین'' کا وجود ہر زمانہ میں باقی رہے گا، ورنہ ان کے ساتھ رہنے کا حکم ہر زمانہ کے تمام مسلمانوں کو نہ دیا جاتا، کیونکہ اسلام نے کسی کو ایسا حکم نہیں دیا جس پر عمل کرنا اس کی قدرت سے باہر ہو، تو اس آیت سے جب یہ ثابت ہوگیا کہ ''صادقین'' ہر زمانہ میں موجود رہیں گے تو یہ خود بخود ثابت ہوگیا کہ کسی زمانہ کے سب مسلمان کسی غلط کاری یا گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتے، کیونکہ کچھ لوگ بلکہ اکثر لوگ بھی اگر کوئی غلط کام یا فیصلہ کرنا چاہیں گے تو اس زمانہ کے ''صادقین'' اس سے اتفاق نہیں کرسکتے، معلوم ہوا کہ امت کا اجماعی فیصلہ کبھی گمراہی اور بے دینی کی بات پر یا حق کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ (۲)

چند احادیث:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں اجماع کی حقانیت کو اور زیادہ صراحت اور تاکید سے بیان فرمایا ہے۔ اس سلسلہ کی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا مجموعہ حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے، فقہا و محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے ان میں سے صرف وہ حدیثیں جو احقر کو سرسری تلاش سے دستیاب ہوگئیں ان کی روایت کرنے والے صحابۂ کرامؓ کی تعداد مجموعی طور پر بیالیس ہے، ذرا اہتمام سے جستجو کی جائے تو اس مضمون کی نہ جانے کتنی حدیثیں جو کتنے ہی مزید صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہوں گی اور مل جائیں، بہرحال جن صحابۂ کرامؓ کی روایتیں اس ناچیز کو چند روز کی سرسری تلاش میں ملی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر (۲) حضرت عمر (۳) حضرت علی (۴) حضرت عبداللہ بن مسعود (۵) حضرت ابن عباس (۶) حضرت عبداللہ بن عمر (۷) حضرت انس (۸) حضرت ابوسعید خدری (۹) حضرت ابوہریرہ (۱۰) حضرت حذیفہ بن الیمان (۱۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ (۱۲) حضرت معاویہ (۱۳) حضرت جابر بن عبداللہ (۱۴) حضرت ابومسعود انصاری (۱۵) حضرت ابوذر غفاری (۱۶) حضرت ثوبان (۱۷) حضرت قدامہ بن عبداللہ بن عمار الکلابی (۱۸) حضرت ابومالک اشعری (۱۹) حضرت عرفجہ (۲۰) حضرت حارث اشعری (۲۱) حضرت عامر بن ربیعہ (۲۲) حضرت فضالہ بن عبید (۲۳) حضرت ابوبصرہ (۲۴) حضرت زید بن ارقم (۲۵) حضرت جابر بن سمرہ (۲۶) حضرت ابوامامہ (۲۷)

---

(۱) پوری آیت اس طرح ہے: ''لَیْسَ البِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِالْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ''. (سورۃ البقرۃ: ۱۷۶، ۱۷۷)

(۲) تفسیر کبیر: ج ۴، ص ۵۱۳۔

حضرت سعد بن وقاص (۲۸) حضرت مرۃ البہزی (۲۹) حضرت قرۃ (۳۰) حضرت عقبہ بن عامر (۳۱) حضرت معاذ ابن جبل (۳۲) حضرت جبیر بن مطعم (۳۳) حضرت زید بن ثابت (۳۴) حضرت نعمان بن بشیر (۳۵) حضرت ابوالدرداء (۳۶) حضرت ابوقر صافہ (۳۷) حضرت اسامہ بن شریک (۳۸) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (۳۹) حضرت عوف بن مالک (۴۰) حضرت عمرو بن عوف (۴۱) حضرت عثمان غنی (۴۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔(۱)

ان حضرات میں بعض صحابۂ کرامؓ نے تو مذکورہ بالا مضمون کی کئی کئی حدیثیں روایت کی ہیں، لہذا حجیت اجماع پر دلالت کرنے والی احادیث کی تعداد تو بہت ہی زیادہ ہو جاتی ہے، پھر صحابۂ کرامؓ کے بعد ان احادیث کے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں بڑھتی ہی چلی گئی ہے ان میں ہر حدیث اگر چہ الگ الگ خبر واحد (غیر متواتر) ہے اور ان کے الفاظ بھی باہم مختلف ہیں مگر اتنی بات ان سب احادیث میں مشترک اور متواتر (۲) پائی جاتی ہے کہ اس وقت کا متفقہ فیصلہ یا عمل ہر خطاو لغزش سے پاک ہے اس طرح اجماع کا حجت ہونا تواتر سے روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے یہاں سب احادیث نقل کرنے کا تو موقع نہیں مثال کے طور پر چند ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق کوئی صریح حکم یا ممانعت (قرآن وسنت میں) موجود نہ ہو تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

"**شاوروا فيه الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأى خاصة**". کہ اس معاملہ میں تم فقہا اور عابدین سے مشورہ کرو اور کسی شخصی رائے کو نافذ نہ کرو۔(**الطبرانی فی الأوسط ورجاله موثقون من أهل الصحيح كذا فی مجمع الزوائد**)(۳)

معلوم ہوا کہ کسی زمانہ کے فقہا و عابدین متفقہ طور پر جس چیز کا حکم دیں یا ممانعت کریں اس کی مخالفت جائز نہیں، کیونکہ ان کا متفقہ فیصلہ غلط نہیں ہوسکتا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

"**لاتزال طائفة من أمتى يقاتلون على الحق ظاهرين إلى يوم القيامة**".(۴)

میری امت میں ایک جماعت (قرب) قیامت تک حق کے لئے سر بلندی کے ساتھ برسر پیکار رہے گی۔

---

(۱) ان سب صحابۂ کرامؓ کی روایتوں کے مفصل حوالے آگے احادیث کے ذیل میں مفصل آئیں گے۔

(۲) دیکھئے علامہ ابن ہمام کی کتاب التحریر کی شرح التقریر والتحریر لابن أمیر الحاج: ج ۳، ص ۸۵، مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ۔

(۳) مجمع الزوائد باب فی الإجماع: ج اول، ص ۱۷۸، طبع بیروت۔

(۴) مسلم شریف، کتاب الإیمان "باب نزول عیسی ابن مریم علیه السلام" ج اول، ص ۸۷، طبع کراچی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علاوہ مزید آٹھ صحابۂ کرامؓ نے بھی تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ (جس سے معنی نہیں بدلتے) روایت کیا ہے، ان حضرات کی روایتیں صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ مستند کتب حدیث میں مذکور ہیں، وہ آٹھ صحابۂ کرام یہ ہیں۔

(۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ(۱) (۲) حضرت ثوبان (۲) (۳) حضرت عمر فارق (۳) (۴) حضرت جابر بن سمرۃ (۵) حضرت ابوہریرہ (۶) حضرت زید بن ارقم (۷) حضرت ابوامامہ (۸) حضرت مرۃ البہزی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (۴)

امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے اس سے مراد اہل علم ہیں۔

بہرحال اس حدیث میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہر زمانے میں حق پر قائم رہے گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس امت کا مجموعہ کبھی کسی گمراہی یا غلط کاری پر متفق نہیں ہوسکتا۔

(۳) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خطبہ دیتے ہوئے مجمع عام میں سنایا کہ:

"لن یزال أمر هذه الأمة مستقیماً حتی تقوم الساعة". (۵)

اس امت کی حالت قیامت تک سیدھی اور درست رہے گی۔

معلوم ہوا کہ پوری امت کا مجموعہ کبھی کسی غلط بات پر متفق نہیں ہوسکتا۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اجماع کے حجت ہونے پر سب سے زیادہ صریح ہے کہ:

"إن الله لایجمع أمتی أوقال أمة محمد علٰی ضلا لة، وید الله علی الجماعة، ومن شذ شذ علی النار".

اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا، اور اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آٹھ صحابۂ کرامؓ نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ کسی نے تفصیل سے کام لیا ہے کسی نے اختصار سے، مگر اتنا جملہ سب صحابۂ کرامؓ نے نقل فرمایا کہ:

"امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ گمراہی پر متفق نہیں کرے گا"۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم "لاتزال طائفة من أمتی الخ" ج۲ص۱۰۸۷،

(۲) سنن أبوداؤد، کتاب الفتن، ج۲ص۵۸۳، ۵۸۴، طبع کراچی، سنن ابن ماجة، أبواب الفتن، باب مایکون من الفتن: ص۲۸۳،

(۳) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب "من یرد الله به خیراً، الخ ج اول ص۱۶۔

(۴) حضرت عمرؓ سے حضرت مرۃ البہزی رضی اللہ عنہ تک چھ حضرات صحابہ کی روایتیں علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اسانید ومتون اور اصل مأخذ کے حوالوں کے ساتھ نقل فرما کر سب کی سندوں کی توثیق فرمائی ہے، البتہ صرف حضرت مرۃ البہزی رضی اللہ عنہ کی روایت جو طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اس کی سند کے متعلق یہ کہا ہے کہ "وفیه جماعة لم أعرفهم" دیکھئے مجمع الزوائد: ج۷، ص۲۸۷ تا ۲۸۹ طبع بیروت ۱۹۶۷ء۔

(۵) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب "من یرد الله به خیراً" الخ ج اول، ص۱۶۔

اوپر حدیث کے جو الفاظ لکھے گئے ہیں یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے روایت کردہ ہیں۔(۱)
باقی سات صحابۂ کرامؓ جنھوں نے یہ حدیث روایت کی ہے یہ ہیں:
(۱) حضرت ابن عباس(۲) (۲) حضرت انس(۳) (۳) حضرت ابومالک اشعری(۴) (۴) حضرت ابوبصرہ(۵)
(۵) حضرت قدامہ بن عبداللہ عمار الکلابی(۶) (۶) حضرت ابوہریرہ(۷) (۷) حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین۔(۸)

---

(۱) جامع ترمذی، أبواب الفتن، باب لزوم الجماعة: ج۲، ص۴۹ طبع کراچی، ومستدرک حاکم، کتاب العلم: ج اول، ص۱۱۵، طبع دکن ۱۳۳۴ھ، ترمذیؒ نے اس حدیث کو ''حدیث غریب من هذا الوجه'' کہا ہے، مگر یہ ''غریب'' کہنا سند کے ایک خاص طریق کی بنا پر ہے ورنہ حاکمؒ نے اسی حدیث کی سند کو سات مختلف طرق سے بیان کیا ہے، ان سب طرق کا مدار معتمر بن سلیمان پر ہے جو ائمۂ حدیث میں سے ہیں اور ان میں کئی طریق سند کے لحاظ سے صحیح ہیں چنانچہ طریق اول میں معتمر کے شاگرد خالد کے متعلق حاکم فرماتے ہیں کہ ''خالد بن یزید القرنی شیخ قدیم للبغدادی لو حفظ هذا الحدیث لحکمنا له بالصحة'' پانچواں طریق جس میں معتمر کے شیخ سالم بن ابی الذیال'' ہیں اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ: هذا لو کان محفوظاً من الراوی لکان من شرط الصحیح'' کیونکہ بقول حافظ ابن حجر سلم بن ابی الذیال ثقہ ہیں اور ان سے ایک حدیث صحیح مسلم میں مروی ہے (تقریب التهذیب: ج اول، ص۳۱۳) حاکم نے ساتوں طریق بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ''إن المعتمر بن سلیمان أحد أئمة الحدیث وقد روی عنه هذا الحدیث بأسانید یصح بمثلها الحدیث فلا بد أن یکون له أصل بأحد هذه الأسانید (حاکم کی اس پوری تحقیق پر حافظ ذہبیؒ نے سکوت فرمایا جو ان کی توثیق کی علامت ہے۔

(۲) جامع ترمذی، حوالہ بالا، ومستدرک حاکم، حوالہ بالا، ج اول، ص۱۱۶۔

(۳) سنن ابن ماجة، أبواب الفتن، باب السواد الأعظم: ص۲۸۳ طبع کراچی، ومستدرک، کتاب العلم: ج اول، ص۱۱۶ و۱۱۷، وکتاب الفقیه والمتفقه للخطیب: جزو پنجم ص۱۶۱، مطبوعہ ریاض، ۱۳۸۹ھ۔

(۴) سنن أبی داؤد، کتاب الفتن: ج۲، ص۵۸۴، طبع کراچی، وجمع الفوائد: ج۲، ص۵۸۴، طبع المدینة المنورة، ابوداؤدؒ نے ابو مالک اشعری کی اس روایت پر سکوت کیا جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کی سند ان کی نزدیک قابل استدلال ہے۔

(۵) مجمع الزوائد بحواله مسند أحمد، باب فی الإجماع: ج اول، ص۱۷۷، طبع بیروت ۱۹۶۷ھ، والتقریر والتحریر بحواله أحمد والطبرانی: ج۳، ص۸۵، ابن امیر الحاج التقریر میں نقل فرماتے ہیں کہ ابوبصرہ کی اس روایت کے تمام راوی ''رجال صحیح'' ہیں سوائے ایک تابعی کے جو مبہم ہے، لیکن اس روایت کا ایک شاہد حدیث مرسل ہے، جس کے سب رجال صحیح ہیں اسے طبریؒ نے سورۂ انعام کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

(۶) مستدرک حاکم: ج۴، ص۵۰۷، حاکمؒ حضرت قدامہ کی اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''هذا الحدیث لم نکتب بهذا الإسناد إلا حدیثاً واحداً'' حافظ ذہبیؒ نے یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

(۷) کتاب الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادی: جزو خامس، ص۱۶۲، مطبوعہ ریاض، خطیب نے ابوہریرہؓ کی یہ روایت اپنی سند سے بیان کی ہے، اور سند پر کوئی کلام نہیں کیا۔

(۸) مستدرک حاکم: ج۴، ص۵۰۷، وفتح الباری: ج۱۳، ص۳۱، مطبوعہ بیروت ۱۳۰۱ھ، حافظ ابن حجرؒ اور حاکمؒ نے ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت موقوفاً بیان کی ہے حافظ ابن حجرؒ نے سکوت فرمایا ہے جو ان کی توثیق کی علامت ہے، اور حاکم نے اسے ''صحیح علی شرط مسلم'' قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ تو حدیث ہم نے مسنداً (غالباً مرفوعاً مراد ہیں، رفع) بھی اپنے پاس لکھی ہے، مگر اس کی سند شرط مسلم کے معیار پر نہیں (اس لئے مستدرک میں اسے ذکر نہیں کیا)۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکمؒ کی اس پوری تحقیق پر یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

ان آٹھ صحابۂ کرامؓ کے علاوہ اس حدیث کو مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی صحابی کا حوالہ دیئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔(۱)

(۵)　حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حاضرین کے سامنے خطبہ دیا، اور فرمایا کہ آج میں تمہارے سامنے اس طرح خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے کھڑے ہوئے تھے، اور آپ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''أوصيكم بأصحابي ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم، ثم يفشو الكذب حتى يحلف الرجل ولا يستحلف ويشهد ولا يستشهد فمن أراد منكم بحبوبة الجنة فليلزم الجماعة فإن الشيطان مع الواحد وهو من الإثنين أبعد''. (رواه الترمذي في الجامع والحاكم في المستدرك واللفظ له، قال الحاكمؒ: هذا حديث صحيح علىٰ شرط الشيخين ولم يخرجاه وأقره الذهبي)(۲)

میں تم کو اپنے صحابہؓ (کی پیروی) کی وصیت کرتا ہوں، پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان کے بعد ہوں گے (یعنی تابعین) پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان تابعین کے بعد ہوں گے (یعنی تبع تابعین) پھر جھوٹ پھیل جائے گا حتی کہ آدمی قسم کھائے گا، حالانکہ اس سے کسی نے قسم کا مطالبہ نہ کیا ہوگا اور گواہی دے گا حالانکہ اس سے کسی نے گواہی طلب نہ کی ہوگی، پس تم میں سے جو شخص جنت کے بیچوں بیچ رہنا چاہتا ہو وہ ''الجماعة'' (۳) (مخصوص جماعت) کو لازم پکڑ لے (یعنی اپنے اعتقاد اور افعال میں اس جماعت کا اتباع کرے) کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے زیادہ دور رہتا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبع تابعین کے بعد دنیا میں جھوٹ پھیل جانیکی خبر دی ہے، مگر ساتھ ہی ''الجماعة'' (مخصوص جماعت) کے ساتھ رہنے اور اس کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دینی اعتبار سے بگڑے ہوئے زمانے میں بھی امت میں ایک خاص ''جماعت'' ایسی موجود رہے گی جو حق پر ہوگی اور اس کا اتباع واجب ہوگا، جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو پیچھے کئی آیات (احادیث سے معلوم ہو گیا ہے، کہ امت کا پورا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگا، رہی یہ بات کہ ''الجماعة'' سے مسلمانوں کی کیسی جماعت مراد ہے؟ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

''الجماعة'' کے ساتھ رہنے اور اس کی اتباع کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

(۱)　دیکھئے: التقرير والتحرير: ج۳، ص۸۵، وتفسير القرآن العظيم لابن جرير الطبري، سورۂ أنعام، ج۷، ص۱۳۷، علامہ ابن امیر الحاجؒ نے حضرت حسن بصریؒ کی اس مرسل روایت کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے تمام راوی صحیح کے رجال ہیں۔

(۲)　جامع الترمذی: ج۲، ص۴۸ و۴۹، مطبوعہ قرآن محل کراچی، ومستدرک حاکم: جلد اول، ص۱۱۴، امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ''حسن صحيح غريب من هذا الوجه'' کہا ہے اور حاکمؒ اور حافظ ذہبیؒ دونوں نے اسے صحيح علىٰ شرط الشيخين قرار دیا ہے۔

(۳)　''الجماعة'' عربی زبان میں مخصوص جماعت کو کہتے ہیں جس کی تشریح آگے آئے گی۔

نے اس حدیث میں نقل فرمایا ہے اسے چار اور صحابۂ کرام (۱) حضرت سعد بن ابی وقاص (۱) (۲) حضرت عبداللہ بن عمر (۲) (۳) حضرت حذیفہ (۳) اور (۴) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے۔ (۴)

(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ کی مسجد خیف میں خطبۂ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا کہ:

"ثلاث لايغل عليهن قلب مسلم إخلاص العمل لله، والنصيحة للمسلمين ولزوم جماعتهم فإن دعوتهم تحيط من ورائهم".

تین خصلتیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا عمل میں اللہ کیلئے اخلاص، مسلمانوں کی خیر خواہی اور جماعت مسلمین کا اتباع، کیونکہ ان کی دعا پیچھے سے ان کا احاطہ کئے ہے (جو ان کو گمراہی اور نفس وشیطان کی حیلہ سازیوں سے بچاتی ہے۔)

معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے اعتقاد اور عمل میں جماعت مسلمین کی اتباع کرے گا، خیانت اور گمراہی سے محفوظ رہے گا، اس حدیث کا حاصل بھی وہی ہے کہ جماعت مسلمین کا متفقہ عقیدہ یا عمل کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

اس حدیث کو دس صحابۂ کرامؓ نے روایت کیا ہے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

(۱) حضرت ابن مسعود (۵) (۲) حضرت انس (۶) (۳) حضرت جبیر بن مطعم (۷) (۴) حضرت زید بن ثابت (۸) (۵) حضرت نعمان بن بشیر (۹) (۶) حضرت ابوسعید خدری (۱۰) (۷) حضرت ابوالدرداء (۱۱) (۸) حضرت معاذ بن جبل

---

(۱) مستدرک حاکم، ج اول، ص ۱۱۴ و ۱۱۵، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو بھی سنداً صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) مستدرک حاکم، ج اول، ص ۱۱۴۔

(۳) صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب کیف الامر اذا لم یکن جماعۃ، ص ۱۰۴۹ ج ۲ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظہور الفتن ص ۱۲۷ ج ۲۔

(۴) مشکوۃ شریف: ج ۱، ص ۳۱، كتاب العلم، باب الاعتصام بالكتاب والسنة بحواله مسند أحمد۔

(۵) مشكوة المصابيح، كتاب العلم، الفصل الثانى: ج اول، ص ۳۵، اصح المطابع کراچی، بحوالہ امام شافعی وبیہقی، و نیز دیکھیے: الرسالہ "للإمام الشافعیؒ" الجزء الثالث، ص ۴۰۱ تا ص ۴۰۳، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، الطبعۃ الأولیٰ ۱۳۸۵ھ امام شافعی نے اس حدیث سے بھی اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔

(۶) مسند احمد، ج ۳، ص ۲۲۵، مطبوعہ بیروت۔

(۷) سنن ابن ماجة، كتاب المناسک، باب الخطبة يوم النحر: ص ۲۱۹، اصح المطابع کراچی، ابن ماجہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد خطبہ الوداع میں منیٰ کی مسجد خیف میں فرمایا تھا اور مجمع الزوائد میں تو اس کی پوری صراحت ہے دیکھئے۔ مجمع الزوائد ج ۱، ص ۱۳۷ تا ۱۳۹، و مسند احمد ص ۸۰ و ۸۲ ج ۴، و مستدرک حاکم، کتاب العلم، باب "ثلاث لايغل عليهن الخ ج اول، ص ۸۶ تا ۸۸، حاکم اور ذہبی دونوں نے انکی روایت کو صحیح على شرط الشيخين کہا ہے۔

(۸) مسند احمد ص ۱۸۳ ج ۵۔

(۹) مستدرک کتاب العلم، باب "ثلاث لایغل علیهن الخ ص ۸۸ ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے۔

(۱۰) حضرت ابوسعید خدریؓ سے حضرت ابوقرصافہؓ تک پانچ صحابۂ کرام کی روایتیں علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں قدرے ضعیف یا غیر موثق سندوں سے ذکر کی ہیں۔ ج ۱، ص ۱۳۷ تا ص ۱۳۹۔

(۱۱) ابوقرصافہ، ان کی کنیت اور نام جندرۃ بن خیشنۃ ہے علامہ ابن الاثیر جزریؒ نے اسد الغابہ میں کہا ہے کہ یہ صحابی ہیں، فلسطین جا کر آباد ہوگئے تھے، شام کے محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اسد الغابہ میں ان کے والد کا نام ایک جگہ "خیشنہ" اور دوسری جگہ "حبشیۃ" لکھا ہے، بہ ظاہر پہلا ہی نام صحیح ہے، کیونکہ اس کے حروف کو علامہ جزریؒ نے ضبط کیا ہے، دوسرے کو ضبط نہیں کیا ہے، دیکھئے اسد الغابہ ص ۳۰۷ ج و ص ۳۷۷ ج ۵ مجمع الزوائد میں ان صحابی کا نام "حیدرہ بن خیثمۃ" لکھا ہے جو بظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، دیکھئے مجمع الزوائد ج ۱/ ص ۱۳۸۔

(۹) حضرت جابر (۱۰) حضرت ابوقر صافہ(۱) رضی اللہ عنہم اجمعین۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

’’يد اللّٰه علىٰ الجماعة ومن شذ شذ إلى النار‘‘.

اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے اور جو شخص (ان سے) الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

معلوم ہوا کہ ’’الجماعة‘‘ (مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت) کو اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و رہنمائی حاصل ہے، جو اس کو ہر خطا سے بچاتی ہے، ان کے متفقہ عقیدہ یا عمل کے خلاف جو بات ہوگی غلط اور باطل ہوگی، اسی لئے پچھلی احادیث میں ’’الجماعة‘‘ کی اتباع کا حکم بڑی تاکید سے دیا گیا ہے، اور یہاں الجماعة سے الگ راستہ اختیار کرنے والوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کا راستہ جہنم کا راستہ ہے۔

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے۔(۲) اور اس کا پہلا جملہ ’’يد اللّٰه علىٰ الجماعة‘‘ مزید دو صحابۂ کرام (۱) حضرت عبداللہ بن عباس (۳) اور (۲) حضرت عرفجہ (۴) رضی اللہ عنہما نے بھی روایت کیا ہے۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’من فارق الجماعة شبراً فمات ميتة جاهلية‘‘ (رواه البخاري ومسلم والخطيب وغيرهم عن ابن عباس وغيره)

جس شخص نے جماعت (مسلمین) سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

’’جاہلیت‘‘ قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس دور کو کہا گیا ہے جب عرب میں کفر کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اسلام کا سورج طلوع نہ ہوا تھا، اس حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ’’الجماعة‘‘ سے علیحدگی اختیار کرنے یعنی ان کے متفقہ فیصلے، عقیدے یا عمل کی مخالفت کو کتنا سنگین جرم قرار دیا ہے، آپ نے اس کی ممانعت میں اتنی تاکید سے کام لیا کہ معتبر کتب حدیث میں صرف اسی مضمون کی اٹھارہ حدیثیں راقم الحروف کو ملی ہیں جو سولہ صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہیں، ان میں ’’الجماعة‘‘ سے علیحدگی کی نہ صرف شدید مذمت کی گئی، بلکہ اس پر دنیا و آخرت کی سخت سزائیں مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں بیان فرمائی ہیں، کئی حدیثوں میں ارشاد ہے کہ جس

(۱) ابوقر صافہ، ان کنیت اور نام جندرہ بن خیشنة ہے، علامہ ابن الاثیر جزری نے اسد الغابة میں کہا ہے ہ یہ صحابی ہیں فلسطین جا کر آباد ہو گئے تھے، شام کے محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اسد الغابة میں ان کے والد کا نام ایک جگہ خیشنة اور دوسری جگہ حبشیة لکھا ہے، بظاہر پہلا ہی نام صحیح ہے کیوں کہ اس کے حروف عالمہ جزری نے ضبط کیا ہے، دوسرے وضبط نہیں کیا، دیکھئے اسد الغابة ص ۳۰۷ ج و ص ۳۷۷ ج ۵، مجمع الزوائد میں ان صحابی کا نام حیدرہ بن خیثمہ لکھا ہے، جو بظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، دیکھئے مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۳۸۔

(۲) جامع ترمذی، أبواب الفتن، باب لزوم الجماعة: ج ۲ ص ۳۹، مستدرک حاکم، کتاب العلم: ج ۱ ص ۱۱۵، اس حدیث کی سند کا مفصل حال حدیث نمبر ۴ کے متعلقہ حاشیہ میں پیچھے بیان ہو چکا ہے، کیونکہ یہ حدیث درحقیقت حدیث نمبر ۴ ہی کا آخری حصہ ہے۔

(۳) جامع ترمذی حوالہ بالا و مستدرک حوالہ بالا: ج ۱ ص ۱۱۶۔

(۴) سنن نسائی: ج ۲ ص ۱۵۸، و کتاب الفقیه و المتفقه: جزء خامس ص ۱۶۲۔

(ي) واللفظ لصحیح البخاری: ۷۰۵۴، کتاب الفتن)

نے ''**الجماعة**'' سے بالشت بھر علیحدگی اختیار کی اور مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا، کچھ حدیثوں میں ارشاد ہے کہ:

''**فقد خلع ربقة الإسلام من عنقه**''.

اس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن سے نکال دیا۔

کہیں ارشاد ہے کہ:

''**دخل النار**''. وہ آگ میں داخل ہوگا۔

کہیں ارشاد ہے کہ:

''**فلا حجة له**''. اس کے پاس کوئی دلیل نہ رہی (جس کی بنا پر اسے معذور قرار دیا جا سکے اور وہ عذاب سے بچ سکے)۔

کہیں ارشاد ہے:

''**فلا تسئل عنهم**''. ایسے لوگوں کا کچھ حال نہ پوچھو (کہ ان پر آخرت میں کیا عذاب ہونے والا ہے)۔

کہیں فرمان ہے کہ:

''**فاقتلوه**''. اسے قتل کر ڈالو۔

کہیں حکم ہے کہ:

''**فاضربوا عنقه كائناً من كان**''. اس کی گردن مارو خواہ کوئی بھی ہو۔

کہیں فرمایا کہ:

''**فإن الشيطان مع من فارق الجماعة يركض**''.

جو شخص ''الجماعۃ'' سے علیحدگی اختیار کرے اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو اسے گناہوں کی طرف ایڑ لگاتا (دوڑاتا) رہتا ہے۔

کہیں فرمایا ہے:

''**اقتلوا الفذ من كان من الناس**''.

علیحدگی اختیار کرنے (الجماعۃ کی مخالفت کرنے) والے کو قتل کرو، وہ کوئی بھی آدمی ہو۔

کہیں ارشاد فرمایا:

''**وأما ترك السنة فالخروج من الجماعة**''. ترک سنت یہ ہے کہ ''**الجماعة**'' سے خارج ہو جائے۔

ایک حدیث صحیح میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ کسی کلمہ گو مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں حلال ہوتا ہے، جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ:

''**التارك لدينه المفارق للجماعة**''.

اپنے دین کو چھوڑنے والا (یعنی) ''**الجماعة**'' سے علیحدگی اختیار کرنے والا ہو۔

جن صحابۂ کرامؓ نے یہ حدیثیں روایت کی ہیں، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس (۱) (۲) حضرت عثمان غنی (۲) (۳) حضرت عرفجہ (۳) (۴) حضرت اسامہ بن شریک (۴) (۵) حضرت عائشہ (۵) (۶) حضرت ابو ہریرہ (۶) (۷) حضرت ابو ذر غفاری (۷) (۸) حضرت حارث اشعری (۸) (۹) حضرت معاویہ (۹) (۱۰) حضرت ابن عمر (۱۰) (۱۱) حضرت حذیفہ (۱۱) (۱۲) حضرت عامر بن ربیعہ (۱۲) (۱۳) حضرت فضالہ بن عبید (۱۳) (۱۴) حضرت ابن مسعود (۱۴) (۱۵) حضرت ابو مالک اشعری (۱۵) (۱۶) حضرت ابوبکر

---

(۱) صحیح بخاری، اول، کتاب الفتن، باب ماجاء في قول اللّٰه "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ ظَلَمُوْا "۔جلد ثانی، ص۱۰۴۵، و صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب وجوب ملازمة المسلمين: ج ثانی، ص۱۲۸ و کتاب الفقيه و المتفقه: جز و خامس، ص۱۶۴۔

(۲) ان کی روایت "التارک لدينه المفارق للجماعة" کے لئے دیکھئے جامع ترمذی: باب ماجاء لايحل دم امرأ مسلم إلا بإحدٰى ثلاث، أبواب الديات: ج اول، ص۲۰۳۔

(۳) ان کی روایت" فاضربوه بالسيف" کے لئے دیکھئے صحیح مسلم: کتاب الإمارة، باب حکم من فرق أمر المسلمين: ج ثانی، ص۱۲۸، و سنن نسائی، کتاب المحاربة "قتل من فارق الجماعة" جلد ثانی، ص۱۵۸، و سنن أبوداؤد، کتاب السنة، باب قتل الخوارج: جلد ثانی، ص۶۵۵۔

(۴) ان کی روایت "فاضربوا عنقه" کے لئے دیکھئے: سنن نسائی حوالۂ بالا۔

(۵) ان کی روایت "التارک لدينه المفارق للجماعة" کے لئے دیکھئے صحیح مسلم، کتاب القسامة والقصاص، باب مايباح به دم المسلم: ج ثانی، ص۵۹، و ترمذی، أبواب الديات، باب ماجاء لايحل دم امرأ مسلم الخ، ج اول، ص۲۰۳۔

(۶) ان کی روایت "مات ميتة الجاهلية" کے لئے دیکھئے: سنن نسائی، کتاب المحاربة "التغليظ فيمن قاتل تحت راية عمية" ج ثانی، ص۱۶۸، و مستدرک، کتاب العلم "من فارق الجماعة" الخ ج اول، ص۱۱۸ و ۱۱۹، حاکم اور ذہبی نے ابو ہریرہؓ کی اس روایت کی سند کے متعلق کہا ہے کہ "قد اتفقا علٰى إخراج أبي هريرةؓ في مثل هذا"، نیز ابو ہریرہؓ ہی کی روایت "وأما ترک السنة فالخروج من الجماعة" کے لئے دیکھئے: مستدرک، کتاب العلم: ج اول، ص۱۲۰، اس روایت کو حاکم اور ذہبی نے "صحيح علٰى شرط مسلم" قرار دیا ہے۔

(۷) ان کی روایت "قد خلع ربقة الإسلام من عنقه" کیلئے دیکھئے سنن أبوداؤد، کتاب السنة، باب قتل الخوارج ج ثانی، ص۶۵۵، ابوداؤد نے ان کی روایت کی سند پر کوئی کلام نہیں کیا، نیز دیکھئے مستدرک: ج اول، ص۱۱۷، قال الذہبی فی سنده "خالد لم يضعف"۔

(۸) ان کی روایت میں بھی وہی الفاظ ہیں جو ابو ذرؓ کی روایت میں ہیں، دیکھئے: جامع ترمذی، أبواب الأمثال، باب ماجاء في مثل الصلوٰة والصيام الخ ج۲، ص۱۲۹، امام ترمذیؒ نے ان کی روایت کو حدیث حسن صحیح غریب کہا ہے اور اسی حدیث کا ایک اور طریق بھی بیان کیا ہے نیز دیکھئے: مستدرک کتاب العلم ج اول، ص۱۱۷ و ۱۱۸۔

(۹) مستدرک، ج اول، ص۱۱۸، حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت "من فارق الجماعة شبراً دخل النار" کی سند پر سکوت کیا ہے۔

(۱۰) ان کی روایت فلاحجة له کی سند کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "قد اتفقا علٰى إخراج أبي هريرة مثل هذا" دیکھئے: مستدرک مع تلخیص: ج اول، ص۱۱۸ و ۱۱۹، نیز ابن عمرؓ ہی کی ایک اور روایت "أخرج من عنقه ربق الإسلام" کے لئے دیکھئے: کتاب الفقيه والمتفقه: جزء خامس، ص۱۶۴۔

(۱۱) مستدرک: ج اول، ص۱۱۹، حافظ ذہبیؒ نے ان کی روایت کردہ حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(۱۲) ان کی روایت "مات ميتة الجاهلية" کے لئے دیکھئے: کتاب الفقيه والمتفقة: جز و خامس، ص۱۶۳۔

(۱۳) مستدرک: ج اول، ص۱۱۹، حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت "فلا تسأل عنهم" کو صحيح علٰى شرط الشيخين کہا ہے۔

(۱۴) ان کی روایت "فاقلتوه" کے لئے دیکھئے: کتاب الفقيه والمتفقه: جز و خامس، ص۱۶۴، نیز ان کی ایک اور روایت "التارک لدينه المفارق للجماعة" کے لئے دیکھئے: کتاب القسامة والقصاص، باب مايباح به دم المسلم: ج۲ ص۵۹، و ترمذی أبواب الديات، باب ماجاء لايحل دم امرأ مسلم: ج اول، ص۲۰۳۔

(۱۵) حوالہ ایضاً۔

(۱) رضی اللہ عنہم اجمعین۔

(۹) حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

"إن أمتي لا تجمع علىٰ ضلالة فإذا رأيتم اختلافاً فعليكم بالسواد الأعظم". (۲)

میری امت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی پس جب تم لوگوں میں اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑلو (یعنی اس کی اتباع کرو)

اس حدیث کا پہلا جملہ تو پیچھے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آچکا ہے، یہاں اس کا دوسرا جملہ "پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑو" بیان کرنا مقصود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دوسرا جملہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک اور روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:

"فاتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ شذ في النار". (۳)

پس تم سواد اعظم کی اتباع کرو کیونکہ جو شخص الگ الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم میں جائے گا۔

معلوم ہوا کہ امت کا سواد اعظم ہمیشہ حق پر رہے گا، یعنی کبھی غلط بات پر متفق نہ ہوگا ورنہ اس کے اتباع کا حکم نہ دیا جاتا۔

"الجماعۃ" اور "سواد اعظم" سے کیا مراد ہے:

"السواد الأعظم" عربی زبان میں "عظیم ترین جماعت" کو کہا جاتا ہے، یہاں مسلمانوں کا وہ فرقہ مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریقہ پر ہو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابۂ کرام کے طریقہ کو حق اور واجب الاتباع سمجھتا ہو اور اس کی مخالفت کو باطل قرار دیتا ہو، چنانچہ چار صحابۂ کرام، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوامامہ، حضرت واثلہ بن الاسقع اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "سواد اعظم" کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "وہ لوگ ہیں جو اس طریقہ پر ہوں جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے"۔ (۴) یہی مضمون اگلی حدیث میں بھی وضاحت سے آرہا ہے:

(۱) یہ اسم گرامی سب سے پہلے لکھنا چاہیے تھا مگر ان کی روایت "اقتلوا الفذ" الخ جس سند سے منقول ہے اس میں ایک راوی "صالح بن میثم" ہیں جن کے بارے میں حافظ ہیثمی نے کہا ہے کہ میں ان کو نہیں جانتا، اس سند کے باقی راوی ثقہ ہیں دیکھئے: مجمع الزوائد ج سادس، ص ۲۳۳۔

(۲) سنن ابن ماجة، أبواب الفتن، باب السواد الأعظم: ص ۲۸۳۔

(۳) مستدرک، کتاب العلم: ج اول، ص ۱۱۵، حاکم نے ابن عمر کی یہ روایت دو طریق سے نقل کی ہے اور دونوں کے بارے میں صحت سند کا رجحان ظاہر کیا ہے، مگر صحت کا فیصلہ نہیں کیا، حافظ ذہبیؒ نے سکوت کیا ہے۔

(۴) مجمع الزوائد، کتاب العلم "باب ماجاء في المراء، ج اول، ص ۱۵۶، کتاب الفتن باب افتراق الامم: ج سابع، ص ۲۵۹، بحوالۂ طبرانی الکبیر حافظ ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی کثیر بن مروان ہیں جو بہت ضعیف ہیں لیکن راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جو مضمون اس روایت میں بیان کیا گیا ہے وہی مضمون اگلی حدیث نمبر ۱۰ میں قوی سند کے ساتھ آرہا ہے، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مضمون کے ثابت ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ (رفیع)

(۱۰)　حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''إن بني إسرائيل تفرقت علٰى ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي علٰى ثلاث وسبعين ملة كلهم في النار إلاملة واحدة، قالوا: من هي يارسول اللّٰه؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي''. (۱)

بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، یہ سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے علاوہ مزید پانچ صحابۂ کرامؓ نے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ روایت کیا ہے، جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت معاویہ (۲) (۲) حضرت عوف بن مالک (۳) (۳) حضرت انس (۴) (۴) حضرت عمرو بن عوف (۵) (۵) حضرت ابوامامہ (۶) رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان سب حضرات کی روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرنے میں متفق ہیں کہ ''میری امت تہتر فرقوں میں (۷) بٹ جائے گی، جن میں سے ایک فرقہ نجات پائے گا، باقی سب فرقے آگ میں جائیں گے''، رہا یہ سوال کہ وہ نجات یافتہ فرقہ کونسا ہے؟ تو اس کا جواب ان روایتوں میں مختلف الفاظ سے دیا گیا ہے ایک جواب حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت میں اوپر آیا ہے کہ وہ ''وہ فرقہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں'' یہ وہی بات ہے جو پچھلی حدیث (نمبر ۹) میں ''السواد الأعظم'' کے متعلق فرمائی گئی ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس فرقہ کو ''السواد الأعظم'' کے نام سے تعبیر فرمایا گیا ہے، حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ وہ فرقہ ''الإسلام وجماعتهم'' ہے یعنی ''اسلام اور مسلمانوں کی جماعت''، باقی تینوں صحابۂ کرامؓ کی روایتوں میں ہے کہ وہ فرقہ ''الجماعة'' ہے۔

(۱)　جامع ترمذی، أبواب الإیمان ''باب افتراق هذه الامة: ج ثانی، ص ۱۰۴، امام ترمذیؒ نے یہ حدیث قوی سند سے روایت کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ ''هذاحديث حسن غريب مفسر لانعرفه مثل هذا إلامن هذا الوجه''۔

(۲)　سنن أبوداؤد، أول كتاب السنة: ج ثانی، ص ۶۳۱، ومشکوٰۃ: ج اول، ص ۳۰، بحوالۂ ترمذی۔

(۳)　سنن ابن ماجة، أبواب الفتن، باب افتراق الأمم: ص ۲۸۷۔

(۴)　مجمع الزوائد، كتاب قتال أهل البغي، باب ماجاء في الخوارج: ج سادس، ص ۲۲۶، وباب افتراق الأمم: ج سابع، ص ۲۵۸، وكتاب الفقيه والمتفقه للخطيب: جزو خامس، ص ۱۶۵۔

(۵)　مجمع الزوائد، كتاب الفتن، باب افتراق الأمم: ج ۷ ص ۲۶۰۔

(۶)　حوالۂ بالا: ص ۲۵۸ بحوالۂ ''طبراني في الأوسط والكبير'' علامہ ہیثمیؒ نے اس کی سند کی توثیق کی ہے۔

(۷)　سوائے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے کہ انہوں نے کل بہتر کا عدد روایت کیا ہے، باقی مضمون انہوں نے بھی وہی نقل فرمایا ہے جو دوسرے صحابۂ کرامؓ کی روایتوں میں ہے۔

روایات کی اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آئیں:

(۱)　وہ نجات یافتہ فرقہ ان لوگوں کا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابۂ کرامؓ کی سنت کے پیرو ہوں گے۔

(۲)　یہاں جو صفت اس نجات یافتہ فرقہ کی بیان فرمائی گئی وہی صفت پیچھے حدیث (نمبر۹) میں "**السواد الأعظم**" کی بیان کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کا نام "**السواد الأعظم**" ہے۔

(۳)　اس نجات یافتہ فرقہ کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض روایات میں ''**السواد الأعظم**'' اور بعض روایات میں ''**الجماعة**'' بتایا ہے۔

ان تینوں باتوں میں حاصل یہ ہوسکتا ہے کہ ''**السواد الأعظم**'' اور ''**الجماعة**'' درحقیقت اس نجات پانے والے ایک فرقہ کے دو نام ہیں، اور یہ فرقہ ایسے لوگوں کا مجموعہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے طریقہ پر قائم ہوں صرف انہی لوگوں کا راستہ راہِ ہدایت ونجات ہے، اس کے خلاف سب راستے گمراہی اور جہنم کی طرف جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پیچھے حدیث (نمبر۵ تا نمبر۹) میں ''**الجماعة**'' اور ''**سواد أعظم**'' کے اتباع کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے، جن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ ''ان پر اللہ کا ہاتھ ہے'' ان کے اتباع کی تاثیر یہ بتائی گئی کہ وہ نفس وشیطان کی حیلہ سازیوں سے بچاتا ہے اور اس کی مخالفت کی سزا دنیا میں سزائے موت اور آخرت میں جہنم کی آگ مقرر فرمائی گئی ہے۔ (نعوذ باللہ منهما)

بہر حال زیر بحث (حدیث نمبر۱۰) سے بھی وہ بات معلوم ہوئی جو پچھلی تمام احادیث سے ثابت ہوتی آرہی ہے کہ امت میں فساد اور بگاڑ پھیل جانے کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ حق پر قائم رہے گا، پوری امت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگا، جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو ''حجیت اجماع'' کا حاصل ہے کہ ''امت کا متفقہ عقیدہ عمل یا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا، اس کا اتباع فرض اور مخالفت سخت حرام ہے۔

یہاں تک حجیت اجماع پر ہم نے قرآن حکیم کی پانچ آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دس حدیثیں بیان کی ہیں جو بیالیس صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہیں، ظاہر ہے کہ ان صحابۂ کرامؓ سے یہ حدیثیں سن کر روایت کرنے والے تابعین کی تعداد اور ان کے بعد سے اب تک ان حدیثوں کو بعد کے لوگوں تک پہونچانے والے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھتے ہی چلی گئی ہے، ان میں سے ہر حدیث الگ الگ اگر چہ متواتر نہ ہو مگر ان سب احادیث کا مشترک مضمون جو اجماع کی حجیت کو ثابت کرتا ہے متواتر ہے۔ (۱) لہذا تواتر سے اجماع کا حجت ہونا اور فقہ کے لئے عظیم مأخذ ہونا قرآن وسنت کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح ہے۔

---

(۱)　تواتر کی اس قسم کو ''تواتر فی القدر المشترک'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی تواتر کی باقی قسموں کی طرح علم قطعی یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ (رفیع)

یہ سب وہ آیات واحادیث ہیں جن سے اجماع کے حجت ہونے پر فقہا اور محدثین ومفسرین نے عام طور پر استدلال کیا ہے، بعض علماء محققین نے اور بھی کئی آیات واحادیث سے استدلال (۱) کیا ہے مگر ہم نے اختصار کے پیش نظر صرف وہ آیات واحادیث یہاں ذکر کی ہیں جو اجماع کی حجیت میں زیادہ واضح تھیں، مطالعہ کے دوران اس سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ کے اقوال وآثار بھی سامنے آئے مثال کے طور پر چند یہ ہیں۔

حجیت اجماع پر چند آثار صحابہؓ:

(۱) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

''ماراٰہ المسلمون حسناً فھو عند اللّٰہ حسن و ماراٰہ المسلمون قبیحاً فھو عنداللّٰہ قبیح''. (۲)

جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھی اور جس کو تمام مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بری ہے۔

(۲) امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور قاضی ''شریح'' کو عدالتی فیصلوں کے لئے جو بنیادی اصول لکھ کر بھیجے ان میں تیسرا اصول یہی تھا کہ جس مسئلہ کا حکم قرآن وسنت میں (صریح طور پر) نہ ملے اس میں اس امت کے اجماعی فیصلہ پر عمل کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سرکاری فرمان امام شعبی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ:

''کتب عمرؓ إلٰی شریح أن اقض بما فی کتاب اللّٰہ فإن أتاک أمر لیس فی کتاب اللّٰہ فاقض بما سن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فإن أتاک أمر لیس فی کتاب اللّٰہ ولم یسنہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

---

(۱) مثلاً سورۂ نساء کی آیت: ''یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ''. (سورۃ النساء:۵۹)
اور سورۂ اعراف کی آیت ''وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّۃٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ''۔ (سورۃ الاعراف:۱۸۱)
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''یوشک أن تعرفوا أھل الجنۃ من أھل النار'' أو قال ''خیارکم من شرارکم، قیل یارسول اللّٰہ بماذا؟ قال بالثناء الحسن والثناء السیء، أنتم شھداء بعضکم علی بعض''. (مستدرک، کتاب العلم: ج اول، ص۱۲۰، قال الحاکم ھذا حدیث صحیح الإسناد وقال الذھبی ''صحیح''.

(۲) موطأ امام محمدؒ، کتاب الصلوٰۃ، باب قیام شھر رمضان: ص۱۴۰، ومجمع الزوائد: ج اول، ص۱۷۸، بحوالہ أحمد والبزار والطبرانی فی الکبیر، وقال رجالہ موثقون، امام محمدؒ نے موطأ میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے، مگر سند ذکر نہیں فرمائی، ان تک یہ ارشاد ضروری قابل اعتماد سند سے پہنچا ہوگا، اور ظاہر بھی یہی ہے کہ یہ حضرت ابن مسعودؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا کیونکہ اتنا بڑا قاعدہ کلیہ جو اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسندیدگی کی خبر دے رہا ہو محض قیاس سے دریافت نہیں کیا جاسکتا، یہ بات صرف وحی سے ہی معلوم ہوسکتی ہے، اور صاحب وحی بتلاسکتا ہے۔ مگر ہم نے اس ارشاد کو احادیث نبویہ کے بجائے آثار صحابہؓ میں اس لئے شمار کیا ہے کہ جن قابل اعتماد سندوں سے یہ ہم تک پہنچا ہے وہ سب ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جاکر ختم ہوجاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتیں بعض سندوں میں یہ ضرور ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ارشاد نبوی بتاکر روایت کیا ہے، مگر وہ سندیں قابل اعتماد نہیں، تفصیل کیلئے دیکھئے ''التعلیق الممجد علی موطا الإمام محمدؒ: ص۱۴۰و۱۴۱۔

علیہ وسلم فانظر ما الذی اجتمع علیہ الناس، فإن جاء ک أمر لم یتکلم فیہ أحد فأی الأمرین شئت فخذ بہ إن شئت فتقدم وإن شئت فتأخر ولا أری التأخر إلا خیراً لک". (۱)

حضرت عمرؓ نے شریح کو لکھ کر بھیجا کہ تم فیصلے قرآن حکیم کے مطابق کرو، اور اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا (صریح) حکم قرآن شریف میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو، اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم (صریح طور پر) نہ قرآن حکیم میں ہو نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں، تو تم اسکے لئے وہ فیصلہ تلاش کرو جس پر سب لوگ متفق ہو چکے ہوں، اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آجائے جس کے متعلق کسی کا فیصلہ موجود نہ ہو (نہ قرآن میں نہ سنت میں نہ اجماع میں) تو اب دو صورتوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرلو یعنی چاہو تو آگے بڑھ کر (اپنے اجتہاد سے فیصلہ کردو) اور چاہو تو پیچھے ہٹ جاؤ (یعنی اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کے بجائے اہل علم سے پوچھ کر عمل کرو) اور میں تمہارے لئے ایسے موقع پر پیچھے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔

(۳) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ:

"اتقوا اللّٰہ وعلیکم بالجماعۃ فإن اللّٰہ لم یکن لیجمع أمۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم علیٰ ضلالۃ". (۲)

اللہ سے ڈرو اور "الجماعۃ" کے ساتھ ساتھ رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو کبھی بھی کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔

اجماع کا فائدہ اور "سند اجماع":

یہاں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اجماع کے حجت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجماع کرنے والوں کو شرعی احکام میں نعوذ باللہ خدائی اختیارات مل گئے ہیں کہ وہ قرآن وسنت سے آزاد ہوکر جس چیز کو چاہیں حرام اور جس کو چاہیں حلال کردیں، خوب سمجھ لینا چاہئے کہ فقہ کا کوئی مسئلہ قرآن یا سنت کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا، اجماع کا بھی ہر فیصلہ قرآن وسنت کا محتاج ہے، چنانچہ فقہ کے جس مسئلہ پر بھی اجماع منعقد ہوتا ہے وہ مسئلہ یا تو قرآن حکیم کی کسی آیت سے ماخوذ ہوتا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یا ایسے قیاس سے جس کی اصل قرآن یا سنت میں موجود ہو، غرض ہر اجماعی فیصلہ کسی نہ کسی دلیل شرعی پر مبنی ہوتا ہے جس کو سند اجماع کہا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب ہر اجماعی فیصلہ قرآن یا سنت یا قیاس پر مبنی ہوتا ہے تو اجماع سے کیا فائدہ ہوا؟ اور اسے فقہ کے دلائل میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اجماع کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ قرآن یا سنت یا قیاس سے ثابت

(۱) دیکھئے خطیب بغدادی کی مشہور تصنیف کتاب الفقیہ والمتفقہ: جزو خامس، ص ۱۶۶۔

(۲) کتاب الفقیہ والمتفقہ: جزو خامس، ص ۱۶۷۔

ہونے والا حکم اگر ظنی (۱) ہوتو اجماع اسے ''قطعی'' بنا دیتا ہے، جس کے بعد کسی فقیہ مجتہد کو بھی اس سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اگر وہ حکم پہلے ہی قطعی تھا تو اجماع اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا کر دیتا ہے اور دوسرا فائدہ اجماع کا یہ ہے کہ وہ جس دلیل شرعی پر مبنی ہو بعد کے لوگوں کو اس دلیل کو پرکھنے اور اس میں غور وفکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ان کو اس مسئلہ پر اعتماد کرنے کے لئے بس اتنی دلیل کافی ہوتی ہے کہ فلاں زمانہ کے تمام فقہا کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، انہوں نے کس دلیل شرعی کی بنیاد پر یہ اجماعی فیصلہ کیا تھا؟ یہ جاننے کی ضرورت بعد کے لوگوں کو نہیں رہتی، سند اجماع کی چند مثالوں سے یہ بات کچھ اور واضح ہو جائیگی۔

چند مثالیں:

(۱) مثلاً فقہ کا مشہور اجماعی مسئلہ ہے کہ دادی، نانی اور نواسی سے نکاح حرام ہے، اجماع کرنے والوں نے یہ مسئلہ قرآن حکیم کی آیت:

''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ''. (سورۃ النساء:۲۳)

حرام کی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں۔

سے لیا ہے، لہٰذا آیت اس مسئلہ کے لئے ''سند اجماع'' ہے۔ (۲) مذکورہ بالا فقہی حکم اگر چہ اس آیت سے ثابت ہو چکا تھا، کیونکہ ''امہات'' (مائیں) کا لفظ دادی اور نانی کو بھی شامل ہے، اور ''بنات'' (بیٹیاں) کا لفظ نواسی کو شامل ہے، (۳) لیکن یہ حکم یقینی اور قطعی نہ تھا، کیونکہ یہ احتمال یہاں موجود تھا کہ امہات (مائیں) سے یہاں صرف حقیقی مائیں مراد ہوں، دادی اور نانی مراد نہ ہوں، اس طرح بنات (بیٹیاں) کے لفظ میں احتمال تھا کہ اس سے یہاں صرف حقیقی بیٹیاں مراد ہوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں مراد نہ ہوں، چنانچہ اس احتمال کی بنیاد پر کوئی مجتہد یہ کہہ سکتا تھا کہ دادی، نانی اور نواسی سے نکاح حرام نہیں، مگر جب ان کے حرام ہونے پر اجماع منعقد ہو گیا تو یہ حکم قطعی اور یقینی ہو گیا اور مذکورہ بالا احتمال معتبر نہ رہا اور کسی مجتہد کو اس سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ (۴)

---

(۱) جو حکم دلیل ظنی سے ثابت ہو وہ ظنی ہوتا ہے اور جو دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ قطعی ہوتا ہے، دلیل ظنی اور دلیل قطعی کا کچھ بیان پیچھے کی بحث میں ہو چکا ہے یہاں اتنی بات سمجھ لی جائے کہ قرآن حکیم کی جن آیات کا مطلب معین طور پر خوب واضح اور یقینی نہ ہو بلکہ اس میں ایک سے زیادہ مطالب کا احتمال ہو تو وہ آیت معنی کے اعتبار سے ظنی ہوتی ہے اگر چہ لفظوں کے اعتبار سے ہر آیت قطعی ہے بلکہ قرآن کریم کا ہر لفظ قطعی طور پر ثابت ہے لیکن بعض کے معنی بھی قطعی ہوتے ہیں اور بعض کے ظنی اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی ہوتا ہے نیز قیاس بھی دلیل ظنی ہے اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی، اجماع ان تمام ظنی احکام کو قطعی بنا دیتا ہے۔

(۲) تسهيل الوصول: ص۱۷۲۔

(۳،۴) تفسیر روح المعانی: ج۴،ص۲۴۹۔

(۲)　یہ تو اس اجماعی فیصلہ کی مثال تھی جو قرآن حکیم سے ماخوذ ہے اور سنت سے ماخوذ ہونے کی مثال فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ کھانے کی کوئی چیز خرید کر قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کر دینا جائز نہیں (جیسا کہ آجکل سٹہ میں ہوتا ہے کہ محض زبانی طور پر کسی چیز کی خریداری کا معاملہ کر کے قبضہ کئے بغیر اسے دوسرے کے ہاتھ اور دوسرا تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، جو قطعاً حرام ہے۔(۱) اس مسئلہ میں سند اجماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

"من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه". (۲)

جس نے کوئی کھانے کی چیز خریدی وہ اس پر جب تک قبضہ نہ کرلے اسے فروخت نہ کرے۔

یہ حکم جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس حدیث سے معلوم ہو چکا تھا، مگر یہ حدیث "غیر متواتر" تھی اور پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ حدیث غیر متواتر ظنی ہوتی ہے، لہٰذا یہ حکم بھی ظنی تھا قطعی نہ تھا جب اس پر اجماع منعقد ہو گیا تو یہی حکم قطعی بن گیا۔

(۳)　اور قیاس سے ماخوذ ہونے کی مثال فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ ربا یعنی سود چاول میں بھی جاری ہوتا ہے، یعنی جب چاول کو چاول کے عوض میں فروخت کیا جائے تو ادھار بھی حرام ہے اور اسی طرح مقدار میں کمی بیشی بھی حرام، لین دین ہاتھوں ہاتھ ہونا ضروری ہے اور دونوں چاول خواہ مختلف قسموں کے ہوں مگر مقدار ان کی برابر ہونی ضروری ہے، ادھار کریں گے یا مقدار میں کسی ایک طرف کمی بیشی کریں گے تو ربا ہو جائے گا، جو حرام ہے۔(۳)

یہ اجماعی فیصلہ قیاس کی بنیاد پر کیا گیا ہے، یعنی اس مسئلہ میں "سند اجماع" قیاس ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان میں سے کسی چیز کو جب تم اسی جنس کے بدلے میں فروخت کرو تو اس میں ادھار یا کمی بیشی رہے تو حرام ہے۔(۴) حدیث سے ان چھ چیزوں کا حکم تو صاف طور پر معلوم ہو گیا تھا، مگر چاول کے متعلق یہ حدیث خاموش تھی اجماع کرنے والوں نے چاول کا حکم ان چھ چیزوں پر قیاس (۵) کر کے معلوم کیا اور بتایا کہ جو حکم ان چھ چیزوں کا ہے وہی چاول کا بھی ہے۔

اگر اس قیاس پر سب مجتہدین کا اجماع نہ ہوتا تو یہ حکم ظنی ہوتا، کیونکہ قیاس دلیل ظنی ہے، اور دلیل ظنی سے حکم قطعی ثابت نہیں ہو سکتا، مگر جب اس قیاس پر ایک زمانے کے تمام فقہا نے اجماع کر لیا تو یہ حکم قطعی ہو گیا، اجماع سے پہلے

---

(۱)　نور الانوار فی شرح المنار: ص۲۲۲، مبحث الإجماع۔

(۲)　مشکوۃ شریف عن ابن عمرؓ: ج۱ص۲۴۷، کتاب البیوع، باب المنهی عنها من البیوع، بحوالہ بخاری ومسلم۔

(۳)　نور الانوار فی شرح المنار: ص۲۲۲، مبحث الإجماع۔

(۴)　صحیح مسلم شریف: ج۲ص۲۴و۲۵، باب الربا، کتاب البیوع۔

(۵)　قیاس ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ فکری عمل ہے، جس کے بہت سے شرائط ہیں، قیاس کی حقیقت انشاء اللہ آگے اپنے مقام پر بیان ہوگی۔

کسی فقیہ کو اس سے مختلف قیاس کرنے کی گنجائش تھی، اجماع کے بعد یہ گنجائش ختم ہوگئی۔

(۴)　بسا اوقات جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہوتا ہے وہ پہلے ہی سے قطعی ہوتا ہے، ایسی صورت میں اجماع سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی قطعیت میں مزید تاکید اور قوت پیدا ہوجاتی ہے مثلاً پانچوں فرض نمازوں میں رکعتوں کی تعداد سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر قطعی طور پر فرض ہے، پھر پوری امت کا اجماع بھی اس پر چلا آرہا ہے جس کے لئے ''سند اجماع'' یہی سنت متواترہ ہے، اس مثال میں ایک ایسے حکم شرعی پر اجماع منعقد ہوا ہے جو پہلے ہی سے قطعی تھی، لہذا اجماع سے اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا ہوگئی ہے، اب اگر کسی زمانہ میں لوگوں کو خدانخواستہ یہ معلوم نہ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں نمازوں میں اس تعداد کی خود بھی پابندی فرمائی تھی اور سب کو اس کی پابندی کا حکم دیا تھا تب بھی لوگوں کو اس کی پابندی اس لئے لازم ہوگی کہ پوری امت کا اجماع اس پر چلا آرہا ہے، یہی حال اوپر کی باقی مثالوں کا ہے، کہ اجماع کرنے والوں نے جس سند اجماع کی بنیاد پر وہ فیصلے کئے تھے اگر بعد کے لوگوں کو وہ سند اجماع معلوم نہ ہو یا یاد نہ رہے، تب بھی وہ اجماعی فیصلے قطعی اور واجب العمل رہیں گے، کیونکہ سند اجماع کی ضرورت اجماع کرنے والوں کو ہوتی ہے، بعد کے لوگوں کو (خواہ وہ فقہا اور مجتہدین ہوں) سند اجماع کی ضرورت نہیں، ان کے لئے صرف اجماع ہی کافی دلیل ہے۔

اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے:

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اجماع صرف عاقل بالغ مسلمانوں کا معتبر ہے، کسی مجنون، بچہ یا کافر کی موافقت و مخالفت کا اعتبار نہیں، نیز اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اجماع منعقد ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عہد صحابہؓ سے لے کر قیامت تک کے تمام مسلمان کسی مسئلہ پر متفق ہوں، اس لئے کہ اگر اسے اجماع کے لئے شرط قرار دیا جائے تو قیامت سے پہلے کسی بھی مسئلے پر اجماع منعقد نہ ہوسکے گا، لہذا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اجماع کے لئے کسی ایک زمانہ کے مسلمانوں کا متفق ہوجانا کافی ہے۔(۱)

رہا یہ سوال کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ضروری ہے یا مخصوص قسم کے افراد کا متفق ہوجانا کافی ہے؟ اس میں علما کے اقوال مختلف ہیں ہم یہاں چند اقوال ذکر کرتے ہیں۔

(۱)　امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع معتبر ہے، کسی اور کی موافقت یا مخالفت کا اعتبار نہیں۔(۲)

---

(۱)　الإحکام فی اصول الاحکام للآمدیؒ: جلد اول، ص۱۱۵۔

(۲)　مشہور یہی ہے، مگر بہت سے علمانے امام مالکؒ کی طرف اس مذہب کی نسبت کا انکار کیا ہے تفصیل کے لیے دیکھئے ''التقریر والتحریر: ج۲ ص۱۰۰۔

(۲)　فرقۂ زیدیہ اور امامیہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو اجماع کا اہل کہتا ہے، دوسرے لوگوں کا اجماع ان کے نزدیک معتبر نہیں۔(۱)

(۳)　بعض حضرات (۲) ان کے نزدیک صرف صحابۂ کرامؓ کا اجماع حجت ہے، ان حضرات کے نزدیک اجماع کا دروازہ عہد صحابہؓ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے (۳)

(۴)　بعض حضرات (۴) کہتے ہیں کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق اجماع کے لئے شرط ہے۔ عوام ہوں یا خواص، عالم ہوں یا جاہل، جب تک سب متفق نہ ہوں اجماع منعقد نہ ہوگا۔

(۵)　پانچواں قول جمہور کا ہے جو نہایت معتدل ہے وہ یہ کہ اجماع صحابہ کے ساتھ خاص نہیں کسی بھی زمانہ کے تمام متبع سنت فقہاء (مجتہدین) کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا اجماع کے لئے کافی ہے، عوام اور اہل بدعت یا فاسق کی موافقت ومخالفت کا اعتبار نہیں۔(۵)

قرآن وسنت کے جن دلائل سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوا ہے، ان سے بھی اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس لئے کہ آیات واحادیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کہیں بھی اجماع کو کسی خاص زمانہ یا خاص مقام یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا، بلکہ مطلقاً "المومنین، الأمة، الجماعة" یا "سواد أعظم" کے اتفاق کو حجت قرار دیا گیا ہے اور یہ چاروں الفاظ صحابۂ کرام آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی صادق آتے ہیں، لہذا اجماع کو صرف صحابۂ کرام یا اہل بیت یا اہل مدینہ کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی واضح دلیل قرآن وسنت میں نہیں ملتی۔

اجماع کو صرف صحابۂ کرام کے ساتھ خاص کرنے والے حضرات جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کا اجماع حجت ہے، مگر یہ کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ بعد کے فقہا کا اجماع حجت نہیں۔

جاہل، فاسق اور اہل بدعت کے اختلاف سے اجماع باطل نہیں ہوتا:

---

(۱)　التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر: ج۳ص۹۸۔

(۲)　(مثلاً داؤد اصفہانیؒ (تسہیل الوصول: ص۱۷۰) ابن حبانؒ کے کلام سے بھی اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے، امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں ایک یہ کہ اجماع صحابہؓ کے ساتھ خاص ہے، اور دوسرا یہ کہ خاص نہیں، دوسرے قول کو علماء حنابلہ نے صحیح راجح قرار دیا ہے

(۳)　التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر: ج۳ص۹۷۔

(۴)　قاضی ابوبکر باقلانیؒ اور علامہ آمدیؒ کا رجحان اسی طرف ہے، مگر دونوں کی رائے میں یہ فرق ہے کہ قاضی ابوبکرؒ تو فرماتے ہیں کہ جس اجماع میں کسی عام مسلمان کا اختلاف ہو وہ اجماع شرعاً حجت تو ہے مگر اس اجماع کو "اجماع امت" نہیں کہا جائے گا، کیونکہ عام مسلمان بھی امت کا فرد ہے، اور علامہ آمدیؒ ایسے اجماع کو حجت بھی نہیں مانتے، دیکھئے: التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر: ج۳ص۸۰۔

رہا یہ سوال کہ جب مؤمنین، امت، الجماعۃ اور سواد اعظم کے اجماع کو قرآن وسنت میں حجت قرار دیا گیا ہے، تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے، کہ عام مسلمانوں بلکہ اہل بدعت اور فاسق وفاجر مسلمانوں کی موافقت بھی اجماع کے لئے شرط ہو اور ان کے اختلاف کی صورت میں اجماع منعقد نہ ہو، کیونکہ مؤمنین اور امت میں یہ لوگ بھی داخل ہیں۔

جواب یہ ہے کہ جن دلائل سے اجماع کی حجیت ثابت ہوئی ہے ان میں اور دیگر آیات واحادیث میں اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اجماع صرف متبع سنت فقہاء کرام ہی کا معتبر ہے، باقی لوگوں کی موافقت یا مخالفت سے اجماع پر اثر نہیں پڑتا، ان دلائل کی کچھ تفصیل یہ ہے:

(۱) قرآن حکیم میں دوجگہ صریح ارشاد ہے کہ:

''فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ''. (سورة النحل: ۴۳، سورة الأنبياء: ۷)

اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم (۱) سے دریافت کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں ان پر واجب ہے کہ علما سے دریافت کرکے اس کے مطابق عمل کریں تو جب عوام کو خود علما کے فتویٰ کا پابند کیا گیا ہے تو دنیا بھر کے تمام علما فقہا کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت عوام کو کیسے جائز ہوسکتی ہے اور ان کے موافقت نہ کرنے سے فقہا کا اجماع باطل کیسے ہوسکتا ہے؟ (۲)

(۲) قرآن حکیم نے فاسق کی دی ہوئی خبر کے متعلق یہ قانون ارشاد فرمایا ہے کہ:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ''. (سورة الحجرات: ۶)

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس خبر کی خوب تحقیق کرلیا کرو، کبھی کسی قوم کی نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچادو، پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس لئے جمہور علما کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت مقبول نہیں، تو جب عارضی نوعیت کے واقعات میں فاسق کی خبر اور شہادت کا یہ حال ہے تو دینی مسائل جو قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے حجت اور واجب الاتباع بننے والے ہوں، ان میں اس کی شخصی رائے کیسے معتبر ہوسکتی ہے؟ اور جو بدعت فسق کی حد تک پہنچی ہوئی ہو اس کا مرتکب بھی فاسق ہے، لہٰذا ایسے اہل بدعت کی رائے بھی اجماع میں معتبر نہیں، اسی لئے جمہور علماء اہل سنت والجماعت نے شیعہ خوارج

---

(۱) یہ اهل الذکر ہی کا ترجمہ ہے، لفظ الذکر کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی علم کے بھی ہیں اس مناسبت سے قرآن کریم میں توراۃ کو بھی الذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ'' اور خود قرآن کریم نے بھی اپنا ایک نام ''الذکر'' بتایا ہے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۴۴: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ میں الذکر سے مراد قرآن کریم ہے، اس لئے ''اہل الذکر'' کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے۔ (تفسیر معارف القرآن: ج ۵ ص ۳۳۲۔)

(۲) تفسیر قرطبی: ج ۱۱ ص ۲۷۲، وتفسیر معارف القرآن: ج ۶ ص ۱۵۹، وج ۵ ص ۳۳۳۔

اور معتزلہ وغیرہ کے اختلاف کا اجماع میں اعتبار نہیں کیا۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ اجماع میں عوام کی موافقت ومخالفت معتبر نہیں، اور اس دوسری آیت سے ثابت ہوا کہ فاسق اور اہل بدعت کی موافقت ومخالفت کا اعتبار نہیں، اس لئے حاصل ان دونوں آیتوں کا وہی ہے جو جمہور علما نے اختیار کیا کہ اجماع صرف متبع سنت فقہا کا معتبر ہے اور یہی بات ان احادیث سے ثابت ہوتی ہے جن سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم وہ احادیث خاصی تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں، یہاں ہمیں ان کے الفاظ کا مختصر جائزہ لینا ہوگا، جس سے جمہور کا مسلک بخوبی واضح ہو سکے گا۔

(۱) سب سے پہلی حدیث جو ہم نے اجماع کی حجیت پر پیش کی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم قرآن وسنت میں نہ ملے تو اس میں آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ:

''وشاورهم فيه الفقهاء والعابدين''. تم اس معاملہ میں فقہا اور عابدین سے مشورہ کرو۔

اس حدیث میں صراحت ہے کہ جو لوگ فقہا بھی ہوں اور عابدین بھی صرف انہی کا مشورہ واجب الاتباع ہوگا۔

(۲) دوسری حدیث جو گیارہ صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہے اس میں پوری امت کا لفظ نہیں بلکہ ''طائفة من أمتي'' کا لفظ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ''میری امت میں ایک جماعت حق پر قائم اور اس کے لئے برسر پیکار رہے گی، اس میں پوری امت کے ہر فرد کے حق پر قائم رہنے کی خبر نہیں دی گئی بلکہ بتایا گیا ہے کہ امت میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، جو مخالفین سے حق کے لئے برسر پیکار رہے گی، اب خود اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتباع حق پر قائم رہنے والی جماعت کا لازم ہوگا، یا اس کے مخالفین کا؟

(۳) تیسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو یہ ارشاد ہے کہ:

''لن يزال أمر هذه الأمة مستقيماً حتى تقوم الساعة''. اس امت کی حالت قیامت تک سیدھی رہے گی۔

ظاہر ہے اس کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ اس امت کا ہر فرد نیکوکار اور ہدایت یافتہ ہوگا کوئی بھی شخص غلطی نہیں کرے گا، کیونکہ مشاہدہ بھی اس کے خلاف ہے، اور اوپر کی اور بعد میں آنے والی حدیثیں بھی، لہذا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس امت کا پورا مجموعہ باطل اور غلط بات پر متفق نہیں ہوگا، کچھ لوگ حق پر ضرور قائم رہیں گے، باقی جو لوگ ان کی مخالفت کریں گے کیا کریں! یہ حق پر ڈٹے رہیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت ہمیشہ مجموعی گمراہی سے محفوظ رہے گی، اور یہ بات ہے جو اوپر کی حدیث میں آ چکی ہے، اب خود فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ حق پر ڈٹے رہیں گے اتباع ان کا واجب ہوگا یا ان کے مخالفین کا؟

(۴) چوتھی حدیث جو آٹھ صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ:

"إن الله لايجمع أمتي(أوقال:أمة محمد)علىٰ ضلالة ويد الله على الجماعة،ومن شذ شذ في النار".

اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ "الجماعة" پر ہے اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

اس حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ وہ بات آ گئی ہے جو ہم اوپر تیسری حدیث کے ضمن میں کہہ آئے ہیں کہ "امت کی حالت ہمیشہ سیدھی رہنے، اور کسی گمراہی پر متفق نہ ہونے"، کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بھی کجروی یا گمراہی کا شکار نہ ہوگا، ہر فاسق و فاجر اور بدعتی مسلمان جو مشورہ بھی دینی امور میں پیش کرے گا صحیح اور درست ہوگا، بلکہ اس حدیث کے آخری دو جملوں "اللہ کا ہاتھ الجماعۃ پر ہے" اور "جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا" نے بتا دیا کہ امت کی حالت سیدھی رہے گی جو راہ ہدایت پر قائم رہے گی، جس کے نتیجہ میں امت بحیثیت مجموعی گمراہ ہو جانے سے محفوظ رہے گی اس جماعت کو اللہ کی طرف سے خاص ہدایت و نصرت ملتی رہے گی لوگوں پر لازم ہوگا کہ اس جماعت کی پیروی کریں اور جو ان سے الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

معلوم ہوا کہ اجماع صرف اسی جماعت کا حجت ہوگا، دوسروں کی موافقت پر موقوف اور دوسروں کی مخالفت سے باطل نہ ہوگا۔

(۵تا۱۰) حدیث نمبر (۵) سے نمبر (۸) تک ۴ حدیثیں جو مجموعی طور پر ۳۴ صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہیں ان میں "الجماعة" کی پیروی کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے، اور اس کی مخالفت پر ہولناک سزائیں بیان ہوئی ہیں۔

نویں حدیث میں "سواد اعظم" کی پیروی کا حکم ہے اور وہیں ہم نے دوسری حدیثوں کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ "الجماعة" اور "سواد اعظم" درحقیقت ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں اور دونوں نام ان مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابۂ کرامؓ کے پیرو ہوں، اسی بنا پر ان کو "أهل السنة و الجماعة" بھی کہا جاتا ہے۔

اور دسویں حدیث میں تو صراحت ہے کہ اس امت میں تہتر فرقے ہوں گے جن میں سے نجات یافتہ فرقہ صرف ان لوگوں کا ہے جو متبع سنت ہوں، باقی سب فرقے گمراہ ہیں۔

پس حدیث نمبر (۵) سے نمبر (۱۰) تک سب حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیروی صرف ان لوگوں کی لازم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی سنت کے پیرو ہوں، اور ان کے مخالفین گمراہ اور سخت عذاب کے مستحق ہیں، اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اجماع صرف متبع سنت مسلمانوں کا کافی ہوگا یا فاسق اور اہل بدعت کی مخالفت کی وجہ سے اسے باطل کر دیا جائے گا؟

حاصل کلام یہ کہ جمہور فقہا نے جو مسلک اختیار کیا ہے کہ اجماع میں عوام، اہل بدعت اور فاسق مسلمانوں کا

اختلاف یا اتفاق معتبر نہیں، بلکہ صرف متبع سنت فقہا کا اجماع ہی حجت ہے قرآن وسنت کی تصریحات سے اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے اور حنفیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اجماع کی قسمیں:

بنیادی طور پر اجماع کی تین قسمیں ہیں (۱) اجماع قولی (۲) اجماع عملی (۳) اجماع سکوتی، ان تینوں کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) اجماع قولی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات زبانی طور پر کسی دینی مسئلہ پر اپنا اتفاق ظاہر کریں، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت، تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔

(۲) اجماع عملی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات کسی زمانہ میں کوئی عمل کریں، جب کوئی عمل تمام اہل اجماع (جائز یا مستحب یا مسنون سمجھ کر کرنے لگیں تو اس عمل کو بالا جماع جائز سمجھا جائے گا اجماع کی اس قسم سے اس فعل کا صرف مباح یا مستحب یا مسنون ہونا ثابت ہوگا، واجب ہونا اس قسم سے ثابت نہیں ہوسکتا، الا یہ کہ وہاں قرینہ ایسا پایا جائے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہو۔

ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں جو سنت مؤکدہ ہیں ان کا سنت مؤکدہ ہونا صحابۂ کرامؓ کے اجماع عملی سے ثابت ہوا ہے۔

(۳) اجماع سکوتی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والوں میں سے کچھ حضرات کوئی متفقہ فیصلہ زبانی یا عملی طور پر کریں جس کی اس زمانہ میں خوب شہرت ہوجائے یہاں تک کہ باقی سب مجتہدین کو بھی اس فیصلہ کی خبر ہوجائے مگر وہ غور وفکر اور اظہار رائے کا موقع ملنے کے باوجود سکوت اختیار کریں ان میں سے کوئی بھی اس فیصلہ سے اختلاف نہ کرے۔

اجماع کی ان تینوں قسموں میں سے پہلی دونوں قسمیں تو سب فقہا کے نزدیک حجت ہیں البتہ تیسری قسم یعنی ''اجماع سکوتی'' کے حجت ہونے میں فقہا کا اختلاف ہے (یہاں تک ان تین قسموں کا بیان تسہیل الوصول ص ۱۶۸، وص ۱۷۳ سے ماخوذ ہے) امام احمدؒ، اکثر حنفیہ اور بعض شوافع کے نزدیک یہ حجت قطعیہ ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ اکثر شوافع اور اکثر مالکیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں اور بعض فقہا نے اسے ''حجت ظنیہ'' قرار دیا ہے۔(۱)

یہ اجماع کی قسموں کا اجمالی بیان ہے، تفصیل کے لئے اصول فقہ کی کتابوں کی مراجعت فرمائی جائے۔

اجماع کے مراتب:

اجماع کرنے والوں کے اعتبار سے اجماع کے حسب ذیل درجات ہیں:

(۱) سب سے قوی درجہ کا اجماع وہ ہے جو تمام صحابۂ کرامؓ نے عملی یا زبانی طور پر صراحۃً کیا ہو، اس لئے کہ

(۱) التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر: جلد ۳ ص ۱۰۱ و ۱۰۲۔

اس کے حجت قطعیہ ہونے پر پوری امت کا (جو حضرات صرف اہل مدینہ یا صرف اہل بیت کے اتفاق کو اجماع کے لئے کافی سمجھتے ہیں تمام صحابہ کا اجماع ان کے نزدیک بھی حجت قطعیہ ہے، کیونکہ صحابہ اس زمانے کے اہل مدینہ اور اہل مدینہ میں اہل بیت بھی داخل ہیں) اتفاق ہے۔(۱)

(۲) دوسرا درجہ صحابۂ کرامؓ کے اجماع سکوتی کا ہے، یہ بھی اگرچہ حنفیہ سمیت بہت سے فقہا کے نزدیک حجت قطعیہ ہے، مگر اس کا منکر کافر نہیں، کیونکہ اس کے حجت ہونے میں امام شافعیؒ اور بعض دیگر فقہا کا اختلاف ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا۔

(۳) تیسرے درجہ پر وہ اختلاف ہے جو صحابۂ کرامؓ کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہا نے کیا ہو، یہ بھی جمہور کے نزدیک حجت تو ہے، مگر حجت قطعیہ نہیں، کیونکہ جو حضرات غیر صحابہؓ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے، ان کے اختلاف کی وجہ سے اس اجماع میں قطعیت باقی نہیں رہی، یہ درجہ میں ''سنت مشہورہ'' کے مانند ہے، اس کا منکر بھی کافر نہیں۔

ان سب درجات کی تفصیل کے لئے اصول فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔(۲)

نقل اجماع:

اجماعی فیصلوں کے درجات کی جو ترتیب اوپر بیان ہوئی وہ اصل کے اعتبار سے ہے، لیکن جب اجماعی فیصلے کی خبر ہم تک پہنچے گی تو اس خبر کی روایت جتنی قوی ہوگی، ہمارے حق میں اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی اتنی ہی قوی ہوگی اور روایت میں جس قدر ضعف ہوگا اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی ہمارے حق میں اتنی ہی ضعیف ہو جائے گی، چنانچہ تمام صحابۂ کرامؓ کا اجماع قولی یا عملی جو درجۂ اول کا اجماع ہے اور اپنی ذات میں ''حجت قطعیہ'' ہے اگر اس کی خبر ہم تک ''تواتر'' سے پہنچے تب تو وہ ہمارے لئے بھی حجت قطعیہ باقی رہے گا، اور اس کا منکر کافر ہوگا، لیکن اس کی خبر ہم تک اگر قابل اعتماد سند سے تواتر کے بغیر پہنچے تو اس کی قطعیت ہمارے حق میں ختم ہو جائے گی اور اس کا حکم وہی ہوگا جو غیر متواتر حدیث کا ہوتا ہے کہ وہ ''دلیل ظنی'' ہوتی ہے شرعی احکام اس سے ثابت ہو سکتے ہیں مگر اس کا منکر کافر نہیں ہوتا۔(۳)

اور اگر اس کی خبر سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہو تو اس کا حکم وہ ہوگا جو حدیث ضعیف کا ہوتا ہے کہ وہ حجت ہی نہیں اور اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہ کا مأخذ ہونے کے اعتبار سے درجۂ اول کے اجماع کی حیثیت ہمارے لئے وہی ہے جو

(۱) تسہیل الوصول: ص۱۷۳۔
(۲) مثلاً ''تسہیل الوصول: ص۱۷۳ و۱۷۴، اور التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر: جلد۳ ص۸۰ تا ۹۲۔
(۳) تسہیل الوصول: ص۱۷۳۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ اگر وہ ہم تک تواتر سے پہنچے تو ''دلیل قطعی'' ہے اور سند ضعیف سے پہنچے تو وہ ہمارے لئے کسی حکم شرعی کی دلیل نہیں بن سکتا۔(۱)

اجماع کے ذیل میں بہت سے مسائل زیر بحث آتے ہیں، اجماع قولی، اجماع سکوتی، اجماع صحابی، اجماع خلفاء راشدین، اجماع سابق اور اجماع لاحق، خرق اجماع، عدم القول بالفصل، ان مسائل پر تفصیلی بحث کتب اصول فقہ میں مذکور ہے۔(۲)

(۱) ماخوذ از مقدمہ امداد الاحکام: ۱/۲۷-۹۳، از مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب۔

(۲) **اجماع:** تیسری اصل اجماع ہے، جس کی حجیت پر اتفاق ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ لفظ اجماع کے استعمال سے احتیاط برتتے ہیں اور ایسے موقع پر ان کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ ''اس رائے کے خلاف کوئی قول ہمارے علم میں نہیں''، یعنی اصل اختلاف کی نفی نہیں بلکہ اختلاف کے معلوم ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام کی یہ تعبیر شدت ورع اور انتہاء احتیاط پر مبنی ہے کہ کسی شئے کا معلوم نہیں ہونا، اس کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں۔ دوسرے بزرگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عادۃً جو ذرائع علم موجود ہیں، ان کے استعمال کے باوجود جب سلف میں سے کسی کا اختلاف کسی مسئلہ میں ثابت نہیں تو سمجھا جائے گا کہ کسی قابل شمار شخصیت نے اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا ہے۔(ماخوذ از اسلامی عدالت: ص ۹۰، ۹۱۔ انیس)

قیاس

قیاس کا ثبوت قرآن سے:

قیاس کا شمار مصادر شرع میں چوتھے درجہ پر ہے۔ جمہور قیاس کے حجت ہونے پر متفق ہیں۔ شریعت اسلامی قرآن و سنت کے احکام کا نام ہے، قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی فکری و عملی تشریح و تطبیق ہے۔ لیکن یہ دونوں عددی اعتبار سے محدود ہیں، جبکہ یہ شریعت قیامت تک کے لیے ہے، قیامت تک نئے حوادث، واقعات اور مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، ماحول بدلتے رہتے ہیں، ضرورتیں اور حاجتیں بھی نئی نئی آتی رہتی ہیں، امت ایسے حالات سے دوچار ہوتی ہے جو پچھلے لوگوں کو پیش نہیں آئے، اس لیے ان نئے واقعات وحاجات کے بارے میں شریعت کا حکم جاننا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ مستقبل کے واقعات ومسائل کے بارے میں قرآن وسنت کے ایسے نصوص نہیں ہیں جن میں صراحتاً شریعت کے احکام آئے ہوں۔ البتہ ان مسائل اور واقعات کی نظیریں یا علتیں ایسی مل سکتی ہیں جو نئے مسائل کی مماثل ہوں۔ ایسے ہی حالات اور واقعات میں اللہ تعالیٰ نے عقل کو استعمال کرنے اور قرآن وسنت میں درج احکام وعلل پر غور کرکے قیاس واجتہاد کے ذریعہ عمل کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ". (سورۃ الحشر:۲)

اس آیت کی تشریح میں قاضی ابوبکرؒ نے تقریب میں اہل لغت کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے:

"ان الاعتبار اسم یتناول تمثیل شیء بغیرہ و إجراء حکمہ علیہ والتسویۃ بینہما فی ذٰلک وإنما سمی الاتعاظ والفکر اعتباراً لأنّہ مقصود بہ التسویۃ بین الأمر ومثلہ والحکم فیہ بحکم نظیرہ ولولا ذٰلک لم یحصل الاتعاظ والازدجار عن الذنب بنزول العذاب والانتقام بأھل الخلاف والشقاق".

(البحر المحیط لأصول الفقہ للزرکشی: ج۵ ص ۲۲)

امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ دلیل پیش کی ہے:

"فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ". (سورۃ المائدۃ:۹۵)

اور فرمایا:

"فھٰذا تمثیل الشیء بعدلہ".

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یَحۡکُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ''. (سورۃ المآئدۃ:۹۵)

فرمایا:

وأوجب المثل و لم یقل أی مثلٍ فوکل ذٰلک إلیٰ اجتهادنا وأمرنا بالتوجه إلی القبلة بالاستدلال و قال'' وَحَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ''. (سورۃ البقرۃ:۱۵۰)

نیز مندرجہ ذیل آیات میں بھی قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

''وَلَوۡرَدُّوۡهُ اِلَی الرَّسُوۡلِ وَاِلٰی اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ''. (سورۃ النساء:۸۳)

اس آیت میں ''اولوالامر'' سے مراد علما ہیں اور استنباط کا مطلب قیاس ہے، اس طرح یہ آیت قیاس کے اثبات میں منصوص ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ لَایَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا''. (۱)

اس میں بھی ایک شیٔ کی تشبیہ دوسری شیٔ سے کرنے کا بیان ہے اور یہی قیاس ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهُوَرَمِیۡمٌ، قُلۡ یُحۡیِیۡهَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ''. (سورۃ یٰسٓ. ۷۸) فهٰذا صریحٌ فی إثبات الإعادة قیاساً.

امام ابن تیمیہؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ''. (سورۃ النحل:۹۰)

اور فرمایا ہے:

'' إن العدل هو التسویة بین المثلین فی الحکم فیتناوله عموم الآیة''. (۲)

قیاس کا ثبوت احادیث سے:

قرآن کی طرح متعدد احادیث سے بھی قیاس کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث:

'' أ جتهد برأیی و لا آلو''. حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کے بعض علاقوں کے قضا پر مامور فرمایا اور فرمایا کہ جب کوئی معاملہ تمہارے سامنے پیش ہوگا تو کس طرح فیصلہ کروگے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۶۔

(۲) البحر المحیط للزرکشی: ج۵ ص ۲۳، ۲۴.

کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سامنے رکھوں گا، اگر اس میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پیش نظر رکھوں گا، اگر وہ مسئلہ وہاں بھی نہ ملا تو میں اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ شکر ہے اللہ کا جس نے اپنے رسول کے رسول (قاصد) کو اس امر کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔(۱)

اس حدیث میں واضح طور پر قیاس کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیاس و اجتہاد نہ صرف جائز بلکہ منشاء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے۔

اسکے علاوہ بھی کئی احادیث میں قیاس کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ذکر آیا ہے مثال کے طور پر ایک مرتبہ ایک شخص قبیلۂ فزارہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس کی بیوی نے کالے رنگ کے بچے کو جنا تھا اور وہ اس کو بیٹا ماننے سے انکار کر رہا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں اس نے کہا ہاں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کس رنگ کے ہیں، اس نے جواب دیا کہ سرخ رنگ کے، کہا: کیا ان کے بچوں میں کوئی بھورے رنگ کا بھی ہے، کہا ہاں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کیسے ہو گیا، اس نے جواب دیا کہ شاید تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے۔ آپ نے فرمایا یہ بھی شاید تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے ہے۔ یعنی جب سرخ اونٹ کو بھورا بچہ پیدا ہو سکتا ہے تو گوری عورت کبھی کالا بچہ بھی جن سکتی ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان پر قیاس کیا نسب کے ثبوت کے لیے۔

قیاس کا ثبوت اجماع صحابہؓ سے:

قرآن وسنت کی طرح اجماع صحابہؓ سے بھی قیاس پر عمل ثابت ہے، صحابہ رضوان اللہ علیہم کا قیاس پر عمل کرنے پر قولی و عملی اتفاق ہے۔ یہاں تک کہ ابن عقیل حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''صحابۂ کرامؓ سے قیاس پر عمل کرنا تواتر سے ثابت ہے اور یہ قطعی ہے''۔

ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''میں سمجھتا ہوں کہ قیاس پر عمل تمام عالم میں، مشرق و مغرب میں اور ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے سوائے چند متأخرین کے کسی کا اس سے اختلاف نہیں رہا ہے اور یہ قوی ترین دلیلوں میں سے ایک ہے''۔

قیاس کا ثبوت عقل سے:

عقلی اعتبار سے بھی قیاس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نصوص قرآنی و احادیث کی

(۱) رواہ احمد وابوداؤد والترمذی، والطبرانی والبیہقی فی سننہ۔

تعداد بہر حال محدود ہے، جب کہ واقعات وحوادث غیر محدود ہیں اور نت نئے مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔

امام قفالؒ کا قول ہے کہ:

"لا حادثة إلا ولله فيها حكم اشتمل القرآن علىٰ بيانه لقوله تعالىٰ:"مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتَابِ مِنْ شَیْءٍ". (سورۃ الأنعام: ۳۸)

یعنی کوئی بھی ایسا حادثہ نہیں پیش آتا ہے جس کا حکم قرآن میں نہ ہو، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نصوص میں تمام پیش آئندہ مسائل کا احاطہ نہیں ہے، چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بقیہ امور کے لیے ہمیں قیاس واجتہاد کا حکم دیا گیا ہے۔

قیاس کے اصول وضوابط اور اس کے شرائط کی تفصیل کتب اصول فقہ میں مذکور ہے۔

اجتہاد

(۱) ''اجتہاد'' لغت میں ''جہد'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی مشقت، گنجائش اور طاقت کے ہیں، قاموس میں آیا ہے:

الجهد: الطاقة والمشقة.

آگے کہا گیا ہے:

والتجاهد بذل الجهد كالاجتهاد.

یعنی ''**تجاهد**'' کے معنی ''**اجتهاد**'' ہی کی طرح اپنی طاقت اور کوشش کو صرف کر دینے کے ہیں۔

خواہ اس کوشش کا تعلق کسی شرعی اعتقادی یا عملی حکم کے جاننے سے ہو، یا کسی لغوی یا عقلی مسئلہ کے جاننے سے ہو، یا یہ کوشش کسی امر محسوس کے سلسلہ میں ہو جیسے کسی چیز کا اٹھانا، لیکن گلاب کا پھول اٹھانے کو ''**اجتهد**'' نہیں کہا جا سکتا۔

علماء فقہ واصول نے ''**اجتهاد**'' کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کے الفاظ ومعانی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ہر چند کہ ان میں سے بعض تعریفوں پر لفظی صنعت کے اعتبار سے بعض اعتراضات کئے گئے ہیں، لیکن ساری تعریفوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ ''**اجتهاد**'' دلیل کے ذریعہ حکم شرعی معلوم کرنے کی غرض سے کوشش وتوانائی صرف کرنے کا نام ہے، اجتہاد کی دقیق ترین تعریف وہ ہے جو ''مسلم الثبوت'' کے مصنف [۲] نے اختیار کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: ''اجتہاد کسی فقیہ کا حکم شرعی ظنی کا علم حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت خرچ کر دینا ہے''۔

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد کا دائرۂ کار ظنی مسائل ہیں اور اس معنی میں وہ اکثر مسئلوں میں فقہ سے ہم آہنگ ہے، ہر چند کہ فقہ، فقہا کے اختیار کردہ معنی میں افعال سے متعلق قطعی احکام سے بھی بحث کرتا ہے، جیسے فقہا کا یہ کہنا کہ ''نماز واجب ہے''۔

ظنی اجتہادی احکام، جو ماضی سے اب تک فقہا کے مابین اختلاف رائے کا میدان رہے ہیں، پر گفتگو کے وقت ایک سوال پیدا ہوا کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

---

(۱) ماخوذ از موسوعہ فقہیہ وزارت اوقاف کویت۔

(۲) محبّ اللہ بن عبدالشکور بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) ایک ہندوستانی عالم ہیں، علم اصول فقہ پر ماضی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ کتاب ساری کتابوں میں آخری اور سب سے بہتر کتاب ہے، علم اصول فقہ کی تدوین کے دونوں معروف طریقوں یعنی طریقۂ متکلمین اور طریقۂ حنفیہ کو اس کتاب میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ (۳۶۲/۲)۔

''کیا یہ زیادہ مناسب نہیں تھا کہ شرعی نصوص ودلائل قطعی ہوتے تاکہ ایک ہی ملت کے فرزندوں کے مابین اس درجہ اختلاف ونزاع کا باعث نہ بنتے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جائیں؟''

اس ابھرنے والے سوال کے سلسلہ میں اللہ کی توفیق سے ہم یہ کہتے ہیں:

وہ احکام جو دین کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو، یا عملی امور سے، ان کا بیان ایسی محکم آیتوں کے ذریعہ ہوا ہے جن میں نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے نہ اختلاف کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ یہ امور ہر زمانہ میں یقینی رہیں، جیسے میراث کے احکام، پرسنل لا کے اصولی احکام اور حدود وقصاص کی آیتیں۔

لیکن جہاں تک متغیر ہونے والے مسائل کا تعلق ہے تو قرآن کریم نے ان کے تئیں رہنما خطوط بیان کر دیئے ہیں، اس لئے وہ نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کا مقام بن گئے ہیں، اور یہ اختلاف اگر مبنی برحق ہو اور خواہش نفس پر مبنی نہ ہو تو امت کے لئے باعث رحمت ہے، خود صحابہؓ کا بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف رہا ہے، لیکن ان کا اختلاف ان کے لئے باعث نزاع نہیں ہوا، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بلا چوں و چرا نماز پڑھتے تھے، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ ان کا مسلک درست ہے لیکن غلطی کا احتمال ہے اور دوسروں کا مسلک غلط ہے لیکن درست ہونے کا احتمال ہے، لیکن جب فتنہ نے سر اٹھایا تو ہوائے نفس نے ڈیرہ جما لیا، نتیجتاً اختلاف رائے باعث نزاع بن گیا۔

مخلوقات کے سلسلہ میں سنت الٰہی، خواہ اس کا تعلق تشریع سے ہو یا تخلیق سے، پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر خیر میں شر کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوا کرتا ہے، نقطہ ہائے نظر میں اختلاف کا باعث بننے والے ظنی نصوص کے خیر وشر والے پہلوؤں کے درمیان موازنہ کرنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ نصوص خیر ہی خیر ہیں، اس لئے کہ سارے نصوص کے قطعی ہونے کی صورت میں افکار کا جمود ناقابل تصور مصیبت کا باعث ہوتا۔

اور تاریخ اس حقیقت کی سچائی کی گواہ ہے، چنانچہ مبنی برخواہش نفس آراء، جو تمام تر وجود پذیر ہونے والے فتنوں کا سرچشمہ تھیں، کے اثرات ناپید ہو گئے اور کتابوں کے صفحات میں صرف ان کی داستان رہ گئی ہے، مؤرخین نے انہیں اس لئے ریکارڈ کر دیا ہے تاکہ ان سے اس امت کی کشادہ نفسی اور آزادیٔ رائے کی کھلی شہادت سامنے آتی رہے، اس طرح کے افکار وآراء سیلاب کی جھاگ کی طرح ختم اور بجلی کی چمک کی طرح بجھ گئے:

''فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً، وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ''(سورۃ الرعد:۱۷)

سو جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لئے کار آمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے۔

پھر یہ کہ اگر سارے نصوص قطعی ہوتے تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہمارے لئے اجتہاد کی گنجائش کیوں نہیں رکھی گئی تاکہ ہماری عقلیں منجمد نہ ہوتیں اور ہمیں جامد نصوص سے سابقہ نہ ہوتا۔

باب اجتہاد کی بندش:

چھٹی صدی ہجری کے آغاز سے ہی بعض علما نے باب اجتہاد کو بند کردینے کی دعوت دی، ان کی دلیل یہ تھی کہ پہلوں نے بعد والوں کے لئے اب کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا ہے، اوران کا استدلال یہ تھا کہ اب ہمتیں پست ہوچکی ہیں لوگوں میں امانت داری باقی نہیں رہی، آمریت پسند حکام کا دوردورہ ہے، اور خدشہ یہ ہے کہ نااہل لوگ خوف یا لالچ کی وجہ سے اجتہاد کا شغل نہ اختیار کرلیں، اس لئے سد ذرائع کے طور پرانہوں نے باب اجتہاد کے بند کردینے کا فتویٰ دے دیا اور بعض ایسے لوگ جنہوں نے سلف کے آراء کی مخالفت کی عوام وخواص کے غصہ کا نشانہ بنے، اس کے باوجود وقتاً فوقتاً ایسے لوگ سامنے آتے رہے جنہوں نے اجتہاد کا دعویٰ کیا یا ان کے مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا گیااورانہوں نے کچھ قابل ذکر اجتہادات کئے بھی، جیسے ابن تیمیہؒ، ان کے شاگرد ابن قیمؒ اور کمال ابن ہمامؒ جو حنفی المسلک تھے وغیرہ، آخرالذکر کے بھی کچھ ایسے اجتہادات ہیں جن میں انہوں نے مسلک حنفی کے حدود سے باہر قدم رکھا، اسی طرح کے لوگوں میں صاحب ''جمع الجوامع'' تاج الدین سبکیؒ اور ان کے والد (تقی الدین سبکیؒ) ہیں، لیکن بہرصورت ان لوگوں کا اجتہاد، ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دینے یا کسی ایسے نئے مسئلہ کے حل کے دائرہ سے باہر نہیں جسے ائمۂ متقدمین نے نہیں چھیڑا تھا۔

لیکن ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ امت میں کچھ ایسے صاحب اختصاص علما ضرور ہونے چاہئیں جن کو کتاب وسنت، اجماع کے مواقع، صحابہ وتابعین اور ان کے بعد والوں کے فتاویٰ کا بخوبی علم ہو، نیز انہیں عربی زبان کی مہارت ہو جس زبان میں قرآن پاک نازل ہوا اور اس میں سنت کی تدوین ہوئی، اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ لوگ صراط مستقیم کے راہی ہوں، اللہ کے سلسلہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں نہ لاتے ہوں، تاکہ امت پیش آمدہ مسائل وواقعات کے سلسلہ میں ان سے رجوع کرسکے، اور اجتہاد کا دروازہ اس طرح چوپٹ نہ کھولا جائے کہ اس میں وہ لوگ بھی درآنے کی کوشش کریں جو قرآن پاک کی ایک آیت دیکھ کر بھی اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے، نیز یہ کہ وہ ایک موضوع کی متفرق چیزوں کو اکٹھا کرکے ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے سے بھی قاصر ہیں۔

جن لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کردینے کا فتویٰ دیا انہیں درحقیقت یہی فکر دامن گیر تھی کہ مذکورہ قسم کے لوگ اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگیں گے اور خدائے تعالیٰ پر بہتان تراشی کرتے ہوئے بلا دلیل وبنیاد کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام کریں گے، کیونکہ ان کا مقصد محض حکام کی خوشنودی ہوگی، بعض مدعیان اجتہاد کو ہم نے دیکھا ہے کہ جب ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ فلاں فلاں بات کا قائل ہونا ان کے آقاؤں کو خوش کرسکتا ہے تو وہ ان کی طلب سے پہلے ہی ان باتوں کے قائل ہونے کا اظہار کرگذرتے ہیں، پھر حکام ان مدعیان اجتہاد کے فتاویٰ کا سہارا لینے لگتے ہیں، چنانچہ ہمارے

زمانہ میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو تجارتی قرضوں پر سود کی حلت کے، اور عام ضروریات میں صرف کیلئے حاصل کردہ قرض کے سود کی حرمت کے قائل ہیں، بلکہ بعض تو علی العموم سود کے حلال ہونے کے قائل ہیں، اس لئے کہ ان کے بقول مصلحت اس پر عمل کرنے کی متقاضی ہے، ان میں سے بعض لوگ تحدید نسل کی غرض سے اسقاطِ حمل کا فتویٰ دے چکے ہیں، اس لئے کہ بعض حکام کی یہی رائے ہے، چنانچہ یہ لوگ اسے فیملی پلاننگ کا نام دیتے ہیں، ان میں سے بعض لوگوں کی رائے ہے کہ حدود کا اجراء صرف ان لوگوں پر ہوسکتا ہے جو حد کو واجب کرنے والے کسی جرم کے عادی بن جائیں، اسی طرح ان میں طرح طرح کے اور عجیب وغریب فتویٰ دینے والے لوگ موجود ہیں، بہرصورت اسی طرح کے لوگوں کے پیش نظر صاحب ورع علما نے اجتہاد کے دروازہ کی بندش کا فتویٰ دیا، لیکن ہماری رائے ہے کہ اجتہاد کی بالکلیہ حرمت اور اس کے دروازہ کی علی الاطلاق بندش کا فتویٰ شریعت کی تصریح اور اس کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ صحیح نظریہ یہ ہوگا کہ اس کو مباح بلکہ شرائط کے پائے جانے کے وقت واجب قرار دیا جائے، اس لئے کہ امت کو ان نئے واقعات کے سلسلہ میں شرعی احکام کی جانکاری کی ضرورت ہے جو پہلے زمانہ میں پیش نہیں آئے تھے۔

اجتہاد کے سرچشمے:

سارے علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حکم صرف خدا کا چلے گا اور اسی کو احکام صادر کرنے کا حق حاصل ہے، لہذا تمام ہی احکام کا سرچشمہ -بواسطۂ وحی - اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

وحی کی دو قسمیں ہیں:

وحی متلو اور وہ قرآن کریم ہے اور وحی غیر متلو اور وہ سنت نبویہ مطہرہ ہے، اس لئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کے رسول تھے اس لئے آپ جو کچھ فرماتے تھے اس کا سرچشمہ ہوائے نفس نہیں بلکہ وحی الٰہی ہوا کرتا تھا۔

اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ سارے احکام کا سرچشمہ براہ راست کتاب وسنت ہیں، لیکن اجماع اگر واقع ہوجائے تو وہ خدائے کریم کے حکم ہی کو ظاہر کرتا ہے، اس لئے کہ پوری امت ضلالت پر متفق نہیں ہوسکتی، رہا قیاس تو وہ بھی (ان لوگوں کے نزدیک جو قیاس کو حجت مانتے ہیں) مجتہد کی رائے کے مطابق حکم الٰہی کو ہی ظاہر کرتا ہے اور قیاس صحیح کے شرائط پائے جانے کی صورت میں اس رائے سے استدلال جائز ہے، خواہ ہم یہ مانیں کہ حق میں تعدد نہیں ہوتا یا یہ کہیں کہ ہوتا ہے۔(۱)

اجتہاد۔ایک نازک کام:

(۲) یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے کہ اگر ہر کس وناکس کو اجتہاد کی اجازت دے دی

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ اردو: ۱/۱۵۱-۵۳، و ۱/۲۷۲-۷۴۔

(۲) ماخوز از اسلامی عدالت مصنفہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: ۶۱ تا ۷۵۔ انیس

جائے تو دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، خواہشات نفس کی پیروی کی جائے گی، مصالح شرعیہ اور مقاصد تشریع کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور شریعت کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ کار اجتہاد کی نازک ذمہ داری اگر نااہل افراد یا ایسے لوگوں کے حوالہ کر دی جائے جو خوف خدا سے خالی اور خشکی و تری میں بے محابا چلنے کا مزاج رکھتے ہیں، تو یقین ہے کہ یہ اصول اجتہاد سے ناواقف اور اہلیت اجتہاد سے محروم لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور اللہ کی مخلوق کو بھی گمراہ کریں گے۔ آج کے عہد کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ لوگ جو مکان کی تعمیر سے لے کر معاشی مسائل تک اور پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی تدریس تک یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت، تربیت، تجربہ، تخصص (SPECIALISATION) کو ضروری تصور کرتے ہیں، وہ دین کے معاملہ میں ناکارہ سے ناکارہ شخص کو رائے دینے اور اجتہاد کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ آج جو لوگ اجتہاد۔ اجتہاد کا نعرہ بآواز بلند لگا رہے ہیں ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جو اس دور کے منکرات وفواحش اور اللہ کے دین کی حرمتوں کو اجتہاد کے مقدس نام پر محض اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لیے حلال کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے خواہشات نفس کی پیروی سے خود رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا ہے اور ''شریعت منزل من اللہ'' کو فیصلہ کی بنیاد بنانے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا گیا:

''وَاتَّبِعْ مَا يُوْحىٰ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ''. (سورۃ الأحزاب:۲)

اے نبی! اس شریعت کی پیروی کیجئے جو آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بذریعۂ وحی بھیجی جاتی ہے۔

اور فرمایا گیا:

''وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ''. (سورۃ المآئدۃ:۴۹)

اور حکم فرمایئے اے نبی! ان لوگوں کے مابین اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔

اجتہاد کی حقیقت:

اس موقع پر ضروری ہے کہ اجتہاد کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ اجتہاد کے عناصر ترکیبی تین ہیں۔ مجتہد، محل اجتہاد اور طریقۂ اجتہاد۔ جیسے مجتہد میں اہلیت اجتہاد ضروری ہے، اسی طرح محل اجتہاد یعنی ان مسائل کا تعین بھی ضروری ہے جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اگر اہلیت اجتہاد مفقود ہوگی تو شریعت عقل عیار کے لیے بازیچۂ اطفال بن جائے گی اور اگر محل اجتہاد کا تعین نہیں ہوگا تو محل منصوص کو اجتہاد کا نشانہ بنا کر نصوص شریعت کو منہدم کیا جائے گا۔ حالانکہ ہر وہ اجتہاد جو نص سے معارض ہو مردود ہے۔

’’(و) إلی (حرام) وهو الاجتهاد (فی مقابلة) دلیل (قاطع) من (نص) کتاب أو سنة (أو إجماع)‘‘. (۱)

اور وہ اجتہاد حرام ہے جو کتاب وسنت کی نص اور اجماع کی دلیل قطعی کے مقابلہ میں ہو۔

محل اجتہاد کے بارے میں اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ مسئلہ جس کے بارے میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی نص قطعی وارد ہو، یا کسی حکم پر امت کا اجماع ہو چکا ہو اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ مثلاً سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اب کاروبار کی ہر وہ صورت جو ربوا اور سود کی تعریف میں داخل ہے وہ حرمت ربوا کی صریح نص کا مصداق ہے۔ اس میں کسی مجتہد کے لیے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ جن احکام شرعیہ کی دلیلیں ظنی ہیں وہ مجتہد کے کار اجتہاد کا میدان ہیں، مثلاً مطلقہ کی عدت قرآن میں ’’ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ‘‘ (تین قرء) بتائی گئی۔ لغت عرب میں قرء کا اطلاق حیض اور طہر دونوں پر ہوتا ہے یعنی یہ لفظ ان الفاظ میں سے ہے جن کا اطلاق متضاد معانی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک صورت کا تعین قطعی نہیں رہتا۔ لہٰذا یہاں مجتہد دونوں میں سے کسی ایک صورت کو اپنے اجتہاد سے متعین کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی یہ چاہے کہ مطلقہ حائضہ کی عدت حیض یا طہر کے بجائے مہینوں سے متعین کی جائے تو یہ نص کے مقابلہ میں اجتہاد ہوگا۔ اسی طرح پنج وقتہ نمازوں کی فرضیت پر امت کا اجماع ہے اب اگر بزعم خود مجتہدین کا ایک ٹولہ اٹھے اور کہنا شروع کردے کہ نماز دو ہی وقتوں کی ضروری ہے تو یہ اجتہاد مردود قرار پائے گا۔ اصول فقہ کے معروف اور مستند ماہر علامہ علی بن ابی علی بن محمد تغلبی ابوالحسن سیف الدین آمدی المتوفی ۶۳۱ھ نے اپنی تصنیف ’الاحکام‘ میں لکھا ہے:

’’وأما ما فیه الاجتهاد. فما کان من الأحکام الشرعیة دلیله ظنی ....وقولنا’’ دلیله ظنی‘‘ تمییز له أما کان دلیله منها قطعی کالعباداة الخمسة ونحوها، فإنها لیست محلاً للاجتهاد وفیها لأنّ المخطئ فیها یعد آثماً والمسائل الاجتهادیة مالا یعد فیها باجتهادهٖ آثماً‘‘. (۲)

محل اجتہاد وہ احکام شرعیہ ہیں جن کی دلیل ظنی ہو۔ دلیل ظنی کی قید سے وہ احکام محل اجتہاد ہونے سے خارج ہو گئے جن کے دلائل قطعی ہوں۔ مثلاً عبادات خمسہ وغیرہ، کہ وہ محل اجتہاد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جو ان احکام میں اجتہاد کرے گا وہ بصورت خطا گناہ گار ہوگا۔ حالاں کہ مسائل اجتہادیہ میں خطاء اجتہادی کی وجہ سے گناہ لازم نہیں آتا۔

اور صاحب تلویح شرح توضیح نے لکھا ہے:

’’کل حکم شرعيٍ لیس فیه دلیل قطعیٌ هو محل الاجتهاد، فلا یجوز الاجتهاد فیما ثبت بدلیلٍ قطعی کوجوب الصلوات الخمس والزکوٰة و باقی أرکان الإسلام و ما اتفقت علیه الأمة من جلیات الشرع التی تثبت بالأدلة القطعیة‘‘. (۳)

(۱) تیسیر التحریر علی کتاب التحریر فی اصول الفقه لأمیر باد شاه: ج۴ص۱۸۰، نیز: التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر لابن أمیر الحاج: ۲۹۲/۳۔

(۲) الإحکام فی اصول الاحکام للآمدی: ج۴ص۱۶۴۔

(۳) التلویح علی التوضیح للتفتازانی: ج۲ص۱۱۷۔

ہر وہ حکم شرعی جس میں کوئی دلیل قطعی موجود نہیں ہو وہی محل اجتہاد ہے پس ان احکام میں اجتہاد درست نہیں ہوگا جو دلیل قطعی سے ثابت ہوں۔ جیسے پنج وقتہ نمازیں اور زکوٰۃ کی فرضیت اور دیگر ارکان اسلام، نیز شرع کے وہ کھلے ہوئے احکام جن پر امت کا اتفاق ہے اور جو قطعی دلائل سے ثابت ہیں۔

محل اجتہاد کے ذیل میں اس تفصیل کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ظنیات جو موضع اجتہاد ہیں ان کی چار صورتیں ہیں:

(۱) دلیل کا ثبوت بھی ظنی ہو اور حکم پر اس کی دلالت بھی ظنی ہو، جیسے ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم: "**لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**". (۱)

ظاہر ہے کہ حدیث بطریقۂ تواتر نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچی ہے، اس لیے اس کا ثبوت ظنی ہے، اسی طرح اس کے مفہوم کی تعیین میں بھی احتمال ہے۔ ایک مفہوم تو یہ ہوسکتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوگی۔ دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ نماز سورۂ فاتحہ کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ پس محل اجتہاد اس موقع پر دو ہے، ایک تو سند کی تحقیق دوسرے ان دونوں مفاہیم میں سے کسی ایک مفہوم کی تعیین۔

(۲) نص کا ثبوت اگر چہ ظنی ہے لیکن اپنے مفہوم پر اس کی دلالت قطعی ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "**فی کل خمس شاۃ**" (۲) کہ نصاب زکوۃ میں عدد کی تصریح پر نص کی دلالت قطعی ہے۔ اس لیے محل اجتہاد نہیں لیکن مجتہد کی بحث ونظر کا موضوع اس حدیث کی سند کی تحقیق ہوگی۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ نص کا ثبوت تو قطعی ہے لیکن حکم پر اس کی دلالت قطعی نہیں۔ جیسے اللہ رب العزت کا ارشاد "**وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ**" (۳) کہ قرآن شریف کی یہ آیت قطعی الثبوت ہے لیکن لفظ قرء کے مفہوم کی تعیین حیض یا طہر پر قطعی نہیں۔ اس لیے کسی ایک مفہوم کی تعیین محل اجتہاد ہے۔

(۴) چوتھی صورت وہ ہے جس کے بارے کوئی نص وارد نہیں اور اس بارے میں سلف کا اجماع ہے۔ ایسے مسائل میں مجتہد کو شریعت کی قائم کردہ علامات اور الاشباہ والنظائر کو سامنے رکھ کر حکم شرعی کا استنباط کرنا پڑتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں قیاس، استحسان، استصحاب اور استصلاح وغیرہ دلائل سے کام لینا پڑتا ہے۔

مجتہد کے لیے ضروری شرائط:

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اجتہاد کے عناصر ترکیبی میں سے اہم ترین عنصر خود مجتہد ہے اور مجتہد کار اجتہاد انجام نہیں دے سکتا ہے اگر وہ مدارک احکام اور مصادر شرع کا علم نہ رکھتا ہو اس لیے مجتہد میں مندرجہ ذیل صلاحیتیں ضروری ہیں:

(۱) قرآن کریم کا علم: خصوصیت کے ساتھ ان آیات پر نگاہ جن کا تعلق احکام اور اصول تشریع سے ہے

---

(۱) بخاری ومسلم، جمع الفوائد، القراءۃ فی الصلوات الخمس: ۲۱۷، مکتبۃ الرشد، ریاض۔ انیس۔

(۲) بخاری، ابوداؤد، نسائی، جمع الفوائد، زکاۃ النقد والماشیۃ والحرث والشجر: ۴۰۷۔ انیس۔

(۳) سورۃ البقرۃ: ۲۲۸۔

اس سلسلہ میں بعض علما نے لکھا ہے کہ پانچ سو آیات احکام ہیں۔لیکن کسی خاص عدد میں منحصر کرنا مقصود نہیں۔ **أحکام القرآن للجصاص** اور **أحکام القرآن لابن العربی** نیز دیگر کتب تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین فقہا نے اس سے کہیں زیادہ آیات سے احکام مستنبط کئے ہیں۔پس یہ مجتہد کی ذکاوت پر مبنی ہے کہ کن آیات سے احکام مستنبط کرسکتا ہے،۵۰۰ آیات دراصل وہ ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ احکام کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، نجم الدین طوفی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''والصحیح أن هذاالتقدیر غیر معتبر،وأن مقدار أدلة الأحکام فی ذلک غیر منحصرة فإن أحکام الشرع کما تستنبط من الأوامر والنواهی کذالک تستنبط من الأقاصیص والمواعظ ونحوها فقل أن یوجد فی القرآن الکریم آیة إلاویستنبط منها شیيء من الأحکام''.(۱)

صحیح یہ ہے کہ آیات احکام کو پانچ سو کے عدد میں محدود کردینا صحیح نہیں، کہ قرآن میں احکام پر دلالت کرنے والی آیات بے شمار ہیں،اس لیے کہ جس طرح اوامر و نواہی سے احکام شرع مستنبط کیے جاتے ہیں اسی طرح قرآن میں مذکور قصص اور مواعظ وغیرہ سے بھی احکام مستنبط کیے جاسکتے ہیں۔پس قرآنی آیات میں شاید ہی کوئی ایسی آیت ہو جس سے کوئی نہ کوئی حکم مستنبط نہیں کیا گیا ہو۔

''إذ غالب القرآن لا یخلومن أن یستنبط منه حکم شرعیٌ''.(۲)

قرآن کے زیادہ تر حصے سے حکم شرعی کا استنباط کیا جاتا ہے۔

بہر حال علم قرآن کے ذیل میں اسباب نزول کی واقفیت، عام خاص مفسر اور مجمل، ظاہر اور خفی، ناسخ اور منسوخ پر نگاہ ہونا ضروری ہے۔

بعض حضرات مجتہد کے لیے حافظ قرآن ہونا ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن دیگر محقق علما کی رائے میں حافظ قرآن ہونا ضروری نہیں ہے۔

''(متناً و استعمالاً لا حفظها)......... من ظهر قلبٍ کما نَبَّهَ علیه الغزالی وغیره.و قیل یجب حفظ ما اختص بالأحکام من القرآن ونقل فی القواطع من کثیرمن أهل العلم أنّه یلزم أن یکون حافظاً للقرآن لأنّ الحافظ أضبط لمعانیه من الناظر فیه. و نقله القیروانی فی المستوعب عن الشافعیؒ، قلت: الأول الأشبه.نعم الحفظ أحسن''.(۳)

مجتہد کے لیے قرآن کے متن کا علم اور اسکے استعمال کا سلیقہ ہونا چاہئے۔زبانی یاد رکھنا ضروری نہیں۔جیسا کہ غزالی وغیرہ نے اس پر متنبہ کیا ہے۔ایک قول یہ ہے کہ احکام سے متعلق مخصوص آیات کا حافظ ہونا مجتہد کے لیے ضروری ہے۔قواطع میں

(۱) نزهةالخاطر العاطر شرح کتاب روضة الناظر وجنةالمناظر لابن بدران:۴۰۲/۲۔

(۲) التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر لابن أمیر الحاج: ج۳ص۲۹۳۔

(۳) التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر لابن أمیر الحاج: ج۳ص۲۹۳۔

بہت سارے اہل علم سے نقل کیا گیا ہے کہ مجتہد کا حافظ قرآن ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ ناظر کے مقابلہ میں حافظ معانی قرآن کو زیادہ محفوظ رکھ سکتا ہے۔ قیروانی نے مستوعب میں یہ قول امام شافعی سے نقل کیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ پہلا قول حق کے زیادہ قریب ہے، البتہ حافظ قرآن ہونا زیادہ بہتر ہے۔

(۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم: خاص کر وہ احادیث جن کا تعلق احکام سے ہے، حدیث قولی ہو، فعلی ہو یا تقریری ہو (یعنی وہ امور جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آتے رہے اور آپ کے علم میں بھی آئے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں علیٰ حالہ برقرار رکھا، اس سے ممانعت نہیں فرمائی)۔ حدیث کے متن، اس کی سند اور راویوں کے حالات اور جرح وتعدیل کا علم، متواتر، مشہور اور خبر واحد سے واقف ہونا، قول وفعل کے اثرات و احکام، غیر محتمل اور محتمل معانی پر نگاہ۔ متعارض روایات کے درمیان تطبیق یا ترجیح کے اصول کا جاننا۔

کیا احادیث کی کسی خاص مقدار کا جاننا ضروری ہے بعض لوگوں نے احادیث کی تعداد پانچ سو یا تین ہزار لکھی ہے۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ اسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ امام احمد بن حنبلؒ سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا ایک لاکھ حدیثوں کا علم کافی ہے، انہوں نے فرمایا نہیں، سائل نے کہا دو لاکھ، انہوں نے کہا نہیں۔ سائل نے کہا تین لاکھ، انہوں نے کہا نہیں۔ سائل نے کہا چار لاکھ، انہوں نے کہا نہیں۔ سائل نے کہا پانچ لاکھ، تو امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا؛ ہاں! میں امید کرتا ہوں کہ کام چل جائے گا۔(۱)

اسی لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا:

”من لم يجمع طرق الحديث لا يحل له الحكم على الحديث ولا الفتيا به“.(۲)

جو طرق حدیث کو جمع نہ کرے اس کے لیے حدیث پر حکم کرنا اور اس کے مطابق فتویٰ دینا حلال نہیں۔

ظاہر ہے کہ آج کے عہد میں جب کہ احادیث مدوّن ہو چکی ہیں، حدیثوں کی ترتیب ابواب فقہ پر ہو چکی ہے، رجال حدیث پر غیر معمولی کام ہو چکا ہے، حدیث کی صحت وضعف، حال راوی، علل احادیث پر محققانہ بحثیں مرتب ہو چکی ہیں تو اب تمام احادیث کے حفظ اور احوال رواۃ کا زبانی یاد ہونا ضروری نہیں ہوگا بلکہ ان معتبر کتابوں کی ممارست، کہ کسی بھی حادثہ کی صورت میں اس کا ذہن متعلق مواد کی طرف منتقل ہو جائے اور پھر ان کتب مدونہ سے زیر غور موضوع پر احادیث نکالنے اور اس کی سند اور صحت وضعف کے بارے میں ان کتابوں کی طرف مراجعت کی صلاحیت کافی ہوگی۔

”إلا أن البحث عن أحوال الرواة في زماننا هٰذا كالمتعذّر لطول المدة وكثرة الوسائط فالأولىٰ الاكتفاء بتعديل الأئمة الموثوق بهم في علم الحديث كالبخاري ومسلم والبغوي والصغاني وغيرهم

---

(۱) كتاب الفقيه والمتفقه للخطيب البغدادي: ج۲ص۱۶۳۔

(۲) المدخل إلىٰ مذهب الإمام أحمد بن حنبل لابن بدران: ص۱۸۱۔

من أئمة الحدیث". (۱)

مگر آج ہمارے زمانہ میں روایت کے احوال کی براہ راست تحقیق تقریباً ناممکن ہے، اس لیے کہ مدت طویل گذر چکی اور واسطے بے شمار ہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ فن حدیث کے قابل اعتماد اور ماہر ائمہ کی تعدیل کے بارے میں رائے کو کافی تصور کیا جائے، جیسے بخاری، مسلم، بغوی اور صغانی وغیرہ۔

(۳) ناسخ اور منسوخ کی شناخت: مجتہد کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ کسی بھی حادثہ میں حکم کرتے وقت اور آیات واحادیث سے استدلال کرتے وقت جان لے کہ یہ حکم منسوخ تو نہیں ہے۔

(۴) متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل کی شناخت: تاکہ کسی مسئلہ میں کوئی ایسی رائے نہ اختیار کرے جو اجماع کے خلاف ہو۔

"معرفة مواقع الإجماع کماذکر الغزالیؒ أن یعلم أنه موافق مذهب ذی مذهب من العلماء وأنّه واقعة متجددة لاخوض فیها لأهل الإجماع ولایلزمه حفظ جمیع مواقع الإجماع والخلاف. (۲)

یعنی اجتہاد کی اہلیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ علماء امت کے اجماع واختلاف سے واقف ہو اور کن مسائل پر سلف نے کلام کیا ہے اور کون سے مسائل نئے ہیں جو عہد سلف میں زیر بحث نہیں آئے۔ البتہ تمام مواقع اجماع واختلاف کا زبانی یاد رکھنا ضروری نہیں ہے۔

پس مسائل کی تین صورتیں ہیں:

(۱) وہ مسائل جو عہد سلف میں زیر بحث نہیں آئے۔

(۲) وہ مسائل جو عہد سلف میں زیر بحث آئے اور ان کے بارے میں کسی رائے پر علما کا اجماع ہوگیا۔

(۳) وہ مسائل جو عہد سلف میں زیر بحث آئے اور ان کے بارے میں علما کی رائے مختلف ہے۔

اس طرح تینوں قسم کے مسائل کی شناخت مجتہد کے لیے ضروری ہے، فقہا کی آراء، ان کے طرز استدلال اور مناہج استنباط کا درک ضروری ہے کہ اس کے بغیر تحقیق کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علماء سلف کی مختلف آراء پر بہت وسیع نگاہ رکھتے تھے۔ جن پر ان کی مجلس میں بحث ہوتی تھی۔ امام مالک رحمہ اللہ اپنی مجلس درس میں زیر بحث مسائل کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں سے امام صاحب کی رائے دریافت کرتے رہتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا یمتنع من الاستماع ممن خالفه، لأنّه قد یتنبّه بالاستماع لترک الغفلة و یزداد به تثبیتاً فیما

(۱) التلویح مع التوضیح: ج۲ص۱۱۷۔

(۲) التقریروالتحریرفی شرح کتاب التحریرلابن أمیرالحاج: ص ۲۹۳۔

اعتقده من الصواب وعليه في ذٰلک بلوغ غاية جهده، والإنصاف من نفسه، حتى يعرف من أين قال ما يقول، وترک ما يترک و لايكون بما قال أغنى منه بماخالف حتى يعرف فضل مايصير إليه علىٰ ما يترک إن شاء اللّٰه". (۱)

اپنے مخالف کی رائے سننے سے گریز نہ کرے اس لیے کہ بسا اوقات دوسرں کی رائے سن کر اسے تنبہ ہوگا اور غلطی سے رجوع کرے گا اور کبھی اسے اپنی رائے کی صحت کا مزید یقین حاصل ہو جائے گا اور مجتہد کے لیے اس کام میں آخری کوشش تک پہنچنا ضروری ہے۔ اور خود اپنی ذات سے انصاف کرنا یہاں تک کہ وہ جان لے کہ وہ جو کہہ رہا ہے کہاں سے کہہ رہا ہے اور کس وجہ سے کہہ رہا ہے، اور اپنے قول کی وجہ سے وہ مخالفین کی آراء سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اختیار کردہ رائے کی ترجیح، متروک رائے پر سمجھ نہ لے۔

(۵) قیاس کا علم: یعنی اہلیت اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ قیاس کی حقیقت، اس کے ارکان اور اس کے شروط سے واقف ہو، مناط کی تحقیق، تخریج اور تنقیح، علت حکم کی تعیین کے اصول پر نگاہ، تخریج احکام کے دلائل کی ترتیب اور ترجیح کا سلیقہ رکھتا ہو۔ شیخ ابوزہرہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

قیاس کے علم کے لیے تین امور کا علم ضروری ہے، اول ان نصوص کو جاننا جن پر حکم قیاسی کی بنیاد ہے۔ ان علتوں کو جاننا جن پر ان نصوص میں حکم کا مدار ہے اور ان اسباب کو جاننا جن کی وجہ سے حکم فرع کا ان اصول کے ساتھ الحاق ممکن ہو۔

دوسرے قیاس کے قوانین اور ان کے ضوابط کو جاننا۔ مثلاً اس بات کو سمجھنا کہ یہ حکم منصوص ایسے محل میں تو نہیں ہے جس کا حکم متعدی نہیں ہوسکتا اور مثلاً علت کے اوصاف کو جاننا جن پر قیاس اور فرع کا اصل کے ساتھ الحاق مبنی ہے۔

تیسرے سلف کے ان مناہج کی واقفیت جن کے ذریعہ ان علل واوصاف کی شناخت حاصل ہوسکے، جو بناء احکام کی اساس ہے۔ (۲)

(۶) عربی زبان وادب کا علم: کتاب وسنت جو اصل مصادر شرع ہیں، یہ عربی زبان میں ہیں، ترجمہ کتنی ہی مہارت کے ساتھ کیوں نہ کیا گیا ہو، ممکن نہیں کہ اصل نصوص کی تمام کیفیات ترجمہ کے ذریعہ دوسری زبانوں میں منتقل کردی جائے، کہ ہر زبان کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں، محاورات ہوتے ہیں، مجازات اور استعارات ہوتے ہیں، ذکر و حذف اور فصل و وصل کے اصول ہوتے ہیں، یہاں تک کہ چند مترادف الفاظ کے مابین کسی خاص لفظ کو منتخب کرنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ معانی وحکمت کے ساتھ نظم وتعبیر کا بھی معجزہ ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اعلیٰ ترین فصاحت وبلاغت کا نمونہ ہیں اور ان جوامع الکلم سے نوازے گئے ہیں جن کے مختصر جملوں میں معانی اور فکر کا سمندر پنہاں ہے۔ ایسی صورت میں استنباط احکام جیسے نازک کام میں براہ راست مصادر احکام سے استفادہ

(۱) الرسالة للامام شافعیؒ۔

(۲) أصول الفقه للشيخ أبی زهرة: ص ۳۸۵۔

کے بجائے ترجموں پر انحصار کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس کتاب کے لیے عربی زبان اور قواعد یعنی لغت، صرف ونحو اور اصول بلاغت نیز اسالیب بیان کو جاننا ضروری ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے المنقول میں لکھا ہے:

”ولابد من علم اللغة فإنّ مآخذ الشرع ألفاظ عربية و ينبغي أن يستقل بفهم كلام العرب وإلا يكفيه الرجوع إلى الكتب. فإنّها لا تدل إلا على معاني الألفاظ. فأما المعاني المفهومة من سياقها و ترتيبها لا تفهم إلايستقل لها. ولابد من علم النحو فمنه يثور معظم إشكالات القرآن“. (۱)

علم لغت کا جاننا ضروری ہے، اس لیے کہ شرع کے مآخذ عربی الفاظ ہیں، اور کلام عرب کے فہم کی پوری صلاحیت ضروری ہے محض کتابوں کی طرف رجوع کافی نہیں۔ اس لیے کہ کتاب لغت سے محض لغوی معنی تو معلوم ہو جائیں گے مگر سیاق وسباق اور ترتیب سے جو معنی مفہوم ہوتے ہیں وہ کلام عرب کو براہ راست سمجھنے کی استعداد کے بغیر نہیں سمجھے جاسکتے۔ علم نحو کا جاننا بھی ضروری ہے کہ اکثر مشکلات قرآن کی تحقیق اسی علم کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

”أما لغةً فبأن يعرف معاني المفردات والمركبات وخواصها في الإفادة فيفتقرإلى اللغة والصرف والنحو والمعاني والبيان“. (۲)

لغت عرب کی واقفیت، یعنی مفردات ومرکبات کے معانی جاننا، معانی کے افادہ کے سلسلہ میں ان کے خواص کو جاننا، اس لیے لغت، صرف ونحو، معانی وبیان کا علم ضروری ہوگا۔

کار اجتہاد:

جیسا کہ عرض کیا گیا اجتہاد کے عناصر ترکیبی تین ہیں۔ مجتہد، محل اجتہاد اور کار اجتہاد۔ محل اجتہاد اور مجتہد سے متعلق مذکور الصدر تفصیل کے بعد کار اجتہاد کی تفصیل بھی بیان کر دینا ضروری ہے۔ اجتہاد کی حقیقت میں ”استفراغ وسع“ مذکور ہے۔ یعنی اپنی آخری کوشش حق وصداقت کی یافت کے لیے صرف کر دینا، مجتہد کا کام ہے۔ جس کی تفصیل اصول فقہ میں مذکور ہے۔ ہم تو یہاں مجتہد کے اس کام کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جس کا تعلق قیاس سے ہے۔ قیاسی احکام کی تخریج وتحقیق کے سلسلہ میں مجتہد کا کام ہے۔ تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط۔

تحقیق مناط:

اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت: قاعدۂ کلیہ جس کا ثبوت نص سے ہے یا جس قاعدۂ کلیہ پر اجماع اور اتفاق ہے۔ مجتہد اس کی تحقیق کرتا ہے کہ زیر غور جزئیہ اس قاعدۂ کلیہ کا مصداق ہے یا نہیں؟ اگر قاعدۂ کلیہ کے ذیل میں وہ جزئیہ آتا ہے تو قاعدۂ کلیہ کا حکم اس جزئیہ پر بھی نافذ ہوگا۔ مثلاً محرم اگر شکار حالت احرام میں کرے تو نص قرآنی قطعی

(۱) المنقول للغزالی: ص ۴۶۳.

(۲) التلویح علی التوضیح: ج۲ ص ۱۱۷۔

سے اس کا کفارہ ''شکار کے مماثل'' عائد ہوگا۔ پس ''کفارہ کا شکار کے مماثل ہونا'' ایسا قاعدۂ کلیہ ہے جس پر نص قطعی وارد ہے لیکن کیا ''نیل گائے'' کے مثل ''گائے'' ہے یا نہیں، اس کی تحقیق مجتہد کا کام ہے۔ اسی طرح نمازوں میں قبلہ کی طرف رخ کرنا نص سے واجب ہے۔ لیکن کسی خاص مقام پر قبلہ مغرب میں ہے یا مشرق میں، جنوب میں ہے یا شمال میں، تحقیق مناط ہے۔ زوجہ کا نفقہ واجب ہے، لیکن زوجین کے حالات، ان کے معیار زندگی، وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کسی خاص مقدمہ میں نفقہ کی خاص مقدار معین کرنا تحقیق مناط ہے۔

تحقیق مناط کی دوسری صورت یہ ہے کہ ''علت حکم'' منصوص یا مجمع علیہ ہے۔ مجتہد اس کی تحقیق کرتا ہے کہ جزئیۂ زیر غور میں وہ علت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ مثلاً بلی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''**إنها ليست بنجس، إنها من الطوافين و الطوافات**''. یعنی ہمہ دم گھروں میں چکر لگانا۔ اس نص کی روشنی میں اس حکم کی علت ہے کہ بلی کا جھوٹا نجس نہیں۔ لیکن کیا یہ علت چوہے اور دوسرے حشرات الارض میں بھی پائی جاتی ہے جو ہمیشہ گھر میں چکر لگاتے ہیں، یہ تحقیق مجتہد کا کام ہے۔

تنقیح مناط:

شارع نے حکم کی نسبت اس کے سبب کی طرف کی ہے، لیکن اس موقعہ پر کچھ ایسی اوصاف اور اتفاقی قیود بھی مذکور ہیں جن کا حکم میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اب مجتہد کا کام ہے ان مذکور اوصاف کو چھان پھٹک کر اصل سبب حکم کا اعتبار کرنا اور ان جزئیات پر اس حکم کو منطبق کرنا جن میں وہ سبب موجود ہیں۔ اور ان اوصاف کو نظر انداز کر دینا جن کا حکم میں کوئی دخل نہیں۔ مثلاً ایک اعرابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

''**هلكت يارسول الله**''. میں برباد ہوگیا یا رسول اللہ!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ماصنعت؟ تم نے کیا کیا ہے؟

اعرابی نے کہا:

''**واقعت أهلي في نهار رمضان**''. میں نے رمضان کے دن میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''**أعتق رقبة**'' غلام آزاد کرو۔

اس حدیث میں غور کریں تو چند باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ سائل کا اعرابی ہونا، رمضان کے ایک خاص مہینہ میں جماع کرنا۔ دن کے وقت جماع کرنا۔ اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وجوبِ کفارہ کا حکم

دیا۔ اصل سبب حکم ''کسی بھی مکلّف کا کسی بھی رمضان میں کسی بھی عورت کے ساتھ جماع کرنا'' ہے۔ پس صاحب واقعہ کا اعرابی ہونا، اس سال کے رمضان میں واقعہ کا پیش آنا، اپنی زوجہ کے ساتھ واقعہ پیش آنا محض اتفاق کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کو حکم میں دخل نہیں، اس لیے ان اتفاقی واقعات و قیود کو چھانٹ کر اصل حکم معین کرنا تنقیح مناط ہے اور اس کی وجہ سے حکم شارع مورد حکم کے ساتھ خاص نہیں رہتا، بلکہ اس میں عموم اور توسع پیدا ہو جاتا ہے۔

تخریج مناط:

یعنی کسی مسئلۂ خاص میں شارع نے کوئی حکم دیا۔ لیکن شارع نے علت حکم کی صراحت نہیں کی۔ اب مجتہد کا مشکل کام یہ ہے کہ اس حکم کی علت اپنے اجتہاد سے مستنبط کرے اور پھر اشتراک علت کی صورت میں اس حکم منصوص کو دوسری جزئیات کی طرف منتقل کرے۔ مثلاً حدیث رسول نے گیہوں، جو، نمک اور سونے چاندی میں صراحۃً ربوا کو حرام قرار دیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ان اشیاء مذکورہ میں کون سی ایسی خصوصیت ہے جو اس حکم کی بنیاد ہے۔ اگر وہ مدار حکم متعین ہو جائے تو دوسری اشیا بھی جن میں وہ خصوصیت پائی جاتی ہو، حرمت حکم ربوا کا محل قرار پائیں گی۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں:

''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواء، يداً بيد. فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد''.(۱)

اب مجتہدین نے ان چھ اشیا پر غور کیا تو کسی نے یہ دیکھا چاندی، سونا ثمن ہیں اور باقی چار چیزیں انسانی غذا ہیں۔ اس لیے انہوں نے علت ثمنیت اور طعم متعین کیا۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے یہ دیکھا کہ ان چھ اشیا میں سے ہر ایک ناپی، تولی جانے والی چیزیں ہیں اور ہر ایک کو اس کی جنس کے ساتھ متفاضلاً فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے انہوں نے علت حکم کی تخریج کرتے ہوئے جنس و قدر کو مدار حکم قرار دیا۔ اور چاول کو چاول کے عوض زیادتی اور کمی کے ساتھ فروخت کرنا حرام قرار دیا۔ پس ایسے مقامات پر جہاں مدار حکم منصوص نہیں ہو علت حکم کا استنباط ''تخریج مناط'' ہے۔

جہاں تک تحقیق مناط کی پہلی قسم کا تعلق ہے اس میں کسی اختلاف کا سوال نہیں ہے۔ تحقیق مناط کی دوسری صورت اور تنقیح مناط کو بھی اکثر منکرین قیاس نے تسلیم کیا ہے۔ البتہ تخریج مناط جمہور علماء امت کے یہاں ثابت ہے اور ظاہریہ اس کے منکر ہیں۔(۲)

اب جب کہ اجتہاد کے ہر سہ عناصر ترکیبی کی وضاحت ہو چکی تو اجتہاد کی حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اجتہاد در اصل

---

(۱) رواه مسلمؒ وأحمدؒ عن عبادة بن الصامتؓ۔

(۲) مزید تفصیل و وضاحت کے لیے شاطبی کی الموافقات نیز ابن قدامۃ المقدسی الحنبلی کی کتاب روضة الناظر وجنة المناظر مع حاشیہ عبدالقادر بدران کی بحث قیاس: ص (۲) ۲۳۴۔۲۳۴ ملاحظہ فرمائیں۔

''کسی ایسے شخص کی طرف سے جو تفصیلی دلائل سے احکام شرعیہ کی تخریج واستنباط کی صلاحیت رکھتا ہو، غیر منصوص حوادث ومسائل کے شرعی احکام معلوم کرنے کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کردینے کا نام'' ہے۔التقریر والتحریر میں اجتہاد اصطلاحی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''الاجتهاد اصطلاحاً: بذل الطاقة من الفقيه فى تحصيل حكم شرعى ظنى. وفى بذل الطاقة إشارة إلىٰ خروج اجتهاد المقهر وهو الذى يقف عن الطلب مع تمكنه من الزيادة علىٰ مافعل من السعى. ومن الفقيه احتراز من بذل الطاقة من غيره فى ذالک فإنه ليس باجتهاد اصطلاحى. وظنى. قيل لأن القطعى لااجتهاد فيه وسيأتى''. (۱)

اور ابن حاجبؒ نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

''هو استفراغ الفقيه الوسع لتحصيل ظن بحكم شرعى''.

ان تعریفات سے اہلیت اجتہاد، محل اجتہاد اور کار اجتہاد کی نوعیت واضح ہوجاتی ہے۔اسی لیے امام جمال الدین الاسنویؒ نے لکھا ہے:

''واعلم أن تعريف الاجتهاد يعرف منه تعريف المجتهد والمجتهد فيه، فالمجتهد هو المستفرغ وسعه فى درک الأحكام الشرعية والمجتهد فيه كل حكم شرعى ليس فيه دليل قطعى كذا قاله الآمدیؒ هنا'' (نهاية السؤل فى شرح منهاج الوصول للإمام جمال الدين الأسنوى). (۲)

اجتہاد کی تعریف سے مجتہد اور محل اجتہاد کی تعریف بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ مجتہد وہ ہے جو احکام شرعیہ کے جاننے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردیتا ہے اور محل اجتہاد وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کوئی نص قطعی وارد نہیں۔آمدیؒ نے اس مقام پر ایسا ہی کہا ہے۔

تجزی اجتہاد کی بحث:

میرے نزدیک یہ اہم ترین مباحث اجتہاد میں سے ہے جس کے بارے میں آج کے عہد میں علما کو خصوصی طور پر غور کرنا چاہئے۔مسئلہ یہ ہے کہ کیا اجتہاد اسی شخص کے لیے جائز ہے جو جملہ مسائل وابواب فقہیہ میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو یا یہ بھی جائز ہے کہ بعض ابواب فقہیہ میں اپنے کمال تحقیق کی وجہ سے اجتہاد کرے اور دوسرے ابواب میں اجتہاد نہ کرے۔تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ ایسے علما جو بعض خاص ابواب فقہیہ میں متخصص ہیں۔مثلاً وہ نکاح وطلاق یا فرائض یا تجارت سے متعلق آیات واحادیث اور اقوال سلف پر حاوی ہوں اور تحقیق کے اس مقام پر ہوں جہاں وہ ان

(۱) التقرير والتحرير فى شرح كتاب التحرير لابن أمير الحاج: ج۲/ص:۲۹۲۔

(۲) التقرير والتحرير فى شرح كتاب التحرير لابن أمير الحاج: ج۳/۲۸۸۔

امور کے بارے میں علت حکم اور مدار مناط کی تخریج کے اہل ہوں، لیکن دیگر ابواب فقہ پر ان کا علم اس درجہ حاوی نہیں۔ یا وہ عالم جو کسی خاص باب فقہ پر تو گہری نگاہ نہیں رکھتا لیکن اس باب کے کسی خاص مسئلہ کے بارے میں وہ جملہ ضروری دلائل پر اس طرح حاوی ہے کہ وہ ان مخصوص مسائل کے احکام شرعیہ مستنبط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو کیا ایسے علما کے لیے ان خاص ابواب یا ان خاص مسائل کے بارے میں اجتہاد کرنا اور اپنے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دینا درست ہوگا؟

اس سلسلہ میں محقق ابن امیر الحاجؒ مسئلہ کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

"شخص منصب الاجتهاد فی بعض المسائل فیحصل له ما هو مناط الاجتهاد من الأدلة فیها دون غیرها......."۔

وہ شخص جو بعض مسائل میں اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو پس اسے دلائل شرع کے ذریعہ ان خاص مسائل میں مناط حکم معلوم ہو جائے لیکن دوسرے مسائل میں یہ درک اسے حاصل نہ ہو۔

آگے فرماتے ہیں:

"(وعلیه) أی جواز تجزیه (فرع) أنه یجوز (اجتهاد الفرضی فی) علم (الفرائض) بأن یعلم أدلته باستقراء منه أو من مجتهد کامل وینظر فیها (دون غیره) من العلوم الشرعیة إذا لم یبلغ فیها رتبة الاجتهاد (وقد حکیت) هذه المسئلة فی أصول ابن الحاجب وغیرها وذکر فیها جوازه وهو قول بعض أصحابنا علیٰ ماذکره البستی من مشائخنا ومختار الغزالی ونسبه السبکی وغیره إلی الأکثر وقال إنه هو الصحیح وقال ابن دقیق العید: وهو المختار، وسیذکر المصنف أنه الحق فی مسئلة غیر المجتهد المطلق یلزمه التقلید وظاهر کلام ابن الحاجب التوقف (واختار طائفة نفیه مطلقاً)"۔ (۱)

تجزیٔ اجتہاد کے جواز کی بنیاد پر علم فرائض کے ماہر کے لیے مسائل فرائض میں اجتہاد درست ہوگا، بایں طور کہ وہ اپنی تلاش و تحقیق یا کسی مجتہد کامل کے ذریعہ احکام فرائض کے دلائل کا علم حاصل کر چکا ہو۔ لیکن وہ دوسرے علوم شرعیہ میں اجتہاد نہیں کرسکتا۔ اگر اسے ان علوم میں درجۂ اجتہاد حاصل نہ ہو۔ یہ مسئلہ اصول ابن حاجب وغیرہ میں منقول ہے۔ اور اس میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی ہمارے بعض اصحاب کا قول ہے جیسا کہ ہمارے مشائخ میں سے بستی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی رائے غزالی نے بھی اختیار کی ہے۔ اور سبکی وغیرہ نے اسے اکثر علما کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ یہی قول مختار ہے اور مصنف یعنی ابن ہمام نے آگے چل کر اسی قول کو حق قرار دیا ہے۔ (۲) اور ابن حاجب کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں توقف فرماتے ہیں اور کچھ لوگوں نے علی الاطلاق اسے نادرست قرار دیا ہے۔

غرض یہ کہ جمہور کی رائے یہی ہے کہ اجتہاد کا اس طرح منقسم ہونا درست ہے۔ بعض لوگ علی الاطلاق نادرست

(۱) التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر لابن أمیر الحاج: ج۲۔ص۲۹۳۔

(۲) دیکھئے: التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر لابن أمیر الحاج ج۳: ص۳۴۴، بحث غیر المجتهد المطلق یلزمه التقلید۔

کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ابواب فقہیہ میں سے کسی خاص باب کی حد تک تو یہ تجزی درست ہے لیکن یہ درست نہیں ہوگا کہ ایک باب کے کسی خاص مسئلہ میں مجتہد ہو اور اسی باب کے دوسرے مسئلہ میں مجتہد نہ ہو۔ بعض لوگوں نے کہا کہ احکام علم فرائض کی حد تک تجزی درست ہوگی کہ کوئی شخص علم فرائض میں مجتہد ہو اور دوسرے ابواب میں نہیں۔ لیکن اسکے علاوہ ابواب میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ فتوحی فرماتے ہیں:

''الاجتهاد يتجزء عند أصحابنا والأكثر......وقيل لايتجزء وقيل يتجزء فی باب لافی مسئلة وقيل فی الفرائض لافی غيرها''. (۱)

اور زرکشی نے کہا:

''وكلامهم يقتضی تخصيص الخلاف بما إذا عرف باباً دون باب أما مسئلة دون مسئلة فلايتجزء قطعاً والظاهر جريان الخلاف فی الصورتين وبه صرّح الأنباری''. (۲)

آج کے عہد میں اس مسئلہ کی خاص اہمیت اس لیے ہے کہ مجتہد کامل مفقود ہے اور بہت سے ایسے مسائل درپیش ہیں جو عہد سلف میں پیش نہیں آئے۔ تو ان مسائل کے حل کے لیے ایسے علما اقدام کر سکتے ہیں جو کسی خاص باب میں اپنی وسعت علمی، کمال اور تحقیق کی بدولت مناط حکم کی تخریج کے اہل ہوں تا کہ ایسے جدید مسائل کا حل ممکن ہو اور جیسا کہ ذکر کیا گیا جمہور کی رائے میں یہ درست ہے لیکن اس موقعہ پر ابن الزملکانی کی رائے میرے نزدیک زیادہ معقول ہے کہ اہلیت اجتہاد کی شرائط دو طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ صلاحیتیں ہیں جن کا تعلق مطلق اجتہاد سے ہے، قطع نظر اس سے کہ اجتہاد احکام صلوٰۃ میں کیا جائے یا احکام بیوع یا کسی اور باب فقہ میں۔ اور بعض وہ شرائط ہیں جن کا تعلق اس مخصوص باب سے متعلق معلومات سے ہے۔ مثلاً قوت استنباط، مفہوم کلام کو سمجھنے کی صلاحیت، کون سی دلیل قابل قبول ہے اور کون سی نہیں، یہ اور اس طرح کی دوسری صلاحیتیں ہر مجتہد کے لیے ضروری ہیں۔ چاہے وہ ایک مسئلہ میں اجتہاد کرے یا جملہ احکام دین میں۔ پس اس طرح کی کلی صلاحیتوں میں تجزی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دوسری قسم کی صلاحیتوں میں تجزی ہوسکتی ہے۔ اور اصل قوت اجتہاد موجود ہو تو کسی خاص باب سے متعلق علم کی وسعت کے اعتبار سے یہ جائز ہوگا کہ ایک باب میں وہ اجتہاد کرے اور دوسرے باب میں اجتہاد نہ کرے۔ محقق ابن امیر الحاج نے ابن الزملکانی کی اس رائے کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔

''وأماقول ابن الزملكانی. الحق التفصيل، فماكان من الشروط كلياً كقوة الاستنباط ومعرفة مجاری الكلام ومايقبل من الأدلة وما يرد ونحوه. فلا بد من استجماعه بالنسبة إلٰی كل دليل ومدلول

(۱) شرح الكوكب المنير المسمی بمختصر التحرير او المختصر المبتكر شرح المختصر: ص۳۹۸۔

(۲) ارشاد الفحول الی تحقيق الحق من علم الاصول للشوكانی: ص۲۵۵۔

فلا تتجزء تلک الأهلية وما كان خاصاً بمسئلة أو بمسائل أو باب فإذا استجمعه الإنسان بالنسبة إلٰى ذالک الباب أو تلک المسئلة أو المسائل مع الأهلية، كان فرضه فى ذالک الجزء الاجتهاد دون التقليد،فحسن". (۱)

ابن الزملکانی کا یہ قول بہتر ہے کہ وہ کلی شرائط مثلاً قوت استنباط،تعبیرات کلام کو سمجھنا،مقبول اور قابل رد دلائل کی شناخت وغیرہ جن کا تعلق ہر دلیل ومدلول سے ہے،تو یہ بنیادی اہلیت متجزی نہیں ہوسکتی البتہ وہ صلاحیت جو کسی خاص مسئلہ،مخصوص نوع کے مسائل یا کسی خاص باب سے تعلق رکھتی ہے،اگر کوئی شخص بنیادی اہلیت کے ساتھ ساتھ ان خاص مسائل میں یہ صلاحیت رکھتا ہے تو اس کے لیے شرع کے اس خاص جزء کی حد تک اجتہاد فرض ہوگا،اور اس کے لیے تقلید درست نہیں ہوگی۔

محقق ابن امیر الحاج نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ کوئی علیحدہ قول نہیں بلکہ دراصل جمہور کی رائے کی وضاحت اور محل اختلاف کی تعیین ہے:

"فإن الظاهر أن هذا قول المطلقين لتجزئ الاجتهاد،غايته أنه موضع لمحل الخلاف فليتأمل". (۲)

ظاہر یہی ہے کہ یہ تجزئ اجتہاد کو علی الاطلاق جائز قرار دینے والوں کا قول ہے۔مقصد اس قول کا محل اختلاف کی وضاحت ہے۔

مقاصد شریعت کا علم:

تشریع کے مقاصد پر نگاہ اور انسانی مصالح،حالات نیز عرف وعادت کی واقفیت بھی مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ احکام شرع مصالح انسانی پر مبنی ہیں۔ان مصالح کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے،فرد سے ہو یا جماعت سے۔اسی طرح عرف وعادت اور احوال ناس کے تغیر کا اثر احکام پر پڑتا ہے۔دوسری طرف اللہ کی شریعت اعتدال پر مبنی ہے۔نہ اس میں وہ تشدد ہے جو بندوں کو تکلیف مالا یطاق اور شدید مشقت میں ڈال دے اور نہ اس میں وہ سہولت و تخفیف ہے جو بندوں کو اباحیت اور بے جا آزادی کی طرف لے جائے۔اس لیے آج کے دور میں خاص کر جب کہ احکام شرع کا بوجھ سر سے اتار کر ہر شئی کو جائز قرار دینے کا رجحان بڑھا ہوا ہے اور دوسری طرف احوال ناس کے تغیر اور عرف وعادات کی تبدیلی نے واقعی کچھ مشکلات پیدا کر دی ہیں،فقہا کا فرض بہت نازک ہو جاتا ہے کہ وہ مقاصد تشریع کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے ہوئے معاشرہ کی مشکلات کو بھی دور کریں اور دوسری طرف اس اباحیت کا راستہ بھی بند کر دیں جو مغربی تہذیب کا خاص تحفہ ہے۔اہلیت اجتہاد کی اس بحث کو ہم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی اس گفتگو پر ختم کرتے ہیں۔حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"اہلیت اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ قرآن وسنت کے اس حصہ کا علم رکھتا ہو جو احکام سے متعلق ہے اور اجماع کے مواقع، قیاس کے شرائط نیز نظر وفکر کی کیفیت،علم عربیت، ناسخ ومنسوخ اور راویوں کے حالات سے واقفیت رکھتا ہو، اور علم وفقہ کی

(۱،۲)　التقرير والتحرير فى شرح كتاب التحرير لابن أمير الحاج: ج۳،ص:۲۹۴۔

حاجت نہیں، لیکن امام غزالیؒ نے فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں فقہ کی ممارست اور مشق سے ہی اجتہادی صلاحیت حاصل ہوتی ہے اور فقہ کی ممارست ہی اس زمانہ میں فہم مسائل حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور صحابہؓ کے زمانہ میں یہ طریقہ نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ غزالیؒ کا یہ قول اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اجتہاد مطلق منتسب کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ مجتہد مستقل کی تصریحات سے مجتہد منتسب واقف ہو۔ اسی طرح مجتہد مستقل کے لیے صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے ان اقوال سے واقف ہونا ضروری ہے جن کا تعلق ابواب فقہ سے ہے۔ یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، کتب اصول میں مذکور ہے۔ اس موقع پر کلام بغوی کا ذکر کردینا نامناسب نہیں ہوگا، بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے جو علم کی پانچ اقسام پر حاوی ہو۔ اول کتاب اللہ کا علم، دوسرے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم۔ تیسرے علماء سلف کے اقوال اور ان کے اجماع واختلاف کا علم۔ چوتھے لغت کا علم، پانچویں استنباط کے ان اصولوں کا علم جن کے ذریعہ وہ کتاب وسنت سے ان مسائل کا حکم مستنبط کرسکے جن کا صراحۃً ذکر کتاب وسنت اور اجماع میں نہیں ہے۔ پس ضروری ہے کہ ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفسر، خاص وعام، محکم ومتشابہ، کراہت وتحریم، اباحت وندب اور وجوب کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں جانتا ہو۔ سنت رسول اللہ میں صحیح وضعیف، مسند ومرسل کا علم رکھتا ہو۔ اسی طرح سنت کو قرآن پر اور قرآن کو سنت پر مرتب کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر اس کے سامنے کوئی ایسی حدیث آئے جو بظاہر قرآن کے موافق نہیں ہو تو وہ تطبیق کی صورت کا سراغ لگا سکتا ہو۔ اس لیے کہ سنت بیان قرآن ہے اس کے مخالف نہیں ہوسکتی۔ واضح رہے کہ احادیث احکام کو جاننا ضروری ہے۔ قصص واخبار ومواعظ کا نہیں۔ اسی طرح علم لغت میں اس حد تک مہارت ضروری ہے جس حد تک آیاتِ احکام اور احادیث کے فہم میں ضرورت ہے۔ تمام لغات عرب کا احاطہ ضروری نہیں ہے۔ اور لغت میں اتنی مہارت ضروری ہے کہ کلام عرب کے اس مقصد کو سمجھ سکے جو مواقع اور حالات کے اختلاف کی صورت میں مراد ہوتے ہیں اس لیے کہ خطاب شریعت عربی زبان میں وارد ہوا ہے۔ پس جو عربی زبان نہیں جانتا وہ شارع کی مراد کو نہیں سمجھ سکتا اور ضروری ہے کہ احکام سے متعلق صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال اور فقہاء امت کے فتاویٰ کے بڑے حصہ پر اس کی نگاہ ہو تا کہ ان کے قول کی مخالفت کرکے وہ ایسا حکم نہ لگادے جو خارق اجماع ہو"۔(۱)

اور آخر میں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ مجتہد جس کی رائے پر دوسرے عمل کریں گے اس کا ثقہ، قابل اعتماد اور صاحب ورع وتقویٰ ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین کے معاملات میں متساہل نہ ہو۔(۲) ☆

---

(۱) عقد الجید فی أحکام الاجتهاد والتقلید: ص ۷ تا ۹ شائع کردہ مطبع مجتبائی دہلی مع ترجمہ سلک مروارید ۱۳۴۴ھ۔

(۲) ماخوذ از اسلامی عدالت مصنفہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: ص ۶۱ تا ۷۵۔

☆ **علم اصول فقہ:** ظاہر ہے کہ مصادر شرع سے احکام کے استنباط کے اصول، علم اصول فقہ کا موضوع ہیں، اس لیے اجتہاد کی بنیاد ہی اصول فقہ پر ہے جس سے مجتہد کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں:

ولابد من أصول الفقه. فلا استقلال للنظر دونه. (المنقول: ص ۴۶۴) اور اصول فقہ کا جاننا ضروری ہے کہ بغیر اس کے اجتہاد ممکن نہیں۔

علامہ شوکانیؒ کی رائے یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے قائم کردہ مسائل اصول کا علم کافی نہیں بلکہ ہر مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود براہ راست اصول استنباط کی تحقیق کرے جس طرح اصول فقہ کی تدوین سے پہلے ائمۂ مجتہدین نے تحقیق واجتہاد کے ذریعہ یہ اصول قائم کئے۔ ظاہر ہے کہ اس رائے میں شدت ہے۔ (شوکانیؒ کی رائے کی تفصیل کے لیے دیکھئے: ارشاد الفحول: ص ۲۵۲) ماخوذ از اسلامی عدالت مصنفہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: ۲:۷۳،۷۷۔ انیس

اتباع

(اتباع سے مراد تقلید ہے۔)(۱) تقلید کا مفہوم، کسی بھی مذہب، مسلک یا کسی امام کی اتباع کرنا ہے، لغت میں ''تقلید'' قلّد کا مصدر ہے، اس کا معنی دوسرے کی گردن میں کوئی چیز ڈالنا ہے جو اس کی گردن کا احاطہ کرلے۔(۲).................اور اصطلاح شرع میں تقلید چار معانی کے لئے آتا ہے:

اول: والی یا قاضی وغیرہ کی تقلید، یعنی ان دونوں کو کام کی ذمہ داری سونپنا۔

دوم: ہدی کے جانور کی تقلید کہ اس کی گردن میں کوئی ایسی چیز ڈال دی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ ہدی کا جانور ہے۔

سوم: تعویذ وغیرہ گردن میں پہنانا۔

چہارم: دین میں تقلید یعنی دین کے سلسلہ میں بغیر دلیل جانے ہوئے کسی کی بات ماننا یا بغیر دلیل کے دوسرے کی بات پر عمل کرنا۔(۳)

مجتہد کی تقلید:

کسی کے قول کو بلا حجت و دلیل قبول کرنا تقلید ہے، جیسے عام آدمی کا مجتہد کے قول پر عمل کرنا، لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی طرف رجوع کرنا تقلید نہیں ہے، اور اسی طرح اجماع کی طرف رجوع کرنا بھی تقلید نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس چیز کی طرف رجوع ہے جو بذات خود حجت ہے۔(۴)

تقلید کا حکم:

مقلدین، فقہا کی جماعت میں نہیں ہیں، اس لئے کہ مقلد فقیہ نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں فقہ کی تعریف کی گئی ہے اور تقلید کی مذمت کی گئی ہے اور درحقیقت یہ ایک قسم کی کوتاہی ہے۔(۵)

(۱) ماخوذ از الموسوعۃ الفقہیۃ اردو، وزارت اوقاف کویت، لفظ تقلید۔

(۲) روضۃ الناظر لابن قدامۃ: ۹۴۴/۲، طبع دوم الریاض مکتبہ المعارف ۱۴۰۴ھ۔

(۳) روضۃ الناظر بتعلیق الشیخ عبد القادر بن بدران: ۴۵۰/۲، طبع المطبعۃ السّلفیہ قاہرہ ۱۴۰۴ھ، إرشاد الفحول للشوکانی: ص ۵۶۲، طبع مصطفی الحلبی قاہرہ ۱۳۶۵ھ۔

(۴) شرح مسلم الثبوت: ۴۰۰/۲، طبع بولاق قاہرہ ۱۳۲۲ھ، المستصفی مطبوع مع مسلم الثبوت: ۳۸۳/۲، طبع بولاق، روضۃ الناظر: ۴۵۰/۲۔

(۵) شرح مسلم الثبوت: ۱۰/۱۔

عقائد میں تقلید کا حکم:

جمہور اصولیین کے نزدیک عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے، جیسے اللہ کا وجود اور اس کی وحدانیت اور صرف اسی ایک کی عبادت کا واجب ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق وسچائی کی معرفت، ان چیزوں میں ان کے نزدیک نظر صحیح اور ایسا تدبر وتفکر ضروری ہے جس سے یقین اور اطمینان قلب حاصل ہو سکے۔ اور اسی طرح اس کی دلیلیں جاننا ضروری ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقیدہ کے سلسلہ میں تقلید کی مذمت کی ہے، ارشاد باری ہے:

" بَلْ قَالُوْآ إِنَّا وَجَدْنَا اٰبآءَ نَا عَلٰى أُمَّةٍ وَ إِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُهْتَدُوْنَ". (۱)

نہیں بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک خاص طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر قدم رکھ رہے ہیں۔

اور جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

"إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ". (۲)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اہل عقل کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لقد نزلت علي الليلة آية، ويل لمن قرأها ولم يتفكر فيها". (۳)

رات میرے اوپر ایک آیت نازل ہوئی ہے، ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو اس آیت کی تلاوت کرے اور اس میں غور وفکر نہ کرے۔

اور اس لئے بھی کہ اس میں ممکن ہے کہ مجتہد اپنے مقلد کے حق میں غلطی کر جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اخبار میں جھوٹا ہو اور اس سلسلے میں مجتہد کی سچائی پر اطمینان قلبی کی وجہ سے اعتماد کرنا کافی نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت اس میں اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے اطمینان قلب کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا، جنہوں نے اپنے اسلاف کی تقلید کی اور ان کے دل اس چیز پر مطمئن تھے جس پر ان کے باپ دادا پہلے سے عمل کرتے تھے، کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے۔ (۴)

اور بعض فقہا نے عقائد میں تقلید پر اکتفا کرنے کو جائز کہا ہے اور یہ ظاہریہ کی جانب منسوب ہے۔ (۵)

---

(۱) سورۂ الزخرف/۲۲۔

(۲) سورۂ آل عمران/۱۹۰۔

(۳) حدیث: "لقد نزلت على الليلة آية، ويل لمن قرأها ولم يتفكر فيها (اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ......الخ) کی روایت ابن حبان (موارد الظمآن/ص: ۱۴۰، طبع السلفیہ) نے کی ہے۔

(۴) کشاف القناع عن متن الاقناع: ۶/۲۰۳، مطالب أولى النهى فى شرح غاية المنتهى وتجريد الزوائد الغاية والشرح: ۶/۱۴۴، طبع المکتب الاسلامی، دمشق۔

(۵) إرشاد الفحول/ص ۲۶۲۔

چنانچہ جمہور کے نزدیک اس سلسلے میں وہ تمام چیزیں عقائد سے ملحق ہیں جو دین کی ضروریات میں سے ہوں تو ان میں تقلید نہیں ہوگی، اس لئے ان کا علم تواتر اور اجماع سے حاصل ہوتا ہے، اور اسی میں اسلام کے پانچ ارکان کا علم حاصل کرنا ہے۔

فروع میں تقلید کا حکم:

جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کے علاوہ عملی احکام شریعت میں تقلید کرنے میں اختلاف ہے اور اس میں دو رائیں ہیں:

اول: ان میں تقلید جائز ہے اور یہ جمہور اصولیین کی رائے ہے۔(۱) انہوں نے کہا: یہ اس لئے کہ ان میں مجتہد یا تو صحیح حکم تک پہنچنے والا ہوگا یا اس سے غلطی ہوئی ہوگی جس میں اس کو ثواب ملے گا، وہ گناہ گار نہ ہوگا تو اس میں تقلید جائز ہے، بلکہ عام آدمی پر تقلید واجب ہے، اس لئے کہ احکام شریعت پر عمل کرنے کا وہ مکلّف ہے، اور کبھی کبھی دلائل میں ایسا خفا اور پیچیدگی ہوتی ہے جس میں نظر صحیح اور اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے، اور عوام الناس کو درجۂ اجتہاد حاصل کرنے کا مکلّف بنا دینا کھیتی اور نسل کے انقطاع کا سبب ہوگا اور پیشوں اور کاموں کے ٹھپ پڑ جانے کا باعث ہوگا، جس کا نتیجہ ویرانی ہوگا، اور اس لئے بھی کہ صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے کو فتوے دیتے تھے اور غیروں کو بھی فتوے دیتے تھے، اور ان کو درجۂ اجتہاد پر پہنچنے کا حکم نہیں دیتے تھے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے علما سے پوچھنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری ہے:

"فَسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ". (۲)

سو اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھ دیکھو۔

دوم: تقلید حرام اور ناجائز ہے، ابن عبد البر، ابن القیم اور شوکانی وغیرہ کا یہی قول ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تقلید کی مذمت کی ہے، فرمایا:

"اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ". (۳)

انہوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علما اور اپنے مشائخ کو (بھی) اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔

اور فرمایا:

"وَقَالُوْا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَائَنَا فَأَضَلُّوْنَا السَّبِيْلاَ. (۴)

اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا سو انہوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔

---

(۱) روضة الناظر: ۱۵۴/۲، ۲۵۴، اِعلام الموقعين عن رب العالمين: ۸۱/۴، ۱۰۲، ۷، إرشاد الفحول: ص ۲۶۲۔

(۲) سورۂ نحل: ۴۳۔

(۳) سورۂ توبہ: ۳۱۔

(۴) سورۂ احزاب: ۶۷۔

اوران کے علاوہ دیگر آیات ہیں، اور ائمہ نے اپنی تقلید سے منع کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

''کسی کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ ہماری بات کہے، یہاں تک کہ وہ یہ جان لے کہ ہم نے یہ بات کہاں سے کہی ہے''۔

اور مزنیؒ نے اپنی ''مختصر'' کے شروع میں فرمایا:

''میں نے امام شافعیؒ کے علم سے اس کا اختصار کیا ان کی اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کرنے کے باوجود اور اس کے جاننے کے باوجود کہ ان کے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سے اپنے دین کے سلسلے میں غور وفکر کریں اور اپنی ذات کے سلسلے میں محتاط رہیں''۔

اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میری تقلید مت کرو اور نہ امام مالک کی، نہ ثوری کی اور نہ اوزاعی کی، بلکہ وہاں سے علم حاصل کرو جہاں سے خود ان لوگوں نے حاصل کیا ہے''۔(۱)

اور ابن القیمؒ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ تقلید جو ان کے نزدیک ممنوع ہے، وہ یہ ہے کہ کسی متعین شخص کے اقوال کو شارع کے نصوص کا درجہ دینا کہ اس کے علاوہ کسی کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ نصوص شارع کی جانب بھی توجہ نہ کرے، الا یہ کہ وہ اس کے قول کی صراحت کے موافق ہو، وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ تقلید ہے جس کے سلسلے میں امت کا اجماع ہے کہ یہ تقلید اللہ کے دین میں حرام ہے، اور یہ تقلید امت میں خیر القرون کے ختم کے بعد ہی ظاہر ہوئی۔(۲)

اور ابن القیمؒ اور شوکانیؒ نے تقلید سے اوپر اجتہاد سے کم ایک درجہ بیان کیا ہے، وہ اتباع کا درجہ ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دلیل کو جان کر غیر کے قول پر عمل کیا جائے، یہ تعریف امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کے اس قول کے مطابق ہے کہ ''کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہماری بات کہے یہاں تک کہ یہ جان لے کہ ہم نے کہاں سے یہ بات کہی ہے''۔(۳)

البتہ تقلید ضرورت کے وقت جائز ہے، اس میں سے یہ ہے کہ جب عالم کو کتاب وسنت میں کوئی نص نہ ملے اور اپنے سے بڑے کسی عالم کے قول کے سوا کوئی دوسری چیز اس کے سامنے نہ ہو تو وہ اس کی تقلید کرے گا، اور تقلید حرام اس وقت ہے جب کہ عالم دلیل کے ذریعہ معرفت حق کی قدرت رکھتا ہو، پھر اس کے باوجود تقلید کی طرف بڑھے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو حلال ذبیحہ پر قدرت رکھتے ہوئے مردار کی طرف بڑھے۔

---

(۱) اِعلام الموقعین: ۱۸۱/۴، ۱۰۲، ۱۱۲، مختصر المزنی المطبوع مع الأم للشافعی: ص۱، إرشاد الفحول: ۲۶۲۔

(۲) اِعلام الموقعین: ۲۳۲/۴، ۲۹۱۔

(۳) اِعلام الموقعین: ۲۶۰/۴۔ اور ائمہ کی اپنی تقلید سے منع کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات اپنے ان شاگردوں سے کہی ہو جو دلائل کی حجیت اور ان کی صحت کی معرفت اور ان کی دلالت کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، چنانچہ ان حضرات کے لئے ان مسائل میں تقلید جائز نہیں ہے جن میں وہ دلائل کی طرف رجوع کر سکتے ہوں، البتہ عام آدمی جو اس کا اہل نہ ہو تو ائمہ کا یہ کلام ان کے لئے نہیں ہے اور تقلید قطعی طور پر ان کے لئے فرض ہے۔

تقلید اس شخص کے لئے ہے جو اجتہاد نہ کرسکتا ہو، یا اجتہاد پر قدرت تو ہو لیکن اس کے لئے اس کے پاس وقت نہ ہو، تو یہ ضرورت کی حالت ہے جیسا کہ ابن القیمؒ کا قول ہے اور امام احمدؒ نے امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا: جب مجھ سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے جس کے سلسلے میں میرے پاس نص نہ ہو تو میں اس میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیتا ہوں، اس لئے کہ وہ قریش میں امام اور عالم ہیں (۱) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا تسبوا قریشاً، فإن عالمها یملأ طباق الأرض علمًا''. (۲)

تم لوگ قریش کو برا بھلا مت کہو، اس لئے کہ قریش کا عالم روئے زمین کو علم سے بھر دیتا ہے۔

جس کی تقلید جائز ہے اس کی شرائط:

عام آدمی اسی شخص سے فتویٰ معلوم کرسکتا ہے جس کے علم وعدالت سے وہ واقف ہو، اور جس کو جاہل سمجھتا ہو تو بالاتفاق اس سے مسئلہ نہیں پوچھے گا، اسی طرح اس شخص سے نہیں پوچھے گا جس کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ فاسق ہے، اور اس شخص سے فتویٰ معلوم کرسکتا ہے جس کے بارے میں غالب گمان ہو کہ وہ عالم ہے، اس لئے کہ وہ اس کو دیکھتا ہو کہ اس کو فتویٰ دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، اور دیگر علما کی موجودگی میں لوگ اس سے علم حاصل کرتے ہیں، اور وہ اس میں علما اور اہل دین وتقویٰ کی علامات دیکھتا ہو، یا کوئی قابل اعتماد شخص اس کو اس کی خبر دے، ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: فتویٰ اسی شخص سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو علم وعدل کے ساتھ فتویٰ دے۔

البتہ علم میں مجہول الحال شخص کی تقلید جائز نہیں، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ سائل سے بڑا جاہل ہو اور عدالت میں مجہول الحال شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے بارے میں ایک یا دو عادل سے معلوم کرلینا ضروری ہے، اس لئے کہ اس سے جھوٹ اور تدلیس کا اندیشہ ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ عدالت کے سلسلے میں سوال لازم نہیں ہے، اس لئے کہ دراصل علما میں تو عدالت ہوتی ہی ہے۔ (۳)

اور ایسے شخص کی تقلید نہیں کی جائے گی جو فتووں میں تساہل سے کام لیتا ہو، اور نہ اس شخص کی تقلید کی جائے گی جو حرام حیلے تلاش کرتا ہو، اور نہ اس شخص کی تقلید کی جائے گی جو شاذ اقوال کو لیتا ہو جن پر جمہور علما نکیر کرتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) مطالب أولی النهیٰ: ۶/۴۴۸۔

(۲) حدیث: ''لا تسبوا قریشاً، فإن عالمها یملأ......'' کی روایت طیالسیؒ نے اپنی مسند (منحة المعبود: ۲/۹۹۱، طبع المنیریة) میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کی ہے، عجلونیؒ نے کشف الخفاء (۲/۸۶، طبع الرسالہ) میں اس کی اسناد کو ضعیف کہا ہے۔

(۳) المستصفی: ۲/۳۹۰، روضة الناظر: ۲/۴۵۴۔

(۴) مطالب أولی النهیٰ: ۶/۴۴۱، ۴۴۶، ۴۴۷، تبصرة الحکام: ۱/۲۵، طبع المطبعة العامرة الشرفیة، قاهره ۱۳۰۱ھ۔

تقلید کس کے لئے جائز ہے:

یہ بات گذر چکی ہے کہ تقلید عام آدمیوں کے لئے اور جو ان کے مشابہ ہوں یعنی اجتہاد پر قدرت نہ رکھتے ہوں ان کے لئے جائز ہے، اسی طرح وہ شخص جس کو اجتہاد پر قدرت حاصل ہو لیکن مصلحت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اگر وہ احکام میں اجتہاد کرنے میں مشغول ہو تو اس کے لئے کسی مجتہد کی تقلید کرنا جائز ہے۔

البتہ اگر مجتہد وسعت وقت اور اجتہاد پر قدرت کے باوجود تقلید کرنا چاہے تو امام شافعیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے تقلید کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے اجتہاد کرنا ضروری ہے اور ایک قول ہے کہ اس کے لئے تقلید جائز ہے۔

اور اس بات کی دلیل کہ اس پر اجتہاد کرنا واجب ہے، یہ ہے کہ اس کا اپنے نفس کے حق میں اجتہاد کرنا نص کے مشابہ ہے تو وہ اجتہاد پر قادر ہوتے ہوئے اجتہاد سے نہیں ہٹے گا، جس طرح نص کے ہوتے ہوئے قیاس پر عمل نہیں کرسکتا۔(۱)

اگر کوئی اجتہاد کا اہل ہو اور وہ اجتہاد کرے، اور اجتہاد کی وجہ سے وہ حکم جان لے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کو چھوڑ دے اور اس سلسلے میں اپنے مخالف کی تقلید کرتے ہوئے اس کے قول پر فتویٰ دے یا عمل کرے، صاحب ''مسلم الثبوت'' کہتے ہیں: ''إجماعاً''، یعنی اس پر ائمۂ حنفیہ کا اجماع ہے، اس لئے کہ جس چیز کا اسے علم ہو گیا ہے تو وہ اس کے حق میں اللہ کا حکم ہے، لہذا کسی کے قول کی بنا پر اس کو ترک نہ کرے گا، لیکن اگر مجتہد قاضی تقلید کر کے فیصلہ کردے تو امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے مطابق اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور دوسری روایت کے مطابق نافذ نہیں ہوگا اور صاحبینؒ کے قول کے مطابق بھی اس کا نفاذ نہیں ہوگا اور فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے اور امام ابوحنیفہؒ سے یہی دوسری روایت ہے۔(۲)

اور جو لوگ اجتہاد میں تجزی کے قائل ہیں ان کے نزدیک مطلق مجتہد پر ان مسائل میں تقلید ضروری ہے جن میں حکم شریعت اس کے سامنے ظاہر نہ ہو، چنانچہ وہ بعض مسائل میں مجتہد ہوگا اور بعض دیگر مسائل میں مقلد ہوگا، لیکن ایک قول یہ ہے کہ عالم شخص اس شرط کے ساتھ تقلید کرے گا کہ اس کے سامنے صحت کی وجہ واضح ہو جائے، اس طور پر کہ دوسرا مجتہد اس کو اس کے سامنے ظاہر کردے۔(۳)

اور کبھی کبھی عالم ثبوت میں بھی تقلید کرے گا، جیسے کہ کوئی شخص تصحیح حدیث میں امام بخاریؒ کی تقلید کرتا ہے، پھر غیر کے نزدیک ثابت شدہ چیز کی بنیاد پر دلالت یا قیاس یا دفع تعارض میں اجتہاد کرے گا۔

---

(۱) البرهان للجويني: ۱۳۴۰/۲، بتحقیق ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب امیر قطر کے نفقہ سے شائع شدہ ۱۳۹۹ھ، روضة الطالبين: ۱۰۰/۱۱۔

(۲) شرح مسلم الثبوت: ۳۹۲/۲، ۳۹۳۔

(۳) شرح مسلم الثبوت: ۴۰۴/۲۔

مفتیان کے متعدد ہونے اوران کے اختلاف کا مقلد پر اثر:

اگر شہر میں صرف ایک مفتی ہوتو مقلد کے لئے اس سے رجوع کرنا اور جو مسئلہ اس کو معلوم نہ ہو اس میں اس کے فتوے پر عمل کرنا واجب ہے۔

اور اگر متعدد مفتی ہوں اور سب اہل ہوں تو مقلد کو اجازت ہے جس سے چاہے مسئلہ معلوم کرے اور سب سے بڑے عالم سے رجوع کرنا اس کے لئے ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ یہ معلوم ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں عوام الناس افضل مفضول دونوں سے پوچھتے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے علاوہ کسی سے پوچھنے سے کسی کو نہیں روکا گیا، لہٰذا صرف علم وعدالت کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

لیکن اگر دو عالموں کے قول میں تعارض ہو اور ایک کا فتویٰ دوسرے کے فتوے سے مختلف ہو تو اس شخص کے فتوے پر عمل کرنا ضروری ہے جس کو وہ خود علم ودیانت میں افضل سمجھتا ہو، چنانچہ علم اور دیانت کی بنیاد پر دونوں مجتہدین کے درمیان ترجیح دینا اس پر واجب ہے، صاحب ''مطالب أولی النهٰی'' کہتے ہیں: کسی قول یا وجہ کی بنیاد پر ترجیح کو صرف نظر کرتے ہوئے حکم یا فتویٰ دینا بالاجماع حرام ہے، اور یہ اس لئے کہ زیادہ علم والے سے خطا کا امکان کم ہوتا ہے اور کم علم والے سے غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور مقلد کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے لئے اختیار رکھے کہ جس کو چاہے لے اور جس کو چاہے چھوڑ دے اور خاص طور سے اس وقت جب کہ وہ رخصتوں کا متلاشی ہو کہ محض خواہش کی بنا پر جو پسند ہو اس کو لے لے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح دلیلوں کے درمیان ترجیح مجتہد پر واجب ہے، اوران میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق نہیں ہے، یہ متفق علیہ ہے اور جن حضرات نے اس کے لئے حقِ اختیار کی اجازت دی ہے، جن کی تعداد قلیل ہے، انہوں نے اس وقت اس کی اجازت دی ہے جب کہ ترجیح ممکن نہ ہو۔(۱)

مذاہب کی تقلید:

شوکانیؒ نے کہا: تقلید کی اجازت دینے والوں کے درمیان اختلاف ہے کہ کیا عام آدمی پر متعین مسلک کا التزام ضروری ہے، ایک جماعت کا قول ہے کہ لازم ہے۔۔۔؟۔۔۔ نے اس کو مختار کہا ہے۔

اور دوسرے فقہا کا قول ہے کہ لازم نہیں ہے، ابن برہانؒ اور نوویؒ نے اس کو راجح کہا ہے، اور یہی حنابلہ کا مسلک ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے عام لوگوں پر بعض مسائل میں بعض صحابہ کی تقلید اور بعض دیگر مسائل میں بعض دیگر صحابہ کی تقلید کرنے میں نکیر نہیں کی ہے، اور مذاہب ومسالک کے ظہور سے پہلے اسلاف جس کی چاہتے تقلید کرتے تھے(۲) اور یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: ''اصولی ضمیمہ''۔

(۱) المستصفی: ۲/۳۹۱، ۳۹۲، روضۃ الناظر: ۲/۴۵۴، ارشاد الفحول رص ۲۷۱، البرہان للجوینی: ۲/۱۳۴۲، ۱۳۴۴، نہایۃ المحتاج: ۱/۴۱، مطالب اولی النہیٰ: ۶/۴۴۲، تبصرۃ الحکام۔

(۲) ارشاد الفحول رص ۲۷۲۔

اور وہ حضرات جو عام آدمی کے لئے کسی متعین مذہب کے التزام کو واجب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک وہ اس کی عزیمتوں اور رخصتوں پر عمل کرے گا، الا یہ کہ اس کے سامنے یہ ظاہر ہو جائے کہ دوسرا اس کے التزام سے بہتر ہے، ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: اگر کسی معاملہ میں اللہ و رسول کا حکم اس کے سامنے ظاہر ہو جائے تو وہ اس سے نہ ہٹے، اور اللہ و رسول کے حکم کے خلاف کسی کی اتباع نہ کرے، اور اس کے لئے مناسب تقلید یعنی کسی مجتہد عالم کے فتوے کی تقلید کے ذریعہ متعین مذہب سے نکلنا جائز ہے۔(۱)

صحیح تقلید پر عمل کرنے کا اثر:

جو تقلید صحیح پر عمل کرے تو اس پر کوئی نکیر نہیں ہے، اس لئے کہ اجتہادی مسائل میں کوئی نکیر نہیں ہے، اور احتساب کا دعویٰ بھی اس میں شامل نہیں ہے، اسی لئے حاکم اس کو اس کے فعل سے منع نہیں کرسکتا۔

اور یہ اس چیز میں بالکل واضح ہے جس کا ضرر صرف مقلد تک محدود ہو، جیسے کوئی شخص اپنی شرم گاہ کو چھولے پھر بغیر وضو کئے نماز پڑھ لے، لیکن اگر اس کے فعل میں ایسا ضرر ہو جو دوسرے کو پہنچے تو ایک قول یہ ہے کہ حاکم یا محتسب اگر اس کو حرام سمجھتا ہے تو اس پر اعتراض کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔(۲)

اور تقلید صحیح پر عمل کرنے والے پر نکیر نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عالم اس کے فعل کو مرجوح سمجھتا ہے وہ اس کی وضاحت نہ کرے، حالانکہ وضاحت کرنا تو اہل علم کا طریقہ رہا ہے اور رہے گا، چہ جائے کہ وہ ان کے درمیان قبول کرنے اور رد کرنے کا مختلف فیہ معاملہ ہو اور کبھی کبھی بعض مجتہدین بعض کو خطا وار ٹھہراتے ہیں، خاص طور پر اس شخص کو جو معارضہ سے محفوظ صحیح نص کی مخالفت کرے اور اکثر اصولیین کے قول کی بنیاد پر یہ بات واضح ہے اور یہ لوگ اجتہادی مسائل میں مجتہد کو خطا وار کہنا جائز قرار دیتے ہیں، البتہ یہ بیان مخالف علما کے عذر کی وضاحت کے ساتھ اور ان کے مرتبہ کا لحاظ اور ان کی شان کا خیال رکھتے ہوئے ہوگا، واللہ اعلم۔

نیز یہ قاعدہ ایسے مقلد کے خلاف جس کا معاملہ حاکم کے سامنے پیش ہو، حاکم کا اپنے اجتہاد کے مطابق مناسب فیصلہ کرنے سے مانع نہیں ہے، اس لئے کہ قاضی کو اختیار نہیں ہے کہ وہ جس کو صحیح سمجھتا ہے اس کے خلاف فیصلہ کرے۔(۳)

مقلد کا فتویٰ دینا:

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک مفتی کے لئے مجتہد ہونا شرط ہے، اور حنفیہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے، بلکہ بہتر ہونے کی شرط

(۱) کشاف القناع: ۲۰۳/۶۔

(۲) نہایۃ المحتاج: ۹۱۲/۱، طبع القاہرۃ

(۳) الأشباہ والنظائر للسیوطی: ص ۱۵۸، طبع مصطفیٰ الحلبی قاہرہ ۱۳۷۸ھ، المغنی لابن قدامۃ: ۲۰۳/۸۔

ہے اور یہ لوگوں کی سہولت وآسانی کے لئے ہے۔(۱)

اور ابن القیم رحمہ اللہ نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ ضرورت کے وقت اور مجتہد عالم کی عدم موجودگی میں مقلد کا فتویٰ دینا جائز ہے(۲) اور حنابلہ میں سے ابن حمدانؒ نے ضرورت کی قید لگائی ہے(۳) اور شوکانیؒ نے بعض اصولیین کی یہ شرط نقل کی ہے کہ مفتی صاحب نظر ہو اور اس کو فتوے کے مأخذ کا علم ہو ورنہ جائز نہیں۔(۴)

اور ابن قدامہؒ کہتے ہیں: مفتی کے لئے جائز ہے کہ سنے ہوئے مسائل بتادے، البتہ اس حالت میں وہ مفتی نہیں ہوگا بلکہ اس کی حیثیت مخبر (بتانے والے) کی ہوگی، چنانچہ وہ اس بات کا محتاج ہوگا کہ وہ کسی متعین مجتہد کی طرف سے خبر دے تو وہ مسئلہ اس کی خبر کی وجہ سے معمول بہ ہوگا، اس کے فتوے کی وجہ سے نہیں۔(۵)

اور شوکانیؒ نے صحیح قرار دیا ہے کہ مقلد جو کچھ اپنے مجتہد سے سن کر مستفتی کے سامنے پیش کرے تو اس کا فتوے سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ محض اس کے قول کو نقل کرنا ہے، وہ کہتے ہیں: میرا اعتقاد یہ ہے کہ مقلد مفتی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم یا حق یا حلال وحرام کے بارے میں پوچھنے والے کو فتویٰ دے، اس لئے کہ مقلد ان باتوں میں سے کچھ نہیں جانتا، ان کو تو صرف مجتہد ہی جان سکتا ہے اور یہ اس وقت ہے جب سائل اس سے کوئی مطلق سوال کرے، لیکن اگر سائل کسی کے قول یا کسی کی رائے کے متعلق سوال کرے تو اگر وہ اس کے مسلک سے واقف ہو تو اس کو اس کی روایت کرنے اور اس کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۶)

اور ابن صلاحؒ نے شافعیہ میں سے حلیمی اور رویانی سے نقل کیا ہے کہ مفتی کے لئے اس چیز میں فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے جس میں وہ خود مقلد ہو، پھر ابن صلاحؒ کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو اس طرح پیش کرے گویا کہ اپنی جانب سے کہہ رہا ہے، بلکہ اس کی نسبت کردے اور اپنے اس امام کی طرف سے نقل کرے جس کا وہ مقلد ہے۔

ابن صلاح رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس قاعدہ کے پیش نظر ہم نے مقلدین میں سے جن کو مفتی شمار کیا وہ درحقیقت مفتی نہیں ہیں، بلکہ ان کے قائم مقام ہیں اور ان کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔(۷)

---

(۱)　مجمع الأنهر: ۲/۱۶۱، المغني: ۹/۲۵۔

(۲)　إعلام الموقعين: ۱/۶۴۔

(۳)　صفة الفتویٰ والمفتي والمستفتي لابن حمدان: ص۴۲، طبع المكتب الإسلامي، دمشق۔

(۴)　إرشاد الفحول: ص۲۹۲۔

(۵)　المغني: ۹/۱۴۔

(۶)　المغني: ۹/۱۴۔

(۷)　فتاویٰ ابن الصلاح مخطوطة بدار الكتب المصرية: رقم (۹۸۸۱۔اصول فقہ) ''ق'' ۱۰۔

کیا مقلد اہل اجماع میں سے ہے:

جمہور اصولیین کے نزدیک مقلد فقیہ نہیں ہے، اسی لئے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اجماع میں اس کی رائے معتبر نہیں ہوگی، خواہ وہ فقہی مسائل سے واقف ہو، اس لئے کہ اہل اجماع کے مابین جامع چیز رائے ہے، اور مقلد کی بذات خود کوئی رائے نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کی رائے دراصل اس کے امام کی رائے ہے، اور یہ اس وقت ہے جب کہ وہ بعض مسائل میں بھی مجتہد نہ ہو، چنانچہ اگر ایسا ہے تو اجتہاد میں تجزی کے جواز کے قاعدہ کے مطابق ان مسائل میں اس کی رائے اجماع میں معتبر ہوگی جن میں وہ مجتہد ہے۔(۱)

مقلد کا فیصلہ:

شافعیہؒ اور حنابلہؒ نے قاضی میں مجتہد ہونے کی شرط لگائی ہے اور یہی ایک قول حنفیہؒ اور مالکیہؒ کا ہے اور ابن حزمؒ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اس لئے کہ ارشاد باری ہے:

"وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ"(۲)

اور آپ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے رہئے اسی (قانون) کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ"(۳)

پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا کرو۔

اور غیر مجتہد صرف تقلید کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف وہ رجوع کرنا نہیں جانتا۔

ابن قدامہؒ کہتے ہیں: قاضی کے لئے جائز نہیں کہ کسی دوسرے کی تقلید کرے اور دوسرے کے قول پر فیصلہ کرے، خواہ اس کے سامنے حق ظاہر ہو اور اس کا غیر اس میں اس کا مخالف ہو یا اس کے لئے حق ظاہر نہ ہو اور چاہے وقت میں گنجائش ہو یا نہ ہو۔

اور تمام حنفیہ اور متأخرین حنابلہ کا یہ قول ہے کہ قاضی کے لئے مقلد ہونا جائز ہے، تاکہ لوگوں کے معاملات واحکام معطل نہ ہوں اور حنفیہ اس کی علت بیان کرتے ہیں کہ قضا کا مقصد جھگڑوں کو ختم کرنا ہے تو اگر تقلید سے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو جائز ہے۔(۴)

---

(۱) شرح مسلم الثبوت: ۲/۲۱۷، ۲۱۸۔

(۲) سورۂ مائدہ/۴۹۔

(۳) سورۂ نساء/۵۹۔

(۴) المغنی: ۹/۱۴، ۲۵، تبصرة الحكام: ۱/۶۴، روضة الطالبين: ۱۱/۹۴، ۹۷، شرح المنهاج بحاشية القليوبي وعميرة: ۴/۲۹۷۔

اور شافعیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر مجتہد قاضی کا ملنا ناممکن ہو تو بوقت ضرورت مقلد کو قاضی بنانا جائز ہے اور ضرورت کا تحقق دو چیزوں سے ہوتا ہے:

اول:

صاحب شوکت بادشاہ اس کو قاضی بنائے، برخلاف نائب سلطان کے، جیسے قاضی اکبر، تو اگر وہ کسی مقلد قاضی کو ذمہ داری دے تو یہ ضرورت نہیں ہے، اور مجتہد کی موجودگی میں غیر مجتہد کو قاضی بنانا بادشاہ کے لئے حرام ہے، پھر اگر اس کی شوکت ختم ہو جائے تو اس کے ختم ہونے کی وجہ سے قاضی بھی معزول ہو جائے گا۔

دوم:

کوئی ایسا مجتہد نہ مل سکے جو قضا کے لائق ہو، لیکن اگر کوئی ایسا مجتہد مل جائے جو قضا کے لائق ہو تو مقلد کو قاضی بنانا جائز نہیں اور اس کو ذمہ دار بنانا نافذ نہیں ہوگا۔

مجبوری میں بنائے ہوئے قاضی پر لازم ہے کہ وہ علما سے مراجعت کرے اور یہ متفق علیہ مسئلہ ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اس پر ضروری ہے کہ اپنے فیصلوں میں اس کی بنیاد کی وضاحت کرے۔

جب اجتہاد تبدیل ہو جائے تو مقلد کیا کرے:

جب کوئی مقلد کسی مجتہد کے فتوے کے مطابق کوئی عمل کرے اور پھر مجتہد کا اجتہاد بدل جائے تو مقلد کے لئے نافذ شدہ تصرف کے سلسلے میں اس کے دوسرے اجتہاد کی پیروی ضروری نہیں ہے، جیسا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ولی کے بغیر نکاح کرلے اور مجتہد کا مقلد ولی کے بغیر نکاح کو صحیح سمجھتا ہے پھر مجتہد کا اجتہاد بدل گیا اور اب وہ اس کو باطل سمجھتا ہے اور اسی طرح اگر کسی حاکم نے اس کے لئے اس کا فیصلہ کردیا، اس لئے کہ ایک اجتہاد اسی طرح کے اجتہاد سے نہیں ٹوٹتا ہے اور مجتہد پر جب کہ اس کا اجتہاد تبدیل ہو جائے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے مقلدین کو اس کی اطلاع دے۔ اور یہ اس وقت ہے جب اجتہاد معتبر ہو، برخلاف اس کے کہ اگر یقینی طور پر اس کی غلطی واضح ہو جائے، اس طرح کہ وہ معارضہ سے محفوظ کسی صحیح نص کے خلاف ہو یا اجماع یا قیاس جلی کے خلاف ہو تو اس کا فیصلہ توڑ دیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اس سلسلے میں نکاح اور دوسرے معاملات میں فرق ہے، نکاح میں فیصلہ توڑ دیا جائے گا، دوسرے معاملات میں نہیں توڑا جائے گا۔ البتہ فتویٰ کی بنا پر مقلد کے تصرف کرنے سے پہلے اگر اجتہاد تبدیل ہو جائے تو اجتہاد تبدیل ہو جانے کے بعد اس کو اس تصرف پر اقدام کا اختیار نہیں ہے، اگر یہی فتویٰ اس کی تنہا بنیاد ہو۔ (۱) ☆

---

(۱) مطالب أولی النهیٰ: ۶/ ۶۳۵، إعلام الموقعین: ۴/ ۲۲۲، روضة الطالبین: ۱۱/ ۱۰۷، جمع الجوامع: ۲/ ۱۶۳، ۱۹۳۔

☆ دیکھئے: الموسوعة الفقهية، لفظ تقلید۔

تقلید اور علمائے دیو بند:

(۱) کسی متعین فقہی مذہب و مسلک کی تقلید کے بارے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ فرماتے ہیں کہ کسی متعین مذہب کی تقلید فی نفسہ حکم شرعی نہیں ہے بلکہ امور دین کی تنظیم کے لئے ایسا فتویٰ دیا گیا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''سو ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ فرض یا واجب نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک میں بے انتظامی ہوتی ہے''۔ (۲)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقلید شخصی یعنی کسی متعین فقہی مذہب کی تقلید اور غیر متعین شخص کی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسی واسطے تقلید غیر شخصی کو فقہا نے کتابوں میں منع لکھا ہے (یعنی ایک مسئلہ میں کسی فقہی مسلک کی تقلید اور دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے مسلک کی تقلید) مگر جو عالم غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو، اور نہ اس کے سبب سے عوام میں ہیجان ہو، اس کو تقلید غیر شخصی اب بھی جائز ہوگی۔ (۳)

اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں:

''الغرض بعد ثبوت اس امر کے کہ یہ مسئلہ اپنے امام کے خلاف کتاب وسنت کے ہے، ترک کرنا ہر مومن کو لازم ہے اور کوئی بعد وضوح اس امر کے اس کا منکر نہیں، مگر عوام کو یہ تحقیق ہی کیونکر ہوسکتا ہے''۔ (۴)

اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جس طرح تقلید کا انکار قابل ملامت ہے، اسی طرح اس میں غلو وجمود بھی موجب مذمت ہے۔ اور تعیین طریق حق کے لئے اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ تقلید مجتہد کی اس کو شارع وبانی احکام سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ اس کو مبین احکام اور موضح شرائع ومظہر مراد اللہ ورسول اعتقاد کر کے کی جاتی ہے۔ پس جب تک کوئی امر منافی اور رافع اس اعتقاد کا نہ پایا جاویگا اس وقت تک تقلید کی جاوے گی اور جس مسئلے میں کسی عالم وسیع النظر، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے، یا کسی عامی کو ایسے عالم سے، بشرطیکہ متقی بھی ہو، بشہادت قلب معلوم ہو جاوے کہ اس مسئلے میں راجح دوسرے جانب ہے، تو دیکھنا چاہئے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو، تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ وتشویش عوام کا ہو، مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لئے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے۔ دلیل اس کی یہ حدیثیں ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھ سے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ'' تم کو معلوم نہیں کہ

(۱) ماخوذ از تاریخ دار العلوم دیو بند۔

(۲) أصول الإفتاء و آدابه: ۱۷۔

(۳) أصول الإفتاء و آدابه: ۲۷، بحوالہ تذکرۃ الرشید: ۱/۱۳۲۔

(۴) أصول الإفتاء و آدابه: ۲۷، ۳، بحوالہ سبیل الرشاد للامام رشید احمد گنگوہی: ۳۰، ۳۱۔

تمہاری قوم یعنی قریش نے جب کعبہ بنایا ہے، تو بنیاد ابراہیمی سے کمی کردی ہے۔'' میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! پھر آپ اسی بنیاد پر تعمیر کرادیجئے'' فرمایا کہ ''اگر قریش کا زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا''۔ روایت کیا اس کو بخاری ومسلم نے ترمذی اور نسائی اور مالک نے۔ف: یعنی لوگوں میں خواہ مخواہ تشویش پھیل جاوے گی کہ دیکھو! کعبہ گرادیا، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کرتا۔ دیکھئے! باوجودیکہ جانب راجح یہی تھی کہ قواعد ابراہیمی پر تعمیر کردیا جاتا، مگر چونکہ دوسری جانب بھی یعنی ناتمام رہنے دینا بھی، شرعاً جائز تھی، گو مرجوح تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخوف فتنہ وتشویش اسی جانب مرجوح کو اختیار فرمایا۔......(نیز) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (سفر میں) فرض چار رکعت پڑھی، کسی نے پوچھا کہ ''تم نے حضرت عثمانؓ پر (قصر نہ کرنے میں) اعتراض کیا تھا، پھر خود چار پڑھی؟'' آپ نے جواب دیا کہ خلاف کرنا موجب شر ہے۔۔۔اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ باوجودیکہ ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک جانب راجح سفر میں قصر کرنا ہے، مگر صرف شر اور خلاف سے بچنے کے لئے اتمام فرمالیا جو جانب مرجوح تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ بہرحال! ان حدیثوں سے اس کی تائید ہوگئی کہ اگر جانب مرجوح بھی جائز ہو تو اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

اور اگر اس جانب مرجوح میں گنجائش عمل نہیں، بلکہ ترک واجب یا ارتکاب امر ناجائز لازم آتا ہے، اور بجز قیاس کے اس پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی، اور جانب راجح میں حدیث صحیح صریح موجود ہے، اس وقت بلاتردد حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ اور اس مسئلے میں کسی طرح تقلید جائز نہ ہوگی، کیونکہ اصل دین قرآن وحدیث ہے، اور تقلید سے یہی مقصود ہے کہ قرآن و حدیث پر سہولت وسلامتی سے عمل ہو، جب دونوں میں موافقت نہ رہی، قرآن وحدیث پر عمل نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں بھی اسی پر جمے رہنا یہی تقلید ہے جس کی مذمت قرآن وحدیث واقوال علما میں آئی ہے، چنانچہ حدیث ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور آپ کو یہ آیت پڑھتے سنا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ (اہل کتاب نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنا رکھا تھا خدا کو چھوڑ کر) اور ارشاد فرمایا کہ ''وہ لوگ ان کی عبادت نہ کرتے تھے، لیکن وہ جس چیز کو حلال کہہ دیتے، وہ حلال سمجھنے لگتے، اور جس چیز کو حرام کہہ دیتے، اس کو حرام سمجھنے لگتے'' روایت کیا اس کو ترمذی نے۔

مطلب یہی ہے کہ ان کے اقوال کو جو یقیناً ان کے نزدیک بھی کتاب اللہ کے خلاف ہوتے، مگر انکو کتاب اللہ پر ترجیح دیتے۔ سو اس کو آیت اور حدیث میں مذموم فرمایا گیا، اور تمام اکابر محققین کا یہی معمول رہا کہ جب ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ قول ہمارا یا کسی کا خلاف حکم خدا اور رسولؐ کے ہے فوراً ترک کردیا۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

نمیلہ انصاری سے روایت ہے کہ کسی نے ابن عمرؓ سے کچھوے کے کھانے کو پوچھا، انہوں نے یہ آیت ''قُلْ لَّآ اَجِدُ الخ'' پڑھ دی (جس سے استنباط کرنا حکم حلت کا تھا) ایک معمر آدمی انکے پاس بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ میں نے ابوہریرہؓ سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کچھوے کا ذکر آیا، تو آپ نے یہ فرمایا کہ ''منجملہ خبائث کے وہ بھی خبیث

ہے‘‘۔ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ’’اگر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے تو حکم یوں ہی ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا‘‘۔ روایت کیا اس کو ابو داؤد نے ۔ اور علماء حنفیہ بھی ہمیشہ اس عمل کے پابندر ہے ۔ چنانچہ............ان حضرات کا امام صاحب کے بعض اقوال کو ترک کر دینا مذکور ہو چکا ہے، جن سے منصف آدمی کے نزدیک ان حضرات پر تعصب وتقلید جامد کی اس تہمت کا غلط ہونا متیقن ہوجائے گا جس کا منشا اکثر پر بلا درایت نظر کرنا ہے اور......ایسی نظر کا غیر معتمد علیہ ہونا ثابت کر دیا گیا ہے ۔لیکن اس مسئلے میں ترک تقلید کے ساتھ بھی کسی مجتہد کی شان میں گستاخی وبدزبانی کرنا یا دل سے بدگمانی کرنا کہ انہوں نے اس حدیث کی مخالفت کی ہے، جائز نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ ان کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو، یا سند ضعیف پہنچی ہو، یا اس کو کسی قرینۂ شرعیہ سے مأول سمجھا ہو اس لئے وہ معذور ہیں اور حدیث نہ پہنچنے سے ان کے کمال علمی میں طعن کرنا بھی بدزبانی میں داخل ہے، کیونکہ بعض حدیثیں اکابر صحابہ کو جن کا کمال علمی مسلم ہے، کسی وقت تک نہ پہنچی تھیں، مگر ان کے کمال علمی میں اس کو موجب نقص نہیں کہا گیا، چنانچہ حدیث میں......عبیدؓ بن عمیر سے حضرت ابو موسیٰؓ کے ذریعہ حضرت عمرؓ کے پاس آنے کی اجازت مانگنے کے قصے میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مجھ سے مخفی رہ گیا، مجھے بازاروں میں جا کر سودا سلف کرنے نے مشغول کر دیا‘‘۔ روایت کیا اس کو بخاری نے......اسی طرح مجتہد کے اس مقلد کو جس کو اب تک اس شخص مذکور کی طرح اس مسئلے میں شرح صدر نہیں ہوا، اور اس کا اب تک یہی حسن ظن ہے کہ مجتہد کا قول خلاف حدیث نہیں ہے، اور اس گمان سے اب تک اس مسئلے میں تقلید کر رہا ہے اور حدیث کو رد نہیں کرتا، لیکن وجہ موافقت کو مفصل سمجھتا بھی نہیں تو ایسے مقلد کو بھی بوجہ اس کے کہ وہ بھی دلیل شرعی سے متمسک ہے اور اتباع شرع ہی کا قصد کر رہا ہے، برا کہنا جائز نہیں۔

اسی طرح اس مقلد کو اجازت نہیں کہ ایسے شخص کو برا کہے کہ جس نے بعذر مذکور اس مسئلے میں تقلید ترک کر دی ہے کیونکہ ان کا یہ اختلاف ایسا ہے جو سلف سے چلا آیا ہے، جس کے باب میں علما نے فرمایا ہے کہ اپنا مذہب ظناً صواب محتمل خطا اور دوسرا مذہب ظناً خطا محتمل صواب ہے، جس سے یہ شبہ بھی دفع ہوجاتا ہے کہ جب سب حق ہیں، تو ایک ہی پر عمل کیوں کیا جاوے، پس جب دوسرے میں بھی احتمال صواب ہے، تو اس میں کسی کی تضلیل یا تفسیق یا بدعتی یا وہابی کا لقب دینا اور حسد وبغض وعناد ونزاع وغیبت وسب وشتم، وطعن ولعن کا شیوہ اختیار کرنا جو قطعاً حرام ہیں، کس طرح جائز ہوگا؟

البتہ جو شخص عقائد یا اجماعیات میں مخالفت کرے، یا سلف صالحین کو برا کہے، وہ اہل سنت والجماعت سے خارج ہے، کیونکہ اہل سنت و جماعت وہ ہیں جو عقائد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہوں، اور یہ امور ان کے عقائد کے خلاف ہیں لہذا ایسا شخص اہل سنت سے خارج اور اہل بدعت وہویٰ میں داخل ہے۔اسی طرح جو شخص تقلید میں غلو کرے کہ قرآن وحدیث کو رد کرنے لگے، ان دونوں قسم کے شخصوں سے حتی الامکان اجتناب واحتراز لازم سمجھیں، اور مجادلۂ متعارفہ سے بھی اعراض کریں۔(۱)

(۱) أصول الإفتاء وآدابه بحواله الاقتصاد فی التقلید والاجتهاد: ۸۴،۸۹۔

قرآن وسنت اور فقہ سے متعلق علماء دیو بند کا مسلک:

علماء دیو بند کے مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق کے غالباً سب سے بڑے نقیب وترجمان حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دار العلوم کے مسلک پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

علمی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت اور اجماع وقیاس پر قائم ہے، اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس کے یہاں کتاب وسنت کی مراد محض قوتِ مطالعہ سے نہیں؛ بلکہ اقوالِ سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہیں، اسی کے ساتھ عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب وسنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے، وہ روایات کے مجموعے سے شارع علیہ السلام کی غرض وغایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں، اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کردینا نہیں چاہتا، جب تک کہ وہ قابل احتجاج ہو، اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوص شرعیہ میں کہیں بھی تعارض اور اختلاف محسوس نہیں ہوتا، بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر رنگ کے علمی وعملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک، جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ (۱)

(۱)　تاریخ دار العلوم دیو بند از سید محبوب رضوی: ۴۲۴، ۴۲۵۔

تدوین فقہ اور امام ابو حنیفہؒ

(۱) ہمیں اس سے انکار نہیں کہ موجودہ دور علم وفن، تحقیق وتدقیق اور اکتشافات جدیدہ کے میدان میں بہت آگے نکل چکا ہے مگر ساتھ ہی اس کے اظہار میں بھی ذرہ برابر تذبذب نہیں ہے کہ دنیا اس ''نظام حیات'' سے بہت دور جا پڑی ہے جو انسانوں کو انسانیت بخشتا ہے اور انسانی مجد وشرف سے ہم آغوش کرتا ہے۔

یہ درست ہے کہ انسانی دماغ نے فضا کو محکوم بنالیا اور زمین کا سینہ چیر کر اس کے خزانے نکال لایا، یہ بھی واقعہ ہے کہ نئی ایجادات نے دنیا کی آنکھیں خیرہ کرڈالیں اور انسانی جدوجہد اپنے شباب پر پہنچ چکی، لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے اس دور میں نہ اخلاق واعمال کی پاکیزگی باقی رہی اور نہ عقائد ومعاملات کی پختگی، نہ دلوں میں اخلاص وللّٰہیت کی روشنی رہی، نہ سینوں میں امانت ودیانت کی جلوہ گری، مختصر یہ کہ انسان سب کچھ ہے مگر جوہر آدمیت سے محروم ہے۔

دین اسلام اور اس کے اغراض ومقاصد:

ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور مکمل ترین دین ہے جس کی تکمیل کا اعلان قرآن مقدس میں موجود ہے، یہ روئے زمین پر آیا ہی اس لیے ہے کہ پوری کائنات کو خدائی نظام پر چلائے اور ان گوشوں کو اجاگر کرے جو انسانوں کو فضل وکمال، شرف ومکرمت، یکجہتی ویگانگت اور اخوت ومحبت کی لازوال دولت سے مالا مال کردے، انسانیت اور اس کے تقاضوں سے محروم نہ ہونے پائے، جو اس کا نمایاں طرۂ امتیاز ہے۔

رب العالمین نے اس عظیم الشان ''نظام حیات'' کی بقا کے لیے قرآن مقدس جیسی کتاب نازل کی اور قیامت تک کے لیے اس کی حفاظت کا اعلان کیا، پھر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ رسول اور معصوم معلم کائنات بنا کر مبعوث فرمایا اور ختم نبوت کے تاج سے سرفراز کیا تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ آپ کی تعلیم وتبیین، تزکیہ وتطہیر اور آپ کے پیش کردہ نشان راہ پر ایمان لایا جائے اور اسے اپنی زندگی کا محور ومرکز بنالیا جائے اور اس طرح انسان اس منزل مقصود کو پالے جو اسکی تخلیق کا منشا ہے۔

(۱) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مقدمہ از مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ جلد اول: ص ۶۱ تا ۷۵۔

اسلامی نظام حیات پر عمل عہد صحابہؓ میں:

عہد صحابہؓ تک یہ نظام، فکر ونظر سے آگے بڑھ کر عمل بلکہ ہر حرکت وسکون میں جاری وساری تھا، آفتاب نبوت گو روپوش ہو چکا تھا مگر اس کی گرمی سے سینے اسی طرح معمور تھے، جمال نبوی سے بظاہر آنکھیں محروم تھیں لیکن دیدار نبوی نے جونشہ پیدا کردیا تھا اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ کیف ومستی کا وہی عالم تھا جدھر دیکھئے اور جہاں دیکھئے وہی حوروں کی سی پاکیزہ دلی اور فرشتہ کا سا تقدس، جانوں کی قربانی دی جاسکتی تھی، لیکن شعبہ جات ایمان کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی پژمردگی ایک لمحہ کے لیے بھی انہیں برداشت نہیں تھی۔

صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال کے چلتے پھرتے مجسمے تھے ان کی کوئی ادا اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ تھی اور سچ پوچھئے تو کتاب وسنت کی یہ ایسی دل فروز شمعیں تھیں جن سے پوری آبادی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

ضرورت تدوین فقہ:

مگر جس طرح انسان ترقی کرتا گیا اس کی ضرورتیں بڑھتی اور پھیلتی گئیں پھر اسلامی حکومتوں کی وسعت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے گئے، ادھر مزاجوں میں بڑی تیزی سے انقلاب آرہا تھا، سوز وگداز اور سادہ دلی اور سادہ زندگی جو صحابۂ کرامؓ کا شیوۂ خاص تھا، ختم ہوتا جارہا تھا، ایران وروم اور دوسرے عجمی ممالک کی سہل پسندی، طبیعتوں میں مرکوز ہوتی جارہی تھی، اس لیے حالت کا تقاضہ ہوا کہ کتاب وسنت کی تعلیمات ایک نئے انداز سے مرتب ہوں۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال تلاش کئے جائیں اور دین کا سارا ذخیرہ سامنے رکھ کر ''نظام حیات'' کی ترتیب ایسے جاذب نظر اور دلکش انداز میں ہو کہ جسے عالم وجاہل، ذہین وغبی، عربی وعجمی اور شہری وبدوی ہر ایک بہ آسانی سمجھ لے اور جو مسائل صراحتاً کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ میں موجود نہیں ہیں علما کے باہمی غور وفکر اور بحث وتمحیص سے مستنبط ہوں تا کہ آنے والی نسلیں پریشانیوں سے دوچار نہ ہونے پائیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں تیز گامی سے چل سکے اور ساتھ ہی ان کی عجلت پسند اور سہل طلب طبیعتیں تلاش وتجسس کی مشقت سے محفوظ ہوجائیں۔

تدوین فقہ اور امام ابوحنیفہؒ:

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام ایک ہمہ گیر، وسیع اور دائمی ''نظام حیات'' ہے اور اس نے اپنی اس امتیازی شان ہمہ گیری اور دوامی حیثیت کی بقا کی خاطر اپنے اندر ایسی لچک اور گنجائش رکھی ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ انسانی ضروریات کا ساتھ دے سکے اور کسی منزل پر اپنے پیرو کی رہبری سے قاصر نہ رہے۔

چنانچہ علماء ربانیین نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس کے لیے سب سے پہلے سراج الامت حضرت امام

ابوحنیفہؒ (متوفی: ۱۵۰ھ) آمادہ ہوئے اور آپ نے اپنے عہد کے علماء کرام کی ایک ایسی معقول تعداد جمع کی جس میں ہر علم وفن کے ماہرین شریک تھے اور جو اپنے علم وفن میں بصیرت ومہارت کے ساتھ ساتھ زہد واتقاء، خداترسی اور فرض شناسی اور دوسرے اوصاف سے متصف تھے۔

خود امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) جنہیں اس مجلس علما کے صدر کی حیثیت حاصل تھی ان سارے کمالات وفضائل کے جامع تھے جن کی ایسے اہم دینی کام میں ضرورت ہوتی ہے اس زمانہ کا کوئی ایسا دینی مکتب فکر نہیں تھا جس سے آپ نے بیدار مغزی کے ساتھ استفادہ نہ کیا ہو، ہزاروں محدثین وشیوخ کے فیض یافتہ تھے، کم وبیش چار ہزار تابعین علما ومشائخ سے آپ نے علم حاصل کیا تھا۔

شرف تابعیت:

پھر خود آپ کو بھی تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا، بعض روایات کے مطابق جس زمانہ میں آپ کوفہ میں پیدا ہوئے بہت سے صحابۂ کرامؓ وہاں موجود تھے اور اس میں تو کسی کو بھی شبہ نہیں ہے کہ بعض صحابہؓ کو آپ نے دیکھا تھا اور بہت سے صحابۂ کرامؓ مختلف شہروں میں اس وقت بقید حیات تھے۔

"أما روايته عن أنسؓ وإدراكه لجماعة من الصحابةؓ بالسن فصحيحان لاشک فيهما". (۱)

ان کا یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنا اور صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کا زمانہ پانا دونوں باتیں صحیح اور شک وشبہ سے پاک ہیں۔

امتیازی شان:

یہ ایک ایسا شرف تھا جس میں کوئی ہم عصر آپ کا سہیم وشریک نہ تھا۔

"وفی فتاویٰ شيخ الإسلام ابن حجرؒ أنه أدرک جماعة من الصحابة كانوا بالكوفة بعد مولده بها سنة ثمانين فهو من طبقة التابعين ولم يثبت ذٰلک لأحد من أئمة الأمصار المعاصرين كالأوزاعی بالشام والحماد بالبصرة والثوری بالكوفة ومالک بالمدينة الشريفة والليث بن سعد بمصر. (۲)

شیخ الاسلام ابن حجرؒ کے فتاویٰ میں صراحت ہے کہ انہوں (یعنی امام ابوحنیفہؒ) نے ان صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کو پایا تھا جو ۸۰ھ میں آپ کی پیدائش کے بعد کوفہ میں زندہ سلامت تھی اور اسی وجہ سے آپ کا شمار تابعین میں ہے، یہ شرف ایسا ہے جو آپ کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہیں، جیسے شام میں اوزاعیؒ، بصرہ میں حمادؒ، کوفہ میں امام ثوریؒ، مدینہ میں امام مالکؒ اور مصر میں لیث بن سعدؒ (ان میں سے کسی کو تابعی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے)

(۱) الخيرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنيفةالنعمان: ص ۲۵۔

(۲) الخيرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنيفةالنعمان: ص ۲۳۔

امام اعظمؒ کی حیثیت:

ائمۂ اربعہ جن کے مذاہب اس وقت دنیا میں رائج ہیں ان میں امام ابوحنیفہؒ اپنے علم و فضل اور سن وسال میں سب سے مقدم تھے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ بقیہ تمام ائمہ آپ کے فیض یافتہ تھے۔(۱)

"ألا من اشتهرت مذاهبهم،هم أربعة ،أبو حنيفة الكوفي،ومالك وأحمد والشافعي،وأوّلهم الأول ويعاصره الثاني،وقيل: روى الأول من الثاني،وقيل:بل الثاني تلميذ للأول،والثالث تلميذ للرابع والرابع تلميذ للثاني ولبعض تلامذة الأول.(۲)

جن کے مذاہب نے شہرت حاصل کی وہ چار امام ہیں، امام ابوحنیفہ کوفیؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ ہیں، ان چاروں میں سے پہلے (یعنی امام ابوحنیفہؒ) مقدم ہیں اور دوسرے آپ کے ہم عصر ہیں یعنی امام مالکؒ اور بعضوں نے کہا کہ پہلے (امام ابوحنیفہؒ) نے دوسرے (امام مالکؒ) سے روایت کی اور بعضوں کا بیان ہے کہ دوسرے (امام مالکؒ) پہلے (امام ابوحنیفہؒ) کے شاگرد ہیں اور تیسرے (امام احمدؒ) چوتھے (امام شافعیؒ) کے شاگرد ہیں اور چوتھے (امام شافعیؒ) دوسرے (امام مالکؒ) اور پہلے (امام ابوحنیفہؒ) کے بعض تلامذہ کے شاگرد ہیں۔

اس کا ماحصل یہ ہوا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ ان چاروں میں مقدم ہیں اور ان چاروں میں سے آپ کے ہم عصر صرف امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) ہیں جو آپ سے پندرہ سال چھوٹے تھے، پھر بعض علماء تاریخ کے بیان کے مطابق امام مالکؒ آپ کے شاگردوں میں ہیں اور یہ بات عقل میں آتی بھی ہے، اس لئے کہ یہ عمر میں آپ سے کم تھے اور اس میں تو قطعاً شبہ ہی نہیں کہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے اور امام محمدؒ (م ۱۸۹ھ) وغیرہ کے شاگرد ہیں، اور دنیا جانتی ہے کہ امام محمدؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید تھے، اور بعض علما کے قول کے مطابق امام مالکؒ بھی، رہ گئے امام احمدؒ یہ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں، اس طرح یہ سلسلہ بھی امام اعظمؒ سے جا کر ملا، اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ، امام اعظمؒ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، ان میں سے پہلے ستر سال اور دوسرے چوراسی سال۔

امام اعظم رحمہ اللہ کو ایک طرف تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے جو ان بقیہ تینوں ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں، دوسری طرف آپ عمر میں ان میں سب سے بڑے ہیں۔

ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) آپ کے انہی فضائل ومناقب کے پیش نظر تحریر فرماتے ہیں:

"الحاصل أن التابعين أفضل الأمة بعد الصحابة........فنعتقد أن الإمام الأعظم والهمام الأقدم

---

(۱) امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے امام مالکؒ ۹۳ھ میں، امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں اور امام احمدؒ ۱۶۴ھ میں اس کا ماحصل یہ ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ کے پندرہ سال بعد امام مالکؒ پیدا ہوئے اور ستر سال بعد امام شافعیؒ اور چوراسی سال بعد امام احمدؒ۔(إكمال في أسماء الرجال)

(۲) مقدمة الفوائد البهية: ص ۷۔

أبو حنيفةؒ أفضل الأئمة المجتهدين و أكمل الفقهاء فى علوم الدين ثم الإمام مالكؒ فإنه من أتباع التابعين،ثم الإمام الشافعیؒ لكونه تلميذ الإمام مالكؒ بل تلميذ الإمام محمدؒ ثم الإمام أحمد بن حنبلؒ فإنه كالتلميذ للشافعیؒ". (۱)

حاصل یہ ہے کہ تابعینؒ کا درجہ صحابۂ کرامؓ کے بعد امت میں سب سے بڑھا ہوا ہے، اسی وجہ سے ہمارا اعتقاد ہے کہ امام اعظم، ہمام اقدم۔ ابوحنیفہؒ کا مرتبہ ائمۂ مجتہدین میں سب سے اونچا ہے، اور فقہاءِ علوم دینیہ میں آپ سب سے بلند و اکمل ہیں۔ آپ کے بعد امام مالکؒ کا درجہ ہے جو تبع تابعین کی صف میں ہیں، پھر امام شافعیؒ کا۔ اس لئے کہ آپ امام مالکؒ بلکہ امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، پھر امام احمدؒ کا جو امام شافعیؒ کے شاگرد کے درجے میں ہیں۔

ماہرین علم وفن کی جماعت:

اس مختصر تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ صدر مجلس اپنے محاسن ومناقب میں، بہت اونچا مقام رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے کتاب وسنت اور لغت ومحاورات کے ان ماہرین علماء ربانیین کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کی دفعات مرتب کیں اور اصول وفروع کا نقشہ تیار کیا اور اس طرح کہ اس علمی ودینی پارلیمنٹ میں سبھوں نے وسعت نظری کے ساتھ ایک ایک مسئلہ پر غور کیا اور بحث ومباحثہ اور تحقیق وجستجو کی ضرورت پیش آئی تو اس سے بھی گریز نہیں کیا۔

تدوین فقہ میں احتیاط:

کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ کا پورہ ذخیرہ سامنے رکھا تا کہ کوئی گوشہ نظروں سے اوجھل نہ رہنے پائے، اور ہر طرح چھان پھٹک کر جچے تلے جملوں میں اسے قلمبند کیا اور اس دیدہ ریزی، غور وفکر، اخلاص وللّٰہیت اور فضل وکمال کے ساتھ فقہ کا وجود عمل میں آیا، جو ہر جہت سے مہذب ومرتب اور زندگی کے تمام شعبہ جات پر حاوی ہے۔

طریقۂ تدوین:

جن علماء قائمین بالحق کی مجلس میں استنباط واستخراج مسائل کا مہتم بالشان کام انجام پایا، ان کی تعداد سیکڑوں سے بڑھ کر ہزار تک تھی، ان میں چالیس علما خصوصی صلاحیتوں کے مالک تھے اور مختلف علم وفن کے ماہرین شمار ہوتے تھے۔ (۲)

"روى الإمام أبو جعفر الشيرماذیؒ عن شقيق البلخیؒ، أنه يقول: كان الإمام أبو حنيفةؒ من أورع الناس

---

(۱) شرح فقه أكبر: ۱۴۶۔

(۲) ونقل عن مسند الخوارزمیؒ أن الإمام اجتمع معه ألف من أصحابه أجلهم و أفضلهم أربعون قد بلغوا حد الاجتهاد فقربهم وأدناهم. (ردالمحتار: ج ۱ ص ۶۲)

ان چالیس علما کے حالات کے لئے (جو خصوصی طور پر مجلس تدوین فقہ میں شریک تھے، دیکھئے مقدمہ انوار الباری مؤلفہ مولانا احمد رضا صاحب۔ ظفیر۔

وأعبد الناس وأكرم الناس وأكثرهم احتياطاً في الدين وأبعدهم عن القول بالرأی فی دين الله عز وجل، كان لايضع مسئلةً في العلم حتى يجمع أصحابه عليها ويعقد عليها مجلساً فإذا اتفق أصحابه كلهم علىٰ موافقتها للشريعة قال لأبي يوسفؒ أوغيره: ضعها في الباب الفلانی آه". (۱)

امام ابوجعفر الشیر ماذیؒ شقیق بلخیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ لوگوں میں سب سے بڑھ کر پرہیز گار "عبادت گذار" کریم النفس اور دین کے باب میں محتاط تھے آپ اللہ تعالیٰ کے دین میں ذاتی رائے کے اظہار سے کوسوں دور تھے کسی علمی مسئلہ کی اس وقت تک تفریع نہیں کرتے جب تک تمام احباب کو جمع کر کے اس پر بحث نہ کر لیتے جب سارے علما شریعت کے اس مسئلہ میں متفق ہو جاتے تو کہیں جا کر امام ابو یوسفؒ سے یا ان کے سوا کسی اور سے فرماتے تھے کہ اسے فلاں باب میں داخل کرلو۔

ایک ایک مسئلہ پر بحث:

امام شعرانیؒ (م۹۷۳ھ) نے بھی امام صاحبؒ کے اس طرز استنباط کا تذکرہ کیا ہے اور تقریباً کم وبیش انہی الفاظ کے ساتھ، چنانچہ علامہ شامیؒ نے بھی لکھا ہے:

"وكذا في الميزان للإمام الشعراني قدس سره". (۲)

امام شعرانیؒ کی کتاب المیز ان میں ایسا ہی ہے۔

پھر علامہ ابن عابدین شامیؒ (م۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

"فكان إذا وقعت واقعة شاورهم وناظرهم وحاورهم وسألهم فيسمع ماعندهم من الأخبار والآثار ويقول ماعنده ويناظرهم شهراً أوأكثر حتى يستقر آخر الأقوال فيثبته أبويوسفؒ حتى أثبت الأصول علىٰ هذا المنهاج الشورائي لأنه تفرد بذلك". (۳)

جب کوئی واقعہ (مسئلہ) آپڑتا تو امام ابوحنیفہؒ اپنے تمام اصحاب علم وفن سے مشورہ، بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال کرتے، پہلے ان سے فرماتے کہ جو کچھ ان کے پاس حدیث اور اقوال صحابہؓ کا ذخیرہ ہے وہ پیش کریں، پھر خود اپنا حدیثی ذخیرہ سامنے رکھتے اور اس کے بعد ایک ماہ یا اس سے زیادہ اس مسئلہ پر بحث کرتے تا آنکہ آخری بات طے پاتی اور امام ابو یوسفؒ اسے قلم بند کرتے، اس طرح شورائی طریقہ پر سارے اصول منضبط ہوئے ایسا نہیں ہوا کہ تنہا کبھی کوئی بات کہی ہو۔

کتاب وسنت کی حیثیت:

"اخبار وآثار" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ پہلے ان علما کے پاس کتاب وسنت کا جو ذخیرہ ہوتا تھا وہ سنایا جاتا تھا پھر

(۱،۲،۳) ردالمحتار: ص۶۲ ج۱۔

صدر مجلس کے علم میں کتاب وسنت کا جو خزانہ محفوظ ہوتا وہ پیش ہوتا، اوران تمام مرحلوں کے بعدان کی روشنی میں ہر شخص پیش آمدہ مسئلہ پر بحث کرتا اوراپنی رائے دیتا، دوسرے اس پر مختلف پہلو سے اعتراض اوراشکالات پیدا کرتے، پھر اشکالات کا ہرایک اپنے فہم کے مطابق مگر کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیتا، خودامام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی اس بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے اورجیسا کہ آپ نے ابھی پڑھا ایک ایک مسئلہ پر مہینوں بحث جاری رہتی، جب ہر پہلو سے اطمینان حاصل کرلیا جاتا، تواسے جچے تلے الفاظ میں درج رجسٹر کیا جاتا۔

خودسوچئے! اگر تنہا کسی ایک کی بات ہوتی تو غلطی کا احتمال تھا، مگر جہاں چالیس جید ماہرفن علما ہوں اور پوری سنجیدگی اوردیانت داری سے ہفتوں اورمہینوں تک ایک ایک اصل پر کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اوراقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں بحث وتمحیص ہو، غلطی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

انسانی غلطی کا تدارک:

لیکن بہرحال تھے یہ سارے علماء ربانیین انسان ہی، اس لئے ممکن تھا کہ کہیں کسی مسئلہ میں لغزش رہ گئی ہو یا آیات واحادیث سے استنباط واستخراج میں نظر چوک گئی ہو، اس لئے صدر مجلس نے ضروری سمجھا کہ بایں ہمہ حزم واحتیاط اور کدوکاوش، انسانی بھول چوک اورمحدودنظری سے صرف نظر کسی طرح بھی مناسب نہیں، چنانچہ اعلان کردیا کہ اگرکسی مستنبط مسئلہ کا کتاب وسنت کے خلاف ہونا ثابت ہوجائے تو ہرمسلمان کو اختیار بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ اسے ترک کردے اورصراحتاً حدیث سے جومسئلہ جس طرح ثابت ہوتا ہے اسی پر عمل کرے۔

”فقد صح عن أبی حنیفةؒ أنه قال: ”إذا صح الحدیث فهو مذهبی“ وقد حکی ذلک الإمام عبدالبرؒ عن أبی حنیفةؒ وغیره من الأئمة ونقله أیضاً الإمام الشعرانیؒ“. (۱)

یہ روایت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بالکل درست ہے کہ آپ نے فرمایا: جب حدیث صحت کو پہنچ جائے تو پھر میرا مذہب وہی حدیث ہے اسے امام عبدالبراوردوسرے ائمۂ دین نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے باب میں بیان کیا ہے اورامام شعرانیؒ رحمہ اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔(۲)

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ص ۱۷۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی صحیح ومعتبر حدیث جوموانع سے خالی اورقابل استدلال ہو یعنی منسوخ نہ ہو نہ ہی کسی علت سے معلول ہو اسی طرح اس میں کسی قسم کی تخصیص بھی نہ ہو تو اس حدیث پر عمل کیا جائے گا اوروہ امام متبوع کا مذہب قرار دیا جائے گا۔ اور یہ حق اسی شخص کو حاصل ہوگا جونصوص میں غورکرنے اوراس میں ناسخ کو منسوخ سے ممتاز کرنے کا اہل ہو۔ جیسا کہ علامہ ابن عابدین نے تحریر کیا ہے: ”ولا یخفی أن ذلک لمن کان أهلاً للنظر فی النصوص ومعرفة محکمها بمنسوخها“. (ردالمحتار: جلد ۱ صفحہ ۶۸)

اسی طرح امام شافعیؒ نے بھی یہ کہا ہے: ”إذا صح الحدیث فهو مذهبی“ اس کی تشریح میں علامہ نوویؒ نے المجموع شرح المهذب میں جو کچھ کہا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

==

امام اعظمؒ کا اعلان:

صاحب ہدایہ (م ۵۹۳ھ) سے مختلف حضرات نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے جو ''روضۃ العلماء زندوسیہ'' کے باب فضل صحابہؓ میں ہے:

''سئل أبوحنيفةؒ إذا قلتَ قولاً وكتاب اللّٰه يخالفه ؟ قال:اتركوا قولي بكتاب اللّٰه،فقيل:إذاكان خبرالرسول صلى اللّٰه عليه وسلم يخالفه ؟ قال:اتركوا قولي بخبر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فقيل: إذاكان قول الصحابةؓ يخالفه ؟ قال: اتركوا قولي بقول الصحابةؓ''. (۱)

امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ جب آپ کے کسی قول کی کتاب اللہ سے مخالفت ہوتی ہو تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ کے مقابلہ میں میرا قول ترک کردو'' کہا گیا: اگر حدیث رسول سے اس کی مخالفت ہوتی ہو تو؟ فرمایا: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو'' کہا گیا اور اگر ایسا ہی قول صحابہؓ اس کے خلاف پڑے تو؟ فرمایا: ''قول صحابہؓ کے مقابلہ میں بھی میرا قول چھوڑ دو'' یعنی میرے قول کی وقعت اس وقت کچھ نہیں جب وہ ان میں سے کسی کے بھی خلاف ثابت ہو۔

بات بالکل درست ہے کہ دراصل جو جدید ترتیب مسائل کی ہورہی تھی، یہ کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ کی روشنی ہی

== ''یعنی جو بات امام شافعیؒ نے کہی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر کس وناکس جو کسی صحیح حدیث کو دیکھے تو یہ کہہ دے کہ یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور اس کے ظاہر پر عمل کرنے لگے، بلکہ حق تو اس شخص کو ہے جس کو مذہب میں مجتہد کا مقام حاصل ہو اور اس کی شرط یہ ہے کہ اس کے گمان پر یہ بات غالب ہو کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو یہ حدیث نہیں پہنچی تھی یا اس کی صحت کا انہیں علم نہیں ہوا تھا اور یہ بات امام شافعیؒ کی تمام کتابوں کے مطالعہ کے بعد اسی طرح ان کے براہ راست تلامذہ کی تمام کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہی کہی جاسکتی ہے۔اور یہ بڑی کڑی شرط ہے''۔(المجموع: جلد ا صفحہ ۱۰۴)

اسی طرح علامہ شہاب الدین قرافی مالکیؒ کہتے ہیں:

''فقہاء شافعیہؒ میں سے بہت سے لوگ اس قول ''إذا صح الحديث فهو مذهبي'' پر اعتماد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا مذہب ایسا ہی ہے کیونکہ حدیث صحیح ہے حالانکہ ان کا یہ موقف غلط ہے اس لئے کہ صحت کے واسطے معارض سے محفوظ ہونا شرط ہے اور معارض کے نہ ہونے کا علم موقوف ہے اس شخص پر جس کو شریعت پر پورا عبور حاصل ہوتا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ یہ حدیث معارض سے بالکل محفوظ ہے۔رہا ایسے شخص کا استقراء وتتبع جو مجتہد مطلق نہیں ہے تو اس کا اعتبار نہیں۔جو شافعی علما اس نظریہ کے حامل ہیں ان کو چاہئے کہ پہلے اپنے اندر استقراء تام کی اہلیت پیدا کریں پھر اس فتویٰ کا اعلان کریں''۔(شرح التنقيح: ۴۵۰)

اس سے واضح ہوا کہ اس زمانہ میں ایسے لوگ جو اپنے آپ کو علم سے منسوب کرتے ہیں اور کبھی حدیث کے کتب ستہ کے مطالعہ کے دوران کوئی حدیث ایسی پاتے ہیں جو محدثین کی اصطلاح میں صحیح ہوتی ہے اور وہ بظاہر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے خلاف پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا مذہب دیوار پر مارو اور حدیث رسول کو اختیار کرو حالانکہ وہ حدیث منسوخ بھی ہوسکتی ہے یا ایسی دلیل کے معارض جو سند کے اعتبار سے مضبوط ہو یا کوئی ایسا مانع ہو جو اس حدیث پر عمل کرنے سے مانع بن رہا ہو اور صحابی وتابعین کا عمل اس سے مختلف ہو کیونکہ صحابہ اور تابعین حدیث کے مفہوم اور صحیح وغیر صحیح اقوال سے زیادہ باخبر ہوتے تھے،اس لئے موجودہ زمانہ کے بعض غیر مجتہد افراد کا یہ عمل ہرگز درست نہیں ہے۔اور ان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ کامل علم وفہم کے بغیر اس طرح کے الفاظ کا استعمال کریں۔(انیس)

(۱) عقد الجيد للشاه ولی اللّٰهؒ: ص ۵۳۔

میں تو ہو رہی تھی اس طرزِ جدید کا منشا صرف یہی تھا کہ امت کے سامنے زمانۂ حال کے مطابق مسائل سہل اسلوب میں آ جائیں، اس لئے کہ زمانہ کی رفتار کا جو رخ تھا، وہ بتا رہا تھا کہ انسانی مزاج سہل پسند بنتا جا رہا ہے، اگر اس وقت توجہ نہیں دی گئی تو آگے چل کر دشواری بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

دلائل پر بنیاد:

امام ابوحنیفہؒ نے اسی پر بس نہیں کیا تھا بلکہ اپنے تلامذہ اور اصحاب کو حکم دے رکھا تھا کہ تم خواہ مخواہ کسی ایک بات پر جم نہ جانا، بلکہ اگر کسی مسئلہ میں کوئی وزنی اور قابل اعتماد دلیل شرعی مل جائے تو پھر اس کو اختیار کرنا اور اس کا دوسروں کو حکم دینا، اس لئے کہ مقصد کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ پر عمل ہے، اپنی بات پر ضد اور اپنے فہم کی اشاعت پیش نظر نہیں ہے

"فاعلم أن أباحنيفةؒ من شدة احتياطه وعلمه بأن الاختلاف من اٰثار الرحمة قال لأصحابه: "إن توجه لكم دليل فقولوا به". (۱)

غایت احتیاط اور اس یقین کی وجہ سے کہ اختلاف آثار رحمت سے ہے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اصحاب سے فرمادیا تھا کہ اگر کوئی دلیل تم کو مل جائے تو پھر اسی پر عمل کرو اور اسی کا حکم دو۔

بعد والوں کا احتیاط:

چنانچہ آپ کے تلامذہ واصحاب اور بعد والوں نے اس قول کی اہمیت محسوس کی اور جب کبھی اور جہاں کہیں کسی مسئلہ کے اندر دلائل وبراہین کی روشنی میں شبہ پیدا ہوا اسے ترک کر دیا اور کتاب وسنت کے دائرہ میں جو دوسری صحیح صورت نظر آئی، اس پر عمل کیا۔

"وقد يتفق لهم أن يخالفوا أصحاب المذهب لدلائل وأسباب ظهرت لهم". (۲)

اور کبھی کبھی دلائل وبراہین کے پیش نظر اصحاب مذہب کی مخالفت بھی ان لوگوں نے کی ہے۔

ضد سے اجتناب کی بکثرت مثالیں:

یہ تو آپ کے اصحاب وتلامذہ کا حال تھا کہ انہوں نے بیسیوں مسائل میں آپ سے دلائل اور اپنے فہم کی بنیاد پر اختلاف کیا، اور اسی پر ان کا عمل رہا، دوسری طرف خود امام اعظمؒ کا حال یہ تھا کہ اگر کسی طے کردہ مسئلہ کے خلاف کوئی دوسری رائے کتاب وسنت کی روشنی میں وزنی معلوم ہوئی اور کتاب وسنت سے قریب تر، تو آپ نے اس طے کردہ مسئلہ کو ترک کر دیا اور اس سے رجوع کر کے دوسری طرف کے قائل ہو گئے، ایک دو نہیں بیسیوں مسائل ایسے ہیں جن

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ص۱۶۔

(۲) ردالمحتار: ج۱۔

سے آپ کا رجوع ثابت ہے، جن لوگوں نے دقت نظر سے فقہ کا مطالعہ کیا ہے ان کی نگاہوں سے یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں۔

کتاب وسنت کے مقابلہ میں رائے کی شدید مذمت:

یہ خوب اچھی طرح ذہن نشیں رہے کہ امام ابوحنیفہؒ اس رائے کی مذمت کرتے تھے جو کتاب وسنت سے مستفاد نہ ہو، بلکہ اسے ضلالت سے تعبیر فرمایا کرتے تھے:

"وقد روی الشیخ محی الدینؒ فی الفتوحات المکیة بسنده إلی الإمام أبی حنیفة رحمه اللّٰه أنه کان یقول: إیاکم والقول فی دین اللّٰه تعالیٰ بالرأی وعلیکم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل". (۱)

فتوحات مکیہ میں شیخ محی الدینؒ نے مسلسل ابوحنیفہؒ تک اپنی سند بیان کرنے کے بعد ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام صاحبؒ فرماتے تھے "اللہ تعالیٰ کے دین میں محض رائے کی بنیاد پر حکم کرنے سے بچو اور اپنے اوپر سنت کی پیروی ضروری کرلو، اس لئے کہ جو اس سے خارج ہوا، وہ گمراہ ہوگیا"۔

آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ جب تک شریعت میں کسی بات کا ثبوت نہ مل جائے اسے زبان پر لانا بھی گناہ ہے۔

"وکان یقول: لاینبغی لأحد أن یقول قولاً حتی یعلم أن شریعة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم تقبله". (۲)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ جب تک یہ یقین نہ ہوجائے کہ یہ بات شریعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے کسی کے لئے اس کا زبان پر لانا درست نہیں ہے۔

استنباط مسائل اور اس کے لئے اہتمام:

جو مسائل صراحتاً کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ میں نہیں ملتے ان کے لئے پوری مجلس طلب کرتے، بحث وتمحیص سے کام لیتے اور جب تک کوئی چیز باہمی اتفاق سے طے نہ ہوجاتی، اطمینان خاطر نہ ہوتا، امام شعرانیؒ (م ۹۷۳ھ) لکھتے ہیں:

"وکان یجمع العلماء فی کل مسئلة لم یجدها صریحة فی الکتاب والسنة ویعمل بمایتفقون علیه فیها". (۳)

جو مسئلہ کتاب وسنت میں صراحتاً نہیں ملتا اس کے لئے تمام علما کو جمع کرتے اور جس پر سبھوں کا اتفاق ہوتا عمل فرماتے۔

استنباط واستخراج کے موقع پر بھی یہی کرتے، علماء عصر سے مشورہ اور ان کا اتفاق ضروری سمجھتے، تنہا اس طرح کا کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

(۱) کتاب المیزان للشعرانی: جلد ۱ ص ۵۰۔

(۲) کتاب المیزان للشعرانی: جلد ۱ ص ۵۱۔

(۳) کتاب المیزان للشعرانی: ج ۱ ص ۵۱

"وکذلک یفعل إذا استنبط حکماً فلا یکتبه حتی یجمع علیه علماء عصره فإن رضوه قال لأبی یوسفؒ: اکتبه". (۱)

جب کبھی کسی حکم کا استنباط مقصود ہوتا تو اس وقت تک اسے ضبط تحریر میں نہیں لاتے جب تک تمام علما کو جمع کر کے مشورہ نہ کر لیتے اگر سب اس سے متفق ہوتے اور پسند کرتے تو امام ابو یوسفؒ سے فرماتے کہ "اسے لکھ لو"۔

اصحاب الرائے کا حاصل:

علما نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو جو "صاحب الرائے" قرار دیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی ذاتی یا من مانی رائے ہوا کرتی تھی، اس لئے کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام صاحبؒ ایسی رائے کو گمراہی فرمایا کرتے تھے لہٰذا اگر کسی نے ایسا کہا ہے یا سمجھا ہے تو اس سے کھلی ہوئی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے خواہ وہ بڑے سے بڑا محدث کیوں نہ ہو، امام موصوف اور آپ کے اصحاب اس سے بالکل بری ہیں، ابن حجر مکی شافعیؒ (م ۹۷۳ھ) نے درست لکھا ہے:

"اعلم أنه یتعین علیک أن لاتفهم من أقوال العلماء عن أبی حنیفةؒ وأصحابه أنهم أصحاب الرائی علٰی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلٰی قول أصحابه لأنهم برآء من ذلک". (۲)

خوب یقین کر لو کہ علما کے اقوال کی وجہ سے ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ کے مقابلہ میں "اصحاب الرائے" کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے کہ یہ حضرات اس سے بالکلیہ بری ہیں۔

تدوین فقہ میں ترتیب:

آگے دلائل کے طور پر لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ اور آپ کے اصحاب کا طرز فکر اور استنباط واستخراج کیا تھا اور آپ کس اصول پر گامزن تھے، فرماتے ہیں:۔

"فقد جاء عن أبی حنیفةؒ من طرق کثیرة ما ملخصه أنه أولاً یأخذ بما فی القرآن فإن لم یجد فبالسنة فإن لم یجد فبقول الصحابةؓ فإن اختلفوا أخذ بما کان أقرب إلی القرآن أوالسنة من أقوالهم ولم یخرج عنهم فإن لم یجد لأحد منهم قولاً، لم یأخذ بقول أحد من التابعین، بل یجتهد کما اجتهدوا". (۳)

امام ابو حنیفہؒ کے متعلق کثرت طرق سے جو ثابت شدہ حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ آپ پہلے قرآن اختیار کرتے اگر قرآن میں وہ چیز نہیں ملتی تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے اور اگر سنت میں بھی کوئی چیز نہیں ملتی تو پھر قول صحابہؓ اختیار کرتے

---

(۱) کتاب المیزان للشعرانی: ج۱ص۵۱۔

(۲،۳) الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفة النعمان: ص۲۹۔

اگر کسی مسئلہ میں صحابہؓ کا اختلاف ہوتا ان میں جو کتاب وسنت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا اسے قبول کرتے اور اس حد سے باہر نہ جاتے اور اگر صحابہؓ کا بھی کوئی قول نہیں ملتا تو تابعین میں سے کسی کا قول نہیں اختیار کرتے بلکہ خود اجتہاد کرتے جیسا کہ دوسرے لوگ کرتے۔

تدوین فقہ میں اولیت کا شرف:

امت میں ترتیب فقہ اور مسائل کے استنباط واستخراج میں آپ کو اولیت کا شرف حاصل ہے اس سے پہلے عام طور پر لوگوں کا دار ومدار حافظہ پر تھا امام مالک رحمہ اللہ بھی اس سلسلہ میں آپ کے خوشہ چیں ہیں، علامہ ابن حجر شافعی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''اِنہ أول من دوّن علم الفقه ورتّبه أبواباً وكتباً علٰى نحوما عليه اليوم وتبعه مالک فی موطأه ومن قبله إنما كانوا يعتمدون علٰى حفظهم''. (۱)

امام ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم فقہ کو مدون کیا اور اسے اس طرح باب وفصل وار مرتب کیا جس طرح آج اس کی مرتب شکل پائی جاتی ہے، امام مالکؒ نے اپنی موطأ میں آپ کی پیروی کی ہے امام ابوحنیفہؒ سے پہلے لوگوں کا اعتماد حافظہ پر ہوا کرتا تھا۔

امام اعظمؒ اور آپ کے اصحاب پہلے محدث پھر فقیہ:

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب پہلے محدث پھر فقیہ تھے، اس لئے کہ جس زمانہ میں احادیث کے مجموعے پائے نہیں جاتے تھے بغیر علم حدیث کے مسائل کا استخراج کہاں سے ہوسکتا تھا۔ ''فقہ حنفی'' کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ، جس سے ساری دنیا اور بعد کے مجتہدین نے اپنے زمانہ میں استفادہ کیا، بغیر حدیث کے کہاں سے آ گیا اور آج اس کے سارے مسائل واصول کس طرح حدیث کے مطابق ہو گئے، لہذا ماننا پڑیگا کہ ''فقہ حنفی'' کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، ابن حجر شافعیؒ (م۹۷۳ھ) نے لکھا ہے:

''مر أنه أخذ عن أربعة الآف شيخ من أئمة التابعين وغيرهم ومن ثم ذكره الذهبیؒ وغيره فی طبقات الحفاظ من المحدثين''. (۲)

یہ بات گذر چکی کہ امام ابوحنیفہؒ نے چار ہزار ائمۂ تابعین اور دوسرے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا اور یہی وجہ ہے کہ امام ذہبیؒ وغیرہ نے محدثین کے طبقۂ حفاظ میں آپ کا شمار کیا ہے۔

---

(۱) الخيرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنيفة النعمان: ص۳۱۔

(۲) الخيرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنيفة النعمان: ص۶۶۔

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا ذوقِ حدیث (۱) ان کی ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے لکھی ہیں:

''كتاب الآثار، كتاب الخراج، كتاب الرد على سير الأوزاعي، كتاب الحجج، موطأ إمام محمد''

اور دوسری کتابیں عام طور پر ملتی ہیں ان کو لے کر پڑھا جائے اور اندازہ لگایا جائے۔

آج بھی فقہ حنفی کا کوئی طالب علم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک ایک ایک مسئلۂ حنفی کی تحقیق کتاب وسنت کی روشنی میں نہیں کر لیتا۔ (۲) ☆

(۱) امام جمال الدینؒ نے اپنی کتاب معین الحکام میں نقل کیا ہے: فإن أبا يوسفؒ صاحب حديث حتى روى أنه قال أحفظ عشرين ألف حديث من المنسوخ هذا القدر فما ظنك بالناسخ وكان صاحب فقه ومعنى. (ص: ۳۰) جس کا ماحصل یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ محدث تھے اور بعض روایت کے مطابق خود امام موصوف کا بیان ہے کہ مجھے منسوخ حدیثیں بیس ہزار یاد ہیں اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناسخ حدیثیں کتنی ہزار یاد ہوں گی، اسی طرح امام محمدؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کو احادیث کی معرفت حاصل تھی فقیہ اور ذہین تو تھے ہی ومحمدؒ صاحب قريحة يعرف أحوال الناس وعاداتهم وصاحب فقه ومعنى ولهذا قل رجوعه في المسائل وكان مقدماً في معرفة اللغة وله معرفة بالأحاديث أيضاً (أيضاً) اور امام اعظمؒ ہر چیز میں بڑھے ہوئے تھے: وأبو حنيفةؒ كان مقدماً في ذلك كله. ظفیر۔

(۲) مقدمۂ فتاویٰ دار العلوم دیو بند، از مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی: ۱/۶۱ تا ۵۷۔

☆ امام ابو حنیفہؒ تک دو واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچی تھیں، اسی طرح صحابہ وخلفاء راشدینؓ کے اقوال وآثار ایک واسطہ سے پہنچے تھے اور تابعینؒ کے اقوال واعمال براہ راست آپ کے علم میں آئے تھے اس لئے بعد کے وہ محدثین جو چار یا پانچ واسطوں سے احادیث کی روایت کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے زمانہ میں احادیث کی سند کے اعتبار سے تحقیق کی اور اس پر صحت وضعف کا حکم لگایا اور صحیح احادیث کو منتخب کر کے اپنی کتابوں میں جمع کیا ان میں سے کچھ کتابیں سند اور تحقیق کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہوئیں جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم حالانکہ ان دونوں محدثین نے نہ تو تمام احادیث صحیحہ کو جمع کیا ہے اور نہ ہی اس کے استیعاب کا قصد کیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے صحیح بخاری کے نام میں مختصر کی قید رکھی ہے یہ فرمایا ہے کہ میں نے جن صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہیں گرچہ اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے: ''لم أخرج في هذا الكتاب إلا صحيحاً وما تركت من الصحيح أكثر''. (مقدمہ فتح الباری: جلد ا صفحہ ۷)

امام بخاریؒ کو جو احادیث یاد تھیں ان میں صرف صحیح احادیث کی تعداد ایک لاکھ تھی جبکہ غیر صحیح احادیث دو لاکھ ان کو حفظ تھے۔ مگر انہوں نے صحیح بخاری میں جو احادیث ذکر کی ہے ان میں تعداد سات ہزار دو سو پچھتر ہے، مکررات حذف کرنے کے بعد ان کی تعداد چار ہزار ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے بھی اپنی صحیح میں ساری صحیح احادیث کو ذکر نہیں کیا، وہ خود اپنی صحیح کے ''باب التشهد في الصلوٰة'' میں لکھتے ہیں: ''ليس كل شيء عندي صحيح وضعته ههنا إن ماوضعت ههنا ما أجمعوا عليه'' میں نے ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح ہو اس کتاب میں جمع نہیں کر دی ہے، بلکہ صرف ان احادیث کو جمع کیا ہے جن کی صحت پر ائمۂ محدثین کا اجماع ہے۔

یہاں اجماع سے مراد اجماع حقیقی نہیں ہے بلکہ حضرت امام مسلمؒ کے بعض ممتاز شیوخ کا اجماع مراد ہے۔ علامہ بلقینیؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلمؒ کی مراد ان کے چار شیوخ احمد بن حنبل، یحیٰ ابن معین، عثمان ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور خراسانی کا اجماع ہے۔ (تدریب الراوی: صفحہ ۲۸)

اسی لئے دیگر محدثین نے ان احادیث کو بھی جمع فرما دیا جو شرائط صحت کی حامل تھیں یا اس لائق تھیں کہ ان سے استدلال کیا جا سکے جیسے صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن، صحیح ابن حبان، المستدرک علی الصحیحین ان کے علاوہ دیگر سنن کی کتابیں جیسے سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، موطا امام مالک، موطا امام محمد، مسند امام ابو حنیفہ، مسند طحاوی، مصنف عبد الرزاق، مسند احمد بن حنبل، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن ترمذی، کتاب الآثار وغیرہ بہت سی کتابیں محدثین نے تحریر کیں اور جو آج بھی موجود ومتداول ہیں۔ اس لئے جو کوئی سنن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنا چاہے تو اسے ان ساری کتب کو پڑھنا چاہئے نہ کہ کسی ایک کتاب کو کیوں کہ کسی بھی مذکورہ بالا کتاب میں تمام احادیث وسنن یکجا نہیں ہیں۔

==

غلط پروپیگنڈہ:

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان حضرات کو حدیث نبوی سے اتنا شغف نہیں تھا جتنا فقہ سے اور نہ یہ کہنا بجا ہے کہ ان حضرات کی تمام تر توجہ آیات اور احادیث سے مسائل واحکام کے استنباط واستخراج پر مرکوز تھی اور تدوین وجمع احادیث

== فقہ حنفی کے محدثین کرام کی فہرست: اس فہرست سے معلوم ہوگا کہ فقہاء احناف محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں احادیث وآثار سے ماخوذ مسائل کثرت سے ہیں اور اس کی بنیاد ہی کتاب وسنت پر ہے اور اسی وجہ سے فقہ حنفی کو دنیا میں دوسری فقہ کے مقابلہ فوقیت کا مرتبہ ملا ہے، اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جتنی تعداد میں محدثین کرام فقہ حنفی میں موجود ہیں دوسری کسی فقہ کے ماننے والوں میں نہیں ہیں۔

(۱) امام ابوحنیفہؒ ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ، عمر ۷۰ سال
(۲) امام زفر بن ہذیلؒ ولادت ۱۱۰ھ وفات ۱۵۸ھ، عمر ۴۸ سال
(۳) امام مالک بن مغول البجلی الحنفیؒ وفات ۱۵۹ھ
(۴) امام داؤد طائی حنفیؒ وفات ۱۶۰ھ
(۵) امام مندل بن علی عزی کوفی حنفیؒ ولادت ۱۰۲ھ وفات ۱۶۸ھ
(۶) امام نصر بن عبدالکریمؒ وفات ۱۶۹ھ
(۷) امام عمرو بن میمون بلخی حنفیؒ وفات ۱۷۱ھ
(۸) امام حبان بن علیؒ وفات ۱۷۲ھ
(۹) امام ابوعصمہ نوح بن ابی مریم ''جامع'' حنفیؒ وفات ۱۷۳ھ
(۱۰) امام زہیر بن معاویہؒ ولادت ۱۱۰ھ وفات ۱۷۳ھ
(۱۱) امام قاسم بن معنؒ وفات ۱۷۵ھ
(۱۲) امام حماد بن امام اعظمؒ وفات ۱۷۶ھ
(۱۳) امام ھیاج بن بسطامؒ وفات ۱۷۷ھ
(۱۴) امام شریک بن عبداللہ الکوفیؒ وفات ۱۷۸ھ
(۱۵) امام عافیہ بن یزید القاضیؒ وفات ۱۸۰ھ
(۱۶) امام امیر المؤمنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارکؒ وفات ۱۸۱ھ
(۱۷) الامام الحجۃ حافظ الحدیث ابو یوسفؒ ولادت ۹۳ھ وفات ۱۸۲ھ
(۱۸) امام ابومحمد نوح بن دراج نخعی کوفیؒ وفات ۱۸۲ھ
(۱۹) امام ہشیم بن بشیر السلمی الواسطیؒ وفات ۱۸۳ھ
(۲۰) امام ابوسعید یحییٰ بن زکریا ہمدانی کوفیؒ وفات ۱۸۴ھ
(۲۱) امام فضیل بن عیاضؒ وفات ۱۸۷ھ
(۲۲) امام اسد بن عمر بن عامر البجلی الکوفیؒ وفات ۱۸۸ھ یا ۱۹۰ھ
(۲۳) الامام المجتہد الجلیل محمد بن الحسن الشیبانیؒ ولادت ۱۳۲ھ وفات ۱۸۹ھ
(۲۴) امام علی بن مسہر قریشی کوفیؒ وفات ۱۸۹ھ
(۲۵) امام یوسف بن خالد سمتیؒ وفات ۱۸۹ھ
(۲۶) امام عبداللہ بن ادریس کوفیؒ ولادت ۱۱۵ھ وفات ۱۹۲ھ
(۲۷) امام فضل بن موسیٰ السینانیؒ ولادت ۱۱۵ھ وفات ۱۹۲ھ
(۲۸) امام علی بن ظبیانؒ وفات ۱۹۲ھ
(۲۹) امام حفص بن غیاثؒ وفات ۱۹۴ھ
(۳۰) امام وکیع بن الجراحؒ وفات ۱۹۷ھ، عمر ۷۰ سال
(۳۱) امام ہشام بن یوسفؒ وفات ۱۹۷ھ
(۳۲) امام نقد رجال یحییٰ بن سعید القطان البصریؒ وفات ۱۹۸ھ، عمر ۸۷ سال
(۳۳) امام شعیب بن اسحاق دمشقیؒ وفات ۱۹۸ھ، عمر ۷۲ سال
(۳۴) امام ابوعمر وحفظ بن عبدالرحمٰن بلخیؒ وفات ۱۹۹ھ
(۳۵) امام ابومطیع حکیم بن عبداللہ بن سلمہ بلخیؒ وفات ۱۹۹ھ
(۳۶) امام خالد بن سلیمان بلخیؒ وفات ۱۹۹ھ، عمر ۸۴ سال
(۳۷) امام عبدالمجید بن عبدالرحمٰن الکوفی الحمانیؒ وفات ۲۰۲ھ
(۳۸) امام حسن بن زیاد لولویؒ وفات ۲۰۴ھ
(۳۹) امام ابوعاصم النبیل ضحاک بن مخلد بصریؒ وفات ۲۱۲ھ، عمر ۹۰ سال
(۴۰) امام مکی بن ابراہیم بلخیؒ وفات ۲۱۵ھ
(۴۱) امام حماد بن دلیل قاضی المدائنؒ
(۴۲) امام صلت بن الحجاج الکوفیؒ
(۴۳) امام شیخ ابوبکر بن ابی تیمیہ السختیانیؒ وفات ۱۳۱ھ
(۴۴) امام ابراہیم بن میمون الصائغ ابواسحاق الخراسانیؒ وفات ۱۳۱ھ
(۴۵) امام سعد بن ابراہیم زہریؒ وفات ۱۳۵ھ
(۴۶) امام ربیعۃ بن ابوعبدالرحمٰن المدنی المعروف بربیعۃ الرائیؒ وفات ۱۳۶ھ
(۴۷) امام عبداللہ بن شبرمۃ ابوشبرمۃ الکوفیؒ وفات ۱۴۴ھ
(۴۸) امام ہشام بن عروۃ بن الزبیر بن العوام الاسدی المدنیؒ وفات ۱۴۶ھ
(۴۹) امام جعفرؒ بن محمدؒ بن علیؒ بن الحسینؓ بن علیؓ بن ابوطالب وفات ۱۴۸ھ
(۵۰) امام زکریا بن ابی زائدہ خالد بن میمون بن فیروز الہمدانی کوفیؒ وفات ۱۴۹ھ

==

سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ بات صرف اس قدر ہے کہ تدوین فقہ جس کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں دی تھی انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اور اجتماعی طور پر پوری محنت کے ساتھ یہ کام شروع کر دیا اور وجہ ظاہر ہے کہ استنباط

==

(۵۱) امام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج المکیؒ وفات ۱۵۰ھ
(۵۲) امام محمد بن اسحاق بن یسار ابوبکر المطلبی (صاحبِ مغازی) وفات ۱۵۱ھ
(۵۳) امام شیخ ابوالنصر سعید بن ابی عروبہؒ وفات ۱۵۶ھ
(۵۴) امام ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو بن محمد اوزاعیؒ ولادت ۸۸ھ وفات ۱۵۷ھ
(۵۵) امام محدث کبیر محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی الذئب القرشی العامریؒ ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۹ھ
(۵۶) امام امیر المؤمنین فی الحدیث شعبۃ بن الحجاجؒ وفات ۱۶۰ھ، عمر ۷۸ سال
(۵۷) امام محدث شہیر اسرائیل بن یونس بن ابواسحاق السبیعی کوفیؒ وفات ۱۶۰ھ
(۵۸) امام شیخ ابرہیم بن ادہم بن منصور بلخیؒ وفات ۱۵۱ھ یا ۱۶۲ھ
(۵۹) امام سفیان بن سعید بن مسروق ثوریؒ ولادت ۹۷ھ وفات ۱۶۱ھ
(۶۰) امام ابراہیم بن طہمانؒ وفات ۱۶۳ھ
(۶۱) امام حماد بن سلمہؒ وفات ۱۶۷ھ
(۶۲) امام ابوالنضر جریر بن حازم الازدی البصریؒ وفات ۱۷۰ھ
(۶۳) امام ابوالحارث لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن مصری حنفیؒ ولادت ۹۲، ۹۴ وفات ۱۷۵ھ
(۶۴) امام حماد بن زیدؒ وفات ۱۷۹ھ، عمر ۸۱ سال
(۶۵) امام شیخ جریر بن عبدالحمید الرازیؒ ولادت ۱۱۰ھ وفات ۱۸۱ھ
(۶۶) امام ہشیم بن بشیر ابومعاویہ السلمی الواسطیؒ ولادت ۱۰۴ھ وفات ۱۸۳ھ
(۶۷) امام موسیٰ کاظم بن الامام جعفر صادقؒ وفات ۱۸۳ھ
(۶۸) امام شیخ عباد بن العوامؒ وفات ۱۸۵ھ
(۶۹) امام مغیرہ بن مقسم الضبی ابوہاشم الکوفیؒ ۱۸۶ھ (جواہر مضیہ) م ۱۳۶ھ (جامع المسانید)
(۷۰) امام ابراہیم بن محمد ابواسحاق الفزاری الشامیؒ وفات ۱۸۶ھ
(۷۱) امام حافظ ابوبکر عبدالسلام بن حرب بن سلم نہدی کوفیؒ وفات ۱۸۷ھ
(۷۲) امام شیخ عیسیٰ بن یونس سبیعی کوفیؒ (اخو اسرائیل) وفات ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۱ھ
(۷۳) امام یوسف بن امام ابویوسفؒ وفات ۱۹۲ھ
(۷۴) امام شیخ ابوعلی شفیق بن ابراہیم بلخیؒ وفات ۱۹۴ھ
(۷۵) امام شیخ ولید بن مسلم دمشقیؒ ولادت ۱۱۹ھ وفات ۱۹۵ھ
(۷۶) امام وحافظ حدیث اسحاق بن یوسف الازرق التنوخی الواسطیؒ (تلمیذ امام اعظمؒ) وفات ۱۹۵ھ
(۷۷) امام ابومحمد سفیان بن عیینہ کوفیؒ وفات ۱۹۸ھ
(۷۸) امام شیخ یونس بن بکیر ابوبکر الشیبانی الکوفیؒ وفات ۱۹۹ھ
(۷۹) امام عبداللہ بن عمر العمریؒ
(۸۰) امام حافظ عبداللہ بن نمیرؒ وفات ۱۹۹ھ
(۸۱) امام شیخ عمرو بن محمد العنقزی قرشیؒ وفات ۱۹۹ھ
(۸۲) امام عمرو بن ہیثم بن قطنؒ وفات ۲۰۰ھ
(۸۳) امام شیخ معروف کرخیؒ (تلمیذ داؤد طائی تلمیذ الامامؒ) وفات ۲۰۰ھ
(۸۴) امام حافظ ابوسلیمان موسیٰ بن سلیمان جوزجانیؒ وفات ۲۰۰ھ عمر ۸۰ سال
(۸۵) امام محدث عباد بن صہیب بصریؒ وفات ۲۰۲ھ
(۸۶) امام زید بن حباب عکلی کوفیؒ وفات ۲۰۳ھ
(۸۷) امام محدث مصعب بن مقدام خثعمی کوفیؒ وفات ۲۰۳ھ
(۸۸) امام ابوداؤد سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسیؒ وفات ۲۰۴ھ عمر ۸۰ سال
(۸۹) امام محدث کبیر خلف بن ایوبؒ وفات ۲۰۵ھ
(۹۰) امام جعفر بن عون بن جعفر بن عمرو بن حریث ابوعون مخزومی کوفیؒ وفات ۲۰۷ھ
(۹۱) امام شیخ قاسم بن الحکم بن کثیر العرنی کوفی قاضی ہمدانؒ وفات ۲۰۸ھ
(۹۲) امام ابومحمد حسین بن حفص اصفہانیؒ (تلمیذ امام ابویوسفؒ) وفات ۲۱۰ھ
(۹۳) امام ابراہیم بن رستم مروزیؒ (تلمیذ امام محمدؒ) وفات ۲۱۱ھ
(۹۴) امام حافظ معلیٰ بن منصورؒ (تلمیذ امام ابویوسفؒ وامام محمدؒ) وفات ۲۱۱ھ
(۹۵) امام حافظ عبدالرزاق بن ہمامؒ (تلمیذ الامام الاعظمؒ) ولادت ۱۲۶ھ وفات ۲۱۱ھ
(۹۶) امام اسماعیل بن حماد بن الامام الاعظمؒ (تلمیذ الامامؒ) وفات ۲۱۲ھ
(۹۷) امام بشر بن ابوالازہرؒ (تلمیذ امام ابویوسفؒ) وفات ۲۱۳ھ
(۹۸) امام حافظ عبداللہ بن داؤد خریبیؒ وفات ۲۱۳ھ
(۹۹) امام حافظ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ یزید المقریؒ وفات ۲۱۳ھ
(۱۰۰) امام اسد بن الفرات قاضی قیروان وفاتح صقلیہؒ وفات ۲۱۳ھ
(۱۰۱) امام احمد بن حفص ابوحفص کبیر بخاریؒ وفات ۲۱۷ یا ۲۱۸ھ
(۱۰۲) امام شیخ ہشام بن اسماعیل بن یحییٰ بن سلیمان الحنفی الفقیہؒ وفات ۲۱۷ھ
(۱۰۳) امام حافظ علی بن معبد بن شداد العبدی الرقیؒ وفات ۲۱۸ھ
(۱۰۴) امام ابونعیم فضل بن دکین کوفیؒ ولادت ۱۳۰ھ وفات ۲۱۹ھ
(۱۰۵) شیخ حمیدی ابوبکر عبداللہ بن الزبیر بن عیسیٰ بن عبیداللہ بن اسامہؒ وفات ۲۱۹ یا ۲۲۰ھ
(۱۰۶) امام عیسیٰ بن ابان بن صدقہ بصریؒ وفات ۲۲۱ھ
(۱۰۷) امام یحییٰ بن صالح الوحاظی ابوزکریاؒ ولادت ۱۴۹ھ وفات ۲۲۲ھ
(۱۰۸) امام حافظ سلیمان بن حرب بغدادیؒ وفات ۲۲۴ھ

==

مسائل واحکام اس وقت کا سب سے اہم کام تھا اور یہ سب کے بس کی بات بھی نہ تھی کیونکہ اس میں بڑے غور وفکر اور فہم وبصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی تدوین حدیث کا کام تو یہ عہد نبوی سے ہوتا آ رہا ہے اور اس وقت بھی بطور خود ہر شخص کو دلچسپی تھی، جس کا بڑا ثبوت امام اعظمؒ کی ''جامع المسانید'' ہے اور پھر پہلی صدی ہجری کے ختم پر جب کہ صحابۂ کرامؓ کو روپوش ہوئے ابھی دس بیس سال بھی نہ گذرے تھے۔(۱)

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جمع حدیث میں اہم کام اسناد اور رواۃ پر نظر ہے اور سچ پوچھئے تو یہی معیار ہے، امام اعظمؒ کے دور میں جس وقت تابعین کا بڑا طبقہ بقید حیات تھا اسناد ورواۃ کی اس بحث کی گنجائش ہی کہاں تھی جو بعد میں ہوئی، صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین کے متعلق یہ مسلم ہے ''**الصحابة کلھم عدول**'' صحابۂ کرامؓ سب کے سب عادل ہیں، رہ گئے تابعین تو یہ موجود ہی تھے۔

پھر یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب فقہ کی تدوین آیات واحادیث سے ہی ہو رہی تھی تو ان چیزوں سے بے توجہی کا موقع بھی کیا تھا اس لئے کہ اس کام میں پہلے احادیث کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ ابن حجر مکی شافعیؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ سے باوجود جلالت علم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقربیت کے احادیث کا وہ ذخیرہ مروی نہیں ہے جو دوسرے چھوٹے بڑے صحابۂ کرامؓ سے کہ یہ حضرات عامۃ المسلمین اور اسلام کے مصالح اور

==

(۱۰۹) امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ وفات ۲۲۴ یا ۲۲۵ھ
(۱۱۰) امام حافظ ابوالحسن علی بن الجعد بن عبید الجوہری بغدادیؒ ولادت ۱۳۳ھ وفات ۲۳۰ھ
(۱۱۱) امام شیخ فرخ مولیٰ امام ابویوسفؒ ولادت ۱۳۶ھ وفات ۲۳۰ھ
(۱۱۲) امام سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین ابوزکریا بغدادیؒ (تلمیذ امام ابویوسفؒ وامام محمد) وفات ۲۳۳ھ
(۱۱۳) امام حافظ علی بن محمد ابوالحسن طنافسیؒ وفات ۲۳۳ھ
(۱۱۴) امام محمد بن سماعہ تمیمیؒ وفات ۲۳۳ھ عمر ۱۰۳ سال
(۱۱۵) امام حافظ محمد بن عبداللہ نمیر کوفیؒ وفات ۲۳۴ھ
(۱۱۶) امام حافظ ابوخیثمہ زہیر بن حرب النسائیؒ ولادت ۱۶۰ھ وفات ۲۳۴ھ عمر ۷۴ سال
(۱۱۷) امام حافظ سلیمان بن داؤد بن بشر المفتری معروف بہ شاذ کوفیؒ وفات ۲۳۴ھ (۱۱۸) امام حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ (عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ) کوفیؒ وفات ۲۳۵ھ
(۱۱۹) امام حافظ بشر بن الولید بن خالد کندیؒ وفات ۲۳۸ھ
(۱۲۰) امام حافظ اسحاق بن راہویہ حنظلیؒ ولادت ۱۶۱ھ، یا: ۱۶۶ھ وفات ۲۳۸ھ عمر ۷۷ سال
(۱۲۱) امام حافظ ابراہیم بن یوسف بلخیؒ وفات ۲۳۹ھ
(۱۲۲) امام حافظ عثمان بن محمد بن ابرہیم الکوفی المعروف با بن ابی شیبہؒ وفات ۲۳۹ھ عمر ۸۳ سال
(۱۲۳) امام یحییٰ بن اکتم بن محمد قطن بن سمعان مروزیؒ وفات ۲۴۲ یا ۲۴۳ھ
(۱۲۴) امام حافظ ولید بن شجاع ابوہمام بن ابی بدر السکونی الکوفیؒ وفات ۲۴۳ھ، عمر ۸۳ سال
(۱۲۵) امام محدث کوفہ ابوکریب محمد بن العلاء الہمدانی الکوفیؒ وفات ۲۴۳ھ عمر ۸۷ سال
(۱۲۶) امام شیخ ابوعبداللہ بن یحییٰ العدنیؒ وفات ۲۴۳ھ
(۱۲۷) امام حافظ احمد بن منیع ابوجعفر البغوی الاصمؒ ولادت ۱۶۰ھ وفات ۲۴۴ھ
(۱۲۸) امام حافظ اسحاق بن موسیٰ الانصاریؒ وفات ۲۴۴ھ
(۱۲۹) امام حافظ سلمہ بن شبیب نیشا پوریؒ وفات ۲۴۶ھ
(۱۳۰) امام حافظ احمد بن کثیر ابوعبداللہ دورقیؒ ولادت ۱۶۸ھ وفات ۲۴۶ھ
(۱۳۱) امام حافظ اسماعیل بن توبہ ابوسہل ثقفی قزوینیؒ وفات ۲۴۷ھ
(۱۳۲) امام حافظ عمرو بن علی فلاس بصریؒ وفات ۲۴۹ھ
(۱۳۳) امام ابوجعفر دارمیؒ وفات ۲۵۳ھ۔ (''انوار الباری'' اردو شرح ''صحیح البخاری'' تالیف تلمیذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوریؒ جلد اول، حصہ اول، صفحہ ۱۴۵ تا ۲۱۷، مطبوعہ ربانی بکڈپو، دہلی۔ انیس)

(۱) عنوان: غلط پروپیگنڈہ۔ سے، ماخوذ از مقدمۂ فتاویٰ دار العلوم دیوبند از مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

احکام میں اس طرح منہمک تھے کہ ان کو روایت کی طرف وہ توجہ نہ رہی جو اور لوگوں کی تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ آپ حضرات احادیث سے شغف نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب، فقہ کی ترتیب اور استنباط واستخراج مسائل کے اشتغال کی وجہ سے اگر احادیث کی روایت میں نمایاں نظر نہیں آتے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ حضرات نے حدیث کی دولت سے وافر حصہ نہیں پایا تھا ان کے الفاظ یہ ہیں:

"ولأجل اشتغاله بهذا الأهم لم يظهر حديثه فى الخارج كما أن أبابكر وعمر رضى الله عنهما لما اشتغلا لمصالح المسلمين العامة لم يظهر عنهما من رواية الأحاديث مثل ماظهر عمن دونهما حتى صغار الصحابة رضوان الله عليهم وكذلك مالك والشافعى لم يظهر عنهما مثل ماظهر عمن تفرغ للرواية كأبى زرعة وابن معين". (۱)

امام ابوحنیفہؒ حدیث وقرآن سے چونکہ مسائل کے استنباط واستخراج میں منہمک تھے جو بڑا اہم کام تھا اس وجہ سے آپ کی خدمت حدیث نمایاں نہ ہوسکی اس کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ مصالح عامہ سے متعلقہ امور میں اشتغال کی وجہ سے روایت حدیث میں وہ نمایاں مقام نہیں حاصل کرسکے جو دوسرے چھوٹے بڑے صحابۂ کرامؓ کو حاصل رہا اور یہی حال امام مالکؒ وشافعیؒ کا ہے کہ ان کی خدمت حدیث ان لوگوں کی طرح نمایاں نہیں، جو اسی کام کے ہوکر رہ گئے تھے جیسے ابوزرعہؒ اور ابن معینؒ۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ امام صاحبؒ اور آپ کے اصحابؒ نے احادیث کے ساتھ بھی اپنے دور کے مذاق کے مطابق وہی شغف رکھا جو رکھنا چاہئے تھا۔ (۲)

تدوین فقہ اور مسائل کا پھیلاؤ:

فقہ کا جو کام امام اعظمؒ کی زیرنگرانی انجام پایا تھا وہ ضرورت اور تقاضائے وقت کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا ہی گیا کسی منزل پر جاکر رکا نہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ انسانی ضرورتیں نئی نئی شکلیں اختیار کرتی رہیں اور نئی ایجادات

(۱) **الخيرات الحسان فى مناقب الامام الاعظم ابى حنيفة النعمان:٦٦۔**

(۲) **امام صاحبؒ اور علوم حدیث:** امام صاحبؒ علوم حدیث کے تمام سرچشموں سے سیراب تھے۔ اور اس میں ان کو جامعیت حاصل تھی ایک مرتبہ خلیفہ ابوجعفر منصور کے یہاں گئے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے امام صاحبؒ کے بارے میں کہا کہ **هذا عالم الدنيا اليوم**۔ یعنی آج یہ دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ ابوجعفر منصور نے پوچھا کہ آپ نے کس سے علم حاصل کیا ہے۔ امام صاحبؒ نے جواب دیا۔ حضرت عمرؓ کا علم اصحاب عمرؓ سے۔ حضرت علیؓ کا علم اصحاب علیؓ سے حضرت ابن مسعودؓ کا علم اصحاب ابن مسعودؓ سے۔ حضرت ابن عباسؓ کا علم اصحاب ابن عباسؓ سے اور ابن عباسؓ کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔ یہ سن کر ابوجعفر منصور نے کہا کہ آپ نے بہت ہی معتبر ومستند علم حاصل کیا ہے۔ (تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۴) ==

اور جدت پسندی کے ساتھ نئے مسائل ابھرتے رہے اور انشاء اللہ یہ سلسلہ تا قیامت یوں ہی جاری رہے گا اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فقہ کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

== امام سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ ابوحنیفہؒ صرف صحیح حدیث کو لیتے تھے حدیث کے ناسخ ومنسوخ کا پختہ علم رکھتے تھے۔ ثقہ راویوں سے روایت کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عمل اور اہل کوفہ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ اور اسی کو دین بتاتے تھے۔ (عقود الجمان: ص ۱۹۱)

حسن بن صالح کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ احادیث کے ناسخ ومنسوخ کی جانچ میں بہت شدت سے کام لیتے تھے اور ان کے روایتی اور درایتی معیار کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے جو حدیث مل جاتی تھی اسی پر عمل کرتے تھے۔ وہ علماء کوفہ کی احادیث وفقہ دونوں کو پہچانتے تھے۔ اور اپنے شہر کے تعامل کی اتباع کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عمل کے حافظ تھے جس پر آپ کا وصال ہوا۔ اور جو علماء کوفہ تک پہنچا۔ (أخبار أبی حنیفة و أصحابه: ص ۱۳)

امام ابوحنیفہؒ نے تابعین وتبع تابعین میں جن شیوخ حدیث سے روایت کی ہے ان کی تعداد چار ہزار ہے ''عقود الجمان'' میں جن اہم مشائخ کے نام حروف تہجی پر شمار کئے ہیں ان کی تعداد ۲۸۰ (دوسواسی) سے زائد ہے۔ (عقود الجمان: ۶۳ تا ۸۷)

اگر ''تفقہ فی الدین'' میں امام حماد بن ابی سلیمانؒ ان کے شیخ اکبر ہیں تو امام عامر بن شرحبیل شعبیؒ حدیث رسول میں ان کے شیخ اکبر ہیں۔ جیسا کہ ذہبیؒ نے لکھا ہے۔ هو أكبر شيخ لأبی حنيفةؒ. وہ ابوحنیفہؒ کے شیخ اکبر ہیں (تذکرة الحفاظ: ۱/۷۵)

امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ بھی قرآن وحدیث، عربیت ودیگر علوم وفنون کے ماہر تھے۔ امام محمد بن حسنؒ جو تلامذہ میں کم عمر تھے علم حدیث اور فقہ میں ان کی گہرائی وگیرائی کا حال یہ تھا کہ امام شافعیؒ جب ان کی خدمت میں گئے اور فقہ وحدیث کی تکمیل کی تو فرمایا کہ میں نے محمد بن حسنؒ سے ایک اونٹ کے بار برابر حدیث سنی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو علم میں میری زبان اتنی نہ کھلتی۔ تمام اہل علم فقہ میں اہل عراق کے عیال ہیں، اور اہل عراق اہل کوفہ کے عیال ہیں، اور اہل کوفہ امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں۔ (ترتیب المدارک: ۱/۲۹۲)

امام ابوحنیفہؒ حدیث کی روایت میں بہت سختی سے کام لیتے تھے۔ امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ ثقہ ہیں وہ ان ہی احادیث کو بیان کرتے ہیں جو ان کو یاد ہوں، اور جو یاد نہیں اس کو بیان نہیں کرتے۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۴۵)

امام صاحبؒ احادیث کی روایت کے بارے میں کہا کرتے تھے: **لاینبغی للرجل أن یحدث من الحدیث إلا ما یحفظ من وقت ما سمعه**۔ آدمی کو چاہئے کہ صرف وہی حدیث بیان کرے جس کو اس نے سماع کے وقت یاد کرلیا ہے۔ (مناقب أبی حنیفةؒ وصاحبیه: ۲۲)

امام صاحبؒ نے کوفہ میں فقہ کی تدوین کی اور فقہی مسائل کا املا کرایا اسی طرح احادیث کی روایت کی اور املا کرایا، بعد میں تلامذہ میں ان کتابوں کو اپنے حلقۂ درس میں روایت کی اس لیے وہ کتابیں ان کی طرف منسوب ہوئیں پھر بھی کچھ کتابیں امام صاحبؒ کے نام سے باقی رہ گئیں جیسا کہ ابن ندیمؒ نے الفہرست میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام دیئے ہیں:

(۱) كتاب الفقه الأكبر	(۲) كتاب الرسالة إلى البستي
(۳) كتاب العالم والمتعلم	(۴) كتاب الرد على القدرية (الفهرست: ۲۸۵)
(۵) كتاب المسند	

فقہ کے مختلف ابواب پر امام ابوحنیفہؒ کے مجتہدات وآثار پر مشتمل کتابیں اس دور کے فقہا ومشائخ کے درمیان مطالعہ میں رہتی تھیں، چنانچہ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جو شخص ابوحنیفہؒ کی کتابوں کو نہیں دیکھے گا وہ فقہ میں متبحر نہیں ہوسکتا ہے اور نہ وہ تفقہ حاصل کر پائے گا۔

امام مالکؒ، امام عبداللہ بن داؤدؒ، امام سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور اس دور کے دیگر فقہا امام صاحبؒ کی کتابوں کو رکھتے اور پڑھتے تھے۔

امیر ابن ماکولہؒ نے الإکـــمـــال میں امام ابوحامد المقریؒ متوفی ۳۳۳ھ کے حال میں لکھا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی کتابیں احمد بن نصرؒ سے سنی ہے اور احمد بن نصرؒ نے ابوسلیمان جوزانیؒ سے اور انہوں نے امام محمدؒ سے یہ کتابیں سنی ہیں۔ (مناقب ابوحنیفہؒ: ۲۵)

بہر حال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی یہ کتابیں کئی صدیوں تک دائر وسائر رہیں اور فقہا ومحققین ان سے استفادہ کرتے رہے۔ بعد میں وہ کتابیں ان کے شاگردوں کی طرف حذف واضافہ کی بنیاد پر منسوب ہوگئیں۔ (انیس الرحمٰن قاسمی)

"من یرد اللّٰہ به خیراً یفقّهه فی الدین إنما أنا قاسم واللّٰہ یعطی". متفق علیه. (۱)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بہتری کا ارادہ فرمالیتا ہے دین میں اسے بصیرت عطا کر دیتا ہے اور میرا کام تو بس تقسیم کر دینا ہے حقیقت میں عطا و بخشش خدا کا کام ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فقاہت اور استنباط و استخراج میں بصیرت فیضان الٰہی ہے، انسانی عمل کو اس میں دخل نہیں، قدرت کی طرف سے یہ فیضان ان بندوں پر ہوتا ہے جسے وہ نوازنا چاہتا ہے۔

فقہ کی برکت:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فقیه واحد أشد علی الشیطان من ألف عابد". رواه الترمذی. (۲)

ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے۔

اور چیزوں کے ساتھ اس حدیث میں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فقہا مسائل میں صحیح طور پر رہنمائی نہیں فرماتے تو شیطان کا لشکر انسانوں کو غلط راستہ پر ڈال دیتا اور گمراہی کے جہنم میں لا کھڑا کرتا اور یہی وجہ ہے کہ شیطان جس قدر فقیہ سے گھبراتا ہے عبادت گذار سے نہیں۔ (۳)

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب العلم: ص۳۲۔

(۲) مشکوٰۃ، کتاب العلم۔

(۳) مقدمۂ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند از مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ: ۱/۵۷تا۷۷۔ انیس

فقہ اسلامی کے ادوار

فقہ اسلامی کی ابتدا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوگئی تھی اور صحابہؓ وتابعینؒ کے زمانے میں نئے مسائل کی تخریج کا کام شروع ہوگیا تھا، اس کے کئی ادوار اور عہد گذرے ہیں، اس موضوع پر قدیم وجدید مورخین نے درج ذیل کتابیں تحریر کی ہیں، جو اس موضوع کے لیے کافی اہم ہیں۔(۱)

لیکن اس کے علاوہ یہاں فقہ اسلامی کے ادوار کا ایک مختصر جائزہ موسوعہ فقہ اسلامی کے حوالہ سے پیش ہے:

فقہ اسلامی مختلف ادوار سے گذری ہے جو ایک دوسرے سے گتھے ہوئے رہے ہیں اور ہر سابقہ دور لاحقہ دور پر اثر انداز رہا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سبھی عہد اپنے زمانہ کے اعتبار سے پوری باریکی کے ساتھ ایک دوسرے سے ممتاز

(۱) قدیم علما کی کتابیں:

۱)طبقات الشافعية۔(شافعیہ) مصنفہ شیخ ابوعاصم عبادیؒ۔(م:۴۵۸ھ)

۲)طبقات الفقهاء(تمام فقہا) مصنفہ امام ابواسحاق شیرازیؒ۔(م:۴۷۶ھ)

۳)طبقات الحنابلة(حنابلہ) مصنفہ قاضی ابوحسین محمد بن فراءؒ۔(م:۵۲۷ھ)

۴)ترتیب المدارک(مالکیہ) مصنفہ قاضی عیاض مالکیؒ۔(م:۵۴۴ھ)

۵)طبقات الشافعية الكبرىٰ(شوافع) مصنفہ امام تاج الدین عبدالوہاب سبکیؒ(م:۷۷۱ھ)

۶)طبقات الشافعية۔ مصنفہ شیخ جمال الدین اسنویؒ۔(م:۷۷۲ھ)

۷)الجواهر المضية(حنفیہ) مصنفہ علامہ محی الدین عبدالقادر قریشیؒ۔(م:۷۷۵ھ)

۸) ذيل علىٰ طبقات الحنابلة۔ مصنفہ حافظ ابن رجب حنبلیؒ۔(م:۷۹۵ھ)

۹)الديباج المذهب۔ مصنفہ برہان الدین ابراہیم بن فرحون مالکیؒ۔(م:۷۹۹ھ)

۱۰)طبقات الشافعية۔ مصنفہ ابوبکر بن احمد دمشقیؒ۔(م:۸۵۱ھ)

۱۱)تاج التراجم۔ مصنفہ حافظ قاسم بن قطلو بغاؒ۔(م:۸۷۹ھ)

۱۲)المقصد الأرشد۔ مصنفہ علامہ برہان الدین ابراہیم بن مفلحؒ۔(م:۸۸۴ھ)

۱۳)الجوهر المنضد۔ مصنفہ علامہ یوسف بن حسن دمشقیؒ۔(م:۹۰۹ھ)

۱۴)المنهج الأحمد۔ مصنفہ ابوالیمن مجیر الدین علیمیؒ۔(م:۹۲۸ھ)

۱۵)توشيح الديباج۔ مصنفہ علامہ بدرالدین قرافیؒ۔(م:۹۶۴ھ)

۱۶)الطبقات السنية۔ مصنفہ علامہ تقی الدین غزیؒ۔(م:۱۰۰۵ھ)

==

ہیں، سوائے عہد اول کے جو عہد نبوت ہے، اس لئے کہ وہ ان ادوار سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد آئے ہیں، پوری طرح ممتاز ہے۔(۱)

پہلا دور: عہد نبوی:

مکی و مدنی دونوں ادوار میں فقہ اسلامی کا تمام تر دار و مدار وحی پر تھا، حتی کہ ان مسائل کا دار و مدار بھی وحی پر تھا (جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اجتہاد کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا یا اسے رد فرما دیا) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اس اجتہاد کو برقرار رکھا تب بھی وہ وحی کے ذریعہ تشریع تھی اور اگر رد کر دیا تو اس رد کی بنیاد بھی وہی تشریع تھی جو وحی پر مبنی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کے اثبات ورد میں جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن حق بات یہ ہے کہ ان مسائل میں جو آپ کو وحی سے نہ معلوم ہو سکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد فرمایا ہے، پھر بسا اوقات اللہ تعالیٰ نے آپ کے اجتہاد کی توثیق کر دی ہے اور بسا اوقات آپ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ خلاف اولیٰ ہے۔

==

۱۷) السخت الأكمل۔	مصنفہ علامہ محمد کمال الدین غزیؒ۔(م:۱۲۱۴ھ)
۱۸) الفوائد البهية۔	مصنفہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ۔(م:۱۳۰۴ھ)
۱۹) اليواقيت الثمينة	مصنفہ علامہ محمد البشیر ازہریؒ۔(م:۱۳۲۹ھ)
۲۰) شجرة النور الزكية في طبقات المالكية۔	مصنفہ شیخ محمد بن محمد مخلوفؒ۔(م:۱۳۶۰ھ)
۲۱) الفقيه و المتفقه۔	مصنفہ ابوبکر احمد ابن علی الخطیب بغدادیؒ۔
۲۲) وفيات الأعيان۔	مصنفہ ابن خلکانؒ۔
۲۳) تاریخ ابن خلدون۔	مصنفہ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدونؒ۔
۲۴) تذكرة الفقهاء۔	مصنفہ علامہ حلی جمال الدین حسن ابن یوسفؒ۔

جدید علما کی کتابیں:

۱) تاريخ التشريع الإسلامي۔	مصنفہ محمد خضری بک و مصنفہ عبداللطیف محمد السبکی
۲) تدوین فقہ۔	مصنفہ مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ۔
۳) تاريخ الفقه الإسلامي۔	مصنفہ علامہ علی الثالث۔
۴) فقہ اسلامی تدوین وتعارف۔	مصنفہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔
۵) اودھ میں افتا کے مراکز اور انکی خدمات۔	مصنفہ ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی۔(انیس)

(۱)　ماخوذ از الموسوعۃ الفقہیۃ اردو جلد اول۔ وزارت اوقاف کویت۔ انیس

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دور یہاں وہاں کے کسی اجنبی فقہ سے متأثر نہیں ہوا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ناخواندہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی استاذ کے سامنے نہیں بیٹھے، نیز جس قوم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ بھی ناخواندہ تھی، اور اسے رومی یا غیر رومی کسی قانون کی کوئی جانکاری نہ تھی۔

ہاں عربوں کے کچھ رسوم تھے جن پر ان کا اتفاق تھا، ان میں سے بعض رسم ورواج کو شریعت نے باقی رکھا اور بعض کو منسوخ کر دیا، جیسے ''متبنیٰ بیٹے'' کا رواج اور ''ظہار'' کی رسم اور نکاح کی بعض قسمیں جو عربوں میں معروف اور رائج تھیں، نیز ''سود'' اس لئے کہ یہ بھی ان میں عام تھا، اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں، کوئی شخص خواہ کتنا ہی اسلام دشمن ہو، یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس دور میں اسلامی قانون سازی سابقہ قوموں کے قوانین سے متأثر ہوئی تھی۔

اس دور میں صرف قرآن پاک کی تدوین زیر عمل آئی، کلام اللہ کے علاوہ حدیث وغیرہ کی تدوین سے اس لئے منع کر دیا گیا تاکہ لوگوں کو کلام اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں التباس نہ ہو، جیسا کہ سابقہ امتوں کے ساتھ ہوا کہ انہوں نے خدائی کلام کو اپنے رسولوں اور علما کی باتوں سے گڈمڈ کر دیا اور اس مخلوطہ کو انہوں نے اللہ کی طرف سے نازل کردہ مقدس کتابوں کا درجہ دے دیا، اس کے باوجود بعض صحابہ کو آپ کی حدیث کی تدوین کی اجازت ملی تھی، جیسے عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص کو، چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر جو احادیث جمع کی تھیں ان کا نام انہوں نے ''**الصادقة**'' رکھا تھا، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اجازت ملی تھی کہ وہ ''خون بہانے'' اور ''دیت'' سے متعلق بعض مسائل لکھ لیں۔

اپنے رب کے پیغام کی مسلسل ۲۳؍سالہ تبلیغ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے، ۱۳؍سال آپ نے مکہ میں گذارے، جن کے دوران آپ کا مشن عقیدہ کی پختہ کاری تھی، خواہ عقیدہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہو، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی شہادت سے، یا یوم آخرت سے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں مکارم اخلاق کی دعوت اور امہات الرذائل سے منع فرمانے پر توجہ دی، عہد مکی میں اگر بعض فروعی اور جزوی احکام مشروع ہوئے، جیسے ذبیحوں کے احکام، تو درحقیقت ان کا تعلق توحید سے تھا۔

مدنی دور میں ہر طرح کی پیہم تشریعات اور قانون سازی کا کام انجام پذیر ہوا، اس دور کے متعلق اگر ہم کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہ تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ داعیانِ اصلاح نظریات تو وضع کرتے ہیں لیکن وہ اپنی زندگی میں ان نظریات کا ثمرہ نہیں دیکھ پاتے، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفیق اعلیٰ سے جا ملنے سے قبل احکام سازی کر کے انہیں اکثر معاملات میں عملی طور پر نافذ کر دکھایا، خواہ ان احکام کا تعلق خاندانی امور سے رہا ہو یا نظامِ حکومت سے، یا دیوانی معاملات جیسے بیع وشراء اور لین دین سے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حرف بحرف پورا ہوا:

"اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيْناً". (۱)

آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کرلیا۔

دوسرا دور: عہد صحابہ:

یہ زمانہ عہد نبوت کے بعد بکثرت پیش آنے والے نئے واقعات کے لحاظ سے امتیاز رکھتا ہے، اس لئے کہ اس دور میں کثرت سے فتوحات ہوئیں، اور مسلمانوں کو ان قوموں سے ملنے جلنے کا موقع ملا جن کے رسم ورواج سے عرب قطعاً ناواقف تھے، ان نئے واقعات کے تئیں خدائی احکام کی جانکاری ضروری ہوئی، اس لئے کہ ہم نے پچھلے صفحات میں کئی بار وضاحت کی ہے کہ کوئی واقعہ ایسا نہیں جس میں حکم شرعی موجود نہ ہو، یہ زمانہ اس لحاظ سے امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں ایسے صحابہ موجود تھے جن کی فقہا کی حیثیت سے شہرت تھی اور نئے مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، بعض صحابہؓ کثرت سے فتویٰ دینے والے تھے، لیکن ان کی تعداد صرف ۳۱ تھی، جن میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے، اگر ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ جمع کر دیئے جائیں تو ایک بڑا دفتر تیار ہو جائے، بعض صحابہؓ فتویٰ کے تعلق سے متوسط درجہ کے تھے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کے بعد کے صحابہؓ کی بہ نسبت ان سے فتاویٰ اس لئے بھی تھوڑے منقول ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہے، ۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی، نیز مرتدین اور مانعین زکوۃ کے فتنہ کی سرکوبی اور روم وفارس کی طرف لشکرکشی نے انہیں مشغول کئے رکھا، متوسطین صاحب افتا صحابہ میں حضرت عثمانؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ بھی ہیں، ان کے فتاویٰ اگر جمع کئے جائیں تو ایک یا دو جزء تیار ہو سکتے ہیں۔

بعض صحابہؓ ایسے ہیں جن سے ایک، دو یا تین مسئلوں میں فتویٰ منقول ہے، بعض صحابہؓ اپنے اجتہاد کے سلسلہ میں اسلامی تشریع کی روح پر اعتماد کرتے تھے بشرطیکہ نصوص اس کی تائید کرتی ہوں، حضرت عمرؓ اس طبقے کے امام سمجھے جاتے ہیں، ان کے بعد ان کے شاگرد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے، جب کہ بعض صحابہؓ جتہاد کے سلسلہ میں پابند الفاظ تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ۔

اس دور کے شروع میں یعنی حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں کتاب وسنت کے علاوہ ایک تیسرا مصدر بھی سامنے آیا، جو ان دونوں کے بعد والوں کے لئے اسلامی احکام کے سلسلہ میں بنیاد بنا، ہماری مراد "اجماع" ہے، ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی نئی صورت حال پیش آتی تو خلیفہ ان صحابہؓ کو بلا بھیجتے جو "تفقہ فی الدین" میں ممتاز تھے اور

(۱)　　سورۂ مائدہ/۳۔

ایسے حضرات ان کے درمیان معروف ومشہور اور گنے چنے تھے، جب وہ آجاتے تو خلیفہ ان کے سامنے مسئلہ رکھتا، پھر اگر وہ کسی رائے پر متفق ہوجاتے تو یہ اجماع کی حیثیت اختیار کر لیتا اور بعد والوں کے لئے اس سے انحراف ناجائز ہوتا تھا۔

اجماع کی حجیت اور اس کے امکان پر شک کرنے والے خواہ کتنا ہی شک کریں، لیکن وہ وقوع پذیر ہو چکا ہے اور اس کا انکار کسی طرح ممکن نہیں، جیسے ''دادی اگر تنہا ہو تو اسے چھٹے حصہ کا وارث'' بنانے اور اگر ''کئی دادیاں ہوں تو سدس (چھٹے حصہ) میں سبھوں کو شریک'' کرنے پر صحابہؓ کا اجماع، اور جیسے ''مسلمان مرد کی اہل کتاب عورت کے ساتھ شادی کی حلت'' کے باوجود ''اہل کتاب مرد کے ساتھ مسلمان عورت کی شادی کی حرمت'' پر ان کا اجماع، اور جیسے ''مصاحف میں قرآن کے جمع'' کرنے پر ان کا اجماع، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مذکورہ مسائل میں یہ صورت حال نہ تھی، اسی طرح دیگر وہ مسائل جن پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

لیکن شیخینؓ کے دور کے بعد اجماع کا دعویٰ محتاج دلیل ہوگا، اس لئے کہ صحابۂ مجتہدین دنیا کے مختلف گوشوں اور ملکوں میں پھیل گئے تھے، زیادہ سے زیادہ جو بات ایک فقیہ کہہ سکتا ہے وہ یہ کہ میں اس مسئلہ میں کسی اختلاف سے لاعلم ہوں۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کہنا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع کا انکار کیا ہے، صحیح نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ جو بات ان سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: اجماع کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا ہے، اس سے ان کی مراد شیخینؓ کے زمانہ کے بعد کا اجماع ہے۔

اس دور میں بھی قرآن پاک کے علاوہ کسی اور چیز کی تدوین زیر عمل نہیں آئی، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نئے مسائل میں صحابۂ کرامؓ کے فتاویٰ زبانی اور سینہ بسینہ نقل ہوئے، ہاں بعض صحابہؓ ذاتی یادداشت کے لئے ان میں سے بعض چیزیں لکھا کرتے تھے۔

صحابہؓ کے آخری دور میں، خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ فتنہ نے پوری قوت سے سر اٹھایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے اور وہ تفرقہ معرض وجود میں آیا جس کی آگ میں ہم مسلمان تاہنوز جل رہے ہیں، ان حالات میں بعض متعصبین نے حدیثیں گڑھنی اور ان کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کبار صحابہؓ تک پہونچانی شروع کیں، یہ متعصبین صحابہؓ میں سے نہیں تھے بلکہ یہ ان کے بعد کے طبقے کے نومسلم تھے۔

اس دور میں فقہ اسلامی، رومی یا فارسی قوانین سے متأثر نہیں ہوا اور اگر صحابہؓ نے ان سے کچھ انتظامی نظام اخذ کئے تو اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ متعین لائن سے ہٹ گئے ہوں، یعنی براہ راست، یا بذریعہ اجماع، یا قیاس، یا استصلاح، احکام کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل کی طرف لوٹانے سے، چنانچہ مسلمانوں نے مفتوحہ علاقوں میں رائج بہت سارے وہ رسوم کالعدم کردیئے جو شریعت کی تصریح اور اس کی روح کے خلاف تھے۔

تیسرا دور: دور تابعین:

یہ دور صغار صحابہؓ کے عہد کا تسلسل تھا، جن میں سے اکثر لوگ فتنہ کی جنگوں کو دیکھ چکے تھے، لیکن اس دور کو دو مکتبہ ہائے فکر کے وجود سے امتیاز حاصل ہے، ایک مکتب فکر کا تعلق حجاز سے تھا، اور دوسرا مکتب فکر عراق میں تھا، حجازی مکتب فکر کا اجتہاد کے سلسلہ میں دارومدار کتاب وسنت پر تھا اور رائے کا سہارا شاید ہی لیا جاتا تھا، اس لئے کہ حجاز گہوارۂ نبوت تھا جہاں محدثینؒ کی کثرت تھی، نیز یہ کہ وہیں مہاجرین وانصار پیدا ہوئے اور یہ بھی کہ راویوں کا سلسلہ ان کے یہاں دراز نہیں تھا، اس لئے کہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی روایت کرنے میں محض ایک راوی سے آگے نہیں بڑھتا تھا، اور یہ راوی بھی اکثر کوئی صحابی ہی ہوتا تھا، اور صحابی تمام کے تمام عادل اور ثقہ ہیں، اس مکتب فکر کے اولین سربراہ مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تھے، ان کے بعد ان کی جگہ سعید بن المسیبؒ اور دیگر تابعین نے لی، جب کہ مکہ مکرمہ میں ان کی سربراہی ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کی، ان کے بعد ان کے شاگردوں نے، جیسے ان کے غلام عکرمہؒ اور ابن جریج وغیرہؒ نے ان کی جانشینی کی۔

لیکن عراقی مکتب فکر رائے سے بہت سہارا لیا کرتا تھا، لیکن رائے کا سرچشمہ اصول پر مبنی قیاس ہوتا تھا، اور قیاس کسی ایسے مسئلہ کو جس میں نصِ شرعی موجود نہ ہو، کسی ایسے مسئلہ سے جوڑ دینا ہے جس میں نص شرعی موجود ہو، ان دونوں مسئلوں میں کسی علت جامعہ کی وجہ سے، جدید مسائل کو عراقی مکتب فکر والے شریعت کے عمومی قاعدوں کی طرف لوٹاتے اور ان کے معیار پر تولتے تھے، یہ لوگ روایت کے سلسلہ میں سخت اصولوں پر کاربند تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ عراق ان دنوں فتنوں کی آماجگاہ تھا، چنانچہ وہاں اسلام سے بیر رکھنے والے شعوبی (قومیت پرست لوگ) تھے جو اپنی مخفی اسلام دشمنی کا اظہار عربوں کے تئیں اپنی ناپسندیدگی کے عنوان سے کرتے تھے، وہاں وہ ملاحدہ بھی تھے جو پیہم شکوک وشبہات کو ہوا دیتے رہتے تھے، نیز ان میں وہ غالی قسم کے روافض تھے جو علیؓ کی محبت میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہیں خدا یا مانند خدا بنا ڈالا اور ان میں علیؓ اور شیعان علیؓ سے بیر رکھنے والے خوارج بھی تھے جو ان مسلمانوں کو مباح الدم سمجھتے تھے جو ان کے ہم مذہب نہ ہوں اور دیگر طرح طرح کے فرقے اور گروہ تھے، اسی لئے قابل اعتبار فقہا روایت میں تأمل اور اس کی چھان بین کرتے اور اس کے لئے ایسی شرطیں روبہ عمل لاتے تھے جن پر اہل حجاز کاربند نہیں تھے، چنانچہ اگر کسی صحابی یا تابعی کا عمل اس کی اپنی روایت کے خلاف ہوتا تو وہ اس بات کو روایت کے لئے باعث خلل سمجھتے تھے، اس لئے اس طرح کی روایت کو اس بات پر محمول کرتے تھے کہ وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ، کسی ایسے مسئلہ میں جس میں ابتلاء عام ہے، کسی ثقہ کی منفرد روایت کو بھی مخدوش گردانتے تھے اور ایسی روایت کو اس بات پر محمول کرتے تھے کہ یا تو یہ منسوخ ہے یا بلا ارادہ راوی سے غلطی ہوگئی ہے، غلطی والی بات اس لئے کہ وہ ثقات کو بالقصد جھوٹ سے موصوف

کرنے سے بچتے تھے، لیکن یہ رائے رکھتے تھے کہ ایک عادل کبھی بھول سکتا یا غلطی کرسکتا ہے۔

اسی لئے نئے مسائل کے سلسلہ میں اس مکتب فکر کے فقہا کا زیادہ تر اعتماد رائے سے کام لینے پر تھا، سوائے اس کے کہ ان مسائل کے سلسلہ میں ان کو کوئی ایسی حدیث مل جائے جس میں کوئی شک نہ ہو یا اس میں غلطی کا احتمال کمزور ہو۔

اس مکتب فکر کے سربراہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد ان کے تلامذہ نے ان کی قائم مقامی کی جن میں سب سے مشہور علقمہ نخعیؒ تھے، ان کے بعد ابراہیم نخعیؒ کا درجہ ہے، جن سے اس مکتب فکر کے ائمہ نے تربیت حاصل کی۔

حجاز کے مکتب فکر کا حدیث واثر والا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے وابستہ فقہا میں ایسے لوگ نہ پائے جاتے ہوں جنہوں نے اپنے بہت سارے اجتہادات میں رائے کا سہارا نہ لیا ہو، چنانچہ اسی دور میں حجاز والوں میں ربیعہؒ بن عبدالرحمٰن تھے جو ''ربیعۃ الرأی'' سے مشہور تھے اور جو امام مالکؒ کے استاذ تھے، اس کے برعکس عراق والوں میں ایسے علما موجود تھے جو رائے پر عمل کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، جیسے عامرؒ بن شراحیل جو ''الشعبی'' سے مشہور تھے۔

ہماری اس گفتگو میں ''مکتب'' سے مراد خاص قسم کی عمارت نہیں ہے جیسا کہ ہمارے عرف میں سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ مراد ہے جو تعلیم کے لئے خاص کی گئی ہو، بلکہ ''مکتب'' سے مراد خاص رجحان اور ممتاز روش کی پابندی ہے، ہر چند کہ (اس دور میں) علما کے جمع ہونے کی جگہ عموماً جامع مسجدیں ہوا کرتی تھیں، اور وہیں حلقہ ہائے تعلیم لگا کرتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اس دور کے علما اپنے گھروں میں اور چلتے پھرتے بھی فتوے دیا کرتے تھے۔

یہ جاننا بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ اس دور میں اکثر اہل علم موالی (غلام) تھے، چنانچہ مدینہ منورہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے غلام نافعؒ تھے، جب کہ مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے غلام عکرمہؒ، کوفہ میں بنی والبہ کے غلام سعیدؒ بن جبیر، بصرہ میں حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ، شام میں مکحولؒ بن عبداللہ جو اوزاعیؒ کے استاذ تھے، اور مصر میں اہل مصر کے امام لیثؒ بن سعد کے استاذ یزیدؒ بن ابی حبیب علم وفضل کے تخت نشین تھے اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے موالی علم وتقدس کے امام تھے۔

لیکن خالص النسب عربی لوگ بھی اس دور میں ہمہ تن مصروف علم ہوگئے تھے، جن میں سعید بن المسیبؒ، عامر شعبیؒ اور علقمہ بن قیس نخعیؒ قابل ذکر ہیں۔

بعض شہروں میں علم کے سلسلہ میں عرب آگے بڑھے ہوئے تھے، جیسے مدینہ اور کوفہ میں، جب کہ بعض دوسرے شہروں میں علم کا علَم موالی کے ہاتھ میں تھا، جیسے مکہ اور بصرہ میں اور شام ومصر میں، لیکن ان دونوں گروہوں کا آپس میں میل جول اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے بارے میں کمتری کے تصور یا شرم وعار کے کسی احساس کے بغیر افادہ و

استفادہ کا رشتہ استوار تھا، کیونکہ اسلام نے ان کے دلوں کو جاہلی عصبیت سے پاک کر دیا تھا۔لیکن اکثر اہل علم کا تعلق اس دور میں موالی سے تھا، اوراس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں:

(الف) عرب ان دنوں سیف بردار تھے اور لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے اس لئے کہ وہ اسلام کی کان تھے اور اس کے تئیں زیادہ غیرت مند تھے، اس بنا پر علم سیکھنے اور سکھانے کے لئے اپنے آپ کو فارغ نہ کر سکے، کہ مذکورہ بالا امور نے انہیں مشغول کرر کھا تھا۔

(ب) ان موالی کا نشو ونما ایسے ماحول میں ہوا تھا جس کی اپنی تہذیب وثقافت تھی ،جس دین کے وہ خوشی اور اپنی پسند سے حلقہ بگوش ہوئے ،انہوں نے اس کی مدد میں حصہ لینا چاہا اور چوں کہ وہ تلوار کے دھنی نہ تھے اس لئے انہوں نے قلم کے ذریعہ اس دین کی مدد ٹھانی۔

(ج) ان کے آقا یعنی صحابۂ کرامؓ نے ان کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی تا کہ وہ علم کی امانت ان سے لے کر دوسروں تک منتقل کرسکیں، چنانچہ نافعؒ مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ ہی کو لیجئے ،انہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کیا، نافعؒ نے ان سے اوران کے علاوہ صحابہؓ سے کسب فیض کیا، جیسے ابو ہریرہؓ اور اُم المؤمنین ام سلمہؓ عبداللہ بن عمرؓ نے ان کے سلسلہ میں فرمایا کہ ''خدانے نافعؒ کے ذریعہ مجھ پر احسان کیا''۔

عکرمہؒ عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے، ابن عباسؓ کی وفات کے وقت وہ غلام ہی تھے، چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے علیؒ نے انہیں خالد بن یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ چار ہزار دینار میں فروخت کر دیا تو عکرمہؒ نے علی سے کہا: تم نے اپنی امت کا علم چار ہزار میں فروخت کر دیا، (یہ سن کر علی کو غیرت آئی) اور انہوں نے خالد بن یزید سے معاملۂ بیع فسخ کر دینے کی درخواست کی، خالد نے درخواست منظور کر لی، اور علی نے عکرمہ کو فوراً ہی آزاد کر دیا۔

سید التابعین حضرت حسن بصریؒ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پروان چڑھے تھے، اسی سے ان کے علم وفضل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(د) یہ موالی حضرات اپنے آقا یعنی کبار صحابہؓ کے سفر وحضر میں ساتھ رہتے تھے، اس طرح وہ اپنے ان آقاؤں کے ظاہر وباطن کو خوب اچھی طرح جان جاتے اوران کے علم وفضل کو امت مسلمہ کی طرف منتقل کرتے تھے۔

یہ دور، قرآن پاک کے علاوہ کسی اور چیز کی عدم تدوین کے اعتبار سے فی الجملہ کبار صحابہؓ کے دور کا تسلسل سمجھا جاتا ہے، سوائے تھوڑی بہت حدیث کی کتابت کے جس کی طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا گیا، نیز اس دور کے کسی فقیہ کے متعلق یہ معلومات نہیں کہ اس نے مشہور شرعی مصادر سے علیحدہ کسی قانونی نظریہ پر اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہو، ورنہ شبہات کو ہوا دینے والوں سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ اس دور کے درپیش مسائل میں سے کسی ایک بھی ایسے مسئلہ کی

نشاندہی کر دیں جس کی کوئی شرعی اصل نہ ہو۔

رسم ورواج پر مبنی مسائل بھی شرعی معیار کے تابع ہوا کرتے ہیں، چنانچہ اگر اسلام کسی رواج کو منسوخ کر دے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی اور شریعت کی طرف سے اس کی منسوخی کے بعد اس پر کاربند ہونا گمراہی ہوگا، لیکن اسلام اس عرف کی حیثیت کو تسلیم کرے تو اس پر عمل جائز ہوگا، اس لیے نہیں کہ وہ ایک عرف ہے بلکہ اس لیے کہ اب اس کی بنیاد نص شرعی پر ہے اور اگر شریعت کسی عرف کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کرے تو اس پر عمل یا ترک عمل شرعی مصلحت کے تابع ہوگا۔

باوجودیکہ اس دور میں بڑے بڑے فتنے رونما ہوئے، لیکن ان کا دائرہ تقریباً خلافت کے معاملہ اور اس سے متعلق احکام تک محدود رہا۔

ہر چند کہ یہ دور عہد بنی امیہ کا ہم عصر تھا، اور خلفاء بنی امیہ اپنی سیاست وحکومت میں نرمی وسختی اور اعتدال کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، لیکن ہر ایک اس کا خیال رکھتا تھا کہ اس سے کفر صریح کا ارتکاب نہ ہو، ان میں سے کسی نے اگر اس طرح کا کوئی کام کیا تو اس کو نکیر کا سامنا کرنا پڑا، اس دور کے فقہا ایک دوسرے سے خط وکتابت اور مناظرہ کرتے تھے، ایک دوسرے کی رائے قبول کرتے تھے، اور حق کی پیروی کو ہر بات سے مقدم رکھتے تھے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے بھلا ہونے کی پیشین گوئی فرمادی تھی، چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے:

"خیرُ الناسِ قرنِی ثُمّ الّذِین یلُونَھُم ثُمّ الّذِین یلُونَھُم". (۱)

سب سے بہتر دور میرا دور ہے، پھر اس کے بعد والا، پھر اس کے بعد والا۔

اگر امت فی الجملہ راہ مستقیم پر گامزن ہو تو کسی شخص کا اس کے طور طریقہ سے انحراف یا اس کی صفوں سے خروج اس کے لئے کچھ مضرت رساں نہیں۔

چوتھا دور: دور صغار تابعین اور کبار تبع تابعین:

اس دور کی ابتدا تقریباً پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل سے ہو جاتی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا آغاز امام عادل عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور سے ہوتا ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحات میں کہا کہ ان ادوار کے مابین زمانی طور پر کوئی خط فاصل موجود نہیں ہے، یہ ایک دوسرے میں پیوست رہے ہیں اور خلف سلف سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

اس دور کا یہ امتیاز ہے کہ اس میں صحابہؓ وتابعینؒ کے فتاویٰ کے ساتھ ساتھ حدیث کی تدوین کا آغاز ہوا، یہ کام امیر

(۱) حدیث "خیر الناس قرنی..." کی روایت شیخینؒ نے کی ہے اور ان دونوں حضرات کے علاوہ بھی دیگر محدثینؒ نے اس کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کی ہے اور اس میں اضافہ ہے۔ (الفتح الکبیر فی ضم الزیادۃ الی الجامع الصغیر للسیوطی: ۹۹/۲، طبع مصطفیٰ الحلبی۔)

المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم پر شروع کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ان کو شرح صدر سے نوازا تھا، ان کو اندیشہ ہوا کہ مبادا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال ضائع ہوجائیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ طاق نسیاں کی نذر ہوجائیں، پھر یہ کہ وہ علت بھی ختم ہوچکی تھی جس کی وجہ سے قرآن کے غیر قرآن کے ساتھ خلط ملط ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے کہ قرآن پاک سینوں اور مصاحف میں محفوظ ہو چکا تھا اور ہزاروں انسان اسے زبانی یاد کر چکے تھے، اور کوئی ایسا مسلم گھرانہ نہ تھا جس میں قرآن پاک کا کوئی نسخہ نہ ہو، اس لئے اہل علم کو حکم ہوا کہ وہ ان احادیث اور صحابہؓ وتابعینؒ کے فتاویٰ کی تدوین کریں جو انہیں معلوم ہیں تاکہ وہ بعد والوں کے لئے مرجع بن سکیں اور بدلتے ہوئے اسلامی معاشرہ میں، جس میں پیہم ایسے نئے حالات پیش آرہے ہیں جن میں شرعی احکام کی ضرورت ہے، مسائل کے حل میں مجتہدین ان سے روشنی حاصل کرسکیں۔

اس سے بعض مستشرقین کے اس مسلک کی قلعی کھل جاتی ہے کہ حدیث کی تدوین کا مقصد فقہی آراء کے لئے وجہ جواز فراہم کرنا تھا، اس لئے کہ تاریخ شاہد ہے کہ فقہی آراء (فتاویٰ) اور حدیث کی تدوین ایک ہی عہد میں زیرِ عمل آئی، اور علمانے ان کی جمع وتدوین کے وقت روایت کی چھان پھٹک اور اس کی صحت وسقم کی طرف سے کامل اطمینان کے حصول کے لئے جو کوشش کی وہ دنیا کی کسی قوم نے نہ کی ہوگی۔

اس دور میں علما اپنے علمی رجحانات اور طریقوں کے تئیں اختصاص کی راہ پر چلنے لگے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض تدوین لغت کے ماہر تھے، تو کسی کا موضوع اس کے آداب اور تاریخ سے اشتغال تھا، اور کسی نے عقیدہ سے متعلق نظری مسائل کو اپنا موضوع بنایا، جیسے عقلی طور پر تحسین وتقبیح اور رویت باری تعالیٰ وغیرہ کے مسائل، لیکن اس دور میں فقہ سے اشتغال رکھنے والے ہی محدثین اور مفسرین قرآن شمار کئے جاتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ عربی زبان کے رموز و اسرار سے اتنا ضرور واقف ہوتے تھے کہ قرآن وحدیث سے استخراج مسائل کے سلسلہ میں وہ ان سے کام لے سکیں، اسی لئے اس دور میں فقہا کو ممتاز مقام حاصل تھا، امراء وحکام بھی ان کے مقام ومرتبہ کا بے پایاں لحاظ کرتے تھے، اور عوام الناس ان کی قدردانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے، اور سارے مسئلوں میں ان سے رجوع کرتے اور انہیں اس امت کا رہنما سمجھتے تھے، اس سے قطع نظر ملک میں ان کو جو سیاسی مرکزیت حاصل تھی اس کیلئے ہم مثال کے طور پر زہریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے استاذ حمادؒ بن سلمہ کا نام لے سکتے ہیں۔

اسی دور کے اواخر میں مختلف فقہی مذاہب رونما ہونا شروع ہوئے، اسی طرح اس مرحلہ میں تدوین وترتیب کے عمل کو فروغ حاصل ہوا، چنانچہ اس سے قبل تدوین کا عمل ملا جلا ہوا تھا لیکن اسی دور میں اس میں تنظیم اور باقاعدگی آئی، یہی دور اس دور پنجم کی تمہید تھا، جس میں ائمہ عظام پیدا ہوئے۔

پانچواں دور: دور اجتہاد:

اس دور کا آغاز اسلامی سلطنت میں جامع علمی ترقی کے آغاز کے ساتھ ہوا، یہ عہد بنی امیہ کے اواخر سے تقریباً چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک ممتد رہا، لیکن اس دور کی بھی ابتدا اور انتہا کی زمانی تعیین (جیسا کہ ہم نے بارہا عرض کیا) کسی مؤرخ کے لئے ممکن نہیں، اس دور میں بڑے بڑے ائمہ، مجتہد منتسب، مذاہب فقہیہ کے مجتہدین اور اہل ترجیح علما پیدا ہوئے، نیز اسی دور میں دقیق علمی طرز پر فقہی مذاہب کی تدوین کا کام ہوا۔

اس سے پہلے کہ ہم مجتہدین کے طبقات کو الگ الگ بیان کریں، ضروری ہے کہ ہم یہ بتاتے چلیں کہ اس دور میں ایک نیا علم معرض وجود میں آیا جس کا فقہ سے گہرا رشتہ ہے، یعنی علم اصول فقہ۔

علم اصول فقہ:

یہ علم دوسری صدی ہجری میں رونما ہوا، جمہور علما کی رائے ہے کہ اس کے پہلے مدوّن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، لیکن ابن ندیمؒ نے ''الفہرست'' میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس علم میں سب سے پہلے قلم اٹھانے والے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ ہیں، بہرصورت اس علم میں پہلی تصنیف جو ہم تک پہنچی ہے وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الرسالۃ'' ہے، اس علم میں کتاب وسنت یا قیاس سے شرعی احکام کے استخراج کے سلسلہ میں مجتہد کے لئے جن قواعد کی پابندی ضروری ہے انہیں بیان کیا گیا ہے، امام شافعیؒ نے اجتہاد کے بارے میں اپنے طریقۂ عمل کو بتانے کے لئے اسے تصنیف کیا تھا، کسی بھی علم یا زندہ وجود کی طرح جو آغاز آفرینش میں چھوٹا ہوتا ہے پھر بڑا ہوتا ہے، علم اصول فقہ بھی متعدد ادوار سے گذرا، بعد میں اس میں کچھ ایسے علوم ومباحث بھی شامل کر لئے گئے جنہیں علم اصول فقہ کے مصنفین نے اجتہاد کے عمل سے مربوط سمجھا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر خالص نظری مباحث بھی شامل کر لئے گئے۔ اس علم میں بھی مفصل اور مختصر تصنیفات ہوتی رہی ہیں۔(۱)

---

(۱) **تصنیفات اصول فقہ:** فروعی اور جزئی احکام کا استنباط جن اصول اور قواعد کی بنیاد پر کتاب اللہ وسنت رسول اور اجماع اور قیاس سے ہوتا ہے وہ اصول فقہ کا موضوع ہے، فقہ اسلامی کے ائمۂ مجتہدین نے استنباط احکام کے جو قواعد متعین کئے ہیں وہ ایسے میزان ہیں جن پر کسی استنباط کی صحت وخطا اور قوت وضعف کو پرکھا جاسکتا ہے، اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند اہم کتب کے اسماء ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱) الرسالة	أبو عبد الله محمد بن إدريس الشافعيؒ (م: ۲۰۴ھ)
۲) اختلاف الفقهاء	امام أبو جعفر الطحاویؒ (متوفی: ۳۲۱ھ)
۳) أصول الكرخی	امام كرخیؒ (متوفی: ۳۴۰ھ)
۴) أصول الفقه، الأصول فی الأصول	امام احمد بن علی الراضی الجصاصؒ (متوفی: ۳۷۰ھ) ==

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ علم اصول فقہ کی تدوین سے قبل اجتہاد کے عمل میں قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس کے برعکس مجتہدین عہد صحابہؓ سے اصول فقہ کی تدوین کے وقت تک پورے طور پر متعینہ قواعد کے پابند رہے ہیں اور اگر بعض قواعد کے سلسلہ میں ایک فقیہ کی رائے دوسرے فقیہ کی رائے سے مختلف رہی ہے تو اس اختلاف کا منشا حتی الامکان صحیح بات کی تلاش اور شرعی احکام کے سلسلہ میں خواہش نفس کی پیروی سے بالکلیہ اجتناب تھا، اور اگرچہ یہ قاعدے مدون نہ تھے لیکن بغیر تدوین کے ان پر عمل جاری تھا، اس کی مثال علم نحو سے دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ عرب فاعل کو رفع اور مفعول کو نصب دینے کی مکمل پابندی کرتے تھے بغیر اس کے کہ وہ ان علمی اصطلاحوں کی پابندی کریں جو تدوین علم نحو کے بعد سامنے آئیں۔

==

۵) أصول السرخسي	شمس الأئمه السرخسيؒ (متوفى: ۴۲۳ھ)
۶) مآخذ الشرائع	امام أبو المنصور محمد ابن محمد الماتريدى الحنفيؒ (م: ۳۳۳ھ)
۷) الأصول في الوصول	الإمام أبوبكر أحمد ابن على الجصاص الرازى الحنفيؒ (م: ۳۷۰ھ)
۸) التقريب والإرشاد	امام أبوبكر محمد بن طيب المالكيؒ (م: ۴۰۳ھ)
۹) العمد	قاضى عبد الجبار المعتزليؒ (م: ۴۱۵ھ)
۱۰) تقويم الأدلة	امام أبوزيد دبوسيؒ (متوفى: ۴۳۰ھ)
۱۱) المعتمد شرح العمد	علامه أبو الحسن محمد بن على المعتزليؒ (م: ۴۳۶ھ)
۱۲) اللمع	امام أبو إسحاق إبراهيم بن على الشافعيؒ (م: ۴۷۶ھ)
۱۳) البرهان	إمام الحرمين عبدالملك بن عبدالله الشافعيؒ (م: ۴۷۸ھ)
۱۴) كنز الوصول في معرفة الأصول	علامه بزدويؒ (متوفى: ۴۸۲ھ)
۱۵) القواطع	امام أبو المظفر منصور بن أحمد الشافعيؒ (م: ۴۸۹ھ)
۱۶) المستصفىٰ	حجة الإسلام أبو الحامد محمد بن محمد الغزاليؒ (م: ۵۰۵ھ)
۱۷) المفخول	حجةالاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزاليؒ (م: ۵۰۵ھ)
۱۸) تبصرة الأدلة	امام أبومعين ميمون بن محمد النسفيؒ (م: ۵۰۸ھ)
۱۹) الأصول	امام أبو القاسم عماد الدين حسين بن على الحنفيؒ (م: ۵۲۲ھ)
۲۰) ميزان الأصول في نتائج العقول	امام علاء الدين محمد بن أحمد الحنفيؒ (م: ۵۵۳ھ)
۲۱) المحصول	امام فخر الدين محمد بن عمر الشافعيؒ (م: ۶۰۶ھ)
۲۲) روضة الناظر وجنة المناظر	امام ابن قدامة الحنبليؒ (متوفى: ۶۲۰ھ)
۲۳) الإحكام في أصول الأحكام	امام سيف الدين الآمدى (متوفى: ۶۳۱ھ)
۲۴) المنتخب الحسامى	امام حسام الدين محمد بن محمد الحنفيؒ (م: ۶۴۴ھ)
۲۵) تنقيح الفصول في اختصار المحصول	امام قرافى مالكيؒ (متوفى: ۶۸۴ھ)
۲۶) منهاج الوصول إلىٰ علم الأصول	قاضى ناصر الدين عبد الله بن عمر البيضاويؒ (م: ۶۸۵ھ)
۲۷) بديع النظام	امام مظفر الدين أحمد بن على الحنفيؒ (م: ۶۹۴ھ)
۲۸) منار الأنوار	امام أبو البركات عبد الله بن أحمد الحنفيؒ (م: ۷۱۰ھ)

==

اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ علم اصول فقہ کی تدوین علم فقہ کے بعد ہوئی ہے، گویا کہ وجود کے اعتبار سے دونوں کی نشو ونما ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت سے ہوئی ہے۔

اسی دور میں فقہ تقدیری یعنی مسائل فرض کرکے ان کے احکام بیان کرنے کا طریقہ رونما ہوا، عراقی مکتب فکر میں اس فقہ کا رجحان امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے شاگردوں سے پہلے ہی نمایاں ہو چکا تھا، اگرچہ ان کے دور میں اور ان کے شاگردوں کے دور میں اس فقہ تقدیری سے اشتغال میں اضافہ ہوا، فقہ کی اس قسم کے بارے میں فقہا دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے:

کچھ لوگ تو اس کو ناپسند کرتے تھے کہ اس سے اشتغال غیر مفید ہے، اور بسا اوقات اس کی وجہ سے ایسی بحثیں کھڑی

==

كتاب	مصنف
۲۹) كشف الأسرار شرح كنز الوصول	امام عبدالعزيز البخاریؒ (متوفی: ۷۳۰ھ)
۳۰) تنقيح الأصول	امام صدر الشريعةؒ (متوفی: ۷۴۷ھ)
۳۱) مجمع الجوامع	علامہ تاج الدين عبد الوهاب الشافعیؒ (م: ۷۷۱ھ)
۳۲) نهاية السئول شرح منهاج الوصول	امام الأسنویؒ (متوفی: ۷۷۲ھ)
۳۳) التشنيف المسامع شرح جمع الجوامع	امام بدرالدين زركشیؒ (متوفی: ۷۹۴ھ)
۳۴) التحرير	علامہ ابن همام (متوفی: ۸۶۱ھ)
۳۵) مسلم الثبوت	علامہ محب اللّٰه البهاری الحنفیؒ (متوفی: ۱۱۱۹ھ)
۳۶) حصول المأمول من علم الأصول شرح إرشاد الفحول	نواب حسن خان مرحوم (متوفی: ۱۳۰۷ھ)
۳۷) العدة فی أصول الفقه	قاضی أبويعلٰی الحنبلیؒ (متوفیٰ: ۴۵۸ھ)
۳۸) الواضح فی الأصول	امام ابن عقيل البغدادی الحنبلیؒ
۳۹) عيون الأدلة فی مسائل الخلاف بين الفقهاء	امام ابن قصار البغدادی المالكیؒ
۴۰) البحر المحيط (اصولیین کے اقوال کے بارے میں)	امام بدرالدين زركشیؒ (متوفی: ۷۹۴ھ)
۴۱) فواتح الرحموت، شرح مسلم الثبوت	علامہ بحر العلومؒ
۴۲) إرشاد الفحول (تلخيص)	قاضی شوكانیؒ
۴۳) كشف الأسرار للنسفی مع شرح نور الأنوار	ملاجيونؒ
۴۴) منافع الدقائق فی شرح مجامع الحقائق	
۴۵) تحقيق المحصول	للإمام الرازیؒ
۴۶) المسودة فی أصول الفقه	لابن تيميةؒ
۴۷) التقريب	قاضی باقلانیؒ

ہو جاتی ہیں جو نزاع کا باعث بنتی ہیں، لیکن کچھ لوگ اس کی تائید کرتے اور کہتے تھے کہ ہم ہر واقعہ کے لئے پہلے سے حکم تلاش کر کے رکھتے ہیں تا کہ واقعہ کے رونما ہونے کے وقت متعلقہ حکم معلوم کرنے کے لئے ہمیں پریشان نہ ہونا پڑے، دونوں رایوں میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ دلیل اور وزن ہے، ہم اس جگہ دونوں رایوں کا موازنہ کرنا نہیں چاہتے، ہر چند کہ ہماری رائے ہے کہ فقہ کی اس قسم میں اتنا زیادہ مشغول ہونا کہ عادتاً ناممکن الوقوع مسائل کو فرض کیا جائے بلا ضرورت اور عبث کام ہے، اور خدا عبث کام میں مشغول ہونا پسند نہیں کرتا، البتہ ان ممکن الوقوع مسائل کو جو ابھی واقع نہیں ہوئے لیکن واقع ہو سکتے ہیں، فرض کرنے اور ان کے احکام کی تخریج کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ فقہ کی کتابوں میں ہمیں بہت سے ایسے مسائل بکھرے ہوئے ملتے ہیں جنہیں متقدمین ناممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اب وہ باقاعدہ رونما ہو چکے ہیں، جیسے جنس کی تبدیلی یعنی عورت کا مرد اور مرد کا عورت ہو جانا اور جیسے مصنوعی حمل اور مُردوں کے اعضا، زندوں کے اندر منتقل کر دینا، یا زندوں کے اعضا کی زندوں کو پیوند کاری، حقیقت یہ ہے کہ فقہ تقدیری نے ان جیسے مسائل میں بحث و تحقیق کا وہ دروازہ کھولا ہے جس میں قدم رکھنا ہمارے لئے فقہ تقدیری کے بغیر دشوار تھا، اس سلسلہ میں متقدمین فقہاء رحمہم اللہ نے ہمارے لئے صراط مستقیم پر چلنے کی راہ ہموار کی ہے۔

مجتہدین وفقہا کے طبقات:

اس پیراگراف میں ہم مجتہدین کے طبقات پر مختصراً روشنی ڈالیں گے، لیکن ہم تفصیل میں نہیں جائیں گے، کیونکہ اس موضوع کی تفصیلات فقہ اسلامی کی تاریخ اور فقہا کے طبقات پر تصنیف کردہ کتابوں میں موجود ہیں۔

علما نے مجتہدین کو مندرجہ ذیل طبقات میں تقسیم کیا ہے:

(الف) کبار مجتہدین: یہ وہ مجتہدین ہیں جو فقہی مذاہب کے بانی ہیں، اگرچہ ان میں سے بعض کے مذاہب باقی و مروج ہیں اور بعض کے مذاہب اب مٹ گئے ہیں، اجتہاد کیلئے اصول سازی اور استنباطِ احکام میں ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک خاص نہج ہے، جیسے ائمہ اربعہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ جو چار مشہور فقہی مذاہب کے بانیین ہیں، جن کی مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی غالب اکثریت پیروی کرتی ہے، ائمہ اربعہ کے ہم عصر دیگر ائمہ بھی تھے جو ان سے کم رتبہ نہ تھے جن کے مذاہب ختم ہو گئے اور اب ان کا وجود باقی نہیں رہا، جیسے شام میں امام اوزاعیؒ، مصر میں امام لیث بن سعدؒ اور عراق میں ابن ابی لیلیٰؒ اور ثوریؒ، ان کے علاوہ دیگر علمائے مجتہدین جن کے تذکرے سے علم الخلاف، تفاسیر اور شروح احادیث و آثار کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔(۱)

(ب) مجتہدین منتسبین: ان سے مراد مذکور الصدر ائمہ کے تلامذہ ہیں، جو قواعد واصول میں اپنے ائمہ سے

(ا) مجتہدین کرام:

نمبر شمار	اسماء	تصنیف	ولادت ہجری	وفات ہجری
۱	امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (امام اعظم)	کتاب الآثار	۸۰	۱۵۰
۲	امام مالک بن انسؒ (امام دار الہجرۃ)	موطأ	۹۳	۱۷۹
۳	امام محمد بن ادریس بن عباس شافعیؒ (مجتہد مطلق)	کتاب الام	۱۵۰	۲۰۴
۴	امام احمد بن حنبل شیبانی وائلیؒ (مجتہد مطلق)	مسند احمد	۱۶۴	۲۴۱
۵	امام ابو یوسف یعقوبؒ، (مجتہد منتسب)	کتاب الخراج	۱۱۳	۱۸۲
۶	امام محمد بن حسن شیبانیؒ، (مجتہد منتسب)	کتاب الاصل	۱۳۲	۱۸۹
۷	امام زفر بن الہذیلؒ، (مجتہد منتسب)		۱۱۰	۱۵۸
۸	امام حسن بن زیاد لولوئیؒ، (مجتہد منتسب)	کتاب الخراج		۲۰۴
۹	امام عبداللہ بن مبارکؒ (مجتہد منتسب)	کتاب الرقاق	۱۱۸	۱۸۱
۱۰	امام عبداللہ بن سفیان ثوریؒ (مجتہد مطلق)	الجامع الکبیر	۹۵	۱۶۱
۱۱	امام ابن راہویہ بن ابراہیمؒ (مجتہد مطلق)	کتاب السنن	۱۶۱	۲۳۸
۱۲	امام عبدالرحمٰن اوزاعیؒ شامی (مجتہد مطلق)	کتاب السنن	۸۸	۱۵۷
۱۳	امام لیث بن سعد مصریؒ (مجتہد مطلق)			۱۷۵
۱۴	امام داؤد ظاہریؒ (مجتہد مطلق)		۲۰۰	۲۷۰
۱۵	امام ابن جریر طبریؒ	تفسیر طبری	۲۲۴	۳۱۰

حنفی مجتہدین کرام:

نمبر شمار	اسماء	تصنیف	ولادت ہجری	وفات ہجری
۱	امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (امام اعظم)	کتاب الآثار	۸۰	۱۵۰
۲	امام ابو یوسف یعقوبؒ (مجتہد منتسب)	الآثار، مبسوط، امالی	۱۱۳	۱۸۲
۳	امام محمد بن حسن شیبانیؒ (مجتہد منتسب)	جامع صغیر، جامع کبیر	۱۳۲	۱۸۹
۴	امام زفر بن الہذیلؒ (مجتہد منتسب)		۱۱۰	۱۵۸
۵	امام حسن بن زیاد لولوئیؒ (مجتہد منتسب)	ادب القاضی، امالی		۲۰۴
۶	امام ابوجعفر احمد طحاویؒ	شرح معانی الآثار	۲۲۹	۳۲۱
۷	امام عبداللہ بن مبارکؒ مجتہد فی المذہب	کتاب الرقاق	۱۱۸	۱۸۱
۸	حاکم شہید محمد مروزیؒ مجتہد فی المذہب			۳۳۴
۹	امام ابوالحسن عبداللہ کرخیؒ //		۲۶۰	۳۴۰
۱۰	ابوبکر احمد جصاص رازیؒ //	احکام القرآن	۳۰۵	۳۷۰
۱۱	ابوالليث نصر بن محمد سمرقندیؒ //			۳۷۳
۱۲	ابوعبداللہ یوسف بن محمد جرجانیؒ //			۳۹۸
۱۳	شمس الائمۃ عبدالعزیز حلوانیؒ //	مبسوط		۴۱۸
۱۴	ابوالحسین احمد قدوریؒ //	مختصر القدوری	۳۶۲	۴۲۸
۱۵	قاضی ابوزید دبوسیؒ //	تاسیس النظر		۴۳۰
۱۶	ابوبکر خواہر زادہ بخاریؒ //			(انیس الرحمٰن قاسمی)

متفق ہیں، لیکن تفریع احکام میں بعض دفعہ ان سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کی آراء اسی مذہب کا جزء سمجھی جاتی ہیں جس کی طرف ان کا انتساب ہے، چاہے ان کی کوئی رائے ایسی بھی ہو جو صاحب مذہب امام سے منقول نہ ہو، جیسے امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں ابو یوسفؒ، محمدؒ اور زفرؒ، امام مالکؒ کے شاگردوں میں عبدالرحمٰنؒ بن قاسم اور ابنؒ وہب، امام شافعیؒ کے شاگردوں میں مزنیؒ، لیکن امام احمدؒ کے شاگرد صرف ان کی آراء اور ان کی احادیث کے ناقل تھے، ان میں سے کسی کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ کسی اصل یا فرع میں اپنے امام کی اس نے مخالفت کی ہے، ان کے شاگردوں میں ابوبکر اثرمؒ، ابوداؤد سجستانیؒ اور ابواسحاق حربیؒ ہیں۔

(ج) مجتہدین مذاہب: یہ وہ مجتہدین ہیں جو اپنے ائمہ کے ساتھ اصول یا فروع میں اختلاف نہیں کرتے، لیکن ان مسائل کی تخریج کرتے ہیں جن میں امام یا ان کے اصحاب سے کوئی رائے منقول نہیں، وہ اس استنباط احکام میں اپنے امام کے منہاج کی پابندی کرتے ہیں، البتہ عرف پر مبنی مسائل میں بسا اوقات اپنے امام کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں، وہ ان مسائل کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کے تئیں امام سے ان کا اختلاف دلیل و برہان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ عرف و زمانہ کا اختلاف ہے، اس لئے کہ اگر ان کے امام کو وہ صورت حال معلوم ہوتی جو ان کو اب معلوم ہوئی ہے تو وہ بھی وہی رائے قائم کرتے جو انہوں نے کی ہے، یہی وہ حضرات ہیں جن پر مذہب کی تحقیق اور قواعد مذہب کو ثابت و مستحکم کرنے اور مذہب کے متفرق مسائل کو یکجا کرنے میں اعتماد کیا جاتا ہے۔

(د) مجتہدین مرجحین: یہ وہ حضرات ہیں جن کی ذمہ داری روایات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینا ہے ان قواعد کی رعایت کرتے ہوئے جن کو متقدمین نے وضع کیا ہے، بعض علما نے (ج) اور (د) کے دونوں طبقوں کو ایک ہی طبقہ مانا ہے۔

(ھ) طبقہ مُستدلین: یہ لوگ نہ تو استنباطِ احکام کرتے ہیں، اور نہ ہی کسی قول کو کسی قول پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن اقوال کے لئے دلائل فراہم کرتے ہیں اور ان امور کی وضاحت کرتے ہیں جن پر اقوال کا مدار ہے، اور حکم کی ترجیح یا انسب بالعمل کی وضاحت کے بغیر دلائل کے درمیان موازنہ کرتے ہیں۔

اگر آپ دقت نظر سے کام لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس طبقہ کو سابقہ دونوں طبقوں سے کم اہمیت حاصل نہیں ہے، اس لئے یہ ناقابل فہم ہے کہ احکام کے لئے ان کے استدلال کا عمل ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دینے پر منتج نہ ہوتا ہو، اسی لئے بہتر یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ تینوں طبقے ایک دوسرے میں داخل ہیں۔

مجتہدین مذہب یا اہل ترجیح یا مستدلین کے تینوں طبقوں میں جن لوگوں کو شمار کیا جاتا ہے وہ مندرجہ ذیل علما ہیں:

حنفیہ میں: ابومنصور ماتریدیؒ، ابوالحسن کرخیؒ، جصاص رازیؒ، ابوزید دبوسیؒ، شمس الائمہ حلوائیؒ اور شمس الائمہ سرخسیؒ وغیرہ۔

مالکیہ میں: ابوسعید برادعیؒ، لخمیؒ، باجیؒ، ابن رشدؒ، مازریؒ، ابن حاجبؒ اور قرافیؒ۔

شافعیہ میں: ابوسعید اصطخریؒ، قفال کبیر شاشیؒ اور حجۃ الاسلام غزالیؒ۔

حنابلہ میں: ابوبکر خلّالؒ، ابوالقاسم خرقیؒ اور قاضی ابویعلیٰ کبیرؒ۔

مذکورہ حضرات کے احوال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقام ومرتبہ اور طبقات کی تعیین میں مؤرخین کا اختلاف ہے، لیکن ان کا اس پر اتفاق ہے کہ مسائل کی تحقیق واثبات میں ان کا کردار ناقابل انکار ہے، بلکہ ان مسائل کی بقا اور جڑیں مضبوط کرنے میں ان کا دوررس اثر رہا ہے۔

مقلدین: ان کا اجتہاد میں کوئی حصہ نہیں رہا، بلکہ ان کا کام نقل کی قوت ہے، ان کے دو طبقے ہیں: طبقۂ حفاظ اور محض متبعین کا طبقہ۔

(الف) طبقۂ حفاظ: یہ لوگ مذہب کے اکثر احکام وروایات سے واقف ہوتے ہیں، یہ نقل کے باب میں حجت ہیں، اجتہاد میں نہیں، پس وہ نقل روایت میں واضح ترین روایتوں کی نشان دہی میں اور باعتبار ترجیح قوی ترین روایت کو نقل کرنے میں حجت ہیں بغیر اس کے کہ اپنی طرف سے کوئی ترجیحی عمل کریں، ان کی شان میں ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''یہ لوگ اقوی، قوی، ضعیف اور ظاہر روایت، ظاہر مذہب اور نادر روایت کے درمیان فرق اور امتیاز کی قدرت رکھتے ہیں، جیسے قابل اعتبار متون کے مصنفین صاحب کنز، صاحب تنویر الابصار، صاحب وقایہ اور صاحب مجمع الانہر، ان حضرات کی شان یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں ردکردہ اقوال اور ضعیف روایات نقل نہیں کرتے، اس بنیاد پر ان کا کام روایتوں کے مابین ترجیح دینا نہیں بلکہ درجاتِ ترجیح کی شناخت اور مرجحین کے مدارج کے مطابق انہیں ترتیب دینا ہے، یہ طبقہ نقل ترجیح میں دورائے بھی رکھتا ہے، چنانچہ ان میں سے بعض علما ایک رائے کی دوسرے پر ترجیح نقل کرتے ہیں جب کہ دوسرے حضرات ان کے برعکس نقل کرتے ہیں اور مرجحین کے اقوال میں سے ان کو اختیار کرتے ہیں جو ترجیحی حیثیت سے قوی ترین ہوں اور اصول مذہب میں اعتماد میں بڑھ کر ہوں، یا ان اقوال کو اختیار کرتے ہیں جن کے قائلین کی تعداد زیادہ ہو یا اس قول کا قائل مذہب کے فقہا کے درمیان زیادہ قابل اعتماد ہو''۔

سابق علما کی طرح انہیں بھی فتویٰ دینے کا حق حاصل ہے، لیکن پہلے والوں کی بہ نسبت محدود دائرہ میں، ان کے سلسلہ میں ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف روایتوں میں راجح اور مرجوح کو جاننا اور ضعف وقوت کے اعتبار سے ان کی حیثیتوں کو پہچاننا ہی طالبانِ علم کی آخری آرزو ہوا کرتی ہے، اس لئے مفتی اور قاضی کے لئے ضروری ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر جواب دے اور اٹکل سے کام نہ لے، تاکہ خدا کی حرام کردہ باتوں کو حلال اور حلال کو حرام کرنے کے ذریعہ باری تعالیٰ پر بہتان سے بچ سکے“۔(۱)

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طبقہ کے علمی کام کا حاصل جمع وتصنیف ہے، اور صحت نقل کے اعتبار سے (نہ کہ قوت دلیل کے اعتبار سے) اقوال مذہب کی ترتیب ہے۔

(ب) متبعین: ان سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو مذہب سے متعلق ساری باتوں میں دوسروں کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ اجتہاد، آراء کے درمیان ترجیح، استدلال اور نقل کے سلسلہ میں ترجیح اور اس کی درستگی وغیرہ کی بابت وہ اپنے پیش روعلما کی پیروی کرتے ہیں، لہذا ان کا کام صرف ترجیح سے متعلق کتابوں کا سمجھنا ہے، اس لئے یہ ترجیح بین الروایات نہیں کر سکتے، اور ترجیح اور درجات ترجیح کی تمیز کے کسی باب میں ان کا علم مرجحین کے درجہ کا نہیں ہوا کرتا، ان کے متعلق ابن عابدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”یہ حضرات رطب ویابس میں فرق نہیں کر پاتے، اور نہ ہی دایاں بایاں کا امتیاز رکھتے ہیں، بلکہ شب میں لکڑی چننے والے کی طرح سب کچھ جمع کر لیتے ہیں، لہذا ان کی تقلید کرنے والے کی تباہی یقینی ہے۔

اخیر زمانوں میں اس طرح کے متبعین کی کثرت ہو چکی ہے، یہ لوگ کتابوں کی عبارتوں میں لگے رہتے ہیں، یہ کتابوں سے صرف معلومات حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کی دلیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ”اس سلسلہ میں ایک قول ہے“ چاہے اس قول کی کوئی قوی دلیل نہ ہو۔(۲)

اس جماعت کے دو مختلف اثرات سامنے آئے: ایک اچھا تھا جس کا تعلق قضا سے تھا اس لئے کہ قضا کا کام مذہب کے راجح قول ہی پر صحیح ہوتا ہے اور ان لوگوں کا کام ہی راجح مذہب کی پیروی ہے، اس طرح بغیر کسی افراط کے قضا کا کام منضبط ہو جاتا ہے، اور جس زمانہ میں افکار میں انحراف پیدا ہو جائے اس میں قضا کے کام کو مقید کرنا اور اس کے دائرۂ عمل کی تحدید ضروری ہوتی ہے، بلکہ صرف قضا کے احکام کی پیروی ہی بہتر ہوتی ہے۔

لیکن اس کا دوسرا اثر یہ مرتب ہوا کہ اس طرز عمل سے فقہائے متقدمین کے اقوال کو مقدس سمجھا جانے لگا، اور دلیل کی قوت کا لحاظ کئے بغیر اور اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ کتاب وسنت سے ان کے اقوال کس حد تک مربوط ہیں اور وہ اقوال کس حد تک قابل تنفیذ ہیں، خود ان کے اقوال کو حجت کا درجہ دیدیا گیا، اور معاملہ گڈمڈ ہو گیا، اس صورت حال نے

---

(۱) الفتاویٰ الخیریۃ: ۲/۳۳، طبع الامیریہ۔

(۲) رسم المفتی لابن عابدینؒ، قدرے تغیر کے ساتھ۔

ان لوگوں میں اپنا اثر دکھایا جو اپنے اعمال کے لئے وجہ جواز کی تلاش میں رہا کرتے ہیں، اور ریاکار و چاپلوس قسم کے لوگ اقوال شاذہ سے استشہاد کرکے اصحاب اثر و اقتدار لوگوں کے غلط اعمال کو جائز ٹھہرانے میں تیزی دکھانے لگے، ان کے لئے بس اتنا کافی ہوتا ہے کہ بعض علما نے ان کی رائے وعمل کو جائز قرار دیا ہے، خواہ اس قول کا (جس کو انہوں نے بطور دلیل اختیار کیا ہے) قائل کوئی بھی ہو، اس کی دلیل چاہے جیسی بھی ہو، بلکہ جس مذہب کی کتابوں میں یہ قول مدوّن ہے اس کے نزدیک اس کی صحت نقل وقوت جیسی بھی ہو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی، پھر ہوتا یہ ہے کہ مذکورہ چاپلوس قسم کے لوگ کثرت علم کے اظہار اور اس پر فخر کے لئے ایسے شاذ اقوال کو مجلسوں میں خوب پھیلاتے ہیں، یہ صورت حال ان لوگوں کیلئے، اور ان کی تقلید کرنے والوں کے لئے، اور دین کے سلسلہ میں ان کی بات کو دلیل کے طور پر قبول کرنے والوں، اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں، سب ہی کے لئے باعث بربادی ہے۔(۱)

مختلف ادوار اجتہاد میں، خواہ اجتہاد مطلق ہو یا مقید، بلکہ مختلف ادوار تقلید میں بھی فقہ سے شغل رکھنے والا کوئی ایسا آدمی ہمیں نہیں ملتا جس نے کسی حکم شرعی کے استنباط کے سلسلہ میں ادلۂ شرعیہ کے علاوہ کسی اور دلیل کا سہارا لیا ہو، ان میں سے کسی نے رومی قانون (Roman Law) یا دیگر قوانین سے جو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کردہ ممالک میں رائج تھے، استفادہ کی کوئی کوشش نہیں کی۔

جو لوگ یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ استنباط احکام میں ہمارے فقہا نے رومی قانون کا سہارا لیا تھا، انہیں چاہئے کہ ہمیں کوئی ایک حکم ایسا بتادیں جس کے سلسلہ میں انہوں نے رومی قانون یا دیگر کسی قانون سے کسب فیض کیا ہو، کوئی حکم رومی قانون کے اشارات سے اگر کچھ مطابقت رکھتا بھی ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اسی سے مستنبط ہے، بلکہ وہ حکم ان احکام میں سے ہے جن پر تمام فطرت ہائے سلیمہ متفق ہیں اور ان مسائل میں سے ہے جو زمانوں کے اختلاف سے مختلف نہیں ہوتے، اس طرح کے احکام اگر اسلامی فقہ میں موجود ہوں تو ان پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر ہے۔

مذاہب فقہیہ کی بقا اور ان کا پھیلاؤ:

گذشتہ سطروں میں یہ بات ہمیں معلوم ہوچکی ہے کہ کچھ فقہی مذاہب ایسے تھے جو اب مٹ گئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ باقی رہے بلکہ وہ ترقی بھی کرتے رہے، بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ ان کی بقا و ترقی کی وجہ اقتدار و حکومت کی طاقت تھی۔

لیکن یہ بات علی العموم قابل قبول نہیں، ہوسکتا ہے کہ باقی ماندہ مذاہب کے بقا اور پھیلاؤ میں حکومت و اقتدار کا کچھ دخل ہو، لیکن یقیناً یہ دخل معمولی رہا ہوگا، اس لئے کہ سلطنت عباسی میں جس کے زیر نگیں تمام اسلامی علاقے تھے، قضا

(۱) موسوعۃ الفقہ الاسلامی: ۶۲/۱-۶۶، قدرے تغیر کے ساتھ، شائع کردہ جمعیۃ الدراسات الاسلامیۃ، زیر نگرانی شیخ محمد ابوزہرہ مرحوم۔

حنفی فقہا کے ہاتھ میں رہی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب حنفی کے ماننے والے شمالی افریقہ اور مصر میں بہت تھوڑے رہے، بلکہ ان دنوں بلاد فارس کی غالب اکثریت کا مذہب بھی شافعی تھا اور اس وقت مذہب حنفی کا دائرۂ اثر عراق، ماوراء النہر کے علاقوں اور بلاد فارس کے کچھ حصوں تک محدود تھا، نیز خلافت عثمانیہ کا اقتدار اکثر اسلامی ممالک پر قائم رہا، اس کا سرکاری مذہب حنفی مسلک تھا، عثمانی قلمرو کے تمام علاقوں میں قضا کا کام حنفی علما کے سپرد رہا، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تیونس کے دار السلطنت کے بعض ان خاندانوں کو چھوڑ کر جو دراصل ترکی نژاد ہیں، سارے شمالی افریقہ میں لوگ مالکی مذہب پر عمل پیرا ہیں، یہی حال مصر کا ہے، وہاں اکثر لوگ شافعی المذہب ہیں اور صعید مصر اور صوبۂ بحیرہ کے علاقوں میں مالکی المسلک ہیں، جب کہ حنفی مذہب کے ماننے والے بہت تھوڑے وہ لوگ ہیں جو یا تو ترک یا چرکسی نژاد ہیں یا منصب قضا کے حصول کی خاطر انہوں نے حنفی مذہب اختیار کر لیا تھا، ہر چند کہ جامعہ ازہر میں تعلیمی حلقے اس مسلک کے طلبہ سے بھرے رہے لیکن مصر کے عام باشندے یا تو شافعی ہیں یا مالکی، لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص مسلک کو مسلط کرنے میں حکومت واقتدار کا دخل رہا؟

یہی بات جزیرہ نمائے عرب اور خلیجی علاقوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، یہ سارے ممالک خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں رہے، اس کے باوجود وہاں کے باشندوں کا مسلک مالکی ہے یا حنبلی اور کچھ لوگ شافعی بھی ہیں اور بہت تھوڑے لوگوں کے استثناء کے ساتھ حنفی مذہب کا ان ممالک میں کوئی وجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مسلک کی بقا اور پھیلاؤ کا اولین دار ومدار صاحب مذہب کے ساتھ لوگوں کے اعتماد وتیقن پر ہے، نیز صاحب مذہب کے شاگردوں کی قوت تاثیر اور مذہب کے پھیلانے اور اس کے مسائل کی تحقیق میں اور مسائل کو خوبصورت طور پر پیش کر کے ذہن وفکر کے قریب کر دینے کے لئے جہد مسلسل پر ہے۔

تقلید:

دین کے کسی معاملہ میں کسی عالم کی تقلید کرنے والوں کو بعض لوگ بہت زیادہ مجروح کرتے رہتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو مقلدین کو مشرکین سے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ بھی ان ہی کی طرح یہ کہتے ہیں:

''إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ''. (سورۂ زخرف/۲۲)

ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہیں کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ دین کے بنیادی مسائل وعقائد جو بدیہی طور پر معلوم ہیں، ان میں کسی عالم کی تقلید کی کوئی گنجائش نہیں ہے خواہ اس کا مقام ومرتبہ کچھ ہی ہو، بلکہ صاحب شریعت کی طرف سے ان کے ثبوت کے تعلق سے مکمل اطمینان

خواہ اجمالی ہی اطمینان ہو، حاصل کر لینا ضروری ہے، البتہ وہ فروعی مسائل جن کے سلسلہ میں ادلۂ تفصیلیہ پر غور وخوض ضروری ہے، عوام کو ان دلائل پر غور وخوض کا مکلّف کرنا اس درجہ دشوار ہوگا کہ زندگی استوار نہیں رہ سکے گی، کیونکہ اگر ہم نے ہر مسلمان کو اس کا مکلّف کر دیا کہ وہ ہر مسئلہ پر مجتہد کی طرح غور وخوض کر لیا کرے تو صنعتیں معطل ہو جائیں گی اور لوگوں کے مفادات ضائع ہو جائیں گے، اس سلسلہ میں دراز کلامی سے بچتے ہوئے یہ کہنا کافی ہے کہ صحابۂ کرامؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے مطابق خیر القرون سے تعلق رکھتے تھے، سب کے سب مجتہد نہیں تھے بلکہ ان میں بھی مجتہدین کی تعداد بہت تھوڑی تھی، اور کثرت سے فتاویٰ دینے اور مسائل سے اشتغال رکھنے والے حضرات صحابہ بھی تیرہ سے زیادہ نہ تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے لوگوں میں سے بعض غلو کرنے والے یہ بات بھی کہہ ڈالتے ہیں کہ کسی آدمی کے مجتہد ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کے پاس قرآن پاک کا کوئی نسخہ، سنن ابی داؤد اور لغت کی کوئی کتاب موجود ہو، اگر اس کے پاس یہ مذکورہ تینوں چیزیں فراہم ہوں تو وہ اجتہاد کر سکتا ہے اور اس کو کسی امام کی تقلید کی ضرورت نہیں، اگر اس فریق کی یہ بات مان لی جائے کہ سنن ابی داؤد، لغت کی کوئی کتاب اور قرآن پاک کے ذریعہ ایک آدمی اجتہاد کر سکتا ہے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے صحابہ مجتہد ہوتے، اس لئے کہ وہ یا تو خالص عرب تھے، یا خالص عربی فضا میں پلے ہوئے تھے، نیز انہوں نے قرآن پاک کے نزول کا زمانہ پایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب تھے، لہذا ان لوگوں کا یہ دعویٰ واقعات کی روشنی میں بالکل ہی غلط ہے، اور یہ کہنا کہ ظنی امور میں ائمہ کی تقلید شرک ہے اور ائمہ کو خدا کا درجہ دے دینا ہے، بے بنیاد بات ہے، اس لئے کہ پڑھے لکھے کی بات تو جانے دیجئے، کوئی ناخواندہ بھی ایسا نہیں جو یہ سمجھتا ہو کہ ائمہ کو تحلیل وتحریم کا وہ حق حاصل ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو حاصل ہے، بلکہ ائمہ کے سلسلہ میں ان کے اعتقاد کا خلاصہ یہ ہے کہ مثلاً یہ امام یا وہ امام اپنے علم اور دین کے اعتبار سے قابل اعتماد اور اللہ کے دین کے سلسلہ میں دیانت دار ہیں، قابل تہمت نہیں ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ جو آج کل دعوائے اجتہاد کرتے اور اس کی دعوت دیتے رہتے ہیں، قرآن پاک کی کسی ایک آیت کو قرآن کریم سے دیکھ کر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے، چہ جائے کہ وہ اس سے کوئی شرعی حکم نکال سکیں، کم سے کم جو بات مجتہد میں ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی گہری واقفیت رکھتا ہو، ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتا ہو اور عام وخاص ومطلق ومقید سے واقف ہو، اور اس کے علاوہ ان دیگر باتوں سے بھی جن کے لئے خاص قسم کی تیاری ضروری ہوتی ہے جو صرف ان تھوڑے

لوگوں کو میسر آسکتی ہے جنہوں نے اس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہو۔(۱) ☆

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ اردو:۱/۵۵تا۲۷۔

☆ فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں:

فقہ حنفی کے مسائل کی اجتماعی تدوین کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے مختلف اصحاب جیسے امام محمدؒ امام ابو یوسفؒ وغیرہ نے متعدد کتابیں لکھیں، فقہی مسائل کے موضوع پر خود امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہے البتہ حدیث میں ان کی مسند اور علم کلام میں ایک کتاب محفوظ ہے۔امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے جو کتابیں تصنیف کیں اور ان سے معتمد ذریعہ سے وہ کتابیں نقل ہوئیں وہی کتابیں فقہ حنفی کی اہم مصادر و مراجع ہیں، امام محمدؒ کی یہ کتابیں تین قسم کی ہیں، پہلی چھ کتابیں ظاہر الروایہ کے نام سے موسوم ہیں جو اعتماد اور ترجیح کے اعتبار سے اول حیثیت رکھتی ہیں، یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱) **الجامع الصغير .**

۲) **الجامع الكبير .**

۳) **زيادات (تكملة الجامع الكبير).**

۴) **المبسوط** (یہ کتاب **الأصل** کے نام سے بھی معروف ہے)۔

۵) **السير الصغير .**

۶) **السير الكبير .**

ان کتابوں میں مسائل، احادیث، آثار اور قیاس کے مستدلات ہیں۔امام محمدؒ کی ان چھ کتابوں کے مسائل کو، مکررات کے حذف کرنے کے بعد حاکم شہید (امام محمد بن احمد مروزیؒ) نے **الكافي** کے نام سے مرتب کیا، جس کی مفصل شرح امام سرخسیؒ نے **المبسوط** کے نام سے کی ہے۔

ان چھ کتابوں کے علاوہ امام محمدؒ کی دیگر چند کتابیں ہیں جو نوادر کے نام سے معروف ہیں مگر ان کا درجہ نقل روایت میں مذکورہ کتابوں سے کم تر ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) ہارونیات۔(۲) کیسانیات۔(۳) رقیات۔ان کے علاوہ امام حسن بن زیادؒ کی تالیف **كتاب المجرد**، امام یوسفؒ کی **كتاب الأمالي** اور **كتاب العشر والخراج** وغیرہ ہیں۔

(الف) فقہ حنفی میں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ معروف ومتداول اور مسائل کے اعتبار سے مستند ہیں۔جیسے:

۱) **مختصر القدوری**	**أبو الحسين أحمد بن محمد القدوريؒ** (م:۴۲۸ھ)
۲) **بدائع الصنائع**	**علامه علاء الدين الكاسانيؒ** (م:۵۸۷ھ)
۳) **فتاویٰ قاضی خاں**	**إمام فخر الدين أوزجنديؒ** (م:۵۹۲ھ)
۴) **الهداية**	**أبو الحسن على المرغينانيؒ** (م:۵۹۳ھ)
۵) **المختار فی فروع الحنفية**	**أبو الفضل مجد الدين الموصليؒ** (م:۶۸۳ھ)
۶) **كنز الدقائق**	**أبو البركات حافظ الدين عبد الله النسفيؒ** (م:۷۱۰ھ)
۷) **نقاية**	**صدر الشريعة عبيد الله بن مسعودؒ** (م:۷۴۷ھ)
۸) **وقاية الرواية**	**برهان الشريعة محمود أحمدؒ** (م:۶۷۳ھ)
۹) **ملتقى الأبحر**	**علامه إبراهيم بن محمد الحربيؒ** (م:۹۵۶ھ)

(ب) درج ذیل کتابیں بھی اسی زمرہ میں رکھے جانے کے لائق ہیں:

۱) **المجرد**	**امام حسن بن زياد اللولوئیؒ** (م:۲۰۴ھ)
۲) **أحكام الأوقاف**	**امام أبوبكر أحمد بن عمر الخصافؒ** (م:۲۶۱ھ)
۳) **آداب القضاء**	**امام أبوبكر أحمد بن عمر الخصافؒ** (م:۲۶۱ھ)

==

==

۳) مختصر الطحاوی	إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاویؒ	(م: ۳۲۱ھ)
۴) اختلاف الفقهاء	امام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوی	(م: ۳۲۱ھ)
۵) مختصر الکرخی	أبو الحسن عبید اللّٰه بن الحسین الکرخیؒ	(م: ۳۴۰ھ)
۶) الکافی	محمد بن محمد الحاکم الشهید البلخیؒ	(م: ۳۴۴ھ)
۷) المنتقیٰ	محمد بن محمد الحاکم الشهید البلخیؒ	(م: ۳۴۴ھ)
۸) عیون المسائل	امام أبو لیث نصر بن محمد السمرقندیؒ	(م: ۳۷۳ھ)
۹) الأجناس	امام أبو العباس أحمد بن محمد الناطفیؒ	(م: ۴۴۶ھ)
۱۰) المبسوط	محمد بن حسین البخاریؒ (خواهر زاده)	(م: ۴۸۳ھ)
۱۱) المبسوط	شمس الأئمة أبو بکر بن محمد السرخسیؒ	(م: ۴۹۰ھ)
۱۲) شرح الطحاوی	علی بن محمد شیخ الإسلام الإسبیجابیؒ	(م: ۵۳۵ھ)
۱۳) خلاصة الفتاوی	طاهر بن أحمد بن عبد الرشید البخاریؒ	(م: ۵۴۲ھ)
۱۴) المحیط البرهانی	امام برهان الدین محمودؒ	
۱۵) المحیط السرخسی	محمد بن محمد رضی الدین السرخسیؒ	
۱۶) تحفة الفقهاء	علامه علاء الدین محمد السمرقندیؒ	(م: ۵۷۵ھ)
۱۷) مختارات النوازل	امام علی بن أبو بکر المرغینانیؒ	(م: ۵۹۳ھ)
۱۸) الفتاویٰ الظهیریة	امام ظهیر الدین محمد بن أحمد البخاریؒ	(م: ۶۱۹ھ)
۱۹) مجمع البحرین وملتقی النهرین	علامه مظفر الدین ابن ساعاتیؒ	(م: ۶۹۴ھ)
۲۰) شرح الوقایة	صدر الشریعة عبید اللّٰه بن مسعود المحبوبیؒ	(م: ۷۴۷ھ)
۲۱) الجوهرة النیرة	أبو بکر الحدادیؒ	(م: ۸۰۰ھ)
۲۲) الجامع الوجیز (فتاویٰ بزازیه)	علامه ابن بزاز الکردری	(م: ۸۲۷ھ)
۲۳) معین الحکام	علامه أبو الحسن علی بن خلیل الطرابلسیؒ	(م: ۸۴۴ھ)
۲۴) النهایة	علامه أبو محمد محمود العینیؒ	(م: ۸۵۵ھ)
۲۵) فتح القدیر	علامه کمال بن همامؒ	(م: ۸۶۸ھ)
۲۶) البحر الرائق	ابن نجیم زین العابدین بن إبراهیم المصریؒ	(م: ۹۷۰ھ)
۲۷) النهر الفائق شرح کنز الدقائق	علامه عمر بن نجیم المصریؒ	(م: ۱۰۰۵ھ)
۲۸) نور الإیضاح و شرحه مراقی الفلاح	علامه أبو الإخلاص حسن بن عمار الشرنبلالیؒ	(م: ۱۰۶۹ھ)
۲۹) الدر المختار	علامه محمد بن علی علاء الدین الحصکفیؒ	(م: ۱۰۸۸ھ)
۳۰) الدر المنتقیٰ (سکب الأنهر)	علامه محمد بن علی علاء الدین الحصکفیؒ	(م: ۱۰۸۸ھ)
۳۱) حاشیة الدر المختار	علامه السید أحمد بن محمد الطحطاویؒ	(م: ۱۲۲۱ھ)

==

==

۳۲) ردالمحتار حاشیة الدر المختار	علامه محمد أمین بن عابدین الشامیؒ	(م:۱۲۵۲ھ)
۳۳) منحة الخالق حاشیة البحر الرائق	علامه محمد أمین بن عابدین الشامیؒ	(م:۱۲۵۲ھ)
۳۴) السعایة شرح شرح الوقایة	علامه أبوالحسن محمد عبد الحی اللکنویؒ	(م:۱۳۰۴ھ)
۳۵) الفتاویٰ الهندیة (عالمگیریة)	شیخ نظام وجماعة من أعلام فقهاء الهند	

(ج) بعض کتابیں متأخرین کی مرتب کی ہوئی ہیں، اور اہل علم کے یہاں معتبر مرجع کے لحاظ سے ان کا ذکر نہیں ملتا، لیکن ان کتابوں میں مشائخ کے اقوال کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر ان کتابوں میں آنے والے اقوال وترجیحات سے متعارض کوئی قول متقدمین کے یہاں نہیں ملتا ہو انہیں قبول کیا جانا چاہئے، ----اور یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱) قنیة	نجم الدین مختار زاهدی المعتزلیؒ	(م:٦٥٦ھ)
۲) الحاوی	نجم الدین مختار زاهدی المعتزلیؒ	(م:٦٥٦ھ)
۳) المجتبیٰ شرح القدوری	نجم الدین مختار زاهدی المعتزلیؒ	(م:٦٥٦ھ)
۴) السراج الوهاج	أبوبکر الحدادیؒ	(م:۸۰۰ھ)
۵) غرر الأحکام	ملاخسروؒ	(م:۸۸۵ھ)
٦) تنویر الأبصار	العلامة التمرتاشیؒ	
۷) جامع الرموز	العلامة شمس الدین القهستانیؒ	
۸) فتاویٰ إبراهیم شاهی	العلامة شهاب الدین دولت آبادیؒ	
۹) فتاویٰ زینیة	العلامة ابن نجیم المصریؒ	
۱۰) خزانة الروایات	قاضی جگن گجراتیؒ	
۱۱) شرعة الإسلام	محمد بن أبوبکر الجواعنیؒ	
۱۲) خلاصة	العلامة لطف الله النسفیؒ	

(د) اسی طرح فقہ شافعی میں مندرجہ ذیل کتابیں بنیادی حیثیت کی ہیں:

۱) کتاب الأم	الإمام محمد الشافعیؒ رحمه الله	(م:۲۰۴ھ)
۲) المهذب	شیخ أبوإسحاق إبراهیم بن علی بن یوسف الشیرازیؒ	(م:٤٧٦ھ)
۳) الوجیز	شیخ أبوحامد محمد بن محمد الغزالیؒ	(م:۵۰۵ھ)
۴) المجموع شرح المهذب	أبوزکریا محی الدین یحیٰ بن شرف النوویؒ	(م:٦٧٦ھ)
۵) منهاج الطالبین	أبوزکریا محی الدین یحیٰ بن شرف النوویؒ	(م:٦٧٦ھ)
٦) تحفة المحتاج علی شرح المنهاج	أبوالعباس أحمد بن حجر الهیثمیؒ	(م:۹۷۴ھ)
۷) مغنی المحتاج إلی شرح المنهاج	شمس الدین محمد بن محمد الشربینیؒ	(م:۹۷۷ھ)
۸) نهایة المحتاج إلی شرح المنهاج	شمس الدین محمد بن أبوالعباس الرملیؒ	(م:۱۰۰۴ھ)

۹) حاشیة القلیوبیؒ والعمیرةؒ علی شرح جلال الدین المحلیؒ علی منهاج الطالبین ==

افتا و استفتا

(۱)فتویٰ کا مادہ ''ف'' ''ت'' ''ی'' ہے،فتویٰ اور فُتیا، اِفتاء سے ماخوذ ہے، اِفتاء کے معنی کسی امر کو واضح کرنے کے ہیں،''أفتاه في الأمر ، أبانه له ''.(۲) فُتیا،تو''ف'' کے پیش کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے،لیکن

==

(ہ) اسی طرح فقہ حنبلی کی مشہور ومروج چند کتابیں بنیادی حیثیت کی ہیں :

۱) مختصر الخرقی	أبو القاسم عمربن حسين الخرقیؒ	(م:۳۳۴ھ)
۲) المغنی	أبومحمد عبد اللّٰه بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسیؒ	(م:۶۲۰ھ)
۳) المحرر فی الفقه	مجد الدين أبو البركاتؒ	(م:۶۵۲ھ)
۴) الشرح الكبيرعلىٰ متن المقنع	شمس الدين المقدسیؒ	(م:۶۸۲ھ)
۵) الفروع	محمد بن مفلح المقدسیؒ	(م:۷۶۲ھ)
۶) مجموع فتاویٰ ابن تيمية	أبو العباس تقی الدين أحمد بن عبدالحليم ابن تيميةؒ	(م:۸۲۸ھ)
۷) الإقناع	شرف الدين أبوالنجا موسیٰ بن أحمد المقدسیؒ	(م:۹۶۰ھ)
۸) كشاف القناع عن متن الإقناع	منصوربن يونس البهوتیؒ	

(و) اسی طرح فقہ مالکی کی چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں :

۱) المدونة	إمام دارالهجرة مالک بن أنسؒ	(م:۱۷۹ھ)
۲) المنتقیٰ	أبوالوليد سليمان بن خلف الباجیؒ	(م:۴۹۴ھ)
۳) المقدمات الممهدات	أبوالوليد محمد بن أحمد بن رشدؒ	(م:۵۲۰ھ)
۴) مختصرالعلامة خليل	العلامة خليل بن إسحاق بن موسیٰ	(م:۵۹۴ھ)
۵) بداية المجتهد ونهاية المقتصد	أبوالوليد محمد بن أحمد بن محمدبن أحمدبن رشد القرطبیؒ	(م۵۹۵ھ)
۶) القوانين الفقهية	أبو القاسم محمد بن أحمد بن الجزیؒ	(م:۱۴۷ھ)
۷) مواهب الجليل شرح مختصرخليل	محمد بن عبد الرحمن الخطابؒ	(م:۶۷۷ھ)
۸) شرح الزرقانی علیٰ مختصرخليل	عبد الباقی بن يوسف بن أحمد الزرقانیؒ	(م:۱۰۹۹ھ)
۹) شرح الخرشی علیٰ مختصرخليل	أبوعبد اللّٰه محمد بن عبد اللّٰه الخرشیؒ	(م:۱۱۰۱ھ)
۱۰) حاشية العدوی علیٰ الخرشی	علی بن أحمد بن مكرم العدویؒ	(م:۱۱۸۹ھ)
۱۱) شرح منح الجليل علیٰ مختصرخليل	محمد عليش المالكیؒ	(م:۱۲۹۹ھ)(انیس)

(۱) ماخوذ از کتاب الفتاویٰ مقدمہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، جلد اول۔

(۲) القاموس المحيط:ص:۱۷۰۲۔

فتویٰ، ''ف'' کے ''پیش'' اور ''زبر'' دونوں طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے،(۱) البتہ ''ف'' پر ''زبر'' زیادہ مشہور اور مروّج ہے، اور اہل مدینہ کی لغت بھی یہی ہے۔''**الفتح في الفتویٰ لأهل المدينة**''(۲) بلکہ علامہ زبیدیؒ کا رجحان تو اس طرف ہے کہ فُتیا ''ف'' کے پیش کے ساتھ ہونا چاہئے اور فَتویٰ ''ف'' کے زبر کے ساتھ ہی ہونا چاہئے۔(۳)...... افتا، کے معنی فتویٰ دینے کے ہیں اور استفتا کے معنی فتویٰ طلب کرنے کے ہیں۔

قرآن مجید میں اِفتاء اور استفتاء کے الفاظ مجموعی طور پر گیارہ جگہ استعمال ہوئے ہیں اور حدیث کی نو مشہور کتب جن کی فہرست سازی ''**المعجم المفهرس**'' میں کی گئی ہے، میں بارہ مواقع پر فُتیا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔(۴)

فتویٰ کی اصطلاحی تعریف کے سلسلہ میں اہل علم نے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں، بعض لوگوں نے فتویٰ کی وہی تعریف کی ہے جو اجتہاد کی ہے، کیوں کہ متقدمین کے نزدیک افتا اور مفتی سے مراد مجتہد ہوا کرتا تھا، اسی لیے بہت سے علماء اصول نے اجتہاد و تقلید کی بحث میں افتا اور استفتا کے احکام ذکر کئے ہیں، بعد کے فقہا نے افتا کی ایسی تعریف کی ہے جس میں بمقابلہ اجتہاد کے عموم پایا جاتا ہے، علامہ قرافیؒ فرماتے ہیں:

''**الفتویٰ إخبار عن الله تبارک و تعالیٰ في إلزام أو إباحة**''.(۵)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کے لازم ہونے یا مباح ہونے کی خبر دینا فتویٰ ہے۔

علامہ بنانیؒ رقمطراز ہیں:

''**الإخبار بالحكم من غير إلزام**''.(۶)

لازم قرار دیئے بغیر کسی حکم کی بابت خبر دینے کو فتویٰ کہتے ہیں۔

علامہ حصکفیؒ کی عبارت سے ظاہر ہے کہ حکم کے بارے میں خبر دینے کا نام افتا ہے:

''**...إلا أن المفتي مخبر عن الحكم**''.(۷)

فتویٰ کی اصطلاحی تعریف کے سلسلہ میں چند باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

(۱) مفتی کے فتویٰ کی حیثیت خبر و اطلاع کی ہوتی ہے، جیسے قاضی فریقین پر احکام کو لازم قرار دیتا ہے، مفتی

---

(۱) القاموس المحيط: ص:۱۷۰۲۔
(۲) لسان العرب: ص:۳۳۴۸۔
(۳) دیکھئے: تاج العروس: ۲۰/۳۸۔
(۴) دیکھئے: المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی الشريف۔
(۵) كتاب الفروق: ۴/۵۳۔
(۶) حاشية جمع الجوامع: ۲/۳۹۷۔
(۷) الدرالمختار مع الرد: ۱/۱۷۶، مقدمه۔

مستفتی پر اپنی طرف سے کسی حکم کو لازم نہیں کرتا اور نہ وہ اس کا مجاز ہے۔

(۲) فتویٰ حکم سے متعلق ایسی اطلاع کو کہتے ہیں جو کسی سوال کے جواب میں ہو، سوال و استفسار کے بغیر اپنی طرف سے حکم شرعی کی رہنمائی کی جائے وہ وعظ و ارشاد ہے نہ کہ فتویٰ۔

(۳) فتویٰ ایسے سوال کا جواب ہوتا ہے جو پیش آمدہ واقعات سے متعلق ہو، اگر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، بلکہ اس کو فرض کر کے جواب دیا گیا تو یہ تعلیم ہے نہ کہ افتا، اس طرح فتویٰ کی جامع تعریف ڈاکٹر شیخ حسین محمد ملاّح کے الفاظ میں اس طرح ہوگی:

"الإخبار بحكم الله تعالىٰ عن الوقائع بدليل شرعي لمن سأل عنه".(۱)

پیش آمدہ واقعات کے بارے میں دریافت کرنے والے کو دلیل شرعی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں خبر دینے کو فتویٰ کہتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا متقدمین کے نزدیک فتویٰ خود اجتہاد سے عبارت تھا، چوتھی صدی ہجری کے بعد جب تقلید کا رواج عام ہوا، اور مجتہدین مفقود ہو گئے تو جو لوگ فقہا کے آراء و اقوال کو نقل کرتے تھے وہی لوگ مفتی کہلانے لگے، اصل میں اس عہد میں عام طور پر نقل فتاویٰ کا کام ہوتا ہے، اور انہیں کو مفتی کہا جاتا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ علامہ ابن ہمامؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

" فأما غير المجتهد ممن يحفظ أقوال المجتهد فليس بمفتٍ، والواجب عليه إذا سئل أن يذكر قول المجتهد كالإمام علىٰ وجه الحكاية، فعرف أن مايكون في زماننا من فتوىٰ الموجودين ليس بفتوىٰ، بل هو نقل كلام المفتي ليأخذ به المستفتي ".(۲)

غیر مجتہد جسے مجتہدین کے اقوال یاد ہوں وہ مجتہد نہیں ہے، اور اس پر واجب ہے کہ جب سوال کیا جائے تو مجتہد کا قول ذکر کرے، جیسے بطور حکایت کے کہے کہ یہ فلاں امام کا قول ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے زمانہ میں موجودہ لوگ جو فتویٰ دیتے ہیں وہ درحقیقت فتویٰ نہیں ہے، بلکہ وہ مفتی کے اقوال کو نقل کرنا ہے تاکہ مستفتی اس پر عمل کریں۔

غالباً اسی پس منظر میں مولانا عمیم الاحسان مجددیؒ نے فتویٰ کی تعریف اس طرح کی ہے:

" تبيين الأحكام الصادرة عن الفقهاء في الوقائع الجزئية ".(۳)

جزئی واقعات میں فقہا سے منقول احکام کو بیان کرنے کا نام فتویٰ ہے۔

---

(۱) الفتوىٰ نشأتها وتطورها:۱/۳۹۸۔

(۲) الدرالمختار مع الرد:۱/۱۶۸، مقدمة۔

(۳) أدب المفتي: ص:۴۔

افتا اور قضا:

فتویٰ سے قریبی اصطلاح قضا کی ہے، کیوں کہ مفتی بھی حکم شرعی کو بیان کرتا ہے اور قاضی بھی، اس لیے اہل علم نے ضرورت محسوس کی کہ قضا اور افتا کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل فرق بیان کئے گئے ہیں:

(۱)　مفتی کسی حکم کے بارے میں خبر دیتا ہے اور قاضی متعلق اشخاص کو اس کا پابند کرتا ہے اور اس پر اس کو لازم قرار دیتا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"لا فرق بين المفتي و الحاكم إلا أن المفتي مخبر بالحكم و القاضي ملزم به". (۱)

مفتی اور حاکم (قاضی) کے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ مفتی حکم کے بارے میں خبر دیتا ہے اور قاضی اس کو لازم قرار دیتا ہے۔

اسی لیے مستفتی پر کسی خاص شخص کا فتویٰ لازم نہیں ہوتا، اگر وہ چاہے تو اس پر عمل کرے اور چاہے تو کسی دوسرے مفتی سے فتویٰ لے لے، لیکن قاضی کا فیصلہ اس پر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ (۲) اسی لیے اگر کسی معاملہ کے دو فریق میں سے ایک نے کسی مفتی سے رجوع کیا ہو تو اسے اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر اس نے کسی قاضی سے رجوع کیا ہو تو دوسرے فریق کو بھی اس سے رجوع کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ (۳)

یوں تو قضا اور افتا کے درمیان فرق اور بھی کئی وجوہ ہیں، لیکن دونوں کے درمیان بنیادی اور جوہری فرق یہی ہے، جس کا علامہ شامیؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

(۲)　علامہ حصکفیؒ نے بزازیہ کے حوالہ سے ایک فرق یہ بھی کیا ہے کہ مفتی دیانت اور باطن کے اعتبار سے بھی فتویٰ دیتا ہے، لیکن قاضی ظاہر کے اعتبار سے ہی فیصلہ کرنے کا مکلّف ہے، مثلاً: کسی شخص نے مفتی سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو کہا تھا کہ: "تو طلاق یافتہ ہے" "أنت طالق" اور کہے کہ میرا مقصد انشاء طلاق نہیں تھا، بلکہ میرا مقصود جھوٹی خبر دینا تھا، تو مفتی طلاق واقع نہ ہونے کا فتویٰ دے گا، لیکن قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔ (۴)

(۳)　علامہ ابن قیمؒ نے ایک فرق یہ بھی لکھا ہے کہ مفتی کے فتویٰ کی حیثیت عمومی نوعیت کی ہوتی ہے، مستفتی بھی اس پر عمل کرسکتا ہے اور دوسرے لوگ بھی، قاضی کا فیصلہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے، دوسرے واقعات میں بطور خود اس کو جاری نہیں کیا جا سکتا۔ (۵)

---

(۱)　شرح عقود رسم المفتي: ص ۲۷، مکتبہ سعیدیہ، سہارنپور۔

(۲)　إعلام الموقعين: ۱/ ۲۶، الإحكام في تمييز الفتاویٰ من الأحكام للقرافيؒ: ص ۲۰۔

(۳)　دیکھئے: البحر المحيط للزركشيؒ: ۶/ ۳۱۵۔

(۴)　ردالمحتار على الدر: ۴/ ۳۰۶۔

(۵)　دیکھئے: إعلام الموقعين: ۱/ ۳۸.

(۴) افتا کا دائرہ بمقابلہ قضا کے وسیع ہے، کیوں کہ قضا کا تعلق بنیادی طور پر مصالح دنیا سے ہے اور افتا کا تعلق مصالح دنیا سے بھی ہے اور مصالح آخرت سے بھی (۱)۔۔۔اسی لیے فتویٰ معاملات کے علاوہ عبادات اور آداب وغیرہ کے بارے میں بھی دیئے جائیں گے، لیکن مخصوص مواقع کے سوا عبادات جیسے: ''نماز روزہ کا درست ہونا اور نہیں ہونا'' کے بارے میں فیصلہ کرنا قاضی کا کام نہیں۔

(۵) ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ قاضی کا فیصلہ بہر حال واجب الاطاعت ہے خواہ وہ فریقین کے مسلک فقہی کے موافق ہو یا خلاف، اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ قضاء قاضی رافع خلاف ہوتا ہے، یعنی جس مسئلہ میں فقہا کے درمیان اختلاف ہو، اور اسی مسئلہ میں جب قاضی فیصلہ کر دے تو وہی فریقین کے لیے واجب العمل ہوتا ہے، جبکہ فتویٰ کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اگر مستفتی کسی اور فقہ کا مقلد ہو اور مفتی کسی اور فقہ کا، اور مفتی اپنی فقہ کے مطابق جواب دیدے تو مستفتی کے لیے اس پر عمل کرنا لازم نہیں۔(۲)

افتا اور اجتہاد:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، متقدمین کے یہاں مفتی وہی ہوتا تھا جو مجتہد ہوتا تھا، اسی لیے اصولیین کی ایک جماعت غیر مجتہد کے لیے فتویٰ دینے کو جائز ہی نہیں کہتی ہے۔(۳) البتہ متأخرین نے افتا کے دائرہ کو وسیع کر دیا، اور ایسے لوگ جو خود مجتہد نہ ہوں، لیکن فقہا کے اجتہادات سے واقف ہوں ان کے لیے بھی فتویٰ دینے کی گنجائش فراہم کی، یا یوں کہئے کہ فتاویٰ کی نقل وحکایت کو فتویٰ سے تعبیر کیا جانے لگا، اس لیے فتویٰ اور اجتہاد کے درمیان فرق کو بھی پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا:

(۱) افتا کا تعلق سوال سے ہے، عام طور پر جب کوئی سوال سامنے آتا ہے تو مفتی اس کا جواب دیتا ہے،

(۱) تهذيب الفروق بهامش الفروق:۴/۹۵۔

(۲) دیکھئے: الفتویٰ نشأتها وتطورها :۱/۴۰۱۔

علامہ ابن قیم کے الفاظ ہیں: ''المفتي هو المخبر بحكم الله تعالىٰ غير منفذ''. (إعلام الموقعين:۴/۲۲۴)

فتویٰ اور قضا میں بنیادی فرق یہی ہے کہ مفتی کسی مسئلہ سے متعلق حکم شرعی بتلاتا ہے اور قاضی واقعہ کی تحقیق کر کے اس پر حکم شرعی کو منطبق کرتا ہے، فتویٰ ''اخبار'' ہے اور قضا ''الزام'' ہے۔

علامہ شامی نقل کرتے ہیں: ''لا فرق بين المفتي والحاكم إلاأن المفتي مخبربالحكم والقاضي ملزم به'' (شرح عقود رسم المفتي:ص ۲۷) مفتی اور قاضی کے درمیان محض یہی فرق ہے کہ مفتی حکم شرعی کے بارے میں خبر دیتا ہے اور قاضی حکم شرعی کو لازم کرتا ہے۔

فتویٰ کا دائرہ بمقابلہ قضا کے زیادہ وسیع ہے، بعض احکام وہ ہیں جن میں فتویٰ تو دیا جائے گا لیکن وہ قاضی کے دائرہ سے باہر ہے، جیسے عبادت، عبادات سے متعلق مسائل میں فتاویٰ تو دیئے جائیں گے، لیکن قاضی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اور اگر قاضی کوئی حکم دے بھی تو اس کی حیثیت فتویٰ ہی کی ہوگی نہ کہ حکم لازم کی۔(كتاب الفروق للقرافي:۴/۴۸) (مقدمۂ فتاویٰ امارت شرعیہ:۱/۱۹-۲۰۔)

(۳) الإحكام في أصول الأحكام:۴/۲۴۱۔

اجتہاد کے لیے سوال ضروری نہیں ہے، بہت سے ایسے مسائل کے بارے میں بھی اجتہاد کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا گیا ہو، بلکہ جو واقعات ابھی پیش ہی نہ آئے ہوں۔

(۲) جو قطعی احکام ہیں ان میں اجتہاد کا دخل نہیں، لیکن فتویٰ احکام قطعیہ کے بارے میں بھی دیا جاتا ہے اور احکام ظنیہ کے بارے میں بھی۔

(۳) اجتہاد احکام کو دریافت کرنے کا نام ہے اور افتا، دریافت شدہ احکام کو ضرورت مند مستفتی تک پہونچانے کا نام ہے۔

(۴) اجتہاد کی حیثیت ایک عام کلی کی ہوتی ہے اور فتویٰ اکثر اوقات کسی خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے، اسی پس منظر میں مفتی کو مستفتی کی نفسیات اور اس کے ماحول سے واقفیت کی اور بعض مرتبہ اس سے استفسار کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی لیے فقہا نے بعض ابواب جیسے ''أیمان'' وغیرہ کے بارے میں کہا ہے کہ جو اس شہر کا باشندہ ہو یا وہاں کی بول چال اور محاورات سے واقف ہو، اسی کو اس بارے میں فتویٰ دینا چاہیے، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

'' لا یجوز أن یفتي في الأیمان والإقرار ونحوهما مما یتعلق بالألفاظ إلا أن یکون من أهل بلد اللافظ أو متنزلاً منزلتهم في الخبرة بمرادهم من ألفاظهم وعرفهم فیها''.(۱)

أیمان، اقرار اور اس طرح کے امور جو الفاظ سے متعلق ہیں، میں اسی کے لیے فتویٰ دینا جائز ہے جو بولنے والے کے اہل شہر میں سے ہو، یا کم سے کم اہل شہر ہی کی طرح ان کی تعبیرات اور بول چال کے عرف سے واقف ہو۔

فتاویٰ کے نام سے مطبوعہ کتابیں:

بہت سی کتابیں فتاویٰ کے نام سے چھپی ہوئی ہیں، جیسے خلاصۃ الفتاویٰ، فتاویٰ ابو اللیث سمرقندی، فتاویٰ ہندیہ اور فتاویٰ قاضیخان، وغیرہ، عام طور پر لوگوں کو اچنبھا ہوتا ہے کہ ان میں سوال و جواب نہیں لیکن انہیں ''فتاویٰ'' کا نام دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں فتاویٰ اور واقعات کی ایک خاص اصطلاح ہے اور وہ یہ کہ استناد و اعتبار کے لحاظ سے کتابوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اول درجہ امام محمدؒ کی چھ کتابوں کا ہے، جنہیں ظاہر روایت کہا جاتا ہے، دوسرا درجہ امام صاحب کے شاگردوں کی تالیفات اور خود امام محمدؒ کی ظاہر روایات کے علاوہ دوسری کتابوں کا ہے، ان کو ''نوادر'' کہتے ہیں، جن احکام کی بابت امام صاحب اور آپ کے تلامذہ کی رائے منقول نہیں ہے، بلکہ بعد کے مشائخ اور اہل علم نے ان میں استنباط و استخراج سے کام لیا ہے، ان مسائل کو فتاویٰ اور واقعات سے تعبیر کرتے ہیں، ان مشائخ میں ابو عصمہؒ، عصام بن یوسفؒ، محمد بن سماعہؒ، ابو سلیمان جوزجانیؒ، ابراہیم بن رستم مروزیؒ اور بعد کے اہل علم ہیں۔

فتاویٰ کے نام سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ظاہر روایت اور نوادر کے علاوہ بعد کے مشائخ کے اقوال کو بھی

(۱) شرح مهذب: ۱/۴۶، مقدمة۔

نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اسی عموم کی وجہ سے ان کو فتاویٰ کہتے ہیں، گویا یہ ایک الگ اصطلاح ہے، اس سے فتاویٰ کی اصولی اصطلاح مراد نہیں ہے۔

منصب افتا کی اہمیت اور کار افتا کی نزاکت:

افتا کی ذمہ داری بہت ہی نازک ذمہ داری ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ کی نسبت اپنے آپ کی طرف کی ہے: ''قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ''. (۱) ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلاَلَةِ''. (۲) گویا اللہ تعالیٰ کی ذات خود مفتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے منشا کی تشریح وتوضیح اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حوالہ کی: ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ''. (۳) یہ بیان ووضاحت کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر عہد کے علما وارباب افتا کے حصہ میں آئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مفتی گویا خود شارع کا نائب ہے، اور اس کی طرف سے احکام شرعیہ میں لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے، اسی لیے علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ مفتی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ فتویٰ دینے میں وہ کس کا قائم مقام ہے؟

''وليعلم المفتي عمن ينوب في فتواه''. (۴)

اور امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مفتی اللہ کی جانب سے رائے کا اظہار کرتا ہے:

''المفتي موقع عن الله تعالىٰ''. (۵)

اسی لیے فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''کہ تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں جری ہو وہ دراصل دوزخ پر جری ہے''۔(۶)

ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ سے منقول ہے:

''میں نے ایک سو بیس انصاری صحابہ کو دیکھا کہ ان میں سے ایک سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ دوسرے کا، دوسرا تیسرے کا حوالہ دیتا اور اسی طرح ایک دوسرے سے رجوع کرنے کی تلقین کرتا، یہاں تک کہ یہ سوال پھر پہلے شخص کی طرف لوٹ آتا''۔(۷)

ان ہی سے منقول ہے کہ صحابہؓ کا حال یہ تھا کہ اگر انہیں کوئی حدیث یاد ہوتی تو ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے بجائے

---

(۱) سورة النساء:۱۲۷۔
(۲) سورة النساء:۱۷۶۔
(۳) سورة النحل:۴۴۔
(۴) إعلام الموقعين:۱/۱۱۔
(۵) شرح مهذب :۱/۴۰، مقدمه۔
(۶) سنن الدارمی:۱/۵۷۔
(۷) شرح مهذب:۱/۴۰۔

ان کا بھائی اس روایت کو نقل کر دے اور کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ چاہتا کہ اس کے بجائے اس کا بھائی بتا دے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جو شخص ہر سوال کا جواب دے وہ مجنون ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ اگر علم کے ضائع ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو فتویٰ نہ دیتا، امام مالک رحمہ اللہ کا حال یہ تھا کہ اڑتالیس مسائل پوچھے گئے تو بتیس کے بارے میں کہہ دیا کہ مجھے اس کا علم نہیں، ایک مسئلہ کے جواب کے بارے میں فرمایا: مجھے معلوم نہیں، عرض کیا گیا، یہ تو آسان اور معمولی مسئلہ ہے، تو آپ غصہ ہو گئے اور فرمایا: علم کی کوئی بات معمولی نہیں، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فتویٰ کی جو صلاحیت اور مطلوبہ استعداد سفیان بن عیینہؒ میں تھی، میں نے کسی میں نہیں دیکھی، لیکن میں نے ان کو فتویٰ سے جتنا زیادہ بچتے ہوئے دیکھا کسی کو نہیں دیکھا، اثرم ناقل ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو بہت سے مسائل میں کہتے ہوئے دیکھا ہے: مجھے نہیں معلوم، سفیان ابن عیینہؒ اور سحنونؒ کہتے ہیں کہ فتویٰ دینے میں جری وہی ہوسکتا ہے جو کم علم ہو، عطاء بن سائبؒ تابعی ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ ان سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تو گفتگو کرتے ہوئے ان پر لرزہ طاری ہو جاتا۔(۱) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سلف صالحین افتا کے سلسلہ میں کس قدر احتیاط برتتے تھے۔

فتویٰ عہد نبوی میں:

یہ ظاہر ہے کہ امت میں سب سے پہلے مفتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وأول من قام بهذا المنصب الشريف سيد المرسلين الخ". (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات وحی پر مبنی اور منشاء ربانی کی ترجمان ہوتی تھی:

"وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوىٰ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡيٌ يُّوۡحىٰ". (۳)

نیز ارشاد ہے:

"اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحىٰ اِلَيَّ". (۴)

اس لیے یہ بات تو ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ وحی کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے، لیکن کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد سے بھی فتویٰ دیتے تھے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور اکثر اصولیین اس کے قائل ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احکام شرعیہ میں بھی

(۱) ملخص از: شرح مہذب: ۱/۴۱-۴۰۔

(۲) إعلام الموقعين: ۱/۱۱۔

(۳) سورة النجم: ۳-۴۔

(۴) سورة يونس: ۱۵۔

اجتہاد پر مامور تھے۔(۱) یہی رائے امام رازیؒ اور قاضی بیضاویؒ کی بھی ہے،(۲) امام غزالیؒ کے نزدیک بھی یہی راجح ہے،(۳) امام سرخسیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے نقطۂ نظر کی اس طرح صراحت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر مامور تھے کہ کسی بھی واقعہ میں وحی کا انتظار کریں، اگر انتظار کے باوجود وحی کا نزول نہیں ہوتا تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رائے اور اجتہاد پر عمل کرنے کی منجانب اللہ اجازت ہوتی، البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجتہاد میں چوک ہوتی تو من جانب اللہ متوجہ فرما دیا جاتا، لہٰذا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی امر کی بابت اجتہاد فرمایا ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر کوئی تنبیہ نازل نہ ہوئی ہو تو یہ اس اجتہاد کے قطعی ہونے کی علامت ہے۔(۴)

متعدد واقعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد سے کام لیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خاتون نے اپنے مرحوم والد کے بارے میں پوچھا جو حج نہیں کر پائے تھے، کہ کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: اگر تمہارے والد پر قرض ہوتا اور تم اسے ادا کرتی، تو کیا یہ کافی نہ ہوتا؟ انہوں نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا دَین زیادہ قابل ادائیگی ہے۔(۵)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کوئی روزہ دار بوسہ لے لے، تو کیا اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اگر تم پانی سے کلی کرو اور اسے حرکت دو، تو کیا اس کے پینے والے سمجھے جاؤ گے: **"أرأيت لو تمضمضت بماء ثم مججته أكنت شاربه ؟"**. (۶) گویا پینے کی تمہید منہ میں پانی ڈالنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماع کی تمہید بوسہ کو قیاس فرمایا، اس لیے صحیح یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات میں، جن میں وحی نازل نہیں ہوا کرتی تھی اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور اجتہاد کی بنیاد پر فیصلے کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ کو علامہ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین (جلد ۴ص ۲۶۶ تا ۴۱۴) میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور مولانا عبدالرحمٰن حیدرآبادی مظاہری نے "فتاویٰ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے انہی روایات کی مختصر تشریح کی ہے، جس کا اردو ترجمہ "فرامین رسول صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ ۲۹۷ ارشادات نبوی صلی اللہ

(۱) دیکھئے: تیسیر التحریر: ۴/۱۸۵، کشف الأسرار للبخاریؒ: ۳/۳۸۶۔

(۲) دیکھئے: المحصول للرازیؒ: ج۲ قسم۳ ص۹، و نهاية السؤل شرح منهاج الوصول للأسنویؒ: ۳/۲۶۴، منهاج الوصول للبیضاویؒ: ص۱۷۶۔

(۳) المستصفیٰ: ۲/۳۵۵۔

(۴) دیکھئے: أصول السرخسیؒ: ۲/۱۹۶، کشف الأسرار: ۳/۳۸۶۔

(۵) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۷۳۱۵، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۱۴۸۔

(۶) سنن أبي داؤد، حدیث نمبر: ۲۳۸۵۔

علیہ وسلم پر مشتمل ہے، افسوس کہ مرتب نے احادیث کی تخریج نہیں کی ہے، بلکہ ابن قیمؒ کے اجمالی حوالوں پر اکتفا کیا ہے، اگر آئندہ ایڈیشن میں احادیث کی تخریج بھی ہوجائے تو اس کی افادیت دو چند ہوجائے گی۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے صحابہؓ نے بھی فتویٰ دیا ہے، بعض صحابہؓ تو وہ تھے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ دینی وانتظامی امور کا ذمہ دار بنا کر بھیجا، جیسے: حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ جن مسائل کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے، وہاں یہ حضرات اپنے اجتہاد اور رائے ہی سے فتویٰ دیا کرتے تھے، لیکن اس کے علاوہ بعض دیگر صحابہؓ بھی عہد نبوت میں فتویٰ دیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا یہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت ہی پر مبنی رہا ہوگا اور یقیناً اس سے ان کی تربیت بھی مقصود ہوگی، چنانچہ قاسمؒ بن محمد بن أبی بکرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (۱) سہل ابن أبی ہثمہ راوی ہیں کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تین مہاجر صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تین انصاری صحابہ حضرت أبی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (۲) اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فتویٰ دیتے تھے۔ (۳) غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم فتاویٰ دیتے تھے اور اجتہاد سے کام لیتے تھے، خواہ قاضی ہو یا نہ ہو، اسی کو علامہ آمدیؒ اور ملا محب اللہؒ وغیرہ نے ترجیح دی ہے۔ (۴)

عہد صحابہ میں:

یہ بات ظاہر ہے کہ گو صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب عدل اور ورع وتقوی کے اعلیٰ معیار پر ہیں، لیکن وہ سب مقامِ افتا پر فائز نہیں تھے، بلکہ ایک محدود تعداد تھی جو فتاویٰ دیا کرتی تھی، اس میں ایک تو ان کی احتیاط کو دخل ہے، دوسرے صلاحیت اور استعداد میں تفاوت کو، تیسرے تقسیم کار کو، دین اور امت سے متعلق مختلف ذمہ داریاں صحابۂ کرامؓ انجام دیتے تھے، تعلیم وتعلم، دعوت وجہاد، انتظام وانصرام اور تربیت وتزکیہ وغیرہ، اسی نسبت سے ایک محدود تعداد علم و

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/۲۳۵۔

(۲) سیر أعلام النبلاء: ۱/۴۵۱-۴۵۲۔

(۳) سیر أعلام النبلاء: ۱/۸۶۔

(۴) الإحکام في أصول الأحکام للآمدیؒ: ۴/۲۳۵، فواتح الرحموت مع مسلم الثبوت: ۲/۳۷۵۔

تحقیق، اجتہاد واستنباط اور قضا وافتا کے کام میں مشغول ہوئی، ان حضرات کو اس زمانہ میں قراء کہا جاتا تھا۔(۱)

علامہ ابن قیمؒ نے تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی تحقیق ہے کہ مجموعی طور پر ۱۳۰ سے کچھ زیادہ صحابہ اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنھم وعنہن نے فتاویٰ دیئے ہیں، پھر انہوں نے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، مکثرین، متوسطین اور مقلین -------- مکثرین سے مراد وہ صحابہ ہیں جنھوں نے کثرت سے فتاویٰ دیئے ہیں، یہ سات صحابہ ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، علامہ ابن حزمؒ کے بقول ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ اس قدر ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے۔(۲)

----اسی فہرست میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا نام بھی آنا چاہئے، بقول بحر العلوم وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی فتویٰ دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی۔(۳)

علامہ ابن قیمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بشمول بیس صحابہؓ کو فتاویٰ کے اعتبار سے متوسطین میں شمار کیا ہے، جن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا شامل ہیں، مقلین یعنی کم فتویٰ دینے والے سے وہ لوگ مراد ہیں جن سے دو چار مسائل منقول ہیں، بقول ابن قیمؒ ان تمام حضرات کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے تو ایک مختصر جزء میں آجائے، ابن قیمؒ نے اس سلسلہ میں ایک سو پچیس صحابہ اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے نام ذکر کئے ہیں جن میں خواتین جنت کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اکثر امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن شامل ہیں۔(۴)

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ڈاکٹر رواس قلعہ جی کو کہ انہوں نے موسوعۂ فقہیہ کے نام سے صحابہؓ کے فتاویٰ کو جمع کرنے کا بہت ہی مبارک اور مسعود کام شروع کیا ہے اور اب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور متعدد صحابہؓ کے فتاویٰ ان کے ذریعہ جمع ہو گئے ہیں، اسی طرح شیخ ابو عبداللہ سید بن کسروی بن حسنؒ کی "**موسوعة آثار الصحابة**ؓ" بھی ایک بڑا کارنامہ ہے، جس میں تمام صحابہؓ کے فتاویٰ کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی

(۱) دیکھئے: مقدمہ ابن خلدون: ص:۳۵۳، طبع: دار الفکر، بیروت۔

(۲) إعلام الموقعين: ۱۲/۱۔

(۳) دیکھئے: التراتيب الإدارية للكتاني: ۴۱۰/۲۔

(۴) إعلام الموقعين: ۱۳/۱-۱۴۔

ہے، یہ بڑی محموداور قابل تعریف کاوشیں ہیں، جن کے ذریعہ موجودہ عہد کے اہل علم کو صحابۂ کرامؓ کے فتاویٰ اور اجتہادات سے استفادہ کا موقع ملے گا، اور سلف سے علمی رابطہ زیادہ بہتر طور پر استوار ہو سکے گا، خاص کر فقہ حنفی اور فقہ مالکی (جس میں صحابہؓ کے فتاویٰ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے) کے لیے صحابہؓ کے فتاویٰ اور آثار کی ترتیب خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں:

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کا دور فقہ وفتاویٰ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، ائمۂ مجتہدین اور بعد کے فقہا نے ان فتاویٰ سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، مکہ میں امام مجاہدؒ، عکرمہؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ، فقہاء مدینہ میں سعید بن المسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، قاسم بن محمدؒ، سلیمان بن یسارؒ، نافعؒ، ابن شہاب زہریؒ اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہؒ (شاگردہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) فقہاء کوفہ میں علقمہؒ، مسروق ہمدانیؒ، ابراہیم نخعیؒ، عامر شعبیؒ، حماد بن سلیمانؒ، فقہاء بصرہ میں مسلم بن یسارؒ، حسن بصریؒ، محمد بن سیرینؒ، قتادہؒ، یمن میں طاؤسؒ، شام میں ابوادریس خولانیؒ، ابن ذویبؒ، دمشق میں رجاء بن حیوۃؒ اور مکحولؒ دمشق اور مصر میں یزید بن حبیبؒ اور عمرو بن حارثؒ کے فتاویٰ کو خاص شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

عہد زریں:

دوسری صدی ہجری فقہ وفتاویٰ اور اجتہاد واستنباط کے لحاظ سے سب سے زریں دور کہلانے کا مستحق ہے، جس میں ایسے ائمۂ مجتہدین پیدا ہوئے جنہوں نے فقہ وفتاویٰ کا نہایت ہی نمایاں کارنامہ انجام دیا، اور ایک بڑے گروہ نے ان کی اتباع و پیروی اور اقتدا و تقلید کا راستہ اختیار کیا، انہیں میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اہل سنت کے چاروں ائمۂ مجتہدین ہیں جن کی فقہ کو امت کے سواد اعظم نے اپنی چشم محبت کا سرمہ بنایا، پھر امام اہل شام امام عبدالرحمٰن اوزاعیؒ اور امام اہل مصر امام لیث بن سعدؒ، محمد بن عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰؒ قاضی کوفہ، کوفہ کے ایک اور فقیہ سفیان ثوریؒ (۹۔۱۶۱ھ) بھی اسی دور کے فقہا اور ارباب افتا میں سے ہیں، امام زید بن علیؒ (۸۰۔۱۲۳ھ) جن کی فقہ کو زیدیہ نے اختیار کیا، امام جعفر صادق (۸۰۔۱۴۸ھ) جن کی طرف شیعہ امامیہ اپنی فقہ کی نسبت کرتے ہیں، بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں، دوسری صدی ہجری کے بعد اصحاب ظواہر کے سرخیل امام داؤد بن علی اصبہانیؒ (۲۰۲۔۲۷۰ھ) نے ایک نئے دبستان فقہ کی بنیاد رکھی، اور چوتھی پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن حزم ظاہریؒ (۳۸۴۔۴۵۶ھ) اس دبستان فقہ کے سب سے بڑے ترجمان بن کر ابھرے، لیکن عملاً ائمۂ اربعہ، امام جعفر صادق اور زید بن علی ہی کی

فقہ باقی رہی، دوسرے مکاتب فقہ دوسری صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک معدوم ہوکر رہ گئے۔

تراجم فقہا پر کتابیں:

اس کے بعد مختلف دبستان فقہ میں فقہا اور ارباب افتا کا ظہور ہوتا رہا، جنہوں نے صاحب مذہب کی آراء کو نقل کرنے اور ان کی تشریح وتوضیح کرنے پر خصوصی توجہ دی، اور جو نئے مسائل پیش آئے ان میں تخریج واستنباط سے کام لیا، ان فقہا ومفتیان کا تذکرہ ان کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے جن کو ''طبقات فقہا'' کے نام سے مرتب کیا گیا ہے، چنانچہ مختلف فقہ سے متعلق شخصیات کے تذکرہ پر مشتمل معروف کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) طبقات الشافعية — شیخ ابو عاصم عبادیؒ (م:۴۵۸ھ)

(۲) طبقات الفقهاء (تمام فقہا) — امام ابواسحاق شیرازیؒ (م:۴۷۶ھ)

(۳) طبقات الحنابلة (حنابلہ) — قاضی ابوحسین محمد بن فراءؒ (م:۵۲۷ھ)

(۴) ترتيب المدارك (مالکیہ) — قاضی عیاض مالکیؒ (م:۵۴۴ھ)

(۵) طبقات الشافعية الكبرىٰ (شوافع) — امام تاج الدین عبدالوہاب سبکیؒ (م:۷۷۱ھ)

(۶) الطبقات الشافعية — شیخ جمال الدین اسنویؒ (م:۷۷۲ھ)

(۷) الجواهر المضية (حنفیہ) — علامہ محی الدین عبدالقادر قریشیؒ (م:۷۷۵ھ)

(۸) ذيل علىٰ طبقات الحنابلة — حافظ ابن رجب حنبلیؒ (م:۷۹۵ھ)

(۹) الديباج المذهب — برہان الدین ابراہیم بن فرحون مالکیؒ (م:۷۹۹ھ)

(۱۰) الطبقات الشافعية — ابوبکر بن احمد دمشقیؒ (م:۸۵۱ھ)

(۱۱) تاج التراجم — حافظ قاسم بن قطلو بغاؒ (م:۸۷۹ھ)

(۱۲) المقصد الأرشد — علامہ برہان الدین ابراہیم بن مفلحؒ (م:۸۸۴ھ)

(۱۳) الجوهر المنضد — علامہ یوسف بن حسن دمشقیؒ (م:۹۰۹ھ)

(۱۴) المنهج الأحمد — ابوالیمن مجیر الدین علیمیؒ (م:۹۲۸ھ)

(۱۵) توشيح الديباج — علامہ بدرالدین قرافیؒ (م:۹۶۴ھ)

(۱۶) الطبقات السنية — علامہ تقی الدین غزیؒ (م:۱۰۰۵ھ)

(۱۷) السحت الأكمل — علامہ محمد کمال الدین غزیؒ (م:۱۲۱۴ھ)

(۱۸) الفوائد البهية　مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ　(م:۱۳۰۴ھ)

(۱۹) اليواقيت الثمينة　علامہ محمد البشیر ازہریؒ　(م:۱۳۲۹ھ)

(۲۰) شجرة النور الزكية في طبقات المالكية، شیخ محمد بن محمد مخلوفؒ　(م:۱۳۶۰ھ)

فقہ حنفی میں طبقات و مدارج:

مختلف دبستان فقہ میں اس فقہ سے متعلق شخصیتوں کی درجہ بندی اور ان کے مقام و مرتبہ کی تعیین کے لیے، فقہا کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے، حنفیہ کے یہاں مشہور تقسیم وہ ہے جو ابن کمال پاشاؒ کی طرف منسوب ہے:

(۱) مجتہدین فی الشرع: جو احکام میں اجتہاد بھی کرتے ہیں اور اجتہاد و استنباط کے لیے خود اپنے اصول و قواعد وضع کرتے ہیں، جیسے: ائمہ اربعہؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ وغیرہ...۔ ان کو مجتہد مطلق بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) مجتہدین فی المذہب: جو مجتہدین فی الشرع کے مقرر کئے ہوئے اصول کی روشنی میں خود اجتہاد کرتے ہیں، گویا وہ فروع میں مجتہد ہوتے ہیں اور اصول میں مقلد، جیسے: امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ۔

(۳) مجتہدین فی المسائل: جو فقہا ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی رائے منقول نہ ہو، جیسے: ابوبکر خصافؒ، امام ابوجعفر طحاویؒ، امام کرخیؒ وغیرہ۔

(۴) اصحاب تخریج: یہ مقلد ہوتے اور اجتہاد کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں، لیکن ایسا قول جس میں دو پہلو ہو سکتے ہو، اور صاحب مذہب سے اسی طرح منقول ہو، وہ دوسری نظائر کو سامنے رکھ کر ایک پہلو کی تعیین کرتے ہیں، امام ابوبکر جصاص رازیؒ وغیرہ کو اس زمرہ میں رکھا گیا ہے۔

(۵) اصحاب ترجیح: جن مسائل میں اصحاب مذہب سے ایک سے زیادہ رائے منقول ہو ان میں ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دیتے ہیں، امام قدوریؒ اور صاحب ہدایہؒ وغیرہ کو ابن کمال پاشاؒ نے اسی زمرہ میں رکھا ہے۔

(۶) اصحاب تمییز: وہ مقلدین جو کتابوں سے مراجعت کر کے قوی وضعیف، ظاہر روایت اور نوادر وغیرہ کا فرق جان سکتے ہیں، جیسے صاحب کنزؒ، تاج الشریعہؒ وغیرہ،...۔ یہ حضرات اپنی کتابوں میں ضعیف اور نامعتبر اقوال نقل نہیں کرتے۔

(۷) عام مقلدین: یعنی وہ لوگ جو معتبر و نامعتبر روایات میں فرق کرنے سے قاصر اور مذہب کی ترجیحات سے ناواقف ہوں۔

فقہاء حنفیہؒ کے یہاں یہی تقسیم معروف ہے، لیکن اول تو ابن کمال پاشاؒ نے جو تقسیم کی ہے، وہ خود محل نظر ہے، دوسرے اس تقسیم کی بنیاد پر شخصیتوں کی جو درجہ بندی کی ہے، وہ اس سے زیادہ محل نظر ہے، امام ابوبکر جصاص رازیؒ، امام کرخیؒ، صاحب ہدایہؒ وغیرہ کو مقلد محض اور صلاحیت اجتہاد سے بالکل عاری قرار دینا اور صاحبینؒ کا اصول میں امام ابوحنیفہؒ کا بتمام وکمال مقلد کہنا بہت ہی قابل غور ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ دور میں جو لوگ منصب افتا پر فائز ہیں وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے اعتبار سے تین طرح کے کام انجام دے رہے ہیں:

(۱) تخریج: یعنی جن مسائل کے بارے میں فقہاؒ کی رائے منقول نہیں ہے اور وہ اِس دور کے پیدا ہونے والے مسائل ہیں، فقہاؒ کے مقرر کئے ہوئے اصول وقواعد کی روشنی میں ان کے بارے میں رائے قائم کرنا، کیوں کہ ہر عہد میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، جن کا شرعی حکم متعین کرنا علما کی ذمہ داری ہے، اور یہ شریعت اسلامی کے ابدی ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

(۲) ترجیح: یوں تو بعد کے فقہاؒ نے متقدمین کی اختلافی آراء کے بارے میں ترجیحات متعین کردی ہیں، لیکن ترجیح کی ایک اساس یہ ہے کہ کوئی رائے اپنے عہد کے عرف اور اس زمانہ کے مصالح پر مبنی ہو ایسے مسائل کے بارے میں اپنے عہد کے حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا، اس کے لیے بعض اوقات ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول بھی کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ حقیقت میں عدول نہیں ہے، عدول وہ اختلاف ہے جو دلیل و برہان پر مبنی ہو، کسی خاص رائے کو تقاضائے عصر و زمان کے تحت اختیار کیا جائے تو یہ حقیقت میں عدول نہیں، اور علامہ شامیؒ وغیرہ نے مختلف مقامات پر اس سلسلہ میں اشارہ کیا ہے۔

(۳) نقل فتویٰ: تیسرا کام یہ ہے کہ جس فقہ کا مقلد ہو، اس فقہ کے مطابق جوابات نقل کردیئے جائیں۔

موجودہ دور میں ارباب افتا یہ تینوں طرح کے کام کر رہے ہیں، لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ پہلی دونوں ذمہ داریاں انفرادی طور پر انجام دینے کے بجائے اجتماعی طور پر انجام دی جائیں، چنانچہ اسی لیے آج کل فقہی مجامع (فقہی اکیڈمیوں) کی تشکیل عمل میں آئی ہے اور یہ عالم اسلام میں بھی اور خود ہندوستان میں بھی بڑی مفید خدمات انجام دے رہی ہیں۔(۱)

(۱) کتاب الفتاویٰ، مقدمہ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۳۶۔

افتا کی اہمیت اور مفتی کی صفات

(۱) یہ درست ہے کہ مسائل واحکام کا سارا ذخیرہ اوراس کی بنیاد ''کتاب وسنت'' ہی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حدیث وقرآن کے اندر ایک خاص انداز میں حقائق واحکام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسری طرف یہ بھی مسلم ہے کہ عموماً ہر شخص کو ہر زمانہ میں حالات یکساں پیش نہیں آتے بلکہ مختلف ڈھنگ سے صورت حال سامنے آتی ہے، سبھوں میں یہ فہم وبصیرت کہاں ہے جو کلام اللہ اور سنت نبوی سے اپنے حالات کے مطابق ہر ہر جزئیہ کا جواب حاصل کرلے اور وہ جواب بالکل صحیح بھی ہو، اگر گنے چنے کچھ افراد اس طرح کے نکلیں بھی تو کوئی ضروری نہیں کہ انہیں کتاب وسنت میں مہارت بھی ہو اور وہ اپنے اندران تمام شرائط کو پاتے ہوں جو ایک صاحب نظر مفتی کے لئے ضروری ہے اور اگر ان تمام اوصاف کے جامع بھی ہوں تو ان کو اتنی مہلت کہاں؟ کہ اس عظیم الشان ذخیرہ سے مفید مطلب آیت وحدیث فوراً تلاش کرلیں اور اس طرح کہ وہ آیت وحدیث دوسری آیتوں اور احادیث سے متعارض بھی نہ ہو، اس لئے عقل کا بھی تقاضہ ہے کہ قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والی ایک معتمد جماعت مسائل ضرور یہ مستنبط کرکے یکجا کرتی رہے تاکہ امت کے عام افراد دن رات کے پیش آمدہ مسائل کے اندر کہیں الجھاؤ میں گرفتار نہ ہونے پائیں اور بلاشبہ اور بلا مبالغہ ان ہی مستنبط احکام ومسائل کا نام فقہ (۲) وفتویٰ ہے۔

مفتیان کرام کی جماعت جن کو فقہ سے مناسبت تامہ ہوتی ہے ہر زمانہ میں پائی گئی اور عوام وخواص ہر ایک کا اس جماعت کی طرف رجوع عام رہا اور یہ اپنے علمی رسوخ خدا داد صلاحیت اور مخصوص فہم کی وجہ سے اس کام میں ممتاز اور نمایاں رہی اور اسے رات دن اسی کام کے ساتھ اشتغال رہا۔

دین کے مخصوص خدام:

یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء کرام کے دو طبقے مخصوص طور پر دین کی اس طرح کی خدمت میں نمایاں اور پیش پیش رہے۔

ایک محدثین کا: جس کا مشغلہ احادیث نبوی کی حفاظت وصیانت رہا، یعنی اس طبقہ کو احادیث نبوی کی روایات

(۱) ماخوذ از فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد اول مقدمہ از مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

(۲) صاحب تفسیر المنارؒ لکھتے ہیں: ذكرت هذه المادة (أى الفقه) فى عشرين موضعاً من القرآن تسعة عشر منها تدل علىٰ أن المراد به نوع خاص من دقة الفهم والتعمق فى العلم الذى يترتب عليه الانتفاع به. (تفسیر المنار جلد ۹/۴۲۱۔) ظفیر۔

اوران کے بیان وضبط کا اہتمام رہا اور انہوں نے اسناد والفاظ حدیث پر گہری نظر رکھی۔

دوسرا طبقہ فقہاء امت کا: جنھوں نے قرآنی آیات اوراحادیث نبوی سے مسائل واحکام کا استنباط واستخراج کیا اور الفاظ حدیث سے زیادہ معانی حدیث اوراس سلسلہ کے اصول وقواعد پر ان کی نظر مرکوز رہی۔(۱)

ملت اسلامیہ کے پہلے مفتی:

(۲) مفتیوں کا تعلق اسی دوسرے طبقے سے ہے اوراس امت کے سب سے پہلے مفتی اعظم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ہے اور یہ دولت آپ تک رب العزت کی طرف سے پہنچی، قرآن پاک میں ''افتا'' کا لفظ خود رب العالمین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

''وَيَسْتَفْتُوْنَکَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَايُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ''.(۳)

اورلوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی جو قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

کلالہ کے سلسلہ میں آیت نازل ہوئی:

''يَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلَالَةِ''.(۴)

لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتے ہیں۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ ان آیتوں میں ''افتا'' کی نسبت خود رب العزت جل مجدہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اس منصب کی جلالت شان کا اندازہ ہوتا ہے اور یقیناً یہ نسبت اس شعبہ کی اہمیت وفضیلت کی سب سے بڑی سند ہے، یہیں سے یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جو عالم دین اس عظیم الشان منصب پر فائز ہوتا ہے اس کی ذمہ داری کس درجہ اہم ہے اسے کس بلندی کا حامل ہونا چاہئے۔

یہ بتایا جاچکا ہے کہ اس منصب عظیم پر سب سے پہلے اس امت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہوئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کی ذمہ داری کی وجہ سے عصمت کی بیش بہا دولت سے نوازا تھا تاکہ دین کے سلسلہ میں آپ جو حکم فرمائیں وہ انسانی غلطیوں اور لغزشوں سے محفوظ ہو، چنانچہ صحابۂ کرامؓ اور دوسرے لوگ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوتے اوراپنے پیش آمدہ مسائل کے سلسلہ میں حکم دریافت کرتے، اور آپ ان تمام کو جوابات سے شادکام فرماتے، ان جوابات وسوالات کا بڑا ذخیرہ آج بھی کتب حدیث میں محفوظ ہے بہت سے علماء کرام نے اس حصہ کو علیحدہ بھی جمع کرنے کی سعی کی ہے۔

(۱) مقدمہ کتاب الفتاویٰ جلد اول از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب۔
(۲) مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اول از مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ۔
(۳) سورة النساء:۱۲۷۔
(۴) سورة النساء:۱۷۶۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات اور جوابات کے لئے حضرت جبرئیلؑ کی حاضری:

کتب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے سوالات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئے جن کا جواب آپ کو معلوم نہیں تھا چنانچہ آپ نے توقف فرمایا، پھر فوراً جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے آپ نے ان کے سامنے سوال پیش کر کے جواب طلب کیا، مگر روح الامینؑ بھی بول اٹھے کہ اس سوال کے جواب میں میرا حال آپ جیسا ہی ہے اور پھر کہنے لگے ”آپ انتظار فرمائیں، میں ابھی رب ذوالجلال کی بارگاہ سے جواب لیکر حاضر ہوتا ہوں“۔

چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ صحابی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی عالم خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے پوچھا ”أي البقاع خير؟“ کونسا خطۂ ارض بہتر ہے؟ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اور فرمایا: میری یہ خاموشی اس وقت تک ہے جب تک روح الامین تشریف نہ لے آئیں، اتنے میں فوراً حضرت جبریلؑ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا اور دریافت کیا اس کا جواب کیا دیا جائے؟ حضرت جبرئیلؑ نے آپ کے سوال کے جواب میں عرض کیا:

”ما المسئول عنها بأعلم من السائل ولكن أسأل ربي تبارك وتعالىٰ“. (۱)

جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ اس مسئلہ میں پوچھنے والے سے کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن میں پروردگار عالم بزرگ وبرتر سے پوچھتا ہوں۔

یہ کہہ کر حضرت جبرئیلؑ روانہ ہو گئے پھر تھوڑی دیر بعد تشریف لے آئے اور کہنے لگے آج میں رب العزت سے اس قدر قریب ہوا جتنا کبھی نہیں ہوا تھا، آپ نے پوچھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ کہا: میرے اور میرے رب کے درمیان صرف ستر ہزار نوری پردے پڑے ہوئے تھے، پھر جو سوال کیا گیا تھا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جواب نقل کیا کہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

”شر البقاع أسواقها وخير البقاع مساجدها“. رواه ابن حبان في صحيحه عن ابن عمر رضي الله عنهما (أيضاً). (۲)

زمین کا بدتر حصہ اس کے بازار ہیں اور بہترین حصہ اس کی مسجدیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر سوال کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن جواب بحیثیت رسول آپ کے ذمہ ضروری تھا لہذا آپ حضرت جبرئیل امینؑ کے ذریعہ جواب معلوم کرتے اور پھر سائل کو جواب مرحمت فرماتے۔

---

(۱) مشکوٰۃ، باب المساجد: ص:۷۱۔

(۲) مشکوٰۃ، باب المساجد: ص:۷۱۔

عجلت پسندی سے اجتناب اور بڑے کی طرف رجوع:

ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) نے اس حدیث کے ضمن میں طیبیؒ (م ۷۴۳ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"إن من استفتی عن مسئلة لایعلمها فعلیه أن لایعجل فی الإفتاء ولایستنکف عن الاستفتاء عمن هو أعلم ولایبادر إلی الاجتهاد مالم یضطر إلیه فإن ذلک من سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم وسنة جبریل علیه السلام". (۱)

جس مفتی سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا جائے جس کا جواب وہ جانتا نہیں ہے تو اس کا فرض ہے کہ نہ وہ فتویٰ دینے میں عجلت کرے اور نہ اپنے سے بڑے عالم سے پوچھنے میں شرمائے اور جب تک بالکل اضطرار کی سی کیفیت پیش نہ آ جائے اجتہاد کی ہمت نہ کرے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریلؑ کا یہی طریقہ تھا۔

گویا مفتی کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اولاً نص کی تلاش کرے اور اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہونے دے اگر اسے کوئی نص نہ مل سکے تو کسی بڑے عالم یا مفتی سے دریافت کرے پوچھنے میں ننگ و عار سے کام نہ لے اور جب تک قابل اطمینان جواب مل نہ جائے بغیر علم غلط صحیح جو جی میں آئے جواب دینے کی کوشش نہ کرے اور یہ کہ مسائل میں اجتہاد اس وقت کیا جائے جب صراحتاً کوئی آیت یا حدیث یا قول صحابہ نہ مل سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ کی حیثیت:

کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ کی حیثیت بہت اونچی ہے کیونکہ آپ کی ذات اقدس ارفع واعلیٰ ہے، آپ خاتم النبین اور عصمت کی دولت سے نوازے ہوئے تھے، یہ ایک اصولی بات ہے کہ جواب کی جامعیت و کاملیت اور اس کے الفاظ کا جچا تلا ہونا، جواب دینے والے کی علمی لیاقت اور اس کے شایان شان ہوتا ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات کی حیثیت "**جوامع الکلم**" اور "**فصل خطاب**" کی ہے جس سے سرتابی کا خیال بھی ایک مسلمان کے لئے گناہ عظیم ہے ارشاد ربانی ہے:

"فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلاً". (۲)

پھر اگر تم کسی امر میں اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالہ کیا کرو، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ طریقہ سب سے بہتر ہے اور اس کا انجام خوش تر ہے۔

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح۔

(۲) سورۃ النساء:۸۔

منصب افتا پر صحابۂ کرامؓ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس عظیم الشان منصب پر آپ کے وہ جلیل القدر، صاحب بصیرت، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فائز ہوئے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

''رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ''.(۱)

اللہ تعالیٰ ان سے راضی وخوش ہوئے اور یہ اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی ہیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''أصحابی کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهتدیتم''.(۲)

میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جن کی تم اقتدا کروگے، ہدایت یاب ہوگے۔

اور جنہیں کتاب وسنت کا فہم خصوصی حاصل تھا اور جن کے باب میں امت کا فیصلہ ہے:

''ألین الأمة قلوباً وأعمقها علماً وأقلها تکلفاً وأحسنها بیاناً وأصدقها إیماناً وأعمها نصیحةً وأقربها إلی اللّٰه وسیلةً''.(۳)

صحابۂ کرامؓ امت میں سب سے زیادہ نرم دل سب سے زیادہ گہرے علم والے، سب سے کم تکلف کرنے والے اور حسن بیان میں سب سے بڑھ کر ہیں، اسی طرح ایمان میں سب سے زیادہ سچے، خیر خواہی میں سب سے آگے اور باعتبار وسیلہ اللہ سے قریب تر ہیں۔

صاحب فتویٰ صحابۂ کرامؓ کی تعداد:

صحابۂ کرامؓ باہمی فہم وفراست اور ذہانت وذکاوت میں مختلف تھے، ان میں جو صاحب فتویٰ تھے ان کی تعداد کے متعلق حافظ ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) کا بیان ہے کہ وہ کچھ اوپر ایک سو تیس میں سے سات کا مکثرین میں شمار کیا گیا ہے، یہ وہ بزرگوار ہیں جن کے فتاویٰ کتب حدیث میں بکثرت منقول ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر ان تمام حضرات کے فتاویٰ یکجا کئے جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ کی تعداد اتنی ہو کہ اس کی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں، ان سات کے نام یہ ہیں:

''حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ''۔

---

(۱) سورۃ التوبة:۱۳۔

(۲) مشکوٰۃ، باب مناقب الصحابةؓ۔

(۳) إعلام الموقعین: جلد ۱ ص ۵۔

صحابہؓ کے بعد فتاویٰ:

پھر ان حضرات اور دوسرے صحابۂ کرامؓ کے ذریعہ دینی علوم نے نشو ونما پائی اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا چلا گیا، یہ سلسلہ الحمدللہ کسی منزل پر پہنچ کر ٹوٹا نہیں بلکہ اب تک قائم ہے اور یقین کامل ہے کہ تا قیامت یوں ہی قائم رہے گا، چنانچہ صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعین، تابعین کے بعد، تبع تابعین، پھر بعد کے علما وفقہا نے اس سلسلہ کو قائم رکھا۔

فقہ حنفی:

فقہ حنفی تمام تر کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اور اقوال صحابہؓ سے مستفاد ہے، مگر سلسلۂ اسناد اس کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت علیؓ پر جا کر منتہی ہوتا ہے، جو اولین ایمان لانے والوں میں ہیں، اور ان کے علاوہ ان صحابۂ کرامؓ سے بھی ملتا ہے جن کے شاگردوں سے امام اعظمؒ نے استفادہ کیا، ان کی تعداد کم وبیش چار ہزار مورخین نے لکھی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (جو فقہ حنفی کے مورث اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں) کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع سے ارشاد فرمایا:

"رضيت لأمتي مارضي لهاابن أم عبد يعني عبدالله بن مسعود". (۱)

میں نے اپنی امت کے لئے ان چیزوں کو پسند کیا جنہیں عبداللہ بن مسعود نے پسند کیا۔

اور امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) نے اپنی کتاب "التقریب" میں حضرت مسروقؒ (م۶۲ھ) سے یہ روایت نقل کی ہے:

"انتهىٰ علم الصحابة إلىٰ ستة عمرؓ وعليؓ وأبيؓ وزيدؓ وأبي الدرداءؓ وابن مسعودؓ ثم انتهىٰ علم الستة إلىٰ عليؓ وعبدالله بن مسعودؓ". (۲)

صحابۂ کرامؓ کے علوم چھ پر آکر ختم ہوئے حضرت عمرؓ، علیؓ، ابیؓ، زیدؓ، ابوالدرداءؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، پھر ان چھ کا علم حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر سمٹ آیا۔

ان دونوں (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ) کے علوم کے ممتاز خوشہ چیں حضرت علقمہؒ (م۶۳ھ) تھے جن کی پیدائش عہد نبوی کی ہے اور جنھوں نے ان حضرات کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، اور حضرت ابودرداءؓ سے خصوصی طور پر تعلیم پائی تھی، حضرت علقمہؒ سے حضرت ابراہیم نخعیؒ (المتوفی ۹۶ھ) نے اور حضرت ابراہیم نخعیؒ سے حماد بن سلمہ الکوفیؒ (المتوفی ۱۱۰ھ) نے تعلیم پائی اور حماد بن سلمہ الکوفیؒ سے امام ابوحنیفہؒ (المتولد ۸۰ھ والمتوفی ۱۵۰ھ) نے ان

---

(۱) الإكمال في اسماء الرجال للخطيب البغدادی۔

(۲) ردالمحتار: جلد ۱ ص ۴۶۔

(۳) تفصیل کیلئے پڑھئے: تاریخ التشریع الإسلامی لمحمد خضری بک اور تاریخ التشریع الاسلامی لعبداللطیف محمد السبکی۔ظفیر۔

کے علاوہ ہزاروں دوسرے علما ومشائخ سے بھی علم حاصل کیا تھا اور امام ابوحنیفہؒ سے امام ابو یوسفؒ (م۱۸۲ھ) امام محمدؒ (م ۱۸۹ھ) اور امام زفرؒ (۱۵۸ھ) اور دوسرے سیکڑوں علما ومشائخ نے علم حاصل کیا اور پھر اس طرح یہ ''فقہ حنفی'' پورے عالم میں پھیل گیا اور بقول ملا علی قاریؒ (م۱۰۱۴ھ) دو تہائی مسلمان اس فقہ پر عمل کرنے والے نظر آنے لگے اور اب تک آرہے ہیں۔

افتا ایک اہم ذمہ داری ہے اور یہی وجہ تھی کہ اسلاف اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے احتراز کرتے تھے اور جن کو وہ اپنے سے علم وعمل میں برتر سمجھتے تھے ان کے سر یہ ذمہ داری ڈالنا چاہتے تھے پھر اس باب میں ان کا حال یہ تھا کہ اگر مسئلہ مستفسرہ کی صحیح صورت معلوم ہوتی تو بلا تکلف بتادیتے، اور اگر معلوم نہ ہوتی تو صفائی سے کہہ دیتے ہمیں یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کسی اور سے پوچھ لیا جائے، کھینچ تان اور تکلف وتصنع کو کسی حال میں پسند نہیں کرتے تھے۔

اور سچ پوچھئے تو یہی سلسلہ چل کر ہمارے اس دور تک پہنچا ہے، یوں دوسرے سلسلے بھی اس میں آکر ملے ہیں جس کا سب سے بڑا امر کز اس وقت عالم اسلام میں دار العلوم دیو بند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ) ہے جہاں کتاب وسنت اور فقہ و فتاویٰ کی تعلیم کا ایک خاص اسلوب اور مخصوص معیار ہے اور جسے اس وقت بحمد اللہ بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور جہاں اس وقت ہندوستان، پاکستان، افغانستان، برما، ملایا، تبت، افریقہ، انڈونیشیا، نیپال اور دوسرے ممالک کے طلباء دین حاضر ہوتے ہیں اور اپنی علمی تشنگی بجھاتے ہیں۔(۱)

افتا کے لئے علم وفہم (۲):

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص پوچھنے والے کے ہر سوال کا جواب بے سمجھے بوجھے دینے لگے وہ ''پاگل'' ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

''إن من أفتىٰ الناس فی کل ما یسألونه عنه لمجنون''. (۳)

جو شخص لوگوں کے تمام سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار بیٹھا رہے وہ ''پاگل'' ہے۔

حضرت سعید بن سحنون رحمہ اللہ کا بیان ہے:

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیو بند مقدمہ جلد اول: ص ۸۶۔

(۲) **مفتی کی مطلوبہ صفات:**

مفتی کو مسلمان، قابل اعتماد، شرعی احکام کا پابند، عاقل، بالغ، فقیہ، صحیح العقیدہ، زیرک ودانشمند، بیدار مغز، اخذ واستنباط کی صلاحیت کا حامل اور غیر جانبدار ہونا چاہئے، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی فتاویٰ دے سکتی ہیں اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا افتا میں امتیازی مقام کی حامل تھیں۔ (ماخوذ: باب آداب الفتویٰ والمفتی والمستفتی '' مقدمة شرح المهذب، ملخصاً) (کتاب الفتاویٰ جلد اول: ۲۵۵)

(۳) إعلام الموقعین: ج ۱ص ۱۲۔

''أجرأ الناس على الفتيا أقلهم علماً''. (۱)

فتویٰ پر بڑا بے باک وہ ہوتا ہے جو کم علم ہوتا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس طرح کے تمام بیانات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''الجراء على الفتيا يكون من قلة العلم ومن غرارته ووسعته فإذا قل علمه أفتىٰ عن كل مايسئل عنه بغير علم''. (۲)

فتویٰ پر جری ہونا قلت علم، ناتجربہ کاری اور بھولے پن کی دلیل ہے کیوں کہ جب آدمی کا علم کمتر ہوتا ہے تو وہ ہر سوال کا جواب دیتا ہے بغیر جانے بوجھے۔

مفتی کا فریضہ:

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہوگا وہ استفتاؤں کے جوابات دینے یا لکھنے میں پوری بصیرت سے کام لے گا اور سوچ سمجھ کر جواب دے گا معلوم نہ ہوگا، کہہ دے گا ''دوسرے علما سے تحقیق کر لی جائے'' اور جسے ذمہ داری کا پورا احساس نہ ہوگا اس کے پیش نظر اپنی بڑائی ہوگی اور بس۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''يا أيها الناس من علم شيئاً فليقل به ومن لم يعلم فليقل ''اللّٰه أعلم'' فإن من العلم أن تقول لما لا تعلم اللّٰه أعلم قال اللّٰه تعالىٰ لنبيه: قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ''. متفق عليه. (۳)

اے لوگو! جو شخص کسی چیز کا علم رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ وہ اسے بیان کرے اور جسے علم نہ ہو، اسے کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، کیوں کہ یہ بھی علم ہے کہ جو بات نہ جانتا ہو، اس کے متعلق کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا ہے کہ: آپ فرما دیں کہ میں تم سے اجرت کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔

خوف خدا:

لیکن دراصل مفتی وہی ہے جس کا دل خوف خدا سے لبریز ہو، اور جو جواب دے خوب دیکھ بھال کرے تا کہ اس کی دانست میں کوئی غلطی یا کوتاہی نہ رہنے پائے، مفتی کا فرض ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مستحضر رکھے:

(۱) إعلام الموقعين ج۱ ص۱۲۔

(۲) إعلام الموقعين: ۱۲۔

(۳) مشکوٰۃ، کتاب العلم۔

"من قال علی ما لم أقل فلیتبوأ بیتاً فی جھنم ومن أفتیٰ بغیر علم کان إثمه علی من أفتاه" رواه أبو داؤد.(۱)

جو شخص میرے خلاف وہ بات کہے جو میں نے کہی نہیں ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے اور جو مفتی بغیر علم کسی مسئلہ کا جواب دیگا اس کا گناہ اس مفتی پر ہوگا۔

غور و فکر:

اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمہ اللہ (م۱۰۱۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی کل جاھل سأل عالماً عن مسئلة فأفتاه العالم بجواب باطل فعمل السائل بھا لم یعلم بطلانھا فإثمه علی المفتی إن قصّر فی اجتھاده".(۲)

یعنی اگر کوئی جاہل کسی عالم سے کوئی مسئلہ دریافت کرے اور وہ غلط جواب دے۔ پس سوال کرنے والا اس غلط جواب پر اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے عمل کرے تو اس کا گناہ اور وبال مفتی پر ہے اگر اس کی طرف سے صحیح جواب کی تلاش میں کوتاہی ہوئی ہے۔

اور اصولاً ذمہ داری مفتی ہی پر ہے بھی، کیونکہ اس کی غلطی نقصان دہ ہے، فتویٰ عام ہوتا ہے صرف سائل تک اس کا حکم محدود نہیں ہوتا بلکہ آئندہ جسے بھی مسئلہ کی یہی مخصوص صورت پیش آئے گی اسی جواب پر عمل کرے گا جو مفتی لکھ چکا ہے۔

مستفتی کا فریضہ:

اس حدیث میں بعض لوگوں نے دوسرے "أفتیٰ" کو "استفتیٰ" کے معنی میں لکھا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ گناہ مستفتی پر ہوگا، کہ اس نے بغیر جانے بوجھے ایسے شخص سے دریافت کیا جو اس کا اہل نہیں تھا۔

"قال الأشرف وزین العرب یجوز أن یکون أفتیٰ الثانی بمعنی استفتیٰ وأفتیٰ الأول معروفاً أی کان إثمه علیٰ من استفتاه فإنه جعله فی معرض الإفتاء بغیر علم".(۳)

اشرف اور زین العرب نے کہا کہ یہ بھی درست ہے کہ دوسرا لفظ "أفتیٰ" "استفتیٰ" کے معنی میں ہو اور پہلا "أفتیٰ" معنی معروف میں اور مطلب یہ ہو کہ اس کا گناہ اس شخص پر ہوگا جس نے پوچھا ہے اس لئے کہ اس نے بغیر جانے بوجھے اسے مفتی بنالیا۔

مفتی و مستفتی دونوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس باب میں احتیاط سے کام لے، مستفتی کو چاہئے کہ وہ دیکھ لے کہ جس سے مسئلہ دریافت کر رہا ہے وہ اس منصب کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ ابن سیرینؒ نے دینی علوم کے سلسلہ میں فرمایا ہے:

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب العلم۔

(۲) مرقاۃ: ۱/۲۴۶۔

(۳) مرقاۃ: ۱/۲۴۵۔

”قال: إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم“. رواه مسلم. (۱)

کہا کہ یہ علم دین ہے، لہذا خوب اچھی طرح دیکھ لیا کرو کہ تم کس شخص سے اپنا دین حاصل کر رہے ہو۔

نالائق مفتی اسلام کی نظر میں:

مفتی کا فریضہ ہے کہ اگر وہ اس منصب کے لائق نہیں ہے تو پھر ہرگز افتا کی جرأت نہ کرے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا اور سخت مجرم، اور جس صاحب اقتدار نے اسے اس منصب پر فائز کیا ہے وہ بھی گناہ گار ہوگا۔ علامہ ابن القیمؒ نے لکھا ہے:

”من أفتى الناس وليس بأهل للفتوىٰ فهو آثم عاص ومن أقره من ولاة الأمور علىٰ ذلك فهو آثم أيضاً“. (۲)

جو نااہل ہونے کے باوجود لوگوں کو فتویٰ دینے لگے وہ گناہگار اور نافرمان ہے اور وہ ذمہ دار بھی جو ایسے شخص کو اس عہدہ پر رہنے دے وہ بھی گناہ گار ہے۔

نااہل مفتی اور حکومت وقت کا فریضہ:

علامہ ابن الجوزیؒ (م ۵۹۷ھ) اور دوسرے علما نے بھی لکھا ہے کہ صاحب اقتدار کا فرض ہے کہ وہ ایسے نااہل مفتی کو کار افتا سے سختی کے ساتھ روک دے، اس لئے کہ اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی راستہ نہ جانتا ہو اور پھر قافلہ کی راہنمائی پر مامور کر دیا جائے یا خود ہو جائے، یا اس ڈاکٹر و طبیب کی ہے جسے خبر نہیں کہ مرض کیا ہے اور علاج شروع کر دے، حدیث میں ایسے طبیب کو علاج سے منع کیا گیا ہے اور اسلامی قانون میں ایسا معالج مجرم ہے۔ یہی حال اس نااہل مفتی کا ہے، ابن ماجہ میں مرفوع حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”من أفتىٰ بفتيا بغير علم كان إثم ذلك على الذى أفتاه“. (۳)

جو شخص بغیر علم فتویٰ دے گا اس کا گناہ اس پر ہوگا جو فتویٰ دے رہا ہے یعنی مفتی گنہگار ہوگا۔

علامات قیامت میں:

صحیحین میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إن اللّٰه لا يقبض العلم انتزاعاً ينتزعه عن صدور الرجال ولكن يقبض العلم بقبض العلماء فإذا لم

(۱) مشکوٰۃ، کتاب العلم: ۳۷۔

(۲) إعلام الموقعين: جلد۲ص ۲۵۶۔

(۳) إعلام الموقعين: جلد۲ص ۲۵۶

يبق عالم اتخذ الناس رؤساً جهالاً فسئلوا فأفتوا بغير علم فضلوا وأضلوا". متفق عليه. (۱)

اللہ تعالیٰ اس طرح علم ختم نہیں کرے گا کہ لوگوں کے سینوں سے اسے زبردستی کھینچ لے گا بلکہ علم، علما کے اٹھ جانے سے ختم ہوگا جب کوئی عالم باقی نہ بچے گا تو اس وقت لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے، چنانچہ ان سے لوگ سوال کریں گے اور وہ بلا علم فتویٰ صادر کریں گے اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

بغیر علم فتویٰ:

یعنی جب مفتی وقاضی جاہل کو بنایا جائے گا تو پھر اس سے سوائے گمراہی و بربادی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، ابن القیمؒ نے ابوالفرجؒ کے حوالہ سے اس اثر مرفوع کو نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من أفتىٰ الناس بغير علم لعنته ملائكة السماء وملائكة الأرض". (۲)

جو شخص بغیر علمی بصیرت کے کار افتا انجام دیتا ہے اس پر زمین وآسمان کے فرشتے لعنت برساتے ہیں۔

امام مالکؒ کا فرمان:

امام مالک رحمہ اللہ نے بڑی اچھی بات فرمائی ہے کہ جس سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اسے چاہئے کہ جواب سے پہلے اپنے آپ کو جنت دوزخ پر پیش کرے اور سوچ لے کہ آخرت میں اسے چھٹکارا کیوں کر حاصل ہوگا۔

امام مالکؒ اور فتویٰ:

خود امام مالک رحمہ اللہ کا اپنا حال یہ تھا کہ ایک دفعہ کسی نے آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، آپ نے جواب میں فرمایا: مجھے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا اتنا ذرا سا مسئلہ ہے اور آپ ایسا فرماتے ہیں۔ یہ سن کر آپ غصہ ہوئے اور فرمایا:

"ليس في العلم شيء خفيف أما سمعت قول الله عز وجل "إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيلاً" فالعلم كله ثقيل إلخ". (۳)

علم میں کوئی چیز ہلکی نہیں ہوا کرتی کیا تم نے یہ آیت کبھی نہیں سنی ہے "اِنَّا سَنُلْقِيْ إلخ" البتہ ہم ڈالیں گے تم پر ایک بھاری بات، لہٰذا علم سارا کا سارا بھاری ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

"ماأفتيت حتى شهد لي سبعون أني أهل لذلك". (۴)

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب العلم: ص ۳۳۔

(۲) إعلام الموقعين: جلد۲ ص ۲۵۶۔

(۳،۴) اعلام: ج۲ ص ۲۵۷۔

میں نے اس وقت تک فتویٰ کی جرأت نہیں کی جب تک ستر اکابر نے میری اہلیت کی شہادت نہیں دی۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے کو فتویٰ کے لئے پیش کردیا، اس نے ایک امر عظیم کو اٹھالیا، جب تک ضرورت مجبور نہ کردے اس منصب پر فائز ہونے کی جرأت نہ کرے۔

سعید بن المسیبؒ:

سعید بن المسیبؒ (م ۹۳ھ) جیسا آدمی جب فتویٰ دینے چلتا تو ان کی زبان پر یہ کلمات ہوتے:

"اللّٰهم سلمنی وسلم منی". (۱)

اے اللہ مجھے خود سلامت رکھنا کہ غلطی نہ ہونے پائے اور مجھ سے محفوظ رکھنا کہ دوسرے میری وجہ سے غلطی میں نہ مبتلا ہوں۔

قاسم بن محمدؒ کا جواب:

قاسم بن محمد بن ابی بکر رحمہ اللہ (م ۱۰۱ھ) سے کسی نے کوئی بات دریافت کی، آپ نے جواب دیا، مجھے یہ مسئلہ اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔ اس شخص نے کہا میں تو آپ کے سوا کسی کو اس منصب کے لائق جانتا ہی نہیں، اسی لئے آپ کے پاس آیا، حضرت قاسم بن محمدؒ نے فرمایا:

"لاتنظر إلٰی طول لحیتی و کثرة الناس حولی". (۲)

میری لمبی ڈاڑھی اور میرے اردگرد لوگوں کی بھیڑ پر مت جاؤ۔

یہ اور اس طرح کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالحین منصب افتا کے سلسلہ میں بڑا اہتمام کیا کرتے تھے اور ان میں اس منصب پر وہی فائز ہونے کی ہمت کرتا جو علوم دینیہ میں ہر طرح باکمال ہوتا۔

مفتی کے لئے شرائط:

اسی اہمیت کے پیش نظر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مسند افتا پر وہی بیٹھنے کی جرأت کرے جو وجوہ قرآن، اسانید صحیحہ اور سنن نبوی سے پورے طور پر واقف ہو"۔

---

(۱) اعلام ص ۲۵۷ ج ۲۔

(۲) حوالہ سابق۔

ایک دفعہ آپؒ نے فرمایا:

"لایجوز الفتیا إلا لرجل عالم بالکتاب والسنة". (۱)

فتویٰ دینا جائز نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو کتاب وسنت کا عالم ہو۔

مفتی کے لئے جن شرائط کا ہونا ضروری ہے ان سارے اوصاف سے پورے طور پر متصف انسان کا ملنا آج کل مشکل ہے لیکن موجودہ دور میں جب کہ کتب احادیث وفقہ مدون ومرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں اور حافظہ کا حال بھی پہلا سا باقی نہیں رہا جو کبھی تھا کہ ایک عالم کو کئی کئی لاکھ حدیثیں یاد ہوا کرتی تھیں لہذا اب دیکھا جائیگا کہ جن لوگوں کو فقہ و حدیث سے شغف کتاب وسنت سے دلچسپی کتب فقہ کے مطالعہ کا ذوق سلیم حاصل ہے اور ساتھ ہی انہوں نے علوم دینیہ باضابطہ علمائے دین سے سبقاً سبقاً حاصل کیا ہے تو ان میں یہ خدمت ان لوگوں کے سپرد ہوگی جو مسائل شرعیہ میں دقیق نظر رکھتے ہیں، اس لئے کہ اب موجودہ اصطلاح میں فقیہ ایسے ہی لوگ مانے جاتے ہیں۔

"إن الفقیه من یدقق النظر فی المسائل وإن علم ثلاث مسائل بأدلتها". (۲)

فقیہ وہ ہے جو مسائل شرعیہ میں دقیق نظر رکھتا ہو خواہ اسے تین ہی مسئلہ دلائل کے ساتھ کیوں نہ معلوم ہوں۔

علامہ ابن عابدینؒ نے صاحب التحریر کی تعریف کو ترجیح دی ہے، وہ یہ ہے:

"وذکر فی التحریر أن شائع إطلاقه علٰی من یحفظ الفروع مطلقاً أی سواء کانت بدلائلها أولا". (۳)

تحریر میں مذکور ہے کہ عام طور سے (فقیہ) کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جسے جزئی مسائل یاد ہوں خواہ دلائل کے ساتھ خواہ بغیر دلائل۔

فقیہ اور اجتہاد:

بات یہ ہے کہ فقہ کی جو اصولیین نے تعریف کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ فقیہ کے لئے مجتہد ہونا ضروری ہے۔

"واصطلاحاً عن الأصولیین: العلم بأحکام الشریعة الفرعیة المکتسبة من أدلتها التفصیلیة". (۴)

علماء اصول فقہ کی اصطلاح میں فقہ ان احکام شرعیہ فرعیہ کے جاننے کو کہتے ہیں جو تفصیلی دلائل سے حاصل ہوئے ہوں۔

---

(۱) إعلام الموقعین: جلد۲ ص۲۵۲۔

(۲) ردالمحتار: جلد۱ ص۳۵۔

(۳) ردالمحتار: جلد۱ ص۳۵۔

(۴) الدرالمختار مع ردالمحتار: جلد ۱ ص ۳۴۔

چنانچہ البحر الرائق میں ہے:

”**فالحاصل أن الفقه في الأصول علم الأحكام من دلائلها كما تقدم فليس الفقيه إلا المجتهد عندهم**“.(۱)

حاصل یہ ہے کہ اصول فقہ میں فقہ نام ہے دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ کے جاننے کا، جیسا کہ گذرا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک سوائے مجتہد کے کوئی فقیہ نہیں ہے۔

غیر مجتہد فقیہ:

باقی مقلد کو جو آج کل فقیہ کہا جاتا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

”**وإطلاقه على المقلد الحافظ للمسائل مجاز**“.(۲)

فقیہ کا اطلاق اس مقلد پر جو مسائل یاد رکھتا ہے بطور مجاز ہے۔

فقہا، فقہ کی تعریف میں دلائل کی قید نہیں لگاتے:

”**وعند الفقهاء حفظ الفروع وأقله ثلاث**“.(۳)

فقہا کے نزدیک فروع کے یاد رکھنے کا نام فقہ ہے جس کا کمتر درجہ تین مسئلے ہیں۔

افتا کے لئے اجتہاد کی شرط:

اس قدر مسلم ہے کہ اصولیین نے جو فقہ کی تعریف لکھی ہے اس کے مطابق فقیہ اور مفتی دونوں کے لئے مجتہد ہونا ضروری ہوجاتا ہے، فقیہ کے متعلق تو آپ پڑھ چکے، مفتی کے سلسلہ میں ابن الھمامؒ (م۸۶۱ھ) فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

”**وقد استقر رأي الأصوليين علىٰ أن المفتي هو المجتهد فأما غير المجتهد ممن يحفظ أقوال المجتهد فليس بمفت**“.(۴)

اصولیین کی رائے طے پاچکی ہے کہ مفتی وہی ہے جو مجتہد ہو، باقی وہ غیر مجتہد شخص جو مجتہد کے اقوال یاد رکھتا ہے، مفتی نہیں ہے۔

پھر آگے چل کر انہوں نے اس کی صراحت کردی ہے کہ موجودہ مقلد علما کا فتویٰ دراصل فتویٰ نہیں نقل فتویٰ ہے۔

---

(۱) ردالمحتار: ج۱ص۳۵۔

(۲) حوالہ سابق۔

(۳) درمختار۔

(۴) ردالمحتار: جلد۱ص۶۴۔

"فعرف أن مایکون فی زماننا من فتویٰ الموجود ین لیس بفتوٰی بل ھو نقل کلام المفتی لیأخذ به المستفتی". (۱) ☆

پس معلوم ہوا کہ ہمارے موجودہ علما کا فتویٰ حقیقتاً فتویٰ نہیں بلکہ مفتی کے کلام کی نقل ہے تا کہ مستفتی اسے اختیار کر کے عمل کرے۔

---

(۱) ردالمحتار: جلد ا ص ۶۴۔

☆ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ منصب افتا کتنی اہم اور عظیم الشان ذمہ داری ہے، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عاقل وبالغ، مسلمان، معتمد، اسباب فسق اور خلاف مروت باتوں سے دور، متورع، فقیہ النفس، سلیم الفکر، قوت استنباط کا حامل اور بیدار مغز ہو۔ (**شرح المھذب: ۴۱/۱**)

اسی لئے متقدمین، مفتی کے لئے بھی اجتہاد کو ضروری قرار دیتے تھے، علامہ صنعانیؒ افتا کی اہلیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**ھو من استکمل فیه ثلاثة شروط: الاجتهاد والعدالة والکف عن الترخیص والتساھل" (تھذیب الفروق: ۱۶/۲)**. (مفتی وہ ہے جو تین شرطوں کا جامع ہو: اجتہاد، عدالت، تساہل اور سہولت پسندی سے اجتناب)۔

بعد میں جب علمی انحطاط پیدا ہوا، نہ ایسے لوگ باقی رہے جو اجتہاد کے اہل ہوں اور نہ اتنی دیانت باقی رہی کہ لوگوں کی شخصی رائے پر پورا اعتماد کیا جاسکے تو اہل علم نے یہ فیصلہ کیا کہ ان حالات میں نقل فتویٰ ہی کافی ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اپنے امام کی آراء، ان کے قواعد اور اسالیب اجتہاد پر نظر رکھتا ہو، علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں: "**ویشترط أن یحفظ مسائل الأئمة ویعرف قواعده وأسالیبه" (الطحطاوی علی الدرالمختار: ۱۷۵/۳)** (مفتی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے امام کے مسائل کو یاد رکھے اور اس کے قواعد واسالیب سے واقف ہو)۔

تاہم ظاہر ہے کہ ہر عہد میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، زمانہ کے احوال اور عرف میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں اور اس کی وجہ سے اجتہادی احکام میں بعض اوقات تغیر ناگزیر ہو جاتا ہے، اس لئے مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے احوال اور عرف پر گہری نظر رکھتا ہو، علامہ شامیؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اور مفتی کے لئے زمانہ سے آگہی نہایت ضروری قرار دیا ہے: "**وکذا لابد له من معرفة عرف زمانه وأحوال أھله". (شرح عقود رسم المفتی: ۴۰)**۔

بلکہ اہل علم نے یہاں تک لکھا ہے کہ جس نے احوال زمانہ کو نہیں جانا، وہ گویا جاہل ہے: "**من جھل بأھل زمانه فھو جاھل**"۔

حقیقت یہ ہے کہ افتا نہایت نازک کام ہے، اس کے لئے ایک طرف مصادر شرعیہ پر گہری نظر، اصول وقواعد استنباط سے آگہی، فقہا کے اجتہادات کا وسیع مطالعہ، اپنے زمانہ کے احوال سے باخبری اور ان سب کے ساتھ ساتھ تقویٰ، خشیت الٰہی، دیانت، عنداللہ جواب دہی کا احساس، اباحیت اور اتباع ہوا سے کامل اجتناب جیسے اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی طبیعت میں احتیاط اور ورع کی کیفیت پائی جاتی ہو، اسی لئے حضرات صحابہؓ جن کے عمیق العلم اور سلیم القلب ہونے کی شہادت دی گئی ہے، ان میں کل ۱۳۰ سے کچھ اوپر اشخاص تھے، جن سے فتویٰ دینا ثابت ہے، ان میں بھی وہ صحابہ جن سے زیادہ فتاویٰ منقول ہیں، ان کی تعداد صرف سات ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ۔ (**إعلام الموقعین: ۱۲/۱**)

حضرات سلفؒ فتویٰ دینے سے گھبراتے تھے اور جب تک کوئی شدید ضرورت متقاضی نہ ہو، خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے، قاسم بن محمدؒ (جو مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہیں) سے ایک صاحب نے کچھ سوال کیا، انہوں نے جواب دینے سے معذرت کی، جب مستفتی نے جواب کے لئے اصرار کیا تو فرمایا کہ یہ بات کہ میری زبان تراش لی جائے، مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں بغیر علم کے کسی مسئلہ میں اظہار خیال کروں۔ (**إعلام الموقعین: ۲۱۹/۴**)

قاضی عبدالرحمٰنؒ ابن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ میں نے بیس صحابہؓ کو پایا ہے، میں ان میں ہر ایک کو دیکھتا تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ چاہتے کہ ان کا کوئی بھائی اس کا جواب دے دے: "**مامنھم رجل یسئل عن شيء إلا ودّ أن أخاه کفاه". (إعلام الموقعین: ۳۴/۱)** ==

موجودہ دور میں کار افتا:

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے اس زمانہ میں کار افتا انجام دینے والے علما مجازاً مفتی کہے جاتے ہیں لیکن اس زمانہ میں بھی ایسے علما کے لئے فقہ میں پوری بصیرت ضروری ہے اور باضابطہ تحصیل علم دین بھی۔ علامہ ابن عابدینؒ (م ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

وقد رأيت في فتاویٰ العلامة ابن حجرؒ سئل في شخص يقرأ ويطالع في الكتب الفقهية بنفسه ولم يكن له شيخ ويفتي ويعتمد على مطالعة الكتب فهل يجوز له ذلک أم لا، فأجاب بقوله لايجوز له الإفتاء بوجه من الوجوه لأنه عامي جاهل لايدری مايقول، بل الذی يأخذ العلم عن المشائخ المعتبرين.(۱)

میں نے علامہ ابن حجرؒ کے فتاویٰ میں یہ بات دیکھی ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا، جو کتب فقہ پڑھتا ہے اور خود سے مطالعہ کرتا ہے کوئی اس کا استاذ نہیں ہے اور وہ اپنے مطالعۂ کتب کے اعتماد پر افتا کا کام کرتا ہے تو کیا یہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ کسی طرح بھی اس کے لئے کار افتا درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت جاہل وعامی ہے اسے خود معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ فتویٰ دینا ان لوگوں کا کام ہے جنھوں نے مستند علما ومشائخ سے علم حاصل کیا ہے۔

== ایک طرف افتا کی ذمہ داری بہت نازک ہے اور دوسری طرف امت مسلمہ کے لئے یہ ایک ایسی ضرورت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے علما نے افتا کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اگر کسی علاقہ میں ایک ہی شخص مسائل شرعیہ کے بارے میں جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، کوئی اور شخص اس کا اہل نہ ہو تو پھر اس کے لئے فتویٰ دینا فرض عین ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں: "**فإن لم يكن غيره تعين عليه وإن كان غيره فهو فرض كفاية**"، (**البحر الرائق:۱/۴۵**)

اگر اس کے علاوہ کوئی اور فتویٰ دینے کا اہل نہ ہو تو فریضہ متعین طور پر اس کے ذمہ ہے، اور اگر اس صلاحیت کا دوسرا شخص بھی موجود ہو تو فرض کفایہ ہے۔

اور امام نوویؒ کا بیان ہے: "**الإفتاء فرض كفاية فإذا استفتي وليس في الناحية غيره تعين عليه الجواب**"، (**مقدمه شرح المهذب:۱/۴۵**) (فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے لیکن اگر استفتا کیا جائے اور اس علاقہ میں اور کوئی مفتی نہ ہو تو اس کے لئے فتویٰ دینا فرض عین ہے)۔

احکام شرعیہ کے بارے میں رہنمائی اور افتا، جہاں فتویٰ کی صلاحیت رکھنے والے علما کا انفرادی اور شخصی فریضہ ہے، وہیں مسلمانوں کے امیر اور ارباب حل وعقد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کی شرعی رہنمائی کے لئے مفتی کا تقرر کریں اور جہاں اہل افراد ہوں ان کو اس ذمہ داری پر مامور فرمائیں، وہیں جو لوگ اس کے اہل نہ ہوں ان کو افتا سے منع کردیں، امام نوویؒ نے خطیب بغدادیؒ سے نقل کیا:

"**ينبغي للإمام أن يتصفح أحوال المفتيين فمن صلح للفتيا أقره ومن لا يصلح منعه**"، (**شرح المهذب:۱/۴۱**) (امام کو چاہئے کہ مفتیوں کے احوال کے بارے میں جستجو سے کام لے، جو فتویٰ دینے کا اہل ہو اس کو اس کام پر برقرار رکھے اور جو اس کا اہل نہ ہو اس کو فتویٰ دینے سے روک دے)۔

نیز ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں: "**وينبغي للإمام أن يبحث عن أهل العلم عمن يصلح ويمنع من لا يصلح**"، (**الفتاویٰ الهندية:۳/۳۰۹، البحر الرئق:۳/۲۹۱**) (امام کے لئے مناسب ہے کہ اہل علم کے بارے میں تحقیق کرے کہ کون فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جو صلاحیت نہیں رکھتا ہو، اسے منع کردے۔ (مقدمۂ فتاویٰ امارت شرعیہ:۱/۲۱-۲۳۔)

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ص ۸۔

معتمد علما کی صحبت:

اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ صرف مطالعہ وکتب بینی سے خواہ معلومات کتنی ہی کیوں نہ ہوجائیں کسی درجہ میں قابل اعتماد نہیں ہے بلکہ وہ عامی جاہل کے درجہ میں ہے، قابل اعتماد ہونے کے لئے ضروری یہ ہے کہ اس نے علوم دینیہ معتمد علماء دین سے باضابطہ حاصل کیا ہو اور خود صاحب بصیرت ہو، چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے چنانچہ آگے مذکور ہے:

"لایجوز له أن یفتی من کتاب ولامن کتابین ،بل قال النووی ؒ ولا من عشرةفان العشرةوالعشرین قد یعتمدون کلهم علی مقالة ضعیفة فی المذهب فلایجوز تقلید هم فیها". (۱)

ایسے شخص کے لئے ایک دو کتاب سے فتویٰ دینا درست نہیں ہے بلکہ امام نوویؒ کا قول ہے دس بیس سے بھی نہیں، اس لئے کہ کبھی یہ کل کے کل مذہب کے باب میں ایک کمزور بات پر اعتماد کر لیتے ہیں لہذا ان کی تقلید درست نہیں ہے۔

افتا کے لئے ضروری شرائط:

جسے فقہ میں بصیرت تامہ حاصل ہو اور فتویٰ کی صلاحیت بھی، وہ البتہ فتویٰ دے سکتا ہے، مندرجہ ذیل شرائط کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"بخلاف الماهر الذی أخذ العلم عن أهله وصارت له فیه ملکة نفسانیة فانه یمیز الصحیح من غیره ویعلم المسائل وما یتعلق بهاعلی الوجه المعتمد به فهذا هوالذی یفتی الناس و یصلح أن یکون واسطة بینهم و بین اللّٰه تعالیٰ". (۲)

البتہ ایسا ماہر فتویٰ دے سکتا ہے جس نے لائق وفائق اہل علم سے اخذ علم کیا ہو اور اسے خود اس فن میں مہارت تامہ اور ملکہ راسخہ اس طرح حاصل ہو چکا ہو کہ وہ صحیح کو غیر صحیح سے متمیز کر سکے اور مسائل اور اس کے متعلقات سے قابل اعتماد طور پر واقف ہو، یہ البتہ ایسا شخص ہے جو لوگوں کو فتویٰ دے سکتا ہے اور اس لائق ہے کہ یہ بندوں اور خدا کے درمیان واسطہ بن سکے۔

ماہر استاذ کا تربیت یافتہ ہونا:

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ماہر استاذ کا تربیت یافتہ ہو اور قواعد شرع کی صحیح معرفت رکھتا ہو۔

"فان المتقدمین شرطوا فی المفتی الاجتهادوهذامفقود فی زماننافلاأقل من أن یشترط فیه معرفةالمسائل بشروطهاوقیودها التی کثیرامایسقطونهاولایصرحون بهااعتماداعلی فهم المتفقه". (۳)

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ص۸۔
(۲) حوالہ سابق۔
(۳) شرح عقود رسم المفتی: ۴۰۔

متقدمین نے مفتی کے لئے اجتہاد کی شرط بیان کی تھی جو ہمارے اس دور میں مفقود ہے لہذا اب کم سے کم اتنی شرط توضرور لگائی جائے گی کہ وہ مسائل کی معرفت ان تمام قیود وشروط کے ساتھ رکھتا ہو جنھیں بسا اوقات مصنفین اس اعتماد پر چھوڑ دیتے ہیں اور صراحت نہیں کرتے کہ فقیہ ان کو سمجھ لے گا۔

زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت:

زمانہ کے عرف اور اہل زمانہ کے احوال سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

''وکذا لابدله من معرفةعرف زمانه وأحوال أهله''.(۱)

اور ایسا ہی مفتی کے لئے عرف زمانہ کی معرفت اور اپنے دور کے لوگوں کے احوال سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

ماہر فقہ کی شاگردی:

کسی قابل اعتماد ماہر فقیہ ومفتی کے پاس رہ کر اس نے فتویٰ نویسی کا سلیقہ باضابطہ سیکھا ہو۔

''والتخريج في ذلک علی استاذماهر ولذا قال في آخر منية المفتي لوأن الرجل حفظ جميع كتب أصحابنالابد أن يتلمذ للفتوىٰ حتى يهتدي إليه''.(۲)

اور وہ کسی ماہر استاذ کا تربیت یافتہ ہو اور اسی وجہ سے منیۃ المفتی کے اخیر میں صراحت ہے کہ گو وہ شخص ائمہ احناف کی تمام کتابیں یاد کر چکا ہو لیکن پھر بھی اس کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ فتویٰ کے لئے اس نے تلمذ اختیار کیا ہو اور اس کی راہیں معلوم کر چکا ہو۔

اس کی وجہ لکھتے ہیں:

''لأن كثيراًمن المسائل يجاب عنهاعلى عادات أهل الزمان فيمالايخالف الشريعة''.(۳)

اس لئے کہ بہت سے مسائل کا جواب اہل زمانہ کی عادات کے لحاظ سے دیا جاتا ہے جن میں شریعت کی مخالفت کا شائبہ بھی نہ ہو۔

عرف زمانہ کی رعایت:

عرف زمانہ کی رعایت مفتی وقاضی کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔

''وفي القنية ليس للمفتي ولاللقاضي أن يحكماعلى ظاهر المذهب ويتركاالعرف''.

---

(۱) شرح عقود رسم المفتی ۴۰۔

(۲) حوالہ سابق۔

(۳) حوالہ سابق۔

قنیہ میں ہے کہ مفتی اور قاضی کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ عرف زمانہ سے صرف نظر کر کے صرف ظاہر مذہب پر فیصلہ دیں۔

''وھذا صریح فیماقلناإن المفتی لایفتی بخلاف عرف زمانه''.(۱)

اس سے صراحتاً یہ بھی ثابت ہوا کہ مفتی اپنے عرف زمانہ کے خلاف فتویٰ نہ دے جیسا کہ ہم نے کہا تھا عرف کی تبدیلی سے مفتی کو واقف ہونا چاہئے۔

''فللمفتی اتباع عرفه الحادث فی الألفاظ العرفیة''.(۲)

مفتی کو چاہئے کہ وہ رسم ورواج زمانہ کی اپنے الفاظ عرفیہ میں رعایت کرے۔

احوال زمانہ سے واقفیت کی قید اور اس کی وجہ:

مفتی کے لئے عرف زمانہ اور احوال کے علم کی قید کیوں لگائی گئی ہے لکھتے ہیں:

''ظھر لک أن جمود المفتی أو القاضی علی ظاھر المنقول مع ترک العرف و القرائن الواضحة والجمل بأحوال الناس یلزم منه تضیع حقوق کثیرة وظلم خلق کثیرین''.(۳)

جو کچھ عرض کیا گیا اس سے آپ پر یہ بات عیاں ہو چکی ہوگی کہ اگر مفتی اور قاضی نے عرف عام اور قرائن واضحہ کو ترک کر دیا اور لوگوں کے حالات سے بے خبر رہا اور ظاہر پر جمار ہا تو پھر یقین کر لینا چاہئے کہ اس طرح بہت سے حقوق ضائع کرنا اور بہتیرے لوگوں پر ظلم کرنا لازم آئے گا۔

چنانچہ اسی وجہ سے صراحت ہے:

''فلابد للمفتی من معرفة أحوال الناس وقد قالوا من جھل بأھل زمانه فھو جاھل''.(۴)

لہذا مفتی کے لئے لوگوں کے احوال کی معرفت ضروری ہے اور اہل علم کا فیصلہ ہے جس نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو نہ جانا وہ جاہل ہے۔

مناقب کردری میں مذکور ہے کہ امام محمدؒ رنگریزوں کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کے معاملات کے سلسلہ میں معلومات حاصل کرتے اور ان میں جو رواج ہوتا اس کا پتہ لگاتے۔

اغلاط سے محفوظ ہونا:

مفتی کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس سے غلطیاں بہت کم واقع ہوں ورنہ وہ لائق

(۱) شرح عقود رسم المفتی ص ۴۰۔
(۲) حوالہ سابق۔
(۳) شرح عقود رسم المفتی ۴۱۔
(۴) حوالہ سابق۔

افتا نہیں ہوسکتا ہے۔

”ولایصیر أهلا للفتویٰ مالم یصر صوابه أکثر من خطأه لأن الصواب متی کثر فقد غلب ولاعبرة فی المغلوب بمقابلة الغالب فإن أمور الشرع مبنیة علی الأعم الأغلب کذافی الولوالجیة“. (۱)

اس وقت تک سند افتاء پر بیٹھنے کے لائق کوئی مفتی نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی درستی اس کی غلطیوں سے بڑھی ہوئی نہ ہو اس لئے کہ اکثر جواب کی صحت غلبہ کی حیثیت میں ہے اور غالب کے مقابلہ میں مغلوب کا کوئی اعتبار نہیں کرتا اس لئے کہ شرعی امور کا دارومدار عموم اور اغلب پر ہی ہے۔

جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اتنی بات واضح ہوکر سامنے آگئی ہوگی کہ اہل علم میں اس منصب پر وہی حضرات فائز کئے جائیں اور فائز ہوں جن میں علمی استعداد اس درجہ کی ہو کہ وہ اس اہم کام (۲) کو حسن وخوبی کے ساتھ سنبھال سکیں۔

نااہل مفتی کی تعزیر:

لیکن اگر کوئی مفتی بننے کا اہل نہیں ہے اور وہ بن گیا ہے تو اس کی تعزیر ضروری ہے اس سلسلہ میں کوئی رورعایت نہیں ہونی چاہئے اس لئے کہ مفتی بظاہر بندوں اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اس لئے اگر ایسے اشخاص کو نہیں روکا گیا تو مفاسد کے دروازے کھل جائیں گے اور مخلوق خدا گمراہی میں مبتلا ہو جائے گی۔

”وأماغیره فیلزمه إذا تسور هذا المنصب الشریف التعزیر البلیغ والرجز الشدید الزاجر ذلک لأمثاله عن هذا الامر القبیح یؤدی الی مفا سد لاتحصیٰ“. (۳)

جو افتاء کے لائق نہ ہو اور اس منصب عظیم پر آدھمکے اس کی تعزیر شدت کے ساتھ لازم ہے اور ایسی سختی ایسے لوگوں کے ساتھ ہونی چاہئے کہ پھر وہ اس طرح کی جرأت نہ کرسکیں کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بے انتہا مفاسد کے دروازے کھل جائیں گے۔

ابن خلدون کی صراحت:

ابن خلدونؒ (م ۸۰۸ھ) نے لکھا ہے کہ دینی حکومت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ منصب افتا پر اس کے لائق اور قابل تر آدمی کو تلاش کر کے فائز کرے اور جو شخص اس کے لائق نہ ہو اور یہ کام انجام دے رہا ہو سختی کے ساتھ منع کردے۔

---

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ۲۲۔

(۲) مفتی کے لئے صرف بالغ ہونے کی شرط ہے جیسا کہ آرہا ہے کسی مخصوص عمر کی قید نہیں کہ مثلا وہ اس عمر کا ہو یا بوڑھا ہو تو اسکو ترجیح ہوگی ولایعتبر السن ولاکثرة العدد لأن الاصغر الواحد قد یوفق للصواب فی حادثة مالایوفق الاکبر والجماعة الخ. (معین الحکام ص ۳۰ پھر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ نقل کیا ہے۔ظفیر۔)

(۳) شرح عقود رسم المفتی ص ۸۔

''أما الفتيا فللخليفة تفحص أهل العلم والتدريس ورد الفتيا إلى من هو أهل لها وإعانته على ذلك ومنع من ليس بأهل لها وزجره لأنها من مصالح المسلمين في أديانهم فتجب عليه مراعاتها لئلا يتعرض لذلك من ليس له بأهل فيضل الناس''. (۱)

فتویٰ کے لئے خلیفہ وقت کا فریضہ ہے کہ صاحب درس وتدریس اور ذی علم کی تلاش کرے اور افتاء کا کام ایسے شخص کے سپرد کرے جو اس خدمت کے لائق ہو اور پھر اس کی مدد بھی کی جانی چاہئے، اور جو اہل نہ ہو، اسے روکنا چاہئے اور سختی کے ساتھ علاحدہ رکھنا چاہئے اس لئے کہ یہ ایک اہم دینی ذمہ داری ہے اگر عہدہ کی رعایت نہ ہوئی تو نااہل لوگ آجائیں گے اور لوگوں کو گمراہی میں ڈالدیں گے۔

لائق ترین کی جستجو:

واقعہ بھی یہی ہے کہ ایسے نااہل کو روک دیا جانا ہی ضروری ہے جو باعث گمراہی ہو، حافظ ابن قیمؒ نے اس سلسلہ میں اپنے شیخ علامہ ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ نااہل کے مسند افتا پر بیٹھنے سے سخت نکیر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اسے قطعاً اس کی اجازت نہیں ہونی چاہئے یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہر معمولی سے معمولی کام پر احتساب ہو اور اس قدر اہم کام پر احتساب کی ضرورت محسوس نہ کی جائے۔ (۲)

علامہ طحطاوی (م ۱۲۴۳ھ) نے عالمگیری کے حوالہ سے لکھا ہے:

''وعلى ولي الامر أن يبحث عمن يصلح للفتوىٰ ويمنع من لايصلح''. (۳)

گورنر کا فرض ہے کہ وہ فتویٰ کے لائق ترین افراد کو تلاش کرے اور جو اس منصب کے لائق نہ ہو، اسے منع کردے۔

پیش آمدہ مسائل وواقعات کے حکم بیان کرنے کا نام اصطلاح میں فتویٰ رکھا جاتا ہے، اگر خدانخواستہ کوئی شخص علوم دینیہ بالخصوص احکام فروع واصول میں مہارت نہ رکھتا ہو، تو خود سوچیے وہ کس مرض کی دوا بن سکتا ہے علمی استعداد ومہارت کے ساتھ کچھ اور اوصاف ہیں جن کا ایک مفتی میں پایا جانا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرسکے۔

پانچ خوبیاں:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی میں پانچ چیزیں نہ ہوں مسند افتا کو زینت بخشنے کی جرأت نہ کرے (۱) نیت صالحہ (۲) حلم ووقار (۳) مسائل میں بصیرت اور ان پر ثابت قدمی کی شان (۴) بقدر ضرورت

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ۱۶۵۔

(۲) دیکھئے: اعلام الموقعین ۲۵۶ ج ۲۔

(۳) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ص ۱۷۵ ج ۳۔

ذرائع معاش (۵) لوگوں کے احوال کی معرفت، نیت صالحہ تو اس لئے ضروری ہے کہ ہر کام کی جان اور روح دراصل یہی پاک نیت ہے، جب تک نیت میں پاکیزگی اور اخلاص نہ ہو، کام میں برکت نہیں ہوسکتی، اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول اور قابل اجر ہوگا، پھر ایسا جواب نور الٰہی سے خالی ہوگا اور خصوصی برکت سے محروم۔ حدیث نبوی ہے:

"إنما الأعمال بالنيات". (۱)

حلم و وقار ہر اہل علم کے لئے ازبس ضروری ہے کہ اس سے خود اس کی ذات کی بھی رونق ہے اور اس کے علم وعمل کی بھی اور مفتی کے لئے خصوصی طور پر اس لئے کہ وہ اپنے منصب پر ایک دینی شعبہ کا ذمہ دار ہے اور عوام وخواص کے لئے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم میں بصیرت اور اپنی بصیرت پر اعتماد اگر نہ ہوگا تو پھر وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کرسکے گا اور دوسرے ان کی تجویز کردہ اور بتائی ہوئی صورت پر یقین کے ساتھ کس طرح عمل پیرا ہوسکیں گے۔

بقدر ضرورت ذرائع معاش کی قید غالباً اس لئے لگائی ہے کہ وہ عوام کی نگاہوں میں ہلکا نہ ہوجائے اور کسی کو اس کی جرأت نہ ہو کہ وہ مفتی کو حرص ولالچ میں ڈالنے کی بات سوچ بھی سکے۔

احوال اہل زمانہ سے واقفیت:

اسی طرح لوگوں کے احوال سے واقفیت بھی ضروری ہے جس کی طرف اوپر بھی اشارہ گذر چکا کہ اس واقفیت کی وجہ سے وہ سوالات کو صحیح طور پر سمجھ سکے گا اور پھر صحیح جواب دے سکے گا۔

بلند کرداری اور عفت:

مفتی کا بلند کردار، عفت مآب، کامل العقل اور صاحب صلاح وتقویٰ ہونا بھی ضروری ہے، صاحب درمختار علامہ حصکفیؒ (م ۱۰۸۸ھ) نے قاضی کی بحث میں جہاں اس کے اوصاف گنائے ہیں مفتی کے لئے بھی ان اوصاف کی نشاندہی کی ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل تمام اوصاف وخصائل کا پایا جانا ضروری ہے۔

"وينبغي أن يكون موثوقا به في عفافه وعقله وصلاحه وفهمه وعلمه بالسنة والآثار ووجود الفقه والإجتهاد شرط الاولوية لتعذره على انه يجوز خلو الزمن عنه عند الاكثر ومثله فيما ذكر المفتي". (۲)

اور ضروری ہے کہ وہ قاضی اپنی پارسائی عقل وفہم صلاح وتقویٰ اور سنت وآثار اور فقہ کے علوم میں قابل اعتماد ہو، رہا اجتہاد تو یہ صرف اولویت کی شرط ہے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک ہر زمانہ میں اس کا پایا جانا دشوار ہے اور اسی طرح ان تمام اوصاف مذکورہ کا مفتی میں پایا جانا بھی ضروری ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے۔ انیس

(۲) الدر المختار باب القضاء: ص ۳۶۴ ج ۴۔

بردباری اور نرم خوئی:

ساتھ ہی انہوں (یعنی صاحب درمختار علامہ حصکفیؒ (م ۱۰۸۸ھ) نے یہ بھی لکھا ہے:

"ویجب أن یکون المفتی حلیماً وزیناًلیّن القول منبسط الوجه". (۱)

اور واجب ہے کہ مفتی بردبار سنجیدہ متین شیریں مقال اور خندہ جبیں ہو۔

دینداری:

مفتی کا دیندار اور خداترس ہونا بھی ضروری ہے اس لئے کہ فاسق مسند افتا کے لائق نہیں ہے اور نہ اسے اس کا حق حاصل ہے فقہا نے صراحت کردی ہے کہ فاسق نہ مفتی ہوسکتا ہے اور نہ ایسے شخص سے استفتا ہی درست ہے:

"والفاسق لایصلح مفتیالأن الفتویٰ من أمور الدین والفاسق لایقبل قوله فی الدیانات (إلی قوله وظاهر)مافی التحریر أنه لایحل استفتاء ه اتفاقا". (۲)

فاسق مفتی نہیں ہوسکتا وجہ یہ ہے کہ فتویٰ دینی امور میں سے ہے اور دیانات میں فاسق کا قول قابل قبول نہیں ہوا کرتا ہے کتاب التحریر میں جو کچھ ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ فاسق سے مسئلہ دریافت کرنا بالاتفاق درست نہیں ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ مسائل شرعیہ میں خشیت الٰہی اور طاعت خداوندی فیضان الٰہی کا موجب ہوا کرتی ہے۔(۳) جولوگ معصیت میں مبتلا ہیں اگر وہ اس کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اسی حال میں فقہ کے دقائق اور مسئلہ کی روح کو پالیں گے تو یہ ان کا محض خواب وخیال ہے واقعہ سے اسے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

اسلام اور عقل وفہم:

ساتھ ہی مفتی کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ مسلمان صاحب عقل وفہم اور بیدار دماغ ہو، اس پر غفلت اور سہو ونسیان کا غلبہ نہ ہو۔

"ولاخلاف فی اشتراط إسلامه وعقله وشرط بعضهم تیقظه". (۴)

مفتی کے لئے اسلام وعقل کی شرط میں کسی کا اختلاف نہیں بلکہ بعض علماء نے اس کے لئے بیدار دماغ ہونا بھی شرط قرار دیا ہے۔

---

(۱) الدرالمختار باب القضاء: جلد۴ص ۴۲۴۔

(۲) الدرالمختار مع ردالمختار: جلد۴ص ۴۱۸۔

(۳) ارشاد نبوی ہے: "مازهد عبد فی الدنیا إلاأنبت الله الحکمة فی قلبه وانطق بهالسانه وبصره عیب الدنیاوداء ها ودواء هاواخرجه منها لمالی دار السلام". رواه البیقهی فی شعب الایمان. (مشکوٰۃ کتاب الرقاق ص ۴۴۳۔)

(۴) الدرالمختار مع ردالمختار: جلد۴ص ۴۱۸۔

دوراندیشی اور بیدار دماغی:

ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس دور میں تیقظ کی شرط لازم ہے:

"قلت: وهذا الشرط لازم في زماننا والحاصل ان غفلة المفتي يلزم منها ضرر عظيم في هذا الزمان". (۱)

میں کہتا ہوں کہ بیدار مغز ہونے کی شرط ہمارے اس زمانہ میں لازم ہے کیونکہ مفتی کی غفلت اور بے پرواہی سے اس دور میں بڑا نقصان لازم آئے گا۔

بالغ وعادل:

مفتی بالغ بھی ہو اور عادل بھی۔

"قال في البحر: فشرط المفتي اسلامه وعدالته ولزم منهما بلوغه وعقله فيرد فتویٰ الفاسق والکافر وغير المكلف". (۲)

البحر الرائق میں ہے کہ مفتی کے لئے جو شرائط ہیں ان میں اس کا مسلم ہونا اور عادل ہونا بھی ہے اور ان دونوں شرطوں سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بالغ وعاقل بھی ہو لہٰذا فاسق کافر اور غیر مکلّف کا فتویٰ رد کر دیا جائے گا۔

پسندیدہ ضروری اوصاف:

علامہ طحطاویؒ (م ۱۲۴۳ھ) نے عالمگیری سے نقل کیا ہے کہ مفتی میں مندرجہ ذیل اوصاف بھی ہونے چاہئیں:

"استفتا کے کاغذات وہ احترام کے ساتھ لے، اسے پہلے بار بار غور سے پڑھے تاکہ سوال کی صحیح صورت اس کے سامنے کھل کر اور متعین ہو کر آجائے، کاغذات استفتاء کی بے حرمتی نہ کرے کہ یہ آداب افتا کے خلاف ہے اگر کبھی جواب میں غلطی واقع ہو جائے تو معلوم ہونے پر اس سے فوراً رجوع کرلے، ضد وہٹ کے ذریعہ اپنی اس غلطی کو صحیح باور کرانے کی فکر نہ کرے، اور رجوع میں ننگ وعار محسوس نہ کرے، فتویٰ کی تحقیق میں تساہل سے کام نہ لے کہ ایسا کرنا مفتی کے لئے حرام ہے، غرض فاسد کی وجہ سے حیلوں کو کام میں نہ لاوے، جس وقت مزاج میں اعتدال نہ ہو جواب تحریر نہ کرے، بلکہ صرف اعتدال کے وقت جواب لکھے، جواب لکھنے کے معاملہ میں کسی کی رورعایت ہرگز نہ ہو، جس ترتیب سے اس کے پاس استفتے آئیں، اسی ترتیب سے جواب دے۔ اس سلسلہ میں اغنیاء امراء اور دوست واحباب اور خویش واقارب کی ایسی رعایت نہ کرے جس سے دوسروں کی حق تلفی ہو، اس باب میں چاہئے کہ اس کے یہاں امیر وغریب اور شاہ وگدا، یکساں ہوں اور کسی

---

(۱) ردالمختار جلد چہارم: ص ۴۱۸۔

(۲) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: جلد ۴ ص ۱۷۵۔

بھی مستفتی سے کوئی اجرت نہیں قبول کرنی چاہئے کہ یہ اس منصب کے شایان شان نہیں ہے‘‘۔

مسائل پر عبور اور قواعد کا علم:

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مفتی اپنے امام کے مسائل پر پورا عبور رکھتا ہو اور اس کے قواعد و اسالیب سے اچھی طرح واقف ہو۔

’’ویشترط أن یحفظ مسائل إمامه ویعرف قواعده وأسالیبه‘‘.(۱)

اور مفتی کے لئے اس کی بھی شرط ہے کہ اسے اپنے امام کے مسائل از بر ہوں اور وہ اسکے قواعد اور اسالیب میں مہارت رکھتا ہو۔

بات لمبی ہوتی جارہی ہے کہنا صرف یہ ہے کہ مفتی کی ذات وصفات کے لئے کچھ شرائط کچھ فرائض اور کچھ حقوق وآداب ہیں جن کا لحاظ بڑی حد تک مفتی کا فریضہ ہے‘ یوں ہمارے یہاں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ اگر کسی مفتی سے جواب میں تھوڑی بہت غلطی واقع ہوجائے تو اسے افتا سے فوراً معزول نہیں کردیا جائے گا۔

’’وذکر في الملتقط: إذا کان صوابه أکثر من خطأه حل له أن یفتي وإن لم یکن من أهل الإجتهاد‘‘.(۲)

ملتقط میں مذکور ہے کہ اگر مفتی کی درستی اس کی خطا اور غلطی پر غالب ہو تو اس کے لئے فتویٰ دینا درست ہے، گو وہ مجتہدین میں سے نہ ہو۔

دماغی توازن:

گو چاہئے یہی کہ جن کو مسائل کا استحضار حاصل نہ ہو یا اس کی دماغی ساخت ہی ٹیڑھی واقع ہو، یا اپنے کسی مرض کی وجہ سے اس فریضہ کو ادا نہ کرسکے تو وہ اس طرح کی ذمہ داری ہرگز قبول نہ کرے، اس لئے کہ جواب کے لئے جس طرح ظاہری ہیئت اچھی ہونی چاہئے، دماغی توازن کا برقرار رہنا بھی بیحد ضروری ہے حد یہ ہے کہ فقہانے لکھا ہے کہ زیادہ مسرت اور حاجات بشریہ کے غلبہ کے وقت بھی فتویٰ نہ دیا کرے کہ یہ چیزیں اطمینان قلب اور دماغی توازن کو کھو دینے والی ہیں۔(۳)

ظاہری ہیئت:

ظاہری ہیئت کے سلسلہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہ واقعہ کتابوں میں درج ہے۔

(۱) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: ص ۱۷۵ ج ۳۔

(۲) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: ص ۱۷۶ ج ۳۔

(۳) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: ص ۱۷۵ ج ۳۔

"وعن أبي يوسفؒ أنه إذا استفتي في مسئلة استویٰ وارتدیٰ وتعمم ثم أفتی تعظيما.... لأمر الإفتاء". (۱)

امام ابو یوسفؒ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ یکسو ہو کر سیدھے بیٹھتے لباس زیب تن کرتے ....عمامہ باندھتے پھر جواب دیتے اور آپ یہ سارا اہتمام افتاء کی عظمت کی وجہ سے کرتے۔

شگفتہ مزاجی:

مفتی کو متواضع، نرم خو، اور شگفتہ مزاج ہونا چاہئے تندخوئی اور درشت مزاجی اس کے لئے سخت عیب ہے۔

"وينبغي للمفتي أن يكون متواضعاليناولايكون جباراعتيداولافظا غليظ القلب لأن الله تعالیٰ قال: فَبِمَارَحۡمَةٍمِنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ. الخ". (۲)

مفتی کو متواضع اور نرم خو ہونا چاہئے سخت کینہ پرور اور درشت خو اور سنگدل نہیں ہونا چاہئے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں نرم خوئی کا تذکرہ کیا ہے اور اسے سراہا ہے۔

جو ضرورتمند ضرورت لیکر مفتی کی خدمت میں حاضر ہو تو اسے چاہئے کہ اگر کوئی معقول عذر نہیں ہے تو اس کی ضرورت پوری کرے اور اس کی حاجت براری کر کے مستحق ثواب ہو اور اپنا فریضہ ادا کرے، گویا مفتی کا دروازہ ہر ایک مستفتی کے لئے کھلا ہوا ہو۔

"قال الفقيه: ينبغي لمن جعل نفسه مفتياأوتولیٰ شيئامن أمور المسلمين وجعل وجه الناس إليه أن لايردهم قبل أن يقضي حوائجهم إلا من عذرويستعمل فيه الرفق والحلم". (۳)

فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ نے کہا ہے کہ جو شخص مفتی ہو یا مسلمانوں کے کسی اور شعبہ کا ذمہ دار ہو، اور لوگوں کا اس کی طرف رجوع عام ہو تو اسے چاہئے کہ اگر کوئی عذر نہیں ہے تو ان کی حاجت روائی کرے واپس نہ کرے اور اس سلسلہ میں نرم خوئی وملاطفت کا برتاؤ کرے۔ (۴)

---

(۱) الطحاوی: ۱۷۵ ج ۳۔

(۲) بستان العارفین للفقیہ ابی اللیث باب من یصلح الفتویٰ ص ۱۴۔

(۳) بستان العارفین للفقیہ ابی اللیث باب من یصلح الفتویٰ ص ۱۴۔

(۴) ماخوذ از فتاویٰ دار العلوم دیوبند مقدمہ جلد اول: ۱ر تا ر ۱۰۱، از مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

فتویٰ کے احکام وآداب

فتویٰ کی فرضیت:

(۱)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کی دعوت دینا برائی سے روکنا ایسا امر ہے جو قیامت تک جاری رہے گا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ فریضہ اس امت سے متعلق کر دیا گیا ہے، بلکہ یہی اس امت کا مقصدِ وجود ہے:

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ". (۲)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورتوں ہی میں سے ایک صورت فتوی دینا بھی ہے؛ کیوں کہ فتوی کے ذریعہ لوگ حلال وحرام سے واقف ہوتے ہیں، اور حلال کو اختیار کرنے اور حرام سے بچنے کی توفیق میسر آتی ہے، اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ فتوی دینے کا شرعی حکم کیا ہے؟ ----- شریعت کے اصولی احکام اور اجتہاد کے سلسلہ میں فقہا کی توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات اور مواقع کے اعتبار سے فتوی دینے کا حکم مختلف ہوگا:

(۱) بعض صورتوں میں فتویٰ دینا مفتی پر فرض عین ہے، یعنی اگر مفتی فتویٰ دینے سے انکار کردے تو گنہگار ہوگا، یہ اس صورت میں ہے جب کہ وہ خود حکم سے واقف ہو، یا کم سے کم واقفیت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے سوا کوئی اور شخص نہ ہو جو اس مسئلہ کا جواب دے سکے، تیسرے وہ مسئلہ پیش آچکا ہو، محض فرضی اور بے فائدہ سوال نہ ہو، چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

" ... فإذا اُستفتی و لیس في الناحیة غیره تعین علیه الجواب ... و لو سأل عامی عما لم یقع لم یجب جوابه ". (۳)

جس شخص سے سوال کیا جائے اگر علاقہ میں اس کے سوا کوئی اور مفتی موجود نہ ہو تو یہ بات متعین ہے کہ اس کے لیے جواب دینا واجب ہے ... اور اگر کسی عامی نے ایسی بات کے بارے میں سوال کیا جو ابھی واقع ہی نہیں ہوئی، تو اس کا جواب دینا واجب نہیں۔

(۱ کتاب الفتاویٰ جلد اول مقدمہ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: ۲۶۰/تا/۲۶۶۔

(۲) سورۃ آل عمران: ۱۱۰۔

(۳) شرح مہذب: ۱/۴۵، مقدمہ۔

اب اگر ایسا سوال ہے جس میں تاخیر سے بھی عمل کی گنجائش ہو تو جواب میں تاخیر بھی کی جا سکتی ہے، اور اگر فوری حل طلب مسئلہ ہو تو فوری طور پر اس کا جواب دینا یا اس کے جواب کو تلاش کرنا واجب ہے، گویا کبھی فتوی کا جواب دینا واجب علی الفور ہوتا ہے اور کبھی واجب علی التراخی، جیسا کہ اجتہاد کا حکم ہے۔ (دیکھئے: کشف الأسرار: ۴/ ۲۶)

فتویٰ دینا فرض کفایہ:

(۲) اگر اس علاقہ میں ایک سے زیادہ مفتی موجود ہوں اور مسئلہ اتنا زیادہ عاجلانہ نہ ہو کہ اگر وہ جواب نہ دے تو ضرورت منداس موقع پر مطلوب عمل سے محروم رہ جائے، تو فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے، جیسا کہ امر بالمعروف کا حکم ہے کہ اگر کئی لوگ امر بالمعروف کی صلاحیت رکھنے والے موجود ہوں تو ہر ایک کے حق میں یہ فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے، اسی پس منظر میں بعض فقہاء شوافع نے لکھا ہے کہ سفر شرعی کی مسافت کے بقدر علاقہ میں کم سے کم ایک مفتی ضرور ہونا چاہئے۔ (۱)

(۳) جو مسائل ابھی پیش نہیں آئے ہیں اور ان کے بارے میں دریافت کیا جائے تو اس کا جواب دینا واجب نہیں، مستحب ہے۔ (۲)

(۴) جو شخص مسئلہ سے واقف ہی نہ ہو یا واقف تو ہو؛ لیکن قرآن وحدیث کے نصوص اور اجماع کے مقابل اور اس کے علی الرغم اپنی رائے رکھتا ہو تو اس کے لیے فتویٰ دینا حرام ہے، کیوں کہ وہ خود غلطی پر ہے، اور فتویٰ دے کر دوسروں کو بھی غلطی پر اکسا رہا ہے۔

(۵) جو مسائل پیش نہیں آئے ہوں اور بظاہر ان کے پیش آنے کی توقع بھی نہیں ہے، ایسی بے فائدہ چیزوں کے بارے میں سوال کرنا اور جواب دینا مکروہ ہے۔ (۳)

افتا کے آداب:

(۱) فتویٰ میں تساہل اور کوتاہی برتنا جائز نہیں، تساہل سے مراد یہ ہے کہ غور وفکر اور تحقیق سے پہلے جواب دیا جائے اور عجلت برتی جائے، البتہ اگر ماضی قریب ہی میں اس مسئلہ کی تحقیق کر چکا ہے اور مسائل کا استحضار ہے تو جلد جواب دینے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، اسی طرح غلط اور ناروا مقاصد کے لیے حیلہ جوئی اور اس کی رہنمائی کرنا جائز نہیں۔

---

(۱) دیکھئے: شرح المنہاج للمحلی: ۴/ ۲۱۴۔

(۲) دیکھئے: کشف الأسرار: ۴/ ۲۷-۲۶، التقریر والتحریر: ۳/ ۲۹۲۔

(۳) دیکھئے: الفتاوی نشأتھا وتطورھا: ۲/ ۶۲۰۔

(۲) غصہ، بھوک وپیاس، غیر معمولی مسرت یاغم، اونگھ، رنجیدگی، شدید گرمی، تکلیف دہ بیماری، پائخانہ وپیشاب، ریاح وغیرہ کو روکتے ہوئے اور ان تمام حالات میں جب آدمی کی طبیعت پوری طرح اعتدال پر نہیں رہتی ہے، فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔

(۳) اقرار، قسم، طلاق اور وہ چیزیں جن کا تعلق الفاظ سے متعلق ہو، اسی وقت فتویٰ دینا چاہئے کہ یا تو خود اس شہر کا باشندہ ہو جہاں سوال کیا گیا ہے، یا ان کے درمیان رہ چکا ہو، اور الفاظ کے سلسلہ میں ان کے استعمال اور عرف سے واقف ہو۔

(۴) فتویٰ کی عبارت مختصر مگر جامع اور واضح ہو، تعبیر ایسی ہو کہ سوال کرنے والا سمجھ بھی لے اور اس کو تشفی بھی ہو جائے، بعض فقہاء سے مروی ہے کہ وہ بہت مختصر جواب دیا کرتے تھے، علامہ حمیری نے اپنے استاذ قاضی ابوحامد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ایک مسئلہ کے بارے میں استفتاء کیا گیا کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ انہوں نے جواب میں صرف اس قدر لکھا ''نہیں'' ---- مگر ہمارے زمانہ میں اکثر اوقات اتنے مختصر جواب سے مستفتی کو تشفی نہیں ہو پاتی، اس لیے ان کے لیے ایک گونہ تفصیل ہی مناسب ہے جیسا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسلوب تھا، مگر جواب میں اس قدر تفصیل بھی نہیں ہونی چاہئے کہ فتویٰ کتاب بن جائے۔

(۵) بہتر ہے کہ فتویٰ لکھنے سے پہلے تعوذ وتسمیہ پڑھ لے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد کے کلمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے، پھر '' رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ'' پڑھے اس کے بعد جواب لکھے، امام مالکؒ کا معمول تھا کہ وہ فتویٰ دینے سے پہلے ''لاحول ولا قوۃ إلا باللہ '' پڑھتے تھے۔

(۶) مناسب ہے کہ '' الجواب وباللہ التوفیق'' سے فتویٰ کی عبارت کا آغاز کرے اور ''واللہ اعلم، واللہ الموفق، وباللہ التوفیق'' وغیرہ الفاظ پر اختتام ہو اور اخیر میں ایسی وضاحت کے ساتھ اپنا نام لکھے کہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔

فتاویٰ میں احتیاط:

(۷) فتاویٰ میں ہمیشہ محتاط زبان والفاظ اور لب ولہجہ اختیار کیا جائے، مثلاً اگر پوچھا جائے کہ فلاں شخص یہ کفریہ کلمات کہتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ تو براہ راست یہ نہ لکھا جائے کہ وہ ''مباح الدم'' ہے، یعنی اس کا قتل جائز ہے، بلکہ اس کی تفصیل کی جائے کہ اگر گواہوں یا خود اس شخص کے اقرار سے یہ بات ثابت ہو جائے، تو قاضی یا سلطان اس کو توبہ کرنے کو کہے، پھر اگر وہ تائب بھی نہ ہو تو اس کو یہ سزا دی جائے، تعزیری احکام میں خصوصیت کے ساتھ اس طرح کی شرطوں کے ساتھ فتویٰ دے۔

جب جواب سے احتراز کرنا چاہئے:

(۸) اگر سوال سمجھ میں نہ آئے یا مزید وضاحت اور بعض امور کی تفصیل مطلوب ہو، تو بلا تحقیق جواب دینے کے بجائے لکھ دینا چاہئے کہ میں اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکا، مزید تشریح کی جائے تو جواب لکھوں گا۔

(۹) اسی طرح اگر دقیق اعتقادی مسائل صفاتِ باری تعالیٰ، تقدیر وغیرہ کے بارے میں سوال کرے تو ان عام لوگوں کے لیے جو کسی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں، اجمالی ایمان رکھنے اور ان دقیق تفصیلات میں نہ پڑنے کی تلقین کی جائے اور لکھا جائے کہ یہی سلف کا طریقہ اور امن وسلامتی کی راہ ہے، ....اور اگر سوال کسی ایسے آدمی کی طرف سے ہو جو خود اعتقادی کجروی اور گمراہی کا شکار ہو تو پھر سہل اور عام فہم تعبیر اور دلیل سے اس کے سامنے مسائل کی وضاحت کرنی چاہئے۔

(۱۰) اسی طرح اگر علوم قرآن سے متعلق سوال ہو، تو اگر فقہی مسائل واحکام سے بھی اس کا تعلق ہو، مثلاً صلوۃ وسطی کی تحقیق وغیرہ، تو اس کا جواب دیا جائے، اور اگر ان امور کی بابت سوال ہو جن کا براہ راست فقہ سے تعلق نہیں، مثلاً کہف و رقیم کی تحقیق، تو علومِ قرآنی پر گہری بصیرت رکھنے والے علماء کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا جائے اور اگر مفتی کو ان مسائل کا استحضار ہو، تو خود بھی جواب دے سکتا ہے۔(۱)

(۱۱) سائل اگر کم فہم ہو، اور مسائل جلدی سمجھ نہ سکے، تو غصہ نہ کرنا چاہئے اور صبر ورفق کا معاملہ کرنا چاہئے کہ یہی انبیاء علیہم السلام اور سلفؒ کا طریقہ رہا ہے، پھر جب تک پوری طرح استفتا اور اس کا تمام پہلو سمجھ میں نہ آجائے جواب لکھنا نہیں چاہئے، فتویٰ کی تحریر بہت باریک یا بہت موٹی نہ ہو، بلکہ اوسط اور واضح ہو، دو سطر کے درمیان تھوڑا سا فصل ہو، مگر اس قدر بھی نہ ہو کہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ کی گنجائش نکل آئے اور بہتر ہے کہ پورا جواب ایک ہی قلم اور ایک ہی شخص کی تحریر ہو۔

(۱۲) جواب عموماً اس قدر دینا چاہئے جس کی بابت سوال ہے، البتہ کہیں مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت مناسب اور مستفتی کے حالات اور واقعات کے مطابق ہو، تو تفصیل کی جا سکتی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضوان اللہ اجمعین نے صرف سمندر کے پانی کے احکام دریافت کئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شبہ کی بنیاد کو سمجھتے ہوئے مردار کے احکام بھی بیان فرما دیئے کہ "ھو الطھور ماؤہ والحل میتتہ" (پانی پاک ہے اور مردار بھی پاک) (یہ ترجمہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی رعایت کرتے ہوئے ہے)۔

---

(۱) کتاب الفتاویٰ جلد اول: ۲۴۶۔۲۵۷۔

(۱۳) فتاویٰ میں سوالات کی ترتیب کوملحوظ رکھنا بہتر ہے، یعنی استفتا میں جس ترتیب سے سوال درج ہے اسی ترتیب سے جواب بھی ہو، مصلحتاً اس کے خلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۱۴) اسی طرح اگر چند استفتا جمع ہو جائیں تو بالترتیب جو پہلے آئے ہوں ان کا پہلے اور جو بعد میں آئے ہوں ان کا بعد میں جواب دیا جانا چاہئے، البتہ مسائل کی نوعیت اگر جلد جواب کی متقاضی ہو، یا مسائل کے حالات کا تقاضا، تو مفتی اپنی صوابدید کے مطابق بعض لوگوں کے سوال کا جواب پہلے دے سکتا ہے۔

(۱۵) جس کاغذ پر سوال مذکور ہو اسی پر جواب دینا چاہئے، بہتر ہے کہ اسی صفحہ پر دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو یا دشوار ہو تو پشت کے صفحہ پر جواب لکھے۔

(۱۶) اگر اہل علم تلامذہ وغیرہ موجود ہیں تو بہتر ہے کہ ان کے سامنے فتویٰ پڑھایا جائے، ان کو بحث کا موقع دیا جائے اور رفق ونرمی کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا جائے، افسوس کہ ہمارے زمانہ میں عموماً اس کا فقدان ہے۔(۱)

یقین واعتماد:

مفتی جب جواب دینے کا ارادہ کرے تو دیکھ لے کہ وہ جو جواب دے رہا ہے اسے خود اس پر یقین ہے یا نہیں، اگر یقین ہے اور اسی کو راجح سمجھتا ہے تب تو جواب تحریر کرے، یا بتائے ورنہ اٹکل پچو جواب دینے کی ہرگز جرأت نہ کرے یا اسی طرح جب خود اسے اعتماد نہ ہو، تو دوسروں کو وہ جواب نہ دے۔

”فالمفروض علی المفتی والقاضی التثبت فی الجواب وعدم المجاذفة فیهما خوفا من الافتراء علی الله تعالیٰ بتحریم حلال وضده“.(۲)

پس مفتی اور قاضی کا فرض ہے کہ جو کچھ جواب دے رہا ہے اس پر وہ پورا یقین رکھتا ہو۔ اٹکل پچو بات نہ کرتا ہو تا کہ اس افتراء کا خطرہ باقی نہ رہے کہ کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیدیگا۔

عدم تثبیت کی صورت میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ کیا سے کیا لکھ جائے، ہوسکتا ہے حرام کو حلال لکھ جائے یا حلال کو حرام، اس لئے ایسی صورت میں افتا سے پرہیز ہی ضروری ہے۔

قول راجح پر فتویٰ:

پھر جواب میں اس قول کو اختیار کرے جو علمائے مذہب کے نزدیک راجح ہو، مرجوح کو ہرگز اختیار نہ کرے مگر یہ کہ کوئی ایسی خاص وجہ ہو اور دلائل کی روشنی میں یہی راجح نظر آئے۔

---

(۱) ماخوذ: آداب المفتی و المستفتی، مقدمه شرح المهذب ملخصاً)۔(کتاب الفتاوی جلد اول:۲۵۹۔۲۶۰)

(۲) شرح عقود رسم المفتی ص۵۔

”إن الواجب على من أراد ان يعمل لنفسه أويفتي غيره أن يتبع القول الذى رجحه علماء مذهبه فلايجوز له العمل أوالإفتاء بالمرجوح إلا فى بعض المواضع وقد نقلوا الإجماع على ذلک“.(۱)

جو شخص خود عمل کا ارادہ کرے یا غیر کو حکم بتائے دونوں صورتوں میں اس پر واجب ہے کہ اس قول کی پیروی کرے، جسے علماء مذہب نے راجح قرار دیا ہے لہذا مرجوح پر عمل یا فتویٰ دینا درست نہیں ہے بجز چند خاص مواضع کے اور فقہاء نے اسی اصل پر اجماع نقل کیا ہے۔

ابن عابدین شامیؒ نے لکھا ہے:

”وكلام القرا فى دال على أن المجتهد والمقلد لايحل لهماالحكم والإفتاء بغير الراجع لأنه اتباع للهوىٰ وهو حرام إجماعا“.(۲)

قرافی کا کلام بتاتا ہے کہ غیر راجح پر فتویٰ دینا یا فیصلہ کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے خواہ وہ مجتہد ہو، یا مقلد، کیونکہ اس وقت خواہش نفس کی پیروی ہوگی جو بالاتفاق حرام ہے۔

مختصر یہ کہ اگر صاحب نظر اور صاحب بصیرت ہے تو دلائل اور اس کی قوت پر نظر کر کے راجح پہلو پر عمل کرے اور فتویٰ دے اور اگر مسائل میں بصیرت تامہ حاصل نہیں ہے تو اپنے علماء مذہب کے قول پر عمل کرے۔

”أما الحكم والفتيابماهو مرجوح فخلاف الإجماع“.(۳)☆

قول مرجوح پر حکم کرنا اور فتویٰ دینا اجماع کے خلاف ہے۔

(۱/۲/۳) شرح عقود رسم المفتی ص۳۔

☆ **فتاویٰ میں ترجیح کے اصول:**

افتا اور استفتا کے آداب اور مفتی کی صفات اور مطلوبہ استعداد کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہاں افتا کے سلسلہ میں ایک بنیادی قاعدہ کی وضاحت کرنی مناسب محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ فقہ ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اور کم وبیش ایک ہزار سال امت کی بہترین ذہانتیں اس فن کی آبیاری میں خرچ ہوئی ہیں، اسی لیے ائمہ اربعہ کی فقہ بھی محض کسی ایک فقیہ کے اقوال وآراء پر مبنی نہیں ہے، بلکہ بہت سی شخصیتوں کے اجتہادات اور استنباطات کا مجموعہ ہے، اور بے شمار کتابیں اہل علم نے تالیف کی ہیں، نہ یہ تمام شخصیتیں ایک درجہ کی ہیں اور نہ یہ ساری کتابیں علمی اعتبار سے ایک مرتبہ ومقام کی حامل ہیں، اسی طرح مختلف شخصیتوں سے جو فقہی رائیں نقل کی گئی ہیں، ان کے اسناد واعتبار میں بھی فرق مراتب پایا جاتا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فقہا کے بہت سے اجتہادات اپنے عہد کے حالات، موجودہ وسائل اور عرف ورواج پر مبنی ہوتے ہیں، حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان میں تبدیلی کو قبول کرنا ناگریز ہوجاتا ہے۔

اسی لیے افتا کے سلسلہ میں بنیادی اصول یہ ہے کہ فتویٰ راجح قول پر دیا جائے، علامہ شامی کا رسالہ ”رسم المفتی“ تقریباً پورا کا پورا اسی اصول کی تشریح وتوضیح پر مبنی ہے، پھر جن مسائل میں مشائخ حنفیہ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان میں ترجیح کی بنیادیں کیا ہوں گی؟ اس سلسلہ میں بھی مختلف اسباب ووجوہ کا ذکر کیا گیا ہے، ان سب کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱) کبھی ترجیح شخصیت کے اعتبار سے ہوتی ہے، جیسے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے میں اختلاف ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد میں سے کوئی ایک امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہوں، تو امام صاحب کے قول کو اور اگر امام صاحب ایک طرف ہوں اور صاحبین دوسری طرف، تو ایک رائے یہ ہے کہ مفتی کو اختیار ہوگا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے، ـــــــ ==

== ۔۔۔۔۔۔دوسری رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر ہی فتویٰ ہوگا، صاحب فتاویٰ سراجیہ نے اسی کو ترجیح دیا ہے اور علامہ شامی کا رجحان بھی اسی طرف ہے، لیکن عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ بہت سے مسائل میں مشائخ نے صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے اور بقول علامہ شامی صاحبین کا قول بھی دراصل امام صاحب ہی کا ایک قول ہوتا ہے، اس لیے مشائخ کے معمول کے اعتبار سے پہلا نقطۂ نظر زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح فقہاء کے جو طبقات کئے گئے ہیں، ان سے بھی ترجیح میں مدد ملتی ہے، جو فقیہ اونچے طبقہ میں شامل ہو، اس کا قول بہ مقابلہ بعد کے طبقات کے فقہا کے قابل ترجیح ہوگا۔

۲) نقل وروایات کے استناد کے اعتبار سے بھی اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے، مثلاً امام محمدؒ کی چھ کتابیں جو ظاہر روایت کہلاتی ہیں، ان میں بھی ائمہ ثلاثہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں، اور امام محمدؒ کی دوسری تحریریں جنہیں نوادر کہا جاتا ہے، وہ بھی انہی فقہاء کے اقوال کو روایت کرتی ہیں، لیکن ظاہر روایت سے متعلق نقول معروف ومتداول ہیں اس لیے ان کو نوادر کے اقوال پر ترجیح دی جاتی ہے، اسی طرح وہ کتابیں جو طویل عرصہ سے مخطوطہ رہی ہوں، تنہا ان کی روایت کو قبول کرنے میں فقہاء نے تامل سے کام لیا ہے، اس لیے اس بات کو بھی اہمیت حاصل ہے کہ اصحاب مذہب کی جو رائیں نقل کی گئی ہوں، وہ کسی حد تک قابل اعتماد ہیں؟ اسی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کی بعض رجوعات جو نوح ابن مریم سے منقول ہیں، کو قبول کرنے میں اہل علم کو کلام ہے، کیوں کہ کسی رائے سے رجوع کو نقل کرنے والا جب تک مستند ومعتبر شخص نہ ہو، کیوں کر اس کے درست اور معتبر ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے؟

بعض دفعہ کتابوں کے لحاظ سے بھی اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے، کیوں کہ بعض مصنفین مذہب کی معتبر روایات کو نقل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور بعض اہل علم ہر طرح کے اقوال جمع کر دیتے ہیں، اسی بنیاد پر درج ذیل کتابوں کو فتاویٰ کے لیے معتبر مانا گیا ہے:

۱) مختصر القدوری	ابوالحسین احمد بن محمد القدوری	(م: ۴۲۸ھ)
۲) بدائع الصنائع	علامہ علاء الدین کاسانی	(م: ۵۸۷ھ)
۳) فتاویٰ قاضی خاں	امام فخر الدین اوزجندی	(م: ۵۹۲ھ)
۴) الہدایۃ	ابوالحسن علی مرغینانی	(م: ۵۹۳ھ)
۵) النقایۃ	صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود	(م: ۷۴۷ھ)
۶) وقایۃ الروایۃ	برہان الشریعہ محمود احمد	(م: ۶۷۳ھ)
۷) المختار فی فروع الحنفیۃ	ابوالفضل مجد الدین موصلی	(م: ۶۸۳ھ)
۸) کنز الدقائق	ابوالبرکات حافظ الدین عبد اللہ النسفی	(م: ۷۱۰ھ)
۹) ملتقی الأبحر	علامہ ابراہیم بن محمد حربی	(م: ۹۵۶ھ)

درج ذیل کتابیں بھی اسی زمرہ میں رکھے جانے کے لائق ہیں:

۱) مختصر الطحاوی	امام ابوجعفر احمد طحاوی	(م: ۳۲۱ھ)
۲) کتاب المبسوط	شمس الأئمہ ابوبکر السرخسی	(م ۴۸۳ھ)
۳) تحفۃ الفقہاء	علامہ علاء الدین محمد سمرقندی	(م: ۵۷۵ھ)
۴) فتح القدیر	علامہ کمال بن ہمام	(م: ۶۸۱ھ)
۵) مجمع البحرین وملتقی النہرین	علامہ مظفر الدین ابن ساعاتی	(م: ۶۹۴ھ)
۶) الجامع الوجیز (فتاویٰ بزازیہ)	علامہ ابن بزاز کردری	(م: ۸۲۷ھ)
۷) النہایۃ	علامہ ابومحمد محمود عینی	(م: ۸۵۵ھ) ==

== بعض کتابیں متأخرین کی مرتب کی ہوئی ہیں، اور اہل علم کے یہاں معتبر مرجع کے لحاظ سے ان کا ذکر نہیں ملتا، لیکن ان کتابوں میں مشائخ کے اقوال کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، گویا وہ اقوال کے ناقل ہیں، اسی لحاظ سے فقہ وفتاوی میں ان کتب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، جیسے فتاویٰ عالمگیری، در مختار، فتاویٰ تاتارخانیہ، مجمع الأنھر اور محیط برہانی، ان کتابوں میں جس تفصیل کے ساتھ جزئیات کو جمع کیا گیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی، اسی طرح متأخرین کی بعض کتابیں وہ ہیں، جو اختلافی اقوال میں تطبیق اور تنقیح کے سلسلہ میں بے نظیر کتابیں کہی جاسکتی ہیں، اس سلسلہ میں علامہ ابن عابدین شامی کی ''ردالمحتار''، علامہ ابن نجیم مصری کی ''البحر الرائق''، علامہ حلبی کی ''کبیری'' اور علامہ طحطاوی کی کتابیں نہایت ہی اہمیت کی حامل ہیں، اسی لیے موجودہ دور میں ارباب افتاء ان کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کرتے ہیں ، اگر ان کتابوں میں آنے والے اقوال وترجیحات سے متعارض کوئی قول متقدمین کے یہاں نہیں ملتا ہو، انہیں قبول کیا جانا چاہئے، اور ان کتابوں کو معتبر نہیں مانا گیا ہے:

۱) تنویر الابصار	علامہ تمرتاشی	
۲) القنیۃ	نجم الدین مختار زاہدی معتزلی	(م:۶۵۶ھ)
۳) الحاوی	نجم الدین مختار زاہدی معتزلی	(م:۶۵۶ھ)
۴) المجتبی شرح القدوری	نجم الدین مختار زاہدی معتزلی	(م:۶۵۶ھ)
۵) جامع الرموز	علامہ شمس الدین قہستانی	
۶) السراج الوھاج	ابوبکر حدادی	(م:۸۰۰ھ)
۷) غرر الأحکام	ملاخسرو	(م:۸۸۵ھ)
۸) فتاویٰ ابراہیم شاہی	علامہ شہاب الدین دولت آبادی	
۹) فتاویٰ زینیہ	علامہ ابن نجیم مصری	
۱۰) خزانۃ الروایات	قاضی جگن گجراتی	
۱۱) شرعۃ الإسلام	محمد بن ابوبکر جوغی	
۱۲) خلاصۃ الکیرانی	منسوب بہ: علامہ لطف اللہ النسفی	

اسی طرح ایک اصول یہ رکھا گیا ہے کہ متون کے اقوال کو شروح وحواشی میں ذکر کی گئیں آراء پر ترجیح ہوگی، کیوں کہ متون میں عام طور پر مذہب کی ان معتبر اقوال کو نقل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے جن پر فتویٰ ہے، اور شروح وحواشی میں اس کا اہتمام نہیں ہوتا، بلکہ کسی مسئلہ سے متعلق مختلف اقوال کے احاطہ کی کوشش کی جاتی ہے، ...... اس حقیر کی رائے میں فتویٰ دینے کے سلسلہ میں عمومی قاعدہ تو یہی ہے، لیکن بعض شارحین صحیح قول کی تعیین، مختلف اقوال کے درمیان تطبیق و تنقیح اور ترجیح پر خصوصی توجہ دیتے ہیں، اگر ان کی تحریروں کی روشنی میں قول راجح کو اختیار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ متن اصل مقصود نہیں ہے، اصل مقصود اسناد واعتبار کا ہے، اسی طرح بعض متون میں قول صحیح کو نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، ان کو معتبر متون کا درجہ حاصل نہیں ہوگا۔

۴) بعض دفعہ دلیل کی بنیاد پر بھی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، جیسے ایک رائے استحسان پر مبنی ہو اور دوسری قیاس پر، تو عام طور پر اس رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، جو استحسان پر مبنی ہو، کیوں کہ استحسان میں قیاس کی جہت گو ظاہر نہیں ہوتی، لیکن زیادہ قوی ہوتی ہے اور قیاس ظاہر ہوتا ہے، لیکن قوت ومناسبت کے اعتبار سے نسبتاً ضعیف، اس لیے استحسان پر مبنی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، البتہ ۲۲/ مسائل وہ ہیں جن میں قیاس کو استحسان پر ترجیح دی گئی ہے، علامہ شامیؒ نے ناطقیؒ اور ابن نجیمؒ کے حوالہ سے ان کا ذکر کیا ہے۔

اسی قبیل سے اس کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ جو رائے عرف کے مطابق ہو، یا جو رائے انسانی ضرورت سے زیادہ ہم آہنگ ہو اور حرج سے بچاتی ہو، وہ رائے راجح ہوگی، کیوں کہ عرف اور ضرورت کی حیثیت بھی فی الجملہ دلیل شرعی کے ہے، اور بہت سے احکام کی بنیاد ان ہی اصولوں پر ہے۔ ==

صاحب قول کے متعلق معلومات:

پھر جس مجتہد کے قول پر فتویٰ دے اس کے متعلق معلوم ہونا چاہئے کہ روایت ودرایت میں اس کا کیا درجہ ہے:

"لابد للمفتی المقلد ان یعلم حال من یفتی بقوله ....بل معرفة فی الروایة ودرجته فی الدرایة وطبقته". (۱)

مفتی مقلد جس کے قول پر فتویٰ دے رہا ہے اس کے متعلق مفتی کو یہ علم ہونا ضروری ہے کہ روایت ودرایت میں اس کا کیا درجہ ہے اور کس طبقہ میں داخل ہے۔

== اسی طرح امام کی جو رائے نص سے قریب تر ہو، اور کتاب وسنت کے ظاہر کے موافق ہو، بہت سی دفعہ اہل علم اسے ترجیح دیتے ہیں، علامہ ابن ہمام اور علامہ حلبی وغیرہ کے یہاں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، نیز علماء ہند میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا انورشاہ کشمیریؒ کے یہاں بھی یہ رجحان کثرت سے پایا جاتا ہے، چنانچہ ظہر وعصر کے اوقات نماز میں بعض مشائخ نے صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے، زمین کی بٹائی داری کے سلسلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا گیا ہے، یہ اور اس طرح کے مسائل کو اس زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے، اس رجحان کو بڑھانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اصل مقصود کتاب و سنت کی اتباع اور شرعی دلیلوں سے ثابت ہونے والے احکام کی پیروی ہے، لہٰذا اگر کسی مسئلہ میں اہل علم کو دو قول میں سے ایک کے نص سے زیادہ موافق ہونے کا اطمینان ہوجائے تو مذہب کے اس قول کو ترجیح دینی چاہئے۔

۵) اگر مختلف اقوال کو مختلف فقہا نے ترجیح دیا ہو، تو ترجیحی تعبیر کی بنیاد پر بھی راجح قول متعین کیا جاتا ہے، چنانچہ اصول افتا کے ذیل میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہ راجح اور درست قرار دیئے جانے میں کس نے کیا تعبیر اختیار کی ہے؟ جس قول کے حق میں زیادہ مؤکد تعبیر اختیار کی گئی ہو، وہ راجح ہوگی، چنانچہ علامہ شامی نے تاکید وتقویت کے اعتبار سے حسب ذیل ترتیب مقرر کی ہے:

۱)به یفتیٰ — **۲)الفتویٰ علیه**

۳)الأصح — **۴)الصحیح**

۵)الأشبه — **۶)الأحوط**

۷)فیه احتیاط

اسی طرح ترجیح کے لیے ألیق، أصلح، أولی، وغیرہ کی تعبیر بھی اختیار کی جاتی ہے:

علامہ خیر الدین رملیؒ نے ترجیح وتصحیح کے لیے یہ تعبیرات ذکر کی ہیں اور ان کو قول مفتی بہ ہونے کی علامت ذکر کیا ہے، وہ اس طرح ہیں:

۱)علیه الفتویٰ — **۲)به یفتیٰ**

۳)به نأخذ — **۴)علیه الاعتماد**

۵)علیه عمل الیوم — **۶)علیه عمل الأمة**

۷)هو الصحیح — **۸)هو الأصح**

۹)هو الأظهر — **۱۰)هو المختار فی زماننا**

۱۱)هو فتاویٰ مشائخنا — **۱۲)هو الأشبه**

۱۳)هو الأوجه۔ (کتاب الفتاویٰ جلد اول: ۲۶۰/تا/۲۶۶، از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب۔)

(۱) شرح عقود رسم المفتی ص ۳۔

خواہشات سے اجتناب:

ہر حال میں خواہشات نفس، لالچ، اور اس طرح کے دوسرے رذائل سے فتویٰ دینے کے وقت مفتی کا بچنا ضروری ہے اس لئے کہ ان جذبات کی پیروی حرام ہے۔

"ویحرم اتباع الهویٰ والتشهی والمیل إلی المال الذی هو الداهیة الکبری والمصیبة العظمیٰ فإن ذلک أمر عظیم لایتجاسر علیه إلّا کُلّ جاهل شقی". (۱)

خواہشات نفس کی پیروی، میلان نفس اور مال دونیا طلبی کا رجحان حرام ہے جو سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑی ہلاکت ہے، یہ ایسا خطرناک اقدام ہے جس کی جسارت جاہل بدبخت کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے۔

ناجائز حیلے:

جو حیلے حرام اور مکروہ ہوں مفتی کے لئے ان کا اختیار کرنا درست نہیں ہے اسی طرح ان رخصتوں کی تلاش میں پڑنا بھی جن سے غلط پر کچھ لوگ استفادہ کے خواہاں ہوں۔ حافظ ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"لایجوز للمفتی تتبع الحیل المحرمة والمکروهة ولاتتبع الرخص لمن اراد نفعه فان تتبع ذلک فسق وحرام استفتاء ہ". (۲)

حرام اور ناجائز حیلوں کی تلاش وجستجو مفتی کے لئے درست نہیں ہے اسی طرح ایسے شخص کے لئے رخصتوں کی جستجو میں پڑنا بھی جائز نہیں ہے جو ناجائز نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو کیوں کہ یہ فسق ہے اور اس طرح کا استفتا حرام ہے۔

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

"ویحرم التساهل فی الفتویٰ واتباع الحیل إن فسدت الأغراض". (۳)

فتویٰ میں تساہل اور حیلوں کی پیروی جب اغراض فاسدہ کے پیش نظر ہو حرام ہے۔

جائز حیلے:

البتہ وہ شرعی حیلے جن پر عمل فقہائے امت نے جائز قرار دیا ہے اور اس میں کوئی شرعی مفسدہ نہیں ہے، ان کے ساتھ فتویٰ دینا درست ہے۔ حافظ ابن القیمؒ رقمطراز ہیں:

"فإن حسن قصده فی حیلة جائزة لاشبهة فیها ولامفسدة لتخلیص المستفتی بهامن حرج

(۱) شرح عقود رسم المفتی: ۳۰۔

(۲) اعلام الموقعین عن رب العالمین: جلد ۲ ص ۲۵۸۔

(۳) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ص ۱۷۵۔

جاز ذلک بل استحب وقد أرشد اللّٰہ تعالیٰ نَبِیَّہ أیّوب علیہ السلام إلی التخلیص من الحنث بأن یأخذ بیدہ ضغثا فیضرب بہ المرأۃ ضربۃ واحدۃ وأرشد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا لاً إلی بیع التمر بدراھم ثم یشتری بالدراھم تمراً آخر''. (۱)

اگر کوئی جائز حیلہ اچھے ارادہ سے اختیار کرے جس میں نہ کوئی شبہ ہو، نہ مفسدہ بلکہ منشا مستفتی کو تنگی سے نکالنا ہو تو یہ جائز ہے بلکہ مستحب، خود اللہ نے اپنے نبی حضرت ایوب علیہ السلام کی حنث (قسم توڑنے کے گناہ) سے بچاؤ کے لئے رہنمائی فرمائی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لے لیں اور اس سے اپنی اہلیہ کو ایک مرتبہ ماریں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے بتایا کہ وہ کھجور دراہم کے بدلے بیچ دیں اور پھر ان دراہم سے دوسری کھجور خرید لیں۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں آداب افتاء کا بھی تذکرہ آ گیا، اب سرسری طور پر ایسی چند ضروری چیزوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا تعلق باب افتا میں متعلق مسائل سے ہے۔

سہل پہلو اور رخصت پر فتویٰ:

جو چیزیں بغیر کراہت جائز ہیں اور شریعت میں ان کے لئے رخصت ہے مفتی کو چاہئے عوام کے لئے ایسے سہل پہلو کو اختیار کرے اور اس پر فتویٰ دے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

''وفی عمدۃ الأحکام من کشف البزدوی: یستحب للمفتی الأخذ بالرخص تیسرا علی العوام مثل التوضی بماء الحمام والصلوٰۃ فی الأماکن الطاھرۃ بدون المصلی الخ''. (۲)

کشف البزدوی کے حوالہ سے عمدۃ الاحکام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مفتی کے لئے مستحب ہے کہ عوام کی آسانی کی غرض سے رخصتوں پر فتویٰ دے جیسے حمام کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہوں میں بغیر جائے نماز کے نماز پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جو لوگ محتاط اور خواص ہیں ان کے لئے عزیمت پر ہی عمل بہتر ہے۔

''ولا یلیق ذلک بأھل العزلۃ بل الأخذ بالاحتیاط والعمل بالعزیمۃ أولیٰ بھم''. (۳)

یہ رخصت گوشہ نشینوں کے لئے مناسب نہیں ہے بلکہ ان کے لئے بہتر ہے کہ یہ احتیاط کو اختیار کریں اور عزیمت پر عمل کریں۔

فتویٰ میں سہل پہلو کا لحاظ رکھنا چاہئے بالخصوص کمزوروں کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ینبغی للمفتی أن یأخذ بالأیسر فی حق غیرہ خصوصا فی حق الضعفاء لقولہ علیہ السلام لأبی موسیٰ الأشعری ومعاذ حین بعثھما إلی الیمن: یَسِّرا ولا تُعَسِّرا''. (۴)

---

(۱) اعلام الموقعین: جلد ۲ ص ۲۵۸۔
(۲) عقد الجید: ص ۷۳۔
(۳) حوالہ سابق۔
(۴) عقد الجید: ص ۷۴۔

مناسب یہ ہے کہ مفتی ایسا قول اختیار کرے جو دوسروں کے حق میں خصوصاً کمزوروں کے حق میں آسان تر ہو اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کیا تو ارشاد فرمایا ''تم دونوں آسانی کرنا اور تنگی نہ کرنا۔

مفتی کے اختیارات وفرائض:

مفتی مناسب جانے تو اس کے لئے درست ہے کہ سائل نے جتنا پوچھا ہے وہ اس سے زیادہ بتادے۔ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یجوز للمفتی أن یجیب السائل بأکثر مماسأله عنه ....وقد ترجم البخاری علی ذلک فی صحیحه فقال باب من أجاب السائل بأکثر مماسأل عنه ثم ذکر حدیث ابن عمرؓ''.(۱)

یہ جائز ہے کہ مفتی سائل کو اسکے سوال سے زیادہ مسائل بتائے امام بخاریؒ نے اس عنوان کا ایک باب قائم کیا ''باب اس بات میں کہ سوال کرنے والے کو اس سے زیادہ جواب دے جتنا اس نے پوچھا'' پھر اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ذکر کی ہے۔

اگر کوئی جواب ایسا ہو جس میں اندیشہ ہو کہ مستفتی کا ذہن غلطی کی طرف جاسکتا ہے تو اس پر تنبیہ کردے۔

''أفتیٰ المفتی للسائل بشئی ینبغی له أن ینبهه علی وجه الإحترازمماقدیذهب إلیه الوهم منه إلی خلاف الصواب''.(۲)

کسی مسئلہ کا مفتی نے جواب لکھا اور اس میں اندیشہ ہے کہ سائل کا ذہن درستی کی مخالف سمت میں جاسکتا ہے تو مفتی کو چاہیئے کہ اس غلطی سے بچنے پر متنبہ کردے۔

حتی الامکان جو حکم بیان کیا جائے اس کی دلیل کا بیان کردینا بہتر ہے تا کہ مستفتی کو سکون قلب حاصل ہوجائے۔

''ینبغی للمفتی ان یذکر دلیل الحکم ومأخذه ماامکنه من ذلک''.(۳)

حتی الامکان مفتی کو چاہیئے کہ حکم کی دلیل اور اس کا ماخذ بیان کردے۔

جواب واضح ہو:

جواب کافی وشافی ہو،اشکال وتذبذب میں ڈالنے والا نہ ہو۔چنانچہ علماء نے لکھا ہے:

''لایجوزللمفتی تخیرالسائل وإلقاء ه فی الإشکال والحیرةبل علیه أن یبین بیانامزیلا للإشکال.......... کافیافی حصول المقصود''.(۴)

(۱) اعلام الموقعین:ص ۲۳۳ ج ۲۔

(۲/۳) حوالہ سابق:ص ۳۳ ج ۲۔

(۴) اعلام الموقعین:ص ۲۴۱ ج ۲۔

یہ درست نہیں ہے کہ مفتی سائل کو اختیار دیدے اور اس طرح اسے مشکلات میں ڈالدے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ اس طرح مسئلہ کو کھول کر بیان کردے کہ کوئی اشکال باقی نہ رہ سکے اور جواب کے لئے کافی ووافی ہو۔

اگر کوئی مسئلہ تفصیل طلب ہو تو ایسی صورت میں اسے مجمل نہیں بیان کرنا چاہئے، اعلام الموقعین میں ہے:

"ليس للمفتى أن يطلق الجواب فى مسئلة فيها تفصيل". (۱)

تفصیل طلب مسئلہ میں یہ جائز نہیں ہے کہ مفتی اجمالی جواب دے۔

اگر..........اس کے پاس کوئی قابل وثوق دیندار عالم ہو اور مسئلہ اہم ہو تو اس سے مشورہ کرے۔

"وإن كان عنده من يثق بعلمه ودينه فينبغى له أن يشاوره". (۲)

اگر کوئی قابل وثوق عالم باعمل موجود ہو تو اس سے مشورہ کرے۔

مفتی کو چاہئے کہ جواب لکھتے وقت اپنا قلب خدا کی طرف پھیر لے اور محتاج محض بن کر خدا کے آگے اپنے کو ڈالدے اور بکثرت دعا کرے۔

"وحقيق بالمفتى أن يكثر الدعاء بالحديث الصحيح". (۳)

مفتی بکثرت دعاء ماثورہ پڑھتا رہے۔

فقہا نے لکھا ہے کہ مفتی کو چاہئے کہ وہ جب استفتاء کا جواب لکھ چکے تو اس کے اخیر میں لکھے واللہ اعلم" (اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے اور عقائد سے متعلق مسئلہ ہو تو لکھے" واللہ الموفق" (اللہ توفیق بخشنے والا ہے)۔

علامہ طحطاوی لکھتے ہیں:

"ينبغى أن يكتب عقب جوابه والله اعلم وقيل يكتب فى العقائد والله الموفق". (۴)

اپنے جواب کے ختم پر واللہ اعلم لکھنا مناسب ہے اور عقائد سے متعلق مسئلہ ہو تو کہا گیا ہے کہ واللہ الموفق لکھے۔

استدلال:

استدلال کا ذکر فتویٰ میں اس کا حسن وجمال ہے اس لئے اس کے نقل کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"عاب بعض الناس ذكر الاستدلال فى الفتوىٰ وهذا العيب اولىٰ بالمعيب بل جمال الفتوىٰ". (۵)

---

(۱)　اعلام الموقعین: ص ۲۴۵ ج ۲۔

(۲، ۳)　اعلام الموقعین: ص ۱۷۱ ج ۲۔

(۴، ۵)　طحطاوی علی الدر المختار: ج ۱ ص ۴۹۔

بعض لوگوں نے استدلال کو فتویٰ میں معیوب قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا خود عیب قرار دینے والے کے لئے معیوب ہے اسلئے کہ دلیل کا اظہار فتویٰ کا حسن و جمال ہے۔

آج کل حوالہ کا طریقہ یہ ہے کہ جس مستند کتاب سے مسئلہ لیا گیا ہے اس کی عبارت نقل کردے اور اس کے صفحات باب کا حوالہ دیدے۔

مستند کتابوں کا حوالہ:

اس سلسلہ میں طحطاویؒ اور دوسرے علماء صراحت کرتے ہیں کہ سند نہ ہونے کی صورت میں متداول مستند کتاب سے مسئلہ اخذ کیا گیا ہو۔

”وطريق نقله أحد من أمرين إماأن يكون له سند فيه أويأخذ ه من كتاب معروف تداولته الأيدى من كتب الإمام محمدبن الحسن ونحوهامن التصانيف المشهورةلأنه بمنزلةالخبر المتواتر والمشهور“.(۱)

نقل کے دوطریقے ہیں ان میں سے ایک یہ کہ اس مسئلہ میں مسلسل اس کے پاس سند ہو یا ایسی مشہور معروف کتاب سے لیا گیا ہو، جو علماء میں مقبول و رائج ہو جیسے امام محمد رحمہ اللہ کی تصانیف مشہورہ یا ان جیسی دوسری کتابیں اس لئے کہ یہ بھی خبر متواتر و مشہور کے درجہ کی چیز ہے۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں آج کل دوسری صورت اسلم اور محکم ہے اور اسی پر موجودہ مفتیوں کا عمل بھی ہے کہ وہ حکم کرنے کے بعد کسی معتمد (۲) کتاب کی عبارت نقل کردیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جس حد تک صریح جزئیہ مل جائے اچھا ہے۔

شامی متاخرین کی کتابوں میں:

ہمارے اس دور میں ردالمحتار لابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ) سب سے زیادہ مقبول و مشہور کتاب ہے، اس لئے

---

(۱) حاشیہ طحطاوی علی الدرالمختار: ص ۴۹ ج ۱۔

(۲) امام محمد رحمہ اللہ کی کتابوں سے نقل در نقل ہوتے ہوئے جو قابل اعتماد کتابیں علما میں مقبول ہیں ان کا حوالہ بھی درست ہے۔ أما الإعتماد على كتب الفقه الصحيحة الموثوق بهافقد اتفق العلماء فى هذا العصر جواز الإعتمادعليها لأن الثقة قد حصلت بهاكماتحصل بالرواية. (معین الحکام ۳۱)

البتہ غیر مشہور کتابوں سے فتویٰ دینا درست نہیں، وعلى هذايحرم الفتيامن الكتب الغريبة التى لم تشتهر حتى تتظافرعليهاالخواطر ويعلم صحة مافيها. (معین الحکام ۳۲)

اسی طرح ان کتابوں سے بھی فتویٰ دینا درست نہیں ہے جو نئی تصنیفات میں شمار کی جاتی ہیں اور جن میں معتبر کتابوں کے حوالہ سے مسئلہ نہ اخذ کیا گیا ہو، وكذلك الكتب الحديثة التصنيف اذالم يشتهرعز ومافيها من المنقول إلى الكتب المشهورة الخ. (معین الحکام ۳۲۔ ظفیر)

کہ اس میں مستند کتب فقہ کا سارا ذخیرہ پوری خوبی سے یکجا کر دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عالم ربانی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کے سامنے بیشتر یہی کتاب رہتی تھی۔

بعض علما نے لکھا ہے کہ جو مسئلہ بیان کیا جائے اس کا ایسا حوالہ نقل کیا جائے جس میں کوئی گنجلک نہ ہو، اسی کے ساتھ مفتی کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ قواعد وضوابط سے مسئلہ اخذ کرنے کی سعی نہ کرے بلکہ صریح جزئیہ نقل کرے۔ شرح حموی میں ہے:

"لما ذکر ....فی الفوائد الزینیة انه لایحل الافتاء من القواعد والضوابط وانما علی المفتی حکایة النقل الصریح کما صرحوا به". (۱)

فوائد زینیہ میں مذکور ہے کہ قواعد وضوابط سے فتویٰ دینا درست نہیں ہے بلکہ مفتی کا فریضہ ہے کہ وہ نقل صریح کی حکایت کرے جیسا کہ فقہا نے اس کی صراحت کی ہے۔

مفتی اور قیاس واجتہاد:

لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر زمانہ کے مفتی کے سامنے کچھ مسائل ایسے ضرور آتے ہیں جو کتابوں میں صراحتاً مذکور نہیں ہوتے ایسی حالت میں اس مفتی پر مسئلہ کا اخذ اصول وقواعد سے ضروری ہوتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا، اس وجہ سے مفتی کے لئے ایسے مواقع میں اس کی اجازت ہر زمانہ میں ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ مفتی کے لئے جہاں بہت سارے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب اور امام کے اصول اور اسالیب سے مناسبت تامہ رکھتا ہو (جیسا کہ پہلے گذر چکا) تاکہ بوقت ضرورت ان نئے مسائل کا جواب فراہم کر سکے جس کی صراحت امام اور اصحاب امام وغیرہم سے منقول نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ مفتی کے لئے فقیہ النفس صاحب حسن تصرف اور سلیم الذہن ہونا بھی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار میں ہے:

"وینبغی أن یکون متنزها عن خوارم المروة فقیه النفس سلیم الذهن حسن التصرف". (۲)

لائق یہ ہے کہ مفتی خوارم مروت سے منزہ ہو اور ساتھ ہی فقیہ النفس سلیم الذہن اور حسن تصرف کے اوصاف سے متصف ہو۔

ان اوصاف کا جو حامل ہوگا وہ مقلد ہونے کے باوجود اصول وضوابط اور کتاب وسنت کی روشنی میں مسائل کا بآسانی جواب دے سکے گا اور تاریخ گواہ ہے کہ اب تک یہی ہوتا آیا ہے۔ (۳)

---

(۱) شرح حموی علی الاشباہ والنظائر: ۱۲۱۔

(۲) حاشیۃ الطحطاوی: جلد ۳ / ص ۱۷۵۔

(۳) **اصول افتاء پر کتابیں:** جس طرح احکام کے استنباط اور اجتہاد کے لیے اصول مقرر کئے گئے ہیں، اسی طرح اہل علم نے فتویٰ دینے کے اصول پر بھی قلم اٹھایا ہے، اور انہیں منضبط کرنے کی کوشش کی ہے، اس فن کو عام طور پر "رسم المفتی" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس میں فتویٰ کی اہمیت، فتویٰ کا شرعی حکم، فتاویٰ نویسی کے اصول وقواعد، مفتی کی صفات وغیرہ موضوعات پر بحث کی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس فن پر کم کام ہوا ہے، اور چند ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے اہم کتابیں یہ ہیں: ==

مصلحت کو ترجیح:

اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں دو صحیح اقوال ہوں تو مفتی اپنی صوابدید اور مصلحت وقت کے پیش نظر کسی کے قول پر فتویٰ دے سکتا ہے۔صاحب الاشباہ والنظائر (م ۹۶۰ھ) لکھتے ہیں:

"المفتی انما یفتی بما یقع عندہ من المصلحۃ کما فی مھر البزازیۃ". (۱)

مفتی بلاشبہ اس مصلحت پر فتویٰ دیتا ہے جسے وہ مناسب جانتا ہے جیسا کہ فتاویٰ بزازیہ کے باب المہر میں ہے۔

اس پر حموی لکھتے ہیں:

"لعل المرادبالمفتی ھناالمجتھداماالمقلدفلایفتی الابالصحیح سواء کان فیہ مصلحۃللمستفتی

==

۱)کتاب الفقیہ و المتفقہ	حافظ خطیب بغدادی	(م:۴۶۳ھ)
۲)ادب المفتی والمستفتی	حافظ تقی الدین ابن صلاح	(م:۶۴۳ھ)
۳)آداب الفتویٰ و المفتی والمستفتی	امام نووی	(م:۶۷۶ھ)
۴)الفتیا و مناھج الإفتاء	شمس الدین محمود اسفہانی	(م:۷۴۹ھ)
۵)الإحکام في تمیز الفتاویٰ	امام ابوالعباس احمد قرافی	
۶)إعلام الموقعین عن رب العالمین	علامہ ابن قیم جوزی	(م:۷۵۱ھ)
۷)الفتویٰ في الإسلام	علامہ شمس الدین قاضی زادہ	(م:۹۸۸ھ)
۸)منارأھل الفتویٰ وقواعدالإفتاء بالأقویٰ	علامہ ابراہیم لقانی مالکی	
۹)شرح عقود رسم المفتی	علامہ ابن عابدین شامی	(م:۱۲۵۲ھ)
۱۰)صفۃ الفتویٰ والمفتی والمستفتی	علامہ احمد حموی	(م:۱۰۹۸ھ)

ان کے علاوہ مختلف اہل علم نے اپنی فقہی تالیفات میں افتا اور استفتا کے آداب پر مستقل عنوان قائم کیا ہے، اور مختصر طور پر اصول افتا پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں علامہ خیر الدین رملی کی "فتاویٰ خیریہ" علامہ سراج الدین اودھی کی "فتاویٰ سراجیہ" اور قاضی فخر الدین خان کی "فتاویٰ خانیہ" نیز علامہ حصکفی کی "درمختار" اور اس پر ابن عابدین شامی کے حواشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اردو زبان میں مستقل حیثیت سے اس موضوع پر بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے، اسی پس منظر میں راقم الحروف (خالد سیف اللہ) کی خواہش پر عزیز گرامی مولانا محمد شہاب الدین سبیلی (پی، ایچ، ڈی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) نے "افتاء--احکام وآداب" (صفحات: ۱۲۸) کے نام سے ایک مختصر مگر جامع تحریر مرتب کی ہے، جسے ۱۴۲۳ھ میں المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد نے شائع کیا ہے، البتہ علامہ شامی کی شرح عقود رسم المفتی کو بعض علماء نے اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے، اس سلسلہ میں مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) اور مفتی محمد سلمان منصور پوری (استاذ حدیث جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد) کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا پالنپوری نے "آپ فتویٰ کیسے دیں؟" کے نام سے عقود رسم المفتی یعنی متن کے اشعار کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے، پھر اس کی شرح اس طرح کی ہے کہ علامہ شامی کی شرح عقود کا نچوڑ آجائے، گویا متن کا ترجمہ ہے اور شرح کی ترجمانی، نیز کتاب کے اخیر میں کتاب میں مذکور شخصیتوں کے تراجم اور کتابوں کے تعارف پر مشتمل بہت ہی مفید ضمیمہ ہے، ....مولانا منصور پوری نے اس میں آنے والے اصولوں کو منقح کرنے اور مثالوں پر منطبق کرنے کی بہت ہی مفید کوشش کی ہے۔(کتاب الفتاویٰ جلد اول: ۲۴۸۔۲۴۹)

(۱) الاشباہ والنظائر: ص ۳۱۸۔

أو لا ویجوز أن یراد به المقلد اذا کان في المسئلة قولان صحیحان فانه مخیر في الفتویٰ بکل واحد منهما فیختار ما فیه المصلحة منهما هکذا ظهر لی". (۱)

شاید یہاں مصلحت میں مفتی سے مراد مجتہد ہے اس لئے کہ جو مقلد ہے وہ تو صرف صحیح نقل پر فتویٰ دیگا خواہ وہ مستفتی کی مصلحت کے مطابق ہو یا نہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں مفتی مقلد ہی مراد ہو اور اس کی صورت یہ ہو کہ اگر کسی مسئلہ میں دو صحیح قول ملتے ہیں تو اسے اختیار ہے کہ ان دو میں سے جسے مصلحت کے مطابق پاوے اس پر فتویٰ دے ایسا ہی میری سمجھ میں آیا۔

مفتی کا مقام (۲):

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی اپنی ذمہ داری میں قاضی سے بڑھا ہوا ہے، کم نہیں ہے اس لئے فقہاء نے جہاں قاضی کے عالم و جاہل ہونے کی بحث کی ہے وہاں اس کی بھی صراحت ہے کہ قاضی مفتی کے فتویٰ پر فیصلہ کرسکتا ہے اگر اس نے قضاء کی بنیاد پر فتویٰ دیا ہو، اس لئے کہ مفتی کا منصب دراصل دیانت کی بنیاد پر فتویٰ دینا ہے۔

"في إیمان البزازیة المفتي یفتي بالدیانة والقاضي یقضي بالظاهر". (۳)

فتاویٰ بزازیہ کی کتاب الایمان میں ہے کہ مفتی دیانت پر فتویٰ دیتا ہے اور قاضی ظاہر حال پر فیصلہ کرتا ہے۔

البتہ مفتی اور قاضی میں یہ فرق ضرور ہے کہ مفتی صرف حکم بتانے کا ذمہ دار ہے اب مستفتی پر موقوف ہے کہ وہ عمل کرے یا نہ کرے، مفتی اسے مجبور نہیں کرسکتا، پھر سوال کرنے والا جیسا سوال کریگا مفتی اسی کے مطابق جواب لکھدے گا یا زبانی بتادیگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مفتی چوکنا اور دور اندیش ہو ایسا نہ ہو کہ مستفتی کے سامنے قبل از وقت صورت مسئلہ بیان کردے اور وہ اس کی روشنی میں سوال ڈھال لائے لیکن ہر حال میں بحث و مباحثہ اور تفتیش و تجسس صرف قاضی کے سر ہے مفتی کے ذمہ نہیں۔

---

(۱) شرح حموی علی الاشباہ والنظائر: ۳۱۸۔

(۲) **مصالح کی رعایت:**

علامہ حمیری نے لکھا ہے کہ مفتی کے لیے یہ بات جائز ہے کہ مصالح اور مستفتی کے حالات کو پیش نظر رکھ کر سوال میں مذکور برائی کے متعلق ایسے جملے نقل کردے جو از راہ تہدید کتاب وسنت میں وارد ہیں، گو کہ اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، مثلاً اگر ترکِ نماز کے بارے میں استفتاء ہو تو لکھے کہ ترکِ نماز تو گویا کفر ہے: " **من ترک الصلوة متعمدًا فقد کفر** ".

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے قاتل کی توبہ قبول ہونے کے بارے میں سوال کیا، تو فرمایا: اس کی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں، پھر دوسرے نے یہی سوال کیا، تو فرمایا کہ اس کے لیے توبہ ہے، پھر لوگوں سے وضاحت فرمائی کہ پہلے شخص کی آنکھ پر کچھ آثار تھے کہ گویا وہ قتل کا ارادہ رکھتا ہے اور توبہ کی قبولیت اس کے حوصلہ کو اور بڑھا دیتی، دوسرا شخص وہ تھا جو قتل کے بعد پشیماں اور اپنے بارے میں مایوس تھا، اگر اس کو یہ جواب نہ دیا جاتا تو اور دل شکستہ ہوجاتا۔ (کتاب الفتاوی جلد اول: ۲۵۷۔۲۵۸، مقدمہ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب۔)

(۳) الدر المختار مع رد المحتار: ۴۲۴۔

عورت مسند افتا پر بیٹھ سکتی ہے:

اسی وجہ سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ افتا اخرس (گونگے) کے لئے بھی درست ہے، جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ مفتی مرد ہی ہو، عورت نہ ہو یا آزاد ہی ہو، غلام نہ ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ بولنے والا ہی ہو گونگا نہ ہو۔ ردالمحتار میں ہے:

"لاحرية ولاذكورة ولانطق فيصح إفتاء الأخرس". (۱)

مفتی ہونے کے لئے نہ آزاد ہونے کی شرط ہے نہ مرد ہونے کی اور نہ صاحب نطق ہونے کی لہذا گونگے کا فتویٰ دینا درست ہوگا۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ افتاء کے فرائض عورتیں، غلام اور گونگے بھی انجام دے سکتے ہیں اگر ان میں وہ تمام شرائط ومحاسن جمع ہیں جو ایک مفتی کے لئے ضروری ہیں اور جن کا اجمالی تذکرہ اوپر گذر گیا۔ (۲)

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار جلد۲ ص ۴۵۔

(۲) ماخوذ از فتاوی دارالعلوم جلد اول: ۸۶۔ تا ۱۱۵، مقدمہ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

استفتا کے آداب واحکام

(۱) استفتا کے معنی سوال دریافت کرنے کے ہیں اور اس کا ثبوت خود قرآن مجید سے ہے، فرمایا گیا: فَسْـئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ. (۲) یہاں ذکر سے علم مراد ہے، اس طرح اہل علم سے پوچھنے اور واقفیت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا، لہٰذا ان تمام لوگوں کے لیے جو خود منصب افتا کے اہل نہ ہوں، واجب ہے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اربابِ افتا سے سوال کریں، ضرورت ہو تو اس کے لیے سفر کریں اور آج کل کے حالات کے لحاظ سے بذریعہ پوسٹ یا انٹرنیٹ دریافت کریں۔

کس سے سوال کیا جائے:

(۱) سوال ایسے شخص سے کرنا چاہئے جو علوم اسلامی سے واقف ہو، فقہ پر دستگاہ رکھتا ہو اور فتویٰ دینے کا اہل ہو، ہر شخص جو روایتی عالم ہو، یا عالم کہلاتا ہو، اس سے استفتا نہیں کرنا چاہئے، عین ممکن ہے کہ ایک شخص بہترین واعظ ہو، اچھا مدرس ہو، مگر فتاویٰ کی کتب اور مفتی بہ اقوال پر اس کی نظر نہ ہو۔

(۲) افتا کی اہلیت جاننے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ عام مسلمانوں میں اس کا مفتی ہونا مشہور ہو، یا ایک بھی صاحب علم کسی کے مفتی ہونے کی نشاندہی کردے۔

(۳) جہاں ایک سے زیادہ اربابِ افتا موجود ہوں وہاں کسی بھی ایک سے سوال کیا جاسکتا ہے، ضروری نہیں کہ یہ جستجو کی جائے کہ ان میں سے کون زیادہ اہلیت رکھتے ہیں؟ البتہ یہ بات زیادہ بہتر ہوگی کہ جو زیادہ اہل ہوں، ان سے تحقیق کو ترجیح دی جائے۔

(۴) پھر اگر دو ایسے مفتی جمع ہوں جن میں سے ایک علم وتحقیق کے اعتبار سے زیادہ ممتاز ہوں اور دوسرے اپنے زہد وورع کے لحاظ سے، تو پہلے کو ترجیح ہوگی۔

(۵) سوال کرنے والے کو چاہئے کہ اس مفتی سے سوال کرے جو اس کا ہم مسلک ہو، یعنی حنفی، حنفی سے، شافعی، شافعی سے، اس لیے کہ اگر اس مسئلہ کو ''مستفتی'' کی نظرِ انتخاب پر چھوڑ دیا جائے اور وہ کبھی حنفی سے اور کبھی

(۱) از کتاب الفتاوی جلد اول مقدمہ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: ۲۴۹/تا ۲۵۵۔

(۲) سورۃ النحل: ۴۳۔

شافعی عالم سے پوچھتا پھرے تو رخصتوں اور سہولتوں کی پیروی کا ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا، اور دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

سوال کے آداب:

(۶) استفتا براہِ راست کرنا چاہئے یا کسی ثقہ قاصد یا قابل اعتماد ذریعہ کو واسطہ بنانا چاہئے۔

(۷) مفتی کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آئے، اس کو تحریری یا زبانی طور پر مخاطب کرتے ہوئے ایسے الفاظ کا استعمال کرے جو احترام و تعظیم کے لیے ہوں، ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ نہ کرے۔

(۸) مفتی کے جواب کے بعد یہ نہ کہے کہ میں نے بھی ایسا ہی کہا تھا، یا یہ کہ میرے دل میں بھی یہی بات آئی، یا آپ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی مجھے یہ بتا چکے ہیں۔

(۹) اس طرح بھی استفتا نہ کرے کہ اگر آپ کا جواب فلاں مفتی صاحب کے موافق ہے، جنہوں نے لکھا ہے ،تو لکھئے ورنہ ضرورت نہیں۔

(۱۰) اس حال میں بھی سوال نہیں کرنا چاہئے جب مفتی کھڑا ہو، یا غیظ وغصہ اور غم کی حالت میں ہو اور مزاج اعتدال پر نہ ہو۔

سوالنامہ اور تعبیر:

(۱۱) سوال کا کاغذ بڑا ہو تا کہ وضاحت کے ساتھ بآسانی اس کا مفصّل جواب بھی اسی کاغذ پر تحریر کیا جا سکے۔

(۱۲) سوال میں احترام کے ساتھ مخاطب کرنے کے علاوہ کچھ دعائیہ جملہ بھی ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے، آپ سے راضی ہو وغیرہ۔

(۱۳) سوال واضح عبارت میں ہو، حروف صاف اور خط نمایاں ہو، بہتر ہے کہ کسی صاحبِ علم سے استفتا مرتب کرائے، گزشتہ زمانہ میں تو بعض فقہا شہر کے بعض مخصوص کاتبین کے لکھے ہوئے سوالات ہی قبول کرتے تھے، عام لوگوں کے سوال قبول نہیں کرتے تھے۔

(۱۴) عام لوگوں کو فتاویٰ میں دلیل کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، ہاں، اگر تسکین نفس اور اطمینان کے لیے دلیل کو جاننا ہی چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ کسی اور مجلس میں آکر اس کی درخواست کرے خواص اور اہل علم دلائل واضح کر دینے کی خواہش کر سکتے ہیں۔

(۱۵) سوال اگر تحریری صورت میں ہو تو مستفتی کو اپنا نام بھی لکھنا چاہئے تا کہ مسائل واضح ہو سکیں۔ (یہ امام نووی کی ''شرح المهذب'' کے مقدمہ(۱) سے ماخوذ ہے۔

(۱) آداب الفتویٰ و المفتی و المستفتی۔

ناپسندیدہ اور بے مقصد سوالات:

(۱۶)　خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ اور نظری قسم کے سوالات کو اسلام میں پسند نہیں کیا گیا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیل وقال اور کثرت سوال کو ناپسند فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایسی چیزیں جو پیش نہیں آئیں، ان کے بارے میں سوال نہ کیا کرو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے، امام اوزاعیؒ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو علم کی برکت سے محروم رکھنا چاہتا ہے تو اس کی زبان پر لایعنی سوالات (اغالیط) ڈال دیتا ہے۔(۱)

ابواسحاق شاطبی نے مختلف روایات کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ جس نوعیت کے سوال ناپسندیدہ ہیں، ان میں حسب ذیل دس صورتیں بھی ہیں:

(۱)　ایسی چیزوں کی بابت سوال کرنا جن کا کوئی فائدہ نہیں، چنانچہ لوگوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حکمت دریافت کی کہ چاند کے باریک اور پھر رفتہ رفتہ موٹے ہونے میں کیا حکمت ہے؟ تو اس بے مقصد سوال کا جواب دینے سے اعراض کیا گیا، اور قرآن میں کہا گیا کہ وہ لوگوں کے لیے اوقات بتانے کا ذریعہ ہے اور درحقیقت چاند کے سلسلہ میں یہی مقصدی بات ہی قابلِ ذکر ہے۔(اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے کہ یہاں قرآن نے اصل سوال سے احتراز کر کے ایک با مقصد بات بتادی ہے، اور اس حقیقت کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کر دیا ہے کہ ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں، دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ یہاں ان کے سوال ہی کا جواب دیا گیا ہے کہ چاند کے موٹے اور باریک ہونے میں یہ حکمت ہے کہ اس کے ذریعہ وقت یعنی تاریخ معلوم ہوتی ہے کہ اگر چاند شروع ہی سے موٹا ہوتا یا آخیر تک باریک رہتا تو تاریخ کا اندازہ نہ ہوسکتا جیسا کہ سورج کی وجہ سے تاریخ کا تعین مشکل ہے۔)

یا اسی طرح ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ پوچھنا ہو پوچھو، حضرت عبداللہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا "مَنْ أبي ؟" (میرے باپ کون ہیں؟) اس سوال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے گئے۔

(۲)　دوسرے یہ کہ ضروری آگاہی حاصل ہوجانے کے بعد پھر خواہ مخواہ سوال کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فقرہ پر برہمی ہوئی، جب ایک شخص نے حج کے بارے میں دریافت کیا: "**أكلّ عام؟**" (کیا یہ حج ہر سال واجب ہے)۔

۳)　فی الوقت جس بات کی ضرورت نہ ہو اس کے بارے میں سوال کرنا،۔۔۔۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**ذروني ما تركتكم**". (میں نے جس معاملہ میں تم کو چھوڑ دیا ہے اور کسی بات کا پابند نہیں بنایا ہے اس

(۱)　امام ابواسحاق شاطبی: الموافقات: ۴/ ۳۱۸-۳۱۷۔

میں تم بھی مجھے چھوڑ دو، اور سوالات نہ کرو۔ (یہ حکم نزول وحی کے زمانہ کے لئے تھا۔)

(۴) پیچیدہ بے مقصد سوالات کرنا، ۔۔۔۔۔حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اغلوطات'' سے منع فرمایا ہے، اور ''اغلوطات'' ایسے ہی سوالات کو کہتے ہیں۔

(۵) کسی ایسے حکم کی حکمت دریافت کرنا جس کا تعلق عقل وقیاس سے نہیں ہے، بلکہ بے سمجھے ایمان لانے، عمل کرنے اور اس پر یقین کرنے سے ہے، یا یہ کہ اس قسم کا سوال ایسا آدمی کرے جو ایسی دقیق باتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

(۶) ضرورت سے زیادہ تکلف اور بے جا غلو پر مبنی سوال، ۔۔۔۔چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ساتھ ایک پانی کے چشمہ پر پہونچے، ایک صاحب نے اس کی پاکی اور ناپاکی کی تحقیق کے لیے مقامی باشندہ سے سوال کیا کہ کیا اس پر پرندے اور جانور بھی آتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کو ناپسند فرمایا اور اس شخص کو جواب دینے سے منع فرمایا۔

(۷) اس طرح سوال نہ کیا جائے کہ کتاب وسنت پر اعتراض اور اشکال کی بو آئے۔ (ہاں، مزید طمانیت اور زیادت ایمان کے لیے شائستہ لب ولہجہ میں ایسا سوال کیا جا سکتا ہے اور صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی زندگی میں اس کی مثالیں موجود ہیں)۔

(۸) متشابہت یعنی دقیق اور مخفی امور کی بابت سوال کرنا، ۔۔۔۔چنانچہ امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح عرش پر بیٹھتے ہیں؟ یعنی اس سے تو اللہ تعالیٰ کے لیے جسم اور مکان لازم آتا ہے، حالاں کہ ذات والا شانہ، لامکان اور جسمانی کثافتوں سے بے نیاز ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا کہ ''استواء'' یعنی عرش پر جلوہ افروز ہونا معلوم ہے، اس لیے کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا ''بدعت'' ہے۔ (اسی طرح تقدیر وغیرہ کے مسائل کا بھی حکم ہے)

۹) سلف صالحین اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشاجرات اور اختلافات کے متعلق سوال و بحث، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے کسی نے جنگ صفین کے بارے میں سوال کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان ہوئی تھی، تو فرمایا: یہ ایسے خون تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھ کو روکا اور بچایا، لہذا مجھے پسند نہیں کہ اب اپنی زبان کو اس سے ملوث کروں۔

(۱۰) وہ سوال جس سے اپنی برتری ظاہر کرنا اور علمی غلبہ حاصل کرنا مقصود ہو۔(۱)

اس لیے ضرورت سے زیادہ اور بے مقصد سوالات سے احتراز کرنا چاہئے۔(۲)

(۱) الموافقات فی أصول الشریعۃ: ۴/۲۱-۲۰-۳۱۹۔

(۲) از کتاب الفتاوی جلد اول صفحہ ۲۴۹۔۲۵۵، مقدمہ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب۔

ہندو پاک کے علما کی فقہی خدمات

ہزار سالہ فقہی خدمات:

ہندوستان کے علما وفقہا کی علمی و دینی خدمات کی ایک روشن تاریخ ہے، ہندوستان میں جب مسلمانوں کی آمد ہوئی تو ابتدا میں علم حدیث پر زیادہ توجہ دی گئی، خاص طور پر سندھ اور گجرات کے ساحلی شہروں میں۔ اس کے بعد اہل علم کی فکر و توجہ کا مرکز علم فقہ بن گیا اور امام ابوحنیفہؒ و دیگر مجتہدین کی فکری و فقہی تسلسل کو آگے بڑھایا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں یہاں کے علما و مفتیان نے فقہ وفتاویٰ کی جو خدمات انجام دی ہے اس کا سلسلہ تاریخی طور پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی جس کا سراغ ملتا ہے وہ عدالت وقضا کے موضوع پر شیخ علی ابن احمد بن محمد بن محمد دیبلی کی آداب القضاء ہے۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے فقیہ ہیں۔ الجواہر المضیۃ میں اس کا تذکرہ مصنف کے احوال میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور ہر صوبہ میں کسی نہ کسی اہم کتاب کی تصنیف کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تصانیف جامعیت، تحقیق اور اپنے عہد کے جدید مسائل کے حل میں انتہائی اہم ہیں، ان میں، شرح و تحقیق بھی ہے اور اجتہادی شان بھی۔

فقہ کی یہ کتابیں مستقل نوعیت کی بھی ہیں اور شروح وحواشی کے عناوین سے بھی ہیں۔ بلکہ شروح وحواشی بہت زیادہ ہیں، چنانچہ اس ہزار سالہ عہد میں شروح وحواشی کے تحت سیکڑوں کتابیں تیار کی گئیں، عام طور پر یہ کتابیں ابتدائی عہد سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک عربی زبان میں تیار کی گئیں، فقہ میں صرف ہدایہ و وقایہ اور قدوری کے حواشی اور شرحیں ساٹھ سے زیادہ ملتی ہیں۔ اسی طرح اصول فقہ کی اہم ترین کتابیں المنار، اصول البزدوی، مسلم الثبوت، تلویح اور حسامی وغیرہ کی تقریباً پچاس سے زائد مطبوعہ وغیر مطبوعہ شروح وحواشی عربی زبان میں ہیں، اسی طرح فقہ کے الگ الگ موضوعات جیسے ارکان اربعہ، نکاح وطلاق، بیوع، میراث، اراضی، حدود وتعزیرات، اجتہاد وتقلید، عدالتی نظام وغیرہ پر عربی و اردو اور فارسی وغیرہ میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابیں چار ہزار سے زیادہ ہیں، اور یہ ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں، جیسے کتب خانہ دار العلوم دیوبند، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کولکاتہ، آصفیہ لائبریری دکن حیدرآباد، ریاست رامپور کی لائبریریاں، کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، کتب خانہ مظاہر علوم، ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ دہلی، کتب خانہ دائرۃ المعارف اعظم

گڈھ، شبلی لائبریری اور ہندو پاک کے قدیم خانقاہوں کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔مختلف عہد وصدی کی چند کتب فقہ وفتاویٰ کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

عربی وفارسی کتب فقہ وفتاویٰ:

کتاب	مصنف	وفات
(۱) آداب القضاء	شیخ علی ابن احمد بن محمد بن محمد دیبلی	
(۲) مجموعۂ سلطانی	حسن بن محمد الصعانی، اللاہوری البغدادی	(م ۶۳۷ھ)
(۳) فتاویٰ بابری (بزبان فارسی)	علامہ نورالدین قطب الدین الخوافی	(م ۶۷۰ھ)
(۴) نہایت الوصول إلیٰ علم الاصول	شیخ صفی الدین بن عبدالرحیم ہندی	(م ۷۱۵ھ)
(۵) زبدۃ الاحکام فی اختلاف الائمۃ الاعلام	سراج الدین الحنفی	(م ۷۷۴ھ)
(۶) فتاویٰ التاتارخانیہ (بزبان عربی)	عالم بن العلا الحنفی الدہلوی	(م ۷۸۶ھ)
(۷) الفتاویٰ السراجیہ	ابوحفص سراج الدین عمر بن اسحاق الہندی	(م ۸۲۹ھ)
(۸) الغرۃ المنیفۃ	ابوحفص سراج الدین	(م ۸۴۶ھ)
(۹) فتاویٰ قاری الہدایۃ	شیخ سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنوی الحنفی	(م ۸۷۳ھ)
(۱۰) فتاویٰ ابراھیم شاہی	قاضی شہاب الدین دولت آبادی	(م ۸۷۴ھ)
(۱۱) الفتاویٰ الاشرفیہ	سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی	(م ۸۸۰ھ)
(۱۲) الفتاویٰ الحمادیہ	ابوالفتح رکن الدین الحنفی الناگوری	(م ۹۲۰ھ)
(۱۳) خزانۃ الروایات	قاضی جگن گجراتی	(م ۹۲۰ھ)
(۱۴) الفتاویٰ النقشبندیہ	معین الدین محمد بن خواجہ محمود النقشبندی	(م ۱۰۸۸ھ)
(۱۵) الفتاویٰ العالمگیریہ	شیخ نظام برہان پوری	(م ۱۰۹۰ھ)
(۱۶) مجمع البرکات	ابوالبرکات بن رکن الدین دہلوی	(م ۱۱۱۹ھ)
(۱۷) مسلم الثبوت	علامہ محبّ اللہ بہاری	(م ۱۱۱۹ھ)
(۱۸) البیاض فی الفقہ	محمد ہاشم بن عبدالغفور سندھی	(م ۱۱۷۴ھ)
(۱۹) فاکہۃ البستان	محمد ہاشم بن عبدالغفور سندھی	(م ۱۱۷۴ھ)
(۲۰) افتائے ہندی	محمد اسحاق دہلوی	(م ۱۲۶۳ھ)
(۲۱) فتاویٰ اشرفیہ فی الفروع الحنفیہ	مفتی شرف الدین رام پوری	(م ۱۲۶۸ھ)
(۲۲) الفتاویٰ الغیاثیہ	داؤد بن یوسف الخطیب البغدادی	

(۲۳) کشف القناع عن وجوہ السماع	علامہ فخر الدین زرادی
(۲۴) رسالہ اباحۃ السماع	سلیمان زکریا ملتانی
(۲۵) الفائق فی اصول الدین	محمد بن عبدالرحیم
(۲۶) صنوان القضاء وعنوان الافتاء	ابو محامد محمد بن الخطیب / تحقیق قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
(۲۷) نصاب الاحتساب	قاضی ضیاء الدین عمر الحنفی
(۲۸) فتاویٰ امینیہ	امین عبیداللہ مومن آبادی
(۲۹) فتاویٰ براہنہ	علامہ نصر الدین لاہوری
(۳۰) مختصر الفتاویٰ	عبدالحمید بن عبداللہ ٹھٹھوی
(۳۱) فتاویٰ سراجیہ	محمد بن محمد سعید لکھنوی
(۳۲) فتاویٰ اخبار شاہی	عتیق اللہ بن اسماعیل بن قاسم
(۳۳) فتاویٰ ضیائیہ	عمر بن محمد سنّامی
(۳۴) کتاب التفریدفی الفروع	
(۳۵) فتاویٰ فیروزشاہی (بزبان فارسی)	

برصغیر میں اردو فتاویٰ:

برصغیر میں فتویٰ نویسی کے کام اور فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے، اس سلسلہ میں ادھر دوسو سال میں غالباً پہلا معروف نام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) کا ہے، اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محلیؒ (م ۱۳۷۹ھ)، مولانا محمد قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی انصاریؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ)، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (م ۱۳۴۶ھ)، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ)، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ (م ۱۳۹۶ھ)، حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ (م ۱۳۷۲ھ)، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (م ۱۳۴۷ھ)، حضرت مولانا مفتی ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد یاسین مبارکپوریؒ (م ۱۴۰۴ھ)، شاہ عبدالوہاب قادری ویلوریؒ (م ۱۳۳۷ھ)، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (م ۱۳۵۹ھ)، مفتی محمد عثمان غنیؒ، مفتی محمد عباس پھلوارویؒ، مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ، مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ (م ۱۳۷۷ھ)، مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ (م ۱۴۱۸ھ)، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (م ۱۴۲۲ھ)، مفتی سید احمد علی سعیدؒ، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (م ۱۴۱۷ھ)، مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ (م ۱۳۷۷ھ)، مفتی رشید احمد

صاحبؒ پاکستانی، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب پاکستانیؒ، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ صاحبؒ مفتی محمد فرید پاکستانی صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، مولانا مفتی احمد خانپوری، مفتی ظہور احمد ندوی صاحب، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مفتی شاکر خان صاحب پونہ وغیرہم آتے ہیں۔

جن علماء کرام کے فتاوے عام طور پر شائع شدہ ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) فتاویٰ عزیزی	شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	(م ۱۲۳۹ھ)
(۲) مجموعہ فتاویٰ عبدالحئ	مولانا ابوالحسنات عبدالحئ لکھنویؒ	
(۳) فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	(م ۱۳۲۳ھ)
(۴) تالیفات رشیدیہ	فقیہ العصر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	
(۵) باقیات فتاویٰ رشیدیہ	فقیہ العصر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	
(۶) عزیز الفتاویٰ	مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ	(م ۱۳۴۷ھ)
(۷) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند	مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ	
(۸) فتاویٰ مظاہر علوم	مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ	(م ۱۳۴۶ھ)
(۹) امداد الفتاویٰ	حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ	(م ۱۳۶۲ھ)
(۱۰) امداد الاحکام	مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رمولانا عبدالکریم گمتھلویؒ	
(۱۱) امداد المفتیین	مفتی شفیع صاحب عثمانی دیوبندیؒ	(م ۱۳۹۶ھ)
(۱۲) کفایت المفتی	مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ	(م ۱۳۷۲ھ)
(۱۳) فتاویٰ شیخ الاسلام	مولانا حسین احمد مدنیؒ	(م ۱۳۷۷ھ)
(۱۴) نظام الفتاویٰ	مفتی نظام الدین اعظمیؒ	(م ۱۴۱۸ھ)
(۱۵) فتاویٰ سعیدیہ	سید احمد علی سعیدؒ	
(۱۶) فتاویٰ محمودیہ	مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	(م ۱۴۱۷ھ)
(۱۷) فتاویٰ امارت شرعیہ	مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ وغیرہ	(م ۱۳۵۹ھ)
(۱۸) فتاویٰ قاضی	قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	(م ۱۴۲۲ھ)
(۱۹) فتاویٰ رحیمیہ	مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ	
(۲۰) فتاویٰ باقیات صالحات	مولانا شاہ عبدالوہاب قادری ویلوریؒ	(م ۱۳۳۷ھ)

(۲۱) فتاویٰ احیاء العلوم — مفتی محمد یٰسین مبارک پوریؒ (م ۱۴۰۴ھ)

(۲۲) احسن الفتاویٰ — مفتی رشید احمد پاکستانیؒ

(۲۳) خیر الفتاویٰ — مولانا خیر محمد جالندھریؒ

(۲۴) فتاویٰ مفتی محمود — حضرت مولانا مفتی محمود پاکستانیؒ

(۲۵) فتاویٰ حقانیہ — مولانا عبد الحق پاکستانیؒ

(۲۶) فتاویٰ دیوبند پاکستان المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ۔ مفتی محمد فرید پاکستانیؒ

(۲۷) فتاویٰ بینات — مجلس دعوت و تحقیق اسلامی جامعہ بنوریہ پاکستان

(۲۸) فتاویٰ عثمانی — مفتی محمد تقی عثمانی پاکستانی

(۲۹) مرغوب الفتاویٰ — مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ (م ۱۳۷۷ھ)

(۳۰) محمود الفتاویٰ — مولانا مفتی احمد خانپوری

(۳۱) کتاب الفتاویٰ — مفتی خالد سیف اللہ رحمانی

(۳۲) فتاویٰ ندوۃ العلماء — مفتی ظہور احمد ندوی

(۳۳) حبیب الفتاویٰ — مفتی حبیب اللہ قاسمی

(۳۴) فتاویٰ شاکر خان — مفتی شاکر خان پونہ

(۲۵) فتاویٰ فرنگی محل — مولانا محمد عبد القادرؒ (م ۱۳۷۹ھ)

(۳۶) فتاویٰ دار العلوم زکریا — مولانا مفتی رضاء الحق

(۳۷) فتاویٰ قیام الملۃ والدین — مولانا محمد قیام الدین عبد الباری انصاری فرنگی محلیؒ

(۳۸) فتاویٰ سعیدیہ — مفتی محمد سعید محدث بنارسیؒ

(۳۹) فتاویٰ شریفی — مفتی احمد شریفؒ

(۴۰) فتاویٰ صدارت العالیہ — مولانا مفتی محمد رحیم الدینؒ

(۴۱) فتاویٰ عثمانی — علامہ منور الدینؒ

(۴۲) فتاویٰ محبوبیہ — احمد حسین خانؒ

(۴۳) فتاویٰ محمدی — محمد قیام الدینؒ

(۴۴) فتاویٰ نظامیہ — مفتی رکن الدینؒ

(۴۵) فتاویٰ مظہر سعادت — مولانا مفتی عبد اللہ مظاہری

(۴۶) علم الفقہ — مولانا عبد الشکور لکھنویؒ

(۴۷)　دینی مسائل اوران کا حل　　مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری

(۴۸)　المنتخب فی فتاویٰ الحنفیۃ

ان کے علاوہ بھی کچھ کتابیں ہیں جن میں موجودہ عہد کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

	کتاب	مصنف	
(۱)	منتخبات نظام الفتاویٰ	مفتی نظام الدین اعظمیؒ	(م۱۴۱۸ھ)
(۲)	الحیلۃ الناجزۃ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	(م۱۳۶۲ھ)
(۳)	الاقتصاد فی التقلید	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	
(۴)	بوادرونوادر	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	
(۵)	جواہر الفقہ	مولانا مفتی شفیع احمد دیوبندیؒ	(م۱۳۹۶ھ)
(۶)	آلات جدیدہ کے شرعی احکام	مولانا مفتی شفیع احمد دیوبندیؒ	
(۷)	مسئلہ امارت اور ہندوستان	مولانا عبدالصمد رحمانیؒ	(م۱۳۹۳ھ)
(۸)	کتاب الفسخ والتفریق	مولانا عبدالصمد رحمانیؒ	
(۹)	کتاب العشر والزکوٰۃ	مولانا عبدالصمد رحمانیؒ	
(۱۰)	فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	مولانا مجیب اللہ ندوی	
(۱۱)	اجتہادی مسائل	مولانا شاہ محمد جعفر پھلوارویؒ	
(۱۲)	آپ کے مسائل اوران کا حل	مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ	
(۱۳)	بینک انشورنس اور سرکاری قرضے	مولانا برہان الدین سنبھلی	
(۱۴)	جدید فقہی مسائل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	
(۱۵)	فقہی مقالات	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	
(۱۶)	فتاویٰ قاضی	قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	(م۱۴۲۲ھ)

ان کے علاوہ کچھ دوسرے علماء کرام کے بھی فتاویٰ ہیں۔(۱)

(۱)　مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

بریلوی مکتبۂ فکر کے مؤسس مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ "العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ" کے نام سے ۱۲ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، صاحب فتاویٰ کے بہت سے رسائل بھی شامل ہیں، لیکن افسوس کہ بدعات کی تائید بلکہ اختراع اور مسلمانوں کی تکفیر میں مصنف کا قلم شمشیر بے نیام رہتا ہے۔ اہل حدیث مکتبۂ فکر کے بھی کئی فتاویٰ اردو زبان میں شائع ہوئے ہیں، جن میں شاہ محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ کے فتاویٰ "فتاویٰ نذیریہ" (۲ جلدیں) مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے "فتاویٰ ثنائیہ" اور مولانا عبد السلام بستوی کے "اسلامی فتاویٰ" کے نام سے طبع ہو چکے ہیں، ان فتاویٰ میں احناف اور غیر مقلدین کے درمیان اختلافی فروعی مسائل کو زیادہ مرکز توجہ بنایا گیا ہے، علماء اہل حدیث ہی میں نواب صدیق حسن صاحبؒ کے فتاویٰ بھی ہیں جو دو مختصر جلدوں پر اور ۱۳۴ صفحات پر مشتمل ہیں اور اس میں بھی سلفی فکر اور لب ولہجہ کی پوری پوری نمائندگی ہے۔ اخبارات ورسائل میں بھی سوال وجواب کی اشاعت کا طویل عرصہ سے معمول ہے، عالم عرب میں روزنامہ "الدیۃ" کے علاوہ "التضامن الإسلامی" اور "المجتمع" وغیرہ میں سوال وجواب کے کالم ہوتے ہیں، ہندوستان کے اخبارات میں روزنامہ "الجمعیۃ" میں احکام وحوادث کا کالم بہت مقبول تھا، "کفایت المفتی" انہی سوالات وجوابات کا مجموعہ ہے۔　==

دار الافتاء

برصغیر ہندو پاک میں دینی علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے جس طرح درسگاہیں قائم ہوئیں دار العلوم اور جامعات

== ۔۔۔۔اس سلسلہ کی ایک نہایت ہی اہم اور قابل ذکر کوشش مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' ہے، مولانا موصوف روز نامہ ''جنگ'' کراچی میں فقہی سوالات کے جوابات لکھا کرتے تھے، ان سوالات و جوابات کا مجموعہ ۹ جلدوں پر مشتمل ہے۔۔۔۔۔۔سوال و جواب کا ایک قابل قدر مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے: ''سوال و جواب --- کتاب وسنت کی روشنی میں'' (۴ جلدیں) یہ صاحبزادہ قاری عبد الباسط صاحب (مقیم جدہ) کے جوابات ہیں جو خلیج کے مشہور اور منفرد اردو روز نامہ ''اردو نیوز'' میں دیئے جاتے ہیں، یہ ایک وقیع مجموعہ ہے اور خلیج میں بسنے والے تارکین وطن کی رہنمائی کے لیے اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔۔۔۔۔۔ہندوستان میں متعدد اخبارات ورسائل میں فقہی سوال و جواب کے کالم کا سلسلہ جاری بھی ہے اور مقبول بھی، جن میں ہفت روزہ ''نقیب'' امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، ماہنامہ ''ہدایت'' جے پور، روز نامہ ''انقلاب'' بمبئی، روز نامہ ''سیاست'' حیدرآباد اور روز نامہ ''منصف'' حیدرآباد (جو ہندوستان میں سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کتاب الفتاویٰ زیادہ تر اسی آخر الذکر اخبار کے سوالات و جوابات پر مشتمل ہے (کتاب الفتاویٰ ملخصاً جلد اول مقدمہ: ۲۳۸ تا ۲۴۶)

عالم عرب اور فتاویٰ کے مجموعے :

فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب کا جو مزاج اس دور میں پایا جاتا ہے، اور خاص طور سے علماء ہند میں، پچھلے دور میں اس کا رواج کم تھا، لیکن پھر بھی بہت سے بزرگوں کے فتاویٰ اور جوابات کا مجموعہ ہمیں ملتا ہے، چنانچہ ''المدونۃ'' کو فقہ مالکی میں اسی طرز پر جمع کیا گیا ہے، کہ امام مالکؒ کے تلامذہ سے سوالات کئے گئے ہیں اور سوال و جواب کو مرتب کر دیا گیا ہے، اسی طرح علامہ ابن صلاح کے فتاویٰ مشہور ہیں جو عبد المعطی امین قلعجی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں، امام نوویؒ کے فتاویٰ کو ابن عطار نے ''المنثورات في عيون المسائل المهمات'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے، اور مولانا محمد رحمت اللہ ندوی کی تحقیق اور دراسۃ کے ساتھ یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہو چکا ہے، شیخ احمد علیش مالکی کے فتاویٰ ''تبصرۃ الحکام'' کے حاشیہ پر ایک زمانہ سے شائع شدہ ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ کے فتاویٰ بھی فتاویٰ غیاثیہ کے ساتھ طبع شدہ ہیں، اس طرح کے بہت سے فتاویٰ متقدمین اور متأخرین کے دور میں پائے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے مفصل اور مدلل فتاویٰ وہ ہیں جو علامہ ابن تیمیہؒ کے افادات ہیں، اور جنہیں ۳۷ جلدوں میں مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہؒ کے نام سے حکومت سعودی عرب نے شائع کیا ہے، یہ عقیدہ و کلام، تفسیر و حدیث، فقہ اسلامی اور تزکیہ و ترہیب کے موضوع پر ایک زبردست انسائیکلو پیڈیا ہے، لیکن اس مجموعہ میں فتاویٰ کے علاوہ علامہ ابن تیمیہؒ کے رسائل اور تالیفات بھی شامل ہیں، اور یہ بھی اہل علم کے لیے محتاج اظہار نہیں کہ علامہ ابن تیمیہؒ ہیں تو فقہ حنبلی کے متبع لیکن مقلد محض نہیں ہیں بلکہ بہت سے مسائل میں اپنی مجتہدانہ رائے رکھتے ہیں۔

ماضی قریب میں عالم عرب کے جن اہل علم کے فتاویٰ مرتب ہوئے اور ان کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں شیخ شلتوت کے فتاویٰ کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور انہوں نے نئے مسائل پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے، اسی طرح شیخ جیاد الحق سابق شیخ الازہر کے اہم فتاویٰ بھی ''بحوث و فتاوىٰ اسلامية في قضايا معاصرة'' کے نام سے تین جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں، اسی طرح سلفی مکتبۂ فکر کے ترجمان شیخ عبد اللہ بن باز کے فتاویٰ بھی طبع ہو چکے ہیں پچھلے دنوں نئے مسائل سے متعلق ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے فتاویٰ کی دو جلدیں ''فتاوىٰ معاصرة'' کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں، اس طرح کے بعض اور فتاویٰ بھی عالم عرب کے فقہا کے منظر عام پر آئے ہیں۔

ادھر ایک بہتر رجحان بعض عرب ملکوں میں انفرادی فتاویٰ کے بجائے اجتماعی طور پر فتویٰ صادر کرنے کا شروع ہوا ہے، اس سلسلہ میں سعودی عرب میں ''هيئة كبار العلماء'' اور کویت میں ''اللجنة الدائمة للإفتاء و البحوث'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ان کے فتاویٰ کے مجموعے شائع بھی ہو رہے ہیں۔ (مقدمہ کتاب الفتاویٰ جلد اول: ۲۳۶ تا ۲۳۸)

وجود میں آئے، اسی طرح ان کے شعبہ کے طور پر دارالافتاء بھی قائم ہوئے، اور کچھ جگہوں پر مستقلاً بھی دارالافتاء قائم ہوئے، یہ سلسلہ ہندو پاک کے علاوہ بہت سے ملکوں میں آج بھی قائم ہے، ہندو پاک میں جو اہم دارالافتاء ایک طویل عرصہ سے قائم ہیں اور وہاں مفتیان کرام مسند افتا پر بیٹھ کر فتویٰ نویسی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے!

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی:

انگریزی دور حکومت میں ۱۸۵۷ء کے بعد، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نے اپنے چند ساتھیوں اور عقید تمندوں کے ساتھ ملکر ۱۲۸۳ھ میں ایک دینی ادارہ کی ''مدرسہ اسلامی عربی'' کے نام سے داغ بیل ڈالی، جس نے تھوڑے ہی دنوں میں دارالعلوم (اسلامی یونیورسٹی) کی حیثیت اختیار کر لی اور اس اسلامی ودینی یونیورسٹی میں جہاں دوسرے شعبہ جات قائم ہوئے ''دارالافتاء'' کا قیام بھی عمل میں آیا۔

ابتدا میں استفتاء بانی دارالعلوم امام ربانی قاسم العلوم حضرت نانا تویؒ کی خدمت اقدس میں آتے رہے، ان پر چونکہ ولایت غالب تھی اس لئے آپ کی تاکید تھی کہ سوالات عارف باللہ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پیش کئے جائیں، اس لئے کہ آپ فقیہ النفس عالم باعمل تھے۔

کچھ دنوں امام ربانی حضرت نانوتویؒ نے یہ خدمت افتا اپنے استاد زادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (المتوفی ۱۳۰۲ھ) سے بھی لی، خود امام ربانی خدمت افتا سے عموماً احتراز فرماتے تھے۔

۱۳۱۰ھ سے مسلسل رجب ۱۳۴۶ھ تک اس عہدۂ افتا پر عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ فائز رہے، دارالعلوم کے احاطہ میں بیٹھ کر یہاں کے شعبہ دارالافتاء کی مہر سے جو فتاویٰ ملک و بیرون ملک میں بھیجے گئے اس کی ابتدا رئیس المفتین حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے ہوئی اور یہی فتاویٰ ''فتاویٰ دارالعلوم'' کے نام سے مشہور ہے۔ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے بعد بھی مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، مفتی مہدی حسنؒ، مفتی محمود حسنؒ، مفتی نظام الدینؒ، مفتی احمد علی سعیدؒ، مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی ودیگر اصحاب فقہ وفتاویٰ نے مسند افتا کو زینت بخشی اور برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں کے افراد استفتاء بھیج کر جواب حاصل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ دارالعلوم کا دارالافتاء پوری دنیا میں فقہ حنفی کا سب سے بڑا مرکز ہے، ہر دور میں یہاں کے فتاویٰ پر عوام وخواص کا اعتماد رہا ہے اور آج بھی ہے۔ (۱)

اس دارالافتاء میں باضابطہ ایک سالہ دارالافتاء کا تربیتی نظام بھی قائم ہے جس میں ممتاز فضلاء کا انتخاب عمل میں آتا

(۱) مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ملخصاً جلد اول:

ہے، یہاں کے تربیت یافتہ مفتیان کرام دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ افتا کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

دارالافتاء گنگوہ، سہارنپور، یوپی:

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد جن اکابر علما نے علم دین کی خدمت کی ان میں سرفہرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تھے، آپ اپنے وطن گنگوہ میں ہی رہتے تھے اور وہیں سے بیعت وارشاد، تعلیم وتزکیۂ باطن اور تدریس فقہ وحدیث کی خدمت انجام دیتے تھے، آپ کی حیثیت فقیہ النفس عالم کی تھی، اس لیے عوام وخواص کا رجوع آپ کی طرف ہوتا تھا، اور استفتا بھیج کر جوابات حاصل کرتے تھے، حضرت گنگوہیؒ نے اپنی زندگی میں ہزاروں فتاوے لکھے، مگر ہر فتوے کو نقل کرنے کا التزام نہیں تھا، اس لیے بہت کم فتاویٰ ایسے تھے جو وہاں نقل ہو کر محفوظ رہے، آپ کی وفات کے بعد مرادآباد کے ایک عالم نے جو فتاویٰ ان کو حاصل ہوئے، ان کو فتاویٰ رشیدیہ کے نام سے شائع کیا، یہ بہت ہی قلیل فتاویٰ تھے، بڑی مقدار لوگوں کے پاس رہی، جو لمبا زمانہ گذرنے سے ضائع ہوگئی، مگر اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے جناب مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب کو کہ انہوں نے مختلف مراجع ومصادر سے اور کئی قلمی بیاضوں سے آپ کے فتاویٰ کا ایک بڑا حصہ جمع کیا اور اسے ''باقیات فتاویٰ رشیدیہ'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی طرح ممبئی کے ایک صاحب خیر نے حضرت رحمہ اللہ کے فتاویٰ رشیدیہ کے ساتھ دوسرے فتاویٰ ورسائل کو شامل کر کے ''تالیفات رشیدیہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

دارالافتاء فرنگی محل، لکھنؤ، یوپی:

فرنگی محل اپنے علمی اور فقہی خدمات کی وجہ سے ایک مشہور عالم خانوادہ ہے، جہاں ایک طرف علم کی خدمت ہوئی وہیں ایک طویل عرصہ سے دارالافتاء بھی قائم ہے، حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحئ فرنگی محلی رحمہ اللہ وہاں کے علما میں سے ایک ہیں، ان کے فتاوے بھی ''مجموعۂ فتاویٰ عبدالحئ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح زمانہ دراز تک حضرت مولانا مفتی محمد عبدالقادر رحمہ اللہ (م: اگست ۱۹۵۹ء مطابق صفر ۱۳۷۹ھ) نے افتا کے فرائض انجام دیئے ہیں، ان کے فتاوے ''فتاویٰ فرنگی محل موسوم بہ فتاویٰ قادریہ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا محمد قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی رحمہ اللہ نے بھی فتاویٰ کا کام کیا ہے جو فتاویٰ قیام الملۃ والدین کے نام شائع ہوئے ہیں۔

دارالافتاء خانقاہ تھانہ بھون، مظفر نگر، یوپی:

خانقاہ تھانہ بھون نہ صرف تعلیم وتزکیۂ باطن کے لیے معروف ہے بلکہ احکام شریعت کی تشریح اور فقہ اسلامی کی نشرو

اشاعت کا عظیم مرکز رہا ہے، وہاں سے جو فتاوے جاری ہوتے تھے وہ نہ صرف عوام کے لیے مفید ہوتے تھے، بلکہ علما وخواص بھی اپنے استفتا بھیج کر اہم مسائل میں جواب حاصل کرتے تھے، حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جو فتاویٰ خود تحریر فرمائے ان کا عظیم الشان مجموعہ ''امداد الفتاویٰ'' چھ جلدوں میں ہے، جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

لیکن سوالات کی کثرت کے باعث حکیم الامت نے خانقاہ تھانہ بھون کے بعض دوسرے علماء محققین کو بھی فتاویٰ لکھنے پر مامور فرمایا تھا، جو آپ ہی کی رہنمائی میں فتاویٰ لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے اور آپ کی نظر واصلاح کے بعد وہ فتاویٰ روانہ کردیئے جاتے تھے، اشاعت کی غرض سے ہر عالم کے لکھے ہوئے فتاویٰ الگ الگ رجسٹروں میں نقل کر کے محفوظ کر لئے جاتے تھے، اس طرح آپ کی رہنمائی میں جو فتاویٰ لکھے گئے ہیں ان کے مندرجہ ذیل تین مجموعے تیار ہوگئے جن کے نام بھی حضرت ہی نے تجویز فرمائے تھے۔

(۱) امداد الاحکام: یہ زیادہ ضخیم مجموعہ ہے، اس کتاب کو متعدد وجوہ سے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ ہی کی تالیف کا درجہ حاصل ہے۔

(۲) امداد المسائل: یہ فتاویٰ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے مولانا احمد حسن صاحب سنبھلی رحمہ اللہ سے لکھوائے تھے، صفر ۱۳۳۴ھ تک کے یہ فتاویٰ چھوٹے چھوٹے چار رجسٹروں میں دار العلوم کراچی کے شعبہ ''مجلس خیر'' میں محفوظ ہیں، مگر طبع نہیں ہوئے ہیں، ان کی تمہید میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ان میں صرف پہلے مہینہ کے فتاویٰ مجھے دکھائے گئے ہیں، باقی میں اس کا التزام نہیں کیا گیا۔

(۳) جمیل الفتاویٰ: یہ تھوڑے سے فتاویٰ ہیں جو حضرت حکیم الامت نے مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ سے ۱۳۶۰ھ میں لکھوانے شروع کئے تھے، ان کی بھی طباعت نہیں ہوسکی۔(۱)

(۴) امداد الفتاویٰ: یہ کتاب عارف باللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے فتاوے کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دار العلوم دیوبند، جامع العلوم کانپور اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام کے دوران تحریر فرمایا تھا جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے مرتب کیا ہے، جس پر مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ نے مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔

دار الافتاء مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی:

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور یوپی ہندوستان کے ان اہم ترین دینی اداروں میں ہے جہاں سے ہزاروں افراد تعلیم پاکر نکلے، اور دین وعلم کی خدمت میں مشغول ہوئے۔ وہاں تعلیم وتدریس کے ساتھ ابتدا ہی سے دار الافتاء کا شعبہ قائم

(۱) امداد الاحکام جلد اول: ۹۴-۹۵۔

ہے۔اس شعبہ سے ملک و بیرون ملک سے آنے والے مختلف علمی وفقہی سوالات کے تحقیقی جوابات لکھے جاتے ہیں، یہ شعبہ ۱۳۳۸ھ میں باضابطہ قائم ہوا،اس سے پہلے حضرات اساتذہ ومشائخ اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ اس اہم کام کے لیے کئی مفتیان کرام متعین ہیں،اسی طرح جوفتاویٰ یہاں سے جاری ہوتے ہیں ان کی نقل ایک رجسٹر میں محفوظ رکھی جاتی ہے چنانچہ نقل فتاویٰ کے لیے بھی ایک مفتی صاحب مامور ہیں۔

مظاہرعلوم میں تمرین افتا کا ایک مستقل درجہ بھی قائم ہے جس میں فضلاء مدارس کوفتاویٰ نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے اس درجہ میں حسب ضابطہ پندرہ طلبہ کا داخلہ لیا جاتا ہے۔اس ادارہ کے فتاویٰ کا مجموعہ شرعی احکام ومسائل کا زبردست خزانہ ہے جو ۱۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے،شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنیؒ کوان فتاویٰ کی جمع و ترتیب کا مستقل احساس تھا اور کبھی کبھی خصوصی مجلس میں فرماتے تھے کہ فتاویٰ کی ترتیب کا کام میری نظروں میں صرف دو ہی لوگ کر سکتے ہیں مفتی محمود یا قاری مظفر۔

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے فتاویٰ کا قابل قدر مجموعہ ہے جو حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ نے مظاہرعلوم کے دارالافتاء میں دوران خدمت تحریر فرمائے۔

اللہ تعالیٰ فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین رحمہ اللہ کی مغفرت فرمائے جنہوں نے اپنے استاذ محترم کی تعلیمات اور فیوض کو عام کرنے کے لیے فتاویٰ کے نقل کی اجازت مرحمت فرمائی اور ناشرین ومرتبین کا علمی تعاون فرمایا، یہ بیش بہا فقہی مجموعہ ''فتاویٰ محمودیہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

بہر حال حضرت شیخ کی خواہش کے مطابق تو یہ جلیل القدر کام نہ ہوسکا البتہ فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین رحمہ اللہ نے اپنی حیات میں صرف اسی کام کے لیے ایک صالح،متدین،مخلص اور محنتی مفتی جناب مولانا عبد الحسیب اعظمی کا انتخاب فرمایا اور موصوف کی غایت محنت اور نہایت عرق ریزی کے بعد اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی فتاویٰ مظاہرعلوم المعروف بہ فتاویٰ خلیلیہ'' شعبہ نشر واشاعت سے شائع ہوچکی ہے۔(۱) جس میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے۔

دارالافتاء جامعہ احیاء العلوم،مبارکپور، یوپی:

۱۸۵۷ء کی جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند جس دینی وعلمی،معاشی واقتصادی بحران سے گذر رہے تھے ان حالات میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت ورہنمائی یہی تھی کہ کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس سے مسلمانوں کا دینی وملی تشخص برقرار رہ سکے،چنانچہ چند مخلص غیور اور ملت اسلامیہ کا حقیقی درد رکھنے والے علما اٹھے

(۱) مقدمہ مظاہرعلوم المعروف بہ فتاویٰ خلیلیہ۔

اور ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیو بند کی بنیاد ڈالی، جس کے ساتھ ہی ایک انقلاب آفریں تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر ۱۸۹۹ء میں حضرت مولانا حکیم الٰہی بخش رحمۃ اللہ علیہ مرید قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کو ایک مکتب کی شکل میں قائم فرمایا، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب رحمہ اللہ کے زمانہ میں یہ جامعہ کی شکل اختیار کر گیا، جامعہ کے فرزندوں نے تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وخطابت ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مشرقی یوپی میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی مقبولیت اور مرکزیت کی بنا پر عام مسلمان اپنی دینی ضرورت کے لیے یہاں سے رجوع کرتے تھے، چونکہ جامعہ کے پہلے مدرس مولانا محمد محمود صاحب تھے، اس لیے شروع میں زبانی طور پر لوگ مسائل ان سے ہی پوچھا کرتے تھے۔ احیاء العلوم کے دوسرے مفتی مولانا مفتی محمد یاسین مبارکپوری رحمہ اللہ تھے، مفتی صاحب کے زمانہ میں فتاویٰ نویسی کا دور سب سے روشن اور شاندار رہا، آپ کے فتاویٰ محققانہ ہوتے تھے۔ وہاں کا دار الافتاء اپنے قیام سے آج تک فتووں کے لیے معروف ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے اور فتاویٰ کا ایک مجموعہ فتاویٰ احیاء العلوم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔(۱)

دار الافتاء دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ:

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، یوپی، ملک کا ایک بڑا دینی وتعلیمی مرکز ہے، یہاں ہر دور میں اصحاب فضل وکمال کی جماعت رہی ہے، یہاں تدریس ودیگر علمی سرگرمیوں کے ساتھ فتاویٰ کا کام بھی ہوتا ہے، محرم ۱۳۱۳ھ میں باقاعدہ دار الافتاء کا قیام مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی سرپرستی میں عمل میں آیا، دوسرے سال ہی مولانا کے آخری شاگرد مفتی عبد اللطیف صاحب کو باقاعدہ عہدۂ افتا کے لیے مقرر کیا گیا، ان دو برسوں میں دار الافتاء کی طرف عوام وخواص کا رجوع ہوا۔ مولانا عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ کے بعد مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری اس عہدہ کے لیے مقرر ہوئے ان کے بعد مفتی محمد سعید ندوی اس کام کو انجام دیتے رہے، اس کے بعد یہ اہم ذمہ داری مولانا مفتی محمد ظہور ندوی کے سپرد کی گئی۔

دار الافتاء دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا اہتمام کبھی ہوا، اور کبھی بعض وجوہات کی بنا پر نہیں ہو سکا، تاہم فتاویٰ لکھنے کا کام تسلسل کے ساتھ ہوتا رہا، ۱۴۱۱ھ سے ۱۴۳۰ھ تک جو فتاویٰ رجسٹر میں محفوظ کئے گئے ان کی تعداد ۲۵۲۴۰ تک پہنچ چکی ہے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ایما پر ترتیب فتاویٰ کا کام شروع کیا گیا، چنانچہ جولائی ۲۰۰۵ء میں اس کام کے لیے باضابطہ مولانا منور سلطان ندوی کو متعین کیا گیا، انہوں نے ترتیب اور حوالہ جات کی تحقیق وتخریج کا کام شروع کیا اب تک دو جلدیں تیار ہو چکی ہیں آگے کا کام جاری ہے۔(۲)

(۱)　مقدمہ فتاویٰ احیاء العلوم جلد اول۔

(۲)　فتاویٰ ندوۃ العلماء جلد اول: ۳۳۔۳۷۔

دارالافتاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ:

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمہ اللہ نے جب بہار میں ''نظام امارت'' قائم فرمایا تو جن شعبوں کی طرف آپ نے اولین توجہ فرمائی، ان میں شعبۂ افتا بھی ہے، ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، ابتداءً امارت کا شعبۂ افتا پھلواری شریف اور گیا دونوں جگہ کام کرتا تھا، گیا کا رجسٹر فتویٰ تو محفوظ نہیں رہ سکا، لیکن پھلواری شریف میں ۱۳۶۴ھ تک جن فتاویٰ کے جوابات دیئے گئے اور ان کی نقل محفوظ رہ پائی، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے ان کی تعداد ''۹۰۳۱'' لکھی ہے۔ گیا سے صادر ہونے والے فتاویٰ اور جن فتاویٰ کی نقل محفوظ نہیں کی جاسکی، اندازہ ہے کہ کم وبیش ان کی تعداد بھی یہی رہی ہوگی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امارت شرعیہ کے دارالافتاء کو شروع ہی سے اعتماد واعتبار اور قبول عام حاصل رہا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت دارالافتاء امارت شرعیہ ملک کے ان تین چار ممتاز اداروں میں ایک ہے، جہاں سب سے زیادہ استفتا آتے ہیں اور ان کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ امارت شرعیہ کے اس اہم شعبہ سے ملک وبیرون ملک سے آئے ہوئے ہزاروں دینی مسائل کے جواب دیئے جاتے ہیں، پھلواری شریف پٹنہ کے علاوہ دارالافتاء امارت شرعیہ کا ایک مرکز خانقاہ رحمانی مونگیر میں قائم ہے اور وہاں سے بھی اسی طرح فتاویٰ جاری ہوتے ہیں، جیسے پھلواری شریف سے، اب تک ان دونوں جگہوں کے فتاویٰ کا انتخاب پانچ جلدوں میں ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے، اس کا ایک غیر مطبوعہ فتاویٰ کا بڑا ذخیرہ رجسٹر میں محفوظ ہے جس پر کام ہو رہا ہے۔ (۱)

دارالافتاء مدرسہ قاسمیہ شاہی، مرادآباد:

مدرسہ قاسمیہ شاہی، مرادآباد، یوپی، دینی تعلیم کا قدیم مرکز ہے، یہاں دارالافتاء بھی مدرسہ کے قیام کے زمانہ سے ہی قائم ہے، البتہ ابتدا میں زبانی اور لکھ کر لوگوں کی شرعی رہنمائی کا کام ہوتا تھا، ۱۳۴۲ھ میں جب سوالات کی آمد زیادہ ہوگئی اور صدر مدرس مولانا احمد حسن امروہویؒ کو اپنی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ کار افتا میں دشواری ہونے لگی تو باضابطہ دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے مفتی کی حیثیت سے مولانا مفتی مصلح الدین عمروی رحمہ اللہ کو مقرر کیا گیا۔ فی الحال دو مفتیان کرام حضرت مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی اور مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری کے ذمہ افتا کی ذمہ داری ہے۔ ۱۴۱۰ھ سے ترتیب فتاویٰ کا کام نائب مفتی مولانا سلمان منصور پوری اور مولانا کلیم اللہ سیتاپوری کے تعاون سے جاری ہے۔

دارالافتاء جامعہ باقیات صالحات، ویلور، بنگلور:

جنوبی ہند کے صوبہ تامل ناڈو کا شہر ویلور سوا سو سال سے زائد سے علوم اسلامیہ کی تعلیم وتدریس کا مرکز رہا ہے

(۱) تاریخ امارت: ۱۶۲۔ ودینی جدوجہد کا روشن باب۔

اور وہاں جامعہ باقیات صالحات قائم ہے۔اس کا دارالافتاء ملک کے ان قدیم دینی وفقہی مراکز میں ہے جس کے ذریعہ ہزاروں افراد نے سوالات کر کے فقہی رہنمائی حاصل کی ہے۔جب جامعہ باقیات صالحات ۱۳۰۱ھ میں قائم ہوا تو اس کے پیش نظر ایسے جانباز مخلص رجال کار کی تیاری تھی جو علوم دینیہ کی نشرواشاعت کے ساتھ امت مسلمہ میں اتباع سنت اور رد بدعت پر وسیع پیمانے پر خدمات انجام دے سکیں، ۱۳۰۱ھ میں اس ادارہ نے درس وتدریس کے نئے نظام کے ساتھ مدرسہ باقیات صالحات کا قالب اختیار کیا۔اس ادارہ کے بانی حضرت مولانا مفتی عبدالوہاب صاحب رحمہ اللہ جب حیدرآباد سے اپنے وطن ویلور واپس آئے تو اولاً انہوں نے اپنی خدمات کا آغاز وعظ وارشاد سے کیا اور اسے امت مسلمہ کی اصلاح کا ذریعہ بنایا، ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب ایک فقیہ بھی تھے اس لیے مسائل کے بارے میں بھی لوگوں کا رجوع رہا اور دارالافتاء کا کام بھی جاری رہا۔اس طرح انہوں نے فقہ وفتاویٰ کی ایک بڑی خدمت کی، ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ باقیات صالحات'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔(۱)

دارالافتاء سبیل السلام حیدرآباد:

دارالعلوم سبیل السلام میں تدریس کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت فتاویٰ لکھنے کا بھی سلسلہ قیام دارالعلوم کے زمانہ سے ہی رہا، شروع میں تو جو فتاویٰ جاری کئے جاتے تھے، ان کے نقل کرنے کا اہتمام نہیں تھا، لیکن جب مدرسہ اپنی اصل زمین ''بارکس'' میں منتقل ہوا، تو فتاویٰ باضابطہ نقل کئے جانے لگے، اس طرح کے دو رجسٹر جس میں مولانا مفتی مظہر الدین قاسمی مرحوم، مولانا مفتی عبدالودود مظاہری، اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہم کے فتاویٰ تھے، ضائع ہوگئے، البتہ فتاویٰ کا ایک رجسٹر محفوظ رہا، جس میں ایک اچھی خاصی تعداد مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے جوابات کی ہے۔وہ سوال وجواب مولانا خالد صاحب کے مجموعہ کتاب الفتاویٰ میں شامل ہیں۔دارالافتاء سبیل السلام کے زمانہ قیام سے اب تک فتاویٰ کا سلسلہ جاری ہے اور وہاں اچھے مفتی رہے ہیں۔

دارالافتاء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، سملک، ڈابھیل، گجرات:

گجرات قدیم زمانہ سے علمی مرکز رہا ہے، اسی کا ایک قصبہ سملک ڈابھیل ہے، جہاں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین واقع ہے، اس کے تحت دارالافتاء بھی قائم ہے، یہاں اکابر علماء کی ایک جماعت درس وتدریس اور افتا کے کاموں میں مصروف رہتی آئی ہے، ان میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کی شخصیت بھی تھی۔۱۹۲۷ء میں جب آپ دارالعلوم دیوبند سے یہاں تشریف لائے تو دارالافتاء قائم ہوا اور تقریباً دو ماہ آپ نے فتویٰ نویسی کا کام انجام دیا، آپ کے بعد ساڑھے چار سال تک مولانا مفتی عبدالرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ و دیگر اصحاب علم جیسے حضرت مولانا احمد بزرگ سملکی رحمہ اللہ،

(۱) مقدمہ فتاویٰ باقیات صالحات۔

حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحب رحمہ اللہ، مولانا مفتی اسماعیل گورار رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مفتی اسماعیل کچھولوی رحمہ اللہ نے افتا کی خدمت کی، اور ۱۴۰۶ھ سے مولانا مفتی احمد خانپوری مدظلہ اس ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ محمود الفتاویٰ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (۱)

دارالافتاء جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات:

دارالافتاء جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات اہم دارالافتاء میں ہے، یہاں سے ہزاروں فتاویٰ اب تک جاری ہو چکے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عبداللہ مظاہری صاحب کی سرپرستی میں اصحاب علم کی جماعت اس خدمت کو انجام دے رہی ہے، وہاں سے فتاویٰ کی پہلی جلد ''فتاویٰ مظہر سعادت'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں مفتی صاحب کے تخصص افتا کے زمانہ میں لکھے گئے فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے، آئندہ کام جاری ہے۔

دارالافتاء دارالعلوم، کراچی، پاکستان:

فقیہ ملت مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ ایک کہنہ مشق اور صاحب نظر فقیہ تھے، اللہ تعالیٰ نے فقہ وفتویٰ میں آپ کو بلند مقام عطا فرمایا تھا، پہلے دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کے اہم منصب پر فائز تھے، پھر ۱۹۴۸ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو یہاں بھی مسلمان اپنے مسائل کے حل کے لیے بکثرت رجوع کرنے لگے اور حضرت مفتی صاحب احکام شرعیہ سے انہیں آگاہ فرمانے لگے، اس طرح رفتہ رفتہ آپ کی ذات گرامی نے کراچی میں بھی ایک چلتے پھرتے دارالافتاء کی حیثیت اختیار کر لی، پھر عوام الناس کی سہولت کے لیے برنس روڈ کراچی کی مسجد باب السلام سے متصل ایک دارالافتاء قائم فرمایا جہاں آپ نے سات سال تک فتوے کا کام کیا۔

جب حضرت مفتی صاحب نے جامعہ دارالعلوم کراچی کی بنیاد رکھی تو اس کے ذریعہ صرف طلبہ کی علمی پیاس بجھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دارالافتاء بھی قائم فرمایا تاکہ دور دراز کے مسلمان بھی اپنی علمی ضروریات میں رہنمائی حاصل کر سکیں، چنانچہ دنیا کے اطراف واکناف سے مسلمان اپنے سوالات بھیجنے لگے اور یہاں سے ان کے علمی وتحقیقی جوابات لکھے جانے لگے، حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ کے جلیل القدر صاحبزدگان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحبان نے اپنے زمانے کے اکابر اصحاب افتا کے علاوہ اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ سے فتوے کی خصوصی تربیت حاصل کی اور والد ماجد کی آخری سانس تک ان کی نگرانی میں اس طرح کام کیا کہ کوئی اہم تحریر انہیں دکھائے بغیر شائع نہیں کی، بانی جامعہ اور ان کے قابل قدر جانشینوں کی محنت سے دارالافتاء ایک خاص مرجعیت کا حامل ہے۔

(۱)　محمود الفتاویٰ جلد اول: ۱۹۱-۱۹۹۔

بانی جامعہ حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ کے علاوہ خدمت افتا میں حضرت مولانا مفتی صابر علی، مولانا مفتی سحبان محمود، مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری رحمہم اللہ، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا محمد عبداللہ، مولانا محمود اشرف عثمانی، مولانا عبدالرؤف، مولانا اصغر علی ربانی اور مولانا عبدالمنان صاحب کے نام نمایاں ہیں۔

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی، پاکستان:

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، لاہور، پاکستان کا باضابطہ قیام ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے کیا اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ سابق مفتی اعظم پاکستان کو اس کا رئیس مقرر کیا گیا، اس سے قبل خود حضرت بنوری رحمہ اللہ جامعہ میں عوام الناس کی شرعی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، تدریس کے ساتھ ساتھ خود فتاویٰ نویسی کا کام کرتے تھے۔

دارالافتاء سے سالانہ ہزاروں فتاویٰ جاری ہوتے ہیں، جن کا باقاعدہ ریکارڈ کیا جاتا ہے، یہ دارالافتاء ایک بڑا علمی مرکز ہے جہاں سے ہر سال کئی ہزار کی تعداد میں فتاویٰ جاری ہوتے ہیں۔ جامعہ سے دیئے گئے فتوے کی ترتیب کا کام جاری ہے، فی الحال جامعہ سے شائع ہونے والا مجلّہ بینات میں جو تحقیقی استفتا کے جوابات شائع ہوتے تھے اسے فتاویٰ بینات کے نام سے چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے، جامعہ کے ویب سائٹ پر بھی دارالافتاء والقضاء کی طرف سے جاری فتاویٰ کو بعینہ درج کیا جارہا ہے جو موجودہ حالات میں ایک مستحسن قدم ہے۔

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (نوشہرہ) پاکستان:

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ) پاکستان کی شہرت ومقبولیت کے ساتھ اس کے دارالافتاء کو بھی عالم اسلام میں سند اعتماد اور مقبولیت عامہ حاصل رہی ہے، یہاں زمانہ قیام ۱۳۶۶ھ سے افتا کا سلسلہ جاری ہے، بانی دارالعلوم حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ سابق استاد دارالعلوم دیوبند جہاں حدیث کی خدمت انجام دیتے تھے وہیں لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ دارالافتاء کے نظام کو بہتر طور پر انجام دیا جائے، اس کے لیے انہوں نے دارالافتاء کے نظام سے مولانا مفتی محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبدالحلیم زروبی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب رحمہ اللہ، مولانا مفتی محمد علی سواتیؒ، مولانا مفتی قاضی انوارالدین صاحب، مولانا مفتی محمد یوسف بونیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحلیم کوہستانی صاحب وغیرہم کو جوڑا، اور یہ سلسلہ جاری رہا، مولانا سمیع اللہ صاحب، مولانا محمد ہاروت صاحب، مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی سیف اللہ ہاشم خان صاحب، مولانا مفتی عبدالحلیم کلاچوی، مولانا عبدالحق قندہاروی، مولانا مفتی محبوب الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی رشید احمد صدیقی صاحب، مولانا مفتی غلام قادر نعمانی صاحب، مولانا مفتی مختاراللہ حقانی، مولانا محمد ابراہیم فانی وغیرہم نے بھی دارالافتاء

کے نظام سے وابستہ ہوکر فتویٰ نویسی کا کام کیا اور فتاویٰ کا سلسلہ جاری ہے۔ وہاں سے صادر ہونے والے فتاویٰ کا ایک منتخب مجموعہ ''فتاویٰ حقانیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

دارالافتاء جامعہ خیر المدارس، ملتان، پاکستان:

ہندوستان کی تقسیم کے بعد حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ نے پاکستان ہجرت کی اور مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کی خواہش اور اصرار پر جنوبی پنجاب کے تاریخی شہر ''مدینۃ الاولیاء'' ملتان میں ۲۲/ ذیقعدہ/ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خیر المدارس قائم کیا، ساتھ ہی دارالافتاء کا قیام بھی عمل میں آیا، وہاں کے دارالافتاء میں برابر جید اور ماہر مفتیان کرام افتا کی خدمت پر مامور رہے، جس سے مقامی و بیرونی اصحاب اپنے سوالات پیش کر کے جوابات حاصل کرتے رہے ہیں، یہاں سے بڑی تعداد میں فتاویٰ صادر ہوئے ہیں، یہاں سے صادر ہونے والے فتاویٰ کے منتخبات کئی جلدوں میں ''خیر الفتاویٰ'' کے نام سے مرتب ہوکر شائع ہو چکے ہیں۔

دارالافتاء مدرسہ قاسم العلوم، ملتان، پاکستان:

ملتان اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے پاکستان کا ایک مشہور شہر ہے، یہاں مدرسہ قاسم العلوم ہندو پاک کی آزادی کے قبل سے قائم ہے، مدرسہ میں زمانہ قیام سے ہی دارالافتاء کا نظام ہے، جہاں سے مسلمان اپنے شرعی مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ کے زمانہ میں دارالافتاء کو وقار حاصل ہوا ہے، آج بھی دارالافتاء سے ہر سال ہزاروں فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ اور دیگر مفتیان کرام کے فتووں کو منتخب کر کے مولانا فضل الرحمٰن صاحب امیر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے ''فتاویٰ مفتی محمود'' کے نام سے کئی جلدوں میں شائع کیا ہے۔

دارالافتاء والارشاد، کراچی، پاکستان:

حضرت مولانا مفتی رشید احمد پاکستانی رحمہ اللہ بڑے عالم تھے، فقہ وفتاویٰ پر ان کی نگاہ عمیق و وسیع تھی، لوگ ان سے مختلف سماجی ومعاشرتی اور دینی وملی سوالات کرتے، جن کے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں تشفی بخش جوابات دیتے، ۱۳۸۳ھ میں انہوں نے ایک فقہی واصلاحی ادارہ ''دارالافتاء والارشاد'' کے نام سے کراچی پاکستان میں قائم کیا اور مستقلاً اسی ادارہ کے ذریعہ آپ نے فقہ وفتاویٰ کی خدمت انجام دی، احسن الفتاویٰ کے بہت سارے فتاویٰ وہیں سے جاری کئے گئے ہیں اور آج بھی وہاں سے فتاویٰ کا سلسلہ جاری ہے۔

کتب فتاویٰ

ہندوستان کے علما وفقہا کی تصانیف جامعیت، تحقیق اور اپنے عہد کے جدید مسائل کے حل میں انتہائی اہم ہیں، ان میں شرح وتحقیق بھی ہے، اور اجتہادی شان بھی، اس لیے کہ نئے مسائل کا شرعی حکم قیاس و اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی آمد ہوئی تو ابتدا میں علم حدیث پر زیادہ توجہ دی گئی، خاص طور پر سندھ اور گجرات کے ساحلی شہروں میں۔ اس کے بعد اہل علم کی فکر وتوجہ کا مرکز علم فقہ بن گیا اور حضرت امام ابوحنیفہؒ و دیگر مجتہدین کی فکری و فقہی تسلسل کو آگے بڑھایا گیا۔ چنانچہ یہاں کے علما و مفتیان نے فقہ وفتاویٰ کی جو خدمات انجام دی ہیں اس کا سلسلہ تاریخی طور پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے، مگر دوسو سال کے عرصہ میں مختلف دارالافتاء سے جو فتاویٰ علما نے دیئے ہیں وہ انتہائی اہم ہیں ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے قدیم وجدید تمام ہی مسائل استفتا کی شکل میں ان کے سامنے پیش ہوتے رہے اور انہوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں ان کے جوابات دیئے۔ ان کے فتاویٰ پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل خصوصیتیں خاص طور پر نظر آتی ہیں!

(۱) وہ پہلے سوال پڑھ کر سائل کی حیثیت ذہن میں قائم کرتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق جواب تحریر فرماتے ہیں، ایک ہی طرح کے متعدد سوالات میں سائلین کے درجے کی حیثیت سے مطول اور مختصر جواب دیتے ہیں۔

(۲) ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ کافی غور وخوض اور تفکر وتدبر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور اس تفکر کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا ہے جو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہو۔

(۳) جوابات کے سلسلہ میں انداز بیان سلجھا ہوا، صاف ستھرا اور پختہ ہوتا ہے، کہیں کسی مسئلہ میں تذبذب کی راہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ مسائل کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور جو جواب تحریر فرماتے ہیں وہ ہر پہلو سے جامع اور مکمل ہوتا ہے۔

(۴) سوالات کے جوابات ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر سوال حذف کر دیا جائے تو بھی نفس مسئلہ جواب سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ انداز بیان سلیس اور جامع، معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے کسی کو کوئی الجھن پیش نہیں ہوتی ہے۔

(۵) مسائل کے جواب میں عرف زمانہ پر گہری نظر رکھتے، اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف مُفتیٰ بہ قول ہیں تو ایسے موقع پر سہل وآسان قول کو اختیار کرتے اور اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔ ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو۔

(۶)　استفتا کے جواب میں ہمیشہ مفتیٰ بہ قول کو اختیار کرتے ہیں الاّ یہ کہ انسانی ضرورت عدول کا تقاضا کرتی ہو تو ایسی صورت میں ضرورتاً غیر مفتیٰ بہ قول کو بھی اختیار کرتے ہیں۔

(۷)　ان حضرات کو اس بات کا احساس تھا کہ عوام کے لئے حکم بتادینا ہی کافی ہے، مگر علما کے لئے دلائل فراہم کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے سائل اگر عام مسلمانوں کے طبقہ میں ہوتا اور وہ مسائل کی علت دریافت کرتا تو اس کو صرف حکم شریعت بتانے پر اکتفا کرتے۔ لیکن اگر کوئی عالم سوال پوچھتا تو اسے علمی انداز سے جواب دیتے اور علل وحکم کو بھی واضح کرتے۔

(۸)　بعض مفتیان کرام کا انداز یہ ہوتا ہے کہ عام معروف مسئلہ کے جواب کا حوالہ درج نہیں کرتے ہیں البتہ اہم مسائل کے جواب میں فقہی کتب یا احادیث کے حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔ بلکہ بعض فتاویٰ میں دلائل کی تفصیل بھی ہے، خاص طور پر احادیث کے دلائل نہایت شرح وبسط سے محدثانہ اصول پر بیان کئے گئے ہیں۔

(۹)　کچھ مسائل ایسے ہیں جن میں فقہ حنفی و دیگر فقہ میں اختلاف ہے، ان مسائل کے بیان میں فتاویٰ اس شرح وبسط سے دلائل کے ساتھ دیئے گئے ہیں کہ وہ مستقل رسالوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

(۱۰)　ہندوستان و پاکستان کے علما کے یہ فتاویٰ تقریباً دوسو سال کے جدید وقدیم مسائل کے حل پر مشتمل ہیں، اس لئے جدید سے جدید مسئلہ چاہے وہ دنیا کے کسی خطہ میں پیش آیا ہو اکثر و بیشتر سوال وجواب کی صورت میں ان کا حل ان فتاویٰ میں نظر آتا ہے۔

ان مذکورہ خصوصیات کے حامل فتاویٰ کی جو کتابیں فقہ حنفی کے اعتبار سے معتبر اور اہم ہیں اور جنہیں اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، ان کا ایک مختصر تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے:

فتاویٰ عزیزی:

انگریزی دور حکومت میں غیر سرکاری طور پر جن علما نے افتا کے فرائض ذاتی طور پر انجام دیئے ان میں سب سے زیادہ مشہور فقیہ، محدث کبیر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت: ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء وفات: ۱۲۳۹ھ) کا نام نامی ہے جن کے فتاویٰ کا مجموعہ فتاویٰ عزیزی کے نام سے فارسی زبان میں شائع ہوا ہے، جس کا بعد میں اردو ترجمہ ایم ایچ سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ۶۳۱ رصفحات پر مشتمل ہے جس میں تمام ابواب فقہ سے متعلق اہم ۳۴۷ رفتاویٰ کا انتخاب ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ:

یہ کتاب فقیہ النفس عارف باللہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۲۴۴ھ- وفات: ۱۳۲۳ھ) کے

فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو آپ نے مختلف اوقات میں اور خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں آنے والے استفتاءات کے جواب لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ کل ۵۰۴/صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل ۲۰۳۴/فتاویٰ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ کے علاوہ محترم جناب مولانا نورالحسن کاندھلوی صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کی ایک مناسب تعداد حاصل کرکے ''باقیات فتاویٰ رشیدیہ'' کے نام سے شائع کیا ہے جس میں ۹۹۸ فتاویٰ، ۶۰۰/صفحات پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح فتاویٰ رشیدیہ کے ساتھ حضرت کے دوسرے فتاویٰ ورسائل پر مشتمل ایک مجموعہ ''تالیفات رشیدیہ'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

مجموعہ فتاویٰ عبدالحئی:

حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی رحمہ اللہ (ولادت: ذیقعدہ ۱۲۶۴ھ) کو اللہ جل شانہ نے تفقہ کی نعمت سے نوازا تھا، اور آپ نے حدیث وفقہ کی عظیم خدمت انجام دی ہے، آپ کے فتاویٰ فارسی زبان میں ہیں اور ان کا پہلا مجموعہ خلاصۃ الفتاویٰ کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں جملہ احکام فقہیہ کو بہت اچھے اور مناسب انداز میں اختصار کے ساتھ مگر مدلل بیان کیا گیا ہے اور بعض مسائل ضروریہ میں تفصیل بھی ہے، تمام مسائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر مسئلہ کو پہلے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر فقہا کے اقوال اور ان کی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے۔ ان تمام فتاویٰ کو مولانا خورشید عالم صاحب رحمہ اللہ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے نئی ترتیب وتبویب کے ساتھ آسان اور سلیس اردو میں منتقل کیا ہے، جو ''فتاوی عبدالحئی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور نوسو مسائل پر مشتمل ہے۔

عزیز الفتاویٰ:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ (۱۲۷۵ھ۔۱۳۴۷ھ) صدر مفتی اول دارالعلوم دیوبند کے منتخب فتاویٰ کا مجموعہ ہے جسے آپ کے شاگرد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی صاحبؒ نے مرتب کیا ہے، اس مجموعہ میں ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۳۴ھ تک کے لکھے گئے فتاویٰ کا انتخاب کیا گیا ہے، ۱۳۵۷ھ میں کئی جلدوں میں اس کی اشاعت ہوئی تھی، اب ایک ضخیم جلد میں ''فتاویٰ دارالعلوم موسوم بہ عزیز الفتاویٰ'' کے نام سے زکریا آفسیٹ پریس، دیوبند، سہارنپور، یوپی، سے طبع ہوا ہے، جو ۱۴۹۱ فتاویٰ اور ۷۵۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے لاکھوں فتاویٰ جاری ہوئے ہیں ابتدا میں ۱۳۱۰ھ سے مسلسل رجب ۱۳۴۶ھ

تک عہدۂ افتاء پر عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ تنہا مفتی کی حیثیت سے رہے، مگر اس چھتیس سالہ دورِ افتاء میں نقول صرف ۱۳۲۹ھ سے ملتے ہیں اس سے پہلے اٹھارہ سال کے فتاویٰ کی نقلیں موجود نہیں ہیں۔ دارالعلوم کے احاطہ میں بیٹھ کر یہاں کے شعبہ دارالافتاء کی مہر سے جو فتاویٰ ملک و بیرون ملک میں بھیجے گئے، اسکی ابتدا رئیس المفتیین حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے ہوئی اور یہی فتاویٰ ''فتاویٰ دارالعلوم'' کے نام سے مشہور ہیں جن کی کل ۱۴ر جلدیں شائع ہوچکی ہیں، مزید کام جاری ہے یہ فتاویٰ تعداد، مسائل کے حل اور تحقیق کے اعتبار سے انتہائی بے نظیر ہیں، زبان بہت صاف ستھری آسان اور سہل ہے ان فتاویٰ کے مرتب حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ ہیں جن کی ترتیب و تحقیق کے ساتھ ۱۲ر جلدیں شائع ہوئیں، ان کے بعد کی جلدیں حضرت مولانا مفتی امین قاسمی صاحب نے مرتب فرمائی ہیں۔

فتاویٰ مظاہر علوم:

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، یوپی میں شروع سے فتویٰ کا سلسلہ جاری رہا ہے، پہلے مفتی کے طور پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمہ اللہ (ولادت: ۱۲۶۹ھ مطابق: ۱۸۵۲ء، وفات: ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء) کا نام آتا ہے جن کے فتاویٰ محفوظ ہیں، ''فتاویٰ مظاہر علوم المعروف بہ فتاویٰ خلیلیہ'' کی پہلی جلد شعبہ نشر و اشاعت سے شائع ہوچکی ہے۔ جس میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے، یہ فتاویٰ تحقیق و تدقیق اور مسائل کے بیان میں انتہائی اہم ہیں بعض نئے مسائل بھی اس میں درج ہیں۔

امداد الفتاویٰ:

یہ کتاب عارف باللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۲۸۰ھ وفات: ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء) کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند، جامع العلوم کانپور اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام کے دوران تحریر فرمائیں جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے مرتب کیا ہے، جس پر مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ نے مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کل ۶ر ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور قدیم و جدید مسائل کے حل و بیان میں علما و خواص کا مرجع ہے۔

امداد الاحکام:

یہ ان فتاویٰ کا نادر روزگار مجموعہ ہے جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی رہنمائی میں آپ کے جلیل القدر بھانجے اور شاگرد رشید حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ (۱۳۱۰ھ۔۱۳۹۴ھ) نے تحریر فرمایا اور کچھ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمہ اللہ (۱۳۱۵ھ۔۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء) کے تحریر فرمودہ ہیں۔

یہ مجموعہ تقریباً انیس سال (محرم ۱۳۴۰ھ سے شوال ۱۳۵۸ھ تک) کے فتاویٰ پر مشتمل ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے فتاویٰ پر حضرت حکیم الامتؒ کے تصدیقی دستخط ہیں، اور جن پر تصدیقی دستخط نہیں ہیں وہ بھی اکثر آپ کے زبانی مشورے سے لکھے گئے ہیں، اور جن فتاویٰ میں مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ان کی صحت پر بھی آپ کو تقریباً ایسا ہی اعتماد تھا جیسے اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ پر۔ فتاویٰ کا یہ مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کے مقدمہ اور ترتیب کے ساتھ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں زکریا بکڈپو دیوبند سے متعدد جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

کفایت المفتی:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت: ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء، وفات: ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء) مفتی اعظم ہند کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو انہوں نے سہ روزہ الجمعیۃ میں حوادث واحکام کے عنوان سے تحریر کیا، یا مدرسہ امینیہ دہلی کے دارالافتاء سے جاری ہوئے، ان کے فتاویٰ کو آپ کے فرزند مولانا حفیظ اللہ واصف صاحب نے مرتب کر کے ''کفایت المفتی'' کے نام سے نو جلدوں میں شائع کیا ہے، زمانہ آگہی، اپنے عصر اور عہد کے حالات کی رعایت اور شستہ وشگفتہ زبان وتعبیر آپ کا خاص امتیاز ہے، اس مجموعہ کی فہرست اجمالی تھی اس لیے لوگوں کو استفادہ میں بہت دشواری پیش آتی تھی، اللہ جزائے خیر دے مولانا عبدالقیوم (استاذ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل) کو کہ انہوں نے اس کی تفصیلی فہرست تیار کر دی ہے جس کی وجہ سے کتاب سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ دارالاشاعت اردو بازار کراچی پاکستان سے بھی شائع ہوئی ہے۔

فتاویٰ شیخ الاسلام:

یہ کتاب شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء، وفات: ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سے مختلف اوقات میں پوچھے گئے استفتا کے جواب کا مختصر مجموعہ ہے، جسے مولانا محمد سلمان منصور پوری استاد حدیث وفقہ مدرسہ شاہی مرادآباد یوپی نے مرتب کیا ہے یہ فتاویٰ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود بہت ہی اہم ہیں۔

امداد المفتیین:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء، وفات: ۱۳۹۶ھ) کے ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۶۲ھ تک کے لکھے گئے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں مفتی کی حیثیت سے لکھے

تھے، اس مجموعہ کو آپ نے خود کئی جلدوں میں مرتب کیا تھا، اب یہ نئی ترتیب وتبویب کے ساتھ ایک ضخیم جلد میں ''فتاویٰ دارالعلوم موسوم بہ امداد المفتیین'' کے نام سے زکریا آفسیٹ پریس، دیوبند، سہارنپور، یوپی، سے طبع ہوکر دستیاب ہے اور مسائل کے حل میں بے نظیر ہے۔

نظام الفتاویٰ / منتخبات نظام الفتاویٰ:

نظام الفتاویٰ اور منتخبات نظام الفتاویٰ حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی رحمہ اللہ کے ان فتاویٰ کا منتخب مجموعہ ہے، جسے انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں مفتی اور صدر مفتی کی حیثیت سے لکھے تھے، آپ کے فتاویٰ میں احوال زمانہ کی رعایت، اور شریعت کی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے جدید عہد کے پیدا شدہ مسائل میں تیسیر وسہولت کا پہلو پایا جاتا ہے، منتخبات نظام الفتاویٰ جدید مسائل کے حل کے اعتبار سے تمام علماء ہند کی موجودہ کتب فتاویٰ میں سب سے ممتاز ہے، اسی وجہ سے مفتی صاحب نے منتخب فتاویٰ کا یہ مجموعہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمہ اللہ (م۱۴۲۲ھ) کی خواہش پر ان کے سپرد فرمایا، جس کی پہلی دو جلدیں ان کی زندگی میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوئی تھی، جسے بعد میں مزید حوالہ جات کی تحقیق اور جدید ترتیب کے ساتھ تین جلدوں میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نئی دہلی نے ایفا پبلیکیشن کی طرف سے شائع کیا ہے ان کے علاوہ نظام الفتاویٰ کے نام سے متعدد جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

فتاویٰ محمودیہ:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ (۱۳۲۵ھ۔۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۶ء) کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے زمانہ قیام کے دوران لکھے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ محمودیہ'' کے نام سے پہلی مرتبہ ۲۰/جلدوں میں شائع ہوا، جسے مولانا محمد فاروق میرٹھی صاحب نے مرتب کیا تھا، اس مجموعہ میں تین ہزار سے زائد مسائل شامل تھے، البتہ اس مجموعہ کی ترتیب اور فتاویٰ پر تخریج وتعلیق کے سلسلہ میں مزید محنت کی ضرورت تھی اور مکررات کو حذف کردینا مناسب تھا۔ اب شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی پاکستان سے ۲۵/جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

فتاویٰ امارت شرعیہ:

امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ، جھاڑکھند کا دارالافتاء ملک کے اہم ترین دارالافتاء میں ہے، زمانۂ قیام سے ابتک ہر دور میں فتاویٰ جاری ہوتے رہے ہیں۔ امارت شرعیہ کے فتاویٰ میں حضرت مولانا محمد عثمان غنیؒ (ولادت: ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء، وفات: ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) کے لکھے ہوئے فتاویٰ کا زیادہ بڑا ذخیرہ ہے، پھر حضرت مولانا مفتی محمد

عباس صاحبؒ (وفات: ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۲ء)، حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی صاحبؒ (وفات: ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء)، حضرت مولانا قمر الدین صاحبؒ امیر شریعت ثالث اور خود بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ (ولادت: ۱۳۰۱ھ، وفات: ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء) کے قیمتی علمی فتاویٰ موجود ہیں، کبھی کبھی قاضی نور الحسن صاحبؒ (ولادت: ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء، وفات: ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء) بھی فتاویٰ لکھتے تھے۔ یہ فتاویٰ انتہائی اہم ہیں، خاص طور پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے فتاویٰ ایسے ہیں جو اجتماعی، دستوری اور اہم ترین ملی مسائل سے متعلق ہیں، استبدال وقف کا مسئلہ ہو یا ترک موالات یا مدارس اسلامیہ کے لئے سرکاری امداد کا مسئلہ، ان کے جوابات میں ایک فقیہ النفس عالم کی فراست ایمانی نظر آتی ہے، انہوں نے آنے والے فتنوں کو کس طرح محسوس کیا اور فتاویٰ میں اس کا کیسے سد باب کیا، یہ علما اور اصحاب نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں، اب تک فتاویٰ امارت شرعیہ کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں دو جلدوں کی ترتیب و تعلیق حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۲ء) نے کی اور باقی جلدوں کی ترتیب و تحشیہ مفتی محمد سعید الرحمٰن قاسمی مفتی امارت شرعیہ نے کی ہے۔ ان جلدوں میں مذکورہ اکابر کے ساتھ مولانا مفتی نعمت اللہ قاسمی سابق مفتی امارت شرعیہ، مولانا مفتی صدر عالم صاحب سابق مفتی امارت شرعیہ، مولانا مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی مفتی امارت شرعیہ، مولانا مفتی سہیل احمد قاسمی مفتی امارت شرعیہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فتاویٰ قاضی:

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۶ء، وفات: ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۲ء) ایک معتبر اور صاحب نظر فقیہ تھے، انہوں نے پوری زندگی قضا اور مقدمات کے فیصلے کی خدمات میں گزار دی، قاضی صاحبؒ عموماً استفتا کے جواب سے گریز کرتے تھے تاہم جن امور کا تعلق قضا سے نہیں یا فریقین قاضی صاحبؒ ہی کے فتویٰ پر عمل کے لیے رضامند ہوں ان مسائل میں آپ فتویٰ لکھتے تھے، قاضی صاحبؒ کے فتاویٰ میں اپنے اکابر کی طرح مدارج احکام کی رعایت، عرف و ضرورت زمانہ کا لحاظ بھرپور انداز میں پایا جاتا تھا، قاضی صاحبؒ کے فتاویٰ کی مجموعی تعداد ایک سو بیس ہے، ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے ایک رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی نے اس کی ترتیب و تحشیہ کا کام کیا ہے جو ''فتاویٰ قاضی'' کے نام سے ۲۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایفا پبلیکشن جوگا بائی نئی دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔

فتاویٰ رحیمیہ:

اللہ جل شانہ نے جہاں حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ (ولادت: ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) کو ایک اچھے قاری ہونے کا مرتبہ عطا فرمایا تھا وہیں آپ کو فقہ و فتاویٰ میں ایک اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا، جامع مسجد نوساری میں آپ

امامت کے فرائض کے ساتھ لوگوں کے آئے ہوئے سوالات کا جواب بھی دیتے تھے، آپ کے فتاویٰ کافی شرح وبسط اور تحقیق پر مبنی ہوتے تھے اور اکابر علما نے ان فتاویٰ کی تحسین بھی کی ہے، یہ مجموعہ اردو کے علاوہ انگریزی اور گجراتی زبانوں میں بھی طبع ہو چکا ہے، چوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں فتاویٰ مرتب کئے ہیں، اس لیے ایک ہی باب کے مسائل مختلف جلدوں میں آئے ہیں، گو مسائل میں تکرار نہیں ہے، اللہ جزائے خیر دے مفتی عبد القیوم صاحب (ڈابھیل) کو، کہ انہوں نے فقہی ابواب کے اعتبار سے ایک تفصیلی فہرست مستقل ایک جلد میں مرتب کردی ہے، جس نے فتاویٰ رحیمیہ سے استفادہ کو آسان کردیا ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ کی ۱۲؍ جلدیں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

فتاویٰ باقیات صالحات:

''فتاویٰ باقیات صالحات'' حضرت مولانا عبد الوہاب ویلوری رحمہ اللہ (ولادت: ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء، وفات: ۱۳۳۷ھ) کے ان فتاویٰ کا منتخب مجموعہ ہے جو انہوں نے مدرسہ باقیات صالحات کے دار الافتاء سے جاری کئے تھے، انہوں نے ہزاروں فتاویٰ لکھے تھے مگر اس کا جو ذخیرہ مدرسہ باقیات کے رجسٹروں میں محفوظ تھا وہ بہت کم تھا۔ مولانا کے فتاویٰ عام طور پر جنوب میں بولی جانے والی دکھنی اردو کے اسلوب اور محاوروں پر مرقوم تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب مرتب فتاویٰ باقیات صالحات نے مفہوم ومراد میں تغیر کئے بغیر صرف اردو زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مجموعہ ان رجسٹروں میں محفوظ فتاویٰ کا ایک حصہ ہے۔ جو ۴۱۴؍ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کل ۳۹۰؍ فتاویٰ ہیں، کلر لتھو گرافی مدراس، ۶ سے طبع ہوا ہے۔

فتاویٰ احیاء العلوم:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد یاسین مبارکپوریؒ (۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء۔۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۳ء) کے ان فتاویٰ کا منتخب مجموعہ ہے جو انہوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور کی تدریس کے زمانہ میں لکھے ہیں۔ یہ فتاویٰ بہت ہی اہم اور مدلل ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۵۳؍ صفحات ۲۷۵؍ فتاوی پر مشتمل ہیں پہلی جلد مولانا جمیل احمد نذیری نے مرتب کر کے جامعہ احیاء العلوم مبارکپور سے شائع کی ہے۔

فتاویٰ فرنگی محل:

فرنگی محل اپنے علمی اور فقہی کاموں کی وجہ سے ایک مشہور خانوادہ رہا ہے، ایک طویل عرصہ سے دار الافتاء قائم ہے جس میں زمانہ دراز تک حضرت مولانا مفتی محمد عبد القادرؒ (م: اگست ۱۹۵۹ء مطابق صفر ۱۳۷۹ھ) منصب افتا پر فائز رہے، ان کے فتاویٰ کو'' فتاویٰ فرنگی محل موسوم بہ فتاویٰ قادریہ'' کے نام سے مفتی محمد رضا انصاری نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

محمود الفتاویٰ:

مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، مولانا موصوف پچھلے بیس تیس سالوں سے دارالافتاء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات میں منصب افتا پر فائز ہیں۔اس مجموعہ میں ماہ نامہ الاصلاح (مجلس خدام الدین، سملک)، ماہ نامہ بیان مصطفیٰ، ہفتہ واری اخبار امید، ماہ نامہ اذان بلال آگرہ میں شائع فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے، اس میں بعض فتاویٰ دارالافتاء کی فائلوں سے خود نوشتہ اور املاء کئے ہوئے بھی لئے گئے ہیں۔

کتاب الفتاویٰ:

یہ کتاب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں آئے ہوئے سوالات کے جوابات میں لکھے ہیں۔

اس مجموعہ میں جو فتاویٰ شامل ہیں وہ پانچ طرح کے ہیں:

(۱) وہ فتاویٰ جو امارت ملت اسلامیہ آندھرا پردیش پنجہ شاہ حیدرآباد سے دیئے ہیں۔

(۲) وہ فتاویٰ جو مولانا نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے دارالافتاء سے دیئے ہیں۔

(۳) وہ استفتا جو مولانا کے پاس شخصی طور پر آئے ہیں۔

(۴) کچھ عرصہ ماہانہ ''افکار ملی دہلی'' کی خواہش پر بھی مولانا نے شرعی مسائل کا کالم لکھا۔

(۵) ۱۹۹۸ء سے روزنامہ منصف حیدرآباد کی ایک معیاری اردو روزنامہ کی حیثیت سے تجدید ہوئی، اس میں مولانا نے شروع ہی سے ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا ہے، اس کالم میں پیش آنے والے نئے سماجی، اجتماعی اور سائنسی مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے جواب دیا جاتا تھا۔

اس طرح اس مجموعہ میں زیادہ تر فتاویٰ وہی ہیں جو منصف میں لکھے گئے اور دسمبر ۲۰۰۳ء تک کے جوابات اس میں شامل کئے گئے ہیں۔

مولانا کا معمول عام طور پر فتاویٰ اور جوابات میں حوالہ سے متعلق عبارتیں درج کرنے اور حوالہ لکھنے کا ہے، اس لیے کتاب میں حوالہ جات کی تخریج کا کوئی بڑا کام نہیں تھا، لیکن کہیں کہیں حوالہ جات چھوٹ گئے تھے اور حافظہ پر اعتماد کرتے ہوئے مسائل لکھائے گئے تھے، ان حوالہ جات کی تخریج کا کام مولانا مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری نے کیا ہے اور ان کے علاوہ مولانا عمر عابدین قاسمی، مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا محمد بلال قاسمی، مولانا منور سلطان ندوی اور معہد کے بعض طلبہ نے کیا ہے۔اس طرح ان فتاویٰ کو چھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

فتاویٰ ندوۃ العلماء:

یہ کتاب دارالافتاء ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے مفتیان کی طرف سے لکھے گئے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں ۱۴۱۱ھ سے لکھے گئے فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے، جو مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب کی نگرانی میں انجام پایا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۴۱۱؍صفحات اور ۸۷۵؍فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ آئندہ کام جاری ہے۔

حبیب الفتاویٰ:

یہ کتاب مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب کا دارالافتاء جامعہ اسلامیہ، مہذب پور، اعظم گڑھ، یوپی سے جاری فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں نئے مسائل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اب تک چھ جلدوں میں شائع ہوگئی ہے، آئندہ کام جاری ہے۔

فتاویٰ شاکر خان:

یہ مجموعہ دارالعلوم نیپالی، بیلگام، کرناٹک میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات ہیں، مفتی شاکر خان پونا صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد فتاویٰ نویسی کا کام شروع کردیا تھا جو ہنوز جاری ہے، دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

احسن الفتاویٰ:

یہ کتاب مفتی رشید احمد پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جسے انہوں نے دارالافتاء دارالعلوم کراچی اور دارالافتاء والارشاد کراچی وغیرہ سے جاری فرمائے، حضرت مفتی صاحبؒ فقہ ومصادر فقہ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اور دلائل کے ساتھ مفصل جواب لکھتے ہیں، یہ مجموعہ علم وتحقیق کے معیار کے اعتبار سے بہت اہم ہے، یہ فتاویٰ شرح وتحقیق، نئے مسائل پر گفتگو اور بعض اختلافی مسائل میں سیر حاصل بحث، نیز فرق باطلہ پر مدلل رد کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں، اس مجموعہ میں بہت سارے فتاویٰ رسائل کی شکل میں ہیں۔ فتاویٰ کی ۱۰؍جلدیں طبع ہوگئی ہیں۔

خیر الفتاویٰ:

یہ کتاب حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے قائم کردہ خیر المدارس، ملتان، پاکستان، کے دارالافتاء سے جاری فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ یہاں سے بڑی تعداد میں فتاویٰ صادر ہوئے ہیں، یہاں سے صادر ہونے والے فتاویٰ کے منتخبات ۶؍جلدوں میں ''خیر الفتاویٰ'' کے نام سے کتابی شکل میں مرتب ہوکر شائع ہوچکے ہیں۔

فتاویٰ مفتی محمود:

مدرسہ قاسم العلوم، ملتان، پاکستان کی انتظامیہ نے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب پاکستانی رحمہ اللہ کو جب

دارالافتاء کی ذمہ داری دی تو انہوں نے دارالافتاء کے ذریعہ ہزاروں فتویٰ جاری کئے، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک تقریباً پچیس سالوں میں آپ نے تقریباً بائیس ہزار سے زائد فتویٰ دیئے، یہ مجموعہ پچیس سالہ دور افتاء میں دیئے گئے فتاویٰ کا ایک منتخب مجموعہ ہے جس کو ۱۰ ؍جلدوں میں جمعیت پبلیکیشنز وحدت روڈ، لاہور، پاکستان سے شائع کیا گیا ہے۔

فتاویٰ حقانیہ:

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ کٹک، پاکستان کے بانی شیخ الحدیث مولانا عبدالحق ودیگر مفتیان کرام کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جسے مفتی مختاراللہ حقانی نے مرتب کیا ہے، جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے، اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

فتاویٰ دیوبند پاکستان المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ:

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ کٹک، پاکستان کی وقیع شہرت عامہ کے ساتھ ساتھ اس کے دارالافتاء کو بھی فقہ وفتاویٰ میں قیادت کی حیثیت حاصل ہے، دارالعلوم کے سن تاسیس ۱۳۶۶ھ سے افتا کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۳۸۶ھ میں جب حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب رحمہ اللہ کی دارالعلوم آمد ہوئی تو دارالافتاء نے ایک منظّم شعبہ کی شکل اختیار کی اور عملی انضباط کے ساتھ ایک ادارہ کام کرنے لگا۔ یہ مجموعہ فتاویٰ کا وہ عظیم ذخیرہ ہے جو انہوں نے دارالعلوم حقانیہ کے قیام کے زمانہ میں دیئے ہیں، ۵؍جلدوں میں مولانا حافظ حسین احمد صدیقی نقشبندی مہتمم دارالعلوم صدیقیہ زروبی ضلع صوابی، پاکستان نے شائع کیا ہے۔

فتاویٰ بینات:

علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ بانی جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی، پاکستان نے مسلمانوں کی ذہنی وفکری اصلاح اور دینی تربیت کے لیے ایک مجلّہ بینات کے نام سے جاری فرمایا تھا جس میں دوسرے مفید علمی وتحقیقی مقالات کے ساتھ اہم تحقیقی وفقہی مسائل بھی شائع کئے جاتے تھے، خاص طور پر جامعہ کی طرف سے جاری ہونے والے فتاویٰ بھی شائع ہوتے تھے، ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ فتاویٰ بینات کے نام سے چار جلدوں میں مکتبہ بینات جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان سے شائع ہوا ہے، جبکہ جامعہ کے دیگر فتاویٰ کی ترتیب کا کام بھی جاری ہے۔

فتاویٰ عثمانی:

یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے فتاوے کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں مولانا کے ان فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے باقاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقل فتاویٰ رجسٹروں میں ان کا اندراج ہے۔ اسی طرح سن ۱۳۸۷ھ و ۸۸ھ میں بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور آپ ان کے جوابات لکھتے۔ ان میں سے بعض فتاویٰ بہت ہی مفصل اور مدلل ہیں یہ فتاویٰ

بھی اس میں شامل ہیں۔اب تک فتاویٰ عثمانی کی ۳رجلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

آپ کے مسائل اوران کا حل:

۵رمئی ۱۹۷۸ء میں ملک کے معروف اخبارروزنامہ ''جنگ'' پاکستان میں ''اقرأ'' کے نام سے اسلامی صفحہ کا آغاز ہوا حضرت مولانا علامہ محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان رحمہ اللہ نے ''آپ کے مسائل اوران کا حل'' کے نام سے کالم شروع کیا، جس میں لوگوں کے سوالات آتے اوران کے جوابات دیئے جاتے۔ بعد میں یہ سوال وجواب کتابی شکل میں آٹھ جلدوں میں مکتبہ لدھیانوی ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان سے شائع کئے گئے، جس میں مسائل کے حوالے فقہ وحدیث سے حاشیہ میں دیئے گئے ہیں۔

مرغوب الفتاویٰ:

مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری رحمہ اللہ (ولادت: ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء، وفات: ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) ایک وسیع النظر باعمل فقیہ تھے، قرآن وحدیث پر بڑی گہری نظر تھی، آپ کے فتاویٰ مدلل اور فقہی بصیرت کے حامل ہیں، اہل برما کی دعوت پر آپ رنگون چلے گئے اورایک مدرسہ میں تعلیم وافتا کی خدمت انجام دی، بعد میں رنگون کی مشہور ''سورتی جامع مسجد'' میں فتویٰ نویسی کا کام کیا، حضرت مولانا مرحوم کے فتاویٰ کی نقول ''سورتی جامع مسجد'' میں محفوظ ہیں، آپ کے پوتے مولانا مرغوب احمد صاحب نے فتاویٰ کے رجسٹروں کی فوٹو کاپی کراکر ترتیب وتحقیق کے بعد ۶رجلدوں میں شائع کیا ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ:

اس کتاب میں مولانا مفتی رضاء الحق صاحب کے فتاویٰ کو جمع کیا گیا ہے، موصوف جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن پاکستان کے دارالافتاء سے منسلک رہے، فی الحال دارالعلوم زکریا، لینیشیا، جنوبی افریقہ سے منسلک ہیں اور شیخ الحدیث کی ذمہ داری کے ساتھ دارالافتاء کے کاموں کو بھی انجام دیتے ہیں، جنوبی افریقہ کے ماحول کے حساب سے بہت سارے فتاویٰ دوسرے مسالک کے فقہ کے ذریعہ دیئے گئے ہیں، اس لیے انتخاب میں مسلک کی رعایت ضروری ہے۔۴رجلدوں میں فتاویٰ شائع ہوچکے ہیں۔

فتاویٰ مظہر سعادت:

فتاویٰ مظہر سعادت کی پہلی جلد شائع ہوچکی ہے جس میں مولانا مفتی عبداللہ مظاہری صاحب ہانسوٹ کے تخصص افتاء کے زمانہ میں لکھے گئے فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے۔آئندہ کام جاری ہے۔

مفتیان کرام

برصغیر میں دوسوسال کے اندر جن اصحاب علم وفضل نے فتویٰ نویسی کے کام انجام دیئے، اوران کے فتاویٰ شائع ہوئے، ان کی تاریخ بڑی روشن اور تابناک ہے، ان بزرگوں کے حالات زندگی چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں۔ یہ سلف کے طریقے پر گامزن تھے، علم اور تقویٰ ان کا شعار تھا، حق گوئی اور بے باکی ان کا نصب العین تھا، ضرورت تھی کہ ان کے احوال تفصیل سے لکھے جاتے اوران میں سے بہت سے اکابر کی سوانح تفصیلی طور پر موجود بھی ہیں، مگر یہاں اختصار کے ساتھ تحریر کیا جارہا ہے:

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بڑے صاحبزادے ہیں، مورخہ ۲۵ ررمضان المبارک ۱۱۵۹ھ مطابق ۲۰ رستمبر ۱۷۴۶ء بروز جمعہ دہلی میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام حلیم تھا، سلسلۂ نسب ۳۴ رواسطوں سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ طویل القامت، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم تھے، ڈاڑھی گھنی تھی، خط نسخ ورقعہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھتے تھے، تیراندازی اور شہ سواری میں ماہر تھے۔

آپ نے قرآن شریف کے حفظ سے فراغت کے بعد اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ان سے قرأت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق ودرایت اور توجہ سے علم حاصل کیا، جس سے آپ کو علوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا، جب آپ ۱۶ رسال کے تھے، والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس کے بعد آپ نے شیخ نوراللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا، علمی اجازت شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے حاصل ہوئی، ان حضرات سے ان علوم وکمالات میں استفادہ اوران کی تکمیل کی جو والد صاحب کی وفات سے تشنۂ تکمیل تھے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد مسند درس پر فائز ہوئے اور آخری عمر تک پوری زندگی خدمت دین کی نذر کردی۔ آپ سے بڑے بڑے فضلا نے استفادہ کیا، اکثر اطراف کے طلبہ آپ کی خدمت میں اس ذوق وشوق سے حاضر ہوئے جیسے پیاسا پانی پر گرتا ہے۔(۱)

(۱)　ماخوذ از تذکرہ شاہ ولی اللہ: ۱۲۹۔۱۳۲۔

پچیس سال کی عمر میں آپ کو متعدد اذیت رساں امراض نے گھیر لیا جن کے سبب آپ مراق، جذام، برص میں مبتلا ہوئے اور بصارت جاتی رہی۔ اس وجہ سے اپنی تدریسی ذمہ داری اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سپرد کر دی مگر اس کے ساتھ خود بھی درس دیتے تھے۔

ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب، خوش گفتار رہے اور تواضع، بشاشت اور مہر و محبت کی یہی ادا قائم رہی جو شروع ہی سے تھی، آپ کی صحبت ذہن و فکر کو جلا بخشتی تھی، ان صحبتوں میں حیرت انگیز خبریں، چیدہ اشعار، دور دراز کے ملکوں، ان کے باشندوں اور وہاں کے عجائبات کا بیان اس طرح ہوتا تھا، جس سے سامعین کو محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنے مشاہدات بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ آپ نے کلکتہ کے علاوہ کوئی اور شہر نہیں دیکھا تھا، مگر غیر معمولی طور پر ذہین اور متجسس فطرت کے مالک تھے، جس کے سبب آپ نے باہر سے دہلی آنے والوں اور معلومات افزا کتابوں سے یہ معلومات اپنے دماغ میں محفوظ کر لی تھیں۔

لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لیے حاضر ہوتے، شاعر و ادیب، ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کے لیے اور محتاج و ضرورت مند لوگ امراء سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کے لیے آتے، کیوں کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی شہرت عام تھی۔

موذی امراض کے باوجود درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، آپ کی تصانیف خاصی تعداد میں ہیں، چند تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی۔
(۲) تحفہ اثنا عشریہ۔
(۳) بستان المحدثین۔
(۴) عجالۂ نافعہ۔
(۵) فتاویٰ عزیزی (بزبان فارسی)۔
(۶) سر الشہادتین۔
(۷) میزان البلاغۃ۔

آپ کی وفات بعد نماز فجر یکشنبہ ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ کو اسی سال کی عمر میں ہوئی اور دہلی کے درگاہ شاہ ولی اللہ مہدیان میں اپنے والد ماجد کے قریب مدفون ہیں۔(۱)

(۱) بحوالہ تذکرہ شاہ ولی اللہؒ: ۱۲۹ تا ۱۳۲۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی ولادت ۶ ؍ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ کو دوشنبہ کے دن گنگوہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحبؒ اپنے زمانہ کے جید عالم دین اور حضرت شاہ غلام علی مجددی (دہلی) کے مجاز تھے۔

قرآن مجید کی تعلیم آپ نے اپنے وطن میں حاصل کی پھر اپنے ماموں کے پاس کرنال چلے گئے وہاں ان سے فارسی کی کتابیں پڑھیں، پھر مولوی محمد بخش رام پوری سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، دہلی میں کچھ دنوں مولانا احمد الدین پنجابی سے بھی پڑھا اور پھر مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا، جو مدرسہ عربی سرکاری (دہلی کالج) میں مدرس تھے اس مدرسہ کا پورا نصاب ونظام قدیم مدرسوں ہی کے مطابق تھا، یہیں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا تعلق ہوا جو ساری عمر رہا، آپ دونوں ہم درس تھے، دہلی میں معقولات کی بعض کتابیں آپ نے مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی پڑھیں، آخر میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل کی، پھر سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منزلیں طے کیں اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں سہارنپور میں نواب شائستہ خاں کے قلعہ میں آپ نے ملازمت کی، پھر گنگوہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا اور یہیں سے تعلیم وارشاد، درس حدیث، فقہ وفتاویٰ اور اصلاح وتربیت کا سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ اس دوران آپ کا ذریعۂ معاش طب تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے جہاد میں شریک ہوئے، معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ آپ کے نام بھی جاری ہوا اور آپ کو گرفتار کر کے سہارنپور جیل بھیج دیا گیا، پھر وہاں سے مظفرنگر کے جیل میں منتقل کیا گیا، چھ مہینے آپ نے جیل میں گذارے، پھر رہائی ہوگئی۔

جیل سے رہائی کے بعد گنگوہ میں ہی پھر سے درس وتدریس اور افتا وارشاد کا سلسلہ شروع فرمایا، صبح سے ۱۲ ؍ بجے تک طلبہ کو پڑھاتے تھے، ایک سال میں پوری صحاح ستہ ختم کرادینے کا التزام تھا، تین سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ آخر عمر میں ضعف بصارت کی وجہ سے تدریس کا سلسلہ بند ہوگیا، مگر ارشاد وتلقین اور افتا کا سلسلہ جاری رہا، ۸ ؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ ؍ اگست ۱۹۰۵ء جمعہ کے دن آپ کی وفات ہوئی۔

حدیث اور فقہ حضرت گنگوہیؒ کے دو خاص موضوع تھے چنانچہ قیام گنگوہ کے زمانہ میں درس حدیث کے ساتھ فقہ و فتاویٰ کا سلسلہ جاری تھا اور ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک سے بھی کثرت سے استفتا آپ کی خدمت میں آتے تھے، فقہ وفتاویٰ میں آپ کے مقام کا یہ حال تھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پاس جو استفتا آتے تھے حضرت نانوتویؒ عموماً وہ استفتاءات حضرت گنگوہیؒ کے سپرد کردیتے تھے آپ ان کے جوابات لکھتے تھے، اسی طرح حضرت

نانوتویؒ کی وفات کے بعد بھی دارالعلوم دیوبند میں آنے والے اہم استفتاءات آپ ہی کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے آپ ان کے جوابات عنایت فرماتے تھے اور کبھی خود دارالعلوم تشریف لا کر استفتا کے جواب تحریر فرمایا کرتے تھے، آپ کی فقہی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے محدث کبیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ آپ کو فقیہ النفس کہا کرتے تھے اور آپ کو علامہ ابن عابدین شامیؒ پر بھی ترجیح دیا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ اب سے ایک صدی پہلے تک اس شان کا فقیہ النفس جماعت علما میں نظر نہیں آتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے درس وتدریس اور فقہ وفتاویٰ کے ساتھ مسلمانوں کی داخلی خرابیوں کے سد باب اور اسلام میں مشرکانہ اوہام وعقائد کے نفوذ کی راہوں کو بند کرنے نیز مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی جدوجہد میں زندگی صرف کی جس کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا زیادہ موقع نہیں مل سکا، تاہم آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں وہ اپنے موضوع سے متعلق گہری تحقیق پر مبنی ہیں ذیل میں آپ کی چند تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) سبیل الرشاد: مسلک احناف پر ایک طبقہ کی طرف سے جو شکوک وشبہات اور اعتراضات کئے جاتے ہیں اس کتاب میں ان کے مفصل اور مدلل جوابات دیئے گئے ہیں اور شکوک وشبہات کا ازالہ کیا گیا ہے، مثلاً آمین بالجہر، قراءت خلف الامام، رفع یدین اور تقلید وغیرہ سے متعلق اس میں تفصیلی بحث ہے۔

(۲) الرأی النجیح: اس رسالہ میں تراویح سے متعلق روایات کو جمع کیا گیا ہے پھر محدثانہ انداز میں روایات کے درمیان جمع وتطبیق کے ذریعہ رکعات تراویح، بیس رکعات ہونے کو واضح کیا ہے۔ یہ رسالہ فتاویٰ رشیدیہ میں بھی شامل ہے۔

(۳) أوثق العریٰ: یہ دراصل آپ کا ایک مفصل فتویٰ ہے جس میں دیہات میں جمعہ کی فرضیت کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے، آپ دیہات میں جمعہ کی عدم فرضیت کو ثابت کرتے ہیں۔

(۴) ھدایة الشیعة: یہ رسالہ ایک شیعی عالم کے سوالنامہ کا جواب ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بلافصل ہونا، اماموں کو درجۂ نبوت تک پہونچانا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی میراث فدک وغیرہ کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۵) ھدایة المعتدی: اس رسالہ میں قراءت خلف الامام سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۶) زبدة المناسك: یہ رسالہ حج وعمرہ کے مسائل پر لکھا گیا ہے جو بڑے سائز کے ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) فتاویٰ رشیدیة: یہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، پہلے یہ فتاویٰ تین الگ الگ اجزاء میں تھے اب ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے جن کی ضخامت پانچ سو صفحات ہے زیادہ تر فتاویٰ محفل میلاد اور بدعات وغیرہ کے رد پر ہیں۔

ان کے علاوہ آپ کے شاگرد حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمہ اللہ نے درسی افادات کو قلم بند کیا تھا، چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی کے افادات کو "**لامع الدراری**"، "**الحل المفھم**"، "**الکوکب الدری**" اور "**الفیض السمائی**" کے نام سے بعد میں شائع کر دیا گیا۔(۱)

(۱)　فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۰۹۔ ۲۱۵۔

مولانا مفتی عبدالوہاب ویلوری رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوری رحمہ اللہ کی ولادت شہر ویلور میں یکم جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۹/اکتوبر ۱۸۳۱ء بروز شنبہ ہوئی، تقریباً چار سال کی عمر میں والد محترم جناب مولانا عبدالقادر صاحبؒ کا آبائی وطن آتور میں انتقال ہوگیا، ابتدائی تعلیم گھر محلے میں ہی ہوئی، علوم متداولہ کی تکمیل کے لیے مدراس گئے اور وہاں مولانا قاضی ارتضا علی گوپاموئیؒ کے جانشین مولانا غلام قادر مدراسیؒ کی خدمت میں مسلسل سات سال رہ کر علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد وطن واپس آگئے البتہ تحصیل علم کے شوق نے مکہ معظّمہ کے سفر پر مجبور کیا وہاں جا کر اکابر علماو مشائخ سے علمی و روحانی کمالات سے فیض اٹھایا۔ مکہ معظّمہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے بعض کتب کی تکمیل کی اور فن مناظرہ پڑھا، مولانا سید محمد حسین پشاوری مہاجر مکیؒ سے علم حدیث اور اصول حدیث کی تکمیل کی، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شرف بیعت حاصل کر کے باطنی استفادہ کیا۔ اپنے وطن ویلور واپس آنے کے بعد مولانا شاہ عبداللطیف صاحب نقوی قادری رحمہ اللہ کی ذات گرامی سے اصلاح باطن کی تربیت پا کر اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

اس کے بعد خدمت خلق، خدمت دین اور علوم شریعت کی نشر واشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا، انہی دنوں سفر حیدرآباد کے دوران جب ڈپٹی کلکٹر کا منصب پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے معذرت کردی۔ حیدرآباد سے وطن واپسی کے بعد خدمات کا آغاز وعظ وارشاد سے کیا اور اسے امت مسلمہ کی اصلاح کا ذریعہ بنایا، لیکن مولانا عبدالغنیؒ کے مشورہ سے درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کے ذریعہ علماو مصلحین کی ایک جماعت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جو آگے چل کر مدرسہ باقیات صالحات کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس مدرسہ کے قیام کے پیش نظر ایسے جانباز مخلص رجال کار کی تیاری تھی جو علوم دینیہ کی نشر واشاعت کے ساتھ امت مسلمہ میں اتباع سنت اور رد بدعت پر وسیع پیمانے پر خدمات انجام دے سکیں، ۱۳۰۱ھ میں اس ادارہ نے درس وتدریس کے نئے نظام کے ساتھ مدرسہ باقیات صالحات کا قالب اختیار کیا۔

۱۳۱۴ھ میں اس مدرسہ کا پہلا جلسۂ دستار فضیلت منعقد ہوا جس میں بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو مدعو کیا گیا۔ اس مدرسہ کو جنوب میں ام المدارس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا سید عبدالحئی لکھنویؒ نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ مولانا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے معبر (تمل ناڈو) ملیبار اور جنوبی ہند کے بیشتر علاقوں میں علم دین کی نشر واشاعت کا کارنامہ انجام دیا جب کہ ان علاقوں میں اس علم شریف کے آثار ونقوش محو ہو چکے تھے۔

غرض حضرت کی ذات گرامی سے دعوت وتبلیغ، احیاء دین، تزکیہ واحسان اور رد بدعات کے جو عظیم کارنامے انجام

پائے ان کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی ذات گرامی ایک عہد آفریں شخصیت تھی جن کے تذکرے کے بغیر جنوبی ہند کی دینی وملی تاریخ نامکمل رہے گی۔

مختصر علالت کے بعد ۲۲/ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ بروز شنبہ داعی اجل کو اس حال میں لبیک کہا کہ زبان پر اللہ اللہ کا ذکر جاری تھا اور چہرۂ انور پر سرور وتبسم کے آثار تھے۔

حضرت مولانا عبدالوہاب رحمہ اللہ کی حیات طیبہ کی طویل مدت میں ہزاروں فتاویٰ جاری ہوئے ہوں گے مگران کا ایک ذخیرہ مدرسہ باقیات صالحات کے رجسٹروں میں محفوظ تھا، ان کو پہلے دو نئے رجسٹروں میں بعینہٖ نقل کرایا گیا۔ فتاویٰ عام طور پر جنوب میں بولی جانے والی دکھنی اردو کے اسلوب اور محاوروں پر مرقوم تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب مرتب فتاویٰ باقیات صالحات نے مفہوم ومراد میں ذرا بھی تغیر کئے بغیر صرف اردو زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے

فتاویٰ کی بیشتر تعداد بانیٔ مدرسہ کے دور کی ہیں اور حضرت ہی کے قلم مبارک سے تحریر ہوئے ہیں البتہ چند فتاویٰ دور ثانی یعنی حضرت مولانا ضیاء الدین محمد صاحب کے ہیں۔(۱)

حضرت مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحئی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ کی ولادت سہ شنبہ/۲۶/ذی قعدہ/۱۲۶۴ھ کو مشہور عالم دین حضرت مولانا عبدالحلیم لکھنویؒ کے گھر باندہ شہر میں ہوئی، ولادت کے ساتویں روز عبدالحئی نام رکھا گیا اور بالغ ہوجانے کے بعد کنیت ابوالحسنات تجویز کی گئی، پانچ سال کی عمر میں حفظ قرآن شروع کیا اور دسویں سال حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ اردو فارسی علوم کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کی، علم حدیث، تفسیر، فقہ واصول فقہ اور دیگر علوم کی تکمیل اپنے والد بزرگوار سے کی، البتہ علوم ریاضی کی تکمیل کے لیے اپنے والد کے ماموں اور استاذ حضرت مولانا محمد نعمت اللہ صاحب ماہر ریاضیات کی طرف رجوع کیا، مولانا موصوف فرماتے تھے کہ میں ان کا آخری شاگرد ہوں۔ مولانا نے سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم حدیث وتفسیر، فقہ واصول فقہ، ریاضی وفلسفہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی، اور والد بزرگوار نے اجازت دے دی، والد کے علاوہ دیگر حضرات مثلاً الشیخ الجمال الحنفی المکی، السید احمد دحلان الشافعی المکی، السید محمد بن عبداللہ المدنی حنبلی نے بھی اجازت دی ہے۔

مولانا کو دوران تعلیم سے ہی تصنیف وتالیف کا ذوق وشوق تھا اور یہی وجہ تھی کہ قلیل عرصہ میں مولانا نے درسی کتابوں کی شروح وحواشی اور تعلیقات بے شمار تحریر فرمائیں، جس کا اندازہ بخوبی وہی لگا سکتا ہے، جو اس میدان کا مرد ہو اور ذوق علمی رکھتا ہو اور مشغلہ درس وتدریس ہو کہ حضرت مولانا نے کس قدر جانفشانی اور محنت وکاوش سے یہ گرانقدر سرمایہ اوراق میں جمع کیا ہے اور طالبین کس قدر مستفید ہو رہے ہیں اور مولانا کی یہ خدمت کسی ایک علم کے ساتھ مخصوص

(۱) مقدمۂ فتاویٰ باقیات صالحات: ۴-۲۲۔

نہیں بلکہ نحو وصرف، منطق، حکمت، فلسفہ، تاریخ سے آگے بڑھ کر حدیث وفقہ کی جو خدمات انجام دیں اہل علم اس کو بھلا نہ سکیں گے، حدیث میں موطا امام محمد پر مشہور ومعروف حاشیہ **التعلیق الممجد** کے نام سے ہمیشہ باقی رہنے والی یادگار رہے، فقہ میں جو مولانا کا خصوصی فن تھا اور اسی میں زندگی کے بیش بہا ایام صرف کر دیئے، ایسے نادر ونایاب ذخائر جمع کر دیئے جنھیں کسی زمانہ میں فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، موجودہ دور کے تمام مدارس میں مقبول اور مروجہ کتاب **شرح وقایة** کی بڑی خدمت کی، سب سے پہلے ایک مختصر حاشیہ لکھا، جو حاشیہ قدیم کے نام سے موسوم ہے، اس کے بعد مستقل طور پر مفصل ومدلل شرح تحریر فرمائی جس کو **سعایة** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور پھر ایک حاشیہ **عمدة الرعایة** کے نام سے تحریر فرمایا۔ فقہ حنفی کی مسلمہ کتاب **هدایة** کی بھی خدمت کی اور اس پر حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ بہت سے رسائل حسب ضرورت مختلف موضوعات اور متفرق مسائل پر تحریر فرمائے، جن کے حوالے **شرح وقایة** کے حواشی میں ملتے ہیں، اس کے علاوہ نحو میں **خیر الکلام**، صرف میں **التبیان**، مناظرہ میں **الهدیة المختارة**، منطق میں **رسالة قطبیة** کے حواشی **الزاهد** پر تعلیقات قدیمہ وجدیدہ، دیگر اہم کتابوں میں، **تاریخ ابن الخلان بأبناء علماء هندوستان، الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل، القول الجازم فی سقوط الحد بنکاح المحارم نفع المفتی والسائل بجمع متفرقات المسائل، النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر، طرب الأماثل فی تراجم الأفاضل، زجر الناس علی إنکار أثر ابن عباس ؓ، إمام الکلام فیما یتعلق بالقراءة خلف الإمام، دافع الوسواس فی أثر ابن عباس ؓ، الآیات البینات علیٰ وجوه الأنبیاء فی الطبقات، الآثار المرفوعة فی الأخبار الموضوعه، الفوائد البهیة فی تراجم الحنفیة، أحکام القنطرة فی أحکام البسملة**، وغیرہ قابل ذکر اور قابل استفادہ ہیں، اور بہت سی تالیفات ایسی ہیں جو آج تک طبع ہی نہ ہو سکیں۔ عموماً مولانا کی تالیفات نوے کے قریب بتائی جاتی ہیں۔

مولانا موصوف کو فقہ سے خصوصی تعلق اور ذوق وشوق کے ساتھ ایک حد تک مناسبت بھی تھی جس کا اندازہ مجموعۂ فتاویٰ عبدالحئی سے بخوبی ہو سکتا ہے، جس میں جملہ احکام فقہیہ کو بہت اچھے اور مناسب انداز میں اختصار کے ساتھ مگر مدلل بیان کیا گیا ہے، اور بعض مسائل ضروریہ میں تفصیل بھی ہے، تمام مسائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر مسئلہ کو پہلے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر فقہا کے اقوال وافعال اور ان کی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے۔ (۱)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کی ولادت آخر صفر المظفر ۱۲۶۹ھ مطابق دسمبر ۱۸۵۲ء میں آپ کے نانیہالی

(۱)　مقدمۂ فتاویٰ عبدالحئی: ۴، ۵۔

قصبہ نانوتہ میں ہوئی۔آپ کا آبائی مکان اسی ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ انبیٹھ ہے جو آٹھویں صدی ہجری سے آباد ہوا، اس بستی میں متعدد علما اور اہل کمال پیدا ہوئے۔

آپ کی تعلیم کا رسمی آغاز بزرگ عالم دین اور اپنے نانا مولانا مملوک علی صاحبؒ کے ذریعہ ہوا آپ نے بہت کم عمر میں قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا اور اردو فارسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرلی تھی، گیارہ سال کی عمر میں تعلیم کی غرض سے اپنے چچا مولانا انصار علی کے ساتھ گوالیار چلے گئے اور وہاں ان سے میزان الصرف، صرف میر اور پنج گنج وغیرہ پڑھیں آپ کے والد صاحب گوالیار ہی میں ملازم تھے لیکن کچھ دنوں بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور انبیٹھ واپس ہونے لگے تو آپ بھی والد صاحب کے ساتھ گھر چلے آئے اور گھر پر ہی مولانا سخاوت علی صاحب سے کافیہ تک کی تعلیم حاصل کی۔گھر پر چوں کہ تعلیم کا انتظام زیادہ اچھا نہیں تھا اس لیے آپ نے انگریزی پڑھنے کے لیے اسکول میں داخلہ لے لیا لیکن چھ مہینہ بعد جب محرم ۱۲۸۳ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، جہاں آپ کے ماموں مولانا یعقوب نانوتوی صدر مدرس تھے تو انہوں نے ۱۲۸۵ھ میں آپ کو دارالعلوم میں داخل کردیا، دارالعلوم میں شرح تہذیب وغیرہ پڑھ کر مظاہر علوم چلے گئے وہاں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام وغیرہ پڑھنے کے بعد پھر ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم آکر منطق، فلسفہ، تاریخ وادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر تعلیمی سلسلہ سے فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد مظاہر علوم میں آپ مدرس مقرر ہوئے، مگر چوں کہ آپ کو عربی ادب کا شوق تھا اور اس حوالہ سے آپ مولانا فیض الحسن ادیب سے بے حد متاثر تھے، مولانا فیض الحسن اس وقت لاہور یونیورسٹی میں مدرس تھے، چنانچہ آپ مظاہر علوم چھوڑ کر لاہور تشریف لے گئے، اور مولانا موصوف سے عربی ادب سیکھا اور مقامات حریری، دیوان متنبّی وغیرہ پڑھیں، لاہور سے واپسی کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند اپنے ماموں مولانا یعقوب صاحبؒ کے پاس پہنچے مولانا یعقوب صاحب نے آپ کے عربیت کی ذوق کو مزید فروغ دینے اور تقویت پہونچانے کے لیے عربی کی مشہور کتاب ''قاموس'' کا ترجمہ کرنے کے لیے منصوری بھیج دیا، وہاں ایک دو ماہ قیام کے بعد آپ وطن واپس آگئے اور مدرسہ عربیہ منگلور میں خدمت انجام دینے لگے۔پھر جب مولوی جمال الدین (جو بھوپال میں مدار المہام تھے) نے مولانا یعقوب صاحبؒ کو بھوپال آنے کی دعوت دی تو انہوں نے دارالعلوم چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی جگہ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو ۱۲۹۳ھ میں بھوپال بھیج دیا تاہم بھوپال آپ کے مزاج کے موافق نہیں ہوسکا اور چند ہی ماہ بعد آپ حج کے لیے چلے گئے، حج سے واپسی کے بعد مولانا یعقوب صاحبؒ نے آپ کو بھاول پور بھیج دیا، پھر ۱۲۹۷ھ میں آپ نے دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا اور اس حج سے واپسی کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آپ کو مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا صدر مدرس بنا کر بھیج دیا۔۱۳۰۸ھ میں حضرت گنگوہیؒ کے ارشاد پر آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور بحیثیت استاد دوم (نائب مدرس اعلیٰ) آپ کا تقرر ہوا پھر حضرت گنگوہیؒ کے حکم سے ۵؍ جمادیٰ

الاخریٰ ۱۳۱۴ھ مطابق نومبر ۱۸۹۶ء کو آپ مظاہر علوم تشریف لے گئے اور وہاں صدر مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۲۵ھ میں آپ کو وہاں ناظم بنایا گیا پھر اواخر عمر (شوال ۱۳۴۴ھ) میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

غرض آپ کا علمی تعلق دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور دونوں اداروں سے رہا ہے جس کی وجہ سے دونوں ادارے آپ کو اپنی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور آپ کی خدمات کو بجا طور پر اپنے ایک فاضل کی خدمت تصور کرتے ہیں کیوں کہ احادیث وفقہ کی تعلیم سے فراغت تو آپ نے مظاہر علوم سے حاصل کی تھی لیکن دارالعلوم کے قیام کی ابتدا ہی میں آپ نے دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مختلف کتابیں پڑھیں اور مظاہر علوم سے کتب حدیث پڑھنے کے بعد پھر منطق وفلسفہ اور ادب وتاریخ وغیرہ کی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں آ کر پڑھیں، اس طرح آپ کی تعلیم کا ابتدائی ادارہ بھی دارالعلوم دیوبند ہے اور آپ کی تعلیم کی فراغت بھی دارالعلوم دیوبند ہی سے ہوئی، نیز آپ کی تدریسی زندگی کا بھی بعض حصہ دارالعلوم دیوبند میں اور بعض حصہ مظاہر علوم سہارنپور میں گذرا، اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ دونوں اداروں سے آپ کا تعلق یکساں رہا ہے اور آپ دونوں اداروں کے لیے قابل فخر سپوت کا درجہ رکھتے ہیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا کہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ متعدد علوم وفنون کے متبحر عالم تھے تاہم حدیث وفقہ سے آپ کو خاص مناسبت تھی اور یہ مناسبت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسی فقیہ النفس شخصیت کی سرپرستی اور شفقت و عنایت کی وجہ سے آپ میں پیدا ہوئی تھی۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک مرتبہ دوران سبق طلبہ کے سامنے فقہ میں آپ کے یکتائے روزگار اور یگانۂ زمانہ ہونے کو اس طرح بیان کیا کہ دیکھو پڑھانے والے مدرس بہت ہیں مگر آج فقیہ ایک ہی شخص ہے اور علامہ نے آپ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

إمام قدوة عدل أمين ونور مستبين كالنهار

إليه المنتهىٰ حفظاً وفقهاً وأضحىٰ في الرواية كالمدار

فقيه النفس مجتهد مطاع وكوثر علمه بالخير جار

ماضی قریب کے مشہور عالم ومفکر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی شان تفقہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہمارے اس عہد میں جن چیدہ اور برگزیدہ علما کو اس دولت علم وحکمت دین سے بہرہ وافر ملا، جس کو حدیث میں ”من يرد الله به خيراً يفقه في الدين“ کے عمیق وجامع الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، ان میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ خاص مقام رکھتے ہیں اور اس کے حامل ومتصف کو فقیہ النفس کے لفظ سے ہماری کتابوں میں یاد کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا کی دینی وملی خدمات یوں تو بہت سے اہم عنوانات پر پھیلی ہوئی ہیں تاہم فقہ وفتاویٰ آپ کی خدمات کا ایک خاص مرکز قرار دیا جاسکتا ہے، فقہ وفتاویٰ کا کام آپ نے طالب علمی کے آخری دور اور زمانہ تدریس کے ابتدائی

ایام سے ہی شروع فرما دیا تھا اور آپ کے فتاویٰ پر اساتذہ کو اس قدر اعتماد اور عوام کو ایسا اطمینان ہوتا تھا کہ لوگ کثرت سے آپ کی طرف رجوع ہوتے تھے اور آپ اپنی نوعمری (۲۷؍سال کی عمر) میں ہی اہل فتاویٰ میں شمار ہونے لگے اور آپ کے گہر بار قلم سے ہزاروں مسلمانوں کے مسائل حل ہونے لگے جو مسائل سخت اور پیچیدہ ہوتے تھے اور جنہیں بڑے بڑے جید علما حل نہیں کر پاتے تھے، ایسے وقت میں وہ آپ سے رجوع کرتے تھے یا آپ کی خدمت میں وہ مسائل بھیج دیتے تھے چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ جیسے اساطین بھی آپ سے رجوع کرتے یا آپ کی خدمت میں استفتا بھیج دیتے تھے اور آپ ان سب کا بڑی باریک بینی سے تحقیقی جواب عنایت فرماتے تھے۔

سالہا سال آپ نے مدرسہ مظاہر علوم کے دارالافتاء کی نگرانی وسرپرستی فرمائی اور آپ کے دستخط وتصدیق کے بغیر کوئی فتویٰ وہاں سے جاری نہیں ہوتا تھا، آپ کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ فتاویٰ خلیلیہ (فتاویٰ مظاہر علوم) کے نام سے شائع ہوا ہے جو یقیناً علم وتحقیق کی دنیا کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔

شوال ۱۳۴۴ھ کو آپ ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے تھے، اس کے ڈیڑھ سال بعد ۱۵؍ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۲؍اکتوبر ۱۹۲۷ء کو عمر کی ۷۷ بہاریں گذار کر فالج کے مرض میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور جنت البقیع میں حضرت عثمان ذی النورینؓ کے قریب اور اپنے شیخ عبدالغنی المجددی مہاجر مدنی کے بازو میں مدفون ہوئے۔

آپ کے گہر بار قلم سے بہت سارے موضوعات پر علمی وتحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جن کو اہل علم کے درمیان سند کا درجہ حاصل ہوا، ذیل میں ان کتابوں کا نام اور مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) **مطرقة الكرامة علىٰ مراة الإمامة:** یہ کتاب روافض کے رد میں لکھی گئی تھی جو ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے پہلی مرتبہ اس کی اشاعت ۱۳۲۰ھ میں ہوئی۔

(۲) **المهند على المفند:** آپ نے علماء مدینہ منورہ کے ستائیس سوالات کے جوابات تحریر فرمائے تھے جو ۶۴؍صفحات پر پھیلے ہوئے تھے اس کو کتابی شکل دے دی گئی اور پہلی مرتبہ ۱۳۲۵ھ میں اس کی اشاعت ہوئی۔

(۳) **براهين قاطعة علىٰ ظلام انوار ساطعة:** یہ کتاب رد بدعات میں لکھی گئی ہے جو ۲۷۹ صفحات پر مشتمل ہے اس کی اشاعت ۱۳۰۴ھ میں ہوئی تھی۔

(۴) **إتمام النعم:** یہ دراصل **تبويب الحكم** کا اردو ترجمہ ہے جو سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حکم سے ۱۳۱۳ھ میں آپ نے کیا تھا پھر مولانا عبداللہ گنگوہیؒ نے اس کی شرح وتوضیح کی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا علیہ الرحمہ نے اس پر طویل مقدمہ تحریر فرمایا، اس طرح یہ کتاب ۲۶۸ صفحات میں شائع ہوئی۔

(۵) **هدايات الرشيد:** یہ کتاب بھی روافض کے رد میں لکھی گئی ہے جو ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوئی۔

(۶) سوال از جميع علماء شيعه: علمائے شیعہ سے کئے گئے متعدد سوالات کا مجموعہ ہے جو ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

(۷) تنشيط الأذهان في تحقيق محل الأذان: خطبۂ جمعہ کی اذان مسجد کے اندر دی جائے یا باہر اس سلسلہ میں یہ ایک تحقیقی اور تفصیلی مقالہ ہے۔

(۸) بذل المجهود في حل أبي داؤد: اس کتاب کو مولانا کا بڑا علمی کارنامہ قرار دیا گیا ہے، ربیع الاول ۱۳۳۵ھ سے شعبان ۱۳۴۵ھ تک دس سال کے طویل عرصہ میں آپ نے اس کام کو مکمل فرمایا، یہ کتاب پانچ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے جس کے صفحات کی تعداد ۱۹۳۸ ہے۔

(۹) فتاویٰ خليليه: آپ کے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو آپ نے مظاہر علوم کے دار الافتاء سے جاری فرمائے تھے اسی لیے اس کو فتاویٰ مظاہر علوم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اس کو مولانا سید محمد خالد نے مرتب کیا ہے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ:

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کا تاریخی نام ظفر الدین تھا، دیو بند ضلع سہارنپور میں ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے، والد گرامی مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دار العلوم کے بانیوں میں تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ (مہتمم دار العلوم دیوبند) کے آپ بڑے بھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے علاتی بھائی تھے۔

قاعدہ اور ناظرہ قرآن شریف کی تعلیم اپنے گھر میں ہی والد صاحب سے حاصل کی، پھر ۱۲۸۴ھ میں جب دار العلوم دیوبند میں درجہ حفظ قرآن شریف جاری ہوا تو ان کو دار العلوم کے اس درجہ میں داخل کر دیا گیا اور ۱۲۸۷ھ میں قرآن مجید حفظ مکمل کر لیا، حفظ کی تکمیل کے بعد دار العلوم ہی میں درس نظامی کی مکمل تعلیم حاصل کی اور ۱۲۹۵ھ میں بخاری شریف، مسلم شریف وغیرہ کا امتحان دے کر دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی، تاہم ۱۲۹۷ھ تک دار العلوم ہی میں تعلیم و تعلم کا مزید سلسلہ جاری رکھا اور تمام علوم عربیہ کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۲۹۹ھ میں کچھ عرصہ دار العلوم ہی میں معین المدرسین کی حیثیت سے تدریسی خدمت انجام دیتے رہے اس دوران مولانا یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں فتاویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دی، پھر ۱۳۰۰ھ میں مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ (میرٹھ) مدرس بنا کر بھیج دیئے گئے، وہاں انہوں نے کئی سال تک تدریسی خدمت انجام دی، ۱۳۰۹ھ میں اکابر دار العلوم نے نائب مہتمم کی حیثیت سے نام پیش کیا اور دار العلوم آ گئے پھر ایک سال بعد یہاں مفتی اور مدرس مقرر کئے گئے۔

افتا کا کام فراغت کے بعد دار العلوم میں معین مدرس کے زمانہ سے ہی شروع کر دیا تھا، اس وقت افتا کا کام حضرت

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۱۶-۲۲۶۔

مولانا یعقوب صاحبؒ (صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) کی نگرانی میں کیا کرتے تھے، پھر جب ۱۳۰۹ھ میں نائب مہتمم کی حیثیت سے دارالعلوم لائے گئے، اس وقت آپ تدریس اور انتظامی امور کے ساتھ افتا کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور بالآخر جب ۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مستقل دارالافتاء قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے وہ تمام جوہر جو ایک ذمہ دار مفتی میں درکار ہیں آپ کے اندر دیکھ کر دارالافتاء کا صدر مفتی نامزد کیا تو آپ نے نیابت اہتمام کا انتظامی کام چھوڑ کر مستقل فتاویٰ نویسی کی خدمت شروع کردی، اس کے بعد تو فتاویٰ نویسی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گیا اور موت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے تقریباً چالیس سال دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں خدمت انجام دی، اس عرصہ میں بڑے بڑے پیچیدہ اور مشکل سوالات کے جواب قلمبند فرمائے، سیکڑوں فتاویٰ ایسے بھی تحریر فرمائے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآراء مہمات میں محاکمہ کی حیثیت رکھتے ہیں، سفر میں بھی دارالافتاء کی ڈاک آپ کے ساتھ رہتی تھی اور مراجعت کتب کے بغیر اپنی خداداد ذہانت اور بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے بے تکلف فتاویٰ لکھاتے رہتے تھے، تاریخ دارالعلوم میں آپ کی شان تفقہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''یوں تو فتاویٰ ہر زمانہ میں لکھے گئے ہیں مگر فتاویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا یہ کمال جماعت دیوبند میں صرف تین ہی شخصیتوں کے حصہ میں آیا تھا ایک حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، دوسرے حضرت مفتی صاحبؒ اور تیسرے حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ''۔(۱)

۱۳۴۷ھ میں مفتی صاحبؒ چند ماہ کے لئے جامعہ ڈابھیل بخاری کا درس مکمل کرنے تشریف لے گئے تھے جمادیٰ الاخریٰ میں وہاں سے واپس دیوبند تشریف لا رہے تھے کہ راستہ میں طبیعت خراب ہوگئی، اسی علالت میں ۱۷ر جمادیٰ الثانی ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء کی شب میں انتقال ہوا دوسرے دن جنازہ ہوا، نماز جنازہ مولانا اصغر حسین صاحبؒ نے پڑھائی اور مزار قاسمی دیوبند میں تدفین عمل میں آئی۔

فتاویٰ نویسی کے اس مہتم بالشان کام اور دارالعلوم کے بعض ذمہ داریوں کی وجہ سے مستقل تصنیف وتالیف کا وقت نہیں مل سکا، تاہم آپ کے علمی سرمایہ میں گہربار قلم سے لکھے گئے وہ بیش قیمت فتاویٰ ہیں جو دارالعلوم کے دارالافتاء سے جاری فرمائے، ان میں سے ۱۸۔۱۹ر سال (۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۷ھ تک) کے فتاویٰ تو بالکل محفوظ نہیں رہ سکے اور ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۳۲ھ تک کے بعض ہی فتاویٰ کی نقل محفوظ کی جاسکی، ۱۳۳۳ھ کے بعد سے فتاویٰ کی نقل رکھنے کا باضابطہ اہتمام کیا گیا، چنانچہ ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۳۴ھ تک لکھے گئے فتاویٰ کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور عزیز الفتاویٰ کے نام سے مرتب کیا تھا جو پہلے آٹھ جلدوں میں تھی، اب سات سو چون (۷۵۴) صفحات پر مشتمل ایک ضخیم جلد میں ''فتاویٰ دارالعلوم یعنی عزیز الفتاویٰ'' کے نام سے طبع شدہ ہے

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند: ۲ر۴۷۔

اوراس کی دوسری جلد میں خود مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتاویٰ ہیں جس کو ''فتاویٰ دارالعلوم یعنی امداد المفتیین'' کا نام دیا گیا ہے۔(۱)

مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کے کل چودہ ضخیم رجسٹروں میں سے مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے صرف دو رجسٹروں کو مرتب فرمایا تھا بارہ رجسٹر باقی تھے، ان کے باقی فتاویٰ کو مفتی ظفیر الدین مفتاحی علیہ الرحمہ نے بارہ ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا اور ہر مسئلہ کا حوالہ اور عربی کتابوں کی عبارت بھی نقل کر دی ہے جس کی وجہ سے ان فتاویٰ کے استناد و اعتماد میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ان بیش قیمت فتووں کے علاوہ تفسیر جلالین کا اردو ترجمہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے رسالہ میزان البلاغہ کا حاشیہ بھی علمی سرمایوں میں ہے۔(۲)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی پیدائش ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہارشنبہ کو صبح کے وقت ہوئی پیدائشی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یوپی) ہے، تاریخی نام کرم عظیم اور والد کا نام شیخ عبدالحق تھا، سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں ہوئی۔ ۱۲۹۵ھ میں جب عمر ۱۵/سال کی تھی، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جیسے اکابر اور اساطین امت سے استفادہ کا موقع ملا، دارالعلوم دیوبند میں پانچ سال قیام کیا، اس دوران علوم عقلیہ ونقلیہ کی مختلف کتابیں پڑھنے کے ساتھ مولانا یعقوب صاحبؒ سے فتاویٰ نویسی کی بھی تربیت حاصل کی۔ ۱۳۰۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام کانپور تشریف لے گئے، پھر کچھ عرصہ بعد وہیں مدرسہ جامع العلوم میں ۱۳۱۵ھ تک خدمت انجام دی، درس و تدریس اور افتا کے علاوہ اصلاحی کام بھی خوب کیا، شہر کانپور بدعات وخرافات کا گڑھ بنا ہوا تھا، مسلسل اور مخلصانہ جدوجہد سے اس میں بڑی حد تک کمی آئی۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اپنے دور کے مجدد تھے، ٹھیک چودہویں صدی کے آغاز میں دینی واصلاحی خدمات کی شروعات کی اور پوری زندگی اسی میں لگے رہے اور دین کے تمام پہلوؤں سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ وہ محدث، فقیہ، مفسر، واعظ، مصنف اور صوفی تھے۔ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، اعلاء السنن کے مقدمہ میں مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے کثیر التصانیف اور ہمہ جہت لکھنے والے مصنف تھے، تقریباً ایک ہزار چھوٹی بڑی مطبوعات چھوڑی ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت گنگوہیؒ

(۱)　عزیز الفتاویٰ: ۱/۵۔

(۲)　فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۲۷-۲۳۱۔

کے توسط سے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بذریعہ مراسلت ۱۲۹۹ھ میں غائبانہ بیعت ہو گئے تھے، پھر ۱۳۰۱ھ کے اواخر میں حج سے فارغ ہو کر حاجی صاحب کی خدمت میں چند دنوں قیام فرمایا۔ پھر دوبارہ ۱۳۰۷ھ میں حج کیا اور ایک مدت تک حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا، پھر واپس آ کر کانپور ہی میں رہے، لیکن صفر ۱۳۱۵ھ میں حاجی صاحب کے مشورہ سے تھانہ بھون چلے آئے اور یہیں ''پیر محمد والی مسجد'' میں قیام فرمایا اور اخیر تک وہیں رہے، جہاں سے متعدد تصنیفی خدمات انجام دیں، یہ مسجد بیک وقت مدرسہ، دار المصنفین، دار المبلغین، خانقاہ اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی تربیت گاہ تھی۔

۱۳۲۰ھ میں آپ کو دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا اور حضرت شیخ الہند کی وفات کے چند سالوں بعد دار العلوم کا سرپرست منتخب کیا گیا۔

حضرت حکیم الامتؒ کی خدمات یوں تو ہمہ جہت ہیں لیکن فقہ اور تصوف میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، چنانچہ فقہ میں مہارت کی بنا پر طالب علمی کے زمانہ سے ہی حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ کی رہنمائی میں فتاویٰ نویسی شروع کر دی تھی، پھر جب کانپور تشریف لے گئے تو وہاں بھی نمایاں طور پر افتا کی خدمت انجام دی اور آخر میں جب قیام تھانہ بھون میں تھا تو یہاں بھی کثرت سے استفاءات کے جوابات تحریر فرمایا کرتے تھے، اس کے علاوہ فقہ میں گرانقدر تصانیف بھی ہیں۔ فقہ و فتاویٰ میں آپ کے کام کا جو طریقہ تھا اس کا مختصراً ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) فقہی مسائل میں نصوص سے اعتناء علماء دیوبند کی خصوصیت رہی ہے چنانچہ آپ میں بھی یہ وصف بدرجہ اتم پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ نص قرآنی کے احکام کے استنباط کے سلسلہ میں باضابطہ **دلائل القرآن علی مسائل النعمان** اور نص حدیث سے مسائل کے استنباط کے تعلق سے **إعلاء السنن** لکھنے کا مستقل ارادہ فرمایا تھا جس کو شاگردوں نے مکمل کیا۔

(۲) فقہا کی جزئیات سے عموماً نہیں ہٹتے تھے اور فقہ و فتاویٰ میں اجتہادی شان رکھنے کے باوجود اپنی انفرادی رائے اختیار کرنے کو نا پسند کرتے تھے۔

(۳) جس مسئلہ میں صریح جزئیہ نہ ملے وہاں اصول و قواعد کی روشنی میں جواب تو لکھ دیتے تھے مگر تنبیہ ضرور کر دیتے تھے کہ یہ جواب اس بنیاد پر ہے کہ صریح جزئیہ نہیں ملا، اس لیے دوسرے سے بھی مراجعت کر لی جائے اور اختلاف ہو تو مطلع کیا جائے۔

(۴) آلات جدیدہ اور معاملات جدیدہ میں ابتلاء عام اور یسر و سہولت کے پہلو کو ہمیشہ سامنے رکھتے تھے تا کہ لوگ شریعت سے متنفر ہو کر حرام میں نہ پڑ جائیں۔

(۵) یسر و سہولت اور ابتلاء عام پر نظر رکھتے ہوئے بسا اوقات مذہب کی ضعیف سے ضعیف روایت کو اختیار کر لیتے تھے۔

(۶)　اگر مذہب میں یسر و سہولت کی گنجائش نہ ہوتو دوسرے ائمہ متبوعین کے مذاہب سے بھی استفادہ کرتے تھے اور اس کو **عدول عن الدین إلی الدین** قرار دیتے تھے چنانچہ **الحیلة الناجزة** اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

(۷)　پیچیدہ مسائل میں ہمیشہ علماء عصر سے رجوع کرتے تھے، شروع میں حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ سے، پھر حضرت گنگوہیؒ سے رجوع ہوتے رہے اور حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد اپنے شاگردوں سے بھی مشورہ کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔

(۸)　حاضرین اور علما کو بھی بار بار تاکید کرتے تھے کہ میرے کسی فتویٰ اور تحقیق سے کسی کو اختلاف ہوتو اس پر ضرور متنبہ کیا جائے اور متنبہ کئے جانے پر اپنی رائے سے رجوع کر لیتے تو اس کو خانقاہ سے نکلنے والے ماہنامہ ''النور'' میں شائع بھی کر دیتے تھے اور اس کے لیے ایک مستقل عنوان ''**ترجیح الراجح**'' کا ہوا کرتا تھا، جس کو بعد میں مجموعۂ فتاویٰ میں ''تصحیح امداد الفتاویٰ'' اور ''اصلاح تسامح'' کے عنوان سے شامل کیا گیا تھا، یہ بھی فرماتے تھے کہ بندہ نے آئندہ کے لیے ایک کافی جماعت اہل علم و دیانت کی اس کام کے لیے مخصوص کر دی ہے کہ میری تمام تحریرات کو نظر تنقید سے دیکھ لیا جائے جو ان کی رائے میں قابل اشاعت نہ ہو ان کو حذف کر دیں یا نشان بنا دیں تاکہ ان کو کوئی شائع نہ کر دے۔

(۹)　نئے مسائل میں امت کی رہنمائی کے لیے باضابطہ ''**حوادث الفتاویٰ**'' کے عنوان سے مسائل لکھے جو مجموعۂ فتاویٰ میں شامل ہیں۔

(۱۰)　ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اپنی ذات و عمل سے متعلق کوئی مسئلہ پیش آتا تو احتیاط کی وجہ سے اپنے فتویٰ پر عمل نہیں کرتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں دوسرے ارباب افتا سے فتویٰ لے کر عمل کرتے تھے اگرچہ وہ دوسرے چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

فقہ و فتاویٰ اور تصوف و سلوک کا یہ روشن چراغ ۸۲/سال ۳/ماہ ۱۰/روز، روشن رہ کر ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹/جولائی ۱۹۴۳ء دس بجے شب اپنی روشنی کا سفر دوسروں کے حوالہ کر کے ہمیشہ کے لئے جوار رحمت میں چلا گیا، نماز جنازہ آپ کے بھانجے اور اعلاء السنن کے مؤلف مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے پڑھائی، وفات سے قبل ایک زمین لے لی تھی اور اس کو قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا گیا تھا، جس میں راہ گزاروں کے پانی کا ایک کنواں، چھوٹا سا سائبان اور ایک چھوٹا سا احاطہ بنا دیا گیا تھا جس میں کچھ درخت بھی لگا دیئے گئے تھے، اسی احاطہ میں دوسرے اعزہ اور خدام کے ساتھ آسودہ خواب ہیں۔

مختلف اسلامی موضوعات پر تقریباً ایک ہزار تصانیف چھوڑی ہیں اور ہر تصنیف اپنے اندر جو علمی گہرائی و گیرائی اور وسعت رکھتی ہے اس کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے ذیل میں چند تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) **بیان القرآن:**　اردو زبان میں یہ مختصر مگر جامع ترین تفسیر ہے اس میں بہت سی تفسیروں کا لب لباب اور خلاصہ

پیش کیا گیا ہے، آیات کی تشریح کے علاوہ نحوی بحث، بلاغت کی باریکیاں، فقہی مسائل، کلام کی بحث اور تصوف وسلوک پر مختصر نوٹ لکھا گیا ہے یہ تفسیر اس وقت دو ضخیم جلدوں میں چھپی ہوئی ہے۔

(۲) جمال القرآن: یہ فن تجوید میں اعلیٰ معیار کی کتاب کہلاتی ہے۔

(۳) التقصیر فی التفسیر: حضرت حکیم الامت کی نظر میں کچھ ایسی تفسیریں آئیں جن کے مشمولات اصول تفسیر سے ہٹے ہوئے تھے جس کی وجہ سے آپ نے یہ کتاب لکھی جس میں صحیح اصول تفسیر کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کو نہ برتنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) جامع الآثار (عربی): فقہ حنفی پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے کہ اس میں صرف قیاس ہی قیاس ہے، نصوص سے اس کا بہت کم تعلق ہے، اس اعتراض کو غلط ثابت کرنے کے لیے حضرت تھانویؒ نے پہلے ''إحیاء السنن'' کے نام سے فقہ حنفی کے مستدلات کو جمع فرمایا مگر طباعت سے پہلے ہی وہ ضائع ہو گیا پھر دوبارہ اس کام کو تھوڑا نہج بدل کر کیا کہ احادیث کی سند کی حیثیت اور وجہ استدلال بھی بیان کی اور اس کا نام ''جامع الآثار'' رکھا، نیز جو احادیث فقہ حنفی کی مستدلات سے بظاہر متعارض معلوم ہو رہی تھیں ان کو حاشیہ میں نقل کر کے ان کا جواب بھی لکھا اور اس کو ''تابع الآثار'' کا نام دیا، اسی سلسلہ کو وسعت دیتے ہوئے اپنے شاگرد مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ سے ''إعلاء السنن'' لکھوائی جو ۱۸ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۵) التشرف بمعرفة أحادیث التصوف (عربی): تصوف کے سلسلہ میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی تھی بعض لوگ اس کو بالکل لغو سمجھ کر مسترد کر دے رہے تھے جب کہ بعض لوگوں نے اس میں غلط چیزوں کی بھی آمیزش کر دی تھی، اس سلسلہ میں آپ نے تجدیدی خدمت انجام دی اور مثبت انداز میں تصوف کا صحیح اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا اور عملاً اس کو برتا بھی، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں صحیح تصوف کو احادیث رسول سے ثابت کیا گیا ہے۔

(۶) الأکسیر فی إثبات التقدیر۔

(۷) حفظ الإیمان: یہ کتاب بدعات اور عقائد باطلہ کے رد میں لکھی گئی ہے۔

(۸) الانتباهات المفیدة فی الاشتباهات الجدیدة۔

فقہ میں آپ کی کتابیں تین درجن کے قریب ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں:

(۹) امداد الفتاویٰ: یہ آپ کے بیش قیمت فتاویٰ کا مجموعہ ہے اولاً ۱۳۲۵ھ تک کے فتاویٰ جمع کئے گئے تھے، جن میں دار العلوم دیوبند، جامع العلوم کانپور اور تھانہ بھون تینوں زمانہ کے فتاویٰ کو جمع کیا گیا تھا، ۱۳۲۵ھ کے بعد کے فتاویٰ ''تتمۂ امداد الفتاویٰ'' کے نام سے شائع ہوتے رہے مگر وفات کے بعد ۱۳۷۱ھ میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مولانا ظہور احمد صاحب کے تعاون سے نئی ترتیب وتبویب کے ساتھ اسے چھ جلدوں میں مرتب کیا، یہ فتاویٰ اپنی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے ہند و پاک اور بنگلہ دیش بلکہ عالم اسلام کے تمام اردو داں علما کے لئے مرجع وماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۱۰) التحقيق الفريد فی حكم آلة تقريب الصوت البعيد۔

(۱۱) تفصيل الكلام فی حكم تقبيل الأقدام۔

(۱۲) كشف الدجیٰ عن وجه الربا: دولت آصفیہ حیدر آباد کے محکمہ شرعیہ سے سود کی حقیقت اور اس کے دنیاوی واخروی مفاسد کے سلسلہ میں آپ کے پاس سوالات آئے تھے یہ رسالہ انہیں سوالات کا تحقیقی و تفصیلی جواب ہے۔

(۱۳) تحذير الإخوان عن الربا فی هندوستان۔

(۱۴) رفع الضنك عن منافع البنك۔

(۱۵) الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة: مفقود الخبر شخص کی بیوی کے بارے میں فقہ حنفی کے اندر احتیاط کی وجہ سے فی زمانہ بہت سختی اور دشواری معلوم ہوتی تھی جس کی وجہ سے بعض عورتیں اسلام ترک کر دینے اور دوسرا مذہب اختیار کرنے پر مجبور ہو رہی تھیں اور پنجاب کے بعض علاقوں سے اس قسم کے واقعات کی خبریں بھی آ چکی تھیں جس کی وجہ سے آپ نے فقہ حنفی کے مناسب جزئیات کے ساتھ فقہ مالکی کو بنیاد بنا کر ایسی عورتوں کے لیے یسر و سہولت کا پہلو اختیار کیا۔

(۱۶) خلاصة الكلام فی أذان الجمعة بين يدی الإمام۔

(۱۷) القول البديع فی اشتراط المصر للتجميع۔

تصوف وسلوک اور دیگر موضوعات پر آپ کی چند کتابیں یہ ہیں۔

(۱۸) مسائل السلوك من كلام الملوك: اس میں تصوف وسلوک کے بہت سے مسائل کو قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے، یہ رسالہ ''بیان القرآن'' کے حاشیہ پر چھپا ہے۔

(۱۹) التكشف عن مهمات التصوف۔

(۲۰) قصد السبيل إلى المولى الجليل۔

(۲۱) إصلاح الرسوم: اس کتاب میں آپ نے معاشرہ میں پائی جانے والی بہت سی رسموں کا ذکر کر کے اس سلسلہ میں شریعت کا حکم بیان کیا ہے، اسی طرح کی ایک کتاب ''اغلاط العوام'' کے نام سے بھی لکھی ہے۔

(۲۲) آداب المعاشرة۔

(۲۳) إصلاح انقلاب الامة: اس کتاب میں عبادات، معاملات، احوال شخصیہ، احوال اجتماعیہ وغیرہ کو جمع کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں امت اور مصلح امت علما کی کمیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے نیز اپنی زندگی اور معاشرہ میں صحیح اسلامی انقلاب کے راستہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

(۲۴) نشر الطيب فی ذكر النبی الحبيب: سیرت کے موضوع پر دریائے عشق ومحبت میں ڈوب کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔(۱)

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۳۲-۲۴۳۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی ولادت محلّہ ''سن زئی''، ضلع شاہجہاں پور، یوپی میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں ہوئی، ۱۹۰۳ء کے بعد دہلی منتقل ہو گئے اور مستقل وہیں سکونت اختیار کرلی۔

ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف کے مشہور مدرسہ اعزازیہ میں حافظ بدھن خاں اور مولانا عبدالحق خاں صاحب سے حاصل کی پھر مدرسہ قاسم العلوم شاہی مرادآباد تشریف لے گئے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف گئے تو اس وقت ابتدائی استاذ مولانا عبدالحق خان مدرسہ اعزازیہ سے الگ ہوکر عین العلم کے نام سے اپنا مدرسہ قائم کر چکے تھے چنانچہ استاذ نے اسی مدرسہ میں رکھ لیا اور تقریباً پانچ چھ سال وہاں تدریسی خدمت انجام دی، دارالعلوم دیوبند میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا امین الدین اورنگ آبادیؒ ہم درس اور مشہور ساتھیوں میں تھے، جن میں مولانا امین الدین نے دہلی میں مدرسہ امینیہ قائم کرلیا تھا اور ان کا برابر اصرار تھا کہ مدرسہ امینیہ تشریف لے آئیں، چنانچہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں مدرسہ امینیہ دہلی تشریف لے آئے اور یہاں صدر مدرس و مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگے، رفتہ رفتہ بانی مدرسہ نے اپنی ذمہ داریاں کم کرلیں اور اعتماد کر کے ذمہ داریاں آپ کے سپرد کرتے رہے، پھر بانی مدرسہ مولانا امین الدین صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۲۰ء میں مدرسہ کے مکمل ذمہ دار بن گئے اور اخیر عمر تک اسی ادارہ میں تدریس و افتا کی خدمت انجام دیتے رہے، تدریس اور افتا کی زندگی نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔

آپ محدث، مفسر، فقیہ، محقق، مصنف، عربی، اردو، فارسی کے بہترین شاعر اور سیاسیات میں خاص ذوق و بصیرت کے مالک تھے، آپ کا دور انتہائی پرآشوب دور تھا، اس لیے اپنے کو مسند درس اور منصب افتا میں محدود کرنے کے بجائے مختلف دینی و ملی خدمات میں مشغول کیا، خاص کر سیاسیات اور افتا میں آپ کی خدمت ناقابل فراموش ہے، چنانچہ مولانا ظہور علی (بھوپال) لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۲ء تک کوئی سیاسی اور مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حضرت مفتی صاحب کی رہبری پوری صداقت و صفائی کے ساتھ نظر نہ آئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے بھی پہلے آپ کی سیاسی سرگرمی شروع ہوگئی تھی چنانچہ آپ زمانۂ طالب علمی ہی میں ''جمعیۃ الانصار دیوبند'' کے رکن اور معاون تھے اسی طرح ۱۹۱۷ء میں ''انجمن اعانت نظربندان اسلام'' قائم ہوئی تو آپ اس کے داعیوں اور بانیوں میں تھے، ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور تحریک خلافت میں بھی بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، نیز پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد جب برٹش گورنمنٹ نے جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا اور اہل ہند کو

دھوکہ دینے کے لیے اسے جشن صلح کے نام سے ہندوستان میں منانا چاہا تو اس کے خلاف ''انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح'' قائم ہوئی، جس کے پس منظر میں سب سے بڑی کارگذار شخصیت آپ ہی کی تھی اس کے علاوہ سیاسیات پر آپ کے مختلف فتاویٰ اور مضامین مختلف اخبارات میں چھپتے رہے۔

۱۹۱۹ء میں جب ''جمعیۃ علماء'' قائم ہوئی تو آپ کی ان ہی سیاسی سرگرمیوں اور سیاسی بصیرت کے پیش نظر اس موقر تنظیم کا آپ کو پہلا صدر منتخب کیا گیا اور ۱۹۳۹ء میں اس منصب سے علاحدگی کے باوجود آپ جمعیۃ سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ برابر جمعیت کے سرگرم رکن رہے اور اکابر نے ذمہ داران جمعیت کو خاص تلقین کی تھی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کو کبھی بھی جمعیت سے علاحدہ ہونے نہ دیا جائے اور اس کی وجہ اعلیٰ سیاسی بصیرت تھی، چنانچہ آپ کے استاذ گرامی شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں کہ بیشک تم لوگ سیاستداں ہو لیکن مولوی کفایت اللہ کا دماغ سیاست ساز ہے۔

سیاست کے علاوہ فرق باطلہ کے رد میں بھی آپ کی نمایاں خدمت رہی ہے، چنانچہ قادیانیت کے رد میں باضابطہ ''البرھان'' نامی رسالہ جاری کیا جس کے ایڈیٹر بھی آپ ہی تھے اور مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لیے ''جمعیۃ علماء ہند'' میں ایک نیا شعبہ ''شعبۂ تبلیغ'' بھی قائم کیا جس کے مبلغین کو مختلف دیہاتوں میں بھیجا کرتے تھے۔

مختلف علوم وفنون کے ساتھ فقہ وفتاویٰ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا اور مختلف دینی وملی سرگرمیوں کے ساتھ خدمت افتا مشغلہ رہا، حتیٰ کہ سیاسیات میں بھی فقہ وفتاویٰ کی لائن سے بڑی خدمات انجام دیں چنانچہ فتاویٰ کے مجموعے میں سیاسیات کا ایک مستقل باب موجود ہے۔

آپ کے ہم عصر اور اکابر علما کو بھی آپ کی شان تفقہ کا اعتراف اور فتاویٰ پر اعتماد تھا چنانچہ جب ترک موالات کا فتویٰ لکھنا تھا تو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے جن دو تلامذہ پر اعتماد کیا تھا ان میں پہلا نام آپ ہی کا تھا اور ترک موالات پر مفصل فتویٰ تحریر کیا، اسی طرح علی گڑھ کے طلبہ کی طرف سے جب استفتا آیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا جواب آپ ہی سے لکھوایا تھا جس پر شیخ الہندؒ نے صرف نظر ثانی فرمائی تھی اور دستخط کر کے بھیج دیا تھا۔

عام فقہی مسائل میں فتویٰ لکھنا کسی قدر آسان ہوتا ہے کہ اس کی عبارتیں بھی فقہ کی کتابوں میں مل جاتی ہیں اور اس کا اثر بھی کسی کی ذاتی زندگی یا حلقہ تک محدود ہوتا ہے، لیکن آپ کا دور انتہائی پر آشوب اور ہنگاموں کا دور تھا، آپ کے پاس زیادہ تر ملکی اور سیاسی معاملات میں استفتاءات آتے تھے جس کا جواب لکھنے کے لئے اصل معاملات کو سمجھنے کے ساتھ علم میں گہرائی اور مختلف علوم وفنون میں مہارت درکار ہوتی ہے، الحمدللہ آپ نے اس فریضہ کو بڑے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا چنانچہ ملک کے نامور عالم اور آپ کے شاگرد مولانا سعید احمد اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ کافی غور وخوض اور تفکر وتدبر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے تھے اور اس تفکر کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو اور پھر ان کا فیصلہ ایسا اٹل اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوا دینا ممکن نہ تھا۔

آپ کے فتاویٰ کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان میں تھی، بلکہ جاوا، سماترا، برما، ملایا، چین، بخارا، سمرقند، بلخ، بدخشاں، ختن، تاشقند، ترکستان، افغانستان، ایران، افریقہ، امریکہ اور انگلستان وغیرہ سے بھی سوالات آتے تھے اور آپ کے جوابات لوگوں کے لیے سرمۂ چشم اور سنگ میل ثابت ہوتے تھے۔

آپ کے فتاویٰ کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ جواب بہت مختصر لکھتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ ایجاز واختصار کے بادشاہ تھے، آپ کا جواب جتنا مختصر ہوتا تھا اتنا ہی پرمغز بھی ہوتا تھا اور اختصار کے باوجود مسئلہ کا کوئی پہلو آپ سے چھوٹتا نہیں تھا البتہ لمبی لمبی فقہی عبارت نقل کرنے کے عادی نہیں تھے۔

آپ کے فتاویٰ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا جواب مستفتی کے سوال سے مربوط ہونے کے باوجود مستقل حیثیت رکھتا تھا یعنی جواب سمجھنے کے لیے مستفتی کے سوال کو پڑھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ مستفتی کے سوال کو حذف کر دیا جائے یا کوئی شخص عدم فرصتی کی وجہ سے سوال نہ پڑھ سکے تو بھی اس کے سامنے مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

آپ کے فتاویٰ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ ہمیشہ دوٹوک فتاویٰ لکھتے تھے چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں دول متحدہ کو فتح حاصل ہوئی اور ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو برطانیہ اور اس کے مقبوضات ونوآبادیات میں جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا گیا تاہم اہل ہند کے بارے میں انگریزوں کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ترکی کے حامی اور خلافت تحریک کے مؤید ہیں اور ترکی کی شکست کی وجہ سے جشن فتح میں شریک نہیں ہوسکیں گے اس لیے باشندگان ہند کو فریب دینے کے لیے ہندوستان میں اس جشن کو جشن صلح کے نام سے منانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اس وقت کے بیدار مغز علما اور حریت پسند افراد نے اس کی مخالفت کی، اس موقع سے آپ نے اس جشن کے خلاف ایک انجمن بھی قائم کی اور اس کے خلاف بیانات بھی دیئے، اسی موقع سے خلافت کمیٹی کے سکریٹری جناب آصف علی نے آپ سے ایک فتویٰ طلب کیا اور پھر آپ کے جواب کی توثیق وتائید میں پنجاب، سندھ، یوپی، بہار وغیرہ کے بہت سے علما نے بھی دستخط فرمائے، فتویٰ کی دوٹوک عبارت یہ ہے:

’’بہ حالت موجودہ مسلمان تاوقتیکہ معاملات کا صحیح فیصلہ شرعی نقطۂ نظر سے ان کے جذبات کے موافق نہ ہو جائے، جشن صلح یا فتح کی خوشی اور مسرت میں شریک ہونا قطعاً ناجائز ہے‘‘۔

فتاویٰ نویسی کی ابتدا ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء سے ہوئی اور آخری عمر تک ۵۴ سال اپنے کو اس مشغلہ میں لگائے رکھا اور امت کی شرعی رہنمائی فرماتے رہے حتیٰ کہ قید وبند کے زمانہ میں بھی یہ مشغلہ نہیں چھوٹا۔

۳۱/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء اور یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب ساڑھے دس بجے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطہ کے قریب جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔

مختلف تحریکوں اور تنظیموں سے وابستگی اور امت کے امور میں مشغولیت نے آپ کے گہربار قلم کو روک سا دیا تھا اس

لیے آپ کی تصنیف زیادہ نہیں ملتی، تاہم اس کثرت اشتغال کے باوجود جو علمی و قلمی سرمایہ چھوڑا وہ درج ذیل ہے:

(۱) کفایت المفتی (۹ر جلدیں): سب سے بڑا قلمی سرمایہ آپ کے گہر بار قلم سے لکھے گئے آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے مرتب کیا، اس کی کل ۹ر جلدیں ہیں، لیکن چونکہ ہمیشہ آپ کے فتاویٰ کی نقل محفوظ نہ کی جاسکی، اس لیے تمام فتاویٰ اس مجموعہ میں نہیں آسکے، یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فتاویٰ نویسی کی پچپن سالہ زندگی میں سے زیادہ پچیس سال کے فتاویٰ ہی کو جمع کیا جاسکا ہے، ورنہ ۹ر جلدوں کے بجائے ۱۹ر جلدیں ہوسکتی تھیں چنانچہ خود مرتب فتاویٰ لکھتے ہیں:

''۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء سے فتویٰ لکھنا شروع کیا اور ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں دہلی تشریف لائے لیکن مدرسہ امینیہ میں نقول فتاویٰ کا سب سے پہلا رجسٹر ربیع الاول ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء سے شروع ہوتا ہے یعنی چھتیس (۳۶) برس فتویٰ لکھنے کے بعد نقول فتاویٰ کا انتظام ہوا مگر یہ انتظام بھی ناکافی وناقص تھا......مدرسہ کے رجسٹر میں آخری فتویٰ ۱۹۴۴ء کا ہے اس کے بعد آپ کی وفات تک آٹھ برس کے زمانہ میں صرف پچیس فتاویٰ درج ہوئے....اندراج فتاویٰ کے لیے کوئی مستقل محرر کبھی نہیں رکھا......۔

مدرسہ امینیہ کے ساتھ جمعیۃ علما کے دارالافتاء کے بھی صدر مفتی تھے اور ''سہ روزہ الجمعیۃ'' میں ''حوادث واحکام'' کے عنوان سے فتاویٰ شائع ہوتے تھے مگر الجمعیۃ کا ریکارڈ بھی مفتی اعظم کے تمام فقہی ذخیرہ کا حامل نہیں بن سکا''۔

(۲) تعلیم الاسلام (۴ر حصے): کم عمر بچے اور بچیوں کے نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے ایمان وعقائد اور ارکان و اعمال کو آسان اور عام بول چال کی زبان میں پیش کیا گیا ہے یہ کتاب لوگوں میں بڑی مقبول ہے اور ہند و پاک کے بیشتر مدارس میں اور بنگلہ دیش وافریقہ کے بعض مدارس میں داخل نصاب ہے۔

(۳) **كف المؤمنات عن حضور الجماعات**: یہ رسالہ عورتوں کے لیے مجالس وعظ میں شرکت اور جمعہ و عیدین کے اجتماعات میں حاضری کے جواز وعدم جواز کے متعلق ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔

(۴) **صلوٰۃ الصالحات**: رسالہ ''كف المؤمنات'' ...... پر مولوی عبدالستار کلانوری نے عید احمدی کے نام سے تنقید لکھی تھی اسی کے جواب میں یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا۔

(۵) **النفائس المرغوبة فی حكم الدعاء بعد المكتوبة**: یہ فرض نمازوں کے بعد دعا کے سلسلہ میں تحقیقی رسالہ ہے جو مشاہیر علما کی تصدیق کے ساتھ جون ۱۹۱۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔

(۶) **الصحائف المرفوعة فی جواب اللطائف المطبوعة**: رسالہ ''النفائس المرغوبة'' پر ایک صاحب نے ''اللطائف المطبوعة'' کے نام تنقید لکھی تھی اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا تھا۔

(۷،۸) **دليل الخيرات فی ترك المنكرات وخير الصلوة فی حكم الدعاء للأموات**: رنگون

سے آپ کے پاس استفتا آیا تھا جس میں میت کی تدفین سے قبل اور بعد خاص طریقہ سے دعا کے اہتمام کے بارے میں شرعی حکم دریافت کیا گیا تھا، آپ نے وہاں کے عوام کے لیے پہلے ایک رسالہ ''**دلیل الخیرات فی ترک المنکرات**'' کے نام سے رسوم وبدعات کے رد میں لکھا تھا، پھر استفتا کا تفصیلی جواب ''**خیر الصلوٰۃ فی حکم الدعاء للأموات**'' کے نام سے تحریر فرمایا، حاجی داؤد ہاشم یوسف اور مولانا قاضی الدین (رنگون) نے اطراف ملک سے مزید ایک سو چونتیس علما سے اس سلسلہ میں فتویٰ لے کر دونوں رسالوں کو ایک ہی جگہ شائع کر دیا۔

(۹) **البیان الکافی:** یہ رسالہ رؤیت ہلال سے متعلق مسائل پر لکھا گیا ہے۔

(۱۰) قنوت نازلہ اور اس سے متعلق مسائل: یہ رسالہ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

(۱۱) اصول اسلام: یہ رسالہ ''جواہر الایمان'' کے نام سے بھی شائع ہوا ہے اس میں اسلامی عقائد اور عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے مسائل کے علاوہ عصری زندگی میں پیش آنے والے بھی بعض مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱۲) **إتمام المقال في بعض أحكام التمثال:** حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک استفتا کے جواب میں نعل نبوی کے تبرک کے جواز پر ایک رسالہ ''**نیل الشفاء بنعل المصطفی**'' کے نام سے لکھ کر چھپوایا تھا، جس میں نعل کی ایک مصنوعی شکل بھی چھاپ دی گئی تھی، مفتی صاحب کے پاس جب کسی نے یہ رسالہ پیش کیا اور اس سلسلہ میں استفسار کیا تو آپ نے تفصیلی جواب لکھا کہ یہ تو محض تصویر بلکہ فرضی نقش ہے اس سے تبرک کیوں کر حاصل کیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ جواب حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجا تو حضرت تھانویؒ نے اپنے فتویٰ سے رجوع فرمالیا اور پھر حضرت تھانویؒ ہی کے مشورہ سے دونوں رسالہ کو ''**إتمام المقال في بعض أحكام التمثال**'' کے نام سے شائع کرا دیا گیا۔

مذکورہ فقہی رسالوں میں سے بیشتر رسالوں کو مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے ''کفایۃ المفتی'' میں شامل کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ سیاسیات اور دوسرے موضوع پر رسالے درج ذیل ہیں:

(۱۳) مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت: ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا جس میں مسلم اکثریتی صوبہ میں مسلمانوں کی سیٹیں کم کر دی گئیں اور جہاں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں مسلم سیٹیں بڑھادی گئیں اور جناح صاحب کا نظریہ، یہ تھا کہ سرمایہ دار کو مزید سرمایہ دار بنانے کا کیا فائدہ؟ یعنی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں سیٹیں بڑھانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ حالاں کہ اس معاہدہ سے جہاں مسلم اکثریت میں تھے وہاں اقلیت میں ہوگئے اور جہاں اقلیت میں تھے وہاں سیٹیں بڑھا کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس وقت آپ نے مثبت انداز اور مہذب اسلوب میں جو تنقید کی تھی اسے رسالہ کی شکل میں ''مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت'' کے نام سے شائع فرمایا تھا۔

(۱۴) شیخ الہند۔ مختصر سوانح وحالات اسیری: یہ رسالہ ''انجمن اعانت نظر بندان اسلام'' کے تحت شائع ہوا

تھا، اسے مفتی صاحبؒ نے ہی مرتب کیا تھا مگر اس پر اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

(۱۵) اردو کا قاعدہ: یہ قاعدہ تعلیم الاسلام سے پہلے بچوں کے لیے لکھا گیا تھا یہ متعدد لسانی خوبیوں کا جامع ہے۔

(۱۶) روض الریاحین: آپ نے عربی میں مدرسہ امینیہ کے قیام کا پس منظر، تاریخ، حالات وغیرہ پر ایک لمبا قصیدہ لکھا تھا اور ایک لمبا قصیدہ اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی شان میں لکھا تھا، اس قصیدہ کا آغاز غزل کے انداز میں ہوتا ہے، پھر ماضی کی راحت، محبوب کے وصال، پھر محبوب کے اعراض و بے رخی، ملامت گر کی ملامت اور اپنے اوپر ہلاکت کے خطرہ کا ذکر کرتے ہیں کہ اچانک آسمان سے آواز آتی ہے کہ جا اور مرشد روحانی کی خدمت میں حاضر ہو جا، اور اس کے بعد آپ دیوبند حاضری اور تعلیم و تعلم اور حضرت شیخ کے فضائل و مناقب کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں، آپ کے اس کلام میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں، ''روض الریاحین'' آپ کے ان ہی قصیدوں کا مجموعہ ہے۔(۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی پیدائش ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء کو بانگر مئو، ضلع اناؤ، یوپی میں ہوئی، سلسلۂ نسب حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے ملتا ہے، والد سید حبیب اللہ مرحوم شروع میں صفی پورہ میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے پھر بانگر مئو تبدیل کر دیئے گئے، جب حضرت مولانا رحمہ اللہ تین سال کے تھے تو والد کی تبدیلی ٹانڈہ میں ہوگئی، ابتدائی تعلیم کی شروعات الہ داد پور، ٹانڈہ ضلع فیض آباد، یوپی سے ہوئی، جب شعور آیا تو گھر میں والدہ محترمہ سے قاعدہ بغدادی اور سیپارہ شروع کیا، ساتھ ہی والد صاحب کے ساتھ اسکول بھی جانا شروع کیا، آٹھ برس تک اس طرح وطن میں قیام رہا، اس دوران پانچویں سیپارہ تک والدہ محترمہ سے اور پانچ سے اخیر تک والد محترم سے ناظرہ پڑھا، اسکول میں درجہ دوم تک پڑھنا ہوا، اس وقت اسکول میں فنون اور کتب زیادہ تھے، جب عمر کا تیرھواں سال شروع ہوا تو بھائی سید احمد مرحوم دیوبند چلے گئے، بڑے بھائی حضرت مولانا سید صدیق صاحب مرحوم پہلے سے دیوبند میں آخری کتابیں پڑھ رہے تھے، اوائل صفر سن ۱۳۰۹ھ سے ۱۳۱۶ھ تک درس نظامی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں مکمل کی، جس میں آپ کے خاص استادوں میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ کا نام ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات، قطبی تصورات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ آخرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک اور موطا امام محمد پڑھیں۔

(۱) فضلاء دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۴۹-۲۶۳۔

۱۳۱۶ھ میں والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور مکہ معظمہ پہنچ کر سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اکتساب فیض کیا، جب کہ ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہو چکے تھے۔ ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۳۳ھ تک آپ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تدریسی سلسلہ جاری رکھا، البتہ درمیان میں تین مرتبہ ہندوستان کا سفر فرمایا، جس میں متفرق اوقات میں تقریباً ۴ سال مدینہ منورہ کا تدریسی سلسلہ منقطع رہا۔

۱۳۱۹ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے اجازت بیعت وخلافت لی، ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار ہوئے اور مالٹا کی جیل میں نظر بند کئے گئے، ۱۳۳۸ھ میں وہاں سے رہا ہوکر ہندوستان واپس تشریف لائے، مالٹا سے واپسی کے بعد آپ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینا شروع کیا اور حضرت شیخ الہندؒ کی وفات ۱۳۳۹ھ کے بعد آزادیٔ ہند تک ملک کی قیادت وسیادت کی ذمہ داری انجام دی اور بے مثال قربانیاں پیش کیں۔

۱۳۴۶ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سرپرست دارالعلوم دیوبند کے مشورہ سے دار العلوم دیوبند کے منصب صدارت تدریس پر فائز ہوئے اور تاحیات اس مقدس مقام سے اپنے فیوض وبرکات سے امت کو مستفیض فرماتے رہے، اس دوران کل تین ہزار آٹھ سو چھپن طلبہ نے آپ سے حدیث شریف کا درس لیا۔

۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ سے وفات تک مسلمانوں کی مؤقر جماعت ''جمعیۃ علماء ہند'' کے صدر رہے۔ ہندوستان کے طول وعرض سے ہزاروں انسانوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کرکے اپنی عاقبت سنواری، جن میں سے ۱۶۶/ حضرات کو آپ نے خلافت سے مشرف فرمایا۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہونے کے باوجود لوگ آپ سے خطوط کے ذریعہ فتویٰ پوچھا کرتے تھے اور آپ ان کا جواب دیا کرتے تھے۔

۱۳/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۷۷ھ بمطابق ۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات کی صبح بیمار ہونے کے باوجود تقریباً نو یا دس بجے اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں تشریف لائے، آپ کی تشریف آوری سے مسرت وشادمانی کی لہر پھیل گئی، تھوڑی دیر کے بعد کمرہ میں واپس آ گئے اور کمرہ خالی کرایا گیا، سب لوگ اس خیال سے باہر آ گئے کہ کچھ دیر نیند آ جائے، اس کے آدھ یا ایک گھنٹے کے بعد کوئی لڑکا کمرے میں داخل ہوا، حضرت آرام فرما رہے تھے، اس نے خوشی میں غور سے دیکھا تو پیشانی اس طرح پھڑک رہی تھی جیسے آنکھیں پھڑکتی ہیں یا گوشت کا کوئی ٹکڑا خود بخود مرتعش ہوتا ہے، خیال بھی نہ گذرا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہوسکتی ہے اور باہر آ گیا، اس کے ایک آدھ گھنٹہ کے بعد گھر کے لوگ نماز کے لیے بیدار کرنے کی غرض سے اندر گئے، پکارا، جگایا اور آخر میں ہلایا، مگر کوئی جواب، کوئی حرکت، نہ دیکھی، تو لوگ سراسیمہ اور بدحواس ہوکر دوڑے، بھاگے، ڈاکٹروں کو بلایا، معاینہ کے بعد اعلان کیا گیا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے۔

بالآخر ۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو علم وعمل اور زہد وتقویٰ سے مزین شیخ العرب والعجم ، امام العصر، محدث دوراں، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ جیسا آفتاب ہمیشہ ہمیش کے لیے غروب ہوگیا، مغرب یا عشا کے بعد حضرت مولانا عبدالاحد صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا راشد حسن نبیرہ شیخ الہند رحمہ اللہ نے غسل دیا، جنازہ کی نماز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے پڑھائی، جنازہ کو زیریں دارالحدیث میں عام زیارت کے لیے رکھ دیا گیا، تین ساڑھے تین گھنٹہ تک لائن بنا کر نظم وضبط کے ساتھ زیارت ہوئی، آخر رات کو دو بجے کے قریب قبرستان کے لئے روانہ کیا گیا اور قبرستان قاسمی میں اپنے محبوب استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے پہلو میں محو خواب ہیں۔(۱)

حضرت مولانا قاضی نورالحسن پھلواروی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا قاضی نورالحسن پھلوارویؒ ایک جید عالم دین، صاحب تقویٰ وطہارت بزرگ اور انتہائی تجربہ کار قاضی تھے، آپ ایک علمی خانوادے کے فرد فرید تھے، آپ کی ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء پھلواری شریف میں والد ماجد کی وفات کے صرف دو ماہ بعد ہوئی۔ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم محمد مخدوم محی الدینؒ اپنے وقت کے ممتاز علما میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور عالم جوانی میں ہی مالک حقیقی سے جا ملے۔(اناللّٰہ وانا الیہ راجعون)

مولانا نورالحسن پھلوارویؒ نے چونکہ دینی وعلمی خانوادے میں آنکھیں کھولیں اس لیے اس کا تقاضہ تھا کہ وہ دینی تعلیم حاصل کر کے رموز شریعت اور اسرار شریعت میں ملکہ حاصل کریں، چنانچہ آپ نے تعلیم پھلواری شریف میں حضرت مولانا عبدالوہابؒ سے حاصل کی، آپ نے اپنے نانا محترم مولانا شاہ محمد وحید الحق منعمیؒ جو سلسلہ منعمیہ کے مشہور بزرگ تھے شروع سے ہی ان کی تربیت ونگرانی میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا، بالآخر مولانا وحید الحق منعمیؒ سے سلسلہ منعمیہ کی اجازت و خلافت حاصل کی۔ درس حدیث وتعلیم قرآن آپ کی زندگی کا سب سے محبوب ترین مشغلہ تھا، اور ہر جمعہ کو قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ رمضان المبارک میں حدیث شریف کے درس کا آخری زندگی تک معمول رہا، اسی کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل پر مکمل عبور حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کو ’’دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ‘‘ کا سب سے پہلا قاضی شریعت مقرر کیا گیا، مزاج میں چونکہ احتیاط بہت زیادہ تھا اس لیے اختلافی مسائل میں بہت محتاط رہتے تھے۔

زندگی کے آخری لمحات تک آپ نے اپنی خداداد قابلیت، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ سے پوری طرح صداقت و حقانیت پر عمل پیرا ہو کر دارالقضاء کا اعتماد قائم کیا۔ آپ کے نزدیک مذاہب وادیان کا کوئی فرق نہیں تھا، مسلم اور غیر مسلم سب آپ سے فیصلہ کراتے تھے، ہر ایک آپ کے فیصلہ کو مانتا اور آپ کے فیصلہ کو حرف آخر سمجھتا تھا، چنانچہ بہار واڑیسہ کے علاوہ پنجاب سے بھی بہت سے مقدمات فیصلے کے لیے آئے اور آپ نے فیصلہ کیا، جس کو سبھوں نے قبول وتسلیم

(۱) تلخیص: سوانح حضرت مدنی رحمہ اللہ۔

کیا، آپ کے فیصلہ پر کسی کو کبھی بھی کوئی اعتراض اور شکایت کا موقع نہ ملتا اور کیوں کر اس کا موقع ملتا جب کہ آپ کا ہر فیصلہ احکام الٰہی اور شریعت مطہرہ کی روشنی میں ہوا کرتا تھا، آپ کا تقریباً ۳۵ سالہ عظیم الشان علمی کام جو مقدمات کے فیصلے ہیں وہ آج بھی دارالقضاء میں محفوظ ہے، ''قضایا امارت شرعیہ'' کی پہلی جلد میں ان کے فیصلوں کو شامل کیا گیا ہے۔

آپ کی عاجزی وانکساری، سلیم الفطرت اور نیک طینتی کی وجہ سے ہر شخص آپ کا مداح تھا، آپ کے ہم عصر بھی آپ کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی مجلس ہمیشہ فواحش ومنکرات، لغویات وخرافات سے پاک رہتی تھی، آپ ہمیشہ ذکر الٰہی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے، خشیت الٰہی اور فکر عقبیٰ ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی۔

آپ کی وفات حسرت آیات کا حادثہ ۳؍رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء بمقام پھلواری شریف پیش آیا، آپ آبائی قبرستان ہی میں مدفون ہوئے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ:

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری رحمہ اللہ کی ولادت ۳؍ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۳؍دسمبر ۱۸۸۳ء بروز جمعرات، لاجپور ضلع سورت، گجرات میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی، سات سال کی عمر میں اردو اسکول لاجپور میں داخلہ لیا، اردو اور گجراتی کی تعلیم اسکول میں پانچ سال تک حاصل کی، فارسی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا احمد میاں لاجپوریؒ سے عربی تعلیم کی ابتدا کی، سن ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک چار سال میں صرف، نحو، فقہ، اصول فقہ، حدیث میں مشکوٰۃ اور منطق میں صغریٰ سے لے کر شرح مہذب تک کی کتابیں پڑھ لیں۔ سن ۱۳۱۹ھ کے اوائل میں مدرسہ جامع العلوم، کانپور میں داخلہ لیا اور ایک سال قیام فرمایا، شعبان ۱۳۲۰ھ میں کانپور سے دہلی واپس آگئے، شوال میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، حضرت شیخ الہندؒ نے شرح جامی، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، اور نور الانوار کا امتحان لیا، جلالین حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ سے پڑھی، مختصر المعانی حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ سے، مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے اور ملا حسن، میبذی اور مقامات حریری مختلف اساتذہ سے پڑھی، لیکن خرابی صحت کی وجہ سے دیوبند کو چھوڑ کر دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں داخلہ لیا، بخاری شریف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ سے پڑھی، اور ۱۳۲۳ھ میں سند فراغت حاصل کی، ۱۳۲۴ھ میں علامہ حسین بن محسن الیمانی سے علم حدیث کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبؒ کو گونا گوں خصوصیات سے نوازا تھا، ان میں ایک خصوصیت تفقہ فی الدین بھی تھی، دینی علوم میں دستگاہ کے ساتھ ساتھ فقہ وفتویٰ پر آپ کی گہری نگاہ تھی، یوں تو فتویٰ نویسی کی مشق جامع العلوم کانپور میں

(۱) مقدمۂ فتاویٰ امارت شرعیہ جلد دوم: ۳۶، ۳۷۔

طالب علمی کے زمانہ سے ہوگئی تھی البتہ باقاعدہ افتا کی خدمت کا موقع ۱۳۶۱ھ سے مدرسہ تعلیم الدین معلمیہ رنگون، برما میں ملا، اور تدریس کے ساتھ افتا کی خدمت آپ کے ذمہ رہی، مدرسہ معلمیہ میں دارالافتاء کا ایک شعبہ قائم ہو چکا تھا، مگر پورے ملک کے حالات کے پیش نظر ایک مستقل دارالافتاء کی ضرورت تھی، اس ضرورت کا احساس حضرت مولانا ابراہیم صاحب راندیریؒ کو ہوا، چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں سورتی جامع مسجد میں دارالافتاء قائم فرمایا، اس میں مختلف حضرات نے افتا کی خدمت انجام دی، ۱۹۳۶ء میں مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ باقاعدہ دارالافتاء کے صدر مفتی بنائے گئے اور مفتی اعظم برما کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے، ۱۹۴۱ء کی جنگ جاپان تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت مولانا نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا اعظم حسین صدیقی مہاجر مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت ہوئے اور دو ماہ مستقل قیام رہا، موصوف کی وفات کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے، حضرت کی وفات کے بعد حضرت شاہ غلام محمد مجددیؒ سے جو سلسلہ نقشبندیہ کے ایک عارف اور اہل دل بزرگ تھے، رجوع فرمایا۔

آپ نے چند مفید تصنیفات چھوڑیں:

(۱) سادات کے مناقب وفضائل میں۔ ''**سفینة النجات فی ذکر مناقب السادات**''۔

(۲) عقائد میں۔ ''توحید الاسلام''۔

(۳) بچوں کے لیے فقہ شافعی میں ''تعلیم الاسلام'' کے طرز پر ''ارکان اربعہ''۔

(۴) حدیث میں ''**جمع الأربعین فی تعلیم الدین**''۔

حضرت مفتی صاحب کی عمر تقریباً ۷۷؍سال کی تھی کہ ۲۹؍دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۷ھ کو فالج کا حملہ ہوا اور یہ مرض مرض الوفات ثابت ہوا۔(۱)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ:

مفکر اسلام، عالم ربانی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ بہار شریف کے قریب موضع پنہسہ میں ماہ صفر ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے، والد ماجد جناب مولوی حسین بخش گاؤں کے رئیس اور ذمہ دار تھے اور نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے، مگر ابھی مولانا کی عمر چار ہی سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی، آگے کی تعلیم کے لیے بہار شریف، کانپور، دیوبند اور پھر الہ آباد کا سفر کیا آخری تعلیم اور حدیث سے فراغت مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے ۱۹۰۵ء میں ہوئی، وہاں سے آنے کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں تدریس کی خدمت انجام دی، پھر اپنے استاذ حضرت مولانا عبد الکافی صاحب علیہ الرحمۃ کی دعوت پر مدرسہ سبحانیہ الہ آباد تشریف لے گئے اور وہاں ایک عرصہ تک تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دی، پھر وہاں سے واپس آئے اور صوبہ بہار کے شہر گیا میں

(۱) مقدمۂ مرغوب الفتاویٰ جلد اول: ۱۸۹۔۲۲۷۔

مدرسہ انوار العلوم قائم کیا اور وہاں تدریس کی خدمت انجام دی۔

تدریس کے ساتھ مسلمانوں کی دیگر دینی وملی خدمت کے کام میں بھی مشغول رہے، جنگ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا، اور ۱۹۱۷ء میں ''انجمن علماء بہار'' قائم کی، اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ''جمعیۃ علماء ہند'' کی تاسیس میں قائدانہ کردار ادا کیا اور ۱۹۲۱ء میں اکابر علما اور عمائدین کے ساتھ ''امارت شرعیہ'' قائم کیا، آپ نے قومی وملی خدمت کے لیے پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا، علما کے صف میں بڑا بلند پایہ مرتبہ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی علیہ الرحمۃ نے تحریر کیا ہے کہ میں ان کو دور حاضر میں کم از کم علما کے طبقہ میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھتا ہوں، وہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں ماہر تھے، اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ جہاں ایک دردمند قائد، زمانہ شناس مفکر، ملت کے غم میں گھلنے والے اور ہر مسلمان کی چوٹ کو اپنے دل پر محسوس کرنے والے بےنفس اور سراپا ایثار شخصیت کے حامل تھے، وہیں عمیق علم، وسیع مطالعہ اور فہم رسا کے مالک بھی تھے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے صاحب علم ان کو ''فقیہ النفس'' کہا کرتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور بڑے بڑے اکابر اہل علم تجاویز کی ترتیب میں مولانا کی لیاقت کے معترف تھے اور انہی پر تکیہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب رحمہ اللہ کو گو اپنی دوسری خدمات، فتنۂ ارتداد کا مقابلہ، مسلمانوں کی اعانت اور ان کے تحفظ کی سعی، امت میں اجتماعیت پیدا کرنے کی کوشش اور اپنے عہد کے سیاسی حالات میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کی جانے والی تدابیر وغیرہ کی وجہ سے افتا وقضا، تصنیف وتالیف اور علمی وتحقیقی کاموں کے لئے یکسو ہونے کا موقع میسر نہیں آیا، لیکن اس کے باوجود اس سلسلہ میں جو کچھ تھوڑا بہت موقع حضرت کو مل سکا اور اس میں سے جو کچھ علمی آثر ہمارے لئے باقی رہ گئے ہیں، وہ ہمارے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان ہی علمی آثر میں ایک یہ فتاویٰ ہیں جو فتاویٰ کے ریکارڈ میں محفوظ تھے اور اب طبع کئے جارہے ہیں۔ شوال ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں، جب میں امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے حکم پر امارت شرعیہ میں حاضر ہوا تو مجھے تین بیش قیمت خزانے بہت فرسودہ حالت میں ملے، ایک تو فائلوں کا وہ ڈھیر جس میں بزرگوں نے مختلف ملی اجتماعی امور پر احکام لکھے تھے، دوسرے دار القضاء سے فیصل ہونے والے مقدمات کی نقلیں اور تیسرے فتاویٰ امارت شرعیہ کا عظیم الشان ذخیرہ۔(۱)

---

(۱) فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول۔

حضرت مولانا کوتحریر وتحقیق کا بھی عمدہ ذوق تھا،ان کے اہم علمی وفقہی اور اصلاحی مضامین اور خطبات وقتاً فوقتاً جریدہ امارت ہفت روزہ نقیب،الجمعیت ،اور دوسرے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے تھے،آپ کے فتاویٰ وقضایا کے علاوہ دیگر کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) قضایا سجاد

(۲) خطبۂ صدارت

(۳) مقالات سجاد

(۴) حکومت الٰہی

(۵) مکاتب سجاد

(۶) امارت شرعیہ شبہات وجوابات

(۷) قانونی مسودے

۱۷رشوال المکرّم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸رنومبر ۱۹۴۰ء بروز شنبہ بمقام پھلواری شریف پٹنہ میں آپ کی شمع حیات بجھ گئی اوراس روز دس بجے رات میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے مزار میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد عباس پھلواروی رحمہ اللہ:

بہار کے مشہور اصحاب طریقت ووجاہت میں ایک بزرگ تھے جن کا نام عطاء اللہ تھا اور شیر شاہ سوری کے ایوان میں کسی بڑے عہدہ پر فائز تھے،ان کا خاندان پٹنہ سے ۸رکیلومیٹر مغرب کی طرف ایک بستی میں آباد ہوا جو پہلے کسی راجہ کی پھلواری تھی،جب یہ خاندان یہاں آکر آباد ہوا اور اس میں بڑے بڑے شیوخ طریقت پیدا ہوئے تو مریدوں اور معتقدوں نے اس کے نام کے ساتھ ’’شریف‘‘ بڑھا دیا اور اس کا پورا نام ’’پھلواری شریف‘‘ قرار پایا،جس کو اس وقت کے انگریز کمشنر نے منظور کرلیا اور ڈاکخانہ وتھانہ بعد میں ریلوے اسٹیشن ہر جگہ اسی نام کو منظور کرلیا گیا۔اس خاندان میں بہت سے بزرگ پیدا ہوئے جن میں شاہ محمد مجیب اللہ قادری بہت نامور ہوئے،جن کا لقب تاج العارفین ہے،ان کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ نعمت اللہ قادری تھے۔جن کے وقت میں ان کے والد کی قیام گاہ کو خانقاہ ’’مجیبیہ‘‘ کہا گیا۔ان کی سات اولاد تھی،بڑے صاحبزادے شاہ ابوالحسن فرد تھے،اور سجادگی ان کے خاندان میں بڑے بیٹے کو ملتی رہی،ان کے ایک صاحبزادہ اور صاحب سجادہ شاہ علی حبیب نصر تھے،جن کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا،ان کے

(۱) ہمارے امیر،شائع کردہ امارت شرعیہ۔

بڑے لڑکے شاہ عبدالحق سجادہ نشیں ہوئے، ان کی عملی وروحانی تربیت حضرت شاہ بدرالدین قادری قدس سرہ نے کی، جوان کے بہنوئی بھی تھے اوران کے والد کے ''اجل خلفاء'' میں تھے، دوسال کے بعدان کا بھی انتقال ہوگیا، توان کے چھوٹے بھائی شاہ عین الحق گدی پر بٹھائے گئے، مگران کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی، خاندان کے بزرگ شاہ علی نعمتؒ نے ان کوتعلیم دی اوروہ خود چونکہ اہل حدیث ہوگئے تھے اس لئے ان کے شاگرد نے بھی یہی مسلک اختیار کیا اور خانقاہیت اورسجادگی سے دستبردار ہوگئے۔(۱) اہل خاندان نے اس موقع پر جمع ہوکر حضرت شاہ بدرالدین بن شاہ شرف الدین کوگدی پر بٹھایا، جوامیر عطاء اللہ کی اولاد نرینہ میں تھے، حضرت شاہ علی حبیب نصر کے بہت محبوب، داماداور خلیفہ تھے۔

امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا تو حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا نام مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے پیش کیامگروہ بہت بوڑھے ہوچکے تھے انہوں نے اپنے بجائے حضرت شاہ بدرالدین قدس سرہ کوامیر بنانے کی تجویز پیش کی، دونوں بزرگ صاحب نسبت اور ہزاروں مریدوں کے شیخ تھے، حضرت شاہ بدرالدینؒ کی وفات کے بعد بالاتفاق ان کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ محی الدین رحمہ اللہ کوامیر شریعت منتخب کیا گیا۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اپنے آپ کو نائب ہی باقی رکھا، حالانکہ وہ امارت شرعیہ کے بانی تھے۔ مولانا مفتی محمد عباسؒ ''تاج العارفین'' شاہ مجیب اللہ رحمہ اللہ کی اولاد نرینہ میں پانچویں پشت میں تھے، ان کے دادا کے والد یعنی پردادا مولانا محمد امام تھے، جوحضرت شاہ ابوالحسن فرد کے سنجھلے بھائی تھے اوراپنے ماحول میں سنجھلے مولوی صاحب کہے جاتے تھے، مولانا کے جدامجد نوراحمد صاحبؒ تک ان کا گھرانہ خوش حال تھا، نذرات وفتوحات کے علاوہ جائداد بھی تھی، اورخود عدالت پٹنہ میں محرر کبیر ہوگئے تھے جواس زمانہ میں بہت بڑاعہدہ تھا، مگران کے بعد یہ سب سلسلہ یکسر بند ہوگیا، ان کے فرزند یعنی مولانا محمد انس نابینا ہوگئے تھے، فقروتوکل علی اللہ پر زندگی گذاررہے تھے، ان کے شیخ حضرت شاہ علی حبیب نصران کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

مولانا محمد عباسؒ نے فارسی اپنے والد سے پڑھی اوراستعداد بہت بڑھالی، پھر خانقاہ کے مدرسہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے شرح جامی، شرح وقایہ، قطبی، میر قطبی اورحضرت شاہ محی الدین قدس سرہ سے کنزالدقائق، ہدایہ اولین و آخرین پڑھی، مولانا نذیرالحق سے صحاح کے اسباق لیےاورنوعمری سے محرری شروع کی۔ لوگوں کے خطوط لکھنااورقبالوں کی نقل کرناان کا پیشہ ہوا، اس سے پیسہ بچا کرزمین میں گاڑدیتے اور جب دویاتین روپیہ ہوجاتے توتفسیر وحدیث کی کتابیں دہلی سے منگایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جولوگ وکالت کرتے تھےان کے لیے فقہ پڑھناضروری تھا، چنانچہ پٹنہ سیٹی کے ایک رئیس مولوی عبدالحفیظ کے یہاں ان کے لڑکے مولوی سید حسین وکیل کی اتالیقی اورتدریس پر مامور ہوئے، مگر پٹنہ سیٹی سے پھلواری اس زمانہ میں دس میل تھا، آناجانامشکل تھااس لیےامارت شرعیہ میں محرر کی نوکری کوترجیح دی، بہت قلیل تنخواہ پر گذر کرتے تھے، فقروافلاس کادوردورہ تھامگرکبھی نہ کسی قسم کی مددلی اورنہ قرض لیااورایک پیسہ کے

(۱)　اعیان وطن مصنفہ مولاناحکیم محمد شعیب میں یہ تفصیل درج ہے۔

امرود یا دو پیسہ کے شکر قند و سوتھنی پر دن کاٹ لیتے تھے، برسات میں جب گھر کا چھپر گر گیا تو خانقاہ کے وقف باغ سے ''جو ان کے دادا کا وقف کردہ تھا'' پانچ عدد بانس بھی طلب نہیں کیے، اور جب خود پیسہ جمع کر لیا تو بازار سے بانس خرید کر اپنے بھائی مولوی وارث محی الدین کے ساتھ مل کر خود چھپر چھایا۔ بعض اعزہ نے مالی تعاون پیش کیا مگر قبول نہیں کیا، حضرت شاہ محی الدین قادری قدس سرہ ان کے استاذ اور رشتہ کے بڑے بھائی تھے، ان کی خواہش کے باوجود کوئی مدد نہیں لی، ان کی خالہ نعیمہ بی بی ''اغور گاؤں، پھلواری سے متصل ایک گاؤں جس کو دانا پور بھی کہتے ہیں'' کا انتقال ہوا تو ان کی بیٹی نے آٹھ ہزار چاندی کے روپیوں کی تھیلی دی اور یہ کہا کہ یہ تم لے لو اور وارثوں کو خبر نہ دو۔ مگر انہوں نے پوری رقم ان کے ورثہ کو پیدل جا کر پہونچا دی۔

ان کو اجازت و خلافت اپنے والد سے اور والد کو دادا سے۔ شاہ مجیب اللہ تاج العارفین تک مسلسل جملہ سلاسل کی تھی اور یہ سلسلہ ایک دوسرے ذریعہ سے بھی ملا مگر سوائے ایک شخص کے جو موضع ''سہار'' مولانا کی سسرال میں جاں بہ لب تھے، کسی کو مرید نہیں کیا جس نے اس کی خواہش کی ان کو اپنے شیخ کی طرف متوجہ کیا، خاندان کے سب لوگ اپنے نام کے آگے قادری لکھا کرتے تھے مگر انہوں نے ہمیشہ اپنا نام محمد عباس غفر لہ لکھا۔ تعلیم اچھی اور کامل ہوئی تھی، کچھ دن شمس الہدیٰ مدرسہ میں ہدایہ اور بخاری کا درس بھی دیا، مگر کوئی سند نہ تھی اس لیے باقاعدہ مدرس دوسرے صاحب بنائے گئے۔

امارت شرعیہ میں آٹھ سال تک محرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، رزق حلال کا اس درجہ داعیہ ان کے اندر تھا کہ بخار کی شدت اور بواسیر کی تکلیف میں بھی کبھی چھٹی نہیں لی، صبح نو بجے سے چار بجے تک کام کرتے تھے، آٹھ سال ملازمت کے بعد ان کے ذمہ فتاویٰ نویسی کا کام سپرد ہوا، کتابوں کی مراجعت، عبارت کی نقل اور اس کا ترجمہ سب خود کرتے تھے، مگر ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر دستخط اس وقت کے ناظم مولانا محمد عثمان غنیؒ کیا کرتے تھے، جب حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اپنی آنکھوں سے یہ بات دیکھی تو باقاعدہ تحریر سے اطلاع دی کہ جو فتاویٰ لکھے وہی دستخط کرے، اس وقت سے اخیر دم تک مفتی امارت شرعیہ کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔ ان کے مختصر بیانی اور استحضار علمی کی تحسین مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ نے کی، جو مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

طریقۂ تدریس بہت آسان اختیار کرتے تھے، اور اکثر مثالیں اردو میں دے کر طلبہ کو مفہوم سمجھا دیتے پھر مصنف کی اصل عبارت سے تطبیق کراتے، وہ اپنے استاد و مرشد حضرت شاہ محی الدینؒ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے بہت معتقد تھے، مولانا قاضی نورالحسنؒ قاضی امارت شرعیہ سے انہوں نے مناسخہ نویسی میں رجوع کیا تھا۔

ان کا انتقال ۱۸؍محرم ۱۳۶۲ھ میں ہوا، اس وقت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ امارت شرعیہ کے ناظم اول بنائے جا چکے تھے (پھر بعد میں نائب امیر شریعت بنائے گئے)

---

(۱) فتاویٰ امارت شرعیہ: ۲؍۴۳؍تا ۴۶ ۔

مرحوم کے ایام خدمت میں مولانا محمد عثمان غنیؒ ناظم تھے، پھر مولانا عبدالصمد رحمانیؒ ناظم ہوئے، انہوں نے نقیب میں جو تعزیتی نوٹ لکھا تھا، وہ ان کی شرافت اور علوم مرتبت کی دلیل ہے۔(۱)

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی ایک متبحر عالم دین، بے مثال فقیہ، بلند پایہ محقق، کثیر التصانیف مصنف اور روحانی کمالات کے حامل تھے، وہ اپنے علم وفضل، زہدوتقویٰ، سادگی و بےنفسی اور عاجزی وخاکساری میں علماء سلف کی زندہ یادگار تھے، وہ قطب عالم حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ کے ساختہ وفیض یافتہ اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ کے شاگرد رشید اور سچے جانشیں تھے، مولانا مونگیریؒ کی روحانیت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تربیت ورفاقت نے ان کی ذات کو کندن بنا دیا تھا، ان کی زندگی علم اور سیاست کا شاندار مرقع تھی، ان کا سینہ علوم ومعارف کا خزینہ اور قومی وملی تحریکات کے رازہائے سربستہ کا امین تھا۔ سیاسی زندگی کے شوروہنگامہ کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اپنا علمی وتحقیقی مشغلہ جاری رکھا، وہ جنگ آزادی کے بطل جلیل اور ملک وملت کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے تھے، انہوں نے اپنے استاذ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ساتھ جہاں علم وتحقیق اور تعلیم وتربیت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، وہیں دینی وملی تحریکات کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی بےلوث خدمات بھی انجام دیں۔ وہ مدرس اور معلم بھی رہے اور امارت شرعیہ کے ناظم، مفتی اور نائب امیر شریعت بھی اور ازہرالہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن بھی اور پوری زندگی علمی ودینی اور قومی وملی خدمات میں گذاردی۔

مولانا مرحوم صوبۂ بہار کے ایک قصبہ باڑھ کے ایک محلّہ بازید پور میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مانڈر ضلع کھگڑیا میں شادی ہوئی اور بعد میں وہیں سکونت اختیار کرلی۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی، عربی کی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا حکیم محمد صدیقؒ سے پڑھیں، جو باڑھ میں مطب کرتے تھے اور مولانا اپنے گھر بازید پور سے روزانہ پڑھنے کے لیے ان کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ ''ھدایۃ النحو'' تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر آگے کی تعلیم کے لیے ۱۳۲۷ھ میں جامع العلوم کانپور کا سفر کیا، کچھ دنوں وہاں رہ کر الٰہ آباد کا سفر کیا، جہاں انہیں مدرسہ سبحانیہ میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ جیسے لائق اور باکمال استاذ کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر ان کی کیمیا گر صحبت وتربیت سے پوری طرح مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ اس کے بعد معقولات کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے غور غشتی پشاور گئے۔

ظاہری علوم سے فراغت کے بعد تعلق مع اللہ، اصلاح باطن اور قلب ونظر کی دنیا آباد کرنے کی خاطر قطب الارشاد اور عالم ربانی حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ کی صحبت کو لازم پکڑا۔ ان دنوں اس صوبہ میں قادیانیت کا فتنہ زوروں پر تھا، پورا صوبہ فتنۂ قادیانیت کی زد میں تھا اسی فتنہ کی سرکوبی کے لیے مولانا محمد علی مونگیریؒ نے اپنے مرشد قطب

عالم حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کے حکم وایماء پر اپنے وطن مالوف کانپور سے ہجرت فرما کر مونگیر کو اپنا مستقر بنایا تھا اور وہاں خانقاہ رحمانی قائم فرما کر اس کو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا، وقت کے اس عظیم الشان جہاد میں علماء مخلصین کا مبارک قافلہ آپ کے ساتھ ہم سفر تھا، خوش قسمتی سے مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کو اس قافلہ میں شرکت و شمولیت کی سعادت میسر آئی، چنانچہ وہ علما کی اس مقدس جماعت کے ساتھ اسلام دشمن تحریک کے استیصال کے لیے مولانا محمد علی مونگیریؒ کی زیر نگرانی عملی میدان میں آئے اور اس فتنہ کے خلاف تحریری وتقریری جہاد میں حصہ لیا اور متعدد اہم کتابیں ردقادیانیت کے موضوع پر تصنیف کیں، اس پرآشوب دور میں جب فتنۂ قادیانیت اپنے شباب پر تھا، آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے بھی اسلام کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کردی تھیں۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی قیادت وسرپرستی میں آپ ان تینوں باطل تحریکوں کے خلاف مستقل خاموش اور علمی جدوجہد میں منہمک رہے اللہ کے فضل وکرم سے ان مجاہدانہ سرگرمیوں اور کوششوں کے نتیجہ میں شمالی مشرقی ہندوستان کا یہ خطہ ان فتنوں کے اثر سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔

مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ کے وصال ۱۳۴۵ھ کے بعد آپ اپنے شفیق استاذ، مفکر اسلام حضرت مولانا محمد سجادؒ کی دعوت پر خانقاہ رحمانی مونگیر سے پھلواری شریف منتقل ہوگئے امارت کا قیام چھ سال قبل ہو چکا تھا اور امارت شرعیہ کے مرکزی دفتر کے نگراں اعلیٰ مقرر ہوئے، اور اس مثالی شرعی تنظیم کی ترقی واستحکام کے لیے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں وقف کردی، امارت شرعیہ کے تعارف اور اس کے پیغام سے مسلمانوں کو روشناس کرانے کے لیے مقالات، مضامین، پمفلٹ اور کتابیں لکھیں، دونوں ریاستوں کے اہم مقامات کا دورہ کیا، تنظیم امارت قائم کی، نقباء کا انتخاب کیا اور ہر مسلم آبادی کو مرکز سے جوڑنے اور تمام مقامی مسائل ومشکلات کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کا نظام بانی امارت کی ہدایات کی روشنی میں بنایا اور نقباء کو اس تنظیم کا مقصد اور طریق کار سمجھایا اور امارت شرعیہ کے نظام میں اپنے استاذ کے رفیق اور دست راست بن کر اسے ترقی کے بام عروج تک پہونچایا۔

۱۳۵۹ھ میں جب بانیٔ امارت نے داعی اجل کو لبیک کہا تو امیر شریعت ثانی حضرت مولانا سید محی الدینؒ نے اپنے درج ذیل فرمان کے ذریعہ آپ کو نائب امیر شریعت نامزد فرمایا؛ ''مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے وصال کے بعد سے ادارہ امارت شرعیہ میں نائب امیر شریعت کی جگہ خالی تھی عملاً گرچہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ ناظم امارت شرعیہ نیابت کے بعض امور انجام دے رہے تھے لیکن ضابطہ کے طور پر وہ اس منصب کے لیے مامور نہیں کئے گئے تھے ان کے چار سال کے کام نہایت اطمینان بخش ہیں، اس وقت بجز اس کے کہ مولانا مرحوم مجمع الکمالات ذات سے ادارہ امارت شرعیہ محروم ہے اور جس کا بدل بظاہر ہندوستان میں نہیں ہے اس کے علاوہ بحمداللہ ادارہ امارت شرعیہ اپنے ہر شعبہ میں بہتر حالت میں ہے، جو مولانا رحمانی کی اہلیت اور ان کی مخلصانہ کارگزاری کا عملی ثبوت ہے، ضرورت داعی تھی کہ اس منصب نیابت کا جلد ہی اعلان ہوتا مگر مشیت الٰہی کے

ہاتھوں مختلف وجوہ کی بناپر تاخیر ہوتی رہی، آج ۸؍ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ یوم جمعہ کو مولانا عبدالصمد رحمانی کا تقرر عہدۂ نیابت امارت پر کردیا گیا، کل سنیچر کے دن سے کارہائے مفوضہ کی طرف متوجہ ہوکر عمل شروع کردیں''۔

اس تقرر کے بعد مولانا رحمانیؒ تاحیات پورے ۳۳ سال اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور قوم وملت کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور تقریباً اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۱۴؍مئی ۱۹۷۳ء کو اپنی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کا صلہ پانے کے لیے اپنے رفیق اعلی سے جاملے۔(رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)

مولانا رحمانیؒ وسیع النظر عالم دین، اونچے درجہ کے محقق ومصنف اور مختلف اسلامی علوم وفنون کے ماہر تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ سب پر گہری نظر تھی لیکن فقہ اور اصول فقہ میں آپ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا اور یہ آپ کا محبوب مشغلہ تھا جو اخیر عمر تک جاری رہا اور عمر کا بڑا حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گذر گیا اور چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں علمی یادگار چھوڑیں وہ ایک عرصہ تک جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر جیسے دینی وروحانی مرکز میں مدرس رہے اور وہاں سے نکلنے والے علمی ماہنامہ ''الجامعۃ'' کے مدیر رہے اور بہت سے بلند پایہ مضامین لکھے، امارت شرعیہ کے مفتی کی حیثیت سے ہزاروں فتاویٰ لکھے جن کا بڑا ذخیرہ امارت شرعیہ کے دارالافتاء میں موجود ہے، آپ کی معرکۃ الآراء تصانیف میں مسئلۂ امارت اور ہندوستان، تاریخ امارت، کتاب الفسخ والتفریق، کتاب العشر والزکوٰۃ، آداب قضا اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر کتابیں ہیں، اسی طرح قرآن محکم، اسلام میں عورتوں کا مقام، پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کا عالمگیر پیغام، فاطمہ رضی اللہ عنہا کا چاند، غیر مسلموں کی جان ومال کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر وغیرہ، بڑی قیمتی کتابیں ہیں۔ آپ کی تصنیف کردہ اہم کتابیں دینی مدارس کے نصاب میں داخل رہی ہیں۔ تیسیر القرآن جو جامعہ رحمانی مونگیر اور بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ملحق مدارس کے وسطانیہ چہارم کے نصاب میں داخل ہے اور واقعی یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے، ایک طرف یہ عربی ترکیب کے لیے بہترین کتاب ہے کہ مبتدی طلبہ کو بتدریج ترکیب سکھاتی ہے، ترکیب اضافی، توصیفی، جملہ فعلیہ خبریہ، جملہ انشائیہ، جملہ شرطیہ، حروف مشبہ بالفعل، افعال ناقصہ، مفاعل خمسہ، حال ذوالحال، ممیّز تمیز وغیرہ تمام ترکیبوں کو جدا عنوان کے تحت سمجھایا گیا ہے۔ دوسری اہم کتاب ''**تلخیص الإتقان**'' علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی ایک جامع اور بیش قیمت کتاب ''**الإتقان فی علوم القرآن**'' پر ہے، جو قرآن کریم سے متعلق تمام ضروری مباحث پر حاوی ہے۔ مولانا رحمانیؒ نے طلبہ کی سہولت کے لیے ایک جامع تلخیص تیار کی ہے، بہرحال ان کی علمی تحقیقات وتفصیلات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

۱۴؍مئی ۱۹۷۳ء مطابق ۱۰؍ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ روز دوشنبہ کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں وفات پائی۔(۱)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ:

(۱) فتاویٰ امارت شرعیہ: ۲؍۳۱؍تا ۳۵۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۳/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی) میں ہوئی، عمر تین سال تھی کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا اس لئے آپ کی پرورش دادی صاحبہ نے فرمائی، نسبی تعلق دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے ہے۔

مولانا نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف ناظرہ دیوبند کے مشہور حفاظ کے پاس پڑھنا شروع کیا، آپ نے قرآن شریف بچپن میں حفظ نہ کیا تھا، ۳۴/سال کی عمر میں چھ مہینے کی مدت میں حفظ قرآن کی سعادت بھی نصیب ہوئی ابتداءً دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی وریاضی میں داخل ہوئے، پھر مدرسہ امدادالعلوم تھانہ بھون میں منتقل ہو گئے جہاں اپنے ماموں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی میں تعلیم پائی، کچھ دنوں جامع العلوم کانپور اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کی تکمیل کی، وہاں مشہور محدث وفقیہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے فیض یاب ہوئے، اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں سے سند فراغت حاصل کی، پھر وہیں سات سال تک تدریس کی خدمت انجام دی، بعد میں تھانہ بھون منتقل ہو گئے اور برسوں حضرت حکیم الامتؒ کی رہنمائی میں خدمت انجام دیتے رہے۔ چند برس برما میں رہ کر مدرسہ راندریہ، رنگون میں علمی، تبلیغی اور انتظامی خدمات انجام دیں پھر وہیں سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر مقرر ہوئے اور یونیورسٹی کے علاوہ مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ میں صحاح ستہ تک کا درس دیا۔ تقسیم ہند سے قبل ڈھاکہ یونیورسٹی سے تعلق کے زمانہ میں تعطیلات گرما میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت، گجرات میں مسلم شریف اور ترمذی شریف کے اسباق پڑھائے۔ کئی بار حج کیا پانچویں حج سے واپسی کے بعد ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہو گئے اور تاحیات دارالعلوم الاسلامیہ واللہ یار ضلع حیدرآباد، سندھ میں بہ حیثیت شیخ الحدیث، قرآن وسنت اور فقہ وفتویٰ کی خدمت فرماتے رہے۔

تمام دینی علوم وفنون میں آپ کی بلند پایہ تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا مختصر تعارف بھی کرایا جائے تو اس کے لئے ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہوگی۔ مولانا کا سب سے بڑا علمی شاہکار جو اس صدی ہی کا نہیں بلکہ علم حدیث کے چودہ سو سالہ دور کا بہت بڑا کارنامہ ہے، کتاب ''اعلاء السنن'' کی تصنیف ہے جو کہ بیس ضخیم جلدوں میں چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی فرمائش اور رہنمائی میں قیام تھانہ بھون کے دوران تصنیف فرمائی، اس کتاب میں مولانا نے تقریباً بیس سال کی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد ان احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع فرمایا ہے، جن سے فقہ حنفی ماخوذ ہے اور تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہ کی بے نظیر محدثانہ تشریح وتفصیل بیان فرمائی۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ فرماتے ہیں کہ ''اس شہید علم کی یہ ایک کتاب ہی ان کی آئینہ کمالات ہے،

اگر اور تصنیف نہ ہوتی تو صرف یہ ایک کتاب ہی کافی وشافی تھی'' یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

مولانا کا دوسرا بڑا علمی شاہکار ''احکام القرآن'' ہے یہ بھی عربی زبان میں ہے، فقہ حنفی قرآن کریم کی کن کن آیات سے ماخوذ ہے اور حنفی فقہ نے کون کون سی آیات سے کن کن فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے؟ ''احکام القرآن'' میں ان سب کو نہایت تحقیق واحتیاط کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس تصنیف کا کام چار علماء محققین کے سپرد فرمادیا تھا، جن میں سے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ نے اپنے اپنے حصوں کا کام مکمل فرمالیا اور وہ طبع بھی ہوگئے ایک حصہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے سپرد سورۂ فاتحہ سے سورۂ نساء تک کا کام تھا، جو آپ نے نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا، علم تفسیر وعلم فقہ میں مولانا کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا کا تیسرا بڑا کارنامہ ''امداد الاحکام'' ہے جو حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ اور مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے اور اس کے اکثر مسائل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگاہ سے گزر چکے ہیں اور بعض فتاویٰ حضرت حکیم الامتؒ نے بھی تحریر فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم نے تدریس وفتویٰ اور تصنیف وتالیف کے علاوہ تبلیغی خدمات میں بھی بھرپور حصہ لیا اور وعظ وتذکیر اور زبانی مناظروں کے ذریعہ دین کی تبلیغ اور باطل کی سرکوبی کا سلسلہ ان تمام علمی وتحقیقی خدمات کے ساتھ تا حیات جاری رہا، برما میں رنگون کے قریب ایک بستی ''ویڈنو'' کے سارے مسلمان بہائی مذہب قبول کر کے مرتد ہوگئے تھے، حضرت مولانا کی تبلیغی کوششوں سے بحمد اللہ ایک ہی سال میں وہ سب دوبارہ مسلمان ہوگئے، صرف سترہ آدمی اس مذہب میں ایسے باقی رہ گئے جنہیں مرکز بہائیت امریکہ سے بڑی بڑی تنخواہیں ملتی۔

عیسائی پادریوں، قادیانیوں اور متعدد فرقوں کے مبلغین سے آپ کے بڑے کامیاب مناظرے ہوئے جن کی بصیرت افروز تفصیلات ''تذکرۃ الظفر'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں بیس سال دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈر، واللہ یار میں دین کی خدمت کی، امراض کا ہجوم ہو چکا تھا اور جسمانی توانائیاں ختم ہو رہی تھیں، مگر صحیح بخاری کا درس اور فتاویٰ کا سلسلہ آخر حیات تک جاری رہا، نماز باجماعت اور اذکار ونوافل کی پابندی میں فرق نہ آیا، جب معذوری زیادہ ہوگئی تو ہاتھ کی گاڑی میں مسجد تک تشریف لے جاتے تھے، زبان پر اکثر اوقات ذکر جاری رہتا۔

۱۳۹۴ھ کے رمضان میں معالجین نے مسلسل امراض کے باعث روزہ سے منع کیا تھا، مگر آپ نہ مانے اور فرمایا کہ:

''حضرت عباسؓ نے نوے سال کی عمر میں بھی روزہ ترک نہ فرمایا اور سخت مشقت کے باوجود فدیہ دے کر روزہ

---

(۱) امداد الاحکام: ۱/۱۰۰-۱۰۵۔

چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے تو میں اس پر کیسے راضی ہو جاؤں''؟

بالآخر اسی سال ۱۳۹۴ھ کے ماہ ذیقعدہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا کراچی میں وفات ہوئی اور یہیں پاپوشنگر کے قبرستان میں مدفون ہوئے، آپ کے صاحبزادے نے تاریخ وفات ۱۳۹۴ھ نکالی ہے۔(۱)

حضرت مولانا محمد عثمان غنی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا محمد عثمان غنیؒ شرفاء کی قدیم آبادی دیورہ ضلع گیا کے خوش حال زمیندار خاندان میں ۱۵/رجب ۱۳۱۳ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۹۶ء روز چہارشنبہ کو پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کرنے کے بعد ذی قعدہ ۱۳۲۸/ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے ۳۵۔۱۳۳۴ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے لیکن رجب میں گھر چلے آئے، اس امتحان میں شریک نہ ہو سکے، پھر ۳۶۔۱۳۳۵ھ میں دوبارہ دورۂ حدیث میں شرکت کرکے فراغت حاصل کی، اس طرح آپ نے دو سال دورۂ حدیث میں شرکت کی۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند محض ایک درسگاہ نہ تھی اسے ہندوستان کے انقلابی اور حریت پسند علما کے مرکز کی حیثیت بھی حاصل تھی، چنانچہ دیوبند میں قیام کے دوران آپ کو اس وقت کے مشہور انقلابی عالم مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی قربت اور سرپرستی حاصل رہی، دراصل مولانا محمد عثمان غنیؒ کے چھوٹے چچا مولانا شاہ ولایت حسینؒ (فاضل دیوبند) کے مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے نہایت گہرے مراسم تھے، اس وجہ سے مولانا سندھیؒ آپ پر خاص توجہ اور شفقت فرماتے تھے، جب مولانا سندھیؒ نے ''مؤتمر الانصار'' اور ''جمعیۃ الانصار'' نام کی تنظیمیں قائم کیں تو ان کی سرگرمیوں میں مولانا محمد عثمان غنیؒ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ۱۹۱۱ء میں مرادآباد نیز ۱۹۱۲ء میں میرٹھ میں تنظیموں کے اجلاس میں پیش پیش رہے، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کا جو وفد بہار میں آیا تھا اس کے ایک رکن مولانا بھی تھے۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان ایک تاریخی موڑ پر کھڑا تھا، انگریزی داں قائدین انگریز حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی تدبیروں میں مصروف تھے، دوسری طرف علما کی جماعت حریت وآزادی کا پرچم بلند کئے ہوئے بڑی بڑی قربانیاں دے رہی تھی، ریشمی رومال کی تحریک کے تانے بانے بنے جا رہے تھے، بوریہ نشیں اور درویش صفت علما درسگاہوں، خانقاہوں اور حجروں سے حریت وآزادی کی روشنی پورے ملک میں پھیلا رہے تھے، انگریز حکمرانوں کی ان پر کڑی نگاہ تھی، بہت سارے گرفتار کر لیے گئے تھے، جو بچ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تحریک کو کن خطوط پر آگے بڑھایا جائے، لگ بھگ یہی زمانہ تھا جب مولانا محمد عثمان غنیؒ تعلیم کی تکمیل کے بعد شعبان ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں وطن واپس آئے اور یہاں آپ کی ملاقات ہندوستان کے مشہور عالم دین، سیاست داں اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے ہوئی، ملاقات کا یہ سلسلہ پہلے ہی سے تھا، مولانا محمد سجادؒ کے پیش نظر بہت سے منصوبے تھے، جن کو بروئے کار لانے کے لیے انہیں مناسب افراد کی تلاش تھی، ان کی مردم شناس نظروں سے مولانا محمد عثمان غنیؒ

کی شخصیت میں پنہاں گونا گوں جوہر پوشیدہ نہ رہ سکے۔

مولانا محمد سجادؒ نے آپ کو اپنی رفاقت کے لیے چن لیا اور یہ انتخاب غلط نہ تھا، بعد میں آپ ان کے معتمد ومشیر اور دست راست بن گئے، مولانا آزادیٔ وطن کی عملی جدوجہد سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے استحکام اور بقا کی خاطر ایک ایسی تنظیم کے لیے کوشاں اور فکرمند تھے جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہو اور جو مسلم معاشرہ میں اسلامی قوانین کے اجراء ونفاذ کے لیے پوری طرح ذمہ دار ہو، بالآخر ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹؍شوال ۱۳۳۹ھ کو مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صدارت میں پٹنہ میں ''جمعیۃ علماء بہار'' کا ایک غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا اور اس اجلاس میں ''امارت شرعیہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ صوبۂ بہار کی مشہور وممتاز ''خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف'' کے سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ بدرالدینؒ امیر شریعت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نائب امیر شریعت منتخب ہوئے، ۹؍(نو) ارکان پر مشتمل مجلس شوریٰ تشکیل پائی جس کے ایک رکن مولانا محمد عثمان غنیؒ بھی تھے اور یہ ارکان میں سب سے کم عمر تھے، پہلی مجلس شوریٰ کے نو ارکان یہ تھے۔ حضرت مولانا شاہ محمد محی الدینؒ، جو بعد میں امیر شریعت ثانی ہوئے، حضرت مولانا عبدالوہابؒ دربھنگہ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا قاضی شاہ محمد نورالحسنؒ، حضرت مولانا عبدالاحدؒ جالے، دربھنگہ، حضرت مولانا فرخند علی سہسرامیؒ، حضرت مولانا کفایت حسینؒ، حضرت مولانا زین العابدینؒ اور حضرت مولانا محمد عثمان غنیؒ۔ مجلس شوریٰ نے ۲۶؍سال کے اس عالم دین کو ''امارت شرعیہ'' کا پہلا ناظم مقرر کیا۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ نے مولانا محمد عثمان غنیؒ کے والد محترم کو دیورہ خط لکھا کہ ''عثمان غنی کو میں نے ''امارت شرعیہ'' کی نظامت کے لیے بلایا ہے آپ ان کو اجازت دے دیجئے گا، روکئے گا نہیں''۔

آپ مولانا محمد سجادؒ اور شاہ محمد قاسمؒ کے ساتھ ۹؍ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو پھلواری شریف پہونچے اور آپ نے ''خانقاہ مجیبیہ'' کے کمرے کو جو جنوب کی طرف بڑے دروازے کی دوسری منزل پر ہے دفتر کے لیے پسند کیا، اس طرح ۹؍ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ کو ''خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف'' میں ''امارت شرعیہ'' کا وہ تاریخی دفتر قائم ہوا، جہاں سے ہندوستان کی آزادی کا پرچم بلند ہوا جو آج بھی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ملت کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

یہ مولانا کی دینی وقومی زندگی کی ابتدا تھی، ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ میں ''امارت شرعیہ'' نے اپنا ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنا طے کیا، اور اس اخبار کا نام ''امارت'' رکھا جس کا پہلا شمارہ یکم محرم ۱۳۴۳ھ کو مولانا کی ادارت میں منظر عام پر آیا، اس اخبار کی ادارت اور امارت شرعیہ کی نظامت کے علاوہ مولانا شاہ محمد عباسؒ کے انتقال کے بعد دارالافتاء امارت شرعیہ کے آپ ہی مفتی مقرر ہوئے اور قریب پچاس سال تک آپ کے تفقہ اور افتا سے بہار کے عوام وخواص مستفید ہوتے رہے۔ آپ کو جزئیات فقہ اور افتا میں پورا عبور حاصل تھا، اس لیے صوبۂ بہار اور بیرون صوبہ کے بھی اکثر وبیشتر استفتا آپ کے پاس آتے تھے اور لوگ آپ کے مدلل جوابات سے مطمئن ہوتے تھے۔ تحقیق مسائل اور تشریح علوم

میں آپ سب لوگوں کے مستند اور معتمد علیہ تھے، بعض مسائل میں مولانا موصوف اپنی خاص رائے رکھتے تھے، جس سے ان کی اصابت فکر اور تفقہ کا پتہ چلتا ہے، آپ کے فتاویٰ سے دارالافتاء کو بڑا وقار اور اعتماد حاصل ہوا۔

''امارت'' کے پہلے ہی شمارے سے مولانا کے بلند مرتبہ اور صاحب طرز صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادب و صحافت کے میدان میں آپ کی حق گوئی اور بے باکی کے اوصاف نمایاں ہونے لگے، تاریخ صحافت آپ کے قلم کو ہمیشہ یاد رکھے گی، جس نے بزدلوں کو بہادری سکھائی، خدا ناشناسوں کو خداشناسی کا درس دیا، اثر، سادگی اور دل کشی کے اعتبار سے اس وقت دو ہی صحافت نگار تھے، پنجاب میں مولانا غلام رسول مہر، ایڈیٹر انقلاب، لاہور اور بہار میں مولانا محمد عثمان غنیؒ ایڈیٹر امارت ونقیب پھلواری شریف، سیاسی اور فقہی مسلک سے اختلاف کے باوجود، ہر شخص ان دونوں کا معترف، مداح اور معتقد تھا۔

وہ دور انگریزی حکومت کے عروج کا دور تھا، اس وقت اعلان حق وصداقت دار ورسن کی آزمائش کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن مولانا کبھی مرعوب نہیں ہوئے، حکومت برطانیہ کی فروگذاشتوں پر نہایت جارحانہ انداز میں گرفت کرنے کے نتیجہ میں حکومت نے آپ کی تحریروں پر بار بار مقدمے چلائے اور بالآخر جریدہ ''امارت'' کو غیر قانونی قرار دے کر بند کر دیا۔

اخبار ''امارت'' کے ۸؍مئی ۱۹۲۶ء کے اداریہ کو حکومت نے قابل اعتراض قرار دے کر اس شمارہ کو ضبط کر لیا اور مولانا پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا۔ ۲۷؍نومبر ۱۹۲۶ء کو عدالت زیریں نے ایک سال قید اور پانچ سو روپیہ کے جرمانے کی سزا سنائی۔ عدالت عالیہ میں اپیل کی گئی۔ ۲۷؍دسمبر کو اپیل کی منظوری کے بعد مولانا ضمانت پر جیل سے رہا ہو گئے، ہائی کورٹ نے قید کی سزا ختم کر دی، لیکن جرمانہ بحال رکھا جو ادا کر دیا گیا۔

اگست ۱۹۲۷ء میں بتیا میں ایک زبردست فساد ہوا جس کے خلاف آپ نے ۲۰؍صفر ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹؍اگست ۱۹۲۷ء کے ''امارت'' میں ایک اداریہ لکھا، حکومت بہار نے اس اشاعت کو ضبط کر لیا اور آپ پر زیر دفعہ ۱۵۳(ایف) مقدمہ چلایا، اس میں پھر ایک سال قید اور ڈھائی سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ ڈسٹرک جج کے یہاں اپیل دائر کی گئی، مولانا کے وکیل بہار کے معماروں میں سے ایک اور اس وقت کے مشہور قانون داں مسٹر علی امام تھے، ایک دن جیل میں رہ کر مولانا ضمانت پر رہا ہوئے۔ ۳۰؍اپریل ۱۹۲۸ء کو اپیل کا فیصلہ ہوا اور مولانا بری کر دیئے گئے۔ تیسری بار پھر حکومت بہار نے ۱۳۵۳ھ کے ''امارت'' کے ایک اداریہ کو قابل اعتراض قرار دے کر ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کر لی، جس کے ادا نہ کرنے پر حکومت نے اخبار کو بند کر دیا۔

اس کے بعد اخبار ''نقیب'' کا اجراعمل میں آیا، اس کے قانونی ایڈیٹر اس کے منیجر مولوی صغیر الحق ناصری مرحوم تھے، لیکن عملاً اس کے مدیر بھی مولانا ہی تھے، ہندوستان کی آزادی کے بعد ۲۰؍جمادی الاخریٰ ۱۳۶۸ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۱۹۴۹ء کے شمارہ سے ایڈیٹر کی حیثیت سے نقیب پر بھی آپ کا نام آنے لگا۔

حضرت مولانا سید محمد عثمان غنیؒ نے صرف امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے ہی دین وملت کی خدمات انجام نہیں دیں بلکہ ہندوستان کی قدیم ترین جماعت ''جمعیۃ العلماء'' سے بھی آپ کا اٹوٹ تعلق رہا۔ جب سے ''جمعیۃ العلماء'' بہار، کا قیام عمل میں آیا، آپ اس وقت سے تا زندگی ۱۳۹۷ھ تک اکسٹھ سال مجلس عاملہ کے رکن رہے اور اس درمیان نائب ناظم، ناظم، نائب صدر اور صدر کے عہدے پر فائز ہوتے رہے، مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس منتظمہ کے تا حیات رکن رہے تھے، ''جمعیۃ العلماء'' ہند، کے زیر انتظام دینی تعلیمی بورڈ کو بھی مولانا کا تعاون حاصل رہا، مولانا اس کی صوبائی شاخ کے صدر تھے۔

خاندانی شرافت ونسبی وجاہت نیز علمی عظمت کے ساتھ ساتھ تصوف وشریعت کے بھی جامع فرد تھے، ایک طرف تو آپ نے حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے متبحر محقق عالم سے شرف تلمذ حاصل کیا تو دوسری طرف ایک صاحب نسبت شیخ طریقت بزرگ حضرت شاہ فدا حسینؒ دیورہ ضلع گیا سے علوم طریقت حاصل کیا اور ان کی طرف سے بیعت و ارشاد کے مجاز بھی تھے، مگر عملاً کبھی آپ نے اس کو اختیار نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد عثمان غنیؒ جیسی فعال شخصیت کم وجود میں آتی ہے جو مختلف اقسام کے مشاغل ومناصب کو بحسن وخوبی پورا کرے اور جس میں ایسی جامع صلاحیت ہو کہ ہر ایک کام کے لیے موزوں اور راست آئے۔

۲۶/ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۸/دسمبر ۱۹۷۷ء یوم پنج شنبہ کو پھلواری شریف میں مولانا کا انتقال ہوا اور قبرستان ''خانقاہ مجیبیہ'' پھلواری شریف، میں آپ مدفون ہوئے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ کی ولادت دیوبند، ضلع سہارنپور میں ۲۰،۲۱/شعبان ۱۳۱۴ھ کی درمیانی شب (جنوری ۱۸۹۷ء) میں ہوئی، دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے آپ کا تعلق تھا مگر والدہ سادات سے تھیں، جب عمر پانچ سال کی ہوئی تو دارالعلوم میں داخلہ کرادیا گیا اور حافظ محمد عظیم کے پاس قرآن پڑھنا شروع کیا، فارسی کی تمام مروجہ کتابیں اپنے والد ماجد سے دارالعلوم ہی میں پڑھیں، حساب وفنون ریاضی اپنے چچا مولانا منظور احمد (مدرس دار العلوم دیوبند) سے حاصل کیے، عربی، صرف ونحو اور فقہ کی کتابیں بھی اپنے والد ہی سے پڑھیں۔

شعبان ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی اور مہتمم صاحب نے دارلعلوم ہی میں مدرس رکھ لیا، آپ کا ارادہ بلا معاوضہ تدریسی خدمت کا تھا، اس لیے دینی علوم کو کسب معاش کا ذریعہ نہ بنا کر فن خطاطی، جلد سازی اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، چنانچہ بعض کتابیں آپ ہی کے دستی خط سے شائع ہوئیں اور بعض کتابیں تو آپ کے پاس ایسی بھی

(۱) مقدمۂ فتاویٰ امارت شرعیہ: ۳۸/۲-۴۲۔

تھیں جن کے مصنف بھی آپ ہی تھے، کتابت بھی آپ ہی کی تھی، اور جلد سازی بھی خود ہی کی تھی، جب تدریس کے ساتھ افتا کی خدمت بھی آپ کے سپرد کی گئی تو کسب معاش کے لیے دوسرے کاموں کی فرصت نہیں مل سکی اور آپ کا بلا معاوضہ تدریسی خدمت کا خواب زیادہ دنوں شرمندہ عمل نہیں رہ سکا، ۱۳۴۹ھ میں آپ کو دارالافتاء کا صدر مفتی بنایا گیا، ۱۳۶۲ھ میں تحریک پاکستان میں آزادانہ حصہ لینے کی وجہ سے دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے اور ۲۰/ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی دعوت پر دستور اسلامی کی ترتیب کے لیے پاکستان منتقل ہوگئے، شوال ۱۳۷۰ھ میں دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی۔

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کے خصوصی شاگرد اور تربیت یافتہ تھے، مفتی صاحب کو آپ پر بڑا فخر اور اعتماد تھا، چنانچہ آپ کی تدریس کے آغاز ہی سے آپ کے استاذ بعض استفتا آپ کے حوالہ کردیتے تھے اور جب ۱۳۴۴ھ میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگئے تو چند سال مولانا ریاض الدین وغیرہ مختلف علما سے افتا کی خدمت متعلق رہی پھر ۱۳۴۹ھ میں مفتی شفیع صاحبؒ کو دارالافتاء میں صدر مفتی کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا گیا اور ۱۳۶۲ھ تک آپ نے اس عہدہ پر فائز رہ کر تقریباً چالیس ہزار فتاویٰ تحریر کئے۔ ۵/ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے لیکن عوام وخواص کے رجوع اور اپنے پیرومرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہدایت پر افتا کا سلسلہ جاری رکھا، تاہم ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۷۱ھ تک نو سالوں میں جو فتاویٰ آپ کے قلم سے نکلے انہیں محفوظ نہیں کیا جاسکا، پھر ۱۳۷۱ھ میں دارالعلوم کراچی کے شعبۂ افتا سے ۱۹۵۹ء تک جو فتاویٰ لکھے ان کی نقل محفوظ کی گئی جن کی تعداد ستر ہزار نو سو بارہ ہے ان کے علاوہ مقدمات کے فیصلے اور زبانی فتوؤں کی تعداد بے شمار ہے۔

آپ نے جدید مسائل کو اجتماعی آراء سے حل کرنے کے لیے ایک مجلس ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' کے نام سے قائم کی تھی، جس میں علامہ یوسف بنوریؒ، مفتی رشید احمدؒ (مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، پاکستان) اور دارالعلوم کراچی اور شہر کے خاص اساتذہ شریک ہوتے تھے اور ہر ماہ اس مجلس کے تحت اجلاس منعقد ہوتے تھے اور نو پیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کی جاتی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سب سے غالب پہلو جس کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوا، وہ خدمت افتا ہی ہے، چنانچہ فراغت کے فوری بعد ہی سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے آپ کو اس کام میں مصروف رکھا یہاں تک کہ زندگی کا سب سے آخری کام فتویٰ نویسی ہی کا کام تھا چنانچہ اپنی وفات سے صرف چند گھنٹے قبل بھی ایک استفتا کا جواب لکھوایا تھا۔ آپ کے فقہی مقام کا اندازہ فتاویٰ کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے، نیز عوام وخواص کا آپ کی طرف رجوع اور اکابر علما کا اعتماد بھی فقہ وفتاویٰ میں آپ کے عالی مقام کا پتہ دیتے ہیں۔

فقہ وفتاویٰ سے منسلک دوسرے علما کے درمیان آپ کو کئی پہلوؤں سے امتیاز حاصل تھا اور کئی اعتبار سے آپ کی ذمہ داریاں بڑھی ہوئی تھیں مثلاً:

(۱) نئی ایجادات: آپ کے زمانہ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسی ایسی نئی ایجادات آگئیں جو آپ سے پہلے نہیں تھیں اور ان کے بارے میں فقہی جزئیات بھی خاموش تھیں اس لیے آپ نے بڑی محنت اور دقت نظر سے ان مسائل کو حل فرمایا۔

(۲) دارالعلوم کی مرکزیت: آپ کے زمانہ میں دوسرے مفتیان بھی تھے مگر ان کے فتاویٰ کا وہ اثر نہیں تھا جو آپ کے فتاویٰ کا تھا اور اس کی وجہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت تھی، چنانچہ اس مرکزیت کے احساس کی وجہ سے آپ بڑی ذمہ داری سے اور خوب سوچ سمجھ کر کسی استفتا کا جواب لکھتے تھے۔

(۳) غیر مسلم حکومت: آپ سے پہلے کے علما نے کسی قدر مسلم حکومت کو پایا تھا جس میں نہ غیر اسلامی معاملات کی ترویج زیادہ تھی اور نہ اسلامی احکام پر کسی طرح کی رکاوٹ، جب کہ آپ کے زمانہ میں انگریزوں کا غلبہ بڑھا ہوا تھا اور مظالم کے طوفان امنڈ پڑے تھے ایسے وقت میں کسی بھی فتویٰ کی غلط تشریح وتوضیح کر کے علما کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور انہیں عتاب کا شکار بنایا جاتا تھا اس لیے بڑی احتیاط اور بڑے غور وخوض کے بعد جچے تلے الفاظ کے ساتھ آپ کو جوابات لکھنے پڑتے تھے۔

(۴) اکابر کے فتاویٰ کی کم یابی: آپ سے پہلے والوں کو صلاحیت مند اساتذہ اور علما کی بڑی تعداد میسر تھی جن سے رجوع ہوکر کسی مسئلہ کا جواب دینا آسان تھا اور آپ کے بعد کے علما کے سامنے مختلف مسائل پر دی گئیں اکابر کی آراء اور ان کے فتاویٰ موجود تھے جب کہ آپ کی زندگی کے بڑے حصے میں ایسے اکابر علما بھی نہیں تھے جن سے رجوع ہوتے اور نہ اکابر کے فتاویٰ مرتب تھے جن سے رہنمائی لی جاسکتی تھی۔

(۵) مسائل کی تحقیق: آپ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ عموماً علما انہیں مسائل کے جوابات لکھتے تھے جو ان سے پوچھے گئے ہوں، لیکن آپ نے ان کے علاوہ اس وقت امت کو جو مسائل پیش آسکتے ہیں اور جن مسائل میں امت کی رہنمائی کی ضرورت تھی بغیر پوچھے بھی آپ نے ان مسائل کی پوری تحقیق فرمائی اور قرآن وحدیث اور اصول اسلام کی روشنی میں امت کی رہنمائی فرمائی۔

فتاویٰ نویسی میں آپ کا جو منہج اور طریقۂ کار تھا اسے درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) سب سے پہلے آپ یہ دیکھتے تھے کہ استفتا جواب دینے کے لائق ہے یا نہیں کیوں کہ بسا اوقات حاصل کرنے کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ مخالف کو زیر کرنا یا فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اس لیے آپ ایسے استفتا کا جواب نہیں لکھتے تھے بلکہ نصیحت کردیا کرتے تھے، چنانچہ ایک صاحب کا استفتا آیا کہ فلاں امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے کیا انہیں ایسا کرنا چاہیے تو آپ نے جواب لکھا کہ یہ سوال تو خود امام صاحب سے پوچھنے کا

ہے انہیں کہئے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم کرلیں۔

(۲) نظریاتی (غیر عملی) سوالات کی آپ حوصلہ شکنی کیا کرتے تھے، چنانچہ آپ سے پوچھا گیا: ''یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں''؟ آپ نے جواب دیا کہ یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیے۔

(۳) فتاویٰ لکھتے وقت آپ اس پہلو سے بھی بہت غور کرتے تھے کہ اس جواب کا نتیجہ کیا ہوگا، مثلاً کوئی مباح چیز ہے، مگر اس سلسلہ میں کھلی چھوٹ دینے سے معصیت تک پہونچنے کا اندیشہ ہے، ایسے وقت میں فتویٰ کے بجائے مشورہ لکھا کرتے تھے کہ یہ عمل مناسب نہیں ہے، یا اس سے گریز کرنا چاہیے۔

(۴) فتویٰ کی عبارت میں فقہی اصطلاحات سے بھی بہت گریز کرتے تھے اور ایسا لکھتے تھے کہ فقہ کی شوکت اور فقہی باریکیاں بھی برقرار رہے اور عام لوگوں کے لیے سمجھنا بھی آسان ہو، مثلاً ترکہ کے مسئلہ میں عموماً علما جواب اس طرح لکھتے ہیں: ''مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا......''۔ اب جو شخص ''حقوق متقدمہ علی الارث'' سے واقف ہی نہ ہو اور دین سے اس بے اعتنائی کے دور میں انہیں اس کا مطلب بتانے والا بھی کوئی نہ ہو وہ ترکہ کس طرح تقسیم کریں گے؟ اس لیے آپ وراثت کے مسئلہ میں جواب اس طرح لکھتے ہیں:

صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو نقدی، زیور، جائیداد، یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو، اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں، پھر مرحوم کے ذمہ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے اور بیوی کا مہر اگر ابھی ادا نہیں ہوا ہو تو وہ بھی دین میں شامل ہے اس کو ادا کیا جائے پھر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ۱/۳ کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے گا، اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے گا......۔

(۵) کسی مسئلہ کا جواب مفصل و مدلل لکھنا ہو تو آپ تمہید اور دلائل کے ساتھ فتویٰ نہیں لکھتے تھے بلکہ پہلے اصل مسئلہ کا مختصر اور سادہ حکم لکھتے تھے تا کہ طالب کا مقصد پہلے ہی جملہ سے پورا ہو جائے اور ایسا اختلاط نہ ہو کہ عام آدمی کے لیے مسئلہ سمجھنا مشکل ہو جائے اس کے بعد دلائل وغیرہ کی تفصیل لکھتے تھے تا کہ علما اور دلائل معلوم کرنے والوں کو بصیرت حاصل ہو سکے۔

(۶) اگر سوال کرنے والے نے گڈ مڈ کر کے مفصل استفتا لکھا ہو اور اس میں کچھ زائد باتیں بھی آ گئی ہوں جن سے حکم پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو، تو آپ پہلے ان سوالات کا تجزیہ کر کے انہیں نمبروار لکھتے تھے پھر ان کے جوابات بھی نمبروار تحریر فرماتے تھے۔

(۷) کسی مسئلہ کی طرف آپ کے دل کا میلان ہوتا اور اکابر سے اس سلسلہ میں واضح رائے نہیں ملتی تو آپ تفرد اختیار کرنے اور اپنی الگ رائے لکھنے سے بہت گریز کرتے تھے اور اس سے آپ کو سخت نفرت تھی چنانچہ ایسے

سوالات کو مؤخر کردیتے تھے اور کافی تلاش وجستجو کے بعد جب اکابر کی تائید حاصل ہوجاتی تب آپ اس کا جواب لکھتے تھے تاکہ الگ الگ لوگوں کی آراء کی وجہ سے امت انتشار کا شکار نہ ہوجائے۔

آپ کی وفات دس اور گیارہ شوال ۱۳۹۶ھ کی درمیانی شب میں کراچی (پاکستان) میں ہوئی، علمی وقلمی سرمایوں میں سب سے اہم اور متبرک سرمایہ ۸/جلدوں میں قرآن مجید کی مفصل اردو تفسیر ''معارف القرآن'' ہے جو عوام وخواص کے لیے یکساں مفید ومقبول ہے، اس کے بعد آپ کے گہربار قلم سے نکلے ہوئے تقریباً ڈیڑھ لاکھ فتاویٰ ہیں جن میں سے ایک حصہ ''امداد المفتیین'' کے نام سے شائع ہوا ہے، ''امداد المفتیین'' دارالعلوم دیوبند میں آپ کے لکھے گئے فتاویٰ کے سولہ رجسٹروں میں صرف ایک رجسٹر کا بعض حصہ ہے، ان کے علاوہ آپ کی باضابطہ تصانیف ڈیڑھ سو سے زائد ہیں، ذیل میں آپ کی چند مشہور تصنیفات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) جواہر الفقہ (۲/جلدیں): یہ آپ کے چوالیس فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔

(۲) احکام القرآن: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حکم پر اور ان کی نگرانی میں کئی علما نے مل کر اس کام کو کیا ہے، اس میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے پانچویں اور چھٹی منزل کا کام کیا ہے، جس کی اشاعت ''**أحكام القرآن للتهانوي**'' کے نام سے ہوئی۔ یہ کتاب عربی زبان میں فقہی ترتیب پر لکھی گئی ہے اور قرآن مجید سے حنفی مسلک کے دلائل کو واضح کیا گیا ہے۔

(۳) آلات جدیدہ کے شرعی احکام: اس کتاب میں ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، انجکشن، ایکسرے، ہوائی جہاز، لاؤڈ اسپیکر، فوٹو گرافی، سنیما اور فلم، خون کا عطیہ اور اعضا کی پیوندکاری وغیرہ سے متعلق احکام شرعیہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) اسلام کا نظام زرعی: یہ کتاب ہندوستان کی زمین کے عشری یا خراجی ہونے کے بارے میں ہے، ہندوستان میں زمین کے عشری یا خراجی ہونے کا فیصلہ فرمایا ہے، بڑی محنت کے بعد یہ کتاب مرتب ہوئی ہے۔

(۵) فتوح الہند: نظام زرعی کی تحقیق کے دوران آپ نے جو فتوحات کی تاریخ پڑھی اسی کو آپ نے جمع فرما کر فتوح الہند کے نام سے شائع فرمایا۔

(۶) اوزان شرعیہ: فقہ میں جو اوزان، پیمانے، مد، اوقیہ، رطل اور صاع وغیرہ کا ذکر آتا ہے وہ پیمانے چونکہ اس وقت موجود نہیں ہیں اس لیے موجودہ اوزان میں ان کو منتقل کرنا ضروری تھا، کیوں کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے علما سے بھی چوک ہوجاتی تھی، اس لیے آپ نے باضابطہ جنگلوں اور کھیتوں میں جاکر اپنے ہاتھوں سے اصلی اور متوسط ''رتی'' توڑ کر اسی طرح ''جو'' وغیرہ لے کر ان کے ذریعہ وزن مقرر کیا، اس طرح یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر بعد کے علما کے لیے بڑی مفید اور بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق ہے۔

(۷) ختم نبوت کامل: اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل کتاب ہے جس میں قرآن مجید کی سو سے

زائد آیات، دوسو دس احادیث اور سینکڑوں اقوال وآثار صحابہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا اور کسی اور کی نبوت کا ناممکن ہونا بیان کیا گیا ہے، نیز قادیانیوں کے اشکالات کے مدلل اور دلنشیں جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔

(۸) کشکول: یہ آپ کے مختلف فقہی، تاریخی اور اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے نیز اس کے آخر میں آپ کے اردو، فارسی کے اشعار اور قصائد بھی شامل ہیں۔

ان کے علاوہ اسلام کا نظام تقسیم دولت، رفیق مع احکام سفر الحج، قرآن میں نظام زکوٰۃ، بیمہ اور انشورنس کی شرعی حیثیت، پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ، احکام القمار، تصویر کے شرعی احکام، رؤیت ہلال کے شرعی احکام، احکام دعا اور اسلامی ذبیحہ جیسی تصانیف بھی قلمی شاہکار ہیں۔(۱)

حضرت مولانا مفتی عبد الکریم گمتھلویؒ:

حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب رحمہ اللہ کا وطن ضلع کرنال کی تحصیل کا مشہور قصبہ ''گمتھلہ گڑھو'' تھا، ۱۵ر محرم ۱۳۱۵ھ میں ولادت ہوئی، پانچ سال کی عمر میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا تھا، والد جناب حکیم محمد غوث صاحب دھلی کے مشہور حکیم ہوئے ہیں، فارسی ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے اور دھلی کے مشہور نقشبندی خاندان سے بیعت وارادت کا تعلق تھا۔

قرآن شریف اور نوشت وخواند کی تعلیم اپنے قصبہ میں پیر جی محمد اسحٰق صاحب وغیرہ سے حاصل کی، پھر سہارنپور کے شہرۂ آفاق مدرسہ ''مظاہر علوم'' میں داخل ہو کر شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی زیر سرپرستی درس نظامی کی باقاعدہ تحصیل شروع فرمادی۔

اسی اثنا میں درس نظامی کا کچھ حصہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے زیر سایہ خانقاہ تھانہ بھون میں مولانا انوار الحق امروہویؒ اور سید احمد حسن سنبھلیؒ سے پڑھنے کا موقع ملا، گاہ بہ گاہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے علمی استفادہ فرماتے رہے۔

''مدرسہ عبد الرب دھلی''، میں حضرت مولانا عبد العلی صاحبؒ سے حدیث کی دو مشہور کتابیں مسلم شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھیں، مولانا عبد العلی صاحبؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردوں میں امتیازی شان رکھتے تھے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے حدیث کی مشہور کتابیں ''صحاح ستہ'' اور ''مُوَطّین'' کی اور علوم نقلیہ وعقلیہ کی قلمی سند بھی حاصل تھی۔

فراغت کے بعد حضرت سہارنپوریؒ کے ایماء پر موضع اجراڑہ ضلع میرٹھ کے ایک مدرسہ میں تدریس پر مامور ہوئے

(۱) فضلاء دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۷۱-۲۸۲۔

اس کے بعد مختلف مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

بعد ازاں تھانہ بھون میں اپنے پیر و مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی رہنمائی میں تدریس و تالیف اور تبلیغ و فتویٰ کی خدمات میں مشغول ہو گئے، اور تقریباً پچیس سال اس خانقاہ سے تعلق رہا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے آپ مجاز صحبت ہیں۔

اسی پچیس سالہ دور میں تقریباً ایک سال آپ نے حیدر آباد، سندھ میں بھی تدریسی اور تبلیغی امور انجام دیئے، کچھ مہینے ریواڑی کے عربی مدرسہ میں بحیثیت مدرس قیام فرمایا۔

حضرت حکیم الامتؒ کو مفتی صاحبؒ پر حد درجہ اعتماد تھا، بڑے بڑے اہم کاموں کی انجام دہی پر آپ کو مامور فرماتے اور اپنے علمی، تحقیقی اور تبلیغی کاموں میں شریک رکھتے تھے۔

۱۳۴۱ھ میں آگرہ کی طرف سے فتنۂ ارتداد کی خبر پہنچی کہ وہاں آریہ، مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر رہے ہیں، حضرت حکیم الامتؒ نے اس فتنہ کے سد باب کے لئے مفتی صاحب مرحوم اور مولانا عبدالمجید بچھرانوی کو روانہ کیا، یہ دونوں حضرات وہاں دو سال تک تبلیغی جدو جہد فرماتے رہے، قرآن شریف کی تعلیم کیلئے وہاں تقریباً ایک سو مکاتب قائم کئے جن کی مالی امداد میں حضرت تھانویؒ نے کافی حصہ لیا، بحمد اللہ یہ کوششیں کامیاب ہوئیں، اس جدو جہد میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہ کی معیت بھی حاصل رہی، جس پر حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے والا نامہ میں بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔

صوبۂ پنجاب میں وراثت کا قانون شریعت کے خلاف نافذ تھا، مثلاً بہن اور بیٹی کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا، مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے اچھے خاصے دیندار مسلمان بھی حصہ نہ دیتے تھے، حضرت حکیم الامتؒ کو اطلاع ملی تو مفتی صاحبؒ کو دو مرتبہ پنجاب کے دورے پر بھیجا کہ وہاں شرعی قانون کی نشر و اشاعت کریں، اور اس غیر شرعی قانون کو تبدیل کرانے کے لئے وہاں کے بااثر لوگوں کو آمادہ کریں، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک رسالہ ''غصب المیراث'' بھی تالیف فرمایا، جو ایک سفر میں ریل میں بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں تحریر فرمایا تھا حضرت حکیم الامتؒ نے یہ رسالہ دو مرتبہ چھپوا کر بذریعہ ڈاک تقسیم فرمایا، ان مساعی کا اثر یہ ہوا کہ سفر پنجاب ختم ہونے سے پہلے ہی لوگوں نے قانون بدلنے کیلئے سعی شروع کر دی جس کے کچھ اثرات پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ظاہر ہوئے کہ قانون میں کسی قدر اصلاحات شرعی ضابطوں کے مطابق کر دی گئیں۔

غالباً ۱۳۴۶ھ یا ۱۳۴۷ھ میں ریاست انور میں دینی تعلیم کے تمام چھوٹے بڑے مدارس حکومت نے یک قلم بند کر دیئے تھے، دہلی میں بھی جبر یہ تعلیم کی وجہ سے قرآنی مکاتب کو حکماً توڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، وہاں گیارہ مکتب ٹوٹ چکے تھے، حضرت حکیم الامتؒ نے اس حکم کو منسوخ کرانے اور متعلقہ قانونی چارہ جوئی کے لئے دھلی بھیجا، مفتی

صاحبؒ کی لگا تار جدوجہد سے بحمد اللہ کامیابی ہوئی اور اس کے بعد کوئی مکتب بند نہ کیا جا سکا، دوسرے مقامات پر بھی دہلی کی کوششوں کے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے۔

آپ تحریک قیام پاکستان کے پرزور حامی تھے، اس زمانہ میں حضرت حکیم الامتؒ نے جو وفود قائد اعظم کے پاس بغرض تبلیغ ومشورہ بھیجے، ان میں آپ کو بھی شریک کیا گیا تھا۔

مفتی صاحبؒ کو مناظرے کا ملکہ بھی خوب حاصل تھا، حیدرآباد سندھ اور انبالہ (پنجاب) میں مرزائیوں سے آپ کے دو مناظروں کی روئداد ''بزم اشرف کے چراغ'' میں نقل کی گئی ہے جن میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔

کئی بلند پایہ تصانیف آپ کی صدقہ جاریہ ہیں جو بیشتر حکیم الامتؒ کی رہنمائی اور فرمائش پر لکھی گئی ہیں، اور سب کا تعلق فقہ وفتویٰ سے ہے۔ چند تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) الحیلۃ الناجزۃ: ہندوستان میں شرعی قاضی مقرر نہ ہونے کی وجہ سے شادی شدہ عورتوں کو بعض حالات میں سخت مصائب کا سامنا ہو رہا تھا، حضرت حکیم الامتؒ نے ان مسائل میں شدید ضرورت کی بنا پر مالکی مسلک اختیار فرمایا اور ان مشکلات کے حل کی بہت آسان صورتیں تجویز فرمائیں، جو کتاب ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں بیان کی گئیں، یہ ایک لحاظ سے اجتہادی نوعیت کا کارنامہ تھا، کئی سال تک فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی پوری تفصیلات نہایت احتیاط اور دقت نظر سے جمع کر کے نکالی گئیں، اس پورے کام میں حکیم الامتؒ نے مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کو اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریمؒ کو اول سے آخر تک شریک رکھا، درحقیقت یہ کتاب ان تینوں بزرگوں کا مشترک کارنامہ ہے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس کتاب کی تالیف کے دوران حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مرتبہ اظہار خوشنودی اور حوصلہ افزائی کے لئے ہم دونوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم دونوں میرے لئے بمنزلہ عینین ہو (عربی زبان میں ''عینین'' دو آنکھوں کو کہتے ہیں) ایک کے اول میں عین ہے (یعنی عبدالکریم) اور ایک کے آخر میں عین ہے (یعنی محمد شفیع)۔ اس کتاب کی تحقیق وتصنیف کے دوران حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ کئی کئی ہفتے دیوبند میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے پاس قیام فرماتے، دونوں بزرگ شب وروز ان پیچیدہ مسائل میں غور وفکر اور تبادلۂ خیالات فرماتے تھے، بحمد اللہ یہ کتاب طبع ہو کر اتنی مقبول ہوئی کہ عورتوں کی مذکورہ مشکلات میں اب ہر حنفی دارالافتاء سے فتویٰ اس کتاب کی روشنی میں لکھتے ہیں۔

(۲) تتمۂ إمداد الأحکام: یہ انہی ۵۰۱ فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو ''امداد الاحکام'' کا جز بن کر دارالعلوم کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔

(۳) المختارات: اس میں خیار بلوغ وغیرہ کے مفصل احکام موجودہ ضرورتوں کے مطابق لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کا جز بن کر شائع ہوا ہے۔

(۴) **وفاق المجتهدين عن وفاق المجتهدين:** اس میں ''حیلہ ناجزہ'' پر ہونے والے بعض علمی اشکالات کو رفع کیا گیا ہے۔

(۵) **تجدد اللمعة في تعدد الجمعة:** اس میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے شہر میں نماز جمعہ کے اجتماعات ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

(۶) **القول الرفيع في الذب عن الشفيع:** حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے رسالہ ''غايات النسب'' پر بعض لوگوں نے اعتراضات کئے اور فتنہ برپا کر دیا، تو حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ نے یہ رسالہ تصنیف فرمایا جس میں ان اعتراضات کا علمی جواب دیا گیا ہے۔

(۷) **ترجمہ نصوص خطبات الأحكام:** حضرت حکیم الامتؒ کی مشہور تالیف ''خطبات الأحكام'' جو بکثرت آیات واحادیث پر مشتمل ہے، مفتی صاحب مرحوم نے اس رسالہ میں ان آیات واحادیث کا ترجمہ ضروری افادات کے ساتھ کیا ہے اور بعض احادیث کا اضافہ بھی فرمایا ہے، یہ رسالہ اصل کتاب کے آخر میں عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔

(۸) غصب المیراث۔

۱۹۴۸ء میں اپنے اعزہ اور اہل وطن کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے، قصبہ ساہیوال ضلع سرگودھا میں قیام فرمایا، تقریباً سوا سال بعد یہیں بخار اور اسہال کے عارضہ میں ۹؍رجب ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں وفات پائی، کل عمر ۵۳؍سال چھ ماہ ۴؍دن ہوئی، اسی قصبہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔(۱)

حضرت مولانا قاری مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ:

حضرت مولانا قاری مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ کی پیدائش شوال ۱۳۲۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۳ء میں نوساری ضلع سورت، گجرات میں ہوئی، ۱۳۲۹ھ میں اپنے جدامجد حضرت مولانا سید ابراہیم لاجپوریؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا مگر ابھی پارہ عم ختم نہیں ہوا تھا کہ جدامجد کا انتقال ہو گیا، پھر اپنے والد بزرگوار اور عم بزرگوار حافظ حسام الدین قادری سے حفظ قرآن مکمل کیا، اسی دوران گجراتی اسکول میں درجہ اولیٰ کی تکمیل بھی کی، اور کچھ عرصہ جامعہ اشرفیہ راندیر کے درجۂ حفظ میں بھی داخلہ لیا، امور خانہ داری کی کچھ ذمہ داریاں اور ان کی مشکلات تھیں جو اس طرح منتقل کرتی رہیں اور اگر جذبۂ صادق کی دستگیری اور فضل خداوندی نہ ہوتا تو اس صغرسنی میں طالب علم کی شاہراہ پر گامزن رہنا مشکل تھا خصوصاً جبکہ اسی دوران شادی بھی ہو گئی تھی۔ ان کے والد صاحب کی کوشش سے نوساری میں مدرسہ محمدیہ کی داغ بیل ڈالی گئی اور والد محترم نے سلسلۂ درس شروع کیا، تو مولانا موسیٰ بھات اور یوسف میمن وغیرہما کے ساتھ آپ بھی مدرسہ

(۱) امداد الاحکام: ۱/۱۰۶-۱۱۰۔

میں درجۂ فارسی کے طالب علم بنے، آپ کی قرأت بہت اچھی تھی، اس لیے نوساری کے لوگوں نے امامت آپ کے سپرد کردی، اس دوران تعلیمی سلسلہ جاری تھا، حضرت مولانا محمد حسین صاحب اور حافظ موٹا صاحب نے آپ کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے آپ کو راندیر بلالیا اور وہاں کی مسجد کا امام مقرر کیا، وہیں مدرسہ محمدیہ عربیہ جامعہ حسینیہ راندیر میں درسیات کی تکمیل کی، ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں جب حضرت مولانا انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کی صدارت میں جامعہ کا چودھواں سالانہ اجلاس ہوا تو جامعہ کی طرف سے سند فراغت ملی۔

فرائض امامت کا پورا احساس رہا، جس کی وجہ سے درسی کتابوں کے علاوہ مسائل کی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا، اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہتر عطا فرمایا تھا، چنانچہ اس دور میں بہت سے مسائل کے حافظ بن گئے، درس نظامی کا سلسلہ شروع ہوا تو اساتذہ کی نگرانی میں فتاویٰ لکھنے کا کام بھی شروع کردیا، مشفق استاذ مولانا حسین صاحب آپ کو سوالات دیدیا کرتے تھے، توجہ اور تحقیق کے بعد جواب لکھتے تھے۔ افتا کے ساتھ درس قرأت کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔ آپ کے فتووں کو ہندوستان کے علمی مراکز میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ آپ نہ صرف تحریر اور فتویٰ کے لحاظ سے بلکہ عملی طور پر رد بدعات میں پیش پیش رہے، نوساری، سورت وغیرہ مقامات سے رسم ورواج کو دور کرنے میں کافی زحمت اٹھائی اور بڑی استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیا۔(۱)

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی پیدائش ۵ر مئی ۱۹۱۲ء مطابق ۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ کو مونگیر میں ہوئی اور اسی (۸۰) سالہ تعمیری اور تحریکی زندگی گذارنے کے بعد ۱۹ر مارچ ۱۹۹۱ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ تین سال کی عمر سے والد صاحب نے اپنے ساتھ رکھنا شروع کردیا اور سفر وحضر موقع بہ موقع آپ کی تربیت کرتے رہے، ۱۹۱۶ء میں تعلیم کی ابتدا ہوئی خود والد محترم سے قرآن کے ذریعہ تعلیم کی ابتدا کی، پھر ان کا داخلہ ''انجمن حمایت اسلام'' دلاور پور، مونگیر میں کرایا، یہاں آپ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک تعلیم حاصل کی، پھر والد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے ہمراہ حیدرآباد روانہ ہوئے وہاں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۴ء تک قیام رہا، اور مولانا عبداللطیفؒ صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی نگرانی میں عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بغرض تعلیم بھیجا۔ وہاں آپ نے چار سال تک تعلیم حاصل کی اس چار سالہ قیام کے دوران آپ کو وقت کے تمام بڑے علماء کرام مثلاً مولانا حیدر حسن خان، مولانا محمد شبلی متکلم، مولانا عبدالودود اعظمی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا حفیظ اللہ وغیرہ رحمہم اللہ سے استفادہ کا موقع ملا، دوران قیام ہی والد کا سایہ اٹھ گیا، عالمیت کے بعد آپ وطن واپس آئے، ۱۹۲۹ء میں گھر کے لوگ حج پر جارہے تھے ان کے ساتھ آپ نے محض ۱۷ر سال کی عمر میں اپنا پہلا حج کیا۔ آپ برادر بزرگ مولانا لطف

(۱) مقدمۂ فتاویٰ رحیمیہ جلد اول: ۵،۴۔

اللہ رحمانیؒ کی ہدایت پر ۱۹۳۰ء میں دار العلوم دیو بند میں اپنی تعلیمی تکمیل کے لیے داخل ہوئے اور دورۂ حدیث مکمل کیا، یہاں آپ نے مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا مفتی شفیع عثمانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا اصغر حسین رحمہم اللہ سے استفادہ کیا۔

دار العلوم سے فراغت کے بعد اپنے وطن تشریف لائے اس وقت آزادی کی جنگ عروج پر تھی، اس میں انہوں نے اکابر علما کے ساتھ حصہ لیا، ۱۹۳۷ء میں جب بہار اسمبلی کا پہلا الیکشن ہوا تو اس میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی طرف سے حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کی ایماء پر آپ نے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیاب ہو کر اسمبلی کے ممبر بنے، اس دور میں انہوں نے اوقاف پر ٹیکس کے خلاف خصوصی بحث کی اور آپ کو اس موضوع پر کامیابی ملی۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ نے ''جامعہ رحمانی'' کو اپنی زندگی کے آخری سال ۱۹۲۷ء میں قائم کیا تھا، ان کی زندگی میں ''جامعہ رحمانی'' بمشکل چھ ماہ چلا، پھر ان کے صاحبزادے مولانا لطف اللہ رحمانیؒ نے اس کو جاری رکھنے کی کوشش کی، مگر ۱۵؍ جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلہ میں خانقاہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا جس کے سبب مدرسہ کو بند کر دینا پڑا، ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا لطف اللہ رحمانیؒ کے انتقال کے بعد آپ ''خانقاہ رحمانی'' کے سرپرست اور سجادہ نشیں منتخب ہوئے، اور اسی سال جامعہ رحمانی کی از سرے نو ابتدا کی، ۱۱؍ نومبر ۱۹۵۹ء میں ''جامعہ رحمانی'' کی باضابطہ عمارت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں دار العلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، ۲۷؍ مارچ ۱۹۵۷ء میں ''امارت شرعیہ بہار واڑیسہ'' کے امیر شریعت بنائے گئے، آپ نے ''امارت شرعیہ'' کو منظم کرنے میں اپنی پوری صلاحیت صرف کر دی، جگہ جگہ دار القضاء قائم کیا، ''امارت شرعیہ'' اور مونگیر میں دار الافتاء قائم کروائے۔ ۸؍ اپریل ۱۹۷۳ء میں آندھرا پردیش کی راجدھانی حیدرآباد میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' بنایا گیا اور مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بورڈ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور آپ جنرل سکریٹری قرار پائے، آپ ہی اصلاً ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے بانی ہیں۔ حضرت مولانا کی زندگی میں ادارہ اپنی خدمات کے لحاظ سے کل ہند سطح پر نمایاں ہوا، جس وقت آپ امیر شریعت منتخب ہوئے ''امارت شرعیہ'' کا دفتر ''خانقاہ مجیبیہ'' پھلواری شریف کے ایک کمرے میں تھا، ایک عمارت حاصل کر کے دفتر کو وہاں منتقل کیا گیا، پھر لب سڑک سرکاری زمین حاصل کر کے اس پر عمارت کی بنیاد ڈالی اور عمارت کی تعمیر ہوئی۔

آپ تصنیف و تالیف کا خاص ذوق رکھتے تھے، دار العلوم دیو بند کے قیام کے دوران تعلیمی ہند کے نام سے جو کتاب لکھی وہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، ۱۹۳۷ء میں بہار اسمبلی میں ''اسلامی اوقاف'' پر محصول لگائے جانے کے خلاف ایک تحریری خطاب کیا جو بعد میں کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا، ۱۹۳۸ء میں ''ہندوستان کی صنعت وتجارت'' نامی کتاب لکھی، ۱۹۳۹ء میں ''مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی'' بہار کی جانب سے ہفت روزہ اخبار ''الہلال'' پٹنہ سے جاری ہوا اور مولانا

ابو المحاسن محمد سجادؒ نے آپ کو مدیر بنایا، ۱۹۵۰ء میں منکرین حدیث کے فتنہ کے سد باب کے لیے کتابت حدیث نامی رسالہ لکھا، ۱۹۵۴ء میں مدارس اسلامیہ کے نصاب کے لیے نصاب جدید مرتب کیا، ۱۹۵۸ء میں ''خانقاہ رحمانی'' میں تربیت قضا کے ہفت روزہ پروگرام میں بلا عنوان ایک مقالہ پڑھا جسے بعد میں ''قضا کی شرعی اور تاریخی اہمیت'' کے نام سے کتابی شکل دی گئی، جمال عبدالناصر صدر مصر، کی درخواست پر مصر کے سفر سے واپسی پر ''سفر مصر وحجاز'' لکھا، اسلامک اسٹڈیز سرکل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے مسلم پرسنل لا کے موضوع پر دوروزہ سیمینار میں مسلم پرسنل لا کے عنوان سے تقریر کی جو کتابی شکل میں شائع ہوئی، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی وفات کے بعد مولانا کے مکتوبات کو اکٹھا کر کے اس کو ''مکاتیب گیلانی'' کے نام سے شائع کیا، ۱۹۷۱ء میں ''نسبت اور ذکر و شغل'' نام سے کتابچہ جامعہ رحمانی سے شائع ہوا، ۱۹۷۳ء میں ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'' نامی کتاب شائع ہوئی، ۱۹۷۴ء میں ''متبنّیٰ بل ایک جائزہ'' شائع ہوا، ۱۹۷۴ء میں ہی ''مذہب، اخلاق اور قانون'' نامی رسالہ شائع ہوا، مسلم پرسنل لا کی افادیت و اہمیت پر ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلہ میں'' نامی کتابچہ شائع ہوا، ۱۹۷۵ء میں ''خاندانی منصوبہ بندی'' کتاب شائع ہوئی، ۱۹۷۷ء میں ۱۵؍صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ''تحفظ دین کا منصوبہ'' تحریر کیا، مسلمانوں کو ''یونیفارم سول کوڈ'' کے تصور سے واقف کرانے کے لیے کتاب لکھی، ۱۹۷۹ء میں ''مسلم پرسنل لا بحث ونظر کے چند گوشے'' کے موضوع پر تحریر شائع کی گئی اور مفت تقسیم بھی ہوئی، ۱۹۸۷ء میں ''نکاح وطلاق'' نامی کتابچہ لکھا، ۱۹۸۸ء میں ''حج کے روحانی، اخلاقی اور اجتماعی اثرات'' کے نام سے کتابچہ تحریر کیا، دارالعلوم دیوبند کی جانب سے تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر دوروزہ کانفرنس میں ''فتنۂ قادیانیت اور مولانا محمد علی مونگیری'' کے نام سے مقالہ پڑھا جو بعد میں شائع ہوا، ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی متفقہ رائے سے فقہ اسلامی کی تدوین کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی آپ نے ''اسلامی قانون'' کا مسودہ اپنی نگرانی میں علماء کرام سے تیار کروایا جواب مسلم پرسنل لا بورڈ سے شائع ہو چکا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی اہمیت وافادیت پر ''مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہرہ'' نامی کتابچہ کے ذریعہ عوام وخواص کو واقف کرایا۔

فقہ اور اصول فقہ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، خانقاہ رحمانی کے اندر مولانا نے ۲۰؍سال تک فتویٰ نویسی کی اہم خدمات انجام دی، آپ کے فتووں میں خاص بات یہ تھی کہ وہ فقہا کی کتابوں کے ساتھ قرآن وحدیث سے براہ راست استفادہ کرتے اور مسائل کا حل پیش کرتے جس سے جدید مسائل کے جواب میں آسانی ہوتی تھی۔(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد یاسین مبارکپوری رحمہ اللہ:

حضرت مولانا مفتی محمد یاسین مبارکپوری رحمہ اللہ کی ولادت یکم محرم الحرام ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۴؍فروری ۱۹۰۷ء کو پرانی

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے امیر شریعت رابع حیات وخدمات، ہمارے امیر، حیات رحمانی وغیرہ۔

بستی مبارکپور، اعظم گڑھ، یوپی میں ہوئی، والد صاحب کا نام عبدالسبحان مرحوم تھا۔ ابتدائی تعلیم پرانی بستی کے مایہ ناز عالم مولانا عبدالرحمٰن بن حاجی محمد قاسم مرحوم سے حاصل کی، قرآن شریف مولانا محمد سعید مرحوم صوفی سے پڑھا، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا، وہاں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں تعلیم حاصل کی، ۶/ شوال ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ تین سال کے بعد شعبان ۱۳۴۵ھ میں سند فراغت حاصل کی، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ اور علامہ ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ آپ کے خاص اساتذہ ہیں۔

فراغت کے بعد مفتی صاحبؒ تدریسی خدمات کے سلسلہ میں ماہ پنڈ اداون خان (پنجاب) میں رہے مگر دور دراز علاقہ اور سفر کی صعوبت کی وجہ سے مبارکپور کے قریب ہی موضع ابراہیم پور میں مدرسی قبول کر لی، پھر مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم نے ۱۳۴۹ھ میں احیاء العلوم بلالیا۔ یہاں ابتدائی عربی سے لے کر دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں اور فتویٰ نویسی کا کام بھی کیا۔

مفتی صاحبؒ بڑی تحقیق وتدقیق کے بعد فتویٰ دیا کرتے تھے، جزئیات پر کافی عبور تھا، زبانی جواب دینے کے بعد فوراً کتاب نکال کر دکھایا کرتے تھے، فتویٰ دینے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے، اگر کسی استفتا میں شبہ پیدا ہوتا تو بار بار تنقیح فرماتے تاکہ ہر پہلو سامنے آجائے اس کے بعد جواب دیتے تھے۔ مفتی صاحبؒ کے پاس استفسار مسائل کے لیے آنیوالوں میں ہر مسلک وعقیدہ کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ ۵۵/ سال تک احیاء العلوم سے منسلک رہے۔ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ احیاء العلوم'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آخر عمر میں ضعف اور اسہال کی شکایت ہوگئی، وفات سے چند ماہ قبل آنکھ کا آپریشن کرایا تھا۔ ۲۲/ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۳ء جمعہ وشنبہ کی درمیانی رات میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ (۱)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی ولادت ۹/ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۵ھ جمعہ کی شب گنگوہ میں ہوئی، والد کا نام حاجی خلیل ہے، سلسلۂ نسب میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، ابتدا میں مولانا امتیاز حسین اور اپنے والد صاحب سے فارسی کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۴۱ھ میں مظاہر علوم میں علم الصیغہ کی جماعت (عربی دوم) میں داخلہ لیا اور جلالین (عربی ششم) تک تعلیم حاصل کی، جلالین اور حماسہ مولانا اسعد اللہ صاحب سے پڑھی، درمیان میں طبیعت دوبارہ خراب ہوگئی، اس لیے تعلیم میں کچھ وقفہ بھی ہو گیا۔ ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، دارالعلوم دیوبند میں تین سال رہے اور ۱۳۵۰ھ میں دورۂ حدیث مکمل کیا۔ اپنے والد صاحب کی خواہش پر اور

(۱) مقدمہ فتاویٰ احیاء العلوم مبارکپور: ۴۰/ تا ۴۸/۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی اجازت سے مزید بزرگوں سے نسبت حاصل کرنے کے لیے دوبارہ مظاہر علوم تشریف لے گئے اور دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۵۱ھ میں جب مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمل پوریؒ سے شرح عقود رسم المفتی پڑھ رہے تھے اور فتاویٰ نویسی کی تربیت بھی پا رہے تھے اس وقت وہاں کے دارالافتاء میں کچھ شخصیات کی کمی ہوگئی تو حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خواہش پر دارالافتاء میں معین مفتی کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، دوسرے سال دارالافتاء کا نائب مفتی بنا دیا گیا اور اس منصب پر تقریباً بیس سال رہے، مگر تواضع کی حد یہ تھی کہ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ معین مفتی ہی لکھا، کبھی نائب مفتی نہیں لکھا۔ طبیعت اکثر خراب رہا کرتی تھی، طالب علمی میں بھی بہت بیمار رہا کرتے تھے اور فراغت کے بعد بھی، چنانچہ مظاہر علوم کے اس قیام کے زمانہ میں طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی، اس لیے ڈاکٹروں نے آب وہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا، چنانچہ مظاہر علوم سے مستعفی ہوکر گھر تشریف لے آئے، پھر ۱۳۷۳ھ میں جامع العلوم کانپور بھیج دیا گیا تاکہ آب وہوا بھی بدل جائے اور ایک ضرورت خدمت بھی انجام پا سکے، وہاں مدرسین کی کمی کی وجہ سے ایک دن میں چودہ چودہ اسباق پڑھاتے تھے اور ساتھ ہی افتا کی خدمت اور اصلاح کا کام بھی کرتے تھے، اس طرح تقریباً بارہ سال وہاں خدمت انجام دی، جامع العلوم کانپور میں قیام کے دوران کئی بار مظاہر علوم سے تقاضہ آیا کہ مظاہر علوم آجائیں، ادھر دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں بعض اکابر کے رخصت ہوجانے کی وجہ سے جگہ خالی ہوگئی تھی اور کسی اچھے مفتی کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی تھی، اس لیے دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں نے بھی یہاں آنے کے لیے اصرار کیا، اس طرح ۲۶/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۳/ ستمبر ۱۹۶۵ھ کو دارالافتاء دارالعلوم میں صدر مفتی کی حیثیت سے کام شروع فرمایا۔ دارالعلوم کے قیام کے زمانہ میں شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحبؒ کا اصرار تھا کہ بخاری کا بھی درس دیں، لیکن اس سے کتراتے رہے، تاہم جب مولانا فخرالدین صاحبؒ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو ۱۷/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳/ اگست ۱۹۶۸ھ کو بخاری جلد ثانی کا درس بھی متعلق ہوگیا اور تقریباً بارہ سال بخاری جلد ثانی کا درس دیا، پھر ۱۴۰۲ھ کو مظاہر علوم میں قیام منظور فرمالیا اور وہاں صدر مفتی کی حیثیت سے تقرر ہوگیا، اس دوران فتاویٰ نویسی اور دارالافتاء کی نگرانی کے علاوہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے فتاویٰ کی ترتیب کا بھی کام کیا اور فقہ واصول فقہ اور حدیث کی بعض کتابوں کا درس بھی متعلق رہا نیز حضرت شیخ کے ہجرت فرماجانے کی وجہ سے بیعت وارشاد کا کام بھی کرتے تھے تاہم اس قیام کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند سے رشتہ بالکل ٹوٹا بھی نہیں تھا بلکہ دارالعلوم دیوبند کی نئی انتظامیہ کی خواہش پر دارالعلوم کے دارالافتاء کی بھی نگرانی فرماتے رہے اور ہفتہ میں ایک دن اپنے کو دارالعلوم کے دارالافتاء کے لیے فارغ کرلیا تھا۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا جب وصال ہوگیا تو مظاہر علوم میں بھی وہی کچھ دیکھنے کو ملا جس کے نظارہ کی تاب نہ لاکر دارالعلوم دیوبند کو خیرآباد کہا تھا، چنانچہ اس قضیہ کی وجہ سے مظاہر علوم سے علاحدہ ہوگئے

ادھر دارالعلوم والے واپس لانا چاہ ہی رہے تھے اس لیے مظاہر علوم سے علاحدگی کے بعد باضابطہ دارالعلوم کی انتظامیہ نے یہاں آنے کی خواہش کی جسے قبول کرلیا اور دوبارہ اس مسند پر آ گئے جس کو آپ کا شدت سے انتظار تھا اور تقریباً اٹھارہ سال مسلسل یہاں خدمت انجام دی، یہاں فتاویٰ نویسی کا کام بھی کرتے تھے، افتا کے طلبہ کی تربیت بھی کرتے تھے، حدیث اور افتا کی بعض کتابوں کا سبق بھی پڑھاتے تھے اور بیعت وارشاد کا کام بھی جاری تھا۔

اللہ نے مختلف علوم وفنون میں مہارت اور درک سے نوازا تھا، تدریس، اصلاح، مناظرہ، سلوک وغیرہ مختلف جہات میں دین محمدی اور امت محمدیہ کی خدمت انجام دی، تاہم سب سے نمایاں خدمت ''خدمت افتا'' ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ افتا کی خدمت طالب علمی ہی سے شروع کر دی تھی کیوں کہ جس وقت مظاہر علوم میں رسم المفتی پڑھ رہے تھے اور فتاویٰ نویسی کی تربیت پا رہے تھے اسی وقت وہاں کا معین مفتی بھی بنا دیا گیا تھا اور اپنے اساتذہ کی نگرانی میں استفتا کے جواب لکھنے لگے تھے پھر بیس سال تک مظاہر علوم میں نائب مفتی کی حیثیت سے کام کیا، پھر جب کانپور گئے تو وہاں بھی دوسرے کاموں کے علاوہ نمایاں طور پر بارہ سال تک افتا کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند جیسے فقہ وفتاویٰ کے مرکز نے صدر مفتی کی حیثیت سے مدعو کیا اور درمیان میں معمولی وقفہ کے ساتھ ۱۸ر سال اس عظیم منصب پر فائز رہے اور پورے ہندوستان بلکہ بیرون ہند سے بھی آئے استفتا کے جوابات تحریر فرماتے تھے، درمیانی وقفہ میں مظاہر علوم میں دوبارہ صدر مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دی، غرض نصف صدی سے زیادہ (۶۶ر سال) افتا کی خدمت انجام دی اور اپنے گہربار قلم سے تقریباً دس ہزار استفتاءات کے جواب تحریر فرمائے اس لیے بجا طور پر دنیا فقیہ الامت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

فقہ وفتاویٰ میں اس درجہ مہارت تھی کہ کانپور کے قیام کے زمانہ میں بعض فتاویٰ مظاہر علوم سے بھیجے جاتے تھے اور کانپور سے جواب لکھ کر روانہ کرتے تھے نیز خواہش کی گئی تھی کہ رمضان کی فرصت میں مظاہر علوم تشریف لے آیا کریں اور یہاں فتاویٰ کے رجسٹر دیکھ لیا کریں اور جہاں کہیں سقم رہ گیا ہو اس کی نشان دہی کر دیں، اسی طرح مظاہر علوم کے قیام کے زمانہ میں ہفتہ میں ایک دن دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی دیکھ بھال کے لیے دیوبند بلایا جاتا تھا اور جب دارالعلوم دیوبند میں تھے تو مظاہر علوم کے دارالافتاء کی نگرانی متعلق تھی اور وہاں کے مفتیان کو ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی بھی اہم فتویٰ مفتی صاحب کو دکھائے بغیر اور ان سے دستخط کرائے بغیر نہ بھیجا جائے، کسی بھی استفتا کا جواب بڑی محنت اور عرق ریزی سے دیا کرتے تھے ان کے فتاویٰ پر اکابر کو بہت اعتماد تھا خاص کر حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ اعتماد فرماتے تھے اور آپ کو ''میرے مفتی صاحب'' کہا کرتے تھے اور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ ہی سے رائے لیتے تھے۔

مفتی صاحبؒ انتہائی ذکی اور عبقری شخصیت کے مالک تھے، قوت حافظہ، ذہانت، حاضر جوابی اور حاضر دماغی کی مثال دی جاتی تھی، قرآنی آیات اور احادیث کے علاوہ سیکڑوں واقعات، کہانیاں، لطائف اور اشعار، فقہی عبارات

اور جزئیات بھی زبانی نقل فرمادیتے تھے اور ایک مفتی کے اندر جتنے علوم کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام علوم آپ میں موجود تھے، درس اور مسئلہ کے بیان کے دوران بھی عام طور پر گفتگو میں مزاج کا عنصر ضرور ہوتا تھا جس کی وجہ سے آپ کے بارعب اور وجیہ ہونے کے باوجود آپ سے استفادہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی تھی اور بحث ومناظرہ میں تو حاضر جوابی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔

فتاویٰ لکھنے کا کیا طریقہ تھا اور فتاویٰ نویسی میں کن کن باتوں کا خیال رکھتے تھے ان کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاتا تھا۔

(۱) عموماً جواب انتہائی مختصر لکھا کرتے تھے اور خط بہت ہی پاکیزہ رہتا تھا لیکن اگر استفتا علما کی طرف سے آیا ہوتو اس کا جواب مفصل اور مدلل لکھتے تھے۔

(۲) جواب ایسی قیود وشرائط کے ساتھ لکھتے تھے کہ کسی لفظ پر کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہو اور حکومت یا غلط لوگ جواب کی عبارت سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جواب لکھنے میں صرف اصول پر اکتفا کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ جب تک فقہی جزئیہ نہ مل جائے اس وقت تک فتویٰ نہیں لکھتے تھے اور اس میں بڑی مہارت تھی، یہاں تک کہ اگر کوئی جزئیہ کسی غیر متعلق باب میں ضمناً آ گیا ہے تو اس کا محل وقوع آپ کو معلوم ہوتا تھا۔

(۴) فقہ حنفی میں تصلب سے کام لیتے تھے، آزادانہ یا اپنی طرف سے رائے دینے سے بہت کتراتے تھے اور اس کو برا سمجھتے تھے۔

(۵) فتاویٰ لکھنے میں مسائل کے صرف الفاظ نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کے مقصد کو بھی سامنے رکھتے تھے اور اس کے لیے اگر سوال سے ہٹ کر کوئی مفید پہلو ہوتو اس کی بھی نشان دہی کر دیتے تھے۔

(۶) سوال اگر غیر شرعی ہو یا فتنہ پردازی کے لئے کیا گیا ہوتو اس کا اندازہ کر کے جواب سے معذرت کر دیتے تھے یا اگر مبہم سوالات ہوں تو کبھی جواب سے معذرت کر دیتے اور کبھی جواب لکھ کر یہ عبارت بھی لکھ دیتے تھے کہ مبہم سوالات کر کے جوابات کو کسی پر منطبق کرنا بسا اوقات غلط اور موجب فتنہ بھی ہوسکتا ہے جس کی ذمہ داری سائل پر ہوتی ہے۔

(۷) اگر سوال طویل ہوتا جس میں غیر ضروری باتوں کا اختلاط ہوتا تو پہلے اس سوال کا مختصر الفاظ میں خلاصہ نکالنے کے بعد یہ لکھتے تھے کہ اگر واقعی آپ کے سوال کا حاصل یہ ہے تو اس کا حکم اس طرح ہے۔

(۸) جواب پوری یکسوئی کے ساتھ لکھتے تھے جواب لکھنے کے دوران کسی سے گفتگو نہیں کرتے تھے اور کسی نے گفتگو کرنا چاہا یا سلام بھی کیا تو آپ کو ناراضگی ہوتی تھی۔

(۹) کوشش ہوتی تھی کہ دارالافتاء کے الگ الگ مفتیوں کے قلم سے لکھے گئے جوابات میں اختلاف نہ ہو اس کے لیے آپ نے ایک دوسرے کو جواب دکھانے کا معمول قائم فرمایا تھا۔

(۱۰) جواب لکھنے اور جلد روانہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اس میں تاخیر اور ٹال مٹول برداشت نہیں ہوتی تھی الا یہ کہ کوئی سوال پیچیدہ اور وقت طلب ہو، چنانچہ ایک مرتبہ اچانک آپ کا سفر طے ہو گیا تو پوری رات بیٹھ کر جواب لکھتے رہے اور صبح تک سارے سوالات کے جوابات لکھ کر سفر پر گئے۔

طویل علالت اور کئی مرتبہ آنکھ اور دل کے آپریشن کے بعد افریقہ کے سفر پر تھے وہیں ناٹال کے شہر ڈربن میں ۱۹ / ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ (۳ / ستمبر ۱۹۹۶ء) منگل کی شب ساڑھے سات بجے (ہندوستانی وقت کے مطابق ۱۸ / ربیع الثانی ساڑھے دس بجے) اس دارفانی سے کوچ کر گئے، نماز جنازہ سے متعلق لوگوں کی خواہش تھی کہ مولانا ابراہیم صاحب پڑھائیں مگر وہ شدت غم سے اتنے نڈھال تھے کہ نماز پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے چنانچہ ہندوستان سے گئے معروف عالم دین مولانا ابوالقاسم بناری (موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہیزل دین سے تین کیلومیٹر فاصلہ پر ''ایکسبرگ'' کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، جنازہ میں تقریباً دس ہزار فرزندان توحید نے شرکت فرمائی۔

علمی وقلمی سرمایہ میں سب سے اہم فتاویٰ کا مجموعہ ہے جن کو مولانا فاروق صاحب نے مرتب کیا ہے اور مولانا سلیم اللہ خاں صاحب کی سرپرستی میں دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی (پاکستان) کے ارباب افتا نے بڑی محنت اور قابلیت کے ساتھ اس کی نئی تبویب اور تخریج وتعلیق کا کام کیا اور ادارہ صدیق ڈابھیل سے ۲۰ / جلدوں میں اس کی اشاعت ہوئی جن میں نو ہزار آٹھ سو پچاسی (۹۸۸۵) استفتاءات اور بارہ ہزار پانچ سو ستتر (۱۲۵۷۷) مسائل ہیں۔(۱)

حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی رحمہ اللہ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں اندرا ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں پیدا ہوئے، دس سال کی عمر میں اپنے گاؤں ہی میں پرائمری کی چوتھی کلاس پاس کی، لیکن انگریزی تعلیم میں جی نہیں لگا اور گھر والوں کے سامنے دینی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی، والد ماجد نے بڑی کوشش کی کہ انگریزی تعلیم ہی حاصل کریں کیوں کہ خاندان میں تقریباً چھ پشت سے کوئی عربی داں نہیں تھا اور نہ عربی مدارس سے کسی کو واقفیت تھی۔

۱۳۴۲ھ میں آپ کی خالہ اپنے ہمراہ قصبہ مبارکپور (اعظم گڑھ) لے گئیں اور مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ کروادیا، مدرسہ احیاء العلوم میں دیوبند کے فاضل کئی مدرسین تھے، حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ بھی وہیں مدرس تھے، ان سب سے خوب استفادہ کیا، مدرسہ احیاء العلوم میں ابتدائی تعلیم کے بعد تین سال بہار شریف مدرسہ عزیزیہ میں تعلیم حاصل کی پھر مدرسہ عالیہ

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۲۹۲ / تا ۳۰۴۔

فتح پوری تشریف لے گئے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۲ھ میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد پانچ سال مدرسہ جامع العلوم جین پور (اعظم گڑھ) میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد مدرسہ جامع العلوم محلّہ دھمال گورکھپور تشریف لے گئے اور وہاں تین سال تدریس سے وابستہ رہے، پھر اپنے شیخ حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے حکم پر دارالعلوم مئوناتھ بھنجن آ گئے اور تقریباً پچیس سال تک یہاں درس وتدریس اور افتا کی خدمات انجام دی، پھر اپنے شیخ ہی کے حکم سے رجب ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں افتا کی خدمت کے لئے گئے۔

اللہ رب العزت نے اختراعی ذہن سے نوازا تھا، چنانچہ فتاویٰ نویسی میں احکام کی علتوں اور اسباب پر غور وفکر کے ساتھ زمانے کے عرف ورواج کا خوب لحاظ کرتے تھے اور اصول اسلام کو ان پر منطبق کرتے تھے، خاص کر علماء دیوبند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعد جدید مسائل کے شرعی حل میں آپ کی نمایاں خدمات ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے خاص شاگردوں میں ہیں اور حضرت شاہ صاحب کے اخص الخاص خادموں میں تھے، دارالعلوم مئوناتھ بھنجن کے قیام کے زمانہ میں افتا کا کام بھی شاہ صاحب ہی کی نگرانی میں کیا کرتے تھے اور شاہ صاحب ہی کے حکم سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، ان سے بیعت بھی تھے اور ان کے مجاز بھی اور علمی وتربیتی مسائل کے علاوہ گھریلو امور میں بھی ان سے مشورہ کو ضروری سمجھتے تھے، شاہ صاحب بھی بہت محبت کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً گھر بھی تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے علمی وقلمی سرمایوں میں سب سے اہم وہ فتاویٰ ہیں جن میں سے خاص مسائل کو منتخب کر کے قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' انڈیا، سے ''**منتخب نظام الفتاویٰ**'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، مزید فتاویٰ پر کام جاری ہے۔ ان کے علاوہ ''**فتح الرحمن فی إثبات مذهب النعمان**'' کی تبییض کا کام بھی کیا ہے، یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی لکھی ہوئی ہے، شیخ جب ہدایہ پڑھ رہے تھے تو ان کو خیال ہوا کہ شاید مذہب احناف کی تائید میں حدیث کا سرمایہ نہیں ہے اور جب شیخ نے مشکوٰۃ پڑھی تو ان کے اس خیال کو مزید تقویت پہنچنے لگی، چنانچہ شیخ کا رجحان شافعی مسلک کی طرف ہونے لگا، پھر شیخ نے اس رجحان کا ذکر اپنے استاذ شیخ عبد الوہاب متقی سے کیا، شیخ متقی نے ان کے خیال کی تردید کرتے ہوئے حدیث کی کچھ کتابوں کی طرف نشاندہی کی کہ ان کتابوں کا مطالعہ کرو، چنانچہ جب شیخ محدث دہلویؒ نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان پر واضح ہوا کہ مذہب احناف کی تائید میں احادیث کا کتنا بڑا سرمایہ ہے، چنانچہ انہوں نے مشکوٰۃ کے طرز پر ایک کتاب تصنیف کی اور اس کا نام ''**أنوار السنة لرواد الجنة**'' رکھا مگر مقصد تصنیف کی وجہ سے ''**فتح الرحمن فی إثبات مذهب النعمان**'' کے نام سے شہرت ملی، یہ کتاب حکیم محمود صاحب معروفی کے کتب خانہ میں مخطوطہ کی شکل میں تھی اور کافی بوسیدہ اور کرم خوردہ ہوگئی

تھی اس لیے مفتی صاحبؒ نے ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے حکم سے اس کی تبییض اور مختصر تعلیق کا کام شروع کیا اور تقریباً ڈھائی سال میں اس کو طباعت کے لائق بنایا۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ حدیث وفقہ اور نحو وصرف پر درج ذیل کتابیں تصنیف فرمائی:

۱۔ أقسام الحدیث فی أصول التحدیث.
۲۔ اصول حدیث (اردو ترجمہ)۔
۳۔ رؤیت ہلال کی شرعی حیثیت۔
۴۔ آسان علم صرف اول (جو اردو میزان کے نام سے مشہور ہے)۔
۵۔ آسان علم صرف دوم (جو اردو منشعب کے نام سے مشہور ہے)۔
۶۔ آسان علم نحو (جو اردو نحو میر کے نام سے مشہور ہے)۔
۷۔ آسان علم نحو عربی (جو معلم سوادخوانی کے نام سے مشہور ہے)۔

اخیر عمر میں سفر حج کا ارادہ فرمایا، یہ سمندری راستہ سے تھا، چنانچہ بحر عرب میں پہنچ کر انتقال ہوگیا، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد جسد خاکی کو سمندر کے سپرد کردیا گیا۔(۱)

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمہ اللہ کی پیدائش ۲۱؍شعبان ۱۳۴۶ھ مطابق ۷؍مارچ ۱۹۲۶ء میں ''پورانوڈیہا' میں ہوئی، یہ گاؤں شہر دربھنگہ سے مشرق کی جانب تقریباً پانچ کیلومیٹر دوری پر ''کملاندی'' کے کنارے واقع ہے، آپ کے والد کا نام منشی شمس الدین تھا۔

تعلیم کا آغاز اپنے گاؤں میں میاں جی محمد یوسف کے پاس سے ہوا، اس وقت عمر چار یا پانچ برس کی تھی پھر اپنے چچا زاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ (جو آپ کے بہنوئی بھی تھے اور امارت شرعیہ کے پانچویں امیر شریعت تھے) کے ساتھ ''مدرسہ محمودیہ' راج پور، نیپال چلے گئے وہاں قرآن پاک کا حفظ شروع کیا لیکن کم عمر بھی تھے اور جسمانی اعتبار سے کمزور بھی، اس لیے درجۂ حفظ سے عربی وفارسی میں داخل کرادیا گیا، پھر مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ''مدرسہ محمودیہ'' سے ''مدرسہ وارث العلوم'' چھپرہ منتقل ہوگئے تو اپنے ساتھ مفتی صاحب کو بھی لے آئے، یہ ۱۹۳۳ء کا ابتدائی مہینہ تھا، درمیان سال میں مدرسہ بورڈ کے امتحان کے لیے گھر آگئے، پھر جب چھپرہ پڑھنے کے لیے گئے تو شرح وقایہ وغیرہ پڑھتے ہوئے نیچے کے درجے کو پڑھانے کے لیے بلا معاوضہ تقرر بھی ہوگیا۔

چھپرہ میں تعلیم کے زمانہ میں یہ طے ہوا کہ اب شوال میں کسی آزاد مدرسہ میں داخلہ لیا جائے اور اس کے لیے

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۳۰۵۔۳۰۹۔

''مدرسہ مفتاح العلوم''، مئو، کا انتخاب ہوا، چنانچہ ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء کو اپنے ساتھی کے ساتھ ''مفتاح العلوم'' پہنچے اور وہاں داخلہ لے کر تعلیم شروع کی، دو سال کے بعد ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی تو اس علاقہ میں قائدانہ رول ادا کیا اور آپ کو اس طرح چھپ چھپا کر رہنا پڑا کہ خود آپ کے بقول ''کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو'' کے مصداق بن گئے، مجبوراً چند دنوں کی روپوشی کے بعد گھر واپس آ گئے اور آئندہ سال مدرسہ سے اطلاع آئی کہ ابھی مدرسہ نہیں آنا ہے اس طرح پورا ایک سال روپوشی کی حالت میں گذارنا پڑا، البتہ اس دوران ''مدرسہ حمیدیہ'' گودنا، چھپرہ اپنے استاذ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے پاس چلے گئے اور وہاں عالم اکزامنیشن بورڈ کی تیاری کی اور امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب بھی ہوئے، پھر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کا خط آیا کہ کہ وارنٹ منسوخ ہو گیا ہے اب تم مدرسہ آ سکتے ہو، اپنے گھر والوں اور اساتذہ سے مشورہ کیا تو چوں کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نینی تال کی جیل میں تھے اس لیے اساتذہ نے دورۂ حدیث کے لیے دیوبند کے بجائے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے پاس جانے کا مشورہ دیا اس طرح دوبارہ مدرسہ مفتاح العلوم مئو چلے گئے اور ۱۱ر شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق یکم اگست ۱۹۴۴ء کو سالانہ امتحان دے کر فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد تدریس میں لگنے کے بجائے مزید علمی پختگی اور قلمی تربیت کا خیال ہوا اور اس کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ سے رابطہ کیا تاکہ ان کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کریں، مگر بعد میں اس خیال کو ترک کرنا پڑا اور تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے مئو گئے پھر نگرام اور ڈھابیل میں خدمت کی، اس کے بعد سانحہ ضلع مونگیر کے ''مدرسہ معینیہ'' سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۳۷۵ھ میں ''جامعہ رحمانی'' مونگیر کے نئے کتب خانہ کا افتتاح تھا، سانحہ مدرسہ ''جامعہ رحمانی'' سے قریب تھا، اس لیے وہاں کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی، خاص کر وہاں کی لائبریری سے استفادہ کے لیے برابر جایا کرتے تھے چنانچہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اس افتتاحی اجلاس میں شریک ہونے کو کہا، اور اس موقع سے ''کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت'' پر مقالہ پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ تیار ہو گئے، چنانچہ اس جلسہ میں ''کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، اجلاس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا قاری طیبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) بھی شریک تھے، یہ مقالہ ان بزرگوں کو بہت پسند آیا اور یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو قاری طیب صاحبؒ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں تقرری کا خط آیا۔ ۵ر ستمبر کو سانحہ سے چلے گئے اور ۹ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے وہاں مختلف علمی و فقہی کاموں میں لگے رہے اور مفوضہ کام کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ادھر سانحہ والے بے چین ہو گئے اور کئی بار ذمہ داران دارالعلوم دیوبند سے درخواست کی کہ مفتی صاحب کو ہمارے یہاں واپس کر دیا جائے، حضرت قاری طیب صاحبؒ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تو ان لوگوں کا اصرار ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے ہی آ کر صرف مدرسہ سنبھال دیں پھر دارالعلوم واپس ہو جائیں گے، اس پر قاری

طیب صاحبؒ نے رضا مندی ظاہر کی، چنانچہ ۲۲؍شوال ۱۳۷۸ھ تا ۲۱؍محرم ۱۳۷۹ھ کی چھٹی لے کر سانحہ پہنچ گئے اور وہاں نظم ونسق کو درست فرمایا پھر ۲۲؍محرم کو دارالعلوم حاضر ہو گئے۔

دارالعلوم کے آغوش میں باضابطہ جو خدمات انجام دیں ان کو درج ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شعبۂ تبلیغ وتصنیف: دارالعلوم دیوبند پہنچنے کے بعد سب سے پہلے قلمی صلاحیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ''جماعت اسلامی'' کے بعض نظریات کی تردید میں آپ کو لکھنے کا حکم دیا گیا، کیوں کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اس جماعت سے ذہنی دوری تھی، تقریباً دو ماہ میں اس کام کو پورا کیا اور ''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے نام سے ایک کتاب تیار کی گئی جس میں جماعت اسلامی کے بعض نظریات کی تردید کی گئی تھی۔

(۲) ترتیب فتاویٰ: مزاج چوں کہ فقہی اور مثبت انداز میں لکھنے کا تھا جس کا مہتمم صاحب کے ذہن رسا نے اندازہ کر لیا تھا، اس لیے ۶؍ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ کو دارالافتاء میں مرتب کی حیثیت سے تبادلہ کر دیا گیا پھر ۲۹؍محرم ۱۳۷۷ھ سے فتاویٰ نویسی کا کام بھی سپرد کیا گیا، استفتا کے جوابات بھی لکھتے تھے اور ترتیب فتاویٰ کا کام بھی کرتے تھے، شروع میں ایک سال میں تو ترتیب کا کام بہت سست رفتاری سے ہوا، لیکن جب محنتی محرر ملا تو کام میں بڑی تیزی آئی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے تمام فتاویٰ کو غور سے پڑھ کر ان پر باب وار، پھر فصل وار عنوانات لگائے، مسائل کے حوالے عبارتوں کے ساتھ نقل کئے اور جو کام گذشتہ پانچ سالوں سے ہو رہا تھا مگر ایک ورق نہیں چھپ سکا تھا اس کو چار سالوں میں مکمل کر دیا، یہ فتاویٰ اس وقت ضخیم ۱۲؍جلدوں میں مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے چھپا ہے جس میں پہلی جلد پر ۶۴ صفحات پر مشتمل مقدمہ، ۲۸ صفحات پر قاری طیب صاحبؒ کا پیش لفظ ہے۔

(۳) کتب خانہ کی ترتیب: ۱۳۸۲ھ میں جب دفاتر کے جائزہ کے سلسلہ میں شوریٰ میں رپورٹ پیش کی گئی تو اس میں کتب خانہ کی بدحالی کی شکایت سب سے زیادہ تھی، چنانچہ شوریٰ کے اکابر نے چاہا کہ کتب خانہ کی ترتیب جدید کی ذمہ داری کسی اچھے، ذی علم، ذی استعداد، مطالعہ سے دلچسپی رکھنے والے اور سلیقہ مند شخص کو دی جائے اور ترتیب فتاویٰ کا کام چوں کہ مفتی صاحبؒ نے بڑے سلیقہ اور تیز رفتاری سے کیا تھا اس لیے ترتیب کتب خانہ کے لیے بھی سبھوں کی نظر انتخاب بھی آپ ہی پر پڑی اور آپ کا تبادلہ کتب خانہ میں ہو گیا۔ گو آپ کو یہ تبادلہ بہت شاق گذرا، لیکن ہمت جٹا کر اس کام کو شروع کیا، کتب خانہ کی ترتیب جدید کے لیے مختلف اسفار کی بھی اجازت دی گئی چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' گئے اور ایک ہفتہ وہاں قیام کر کے کتب خانہ کا تفصیلی جائزہ لیا اور مختلف لوگوں سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال بھی کیا، پھر ''رضا لائبریری'' رام پور، تشریف لے گئے، وہاں کی ترتیب بہت پسند آئی، وہاں بھی ایک ہفتہ قیام کیا اور ضروری چیزیں نوٹ کیں، پھر ''خدا بخش لائبریری'' پٹنہ، کا بھی جائزہ لیا، اور واپس آ کر کتب خانہ کی ترتیب کا کام شروع کیا، پہلے مطبوعہ کتابوں کو زبان وار اور فن وار الگ الگ کیا اور کارڈ سسٹم جاری کیا پھر مخطوطات کا حصہ

الگ کیا اوران کا دو جلدوں میں تعارف بھی لکھا جسے بہت پسند کیا گیا، پھر اکابر دیوبند کی کتابیں ایک الگ کمرہ میں رکھوائیں تاکہ تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کو آسانی ہو اوران کتابوں کا تعارف بھی لکھا، لیکن وہ تعارف چھپنے سے پہلے ایک حادثہ میں ضائع ہو گیا، نیز پہلے وہاں بیٹھ کر طلبہ کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا انتظام نہیں تھا آپ کی کوششوں سے یہ انتظام ہو سکا۔ اس طرح ترتیب فتاویٰ کے بعد کتب خانہ کی ترتیب کا کام بھی آپ کے ہاتھوں مکمل ہوا، جس سے باذوق اہل علم کی شکایات دور ہوئیں اور لائبریری زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لائق بنی، آج بھی یہ کتب خانہ اسی ترتیب پر ہے اوراس کا سارا انتظام اسی نہج پر چل رہا ہے۔

(۴) خدمت افتا: جس وقت دارالافتاء میں ترتیب فتاویٰ کے لئے رکھا گیا تھا اس کے دو ماہ بعد ہی افتا کا کام بھی سپرد کر دیا گیا تھا اور حقیقت میں آپ اسی کام کے لائق تھے، کیوں کہ مزاج شروع سے فقہی رہا ہے، جس کا اظہار حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ وغیرہ نے اپنے مختلف خطوط میں کیا ہے، لیکن درمیان میں آپ کی متنوع صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف کام لئے گئے، افتا کا کام فراغت کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا، اور ترتیب کے زمانہ میں بھی افتا اور ترتیب فتاویٰ کا کام انجام دیتے تھے، جس میں تمام مسائل کے حوالہ کے لیے مختلف کتابوں کی مراجعت کی ضرورت پڑتی تھی اور یہ کام بصد شوق کرتے تھے کیوں کہ یہ کام ذوق کے مطابق تھا اوراس میں مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ جیسی وسیع العلم شخصیت کے فتاویٰ کا مطالعہ کرنے سے خود اپنے علم میں وسعت بھی پیدا ہو رہی تھی اور ہر مسئلہ کا حوالہ درج کرنے کی وجہ سے مطالعہ کا ذوق بھی پورا ہو رہا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے علاوہ اپنی صلاحیت واستعداد اور علمی حلقوں میں مقبولیت ومحبوبیت کی وجہ سے کئی اور عہدوں پر فائز رہے چنانچہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور تمام مسلمانوں کی متحدہ تنظیم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی مجلس تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن تھے، ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' انڈیا کے صدر رہے، ''امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ'' کے معزز رکن شوریٰ، اور مختلف دینی درسگاہوں اور ملی اداروں کے سرپرست تھے۔

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ ایک اچھے مفتی، بہترین مدرس، اور بے باک خطیب بھی تھے، لیکن اصل مزاج تصنیف وتالیف کا تھا، مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں، ذیل میں مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اسلام کا نظام مساجد: یہ آپ کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جسے ''مدرسہ معینیہ'' سانحہ، مونگیر کے قیام کے زمانہ میں لکھی تھی، کتاب کی ترتیب سے قبل مولانا سید سلیمان ندویؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مفتیٔ اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ وغیرہم سے مراسلت بھی کی گئی تھی اور حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں

ندویؒ کی نظر ثانی کے بعد اس کی اشاعت ہوئی۔
(۲) اسلام کا نظام امن۔
(۳) اسلام کا نظام عفت وعصمت۔
(۴) اسلامی نظام معیشت۔
(۵) اسلام کا نظام جرم وسزا۔
(۶) دارالعلوم دیوبند۔ قیام اور پس منظر۔
(۷) دارالعلوم دیوبند۔ایک عظیم مکتب فکر۔
(۸) مشاہیر علماء دیوبند۔
(۹) امارت شرعیہ کتاب وسنت کی روشنی میں۔
(۱۰) امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب۔
(۱۱) مصائب سرورکونین-اسوۂ حسنہ۔
(۱۲) تاریخی حقائق: یہ کتاب صحابہ اور سلف کے واقعات پر لکھی گئی ہے۔
(۱۳) تاریخ مساجد: یہ کتاب اسلامی تاریخ کی یادگار مسجدوں سے متعلق تصنیف کی گئی ہے۔
(۱۴) حیات گیلانی: معروف اہل قلم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی مفصل سوانح حیات۔
(۱۵) دینی عقائد: یہ کتاب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خواہش پر لکھی گئی تھی اس میں اہل سنت والجماعت اور علماء دیوبند کے صحیح عقیدے کی ترجمانی کی گئی ہے۔
(۱۶) جماعت اسلامی کے دینی رجحانات: یہ کتاب بھی قاری طیب صاحبؒ کے حکم پر جماعت اسلامی کے بعض نظریات کی تردید میں لکھی گئی ہے۔
(۱۷) نظام تربیت۔
(۱۸) اسلام کا نظام تعمیر سیرت۔
(۱۹) اسلامی حکومت کے نقش ونگار۔
(۲۰) تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند۔
(۲۱) مسائل حج وعمرہ۔
(۲۲) حکیم الاسلام اور ان کی مجالس۔
(۲۳) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی۔

(۲۴) تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگر۔

(۲۵) درس قرآن۔

(۲۶) اسلام کا نظام حیات۔

(۲۷) حضرت نانوتویؒ-ایک مثالی شخصیت۔

(۲۸) ترجمہ درمختار از ابتداء تا کتاب الطلاق۔

(۲۹) مشاہر علماء ہند کے مراسلے: اکابر علما اور مشہور اصحاب قلم حضرات سے جو آپ کی مراسلت ہوئی اور وہ علمی مضامین جو اپنے عہد کے حالات اور کتابوں سے متعلق تبصروں پر مشتمل تھے، عمومی افادہ کے لیے آپ نے انہیں جمع کر دیا ہے۔

(۳۰) زندگی کا علمی سفر: یہ آپ کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔

(۳۱) مجموعۂ قوانین اسلامی: امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خواہش پر آپ نے دفعہ وار اسلامی قوانین کی ترتیب کا کام شروع فرمایا اور گو کئی علما نے اس کام میں حصہ لیا مگر ابتدائی مسودہ کی ترتیب کی سعادت آپ ہی کے حصہ میں آئی۔

(۳۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۱۲/جلدیں): یہ مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ مفتی اول دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جن کو آپ نے بڑی محنت سے ۱۲/ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا ہے، جن کی آخری جلد کتاب اللقطہ پر ختم ہوتی ہے۔

۲۰۰۸ء میں آپ نے اپنے فرزندان کے اصرار پر اپنی پیرانہ سالی اور علالت کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے علاحدگی اختیار کرلی وراپنے گاؤں پورانوڈیہا میں ہی رہنے لگے۔(۱) اپنے وطن کے قیام ہی کے زمانہ میں ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء مطابق ۲۵/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ کی رات جوار رحمت میں اپنی جگہ بنالی۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ:

قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی ولادت ۱۹۳۶ء میں ہوئی، آپ کا آبائی وطن ضلع دربھنگہ کی مشہور علمی بستی جالے ہے۔ آپ کے والد ماجد عبدالاحد صاحبؒ شیخ الہند مولانا محمودالحسن دیوبندیؒ کے اولین شاگردوں میں سے تھے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی قرآن مجید اپنی والدہ سے پڑھا اور اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا زین العابدینؒ سے پڑھی۔ ۱۹۵۱ء میں آپ کا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں جماعت پنجم میں ہوا، آپ دار العلوم دیوبند میں چار سال رہے، ۱۹۵۵ء میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے۔ مادرعلمی دارالعلوم دیوبند سے آپ کو

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۳۴۷-۳۴۹۔

عشق کی حد تک لگاؤ تھا، آپ ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے، علماء عرب کے سامنے دیوبند کا ذکر بڑے بلند الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے ''جامعہ ازہر'' مصر میں آپ کا داخلہ منظور ہو چکا تھا اور آپ وہاں جانے کے آرزومند تھے مگر آپ کی والدہ اس حق میں نہیں تھیں کہ آپ اتنا طویل سفر کریں، چنانچہ انہوں نے حضرت مدنیؒ کو خط لکھا اور حضرت مدنی نے ازہر (مصر) جانے سے آپ کو منع کر دیا، شوال میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت رابع امارت شرعیہ کا ایک خط ''جامعہ رحمانی'' میں تقرر کے لیے آگیا، چنانچہ آپ حضرت مدنیؒ کے حکم پر ۲۱؍شوال ۱۳۷۴ھ سے ''جامعہ رحمانی'' میں تدریس کی خدمت پر مامور ہو گئے، یہاں سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی معیت کا آغاز ہوا اور جب تک حضرت مولانا نے قدرت کے فیصلے پر دنیا نہیں چھوڑ دی اس وقت تک مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑا، مولانا کے تعاون و اعتماد کا یہ مبارک سفر ۳۶؍سال دس ماہ تک رہا، جس نے ملت اسلامیہ کی ایک نئی تاریخ کو وجود بخشا۔ مونگیر میں پہلے مرحلہ میں قاضی صاحبؒ کا قیام سات سال رہا، اس دوران آپ کو درجہ پرائمری سے عربی ہفتم تک کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔

حضرت امیر شریعتؒ کی صحبت نے آپ میں ملی مسائل کے بارے میں سوچنے کا صحیح و مثبت رخ پیدا کیا اور گروہی و جماعتی تعصب سے اوپر اٹھ کر مثبت اور آفاقی طرز پر سوچنے کا مزاج بنایا اور پھر پوری زندگی اسی طرز پر گذری، قاضی صاحبؒ کی خدمت کا دوسرا رخ کارقضا ہے۔ قاضی صاحبؒ پر طالب علمی ہی سے فقہی رنگ غالب تھا اور جامعہ رحمانی میں ہدایہ کے اسباق آپ سے متعلق ہوئے تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہو گیا پھر قضا کی ذمہ داری آپ کے سر آئی تو آپ پر فقہی رنگ پختہ تر ہوتا گیا، چنانچہ آپ نے اپنی زندگی میں دوسرے شعبوں کے ساتھ نمایاں خدمت فقہ کے باب میں انجام دی اور سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مرکز فقہ ہی کو بنایا، فقہ و فتاویٰ کی لائن سے آپ کی خدمات کو سات خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) فتاویٰ نویسی: قاضی صاحبؒ اصلاً ''امارت شرعیہ'' کے قاضی تھے اور فقہا کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ قاضی فتویٰ دے سکتا ہے یا نہیں، یا عام مسائل میں دے سکتا ہے، ان مسائل میں نہیں جن کا تعلق قضا کے باب سے ہو اور جن میں فریقین کے دارالقضاء سے رجوع کا امکان ہو؟ اس لیے قاضی صاحب عموماً استفتا کے جواب سے گریز کرتے تھے تاہم جن امور کا تعلق قضا سے نہیں یا فریقین قاضی صاحب ہی کے فتوے پر عمل کے لیے رضامند ہوں ان مسائل میں آپ فتویٰ لکھتے تھے، بعض فتاویٰ آپ نے ایسے بھی لکھے ہیں جن کو دوسروں کے دستخط سے جاری کیا جن کی آج شناخت مشکل ہے اخیر زمانہ میں جب کہ صرف چند اہم مقدمات ہی کے فیصلے فرماتے تھے اس زمانہ میں استفتا کے جواب بھی لکھا کرتے تھے۔

قاضی صاحبؒ کے فتاویٰ میں اپنے اکابر کی طرح مدارج احکام کی رعایت عرف و ضرورت زمانہ کا لحاظ بھرپور انداز

میں پایا جاتا تھا، قاضی صاحبؒ کے فتاویٰ کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو سے کچھ زیادہ ہے، ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے ایک رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی نے اس کی ترتیب وتحشیہ کا کام کیا ہے جو''فتاویٰ قاضی'' کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

(۲) قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ: قاضی صاحبؒ کی زندگی کی سب سے نمایاں خدمت ''خدمت قضا'' ہے، قضا کی ذمہ داری پہلے سے بھی آپ کے خاندان سے متعلق رہی ہے، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء کو امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ پھلواری شریف پٹنہ میں آپ کو ناظم اور قاضی مقرر کیا۔ ۱۹۶۵ء تک آپ امارت شرعیہ کے ناظم رہے پھر نظامت کی ذمہ داری حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (موجودہ امیر شریعت) کے سپرد کی گئی، تاہم ۱۹۶۲ء سے اپنی وفات (۲۰۰۲ء) تک چالیس سال آپ یہاں کے قاضی رہے اور ۹؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۴؍جون ۱۹۹۹ء سے اپنی وفات تک بارہ سال نائب امیر شریعت بھی رہے، ان کے علاوہ امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری، مولانا سجاد میموریل اسپتال، مولانا منت اللہ رحمانی میموریل ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، پارامیڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری، اور امارت مجیبیہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ دربھنگہ، امارت عمر ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ راور کیلا، امارت ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ پورنیہ کے صدر، وفاق المدارس الاسلامیہ، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء پٹنہ کے بانی وصدر تھے۔

''امارت شرعیہ'' کے پلیٹ فارم سے آپ نے بے شمار علمی وفقہی خدمات انجام دی، ملک کے مختلف علاقوں میں آپ نے تربیت قضا کے کیمپ لگوائے، پہلے امارت شرعیہ میں تربیت قضا کا باضابطہ نظم نہیں تھا آپ نے اس کا ایک سالہ کورس تیار کیا اور تربیت پانے والے طلبہ کے لیے قیام وطعام کے علاوہ وظیفہ کی بھی سہولت مہیا کی، پہلے مرکزی دار القضاء کے علاوہ صرف نو (۹) ذیلی دارالقضاء قائم تھے اور دو تین کو چھوڑ کر سب اضمحلال کی حالت میں تھے آپ نے اس نظام کو بھی استحکام بخشا اور اس میں توسیع فرمائی چنانچہ آپ کی کوششوں کے نتیجہ میں ذیلی دارالقضاء کی تعداد ۳۶ ہوگئی، ان کے علاوہ آسام، کرناٹک، تمل ناڈو، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، دہلی اور یوپی میں بھی نظام قضاء قائم ہوا۔

۱۹؍اکتوبر ۱۹۹۳ء کو جے پور میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے گیارہویں اجلاس میں جو دارالقضاء کی تجویز منظور ہوئی تھی یہ تجویز بھی قاضی صاحبؒ نے ہی نہایت مؤثر طریقہ پر پیش کی تھی جس سے پورے مجمع نے اتفاق کیا اور آپ ہی کو اس نظام قضا کا کنوینر بنایا گیا، چنانچہ آپ کی کوششوں کے نتیجہ میں دہلی، ممبئی، تھانہ، دھولیا، اکولا، میسور اور اندور میں دارالقضاء قائم ہوئے اور ملک گیر سطح پر دارالقضاء کے سلسلہ میں بیداری پیدا ہوئی۔

قاضی صاحبؒ کو اللہ نے بلا کی ذہانت وفطانت اور قضا کی صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ کے فیصلوں میں قاضی ابو یوسفؒ، وکیع بن الجراحؒ، اور قاضی شریحؒ کے فیصلوں کی جھلک نظر آتی ہے، قاضی صاحبؒ چالیس سال دارالقضاء امارت شرعیہ کے قاضی رہے اخیر عمر کے چار سال سخت علالت کی وجہ سے علاج کے سلسلہ میں دہلی مقیم رہے۔

(۳) مسلم پرسنل لابورڈ: ۱۹۶۳ء میں سب سے پہلے ''امارت شرعیہ'' پٹنہ میں ''مسلم پرسنل لا'' کانفرنس بلائی گئی، قاضی صاحبؒ بھی اس وقت ''امارت شرعیہ'' میں تھے اس کانفرنس میں آپ کا بھی حصہ تھا، پھر مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر مارچ ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں اجتماع رکھا گیا تو اجتماع کی تیاری کے لیے قاضی صاحبؒ ایک ماہ قبل ہی سے دارالعلوم میں مقیم ہوگئے اور ''متبنیٰ بل'' کے قانونی اور شرعی پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور معاندین کے اعتراضات کو جمع فرما کر بنیادی سوال مرتب کیا، پھر جب دسمبر ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں کنونشن منعقد ہوا تو اس میں بھی قاضی صاحبؒ کا مؤثر خطاب ہوا پھر جب حیدرآباد میں عہدہ داران کے انتخاب کا اجلاس ہوا تو آپ کا ایسا مؤثر خطاب ہوا کہ قاری طیب صاحبؒ نے فرمایا کہ قاضی صاحب کے خطاب کے بعد کسی کے خطاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غرض ''مسلم پرسنل لابورڈ'' کی تاسیس اور تشکیل کے ہر مرحلہ میں قاضی صاحبؒ پیش پیش رہے، جب بورڈ کے دوسرے صدر حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کا انتقال ہوا تو ۲۳/اپریل ۲۰۰۰ء آپ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا اور اپنی وفات (۴/اپریل ۲۰۰۲ء) تک تقریباً دوسال آپ نے اس عہدے پر رہ کر گرانقدر خدمات انجام دیں۔

(۴) مرکز البحث الاسلامی کا قیام: ۱۹۷۹ء میں قاضی صاحبؒ نے ساؤتھ افریقہ کا سفر کیا تو وہاں بہت سے ایسے نئے مسائل سامنے آئے جن کے حل کے لیے ایک گونہ اجتہاد اور غور وفکر کی ضرورت تھی لیکن اس ہویٰ پرستی اور علمی انحطاط کے زمانہ میں انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی غور وفکر کا راستہ زیادہ محفوظ تھا جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فقہاء صحابہ کے اجتماعی مشورہ کی مجلس قائم کی تھی اور جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہا کے اجتماعی غور وفکر کا نظام بنایا تھا، چنانچہ قاضی صاحب ''مسلم پرسنل لابورڈ'' کے اجلاس میں جب حیدرآباد آئے تو یہیں اس مقصد کے لیے ''مرکز البحث الاسلامی'' کے ابتدائی خاکہ پر مشورہ ہوا اور اسکی تشکیل عمل میں آئی، اس کا پہلا سیمینار یکم تا ۳/اپریل ۱۹۸۹ء میں ''ہمدرد یونیورسٹی'' میں منعقد ہوا، جس میں ضبط ولادت، اعضاء کی پیوندکاری اور مکان ودوکان کی پگڑی کے موضوعات زیر بحث آئے، اس سیمینار میں ایک سوبیس اداروں اور دارالافتاء کی نمائندگی ہوئی، مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے اس کی صدارت فرمائی تھی اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے افتتاحی کلمات فرمائے تھے۔

(۵) سہ ماہی بحث ونظر: ''امارت شرعیہ'' کے ترجمان ہفت روزہ ''نقیب'' میں عام اصلاحی دینی وسماجی مضامین شائع ہوتے تھے، دقیق فقہی مباحث درج نہیں کئے جاسکتے تھے اس لیے ایک خاص علمی وفقہی پرچہ نکالنے کی تجویز سامنے آئی اور قاضی صاحبؒ نے ۱۹۸۸ء میں ذاتی طور پر ''بحث ونظر'' کے نام سے سہ ماہی رسالہ نکالنا شروع کیا جس مقصد کے لیے یہ رسالہ نکالا جارہا تھا، اس کے لیے خصوصی عناوین رکھے گئے، چنانچہ نئے مسائل کے حل میں سب سے زیادہ اصول کی ضرورت پڑتی تھی، اس لیے ایک عنوان ''اصولی مباحث'' کا رکھا گیا، ایک عنوان ''تحقیقات فقہیہ'' کا رکھا گیا، جس میں جدید مسائل پر علما کی آراء نقل کرکے بحث وتمحیص اور اصول کی کسوٹی پر جانچنے اور ایک رائے کو

دوسری رائے پر ترجیح کیسے دی جائے اسے تفصیل سے درج کیا جاتا تھا، مذکورہ دونوں عناوین پر عموماً قاضی صاحبؒ خود ہی لکھتے تھے، ان کے علاوہ ایک عنوان ''قضایا'' کا تھا جس میں دارالقضاء کے فیصلے شائع کئے جاتے تھے، ایک عنوان ''فقہی شخصیات'' کا رکھا گیا تا کہ فقہ کے حوالہ سے اپنے اسلاف کی محنت وجاں فشانی علما کے سامنے آئے۔

اس رسالہ کی اشاعت نے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی کہ علمی انحطاط کے اس دور میں اس قسم کا رسالہ کون پڑھے گا لیکن چند ہی مہینوں میں اس کی مقبولیت نے لوگوں کو حیران کر دیا اور علما میں بحث وتحقیق کی ایک لہر پیدا ہوگئی، اس رسالہ کی نیابت میں راقم الحروف (انیس الرحمٰن قاسمی) شامل رہا۔

(۶) اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا قیام: ''مرکز البحث الاسلامی'' کے سیمینار کی کامیابی، امت کے مسائل سے علما کی دلچسپی اور مختلف الفکر علما کی وسیع القلبی دیکھ کر قاضی صاحبؒ کا حوصلہ بڑھا اور ''مرکز البحث الاسلامی'' کو ۱۹۸۹ء میں ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' انڈیا کی شکل میں بدل دیا گیا، قاضی صاحبؒ کی زندگی میں اکیڈمی کے تحت تیرہ فقہی سیمینار ہوئے، جن میں بہ حیثیت مجموعی ۴۱ مسائل پر بحث کی گئی، ان کے علاوہ دینی مدارس کے طلبہ میں اپنے عہد کے مسائل پر شعور پیدا کرنے کے لیے توسیعی خطبات اور تربیتی کیمپ کا انتظام کیا گیا، ۱۷ر مدارس میں آپ نے توسیعی خطبات رکھے اور تین کیمپس منعقد کئے گئے جن میں معاشیات، علم شہریت، نفسیات، مخالف اسلام تحریکات اور دستور ہند وغیرہ پر محاضرات دیئے گئے، نیز اکیڈمی کے تحت آپ کی زندگی میں فقہی سیمینار میں پیش کئے گئے، مقالات کے ۱۷ر مجموعے اشاعت پذیر ہوئے اور ۵۴ر کتابیں طبع ہوئیں، الموسوعة الفقهية (۴۰ر جلدوں) کا اردو ترجمہ آپ نے ہی شروع کرایا تھا جو آپ کی زندگی میں نہیں چھپ سکا۔ آپ کی وفات کے بعد اس کی اشاعت شروع ہوئی۔

(۷) المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء: نظام قضا کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ محض چند تربیتی کیمپ پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ افتا اور قضا کے اصول وفروع کو پوری وسعت کے ساتھ پڑھایا جائے، چنانچہ اس کام کے لیے قاضی صاحبؒ نے ایک مستقل ادارہ کے قیام کا فیصلہ کیا اور ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۹ء میں امارت شرعیہ کی طرف سے معہد کی بنیاد ڈالی، قاضی صاحبؒ نے اس ادارہ کو ملک گیر پیمانہ پر مفید بنانے کے لیے جہاں پرکشش اور مفید نصاب رکھا وہیں مختلف علاقے کے علما کو بھی اعتماد میں لیا اور انہیں ادارہ کا رکن بنایا چنانچہ عام طور پر بہار اور مشرق کی طرف دوسرے علاقوں کے علما اور طلبہ کا رخ کم ہونے کے باوجود اس ادارہ سے ہر علاقہ کے علما اور طلبہ کا رجوع ہوتا ہے۔

(۸) تصنیفات وتالیفات: قاضی صاحبؒ نے بنیادی طور پر کتابوں کی تصنیف سے زیادہ افراد واشخاص کی تربیت پر توجہ دی اس لیے آپ کی تصنیفات تعداد کے اعتبار سے کم ہیں لیکن آپ کی جتنی بھی کتابیں ہیں وہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے انتہائی اہم اور علماء تحقیق کے لیے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتی ہیں، آپ کی بیش بہا تصانیف میں ''اسلامی عدالت'' (۴۳۳صفحات) ''مباحث فقہیہ'' (آپ کے مقالات کا مجموعہ ۴۶۹صفحات) ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ:

تعارف وتجزیہ‘‘ (۵۶ صفحات) ’’خطبات بنگلور‘‘، ’’فتاویٰ امارت شرعیہ‘‘ (۲ر جلدیں، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفتیان امارت شرعیہ کے فتاویٰ کی ترتیب) ’’اسلام انسانی مسائل کا حل‘‘ (تین خطبات کا مجموعہ) ’’اسلام اور اجتماعیت‘‘ (یہ بھی آپ کے خطبات کا مجموعہ ہے) ’’صنوان القضاء وعنوان الافتاء‘‘ (قاضی عماد الدین اشفور قانیؒ کی تصنیف پر تحقیق وتعلیق ۴ر جلدیں مجموعی صفحات ۱۶۸۱) ’’فقہ المشکلات‘‘ (منتخب فقہی مضامین کا مجموعہ، صفحات ۲۴۸) ’’کتاب الفسخ والتفریق‘‘ (مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی کتاب پر تحقیق وتعلیق) ’’آداب قضاء‘‘ (مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کتاب پر تحقیق وتعلیق) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۹) دوسرے میدانوں میں خدمت: قاضی صاحبؒ ہر جہت میں ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں کوشاں تھے چنانچہ وہ امت کے زوال کے سبب بنیادی انتشار وافتراق کے بجائے ’’اتحاد امت‘‘ کے بہترین داعی تھے اور مسلمانوں میں ہمہ جہت خدمات کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے چنانچہ مسلمانوں کے دینی، سیاسی اور معاشی ہر طرح کے زوال کو دیکھ کر قاضی صاحبؒ نے ۱-۲ر جون ۱۹۹۱ء کو ’سورج کنڈ، ہریانہ‘‘ میں ملت کے باشعور افراد کو جمع فرمایا، ۱۳ر اپریل ۱۹۹۲ء کو اس سلسلہ کی دوسری میٹنگ دہلی میں کی، جس میں ۲۳-۲۴ر مئی کو ممبئی میں ’’اتحاد ملت کانفرنس‘‘ کی تجویز طے ہوئی، اسی کانفرنس میں ’’آل انڈیا ملی کونسل‘‘ کا قیام عمل میں آیا، آپ نے ’’کاروان آزادی‘‘ نکالنے کا اہتمام کیا، جس میں جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر بیانات کا سلسلہ میسور سے شروع کر کے پورے ملک میں پھیلایا گیا، مدارس کو حکومت کے نشانے سے بچانے کے لیے ’’رابطۂ مدارس کانفرنس‘‘ بلائی، ٹاڈا اور پوٹا جیسے ظالمانہ قانون کے خلاف بہت ہی مؤثر آواز اٹھائی، ان کے علاوہ ’’امارت شرعیہ‘‘ کی طرف سے غریبوں کے علاج کے لیے پٹنہ، دربھنگہ وغیرہ میں اسپتال کے قیام کا منصوبہ بنایا اور غریبوں کے علاج کے لئے متعدد میڈیکل کیمپ لگوائے، مسلمانوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے پٹنہ و دیگر جگہوں جیسے پورنیہ، دربھنگہ، راورکیلا، مغربی چمپارن وغیرہ میں ’’ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ‘‘ قائم کئے، مدارس کے معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لیے ۱۹۹۶ء میں ’’وفاق المدارس الاسلامیہ‘‘ بنائی جس سے آزاد مدارس ملحق ہیں۔

(۱۰) عہدے اور ایوارڈ: آپ بیک وقت کئی کئی اداروں سے وابستہ تھے اور ہر ادارہ کے کام کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، آپ چند سال ’’امارت شرعیہ‘‘ کے ناظم رہے، تاحیات دار القضاء کے قاضی اور اخیر عمر میں نائب امیر شریعت بھی رہے، اس کے علاوہ آپ ’’امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ‘‘ کے جنرل سکریٹری، ’’مولانا سجاد میموریل اسپتال‘‘ کے سکریٹری، ٹیکنیکل اداروں کے صدر، ’’وفاق المدارس الاسلامیہ‘‘ کے بانی وصدر، سہ ماہی رسالہ ’’بحث ونظر‘‘ کے بانی و مدیر اعلیٰ، ’’المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء‘‘ کے بانی وصدر، ’’اسلامک فقہ اکیڈمی‘‘ کے بانی و جنرل سکریٹری، ’’مسلم پرسنل لا بورڈ‘‘ کے رکن تاسیسی، رکن عاملہ، ’’محکمہ دار القضاء‘‘ کے کنوینر اور اخیر عمر میں

صدر بھی رہے، ''آل انڈیا ملی کونسل'' کے بانی وسکریٹری جنرل، ''انسٹی ٹیوٹ آف اوبجکیٹو اسٹڈیز'' کی کورننگ باڈی کے ممبر، ''الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن'' کے ''شریعہ بورڈ'' کے رکن، ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' (مکہ مکرمہ) کے رکن، ''انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی'' جدہ، کے اکسپرٹ ممبر، ''**المجمع الفقهي العالمي**'' دمشق، کے رکن اور ''**الهيئة الخيرية الإسلامية العالمية**'' کویت، کے رکن اعزازی تھے۔

آپ کی اس ہمہ جہت خدمت اور مقبولیت کی وجہ سے مختلف اداروں سے آپ کو جتنے ایوارڈس ملے ہیں، ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو اتنے ایوارڈس حاصل ہوئے ہیں۔

۲۰/محرم الحرام ۱۴۲۲ھ مطابق ۴/اپریل ۲۰۰۲ء جمعرات کا دن رخصت ہو رہا تھا اسی وقت شام سات بجکر پانچ منٹ پر اپنی طویل علالت، بلکہ تھکاوٹ کے بعد یہ مسافر جوار رحمت میں سو گیا۔ (**انا للّٰہ وانا الیہ راجعون**) آپ نے آخری سانس دہلی کے اپولو اسپتال میں لی، صبح آپ کی پہلی نماز جنازہ ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' دہلی، میں مولانا عبداللہ مغیثی نے پڑھائی، دوسری نماز جنازہ دہلی ایرپورٹ پر مولانا یعقوب صاحب (استاذ مظاہر علوم وقف) نے پڑھائی، جمعہ کے بعد تیسری نماز ''امارت شرعیہ'' میں مولانا سید نظام الدین امیر شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے پڑھائی، عشا کے بعد آخری نماز جنازہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (برادر زادۂ قاضی صاحبؒ) نے مہدولی دربھنگہ میں پڑھائی اور وہیں اپنے گھر کے سامنے آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (۱)

مفتی ظہور احمد ندوی:

۱۹۲۷ء میں مبارکپور، یوپی کے ایک زمیندار گھرانہ میں آنکھیں کھولیں، والد ماجد جناب عبدالستار صاحبؒ ممتاز فارسی داں اور علاقہ کے بڑے زمینداروں میں سے تھے۔ سن شعور کے بعد تعلیم شروع ہوئی، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ''مدرسہ ریاض العلوم'' میں ہوئی، پھر مبارکپور کے ''مدرسہ احیاء العلوم'' میں داخل ہوئے، شرح جامی اور شرح تہذیب تک درس نظامی کے مطابق تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' لکھنؤ تشریف لائے، ۱۹۵۰ء تک یہاں کے مشہور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مادر علمی میں ہی تدریس کا موقع ملا، فقہ سے گہری دلچسپی اور فقہی مہارت کے پیش نظر فن فقہ کی اونچی کتابیں پڑھانے کو ملیں پھر دارالعلوم کے صدر مفتی بنائے گئے، اور اب تک دارالعلوم میں اپنی صلاحیت سے فیض یاب کر رہے ہیں، اس کے علاوہ دارالعلوم کے نائب مہتمم کی بھی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں، مفتی صاحب کو علم فقہ سے خصوصی اور گہرا تعلق زمانہ طالب علمی سے ہی رہا ہے، اور اس میں بڑا دخل مربی خاص مولانا مفتی سعید

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۳۱۴/تا ۳۲۳۔

ندویؒ کا ہے جو اُن دنوں دارالعلوم کے مفتی تھے، ان کی نگرانی اور سرپرستی میں اپنا علمی سفر مکمل کیا، مفتی سعید صاحبؒ کی توجہات کی وجہ سے فقہ کے قدیم وجدید مآخذ ومراجع ومصادر سے استفادہ کا موقع ملا، اور فکر ونظر میں وسعت اور مزاج میں تفقہ پیدا ہوا، دارالافتاء کی ذمہ داری اور طویل عرصہ تک فقہی کتابوں کی مناسبت کی وجہ سے اس فن پر پورا عبور حاصل ہو گیا ہے۔ استحضار اور حاضر جوابی کی خاص دولت آپ کو ملی ہے، فقہ کی جزئیات ہمہ وقت جس طرح نوک زبان ہوتی ہیں وہ کم ہی کسی کو رہتی ہے، آپ کے بارے میں عام تأثر ہے کہ ہدایہ کی جلدیں گویا حفظ یاد ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ بھی مشکل اور پیچیدہ مسائل میں آپ سے رجوع کرتے ہیں، فقہی مہارت کے ساتھ دقیقہ رسی اور نکتہ دانی میں بھی کمال حاصل ہے۔

مولانا مفتی احمد خانپوری:

مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب ۲۷/شوال ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء کو موضع خانپور ضلع بھروچ صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے، والد کا نام محمد تھا، ابتدائی تعلیم خانپور کے مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم اشرفیہ راندیر، جامعہ حسینیہ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، مدرسہ تعلیم الاسلام آنند، میں تعلیم حاصل کی، اخیر میں انہوں نے ۱۳۷۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد والے سال میں دارالافتاء میں داخلہ لیا اور فراغت کے بعد دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لائے، یہاں تعلیم وتدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کا کام بھی سپرد کیا گیا۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مفتی صاحب کے لکھے گئے فتووں کو مولانا مفتی عبدالقیوم راجکوٹی نے ''محمود الفتاویٰ'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ فتووں کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ مفتی صاحب علم وفہم اور تقویٰ کے صفات سے مزین ہیں، مسائل حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی ولادت ۴/جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ مطابق نومبر ۱۹۵۶ء کو مولانا حکیم زین العابدینؒ (قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے بڑے بھائی) کے گھر محلہ جالے، دربھنگہ، بہار میں ہوئی، قرآن مجید، ابتدائی اردو وغیرہ اپنی دادی، والدہ اور پھوپھا مولانا وجیہ احمد سے پڑھی، فارسی اور عربی کی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں، پھر اپنے قریب کی بستی دوگھرا میں مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ میں ایک دو سال کی تعلیم حاصل کی، یہاں مولانا عبدالحمید قاسمی نیپالی خاص استاذ تھے، متوسطات سے دورۂ حدیث کی تعلیم جامعہ رحمانی مونگیر میں ہوئی، ۱۳۹۵ھ میں فراغت کے بعد مکرر دورۂ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شعبان ۱۳۹۶ھ میں وہاں سے فارغ ہوئے، دیوبند سے فراغت کے بعد ''امارت شرعیہ'' پٹنہ سے قضا وافتا کی تربیت حاصل کی۔

شوال ۱۳۹۷ھ میں امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش مولانا حمید الدین حسامی عاقلؒ کی دعوت پر دار العلوم حیدر آباد تدریس کے لیے گئے، ۱۳۹۸ھ میں مولانا عاقل صاحب کی اجازت سے تعلیمی سال پورا کر کے دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد منتقل ہو گئے، شعبان ۱۴۲۰ھ میں دار العلوم سبیل السلام سے مستعفی ہو گئے اور اکابر کے مشورہ کے بعد فضلاء مدارس کی تربیت کے لیے ایک مستقل ادارہ ''المعہد العالی الاسلامی'' قائم کیا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو گوناگوں خوبیوں سے نوازا ہے، تفسیر، حدیث، رجال، سیر، فقہ، اصول فقہ، قواعد فقہیہ اور درس نظامی کے فنون پر گہری نظر ہے، مولانا کی دینی و فقہی خدمات کا ایک پہلو مختلف دینی و فقہی اداروں کا قیام اور اس کی کوشش ہے، جس کے لیے انہوں نے ''المعہد العالی الاسلامی'' قائم کیا، مولانا ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے سکریٹری، ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' انڈیا کے جنرل سکریٹری، اور ''دار القضاء ملت اسلامیہ'' آندھرا پردیش کے قاضی ہیں۔

فقہ سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں، چنانچہ ''قاموس الفقہ'' (۵ر جلدیں)، حلال وحرام، اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ، طلاق وتفریق، نیا عہد نئے مسائل، مسجد کی شرعی حیثیت، خواتین کے مالی حقوق شریعت اسلامی کی روشنی میں، جدید فقہی مسائل (۵ر جلدیں)، کتاب الفتاویٰ (۶ر جلدیں) تدوین وتعارف، آسان اصول فقہ، **معاییر الحنفیة فی الاحتجاج بالسنة، قضایامعاصرةوأسلوب معالجتها، قضایافقهیة فی الأقلیات المسلمة**، وغیرہ اب تک شائع ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت ساری تالیفات ہیں۔ موصوف عہد حاضر کے مسائل پہ گہری نگاہ کے ساتھ اس کا شرعی حل پیش کرنے میں خصوصی درک ومہارت رکھتے ہیں۔ اللہ ان کی حیات میں برکت دے اور امت کو بیش از بیش ان سے فیض حاصل ہو۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی:

مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب کی پیدائش یکم مارچ ۱۹۵۸ء میں ہوئی، والد ماجد کا نام حاجی شیخ یار مرحوم ہے، آبائی وطن جھڑکاہی، ضلع مشرقی چمپارن، بہار ہے، ابتدائی تعلیم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں ہوئی، پھر مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارنپور میں داخلہ لیا اور عربی ششم تک وہاں تعلیم حاصل کی، ۱۹۷۷ء میں دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں دار العلوم ہی میں افتا کیا۔ فراغت کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جونپور، یوپی میں تقریباً تیرہ سال تدریسی خدمت انجام دی پھر ۱۹۹۴ء میں ''جامعہ اسلامیہ دار العلوم، مہذب پور، اعظم گڑھ'' کی بنیاد رکھی اور تا ہنوز اسی مدرسہ میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مولانا حبیب اللہ صاحب کو فقہ وفتاویٰ سے خاص لگاؤ رہا ہے اس پہلو سے نمایاں خدمات رہی ہیں۔ چنانچہ دار العلوم دیوبند سے افتا کی تربیت پانے کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جونپور میں تیرہ سال تدریس کے ساتھ افتا

کی بھی خدمت انجام دی اور ۱۸۔۱۷ ر سالوں سے دار العلوم مہذب پور میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ فتاویٰ کا مجموعہ بھی ۶ ر جلدوں میں ''حبیب الفتاویٰ'' کے نام سے مطبوع ہے۔

ایک درجن سے زائد کتابیں تالیف فرمائی ہیں جن میں فقہ کے موضوع پر ''**نیل الفرقدین فی المصافحة بالیدین**''، **أحكام يوم الشك** ،نوٹ کی شرعی حیثیت، **المساعی المشكورة فی الدعاء بعد المكتوبة، تنقيه الأذهان** (میت کے متعلق)، تحقیقات فقہیہ (مختلف رسائل ومقالات کا مجموعہ)، اور حبیب الفتاویٰ (۶ ر جلدیں) وغیرہ اور دیگر موضوعات پر مبادیات حدیث، **أحب الكلام فی مسئلة السلام،التوسل بسيد الرسل،جذب القلوب** ،والدین کا پیغام زوجین کے نام، **تحفة السالكين**، مسلم معاشرہ کی تباہ کاریاں، رسائل حبیب، سدائے بلبل (خطبات کا مجموعہ) خاص کر قابل ذکر ہیں۔(۱)

مفتی شاکر خان صاحب:

مولانا شاکر خان صاحب کی ولادت ۵ ر جولائی ۱۹۶۵ء کو سسن اسپتال پونہ میں ہوئی، بچپن ہی میں والدہ کا سایہ اٹھ گیا، والد حافظ مطیع اللہ خان صاحب صوات پاکستان کے رہنے والے تھے، پونہ میں آکر بس گئے تھے، ابتدائی تعلیم والد ماجد سے شروع کی، مولانا یونسؒ کے توسط سے دار العلوم عالمگیر بھنگار، احمد نگر میں داخلہ کرایا گیا، وہاں ناظرہ اور حفظ کی تکمیل کی، ایک سال کے لیے دار العلوم نپانی میں داخلہ لیا، جامعہ حسینیہ راندیر، سورت میں شعبہ عالمیت میں داخلہ لے کر مشکوٰۃ شریف وہیں مکمل کی اور دورۂ حدیث کے لیے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور افتا میں تخصص بھی وہیں سے کیا، نیز دار العلوم امدادیہ چونا بھٹی، بمبئی میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن فتحپوری سے رسم المفتی اور سراجی پڑھی، مولانا اس وقت دار العلوم نپانی، بیلگام کرناٹک میں شیخ الحدیث اور افتا کے ذمہ دار ہیں۔(۲)

حضرت مولانا عبد الحق پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ:

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء کو اکوڑہ خٹک، پاکستان میں حضرت مولانا حاجی معروف گل ولد حاجی میر آفتاب صاحب مرحوم کے گھر ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور گاؤں کے مشہور بزرگ حاجی صاحب قصابان اور ممتاز بزرگ مولانا عبد الغفار وغیرہ سے حاصل کی، آٹھ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے مختلف مقامات کے جید اور ممتاز علماء کرام سے ملاقات کی، ۱۳۴۷ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۲ھ میں سند فراغت حاصل کی۔

---

(۱)　فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۴۱۱-۴۱۲۔

(۲)　فتاویٰ شاکر خانجلد اول: ۲۸ ر تا ۴۲ ر۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے آبائی گاؤں اکوڑہ خٹک میں واقع مسجد (جواب مسجد قدیم مولانا عبدالحق کے نام سے معروف ہے) میں مختلف علوم وفنون کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تدریس شروع کی، ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی پیش کش کی جسے آپ نے بخوشی قبول کرلیا۔

دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۶۶ھ (مطابق ۱۹۴۷ء) میں رمضان المبارک کی تعطیل کے موقع سے گھر آئے ہوئے تھے، اسی دوران ہندوپاک کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا، لوگوں کا آپسی تبادلہ کے دوران راستہ میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازارگرم ہوگیا جس کی وجہ سے دیوبند جانا مشکل تھا، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حکومتی سطح پر بحفاظت دیوبند لانے کا انتظام بھی کیا مگر والد صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور دیوبند جانے سے روک دیا، ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے نہج پر دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی۔

عارف باللہ عظیم مجاہد حضرت حاجی صاحب ترنگزئی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پر بیعت کی، ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی۔

آپ جہاں ایک عظیم محدث، مدبر سیاست داں اور روحانی پیشوا تھے وہیں ایک عظیم فقیہ محتاط مفتی کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے، لوگ ہزاروں مسائل کا حل طلب کرتے تھے، اپنے تنازعات اور گھریلو جھگڑے بھی ان سے حل کرواتے تھے۔ عموماً کوشش ہوتی تھی کہ سائل کو اس کا جواب مکمل سمجھایا جائے، اس لیے جواب لکھتے وقت بات کھل کر بیان فرماتے، اگرچہ طویل ہوجاتا۔ فتویٰ لکھتے وقت فقہ حنفی کی مشہور کتابیں زیرنظر رہتیں، احتیاط کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم کے دیگر مفتیان بھی جب فتویٰ لکھتے تو انہیں اپنے سامنے سنانے کا حکم فرماتے، مسائل کے بیان کرنے یا لکھنے میں ماحول، حالات اور اس کے نتائج وعواقب کا بھی لحاظ رکھتے تھے، اور مصلحت شرعی کو سامنے رکھ کر جواب دیا کرتے تھے تاکہ معاشرہ میں بدمزگی پیدا نہ ہو، اور شریعت کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ آپ مسائل کے جوابات نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں دیا کرتے تھے، اور اس میں حوالہ جات کا خصوصیت سے اہتمام کرتے تھے تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔ آپ نے دارالافتاء کے نظام کو مستحکم کرنے کے لیے کئی مفتیان کرام کو استفتا کے جوابات لکھنے کی ذمہ داری دے رکھی تھی۔ (۱)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا رشید احمد کی ولادت ۳ر صفر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۶ ر ستمبر ۱۹۲۲ء منگل کو ’’کوٹ اشرف‘‘ ملتان، پاکستان میں ہوئی آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد سلیم صاحب اصلاً لدھیانہ کے رہنے والے ہیں جو مشرقی پنجاب میں واقع ہے اور ہندوستان کا ایک حصہ ہے لیکن زمینداری کے سلسلہ میں لدھیانہ سے فیصل آباد پھر ملتان کی تحصیل خانیوال

(۱) فتاویٰ حقانیہ جلد اول۔

تشریف لے گئے اور وہاں ایک نئی بستی قائم کی، مولانا محمد سلیم صاحب رحمہ اللہ کا تعلق چوں کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بڑا گہرا تھا اور حضرت کے خاص فیض یافتہ تھے اس لیے اس نئی بستی کا نام کوٹ اشرف رکھا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کے نام پر اپنے فرزند کا نام رشید احمد رکھا، مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا تاریخی نام سعود اختر ہے یہ نام خود پندرہ سال کی عمر میں تجویز فرمایا تھا۔

قرآن مجید کی تعلیم اپنی والدہ سے پانچ برس کی عمر میں حاصل کی پھر ۱۳۴۸ھ سے ۱۳۵۲ھ تک سرکاری پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی، اپنی ذہانت وفطانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنی جماعت کے ساتھیوں میں ممتاز رہے، ۱۳۵۳ھ سے لے کر ۱۳۵۹ھ تک متعدد مدارس میں تعلیم حاصل کی، شوال ۱۳۶۰ھ میں آپ کا داخلہ دار العلوم دیوبند میں ہوا، یہاں بخاری اور ترمذی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ سے پڑھی، مگر اخیر سال میں حکومت برطانیہ نے حضرت مدنی رحمہ اللہ کو گرفتار کر کے مراد آباد جیل بھیج دیا تو یہ کتابیں حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی رحمہ اللہ نے ختم کرائیں۔

فتاویٰ نویسی کا کام فراغت کے بعد ۱۳۶۲ھ سے ہی شروع کر دیا تھا جب مدینۃ العلوم بھینڈ وضلع حیدر آباد سندھ میں مدرس تھے لیکن یہاں دار الافتاء کی مکمل ذمہ داری ۱۳۶۶ھ میں ڈالی گئی اور ۱۳۶۹ھ تک بیک وقت شیخ الحدیث، صدر مدرس اور صدر مفتی رہے، پھر ۱۳۷۰ھ میں جب جامعہ دار الہدیٰ ٹیڑھی گئے تو وہاں بھی شیخ الحدیث اور صدر مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے، پھر جب دار العلوم کراچی گئے تو وہاں اگر چہ آپ شیخ الحدیث رہے اور افتا کی ذمہ داری باضابطہ متعلق نہیں کی گئی لیکن زیادہ اہم اور پیچیدہ مسائل سے متعلق استفتاءات آپ ہی کے سپرد کئے جاتے تھے نیز ۱۳۸۱ھ میں جب دار العلوم نے تخصص فی الفقہ کا شعبہ شروع کیا تو اس میں مربی کی حیثیت سے آپ ہی کا نام منتخب کیا گیا پھر ۱۳۸۳ھ سے ایک علیٰحدہ فقہی اور اصلاحی ادارہ ''دار الافتاء والارشاد'' کی بنیاد ڈالی اور مستقل اس پلیٹ فارم سے فقہ وفتاویٰ کی خدمت انجام دی۔

مفتی صاحب کے علمی وقلمی سرمایوں میں سب سے اہم سرمایہ فتاویٰ کا مجموعہ ''احسن الفتاویٰ'' ہے، فتاویٰ کی بڑی تعداد محفوظ نہیں کی جاسکی جیسا کہ آپ کے حالات لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۷۰ھ تک فتاویٰ کی نقل رکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا اور ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۷۶ھ تک کل دو ہزار پچیس (۲۰۲۵) فتاویٰ تحریر کئے مگر ان میں صرف چار سو اکاون (۴۵۱) فتاویٰ نقل ہو سکے، ابتدائی دور کے فتاویٰ کا مجموعہ سب سے پہلے ۱۳۷۹ھ میں شائع ہوا تھا اور ۱۳۸۳ھ سے جدید سلسلہ کا آغاز ہوا اور اب یہ مجموعہ ۸ر ضخیم جلدوں میں طبع شدہ ہے۔

اس کے علاوہ کئی فقہی اور اصلاحی رسالے بھی تصنیف فرمائے جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔

ان میں سے (۱) أحسن القضاء فی الذبح بإعانة الکهرباء (۲) الاجتثاث لموحد الطلقات

الثلاث (۳) اجتماعی ذکر کے مروجہ حلقے (۴) احکام معذور (۵) أداء القرض من الحرام (۶) الإرشاد إلٰی مخرج الضاد (۷) اسلام کا عادلانہ نظام معیشت (۸) ایمان وکفر کا معیار (۹) بلاسودی بینک کاری (۱۰) زبدة الکلمات فی حکم الدعاء بعدالصلوٰة (۱۱) سیاست اسلامیہ (۱۲) القول الأظهر فی تحقیق مسافة السفر (۱۳) کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم، وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ بیشتر رسائل ''احسن الفتاویٰ'' میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔(۱)

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ:

قطب زماں، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے اپنی تربیت واصلاح کرانے اور فیض یاب ہونے والوں میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تمام علوم وفنون کے جامع فاضل، اپنے زمانہ کے محدث، فقیہ، اور جید عالم شریعت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مربی اور شیخ طریقت تھے۔ مسلک اکابر دارالعلوم دیوبند کے بارے میں آپ کی صلابت رائے اور تحفظ مسلک کے لیے آپ کی خدمات سب پر روشن ہیں، اس سلسلہ میں آپ کی نگاہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ رعایت بھی سخت مضرت رساں تھی۔

حضرت مولانا کا محبوب ترین مشغلہ جس میں آپ کی زندگی کا تقریباً تمام زمانہ گذرا وہ درس وتدریس، فقہ وفتاویٰ اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کے ساتھ مدارس عربیہ کی سرپرستی اور فروغ کے لیے سعی اور کوشش کرنا تھا۔

حضرت مولانا نے ۱۹؍شوال ۱۳۴۹ھ مطابق ۹؍مارچ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کے شہر جالندھر میں عارف باللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی سرپرستی میں ''جامعہ خیر المدارس'' قائم فرمایا، جامعہ ابتدائی چند سال مالی لحاظ سے مشکلات ومصائب کا شکار رہا، مگر بفضلہٖ تعالیٰ بانی جامعہ، اساتذہ وطلبا کے اخلاص، محنت وحوصلہ اور عوام کے تعاون سے مشکلات میں کمی آتی گئی، اور ''خیر المدارس'' ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا، جالندھر میں ۱۸؍سال تک طلبہ کی بڑی تعداد جامعہ سے علوم عربیہ اسلامیہ اور قرآن وحدیث کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد حضرت مولانا خیر محمد رحمہ اللہ نے پاکستان ہجرت کی اور مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کی خواہش اور اصرار پر جنوبی پنجاب کے تاریخی شہر ''مدینۃ الاولیاء'' ملتان میں ۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ''خیر المدارس'' کا دوبارہ آغاز کیا۔

ملتان، جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے پاکستان کا وسط ومرکز اور تاریخی لحاظ سے ایک اہم علمی مقام ہے، مگر ملتان اور جنوبی پنجاب کے اکثر اضلاع ومضافات علوم شرعیہ سے ناواقفیت کے باعث جہالت اور رسوم وبدعات کے

(۱) فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات: ۳۱۰۔۳۱۳۔

اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے، ان حالات میں ''خیر المدارس'' کا وجود تاریکیوں میں چراغ اور طوفانوں میں نشان منزل کا پتہ دینے والا مینارۂ نور ثابت ہوا، جس کی روشنی جلد ہی نہ صرف پنجاب و پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں پھیلنے لگی اور یہ ادارہ عوام کی توجہات کا مرکز بن گیا، گذشتہ پون صدی کے دوران ''جامعہ خیر المدارس'' سے ہزاروں تشنگان علم اپنی پیاس بجھا چکے ہیں، جامعہ کے تعلیم یافتہ ملک اور بیرون ملک ہرجگہ خدمت دین میں مصروف ہیں، فضلاء جامعہ کی کثیر تعداد نے پاکستان کے گوشہ گوشہ میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا ہے۔

دوبارہ آغاز کے ساتھ ہی دارالافتاء کا قیام بھی عمل میں آیا، یہ شعبہ جید اور ماہر مفتی حضرات کی نگرانی میں مصروف خدمت ہے جو عام مسلمانوں کے دینی مسائل حل کرنے اور انہیں صحیح اسلامی احکام سے آگاہ کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے جس سے مقامی ملکی و غیر ملکی سب مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس شعبہ سے اب تک لاکھوں فتاویٰ جاری کئے جا چکے ہیں جو ''خیر الفتاویٰ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ (۱)

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے شمال مشرقی کونے میں دریائے ستلج کے درمیان جزیرہ نما بستی ''عیسیٰ پور'' میں غالبًا سن ۱۳۵۱ھ، مطابق ۱۹۳۲ء میں ہوئی، والدہ ماجدہ کا انتقال شیر خوارگی کے زمانہ میں ہو گیا تھا، والد ماجد الحاج چوہدری اللہ بخش مرحوم حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے بیعت تھے، دیہات کے پنچائتی فیصلہ نمٹانے میں ان کا شہرہ تھا، ابتدائی تعلیم کی شروعات قاری ولی محمد صاحب سے ہوئی۔ پرائمری کے بعد ۱۳/ برس کی عمر میں لدھیانہ کے مدرسہ محمودیہ اللہ والا میں داخل ہوئے، یہاں حضرت مولانا امداد اللہ صاحبؒ سے فارسی پڑھی، اگلے سال مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے مدرسہ انوریہ میں داخلہ لیا، یہاں ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں، ۲۷/ رمضان ۱۳۶۶ھ میں قیام پاکستان کا اعلان ہوا، اور مشرقی پنجاب سے مسلم آبادی کے انخلا کا ہنگامۂ رستا خیز پیش آیا، مہینوں کی خانہ بدوشی کے بعد چک ۳۳۵ ڈبلیو بی، ملتان میں قیام ہوا، وہاں سے قریب منڈی جہانیاں میں چوہدری اللہ داد خان مرحوم کی تعمیر کردہ جامع مسجد میں ''مدرسہ رحمانیہ'' تھا، وہاں حضرت مولانا غلام محمد لدھیانویؒ اور دیگر اساتذہ سے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، ایک سال ''مدرسہ قاسم العلوم'' فقیر والی ضلع بہاول پور میں حضرت مولانا عبداللہ رائے پوریؒ، ان کے برادر خورد مولانا لطف اللہ شہید رائے پوریؒ، اور حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب سے متوسطات کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد چار سال ''جامعہ خیر المدارس'' ملتان میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ، حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا

---

(۱) مقدمۂ خیر الفتاویٰ جلد اول۔

عبدالشکور کامل پوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہؒ، حضرت مولانا محمد نور صاحبؒ، حضرت مولانا غلام حسینؒ، حضرت مولانا جمال الدینؒ اور حضرت مولانا محمد شریف کشمیریؒ سے تعلیم حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے سال حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ سے سلسلہ اشرفیہ، امدادیہ، صابریہ میں بیعت کی، اور حضرت رحمہ اللہ کے حکم سے روشن والا ضلع لائل پور کے مدرسہ میں تدریس کے لیے تقرر ہوا، دوسال کے قیام کے بعد حضرت رحمہ اللہ نے ماموں کانجن، ضلع لائل پور بھیج دیا، وہاں مولانا محمد شفیع ہوشیار پوریؒ کی معیت میں دس سال تک قیام رہا۔

تعلیم وتدریس کے ساتھ لکھنے کا بھی شوق تھا، زمانۂ طالب علمی میں مشکوٰۃ کی شرح ''التقریر النجیح'' کے نام سے تالیف فرمائی، سب سے پہلا مضمون مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے رد میں لکھا، ۵/مئی ۱۹۷۸ء میں جناب میر شکیل الرحمٰن نے ''جنگ'' کا اسلامی صفحہ ''اقرا'' جاری کیا تو ان کے اصرار اور مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی اور مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ کی تاکید وفرمائش پر اس سے منسلک ہوئے اور دیگر مضامین کے علاوہ ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کا مستقل سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ بلا مبالغہ لاکھوں مسائل کے جوابات، کچھ اخبارات کے ذریعے اور کچھ نجی طور پر لکھنے کی نوبت آئی۔

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمہ اللہ سے بیعت ہوگئے، ساتھ ہی حضرت اقدس ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمہ اللہ نے بھی اجازت وخلافت عطا فرمائی۔

ماہنامہ ''بینات''، ہفت روزہ ''ختم نبوت''، ''اقراء ڈائجسٹ'' کے علاوہ ملک کے مشہور علمی رسائل میں شائع شدہ سینکڑوں مضامین کے علاوہ چند کتابیں بھی تالیف کیں۔

(۱) اردو ترجمہ **خاتم النبیین** از علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ۔
(۲) اردو ترجمہ **حجۃ الوداع وعمرات النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم** از شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ
(۳) عہد نبوت کے ماہ وسال (ترجمہ **بذل القوۃ فی سنی النبوۃ**، از مخدوم محمد ہاشم سندھیؒ)
(۴) سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ (عربی سے ترجمہ)
(۵) قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث اور ان کے خلفاء کرام (۳/جلدیں)
(۶) اختلاف امت اور صراط مستقیم (دو جلدیں)
(۷) عصر حاضر حدیث نبوی کے آئینہ میں۔
(۸) **شہاب مبین لرجم الشیاطین** (رجم کی شرعی حیثیت)
(۹) گمراہ کن عقائد اور صراط مستقیم۔
(۱۰) بولتے حقائق۔

(۱۱) شخصیات وتأثرات (دوجلدیں)

(۱۲) **ذریعة الوصول إلٰی جناب الرسول** (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

(۱۳) اسلام کا قانون زکوٰۃ وعشر۔

(۱۴) معاشرتی بگاڑ کا سد باب۔

(۱۵) مقالات وشذرات۔

(۱۶) رسائل یوسفی۔

(۱۷) ارباب اقتدار سے کھری کھری باتیں۔

(۱۹) دنیا کی حقیقت (دوجلدیں)

(۲۰) دورِ حاضر کے تجدد پسندوں کے افکار۔

(۲۱) تحفۂ قادیانیت (۶؍جلدیں)

(۲۲) منتخب احادیث (دعوت وتبلیغ کے چھ بنیادی اصول)۔

(۲۳) **أطیب النغم فی شرح سید العرب والعجم صلی اللّٰہ علیہ وسلم**

(۲۴) آپ کے مسائل اوران کا حل (۱۰؍جلدیں)(۱)

حضرت مولانا مفتی محمود پاکستانی رحمہ اللہ:

مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے ضلع میانوالی کی بستی عیسیٰ ابا خیل سے درس وتدریس کا آغاز کیا، اس کے بعد حضرت سید عبدالعزیز رحمہ اللہ کی دعوت پر ابا خیل ضلع لکی مروت تشریف لائے، ''مدرسہ قاسمیہ شاہی'' مرادآباد، یوپی سے سند فراغت حاصل کی، آخر میں ''مدرسہ قاسم العلوم'' ملتان تشریف لائے اور ساری زندگی اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔ آپ اعلیٰ مدرس، بلند پایہ شیخ الحدیث، منفرد مفسر قرآن اور صاحب اجتہاد فقیہ تھے، آپ کی زندگی کا بڑا حصہ قومی کاموں میں صرف ہوا لیکن قومی اموراوران سے متعلق ذمہ داریاں ان کے علمی مشاغل کو نہ روک سکیں۔ آپ صوبہ سرحد پاکستان کے وزیراعلیٰ بھی رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فقہ میں خاص مقام عطا کیا تھا، حضرت علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت پاکستان میں ان سے بڑا کوئی مفتی نہیں۔ آپ کے علمی منصب کا اعتراف عرب کے علما بھی کرتے تھے۔

مفتی محمود صاحب کی شہرت عام ہوئی تو ''قاسم العلوم'' کی انتظامیہ انہیں اپنے مدرسے میں بلانے پر مجبور ہوگئی، جب

---

(۱) آپ کے مسائل اوران کا حل، جلد اول: ۱۲۔۱۶۔

مفتی صاحب ''قاسم العلوم'' ملتان میں آ گئے تو منتظمین کو معلوم ہوا کہ یہ صرف فقہ کے ماہر ہی نہیں، علم حدیث پر بھی پوری دسترس رکھتے ہیں تو فیصلہ یہ ہوا کہ بحیثیت استاذ تو مفتی صاحب علم حدیث پڑھائیں گے اور بحیثیت مفتی دارالافتاء کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ''قاسم العلوم'' میں ان کے ابتدائی دور میں لوگ ہزاروں مسائل لے کر آئے اور انہوں نے ہزاروں فتوے جاری کئے، ان میں بیشتر مسائل مشکل اور الجھے ہوئے ہوتے تھے، لیکن مفتی صاحب کے دست گرہ کشا کے سامنے یہ الجھاؤ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، چونکہ مفتی صاحب اس شرط پر مدرسہ آئے تھے کہ انتظامیہ ان کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگائے گی، اس لیے جب مفتی صاحب کی سیاسی مصروفیات بڑھ گئیں تو افتا کا کام کم ہو گیا، اب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو مفتی صاحب اس پر فتویٰ دیتے، عام مسائل پر نائب مفتی ہی جواب لکھ دیتے تھے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک پچیس سالوں میں آپ نے تقریباً بائیس ہزار سے زائد فتوے دیئے، جو دارالافتاء کے رجسٹر میں محفوظ ہیں۔

''جمعیت علماء ہند'' قیام پاکستان کے بعد ہندوستان تک محدود ہو چکی تھی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی ''جمعیت علماء اسلام'' مولانا کے عدم توجہ کی وجہ سے معطل سی ہو کر رہ گئی تھی، ملک میں دینی سیاست کے لیے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی، مولانا مفتی محمود صاحب نے ۱۹۵۶ء میں چیدہ چیدہ علماء کرام کو ملتان میں جمع کیا اور علماء کرام نے اپنے سیاسی پلیٹ فارم سے نفاذ شریعت کی جدوجہد کا آغاز کیا۔

۱۹۶۲ء میں مفتی صاحب نے انتخابات میں حصہ لیا اور پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، ۱۹۷۰ء میں جب یحییٰ خان نے انتخابات کا اعلان کیا تو مفتی صاحب اور ''جمعیت علماء اسلام'' کی سیٹ سے بھٹو کو ڈیرہ اسماعیل خان میں زبردست شکست دی، مفتی صاحب کی محنت سے اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا، ۱۹۷۷ء میں پاکستان کے اسلامی رخ کو متعین کیا، جنرل ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ مفتی صاحب نے اسلامی نظام کے لیے تعاون شروع کیا اور کچھ اسلامی دفعات کا اعلان بھی کر دیا گیا، جب ضیاء الحق مرحوم آمریت کی طرف رخ کرنے لگے تو مفتی صاحب نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کی آمریت کو للکارا اور اس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے خلاف آپ تحریک کا آغاز کرنے کے لیے تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کو متحد کر رہے تھے کہ چودھویں صدی کے آخری حج کے سفر پر تشریف لے جاتے ہوئے کراچی میں قیام کے دوران ''جامعہ علوم اسلامیہ'' بنوری ٹاؤن کے مہمان خانہ میں مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا محمد رفیع عثمانی، شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مفتی احمد الرحمٰن، ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر، مولانا محمد طاسین، مولانا محمد بنوری سے زکوٰۃ کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے سن ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء کو دار بقا کی طرف چلے گئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

اس وقت آپ کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی امارت میں ''جمعیت علماء اسلام'' پاکستان اپنے فرائض کو انجام دے رہی ہے۔ (۱)

---

(۱) فتاویٰ مفتی محمود جلد اول: ۱۲۴/تا ۱۶۰۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب:

آپ کی پیدائش ۱۹۴۳ء میں دیو بند ضلع سہارنپور، یوپی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں حضرت مولانا احتشام الدین تھانوی رحمہ اللہ کے قائم کردہ ادارہ ''مدرسہ اشرفیہ'' میں حاصل کی، جامعہ کراچی سے وکالت میں ماسٹر اور جامعہ پنجاب سے عربی ادب میں تخصص کیا، بعدازاں ۱۹۶۱ء میں اسی ادارے سے فقہ کی تعلیم مکمل کی، دارالعلوم کراچی سے درس نظامی نمایاں نمبروں سے پاس کیا۔

آپ نے علوم حدیث کی اجازت تقریباً تمام جید علما سے حاصل کی جن میں خود ان کے والد محترم حضرت مفتی محمد شفیع دیو بندی، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ شامل ہیں۔

آپ کے والد ماجد آپ کی تربیت سلوک کے لیے بہت فکر مند تھے، اپنے والد کے حکم سے ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمہ اللہ سے تعلق قائم کیا، کچھ ہی عرصہ میں ان سے متأثر ہو کر بیعت ہو گئے۔

جامعہ کراچی سے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک وکالت کی تعلیم حاصل کی، اور ۱۹۸۲ء میں طویل عرصے تک وفاقی شرعی عدالت کے نظام سے وابستہ رہے، پاکستان کے قائم مقام منصف اعظم بھی رہے، ۲۰۰۲ء تک سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بینچ کے جج رہے، آپ نے شریعت اپیلیٹ بینچ کے تحت سود کو غیر شرعی قرار دے کر اس پر پابندی کا فیصلہ دیا جس کے پاداش میں اس وقت کے صدر پرویز مشرف نے آپ کو عہدہ سے برطرف کر دیا۔

جدید معاشی نظام کی اساس جدید بینکنگ پر ہے، جس کا پورا ڈھانچہ سود کی بنیادوں پر کھڑا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے، اس لیے شرعی حدود میں رہ کر بینک کاری کا بغیر سودی سرگرمیوں کے جاری رکھنا ایک مستقل مسئلہ تھا لیکن آپ کی مجددانہ کوششوں کی بدولت یہ مستقل طور پر حل ہو سکا، آپ نے عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایسا نظام وضع کیا ہے جو ساری دنیا میں مقبول عام ہو رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کئی اسلامی بینکوں کے مشیر ہیں، کئی اسلامی مالیاتی اداروں کے اکاؤنٹنگ، آڈیٹنگ اور آرگنائزیشن کے چیرمین بھی ہیں۔ آپ نے پاکستان میں پھیل رہے قادیانی نظریات کی مخالفت کی تحریک میں اپنا اہم رول ادا کیا، مولانا سمیع الحق صاحب کے ساتھ قادیانیوں کے خلاف ایک دستاویز تیار کی جو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی۔ آپ کا شمار کثیر التصانیف علما میں کیا جاتا ہے۔

آپ کی چند تصانیف یہ ہیں:

(۱) آسان ترجمۂ قرآن (توضیح القرآن) مع تشریحات، مکمل تین جلدیں۔

(۲) آسان نیکیاں

(۳) اندلس میں چند روز

(۴) اسلام اور سیاست حاضرہ

(۵) اسلام اور جدت پسندی

(۶) اکابر دیوبند کیا تھے؟

(۷) تقلید کی شرعی حیثیت

(۸) پرنور دین

(۹) تراشے

(۱۰) بائبل کیا ہے؟

(۱۱) جہان دیدہ

(۱۲) دنیا میرے آگے

(۱۳) حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق

(۱۴) حجیت حدیث

(۱۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

(۱۶) فرد کی اصلاح

(۱۷) علوم القرآن

(۱۸) ہمارا معاشی نظام

(۱۹) نمازیں سنت کے مطابق پڑھیں

(۲۰) عدالتی فیصلے

(۲۱) عیسائیت کیا ہے؟

(۲۲) درس ترمذی

(۲۳) تکملۂ فتح الملہم

(۲۴) فتاویٰ عثمانی

دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اور فتویٰ کے میدان میں آپ سے اللہ جل شانہ نے بڑا کام لیا ہے، اس سلسلہ میں ''**تکملة فتح الملهم**'' کے فقہی مباحث، **بحوث قضایا فقهية معاصرة**، فقہی مقالات، **أحكام الأوراق النقدية**، عدالتی فیصلے، ملکیت زمین کی تحدید، وغیرہ فقہی میدان میں آپ کی گرانقدر تصنیفات ہیں۔

فقہی میدان میں خدمات کا ایک بڑا حصہ ہزاروں کی تعداد میں لکھے ہوئے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو پچھلے

پینتالیس سالوں میں تحریر فرمائے ہیں مگر ان کی یہ عظیم الشان علمی، فقہی اور تحقیقی خدمت شائع نہ ہونے کی وجہ سے ہنوز نظروں سے اوجھل ہے۔

اگرچہ اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی بنا پر زمانۂ طالب علمی میں ہی فتاویٰ لکھنا شروع کر دیا تھا مگر درجۂ تخصص سے فراغت کے بعد اپنے والد ماجد کی زیرِ نگرانی با قاعدہ فتویٰ لکھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک بحمد اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جاری ہے، اس پورے عرصہ کے تقریباً تمام فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقل فتاویٰ کے قدیم وجدید رجسٹروں میں محفوظ ہیں مگر چونکہ بالکل ابتدا میں دارالعلوم میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا کوئی با قاعدہ اور منظّم انتظام نہیں تھا اس لیے دارالافتاء کے بعض دیگر فتاویٰ کی طرح شروع کے کچھ فتاویٰ بھی محفوظ نہیں رہے۔ مولانا کے فتاویٰ کے چند ادوار ہیں:

(۱)　وہ فتاویٰ جو ''دارالافتاء دارالعلوم'' کراچی سے با قاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقل فتاویٰ رجسٹروں میں ان فتاویٰ کا اندراج ہے۔

(۲) بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور البلاغ میں ان کے جوابات دیا کرتے تھے، ان میں بعض انتہائی مفصل اور محقق جوابات بھی ہیں، البلاغ کے بعض فتاویٰ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

(۳)　تمرین افتا کے زمانہ میں آپ کے تحریر کردہ تمام فتاویٰ والد ماجد سے تصحیح وتصدیق شدہ ہیں ان میں سے بعض مفصل اور مدلل فتاویٰ بھی ہیں جن کو مجموعہ فتاویٰ عثمانی میں شامل کیا گیا ہے۔(۱)

مولانا سعید احمد جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کی پیدائش ۱۹۵۶ء میں ہوئی، والد کا نام جام شوق محمد مرحوم ہے۔ ابتدائی تعلیم مولانا عطاء الرحمٰنؒ اور مولانا غلام فریدؒ سے ہوئی، ۱۹۷۱ء میں مدرسہ انواریہ حبیب آباد طاہر والی، ۷۲۔۱۹۷۳ء تک مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ظاہر پیر خان پور میں، ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم کبیر والا خانیوالا، ۷۶۔۱۹۷۷ء میں جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، مولانا مصباح اللہ شاہؒ، وغیرہم سے ہوئی، اور ۱۹۷۷ء میں فاتحہ فراغ پڑھا، کراچی بورڈ سے میٹرک اور ایف اے کا امتحان دیا اور اسی بورڈ سے عربی فاضل کی سند حاصل کی، کئی جگہ امامت وخطابت وتدریسی خدمت کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ میں استاذ مقرر ہوئے، ماہنامہ ''بینات''، روزنامہ ''جنگ'' کے اسلامی صفحہ ''اقرا''، ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں مضامین شائع ہوئے، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ سے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے، ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں تخریج اور نظرِ ثانی کا کام کیا، آپ کے تصانیف میں معارف بہلوی

(۱)　فتاویٰ عثمانی جلد اول: ۳۳۔۴۴، ودیگر کتب۔

(چار جلدیں)، بزم حسین (دو جلدیں)، حدیث دل (تین جلدیں)، پیکر اخلاص، فتنہ شاہی ہے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد فرید پاکستانی رحمہ اللہ:

حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی، جن کی آغوش شفقت میں قرآن مجید اور فارسی وعربی کی ابتدائی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ درس نظامی کی اکثر وبیشتر کتابیں پڑھیں، ۱۳۸۶ھ میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو منطق وفلسفہ اور حکمت وریاضی کی تعلیم مولانا خان بہادر رحمہ اللہ اور مولانا محمد نذیر چکیسریؒ سے سید وشریف سوات میں حاصل کی، اور اونچی کتابیں مولانا عبدالرزاق رحمہ اللہ سے مروان میں پڑھیں، درس حدیث کی تعلیم مولانا نصیر الدین غورغشتوری کی درسگاہ سے حاصل کی۔

''جمعیت علماء اسلام'' پاکستان، کے مرکزی سرپرستوں میں سے تھے، مولانا مفتی محمود صاحب سے پہلے شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور اکابر ''جمعیت علماء'' ہند کے نظریات پر کاربند تھے، بیس سال تک دارالعلوم حقانیہ میں تدریس اور افتا کے منصب پر فائز رہے، ہزاروں کی تعداد میں طالبان علوم نبویہ آپ سے مستفید ہوئے، والد محترم کے دست حق پر سلسلہ نقشبندیہ سے بیعت وخلیفہ مجاز تھے۔ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے آپ کے ہزاروں فتاویٰ شائع ہوئے ہیں اور کئی تصنیفات بھی کی ہیں، زندگی کا اکثر حصہ اعصابی عوارض، علالت اور ضعف ونقاہت میں گذارا، ۲۱ رمئی ۲۰۰۵ء کو پچاس برس کی عمر پا کر عالم شباب میں ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو تدریسی فرائض کی شہرہ آفاق مقبولیت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے ملکہ راسخہ سے بھی نوازا تھا۔ بطور تذکرہ چند کتب کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱)منهاج السنن شرح جامع السنن للترمذی (عربی): یہ مختصر جامع شرح ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، تمام اہم فقہی اور حدیثی مباحث پر حاوی ہے جس کو بیک وقت شرح حدیث اور فتاویٰ کی حیثیت حاصل ہے۔

(۲)هداية القاری علی صحیح البخاری (عربی): جو بخاری شریف کے مطول اور ضخیم شروح کا ملخص ہے اور اکابر محدثین کے امالی کا نچوڑ ہے۔

(۳)فتح المنعم شرح مقدمة مسلم (عربی): یہ صحیح مسلم کے مقدمہ کی محققانہ شرح ہے جو دس اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

(۴)البشریٰ لأرباب الفتویٰ (عربی): یہ مختصر رسالہ افتا کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے دس فصلوں پر تقسیم ہے، آخری فصل میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مختصر سوانح حیات اور ان پر اعتراضات کے جوابات بیان کئے گئے ہیں۔

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد اول: ۱۲۔۱۶۔

(۵) **العقائد الإسلامية باللغة السليمانية** (پشتو): یہ کتاب چالیس عقائد اور چالیس اہم احکام پر مشتمل ہے۔

(۶) مقالات (پشتو): اس کتاب میں بعض اختلافی مسائل کے حل کے علاوہ مسئلہ توحید واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

(۷) مسائل حج (پشتو): یہ رسالہ حج کے اہم مباحث اور احکام ومسائل پر مشتمل ہے۔

(۸) رسالة التوسل (عربی): اس رسالہ میں مسئلہ توسل پر معتدل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۹) سلسلۂ مبارکہ (اردو، پشتو، فارسی): اس میں تصوف کی تعریف، غرض وغایت اور سلسلہ نقشبندیہ کے اسباق کی تشریح کی گئی ہے۔

(۱۰) رسالہ قبریہ (پشتو): اس میں موت اور کفن دفن سے متعلق مسائل جمع کئے گئے ہیں۔

(۱۱) **الفوائد البهية إلى أحاديث خير البرية** (عربی): یہ رسالہ اصول حدیث، اقسام، تعریفات اور آداب علم حدیث پر مشتمل ہے۔

(۱۲) فتاویٰ دیوبند پاکستان المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ: دارالعلوم حقانیہ کے ۳۱ رسالہ ریکارڈ میں سے منتخب فتاویٰ کا مجموعہ جسے مولانا مفتی محمد وہاب منگلوتی فاضل ومتخصص دارالعلوم حقانیہ مفتی دارالعلوم صدیقیہ زروبی نے مرتب کیا ہے۔(۱)

مولانا مفتی رضاء الحق صاحب:

مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ میں حدیث وفقہ کے استاذ ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲ رستمبر ۱۹۹۶ء مدفون ایلبرگ کیمیٹری نزد جوہانسبرگ) کے خلیفہ ہیں۔ مولانا کا وطن اصلی خیبر پختونخوا، پاکستان ہے، عالمیت اور فضیلت ''جامعہ اسلامیہ'' اکوڑہ خٹک، پاکستان میں ۲۰ رسال کی عمر میں مکمل کی اور تخصص فی الدعوة والارشاد (زیر نگرانی مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی) اور تخصص فی الافتاء (زیر نگرانی مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی) بنوری ٹاؤن کے ''جامعہ بنوریہ'' سے کیا۔ تخصص فی الافتاء کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب جنوبی افریقہ آنے سے پہلے بنوری ٹاؤن میں استاذ ہو گئے۔ دارالعلوم زکریا کے مہتمم مولانا شبیر احمد سلوجی صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے بنوری ٹاؤن میں پڑھا ہے۔ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن سے اپنی تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد جب مولانا شبیر سلوجی صاحب جنوبی افریقہ آئے اور اپنا مدرسہ دارالعلوم زکریا قائم کیا تو انہوں نے مفتی صاحب کو جنوبی افریقہ آنے کی اور دارالعلوم زکریا میں استاذ کے عہدہ پر فائض ہونے کی دعوت دی۔ آپ نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے۔

---

(۱) فتاویٰ دیوبند پاکستان المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد اول: ۳۱-۳۶۔

مولانا ایک محدث ہونے کے علاوہ ایک فقیہ، نحوی، صرفی، منطقی، فلسفی، متکلم، شیخ طریقت، مصنف اور ایک عمدہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''قرار دل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ یقیناً قرار دل تلاش کرنے والوں کے دل کا قرار ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کچھ دوسری کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جو ان کے وسعت مطالعہ اور علم کی گہرائی کی عکاس ہیں۔ تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) بدء الامالی (عقائد)۔
(۲) الجزء اللطیف (حدیث)۔
(۳) اعلام الفعام (تقابل مذاہب)۔ (۵) خطبات الاحکام۔
(٦) ذکر بالجہر۔ (۷) تمرین الصرف۔
(۸) شرح قصیدہ بردہ شریف۔
(۹) فتاویٰ سراجیہ۔
(۱۰) فتاویٰ دار العلوم زکریا (پانچ جلدیں)

دار العلوم زکریا میں درس و تدریس کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ جمعیۃ المفتیین جنوبی افریقہ میں بھی مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں اور جمعیۃ المفتیین پاکستان کے ممبر ہیں۔ ساتھ ہی جمعیۃ العلماء جنوبی افریقہ کے کنسلٹنٹ ممبر بھی ہیں۔ اللہ جل شانہ نے فتوے کے سلسلہ میں کافی سمجھ بوجھ عطا فرمائی ہے، آپ کے فتوے میں احتیاط کا پہلو غالب رہتا ہے اور اگر کسی مسئلہ میں کئی آراء ہوتی ہیں تو ہمیشہ احوط پر عمل کرتے ہیں۔ ()()()

خلاصۂ کلام:

یہ تفصیلی مقدمہ جسے آپ نے پڑھا گرچہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے پھر بھی اس کا احساس ہے کہ علماء ہند و پاک کے فتاویٰ کی خصوصیات اور ان بزرگوں کی خدمات کو جس تفصیل کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے ابھی تک وہ کام نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی ضرورت بہر حال باقی ہے تا کہ امت کے سامنے یہ واضح ہو کر آسکے کہ بارہ سو سالہ عہد میں ان ہندوستانی علما و فقہا نے کس طرح کی علمی و دینی خدمت انجام دی ہے۔ اخیر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہماری ان تقصیرات کو معاف فرمائے جو ''فتاویٰ علماء ہند'' کی صفحات میں ہوئی ہیں، ان لغزشوں کو بھی اپنی رحمت اور عفو و کرم سے معاف فرمائے جو اتنی بڑی دینی خدمت میں ہوئی ہیں، امید ہے کہ اصحاب علم و فقہ علمی و فقہی سہو و نسیان و غلطی پر متنبہ فرمائیں گے تا کہ آئندہ ان کی اصلاح کرسکوں۔ (انشاء الله العزیز)

''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ''

انیس الرحمٰن قاسمی
ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

۲ر رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
مطابق ۱۴ر مئی ۲۰۱۳ء

قال اللّٰہ جلّ وعلیٰ

یٰا اَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ، وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا.

(سورۃ المائدۃ:۶)

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

”**الطهور شطر الإيمان**“. (مسلم:۱/۱۱۸)

”**مفتاح الصلوة الطهور**“. (ترمذی)

کتاب الطهارة

فرائضِ وضو، سننِ وضو، مستحباتِ وضو
مکروہاتِ وضو، نواقضِ وضو

فرائضِ وضو

(۱) وضو کے فرائض وسنن:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ وضو میں کتنے فرائض اور کتنی سنتیں ہیں،

(۱) **وضو کی قسمیں:**

وضو کی حیثیت نماز ودیگر عبادتوں کے لیے شرط کی ہے اوراس کی پانچ قسمیں ہیں: (۱) فرض (۲) واجب (۳) مستحب (۴) مکروہ (۵) حرام۔اس کی تفصیل یہ ہے:

فرض وضو:

۱۔ یعنی جس شخص پر نماز فرض ہے اگر وہ حدث کی حالت میں ہے (یعنی وضو یا تیمّم کی حالت میں نہیں ہے) تو اس پر نماز کے لیے وضو کرنا فرض ہے چاہے فرض نماز پڑھنی ہو یا نفل یا جنازہ کی نماز ہو یا سجدہ تلاوت ہو جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت ''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ، وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا. (سورۃ المائدۃ:۶) سے ظاہر ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

''اللہ بغیر پاکی (وضو) کے نماز قبول نہیں کرتا ہے''۔(ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۶۷)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تم میں سے کسی کی نماز کو اگر حدث کی حالت میں ہو تو قبول نہیں کرتا ہے یہاں تک کہ وہ وضو کرلے''۔(المصنف حدیث نمبر ۵۳۰: ۱/۵۵)

۲۔ نماز پڑھنے کے علاوہ قرآن کریم چھونے کے لیے بھی وضو فرض ہے، چاہے پورا قرآن چھونا ہو یا اس کا ایک ورق یا لکھی ہوئی ایک آیت چھونی ہو، چاہے یہ آیت کاغذ پر تحریر ہو یا پلاسٹک پر یا دیوار پر یا کسی دوسری چیز پر۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''(سورۃ الحدید:۷۹) قرآن کو نہیں چھوتے ہیں مگر پاک لوگ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''قرآن نہ چھوئے کوئی مگر یہ کہ وہ پاک ہو''۔

۳۔ البتہ اگر قرآن کی کیسیٹ ہو یا کمپیوٹر کی فلوپی (یا سی ڈی، پین ڈرائب) میں ہو تو اس کے چھونے کے لیے وضو کرنا فرض نہیں ہے، البتہ مستحب ہے۔(نظام الفتاویٰ ۲۵/)

۴۔ تفسیر قرآن جب کہ قرآن کی آیتیں زیادہ ہوں تو چھونے کے لیے وضو کرنا فرض ہے اور اگر تفسیر زیادہ ہو تو وضو کرنا مستحب ہے، فرض نہیں ہے۔

واجب وضو:

۱۔ خانہ کعبہ کے گرد طواف کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔(الہدایۃ: ۲/۲۵۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بیت اللہ کا طواف نماز ہے، البتہ اس میں بولنے کو اللہ نے جائز قرار دیا ہے پس جو کوئی گفتگو کرے تو وہ خیر کی بات کرے۔(رواہ الترمذی) ==

تشریح فرمائیں؟

== اور طواف چوں کہ حقیقی نماز نہیں ہے اس لیے اس کی صحت وضو پر موقوف ہے، البتہ وضو کرنا واجب ہوگا اور وضو کے ترک سے طواف واجب میں صدقہ، طواف فرض میں بڑا جانور اور طواف نفل میں صدقہ لازم ہوگا۔ (الہدایۃ: ۲۵۴/۲)

مستحب وضو:

تیس سے زائد حالتیں ایسی ہیں جن کے لیے اگر وضو نہیں ہے تو وضو کرنا مستحب و مندوب ہے، جیسے:

(۱) جب سونے کا ارادہ ہو تو وضو کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جب تم بستر پر جاؤ تو نماز کے لیے وضو کی طرح وضو کرو، پھر اپنے داہنے پہلو لیٹ جاؤ۔ (۲) جب سو کر اٹھے تو وضو کرے۔ (۳) وضو ہو پھر بھی ہر وقت کی نماز کے لیے نیا وضو کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص طہارت کے باوجود وضو کرے تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ (ابن ماجہ حدیث: ۶۳۲، ۹۶/۱) (۴) دینی و شرعی کتب عقائد، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ کے چھونے کے لیے۔ (۵) قرآن کریم کی قراءت کے لیے۔ (۶) حدیث شریف کی روایت کے لیے۔ (۷) دینی و شرعی کتابوں کے مطالعہ و تدریس کے لیے۔ (۸) اذان دینے کے لیے۔ (۹) اقامت کہنے کے لیے۔ (۱۰) خطبہ نکاح و دیگر خطبات کے لیے۔ (۱۱) ذکر الٰہی کے لیے۔ (۱۲) صفا و مروہ کے درمیان سعی کے لیے۔ (۱۳) عرفہ میں وقوف کے لیے۔ (۱۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے۔ (۱۵) غسل کرنے سے پہلے وضو کرنا۔ (۱۶) جنبی کے لیے کھانے پینے سے پہلے وضو کرنا۔ (۱۷) جنبی کے لئے جماع سے پہلے وضو کرنا۔ (۱۸) جنبی کے لیے سونے سے پہلے وضو کرنا۔ (۱۹) غصہ آنے پر وضو کرنا۔ (۲۰) ہر طرح کے گناہ جھوٹ، غیبت کے ارتکاب کے بعد۔ (۲۱) نماز سے باہر قہقہہ لگانے سے۔ (۲۲) میت کو غسل دینے کے بعد۔ (۲۳) میت کو اٹھا کر لے جانے کے بعد۔ (۲۴) غزل گوئی یا قبیح مضامین کی شعر گوئی کے بعد۔ (۲۵) اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد۔ (۲۶) عورت کو چھونے یا اس کے محاسن کو دیکھنے کے بعد۔ (۲۷) ہمہ وقت باوضو رہنے کے لیے۔ (۲۸) شرمگاہ کو چھونے کے بعد۔ (۲۹) وضو ہونے پر وضو کسی عبادت کے لیے۔ (۳۰) مسجد میں داخلہ کے لیے۔

مکروہ وضو:

۱۔ اگر باوضو ہو اور اس وضو سے کوئی عبادت نہ کی ہو تو وضو رہتے ہوئے وضو کرنا مکروہ ہے گرچہ وضو کے بعد مجلس بدل گئی ہو۔ (مراقی الفلاح: ۴۰)

۲۔ مسجد یا اس کے صحن میں وضو کرنا یا کلی کرنا مکروہ ہے۔ (فتاویٰ ہندیۃ: ۱۰۸/۱)

حرام وضو:

وضو کے لیے پاک پانی اور اس کا ملکیت میں ہونا یا اس کا استعمال مباح ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اگر کسی نے غصب کئے ہوئے یا چوری کئے ہوئے پانی سے وضو کیا تو اس کا وضو کرنا حرام ہوگا۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۱۰۸/۱)

وضو فرض ہونے کی شرطیں:

اوپر وضو کی فرضیت اور اس کی دیگر قسموں کا بیان تھا، مگر یہ جاننا چاہیے کہ وضو ہر شخص پر ہر وقت فرض نہیں ہے بلکہ یہ اسی شخص پر فرض یا واجب ہے جو مکلّف ہو یعنی اس میں ذیل کی آٹھ شرطیں پائی جاتی ہوں ورنہ نہیں:

(۱) اول یہ کہ وہ مسلمان ہو کیوں کہ کافر و مشرک پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے (۲) دوم یہ کہ وہ بالغ ہو کیوں کہ بچے پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے (۳) سوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ ۱۔ کیوں کہ مجنون پر اس کی حالت جنون میں وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔ ۲۔ اسی طرح مصروع پر حالت صرع میں وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔ ۳۔ سونے والے پر حالت نوم میں وضو واجب نہیں ہوتا ہے (۴) چہارم یہ کہ اتنی مقدار میں پاک پانی موجود ہو (اور ملکیت میں ہو یا اس کا استعمال مباح ہو) جس سے تمام اعضاء وضو کو ایک بار دھویا جاسکے کیوں کہ اگر پانی موجود نہ ہو یا اتنا کم ہو کہ تمام اعضاء وضو کو وہ دھو نہیں سکتا ہے تو وضو فرض نہیں ہوگا (۵) پنجم یہ کہ پانی کے استعمال پر قادر ہو یعنی وہ اس کے استعمال سے عاجز نہ ہو مثلاً قید میں یا شدید بیمار ہو تو اس صورت میں بھی وضو فرض نہیں ہوگا (۶) ششم یہ کہ حدث کی حالت میں ہو یعنی اسے وضو نہ ہو (۷) ہفتم یہ کہ فرض نماز کا وقت ہو اور وقت تنگ ہو کیوں کہ وضو کی فرضیت نماز کے لیے ہے اور نماز کا وقت اگر آخر نہ ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ ابھی وہ وضو نہ کرے مگر جب آخر وقت ہو جائے تو وضو کرنا فرض ہو جائے گا تا کہ نماز ادا کر سکے (۸) اور آخری شرط یہ ہے کہ اگر عورت ہو تو وہ حیض و نفاس کی حالت میں نہ ہو کیوں کہ حیض و نفاس والی عورتوں پر اس حالت میں نماز فرض نہیں ہوتی ہے اس لیے وضو بھی فرض نہیں ہے (مراقی الفلاح: ۲۴) ==

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو کے فرائض چار ہیں: (۱) چہرہ کا دھونا (۲) دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا(۱) (۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا (۴) دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا، **كذافي نورالإيضاح: ص ۳۰. وفي القرآن المجيد:" يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْااِذَاقُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْاوُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ". (۲)**

اور وضو کی سنتیں اٹھارہ ہیں جیسا کہ علامہ شرنبلالیؒ نے بیان فرمایا ہے: (۱) دونوں ہاتھوں کا گٹوں تک دھونا (۲) شروع

== **وضو کے صحیح ہونے کی شرطیں:**

جس طرح وضو کے فرض ہونے کے لیے کچھ شرطیں متعین ہیں اسی طرح وضو کے صحیح و درست ہونے کے لیے بھی شریعت نے چند شرطیں مقرر کی ہیں اور وہ تین ہیں:

۱۔اول یہ کہ وضو میں بدن کے جن اعضا کا دھونا فرض ہے ان کا کوئی حصہ بال برابر بھی (وضو کے پانی سے دھونے سے) خشک نہ رہ جائے۔۲۔دوم یہ کہ وضو کے منافی چیزیں نہ پائی جائیں جیسے عورتیں حیض یا نفاس میں نہ ہوں یا دوران وضو حدث نہ ہو۔۳۔سوم یہ کہ اعضاء وضو پر کوئی بھی ایسی چیز لگی ہوئی نہ ہو جو پانی کو جلد تک پہونچنے سے روکتی ہو، جیسے ناخن پالش وغیرہ۔(طہارت کے احکام ومسائل:۹۲۔۹۹۔انیس)

(۱) ۱۔چہرہ دھونے کے بعد وضو میں دوسرا فرض دونوں ہاتھوں کا کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سرے تک ایک بار مکمل طور پر دھونا ہے۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۸۹،۹۹۔الدرالمختار: ۱/۱۰۲**)۲۔اگر کسی شخص کے ہاتھ میں پانچ انگلیوں کے بجائے چھ انگلی یا اس سے زائد انگلیاں ہوں یا ایک ہتھیلی کی جگہ دو ہتھیلیاں ہوں تو وضو میں ان سب کا دھونا فرض ہوگا۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۸۹،۹۹۔الدرالمختار: ۱/۱۰۲**)۳۔اسی طرح اگر کسی کے ایک ہاتھ میں کہنی سے یا اس کے نیچے دوسرا ہاتھ نکلا ہو، چاہے اس ہاتھ سے کام کرتا ہو یا کام نہ کرتا ہو، وضو میں اس کا دھونا بھی فرض ہوگا۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۰۔الدرالمختار: ۱/۱۰۲**)۴۔اور اگر کہنی کے اوپر سے ہاتھ نکلا ہو تو کہنی کے سامنے سے اس کا دھونا فرض ہوگا (**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۰۔الدرالمختار: ۱/۱۰۲**)۵۔اگر کسی شخص کے ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے سے مل گئی ہوں تو وضو میں انگلیوں کے درمیان پانی پہونچانے کے لیے خلال کرنا فرض ہوگا اور اگر بغیر خلال کیے پانی پہونچ جاتا ہو جیسے حوض میں وضو کرے یا نلکی سے وضو کرے تو ایسی صورت میں انگلیوں کا خلال تر انگلیوں سے کرنا سنت ہوگا۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۰**)(طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۴،۱۰۵۔انیس)

ہاتھ کٹے ہوئے کا وضو:

۱۔ایسا شخص جس کا ایک ہاتھ کہنی سے کٹ گیا ہو وہ کہنی کو وضو میں دھوئے گا، یہ دھونا فرض ہے۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۴**)۲۔اور اگر دونوں ہاتھ کہنی سے یا اس کے نیچے سے کٹ گئے ہوں تو وہ کسی سے پانی ڈلوا کر وضو کرے گا اور کہنی پر بھی پانی ڈلوائے گا، چہرہ دھلوائے گا اور سر کا مسح کرائے گا اور دونوں پاؤں دھلوائے گا (**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۴**)۳۔اور اگر ایسا شخص جس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے ہوں وضو کرانے کے لیے کسی کو نہ پائے تو ایسی حالت میں اپنا چہرہ و سر پانی میں ڈال کر دھوئے اور پاؤں بھی پانی میں ڈال کر دھوئے اور اپنی کہنیوں کو بھی پانی میں ڈالے، البتہ اگر کہنی کے اوپر سے ہاتھ کٹا ہوا ہو تو پھر ہاتھ کو دھونا فرض نہیں ہوگا (**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۴**)۴۔اور اگر پانی سے دھونا ممکن نہ ہو تو پھر تیمّم کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے چہرے کو کسی مٹی یا دیوار پر ملے اور کہنی کو بھی مل لے۔(**الفتاویٰ التاتارخانية: ۱/۹۴**)(طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۶۔انیس)

(۲) **سورة المائدة: ۵**، آیت: ۶۔حدیث میں ہے: **عن أبي رافع عن عمه رفاعة بن رافع أنه كان جالسا عندالنبي صلى الله عليه وسلم فقال:"إنهالاتتم صلوٰةلأحدحتى يسبغ الوضوء كما أمره الله تعالىٰ يغسل وجهه ويديه إلى المرفقين ويمسح برأسه ورجله إلى الكعبين".** (ابن ماجہ: ۳۶، مطبوعہ دیوبند۔انیس الرحمٰن قاسمی)

میں بسم اللّٰہ پڑھنا (۳) مسواک کرنا (۴) تین مرتبہ کلی کرنا (۵) تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالنا (۶) مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ کرنا (۷) گھنی ڈاڑھی میں خلال کرنا (۸) انگلیوں میں خلال کرنا (۹) ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھونا (۱۰) ایک مرتبہ پورے سر کا مسح کرنا (۱۱) دونوں کانوں کا مسح کرنا (۱۲) ہر عضو کو رگڑ کر دھونا (۱۳) ہر دوسرے عضو کو پہلے عضو کے خشک ہونے سے پہلے دھونا (۱۴) نیت کرنا (۱۵) ہر عضو کی جو ترتیب قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے اسی ترتیب سے دھونا (۱۶) جس عضو کی تعداد دو ہے، اس میں داہنے کو پہلے دھونا (۱۷) ہاتھ اور پیر کو انگلیوں کی جانب سے دھونا (۱۸) گردن کا مسح کرنا۔

(کذافی نور الایضاح: ۳۴)(۱) واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ حررہ العبد حبیب اللّٰہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ: ۱/۳۴۳)

---

(۱) وضو میں مسنون اعمال سے متعلق مندرجہ ذیل حدیثیں ہیں: ۱۔ عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه علی المنبر یقول: سمعت رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم یقول: إنما الأعمال بالنیات وإنمالکل امرء ما نوی. (بخاری شریف: باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم ص۲ نمبر۱) اعمال کے ثواب کا دارومدار یا اعمال کے صحیح ہونے کا دارومدار نیت پر ہے۔ بغیر نیت کے وضو کا ثواب نہیں ہوگا۔ اس لئے وضو میں وضو کی نیت کرنا سنت ہے۔

۲۔ عن الحسنؒ قال: یسمی إذا توضأ، فإن لم یفعل أجزأه. (مصنف ابن أبی شیبة: باب فی التسمیةفی الوضوء جلد اول، ص۱۲، نمبر ۱۸)

۳۔ عن أبی سفیان بن حویطب عن جد ته عن أبیها قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم یقول: لا وضوء لمن لم یذکر اسم اللّٰہ علیه" (ترمذی شریف: باب فی التسمیة عند الوضوء، ص ۱۳، نمبر ۲۵/ابوداؤد شریف: باب فی التسمیة علی الوضوء، ص۸، نمبر ۱۰۱. سنن ابن ماجه: ۳۲)

۴۔ إن حمرانؒ مولیٰ عثمانؓ أخبره أنه رأی عثمان بن عفانؓ دعا بإناء، فأفرغ علی کفیه ثلاث مرار فغسلهما، ثم أدخل یمینه فی الإناء فمضمض واستنثر ثم غسل وجهه ثلاثاً و یدیه إلی المرفقین ثلاث مرار، ثم مسح برأسه، ثم غسل رجلیه ثلاث مرارإلی الکعبین، ثم قال: قال رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم: من توضأ نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لایحدث فیهما نفسه غفر له ما تقدم من ذنبه۔ (بخاری شریف: باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً، ۱/۲۷، نمبر۱۵۹/أبوداؤد شریف: باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم، ص۲۶، نمبر۱۰۸، صحیح مسلم: ۱/۱۲۰) اس حدیث میں ہے کہ پہلے تین مرتبہ گٹوں تک ہاتھ دھوئے۔

۵۔ عن عائشةؓ أن النبی صلی الله علیه وسلم اغتسل من الجنابة فبدأ فغسل کفیه ثلاثاً. (مسلم شریف: باب صفةغسل الجنابة، ص۱۴۳، نمبر۳۱۶/۷۲۰) اس حدیث میں ہے کہ پہلے ہتھیلیوں تک تین مرتبہ ہاتھ دھوئے۔

۶۔ عن أبی حیة قال رأیت علیاً توضأفغسل کفیه حتی أنقاهما ثم مضمض ثلاثاًواستنشق ثلاثاًوغسل وجهه ثلاثاً وذراعیه ثلاثاًومسح برأسه مرةً ثم غسل قدمیه إلی الکعبین ثم قال فأخذ فضل طهوره فشربه وهوقائم ثم قال أحببت أن أریکم کیف کان طهوررسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. (سنن الترمذی: ۱/۸، باب وضوء النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کیف کان) عن طلحة عن أبیه عن جده قال: دخلت یعنی علی النبی صلی الله علیه وسلم وهو یتوضأ والماء یسیل من وجهه ولحیته وعلی صدره فرأیته یفصل بین المضمضة والاستنشاق. (أبو داؤدشریف: باب فی الفرق بین المضمضة والاستنشاق، ص۳۰، نمبر۱۳۹) اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ مضمضہ اور استنشاق الگ الگ چلو سے کیا جائے۔

۷۔ عن ابن عمرؓ قال: کان رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم إذا توضأ عرک عارضیه بعض العرک ثم شبک لحیته بأصابعه من تحتها. (ابن ماجة شریف: باب ما جاء فی تخلیل اللحیة، ص۶۳، نمبر۴۳۲) اس حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم وضو میں گالوں کو رگڑا کرتے تھے۔

==

وضو میں واجبات:

سوال:۔ کیا وضو میں واجبات ہیں یا نہیں؟

الجواب

فقہاء کرام رحمہم اللہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو اور غسل دونوں میں واجبات نہیں۔''لما قال الحصکفیؒ:(وسننه) أفاد أنه لاواجب للوضوء ولاللغسل وإلالقدمه.(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار: ج ا ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ،سنن الوضوء)(ا)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۰)

== ۸۔عن عاصمؓ بن لقیط بن صبرة .....فقلت یا رسول اللّٰه ! أخبرنی عن الوضوء قال: أسبغ الوضوء و خلل بین الأصابع وبالغ فی الاستنشاق إلا أن تکون صائماً ۔(أبو داؤد شریف ،:باب فی الاستنثار ،ص۱۹،نمبر۱۴۱/ ترمذی شریف ،:باب ما جاء فی کراهیة مبالغة الاستنشاق للصائم ،ص۱۹۷،نمبر۷۸۸)اس حدیث میں ہے کہ روزہ دار نہ ہوتو ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرے۔

۹۔فقال عبد اللّٰہؓ بن زید: نعم .... ثم مسح رأسه بیدیه فأقبل بهما و أدبر بدأ بمقدم رأسه حتی ذهب بهما إلیٰ قفاه ثم ردهما إلی المکان الذی بدأ منه ثم غسل رجلیه۔(بخاری شریف :باب مسح الرأس کله،ص ۳۷،نمبر۱۸۵/ ابوداؤد شریف : باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم ۲۸،نمبر۱۱۸)اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پورے سر کا مسح سنت ہے۔

۱۰۔عن ابن عباسؓ:أن النبی صلی الله علیه وسلم مسح برأسه وأذنیه ظاهرهما وباطنهما.(ترمذی شریف:باب مسح الأذنین ظاهرهماوباطنهما،ص ۱۱ ،نمبر ۳۶/أبو داؤد:باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم،ص ۱۶ ،نمبر ۱۲۱)

۱۱۔عن أبی أمامةؓقال:توضأالنبی صلی الله علیه وسلم فغسل وجهه ثلاثاً و ید یه ثلاثاً،و مسح برأسه ،و قال:الأذنان من الرأس.(ترمذی:باب ماجاء أن الأذنین من الرأس ۔ص۱۶،نمبر۳۷)اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کان کے اوپر اور نیچے کے حصہ کا سر کے ساتھ مسح کرنا سنت ہے۔

۱۲۔عن خالدؓ عن بعض أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم:رأی رجلا یصلی وفی ظهرقدمه لمعة قدرالدرهم لم یصبهاالماء فأمره النبی صلی الله علیه وسلم أن یعید الوضوء والصلاة۔(أبوداؤد شریف:باب تفریق الوضوء،ص۲۶ نمبر۱۷۵)پے در پے وضو سنت ہے البتہ عذر کی وجہ سے دیر ہو جائے تو سنت کی ادائیگی میں فرق نہیں آئے گا۔

۱۳۔عن عائشةؓ قالت:کان النبی صلی الله علیه وسلم یعجبه التیمن فی تنعله،و ترجله،و طهوره،وفی شأنه کله۔(بخاری شریف:باب التیمن فی الوضوء و الغسل ،ص۲۹ نمبر۱۶۸/مسلم شریف :باب التیمن فی الطهور،ص۱۳۱،نمبر۲۶۸/۶۱۷)اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اچھی چیز میں دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے،اس لئے یہ سنت ہے

۱۴ .عن عائشةؓ قالت: قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم:عشرمن الفطرة،قص الشارب،و إعفاء اللحیة،والسواک،واستنشاق الماء،وقص الأظفار،وغسل البراجم ،ونتف الإبط،وحلق العانة ،وانتقاص الماء.قال زکریاؒ:قال مصعبؒ:ونسیت العاشرةإلاأن تکون المضمضة.(مسلم شریف:باب خصال الفطرة،ص۱۲۵،نمبر۲۶۱/۶۰۴/أبوداؤدشریف:باب السواک من الفطرة،ص۱۹،نمبر۵۳)

۱۵۔مسح رقبہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ سنت ہے یا مستحب،بعض حضرات نے مسنون قرار دیا ہے،جبکہ دوسرے بعض حضرات نے مستحب قرار دیا ہے،راجح یہی ہے کہ یہ مستحب ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں جتنی بھی روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا متکلم فیہ۔علامہ شامیؒ نے بھی مستحب قرار دیا ہے۔چنانچہ فرماتے ہیں:ومستحبه...مسح الرقبة،هوالصحیح.(الدرالمختارمع ردالمحتار:۱/۲۴۷،۲۴۷۔زکریا بک ڈپو دیو بند)انیس)

(ا) قال ابن نجیمؒ: ذکر فی النهایة:أنه یجوزأن یکون الفرض فی مقدارالمسح بمعنی الواجب لالتقائهما فی معنی اللزوم وتعقب بأنه مخالف لمااتفق علیه الأصحاب إذلاواجب فی الوضوء.(البحر الرائق: ج ا ص ۱۱ ، کتاب الطهارة)

طہارت کے لیے ان ہی اعضا کو کیوں خاص کیا گیا:

سوال: ہر نماز کے لیے پنج وقتہ وضو کیا جاتا ہے اگر ایک ہی دفعہ وضو کر لیا جائے اور چار وقت نہ کیا جائے تو عقل سلیم طہارت کا حکم نہیں لگا سکتی اور طہارت ظاہری کا اثر طہارت باطنی پر پڑتا ہے یا نہیں؟ طہارت کے لیے ان اعضا کو کیوں خاص کیا گیا؟ اگر ان اعضا کے دھونے کے بجائے غسل کر لیا جائے تو کیا وضو ہو جائے گا؟

الجواب

نماز کے لیے طہارت کی ضرورت ہے، طہارت کے لیے ان اعضا کو اس لیے خاص کیا گیا کہ یہ اعضا اکثر حالات میں خارجی مؤثرات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور تلویث کا اثر ان اعضا پر بنسبت باقی اعضا کے زیادہ ہو سکتا ہے اس لیے ان ہی اعضا کو دھونے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، وضو کی جگہ غسل کر لینا بدرجہ اتم کافی ہے اور غسل کے اندر وضو خود بخود ہو جاتا ہے لیکن اگر ہر نماز کے لیے غسل کا حکم عام دیدیا جاتا تو مسلمانوں پر اس کی تعمیل دشوار اور قریب قریب ناممکن ہو جاتی اس لئے حکم تطہیر میں لوگوں کی آسانی کا لحاظ بھی خدائے علیم وحکیم وخبیر کے احکام میں موجود ہے ،طہارت ظاہر کا اثر طہارت باطن پر بے شک پڑتا ہے اس لئے نماز جو طہارت باطن کا ذریعہ ہے اس کے لئے طہارت ظاہری شرط کر دی گئی اور طہارت ظاہری میں مکلفین کی آسانی کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے کیوں کہ بفحوائے ''الدین یسر'' اعمال دینیہ کا مبنیٰ آسانی پر رکھا گیا ہے۔(۱) واللہ اعلم۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی ۲:۲۶۳)

چہرہ کی حد کہاں سے کہاں تک ہے اور داڑھی کے غسل کا حکم:

سوال:(۱) حد چہرہ کہاں سے کہاں تک ہے، حد چہرہ کس کو کہتے ہیں؟ (۲) ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان میں جو عضو ہے وہ حد چہرہ ہے یا خارج ہے؟ (۳) وضو میں گھنی داڑھی کے جڑوں کا کس قدر خشک رہنا معاف ہے؟ (۴) گھنی داڑھی سے جڑوں کا اور بالوں کا دھونا فرض ہے یا واجب یا سنت ہے، کیا ہے؟ (۵) گھنی داڑھی سے چند بال خشک رہ گئے تو وضو درست ہوگا یا نہیں بالوں کا کس قدر خشک رہنا معاف ہے؟ (۶) داڑھی بھگونے کے لئے چلو میں پانی لے کر خوب بھگودے، یا صرف جس پانی سے منھ دھویا جاوے وہی پانی کافی ہے؟

---

(۱) اللہ تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں وضو میں بدن کے چار اعضا کو متعین کیا ہے وہ یہ ہیں (۱) چہرہ (۲) دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت (۳) دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت، ان کا دھونا فرض کیا گیا ہے (۴) اور چوتھا عضو سر ہے اس پر مسح کرنا فرض کیا گیا ہے جو کم از کم اس کا چوتھائی حصہ ہو۔ غور کیا جائے تو ان اعضا کے دھونے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بدن کے یہ اعضا عام طور پر ڈھکے ہوئے نہیں رہتے ہیں اور ان پر گرد اور میل کچیل بھی آتی رہتی ہے۔ ان کے دھونے سے صفائی وستھرائی بھی ہوتی ہے اور جسمانی وروحانی نشاط بھی حاصل ہوتا ہے اور چونکہ اس سے بدن کے گناہ دھل جاتے ہیں اس لئے دل میں ایک خاص طرح کی نورانیت اور تابانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ (طہارت کے احکام ومسائل: ۹۹۔ انیس)

الجواب

(۱) چہرہ کی حد عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک ہے، اور لمبائی میں سر کے بالوں سے لیکر ٹھوڑی کے نیچے حلق تک ہے۔(۱) (۲) گھنی داڑھی کے بالوں کی جڑوں کا تر کرنا فرض نہیں ہے، بلکہ اوپر اوپر کے بالوں کا دھونا فرض ہے۔ (۳) ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان جو عضو ہے وہ بھی چہرہ میں داخل ہے۔ (۴) جو پانی چہرہ پر ڈالا جاتا ہے اگر اس سے ڈاڑھی کے اوپر کے بال خوب تر ہو جاویں تو علیحدہ چلو لینے کی ضرورت نہیں۔

(۵) گھنی داڑھی کے نیچ میں بال خشک رہیں تو حرج نہیں، اوپر کے بال تر ہو جانا چاہئے، واللہ اعلم۔

۸/ رجب ۴۱ھ (امداد الاحکام جلد اول ص: ۳۴۳)

وضو میں چہرہ کی حد کہاں سے کہاں تک ہے:

سوال: (۱) وضو میں حد چہرہ کس کو کہتے ہیں (۲) حد چہرہ کہاں سے کہاں تک ہے (۳) ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان جو عضو ہے وہ چہرہ میں ہے یا خارج ہے؟

الجواب

(۱۔۲) قال فی مراقی الفلاح: (وحده) أی جملة الوجه (طولاً من مبدأ سطح الجبهة) سواء کان به شعر أم لا والجبهة ما اکتنفه جبینان إلی أسفل الذقن وهی مجموع لحیته واللحی منبت اللحیة فوق عظم الأسنان لمن لیست له لحیة کثیفة وفی حقه إلی مالاقی البشرة من الوجه، (وحده عرضاً مابین شحمتی الأذنین) ویدخل فی الغایتین جزء اً منهما لاتصاله بالفرض والبیاض الذی بین العذار والأذن علی الصحیح آه ملخصاً، ص ۳۴.

چہرہ کی حد طول میں سر کے بالوں کی جڑ سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک ہے اور عرضاً ایک کان کی لو سے لے کر دوسرے کان کی لو تک ہے۔ (۲)

(۱) قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالی: (وحده) أی جملة الوجه (طولاً من مبدأ سطح الجبهة) سواء کان به شعر أم لا والجبهة ما اکتنفه جبینان إلی أسفل الذقن وهی مجموع لحیته و اللحی منبت اللحیة فوق عظم الأسنان لمن لیست له لحیة کثیفة وفی حقه إلی ما لاقی البشرة من الوجه، (وحده عرضاً مابین شحمتی الأذنین) ویدخل فی الغایتین جزء اً منهما لاتصاله بالفرض والبیاض الذی بین العذار والأذن علی الصحیح آه ملخصاً. (مراقی الفلاح، ص ۳۴.) انیس

(۲) چہرہ پیشانی کے اوپری کنارے سے لے کر ٹھڈی کے نیچے تک (لمبائی میں) اور دائیں کان کی لو سے بائیں کان کی لو کے درمیان کا حصہ (چوڑائی میں) ہے۔ (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۱۔ انیس)

(۳) ٹھوڑی کے نیچے حلق کے درمیان میں جوعضو ہے وہ بھی چہرہ(۱) میں داخل ہے اس کا دھونا بھی فرض ہے۔(امدادالاحکام جلداول ص۳۴۳ و۳۴۴)

گنجے سر والے آدمی کے چہرے کی حدود کا حکم:

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! فقہ کی بعض کتابوں میں چہرے کی حد سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک

(۱) اس کی تفصیل یہ ہے کہ چہرہ میں بھنوں، آنکھ، ناک، رخسار، لب اور ٹھڈی وڈاڑھ سب داخل ہیں۔(الدرالمختار مع ردالمحتار:۱۰۱/۱، الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۸/۱، ۸۹)

بھنویں:

وضومیں دونوں بھنوؤں کے چمڑے کوبھی دھونا چاہیے، البتہ اگر بھنوؤں کے بال گھنے ہوتو صرف بالوں کادھونا فرض ہے، ان کے نیچے کی جلدکادھونا فرض نہیں ہے۔(الدرالمختار مع ردالمحتار:۱۰۱/۱، الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۸/۱، ۸۹)

آنکھ:

دونوں آنکھوں کے پپوٹے، آنکھوں کے دونوں کونے اور پپوٹوں کے بال کاوضومیں دھونا فرض ہے۔لیکن آنکھ کے اندرونی حصہ کادھونا فرض نہیں ہے، البتہ وضوکرتے وقت دونوں آنکھوں کوقصداً سختی سے بندکرلینا صحیح نہیں ہے، بلکہ نہ بہ تکلف کھولنے کی ضرورت ہے اورنہ بندکرنے کی۔جس کی آنکھ میں کیچڑ آتا ہوتواس کے لیے ضروری ہے کہ ان کوصاف کرکے ان کے نیچے کی سطح تک پانی پہونچائے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۷/۱، ۸۸)

ناک:

وضومیں ناک کے اوپری حصہ کادھونا فرض ہے اوراندرونی حصہ کادھونا اورصاف کرنا سنت ہے۔

رخسار:

وضومیں دونوں رخسار کادھونا فرض ہے، اگران پربال اگ آئے ہوں اور گھنے نہ ہوں توان بالوں کی جڑ کادھونا فرض ہے اور گھنے ہوتو صرف بالوں کادھونا فرض ہے۔دونوں رخساروں اوردونوں کانوں کی لو کے درمیان کے حصہ کوبھی پانی سے ترکرنا فرض ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۷/۱، ۸۸)

ہونٹ:

چہرہ کے حصہ میں دونوں ہونٹ بھی داخل ہیں، وضومیں دونوں ہونٹوں کے اس حصہ کودھونا فرض ہے جوبندکرنے کے بعدبھی کھلے رہتے ہیں۔لیکن ہونٹ کے اندرونی حصہ اوردانت ومنھ کے اندرکادھونا فرض نہیں ہے البتہ سنت ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۸/۱، ۸۹، ردالمحتار:۱۰۰/۱)

مونچھ:

مونچھ اگرمنڈے ہوئے ہوں تواس کی جلدکاوضومیں دھونا فرض ہے اورمنڈے ہوئے نہ ہوں توان کی جڑوں تک پانی پہونچانا چاہیے۔

اگرمونچھ گھنے اور بڑے ہوں اوران کی تہہ تک پانی پہونچانا دشوارہوتو مونچھ کے بالوں پرپانی بہانا کافی ہوگا۔

اگرمونچھ گھنے اوراتنے بڑے ہوں کہ ہونٹ کوبھی چھپالیتے ہوں توپانی سے تر انگلیوں سے مونچھ کے بالوں کاخلال کرنا واجب ہے تاکہ ہونٹوں تک تری پہونچ جائے۔(ردالمحتار:۱۰۱/۱)

ٹھڈی:

ٹھڈی کادھونا فرض ہے، ٹھڈی پراگربال نہ اگے ہوں یابالوں کومونڈدیاہوتو پوری ٹھڈی کاوضومیں دھونا فرض ہے۔

اوراگربال اگے ہوں اورگھنے نہ ہوں توپھربالوں کی جلدتک پانی پہونچانا ضروری ہے اوراگربال گھنے ہوں توصرف ان بالوں کادھونا فرض ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۸۸/۱، ۸۹)(طہارت کے احکام ومسائل:۱۰۱، ۱۰۳۔)انیس

اور ایک کان سے دوسرے کان تک مذکور ہے، اب اگر کسی شخص کے سر کے نصف سے بال شروع ہوئے ہوں تو اس بارے میں اس کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب ________________

فقہاء کرام کی عبارات میں جو یہ مذکور ہے کہ چہرے کی حد سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ عام طور پر جہاں سے سر کے بال اگنے شروع ہوتے ہیں یعنی عرف میں بال اگنے کی جو حد ہو اس کا اعتبار ہے، اس لئے جو آدمی بالکل گنجا ہو یا اس کے بال سر کے نصف سے شروع ہوتے ہوں تو اسے عرف کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

قال العلامۃحسن بن عمارالشرنبلالیؒ:"(وحدہ) أی جملۃ الوجہ (طولاً من مبدأ سطح الجبھۃ)سواء کان بہ شعر أم لا"قال السید أحمد الطحطاویؒ:"(قولہ سواء کان بہ شعرأم لا)أشار بہ إلیٰ أن الأغم والأصلع والأقرع والأنزع فرض غسل الوجہ منھم ماذکر"(طحطاوی ومراقی الفلاح،أحکام الوضوء: ص ۴۵)(۱) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ۲۰۴و۲۰۵)

کان اور رخسار کے درمیانی حصہ کا حکم:

سوال: جو حصہ کان اور رخسار کے درمیان ہے اس کا وضو میں دھونا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب ________________ حامداً و مصلیاً

فرض ہے۔ شامی: ۱/۶۶۔(۲) (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۳،۴۴)

---

(۱) قال العلامۃ الحصکفیؒ:"(من مبدأ سطح جبھتہ) أی المتوضیٔ بقرینۃالمقام(إلیٰ أسفل ذقنہ) أی منبت أسنانہ السفلیٰ(طولاً)کان علیہ شعرأولا، عدل من قولھم من قصاص شعرہ الجاری علی الغالب إلیٰ المطرد لیعم الأغم والأصلع والأنزع".(الدر المختارعلیٰ صدرردالمحتار،کتاب الطہارۃ: ج ۱ ص ۹۶،۹۷)ومثلہ فی الھندیۃ، کتاب الطھارۃ(ج ۱ ص ۴)

(۲) قال العلامۃ الحصکفیؒ :"(فیجب غسل المیاقی.......... ومابین العذاروالأذن) لدخولہ فی الحد، وبہ یفتی".(الدرالمختار)،وقال ابن عابدین: ؒ(قولہ: مابین العذاروالأذن):أی مابینھما من البیاض و(قولہ:وبہ یفتی):وھوظاھرالمذھب، وھوالصحیح، وعلیہ أکثرالمشائخ".(ردالمحتار:۱/۹۷،أرکان الوضوء أربعۃ،سعید، وکذافی التاتارخانیۃ:۱/۸۹،الطھارۃ،إدارۃ القرآن،کراچی،وکذافی الفتاویٰ العالمگیریۃ:۱/۴،الفصل الأول فی فرائض الوضوء،رشیدیہ،وکذا فی مراقی الفلاح: ۱/۵۸،فصل فی أحکام الوضوء،قدیمی۔)

وضو میں دونوں رخسار کا دھونا فرض ہے، اگر ان پر بال اگ آئے ہوں اور گھنے نہ ہوں تو ان بالوں کی جڑ کا دھونا فرض ہے اور گھنے ہوں تو صرف بالوں کا دھونا فرض ہے۔ دونوں رخساروں اور دونوں کانوں کی لو کے درمیان کے حصہ کو بھی پانی سے تر کرنا فرض ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ: ۱/۸۷،۸۸) طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۲۔) انیس

عورت کے ناک، کان میں سوراخ ہوتو وضو میں پانی پہنچانا ضروری ہے یا نہیں:

سوال: اگر کسی عورت کے ناک، کان میں سوراخ ہوتو وضو میں پانی پہنچانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ

جو عورت ایسی چیزیں پہنے جس کی وجہ سے اس کے کان اور ناک وغیرہ میں سوراخ ہو تو اس کو خوب ہلا لے تا کہ پانی اس کے سوراخ میں پہنچ جائے، وضو اور غسل کے وقت ایسا نہ ہو کہ پانی نہ پہنچے اور غسل اور وضو صحیح نہ ہو، البتہ اگر انگوٹھی، چھلے ڈھیلے ہوں کہ بغیر ہلائے بھی پانی پہنچ جائے تو ہلانا واجب نہیں ہے لیکن ہلا لینا اب بھی بہتر ہے۔ (بہشتی زیور ص:۷۷)

نیز ملاحظہ ہو:

"امرأةاغتسلت هل تتكلف فى ايصال الماء الى ثقب القرط ام لا(القرط)مايعلق فى شحمةالاذن(قال)محمدفى الاصل وهذاداب صاحب المحيط بذكرلفظ قال ومراده ذلک تتكلف فيه فى ايصال الماء الى ثقب القرط كماتتكلف فى تحريک الخاتم ان كان ضيقا،المعتبرفيه غلبةالظن بالوصول،ان غلب على ظنهاان الماء لايدخله الابتكلف تتكلف وان غلب انه وصله لاتتكلف،سواء كان القرط فيه ام لاوان انتضم الثقب بعدالقرط وصاربحال ان امرعليه الماء يدخله وان غفل لافلابدمن امراره ولاتتكلف لغيرالامرارمن ادخال عودونحوه فان الحرج مدفوع وانماوضع المسئلةفى المرأةباعتبارالغالب والافلافرق بينهاوبين الرجل". (شرح منیۃ المصلی ص:۴۸)

اسی عبارت سے معلوم ہو گیا کہ جب کان کی لو میں سوراخ ہو اور زیور ہو تو اس میں پانی پہنچانا ضروری ہے اور اگر غالب ظن ہو کہ وہ بند ہو چکا ہو تو اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ناک کے سوراخ میں غسل اور وضو میں پانی پہنچانا ضروری ہے اور کان میں فقط بہا دینا کافی، اس سے مستحب ادا ہو جائے گا، اگر ناک کا سوراخ بھی بند ہو چکا ہو تو اس کو زبردستی کھولنے کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم (فتاویٰ دار العلوم زکریا جلد اول: ۵۲۰، ۵۲۱)

پیشانی کے اوپر کے حصہ میں بال نہ ہوں تو وضو میں چہرہ کہاں تک دھونا چاہیے:

سوال: ایک شخص کے سر کے اگلے حصہ میں بالکل بال نہیں ہیں، تقریباً نصف سر کے بعد بال ہیں وضو میں اسے چہرہ کہاں تک دھونا چاہیے، عرف میں جسے پیشانی کہتے ہیں وہاں تک دھونا کافی ہے یا جہاں سے بال اگنا شروع ہوں وہاں تک دھونا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ـــــــــــــــــــ

عام طور پر جہاں سے سر کے بال اگتے ہیں اور جسے عرف میں پیشانی کہتے ہیں اتنے حصے کا دھونا فرض ہے اس سے

اوپر تک دھونا فرض نہیں ہے، مراقی الفلاح میں ہے:''(وحده) أى جملة الوجه(طولاًمن مبدأ سطح الجبهة)سواء كان به شعرأم لا''. طحطاوی میں ہے:''(قوله سواء كان به شعرأم لا)أشاربه إلیٰ أن الأغم والأصلع والأقرع والأنزع فرض غسل الوجه منهم ماذكر''.(۱)

''عمدۃ الفقہ'' میں ہے: اگر کسی کے بال آدھے سر تک اگلی طرف سے نہ اگیں تو عرف میں جہاں تک پیشانی کہلاتی ہو اس سے اوپر تک دھونا فرض نہیں بلکہ پیشانی کے بالوں کے اگنے کی معروف جگہ تک دھونا فرض ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے الخ۔(عمدۃ الفقہ :۱/۹۳) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ:۸/۹۰/۹۱)

وضو میں ٹھوڑی تک دھونے میں عورت مرد، بالغ نابالغ سب کا حکم:

سوال: نابالغ یا عورت وضو کرتے ہوئے ٹھوڑی کے نیچے، جس جگہ تک ڈاڑھی کے بال جمے ہوئے ہوتے ہیں وہاں تک یا فقط ٹھوڑی ہی دھوئے، گلے کو جہاں تک بال ہوتے ہیں، نہ دھوئے یعنی گلے کی ہڈی جو ابھری ہوئی ہوتی ہے وہاں تک دھوئے یا کہاں تک؟

الجواب

اس میں بالغ ونابالغ مرد وعورت سب کا ایک حکم ہے، تفاوت نہیں۔(۲) واللہ اعلم۔ بدست خاص، ص:۵۲ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۱۳۹)

گھنی داڑھی کے دھونے کا حکم:

سوال: گھنی داڑھی کی جڑوں کا اور بالوں کا دھونا فرض ہے، یا واجب ہے یا سنت ہے کیا ہے؟ گھنی داڑھی کے بالوں کی جڑوں کا کس قدر خشک رکھنا معاف ہے، گھنی داڑھی کے چندبال خشک رہ گئے تو یہ وضو درست ہوا یا نہیں، بالوں کا کس قدر خشک رہنا معاف ہے، ڈاڑھی کے بھگونے کے لئے چلو میں پانی لے لے کر ڈاڑھی خوب

(۱) مراقی الفلاح وحاشیۃ الطحطاوی:۳۲، الدر المختار مع رد المحتار:۱/۸۹/۹۰)

حدیث میں ہے: عن ابن عباس قال: دخل على علی ؓ يعنى ابن أبى طالب و قد أهرق الماء .....ثم أخذ بكفه اليمنیٰ قبضة من ماء فصبها على ناصيته فتركها تستن على وجهه۔(ابو داؤد شریف : باب صفة وضوء النبى ﷺ ص۲۷، نمبر ۱۱۷) اس حدیث میں ہے کہ پیشانی کے شروع سے، تھوڑی کے نیچے تک پانی بہایا، جس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں سے سر کے بال اگتے ہیں وہاں سے پیشانی شمار کیا جائے گا۔ انیس

(۲) (وحده) أى جملة الوجه(طولاًمن مبدأسطح الجبهة)سواء كان به شعرأم لا''. طحطاوی میں ہے:''(قوله سواء كان به شعرأم لا)أشاربه إلى أن الأغم والأصلع والأقرع والأنزع فرض غسل الوجه منهم ماذكر''.(مراقی الفلاح وحاشیۃ الطحطاوی:۳۲، الدر المختار مع رد المحتار:۱/۸۹/۹۰، انیس الرحمٰن)

اچھی طرح بھگوے یا کہ صرف جس پانی سے منہ دھویا جاوے وہی پانی کافی ہے؟

الجواب

قال فی نور الإیضاح: وفی حقه (أی من له لحیة کثیفة)إلیٰ مالاقی البشرة من الوجه آه قال الطحطاوی: أی الذی لاتری منه فلایجب علیه إیصال الماء إلی المنابت السفلیٰ آه ص: ۳۴، وفی نورالإیضاح أیضاً:(یجب)یعنی یفترض(غسل ظاهراللحیة الکثیفة) وهی التی لا تری بشرتها(فی أصح ما یفتی به) من التصاحیح فی حکمها لقیامها مقام البشرة لتحول الفرض إلیها(إلیٰ أن قال) (ولایجب إیصال الماء إلی المسترسل من الشعرعن دائرة)لأنه لیس منه إصالةولابدلاً عنه قال الطحطاوی:وإنمازاد المصنف لفظ ظاهرإشارةً إلیٰ أنه لایفترض غسل ماتحت الطبقة العلیامن منابت الشعر،آه ص: ۳۷.

گھنی داڑھی کا حکم یہ ہے جو جڑیں رخساروں سے متصل ہیں ان کا دھونا نیز جو بال چہرہ کے دائرہ کو محیط ہیں، ان کا اوپر سے دھونا فرض ہے، اور جو جڑیں رخساروں سے متصل نہیں، اسی طرح وہ بال جو دائرہ چہرہ کو محیط نہیں بلکہ نیچے کو دراز ہوگئے ہیں، نیز وہ جڑیں اور بال جو ٹھوڑی کے نیچے ہیں ان کا تر کرنا اور دھونا فرض نہیں ہے، ہاں سنت یہ ہے کہ ایک دو چلو میں پانی لے کر ٹھوڑی کے نیچے کے بالوں کو جڑوں سمیت تر کرلیا جاوے۔

اس جواب سے اس کے متعلق تمام سوالات کا جواب ہوگیا، خلاصہ یہ ہے کہ گھنی داڑھی کی جو جڑیں رخسار سے ملی ہوئی ہیں سب سے اوپر ان کا تر کرنا فرض ہے، اور جو بال رخساروں کے اوپر ہیں اور جو ٹھوڑی کے اوپر ہیں (جن سے دائرہ وجہ کا احاطہ ہو رہا ہے) ان کا دھونا فرض ہے اس کے ماسوا باقی جڑوں اور بالوں کا دھونا یا تر کرنا فرض نہیں، صرف سنت ہے، اگر یہ باقی جڑیں اور بال خشک رہیں تو معاف ہے اور جتنی مقدار جڑوں یا بالوں کا دھونا فرض ہے ان کے لئے الگ چلو میں پانی کا لینا ضروری نہیں، وہی پانی کافی ہے جو چہرہ کے اوپر بہہ کر آرہا ہے۔(امدادالاحکام جلد اول ص:۳۴۴ تا ۳۴۵)

چوتھائی داڑھی کا مسح:

سوال: فقہاء حنفیہ کے نزدیک چوتھائی داڑھی کا مسح کرنا فرض ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھڈی کے نیچے بھی تر فرمایا تو اگر چوتھائی داڑھی کا مسح کرنا فرض ہے تو ٹھڈی کے نیچے تر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

الجواب

چوتھائی داڑھی کا مسح کرنا فرض ہے اور ٹھڈی کے نیچے تر کرنا سنت ہے۔ بہتر ہے کہ فرض پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ سنت کے موافق عمل کیا جائے یعنی ٹھڈی کے نیچے تر کیا جائے۔ ٹھڈی کے نیچے منہ کی حد میں وضو نہیں اس واسطے کہ اس کا دھونا فرض نہیں، ایسا ہی جس کی داڑھی گھنی ہو تو اس کے لیے سنت ہے کہ داڑھی کے بال سے جس قدر منہ چھپا ہو وہ بھی دھوئے ان دونوں امر میں کچھ تعارض نہیں کہ چوتھائی داڑھی کا مسح کرنا فرض ہے اور ٹھڈی کے نیچے دھونا سنت ہے یعنی اگر چوتھائی داڑھی کا مسح کر لے تو فرض ادا ہو جائے گا اور وضو درست ہو جائے گا مگر سنت ادا نہ ہو گی تو چاہیے کہ صرف مسح پر (اکتفا۔انیس) نہ کیا جائے گا بلکہ ٹھڈی کے نیچے دھویا جائے۔(۱) (فتاویٰ عزیزی اردو، مطبع سعید کمپنی لاہور: ۴۹۴)

داڑھی کے بال اور کھال دھونے کا حکم:

سوال: زید کی داڑھی گھنی ہے اور وضو میں چہرے کا دھونا فرض ہے۔ چہرے پر جو بال ہیں اور جو بال لٹک رہے ہیں اور بال کے نیچے جو چمڑے ہیں ان تینوں کے بارے میں یعنی چہرے سے جو بال ملحق ہیں اور اس کے نیچے جو چمڑے ہیں اس طرح جو بال لٹک رہے ہیں، کیا ان کا دھونا فرض ہے؟

الجواب و باللہ التوفیق

صورت مسئولہ میں جب کہ زید کی داڑھی گھنی ہے تو داڑھی کے بال کے نیچے جو کھال ہے اس کا دھونا یا اس تک پانی پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ البتہ چہرے پر داڑھی کے جو بال ہیں ان کا دھونا فرض ہے۔(۲) لیکن جو بال چہرے سے نیچے لٹکے ہوئے ہیں ان کا دھونا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ دیکھئے: شامی: ۶۸/۱، امداد الفتاوی: ۳/۱۔(۳) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد جنید عالم ندوی قاسمی، ۲۸/۵/۱۴۱۱ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ: ۱۰۰/۲)

(۱) داڑھی چوں کہ رخسار اور ٹھڈی پر ہوتی ہے اس لیے اس حصہ کی داڑھی کا دھونا فرض ہے، البتہ داڑھی کے جو بال لٹکے ہوئے ہوں ان کا دھونا فرض نہیں ہے، بلکہ سنت ہے۔ داڑھی اگر گنجان نہ ہو بلکہ ہلکی ہو تو نیچے کی جلد تک پانی پہونچانا فرض ہے اور اگر گنجان ہو تو جلد کی سطح تک پانی پہونچانا فرض نہیں ہے، البتہ گھنی داڑھی کا خلال تر انگلیوں سے کرنا سنت ہے۔ داڑھی چوں کہ چہرہ میں داخل ہے اس لیے اسے اسی پانی سے دھویا جائے گا جو چہرہ کے لیے لیا جائے، مثلاً پہلی دفعہ دونوں چلّو میں پانی لیں گے اور پورا چہرہ داڑھی سمیت دھوئیں گے، اسی طرح دوسری اور تیسری دفعہ دھوئیں گے۔ البتہ داڑھی کے خلال کے لیے الگ سے پانی لیں گے۔ وضو کرنے کے بعد داڑھی کاٹ دی یا مونڈ دی رو دوبارہ ٹھڈی کو دھونا ضروری نہیں ہے۔(ردالمحتار: ج ۱ ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۷) طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۳، ۱۰۴۔انیس)

(۲) حدیث میں ہے: عن ابن عباسؓ قال: دخل علی علیؓ یعنی ابن أبی طالب و قد أهرق الماء .....ثم أخذ بكفه اليمنى قبضةً من ماء فصبها على ناصيته فتركها تستن على وجهه. (أبو داؤد شريف : باب صفة وضوء النبی ﷺ، ص ۲۷، نمبر ۱۱۷) اس حدیث میں ہے کہ پیشانی کے شروع سے، تھوڑی کے نیچے تک پانی بہایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی کے اوپر پانی بہا دینا کافی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے: عن عبد الرحمن بن أبی ليلیٰ قال: إن استطعت أن تبلغ بالماء أصول اللحية فافعل. (مصنف ابن أبی شيبة ، فی غسل اللحية فی الوضوء، ج اول ص ۲۲، نمبر ۱۲۷) انیس

(۳) ثم لاخلاف أن المسترسل لايجب غسله ولامسحه بل يسن، وأن الخفيفة التی ترى بشرتهايجب غسل ماتحتها، كذافی النهر (ردالمحتار علی ہامش الدر المختار: ۲۱۵/۱۔۲۱۶) وأماالنابت على الخدين فيجب غسل مادخل منه فی دائرة الوجه دون الزائد عليها، ولذا قال فی البدائع: الصحيح أنه يجب غسل الشعر الذی يلاقی الخدين وظاهر الذقن لامااسترسل من اللحية عندنا. (ردالمحتار: ۲۱۵/۱) مرتب فتاویٰ امارت شرعیہ۔ ==

وضو میں داڑھی کا دھونا اور خلال کرنا:

سوال: ”حدالوجه فی الوضو ء“ کی تحدید میں جوفقہانے ”من قصاص الشعرإلیٰ أسفل الذقن“ لکھا ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ غایت داخل مغیا ہے یانہیں یعنی اسفل ذقن کا دھونا ضروری ہے یانہیں اور داڑھی ہونے کی صورت میں کیا حکم ہے، نیز یہ فرمائیں کہ تخلیل لحیہ کے بارے میں مفتی بہ قول کیا ہے؟

اگرأسفل ذقن داخل فی الغسل نہیں ہے تو تخلیل لحیہ کیوں مشروع ہے جب کہ فقہا نے لکھا ہے کہ سنت ”إکمال الفرض“ کو کہتے ہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

”(وهو)مشتق من المواجهة ....(من مبدأ سطح جبهته)...... (إلیٰ أسفل ذقنه) أی منبت أسنانه السفلی، تفسير للذقن بالتحريک:أی إلى أسفل العظم الذی عليه الأسنان السفلیٰ:وهو ماتحت العنفقة اھ“درمختار،شامی: ۱/۸۹.(۱)

اسفل ذقن کووضو میں دھویا جائے گا اسی وجہ سے جب اس پرلحیہ ہواور وہ خفیفہ ہو اس کا غسل ساقط نہیں ہوتا البتہ اگرلحیہ کثیر ہوتو حصۂ ذقن مستور کا غسل ساقط ہو جاتا ہے۔

”(وغسل جميع اللحية فرض) يعنی عملياً (أيضاً) على المذهب الصحيح المفتی به المرجوع إليه ،وماعدا هذه الرواية مرجوع عنه كمافی البدائع.ثم لاخلاف أن المسترسل لايجب غسله ولامسحه بل يسن، وأن الخفيفة التی ترى بشرتها يجب غسل ماتحتهاآه،درمختار،قوله (بل يسن) أی المسح ،آه شامی.(۲)

”(وتخليل اللحية)هوتفريق شعرهامن أسفل إلیٰ فوق (بحر)وهوسنةعندأبی يوسف، وأبوحنيفةومحمديفضلانه، ورجح فی المبسوط قول أبی يوسف،كمافی البرهان،(شرنبلالية)

== اس کا طریقہ اس طرح ہوگا جس طرح حدیث میں ہے:عن أنس بن مالک أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا توضأأخذكفاًمن ماء فأدخله تحت حنكه فخلل به لحيته،وقال هكذا أمرنی ربی عز و جل.(أبوداؤد شريف:باب تخليل اللحية،ص۳۱،نمبر۱۴۵/ترمذی شريف:باب تخليل اللحية،ص ۱۴ ،نمبر ۳۱ / ابن ماجه شريف : باب ما جاء فی تخليل اللحية،ص۶۳،نمبر۴۲۹)

إن ابن عمر كان إذاتوضأ يعرک عارضيه و يشبک لحيته بأصابعه أحياناً و يترک أحياناً.(سنن بيهقی:باب عرک العارضين ،ج اول،ص۹۲،نمبر۲۵۱)انیس

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار ۱/ ۹۶ ـ ۹۷،أركان الوضوأربعة.سعيد

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار:۱/۱۰۰،۱۰۱،سعید

وفی شرح المنیة: والأدلة ترجحه، وهو الصحیح آه، قال فی الحلیة: والظاهر أن هذا کله فی الکثة، وأما الخفیفة: فیجب إیصال الماء إلیٰ ما تحتها، شامی. (۱) قال ابن العلاء: "وفی السراجیة: حد الوجه من قصاص الشعر إلیٰ أسفل الذقن طولاً، ومن شحمة الأذن آه، وفی شرح الطحاوی: وإن لم یکن له لحیة فغسل الذقن فرض، وإیصال الماء إلیٰ داخل العینین ساقط الخ، (۲) فی الهدایة: وتخلیل اللحیة سنة، وفی فتاویٰ الحجة: وهو الأصح، وقیل: هو سنة عند أبی یوسف، جائز عند أبی حنیفة ومحمد رحمهم الله، (۳) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ، معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم، ۱۰ محرم الحرام ۶۸ھ، الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ، سہارنپور، ۱۴ محرم الحرام ۶۸ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۲-۴۳)

ہلکی اور گنجان داڑھی دھونے کا حکم:

سوال: وضو میں ڈاڑھی کے واسطے علیحدہ تین دفعہ پانی لینا کب ضروری ہے اور کب نہیں، کیا گنجان ڈاڑھی اور ہلکی کا ایک ہی حکم ہے؟

الجواب

درمختار کا یہ مضمون ہے کہ جمیع لحیہ کا غسل فرض ہے، لیکن لٹکی ہوئی کا دھونا اور مسح کرنا فرض نہیں بلکہ سنت ہے اور لحیہ خفیفہ جس میں جلد نظر آوے اس کے ماتحت کا دھونا ضروری ہے۔ (۴) اور جس کا دھونا فرض ہے اس میں تثلیث سنت ہے۔ (۵)

(ڈاڑھی چوں کہ چہرہ میں داخل ہے، اس لیے اسے اسی پانی سے دھویا جائے گا، جو چہرہ کے لیے لیا جائے گا۔ مثلاً پہلی دفعہ دونوں چلو میں پانی لیں گے اور پورا چہرہ مع ڈاڑھی دھوئیں گے، پھر دوبارہ دونوں چلو میں پانی لیں گے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۱۱۷ سعید

(۲) التاتارخانیة، کتاب الطهارة: ۱/۸۷، إدارة القرآن، کراچی

(۳) التاتارخانیة: ۱/۱۰۹، کتاب الطهارة الوضوء، إدارة القرآن، کراچی

(۴) (وغسل جمیع اللحیة فرض) یعنی عملیاً (أیضا) الخ، ثم لا خلاف أن المسترسل لا یجب غسله ولا مسحه بل یسن، وأن الخفیفة التی تری بشرتها یجب غسل ما تحتها، الخ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار، فرائض الوضوء: ۱/۹۳، ظفیر

(۵) وتکرار الغسل إلی الثلاث سنة أیضاً لمواظبته علیه الصلوٰة والسلام علیه الخ (غنیة المستملی، سنن الوضوء: ۲۵، ظفیر۔ غنیة المستملی یہ کبیری اور شرح منیہ کے نام سے مشہور ہے، یہ شیخ ابراہیم حلبیؒ کی تصنیف ہے یہ بھی مختلف مطابع میں چھپی ہے، زیر نظر فتاویٰ میں صفحات کا حوالہ فخر المطابع لکھنؤ کے مطبوعہ نسخہ کا ہے۔ ظفیر

اور پورا چہرہ ڈاڑھی سمیت دھوئیں گے، اسی طرح تیسری مرتبہ، ڈاڑھی کے لیے الگ پانی اس وقت لیں گے جب خلال کریں گے، اور وہ بھی ایک مرتبہ۔ ظفیر (۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱۲۶/۱)

گھنی ڈاڑھی کے بال وضو میں دھونا فرض ہے:

سوال: وضو میں گھنی ڈاڑھی کے بالوں کا دھونا فرض ہے، یا مستحب اور جڑوں میں پانی پہنچانا ضروری ہے یا فقط بالوں کا مسح کرلیا جائے؟

الجواب

درمختار میں ہے: **(وغسل جميع اللحية فرض) يعنى عملياً (أيضاً) على المذهب المفتى به المرجوع إليه وماعداهذه الروايةمرجوع عنه كمافى البدائع(درمختار)(قوله وماعداهذه الرواية):أى من روايةمسح الكل أوالربع أوالثلث أومايلاقى البشرة أوغسل الربع أوالثلث الخ شامى.** (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱۲۶/۱)

داڑھی کے مسح کرنے اور دھونے کا حکم:

سوال: شرح وقایہ میں ہے: ''**أما اللحية فعند أبى حنيفةؒ مسح ربعها فرض**'' اس کا کیا مطلب ہے۔ آیا داڑھی کا مسح بھی فرض ہے یا کہ فقط سر کا مسح فرض ہے داڑھی کا مسح سنت؟

الجواب

اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر داڑھی ایسی ہو جس کے اندر جلد...... وجہ کی نظر آتی ہو وہاں تو اس جلد کا بھی دھونا فرض ہے اور اگر جلد مستور ہو............ تو جس قدر حد وجہ اور دائرۂ............ وجہ سے نیچے لٹکی ہو اس کا مسح سنت ہے اور جو دائرہ

(۱) **(وتخليل اللحية) لغيرالمحرم بعدالتثليث (درمختار)أى تثليث غسل الوجه،إمداد،الخ،........... روى أبوداؤدعن أنس رضى اللّٰه تعالى عنه"كان صلى اللّٰه عليه وسلم إذاتوضأ أخذ كفاً من ماء تحت حنكه فخلل به لحيته وقال بهذا أمرنى ربى"(ردالمحتار،كتاب الطهارة،سنن الوضوء:۲۰۹/۱**، ظفیر

(۲) **ردالمحتار،كتاب الطهارة،بحث الوضوء:۹۳/۱**۔ ظفیر

اس سے معلوم ہوا کہ کل داڑھی کا دھونا فرض ہے مسح کرنا کافی نہیں اور گھنی ڈاڑھی ہو تو نیچے جلد تک پانی کا پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ البتہ ہلکی ہو تو ضروری ہے، درمختار میں ہے: **ثم لا خلاف أن المسترسل لايجب غسله ومسحه بل يسن ،وأن ا لخفيفة التى ترى بشرتها يجب غسل ماتحتها كذا فى النهر، وفى البرهان: يجب غسل بشرة لم يسترها ا لشعر كحاجب وشارب الخ (الدرالمختارعلىٰ هامش ردالمحتار،فرائض الوضوء:۹۳/۱**۔ ظفیر) قاضی خاں میں ہے: **ولا يجب إيصال الماء إلىٰ منابت الشعر إلا أن يكون الشعر قليلاً يبدوا لمنابت الخ.** ظفیر

وحدوجہ کے اندر ہو کہ اگر اس بال کو پکڑ کر کھینچا (یعنی نیچے کیطرف کھینچا جاوے۔ **فسر ہ ابن حجرفی شرح المنهاج: بمالو مُدّمن جهة نزوله لخرج عن دائرة الوجه آه** (شامی: ۹۳/۱) جاوے تو وجہ سے باہر نہ رہے تو اس میں کئی روایتیں ہیں، ایک روایت وہ بھی ہے جو شرح وقایہ میں ہے لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ سب کا دھونا فرض ہے۔ **هکذا فی الدر المختار و رد المحتار**، فقط، ۱۷؍محرم ۱۳۲۴ھ، امداد: ج ۱ ص ۹۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۳۰/۱)

وضو میں گھنی داڑھی دھونے اور مسح کرنے کا حکم:

سوال: وضو میں بصورت گھنے ہونے بال داڑھی کے جلد میں جہاں سے بال جمتے ہیں پانی پہنچانا چاہئے یا صرف بالوں پر مسح کر لینا چاہئے اور مسح بالوں کے لئے نیا پانی لینا چاہئے یا کہ جو پانی منہ دھونے کے واسطے لیا ہے اسی پانی سے منہ پر ڈالنے کے بعد مسح کر لینا چاہئے۔

الجواب

جو کھال بالوں میں سے نظر آتی ہو اس کا دھونا تو فرض ہے اور جو نظر نہ آتی ہو مثلاً داڑھی گھنی ہو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جو داڑھی چہرہ کی حد کے اندر ہے اس کا دھونا فرض ہے اور جو لٹکی ہے اس کا دھونا فرض نہیں بلکہ اولیٰ ہے۔ **فی الدرالمختار: (وغسل جميع اللحية فرض) يعنى عملياً (أيضاً) على المذهب الصحيح المفتى به المرجوع إليه وما عدا هذه الروايةمرجوع عنه كمافى البدائع، ثم لاخلاف أن المسترسل لايجب غسله ولامسحه بل يسن، وأن الخفيفة التى ترىٰ بشرتهايجب غسل ماتحتهاكذافى النهر**.(۱) ۱۷؍ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ، تتمہ خامسہ صفحہ ۸۳۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۳۱/۱)

داڑھی کے خلال کے بارے میں متعدد اہم مسائل:

سوال (۱): وضو میں داڑھی کا خلال تین بار سنت ہے یا ایک بار؟

(۲) صرف ٹھوڑی کے نیچے خلال کرنا ہے یا دائیں بائیں بھی؟

(۳) دائیں بائیں ہو تو کس طرح کرے؟ ہتھیلی کی جانب کس طرح رہے؟

(۴) تیمّم میں خلال کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ کس طرح اور کتنی بار سنت ہے؟

(۵) گھنی داڑھی میں صرف اوپر ہی کے حد چہرہ کے اندر والے بالوں پر پانی بہانا فرض ہے یا اندرونی بالوں کو جو کہ جڑ سے اوپر ہوں دھونا فرض ہے؟ حافظ رحمت علی خان: مدرسہ عربیہ، رائیونڈ: لاہور۔

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، فرائض الوضوء: ۱۰۰/۱، ۱۰۱، بیروت۔ انیس الرحمٰن قاسمی

الجواب

(۱) ایک بار۔ **وهو ظاهر لسكوتهم عن بيان التكرار في موضعه.**

(۲) **وتخليل اللحية هو تفريق شعرها من أسفل إلىٰ فوق بحر (شامية: ج ۱ ص ۸۲)**

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری داڑھی کا مع جانبین کے خلال ہونا چاہئے کیونکہ داڑھی میں جانبین کے بال بھی داخل ہیں ورنہ داڑھی کے کچھ حصہ کا خلال لازم آئے گا۔صاحب بحر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

وظاهر كلامهم أن المراد باللحية الشعر النابت على الخدين من عذار وعارض والذقن (بحر: ج ۱ ص ۱۶) ويجوز أن يكون حديث أنس رضى الله تعالىٰ عنه مشعراً إلىٰ خلاف ذلك ولفظه ''كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا توضأ أخذ كفاً من ماء تحت حنكه فخلل به لحيته (الحديث) شامية: ج ۱ ص ۱۰۹)

(۳) پانی کا چلو لے کر داڑھی کے بالوں میں پہنچائے اس وقت ہتھیلی گردن کی جانب ہوگی پھر بوقت خلال ہتھیلی کی پشت گردن کی جانب کر کے خلال کرے۔ **كما في الطحطاوي شرح المراقي: ص ۳۹)**

(۴) تیمّم میں خلال کرنا نظر سے نہیں گزرا بس صرف بالوں کے اوپر ہاتھ پھیرے۔

وفي الحلية: يمسح من وجهه ظاهر البشرة وظاهر الشعر على الصحيح اهـ. (عالمگیری: ج ۱ ص ۱۴)

(۵) گھنی داڑھی میں چہرے کے اندر والے بالوں پر پانی سے فرض ادا ہو جائے گا گو جڑوں کے قریب تک پانی نہ پہنچے کیونکہ ''**داخل شعر اللحية**'' محل فرض نہیں۔

قال في المراقي: وأبو حنيفة ومحمد يفضلانه لعدم المواظبة ولأنه لإكمال الفرض وداخلها ليس محلاً له ومثله في الهداية. (مراقي: ص ۳۹) فقط والله اعلم، بندہ عبد الستار عفا اللہ عنہ، ۱۱/۵/۱۳۸۲ھ، الجواب صحیح، محمد عبد اللہ عفا اللہ عنہ۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۶۷-۷۷)

داڑھی کے غسل وخلال کے بارے میں قولِ فیصل:

سوال: خلال یا غسلِ لحیہ کا حکم شرعی کیا ہے۔ پہلے تو یہ سنا یا پڑھا تھا کہ داڑھی گھنی ہو تو صرف خلال مسنون ہے ورنہ جہاں سے چہرہ کی کھال نظر آئے اس کا دھونا فرض ہے۔ دریافت کرنے پر ایک سابق مفتی دیوبند نے اس کا طریقہ اس طرح دکھا کر سمجھایا تھا کہ چہرہ دھوتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نیچے کی جانب سے داڑھی میں داخل کر کے خلال کیا جائے۔

پھر ایک عالم مدرس نے بتایا کہ ایک چلو میں پانی لے کر نیچے سے داخل کیا جائے اور بعض لوگوں نے غسل لحیہ کو ضروری کہا۔

پھر ایک بڑے عالم نے کہا کہ امام اعظمؒ کے اس بارے میں آٹھ قول منقول ہیں اور کنز میں گھنی داڑھی کا خلال اور غیر گھنی کا غسل جو لکھا ہے یہ تسامح ہے بلکہ بہرصورت غسلِ لحیہ ہی ضروری ہے۔ بحرالرائق میں یہی کہا گیا ہے۔ ان مختلف جوابات سے تردد واقع ہوگیا۔ مہربانی فرما کر تشفی بخش جواب دیں؟

الجواب

۱۔ لحیہ کثہ کا دھونا فرض ہے لیکن یہ سارے بالوں کے بارے میں نہیں۔ بلکہ یہ صرف شعر غیر مسترسل کے متعلق ہے۔ صاحب بحر مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

وهذاكله فى غيرالمسترسل وأماالمسترسل فلا يجب غسله ولامسحه لكن ذكرفى منيةالمصلى أنه سنة. (بحر الرائق: ج ا ص ١٦)

۲۔ جو داڑھی کچھ گھنی اور کچھ خفیفہ ہو اس کا حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ کثہ کے نیچے کا دھونا فرض نہیں اور خفیفہ والے حصے کے نیچے کا دھونا فرض ہے کیونکہ سقوط غسل کی علت ''جزم الاستتار بالشعر'' ہے۔

كمافى الدرالمختاروالشامية: وفى البرهان: يجب غسل بشرةلم يسترهاالشعراهـ وفى الشاميةتحته: أما المستورة فساقط غسلها للحرج (ج ا ص ۹۴)

الحاصل لحیہ کثہ کے بارے میں صحیح اور مفتی بہ یہی قول ہے کہ اس کے ظاہر کا دھونا فرض ہے اور باطن و داخل کا خلال سنت ہے۔ **كما فى المعتبرات**۔ فقط واللہ اعلم، بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیرالمدارس، ملتان۔ ۱۳۸۲/۱۰/۱۸ھ، الجواب صحیح۔ بندہ محمد عبداللہ غفرلہ، رئیس الافتاء۔ (خیرالفتاویٰ: ۲/۵۶-۵۷)

وضو میں داڑھی دھونے کا حکم:

سوال　جو سنت کے موافق داڑھی رکھتے ہیں، ان کی داڑھی تھوڑی سی نیچے لٹکتی رہتی ہے، ایسے شخص کے لئے وضو میں داڑھی کو دھونے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

داڑھی کا جو حصہ ٹھوڑی کے مقابل میں ہے، اس کا دھونا فرض ہے، البتہ جو حصہ ٹھوڑی سے نیچے لٹکا ہوا ہے، اس کو دھونا یا اس پر مسح کرنا واجب نہیں، کیونکہ وہ چہرہ (وجہ) میں شامل نہیں: **''وأظهرالروايات عنه غسل ما يلاقى البشرةواختاره فى المحيط والبدائع قال فى معراج الدراية: وهوالأصح، وفى الفتاوىٰ الظهيرية:**

وبه يفتىٰ ...وأما ما استرسل منها فلايجب غسله ولامسحه لكونه ليس من الوجه"(۱) البتہ بعض فقہانے اسے مسنون قرار دیا ہے۔(۲)۔(کتاب الفتاویٰ:۲/۴۱)

خضاب والی داڑھی پر وضو کا حکم:

سوال:۔ بالوں پر خضاب لگانے سے حقیقت میں بالوں کی اپنی حقیقت غائب ہوکر ان پر باریک سا پردہ آجاتا ہے، کیا اس سے وضو پر اثر پڑتا ہے؟

الجواب

بالوں پر خضاب لگانے سے کوئی تہہ نہیں بنتی اس لئے ایسے رنگ کی موجودگی میں وضو اور غسل پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ رنگریز کے ہاتھوں پر کپڑے کو رنگ دیتے وقت رنگ کا لگ جانا مانع وضو وغسل نہیں۔ البتہ اگر بدن کے کسی ایسے حصہ پر جس کا دھونا ضروری ہو جیسے لکڑی والا رنگ (پینٹ) لگ گیا ہو تو اس سے تہہ بن جانے کی وجہ سے پانی کا پہنچنا ممکن نہیں اس لئے اس کا ہٹانا ضروری ہے اور اس کی موجودگی میں وضو بھی درست نہیں۔

قال الحصكفيؒ: (و) لايمنع (ماعلىٰ ظفر صباغ و) لا (طعام بين أسنانه) أوفى سنه المجوف، به يفتىٰ...... وهو الأصح، (الدرالمختار علىٰ صدرردالمحتار: ج ۱ ص ۱۵۴، أبحاث الغسل)، (۳) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۳و۵۰۴)

خضاب لگایا ہو تو وضو صحیح ہوگا یا نہیں:

سوال: ایک شخص نے اپنے سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگایا ہے کیا یہ خضاب لگانا درست ہے؟ اگر لگایا ہو تو وضو اور غسل جنابت صحیح ہوگا یا نہیں، اگر خضاب لگانا ہو تو کونسا خضاب لگانا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

سیاہ خضاب لگانا سخت گناہ ہے احادیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: '**عن ابن عباس رضى الله عنهما: عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: يكون قوم فى اٰخرالزمان يخضبون بهذاالسواد كحواصل الحمام لايجدون رائحة الجنة**". حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم

(۱) کبیری: ص۱۹۶۔

(۲) البحر الرائق: ۱/۳۴۔

(۳) قال العلامة الشرنبلاليؒ: ولاماعلىٰ ظفر الصباغ من صبغ للضرورة وعليه الفتوىٰ، مراقى الفلاح علىٰ صدرالطحطاوى: ص ۵۰، فصل فى تمام أقسام الوضوء، ومثله فى منية المصلى: ص ۲۳.

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آخر زمانے میں کچھ لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب لگائیں گے جیسے کبوتر کا سینہ، ان لوگوں کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی۔(۱) مزید تفصیل فتاویٰ رحیمیہ، صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱ جلد ۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

لہٰذا خالص سیاہ خضاب نہ لگایا جائے، لگانا سخت گناہ ہے، سرخ یا مہدی کا خضاب لگایا جائے، اگر کسی نے باوجود ناجائز، خالص سیاہ خضاب لگایا ہوا گر وہ پانی کی طرح پتلا ہوا اور خشک ہونے کے بعد بالوں تک پانی پہنچنے کے لیے رکاوٹ نہ بنتا ہو تو اس صورت میں وضو و غسل ہو جائے گا (مگر خضاب لگا رکھا ہے اس کا مستقل گناہ ہوگا) اور اگر وہ گاڑھا ہو بالوں تک پانی پہنچنے کے لئے رکاوٹ بنتا ہو تو پھر وضو و غسل صحیح نہ ہوگا۔(۲) واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ: جلد ۱۴۵/۷۔۱۴۶، جلد: ۹۳/۸)

گھڑی سختی سے باندھی ہوئی ہو تو کیا وضو میں ہلانا ضروری ہے:

سوال اگر گھڑی ہاتھ پر اس قدر سختی سے باندھی جائے کہ اپنی جگہ سے نہ ہلے تو اس صورت میں وضو کرنے سے وضو ہوگا یا نہیں؟

الجواب

گھڑی کے نیچے والے حصہ جسم پر پانی نہ پہنچے تو وضو نہیں ہوگا۔(۳)

ولو كان خاتمه ضيقاً نزعه أو حركه وجوباً اهـ. (درمختار على الشامية: ج ۱ ص ۱۴۳) فقط والله أعلم، محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ، مفتی جامعہ خیر المدارس، ۲۰/۳/۱۴۰۱ھ، الجواب صحیح، بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، مفتی جامعہ ہٰذا۔ (خیر الفتاویٰ: ۷۷/۲)

دوا اگر اس طرح چمٹ جاوے کہ چھڑانا مشکل ہو تو عضو کس طرح دھویا جائے:

سوال: اگر ایک شخص کے بدن پر ایسا زخم لگ گیا جس سے خون بند نہیں ہوتا ہے، اگر چونا لگا دیا گیا اور اس کے

---

(۱) ابوداؤد: ۲۲۶/۲، مشکوٰۃ شریف: ۳۸۳۔

(۲) **عن عائشة رضى الله عنها في المرأة تتوضأ وعليها الخضاب قالت: اسلتيه و ارغميه. قال أبو عبيدة: قولها ارغميه تقول اهينيه و ارمى به عنك.** (سنن بيهقى، باب نزع الخضاب عند الوضوء إذا كان يمنع الماء، ج اول، ص ۱۲۵، نمبر ۳۶۴) اس اثر میں ہے کہ خضاب ہو تو اس کو دور کر دینا چاہئے تا کہ پانی کھال تک پہنچ جائے۔ انیس

(۳) اس لیے نیچے تک پانی پہونچانے کے لیے گھڑی کو حرکت دینا ہوگا، اگر اس قدر سختی سے باندھ رکھی ہو کہ حرکت نہ کر سکے تو پھر گھڑی کو نکال لینا ضروری ہوگا۔ اسی طرح انگوٹھی پہن کر وضو کرنا درست ہے، اگر انگوٹھی ڈھیلی ہو اور اس کے نیچے پانی پہونچ جاتا ہو تو اس کو ہلانا مستحب ہے اور اگر تنگ ہو تو ہلا کر اس کے نیچے پانی پہونچانا فرض ہے۔ انگوٹھی پہننے میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ مرد چاندی کی پہنیں اور عورتیں سونے یا چاندی کی یا لوہے، پیتل وغیرہ کی انگوٹھی پہنیں۔ (طہارت کے احکام و مسائل: ۱۰۵، ۱۰۶۔ انیس)

اثر سے خون بند ہوگیااوروہ جگہ ایسی ہے جس کا دھوناوضومیں ضروری ہے تو چونا چھڑا کر وہ جگہ دھونا چاہئے یا نہیں، اگر چونا ایسا خشک ہوگیا ہے کہ چونے کے چھڑانے سے پھر خون نکلنے کا اندیشہ ہے تو کیا کرے؟

اسی طرح اگر غسل کی ضرورت ہے اور ٹانگ میں، کئی دن ہوئے ایک چوٹ لگ گئی تھی اوراس پر چونا لگا دیا گیا تھا اورخون اس سے بند ہوگیا تھا، اب وہ چونا ایسا خشک ہوگیا ہے کہ پانی کی تری سے کسی طرح نہیں چھوٹتا ہے، اگر چاقو وغیرہ سے چھڑایا جائے تو خون نکلنا ضروری ہے ایسی صورت میں کیا کرے، صرف اوپر اوپر سے پانی اس جگہ بہا لینا درست ہے یا بہ تکلف چونا چھڑا کر صاف کر کے خواہ خون ہی کیوں نہ نکلے پانی بہانا چاہئے اور اگر خون نکلنے لگے اور پھر بھی پورے طور پر چونا اس زخم سے نہ چھوٹے تو کیا کرے؟

الجواب ــ

چونا چھڑانا واجب ہے، بشرطیکہ چھڑانا ضرر نہ دے، اوراگر ضرر دے تو اسی پر پانی بہالیا جاوے، چاقو سے چھڑانے کی ضرورت نہیں، بلکہ تیل اور پانی وغیرہ سے بسہولت جتنا چھوٹ سکے اس کا چھڑانا واجب ہے، اور جو اس سے بھی نہ چھوٹے اس کا مضائقہ نہیں ۔**قال فی نورالإیضاح:ولو ضره غسل شقوق رجلیه جاز إمرار الماء علی الدواء الذی وضعه فیها، قال الطحطاوی:ثم محل جواز إمرار الماء علی الدواء إذا لم یزد علی رأس الشقاق فإن زاد تعین غسل ماتحت الزائد کمافی ابن أمیر حاج،ومثله فی الدر،لکن ینبغی أن یقید بعدم الضرر کمالایخفیٰ أفاده بعض الأفاضل آه**(ص ۷۳) یہی حکم غسل کا بھی ہے ،واللہ اعلم ۲۳ رشعبان ۴۳ھ ۔(امدادالاحکام جلداول ص ۳۴۵ و ۳۴۶)

روغن چھڑائے بغیر وضو ہوگا یا نہیں:

سوال: جولوگ رنگریزی کا کام کرتے ہیں یا تارکول (ڈامبر) کا کاروبار کرتے ہیں ان کے متعلق یہ امر دریافت طلب ہے کہ رنگ یا تارکول جو ان کے ہاتھ پیر وغیرہ پر لگے ہوتے ہیں یہ دھونے سے صاف نہیں ہوتے اور وضو کرنے سے ان کے نیچے پانی نہیں جاتا تو کیا ان کے ہاتھوں پر لگنے کی صورت میں ان کا وضو ہوجائے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

رنگ ریز، جو کپڑا رنگنے کا کام کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پر جو رنگ لگا رہتا ہے اسے اتارنے کی ضرورت نہیں البتہ لکڑی یا لوہے وغیرہ پر چپکنے والا روغن اگر جم گیا تو اسے اتارے بغیر وضو نہ ہوگا، ہاں اگر ایسے روغن کی تہہ نہیں جمی، صرف رنگ نظر آتا ہے تو وضو ہوجائے گا اس لیے کہ یہاں پانی کے پہنچنے سے کوئی مانع نہیں۔

"قال فی شرح التنویر:(و)لایمنع (ماعلی ظفر صباغ و)لا(طعام بین أسنانه)أوسنه

المجوف،به يفتى،وقيل:إن صلباًمنع،وهوالأصح،وفى الشامية:(قوله وهوالأصح)صرح به فى شرح المنيةوقال:لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورةوالحرج،ردالمحتار: ١٤٣/١.(١)فقط واللہ تعالیٰ اعلم ـ ۲/شعبان ۹۵ھ ـ (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۰)

پالش ناخن پر لگی رہ جائے تو وضو کا حکم:

سوال: جوتوں پر پالش کرنے کے بعد اگر پالش ناخن وغیرہ میں لگی رہے اچھی طرح صاف نہ کیا جائے تو وضو وغیرہ میں کوئی حرج تو نہیں کہ اس میں موم کی آمیزش ہوتی ہے، موم پانی کو جذب نہیں کرتا؟

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

(۲) اگر محض رنگ اور کسی قدر چکناہٹ باقی ہے تو اس سے وضو میں خلل نہیں آتا جیسے اگر تیل لگا ہوا ہو اور اس پر پانی بہا دیا جائے، اگر صرف رنگ اور چکناہٹ ہی نہیں بلکہ موم بھی باقی ہے جس سے پانی نہیں پہنچ سکتا تو نہ وضو درست ہے نہ غسل ـ (۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ـ حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیوبند، ۱۲/۲/۸۷ھ ـ الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ، دارالعلوم دیوبند، ۱۳/۲/۸۷ھ ـ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۱-۴۲)

وضو اور غسل میں ناخن پالش کا حکم:

سوال: علماء کرام و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ اس دور میں عورتیں جو ناخن پالش لگاتی ہیں جب ان سے کہا جائے کہ ناخن پالش لگانا ناجائز ہے اس کے ہوتے ہوئے وضو نہیں ہوتا جو کہ نماز کے لیے شرط ہے

(۱) الدرالمختارمع ردالمحتار: ج ١ ص ١٥٤، أبحاث الغسل ـ انیس

(۲) ا ـ وضو میں ہاتھ پاؤں کے ناخن دھونا بھی فرض ہے، اگر کسی کے ناخنوں میں آٹا یا مٹی یا پالش لگی ہو تو اس کو صاف کر کے ناخن کے اوپری حصہ پر پانی پہونچانا ضروری ہوگا ـ (الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۰) ۲ ـ اسی طرح اگر ناخن بڑھے ہوئے ہوں اور ان کے نیچے یہ چیزیں آٹا یا مٹی، پالش لگی ہوں تو ان کو صاف کر کے سامنے کے نچلے حصہ میں پانی پہونچانا ضروری ہوگا، البتہ اگر ناخن چھوٹے ہوں اور مٹی یا آٹا لگا ہوا ہو تو بغیر صاف کئے وضو کرنا درست نہ ہوگا ـ (الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۰) ۳ ـ آج کل عورتیں ناخنوں پر مصنوعی پالش لگاتی ہیں ایسی پالش کو وضو کرتے وقت صاف کر کے دھونا ضروری ہے ـ (الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۰) ۴ ـ اگر ناخنوں میں میل کچیل ہو تو اس کو صاف کئے بغیر بھی وضو کرنا درست ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ صاف کر لے ـ (الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) (طہارت کے احکام و مسائل: ۱۰۵)

(۳) ”(ويجب) أى يفرض (غسل) كل مايمكن من البدن بلاحرج مرةً كأذن(إلىٰ اٰخره) (ولايمنع) الطهارة(ونيم) أى خرء ذباب وبرغوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولوجرمه .به يفتى. (ودرن ووسخ)...... وكذادهن ودسومة(إلىٰ اٰخره)،(و)لايمنع(ماعلى ظفرصباغ و)لا(طعام بين أسناه) أوفى سنه المجوف، به يفتىٰ، وقيل إن صلباً،منع، وهوالأصح“(الردالمحتارعلىٰ الدرالمختار: ١٥٢/١.١٥٤،مطلب :أبحاث الغسل،(سعيد)الفتاوىٰ العالمگيرية : ٤/١، الفصل الأول فى فرائض الوضوء ، (رشيديه)مراقى الفلاح: ٦٣/١،فصل فى تمام أحكام الوضوء.قديمى

اور نماز ارکان اسلام میں سے ہے جب وضو ہی نہیں ہوا تو نماز جو اس پر مرتب ہوتی ہے کیسے صحیح ہوگی تو یہ جواباً کہتی ہیں کہ یہ تزئین کے لیے لگائی جاتی ہے جو کہ عورت کے لیے ضروری ہے فقہائے کرام بھی فرماتے ہیں کہ عورت کو خاوند کے لیے ہر وقت تیار و مزین رہنا چاہیے پھر کیوں کر نہ لگائی جائے کیا اس کا لگانا جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

ایسی تزئین حرام ہے جو شرعی فرائض کی صحت سے مانع ہو، جو چیز بدن تک پانی پہنچنے سے مانع ہو اس کی موجودگی میں وضو اور غسل صحیح نہیں ہوتا اگر بال برابر بھی جگہ خشک رہ گئی تو وضو اور غسل نہ ہوگا، حضرات فقہا رحمہم اللہ تعالیٰ نے گُندھے ہوئے خشک آٹے کو صحت وضو سے مانع قرار دیا ہے حالانکہ وہ ناخن پالش جتنا سخت نہیں ہوتا اور اس کی ضرورت بھی ہے تو ناخن پالش کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے، جتنی بھی نمازیں ناخن پالش لگا کر پڑھی ہیں وہ واجب الاعادہ ہیں اور ساتھ ساتھ توبہ و استغفار بھی کرے۔

”قال فی الشامیة(قوله بخلاف نحو عجین)أی کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضوغ متلبد،جوهرة،لکن فی النهر:ولو فی أظفاره طین أو عجین فالفتویٰ علی أنه مغتفر قرویاً کان أو مدنیاً آه،نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة:فی العجین واستظهر المنع لأن فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء“. (ردالمحتار: ۱/۱۴۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۴/ جمادی الاولیٰ ۹۸ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۶و۲۷)

چہرے کا پردہ، ناخن پالش اور وضو:

سوال: جیوٹی وی پروگرام عالم آن لائن ۲۵/ جنوری اتوار کی رات کا دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ ایک گمراہ کن پروگرام تھا، اس پروگرام میں دو عالم آتے ہیں، ایک شیعہ سے اور ایک سنی حنفیہ سے اور کبھی کبھی کوئی اہل حدیث عالم بھی آتے ہیں۔ خیر میں بات کر رہا تھا کہ اس پروگرام کا عنوان ”کیا عورت میک اپ کرسکتی ہے؟“ اس پروگرام کے شرکاء میں ایک شیعہ عالم اور دوسرے عالم شکیل اوج صاحب تھے (جن کا لباس تک غیر اسلامی تھا، ٹائی باندھ رکھی تھی) سوال تھا کہ کیا عورت ناخن پالش لگا کر وضو کرے تو ہو جائے گا کہ نہیں؟ شیعہ عالم نے جواب دیا کہ نہیں ہوگا، کیوں کہ ناخن پالش سے وضو کی جگہ خشک رہتی ہے، مگر فقہ حنفیہ سے تعلق رکھنے والے عالم شکیل اوج صاحب نے کہا کہ: وضو ہو جائے گا، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضو کی جگہ اگر بال برابر خشک رہ جائے تو وضو نہیں ہوگا، مگر شکیل اوج صاحب فقہ حنفیہ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو گمراہ کر رہے ہیں کہ ناخن پالش پر وضو ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال پردے کے متعلق تھا، شیعہ عالم نے کہا کہ عورت پردے میں اپنا چہرہ ڈھکے گی، مگر شکیل اوج صاحب نے کہا کہ: عورتوں کو چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت ہے، چہرہ نہیں ڈھکے گی، جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے

کہ:عورتیں اپنے چہرے کوڈھک کے رکھیں، عالم آن لائن ایک اچھا پروگرام ہے مگراس میں شکیل اوج صاحب جیسے گمراہ کرنے والے عالم کونہیں بولنا چاہیے۔سائل محمد افتخار الدین

الجواب ـــــــــــــــ باسمه تعالیٰ

عالم آن لائن کے جس پروگرام کا آپ نے حوالہ دیا ہے، بلاشبہ اس سے بہت بڑی گمراہی پھیل رہی ہے۔دراصل یہ پروگرام عالم آن لائن کے بجائے جاہل آن لائن کہلانے کا مستحق ہے،آپ کی طرح کے مختلف حضرات کی شکایات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالباًاس پروگرام کے اجرا کا مقصد ہی مسلمانوں کودین سے برگشتہ کرنا ہے، چنانچہ اس پروگرام میں عموماًایسے ہی لوگوں کولایا جاتا ہے جوعلم وعمل کی ابجد سے ناواقف ہوتے ہیں، جواپنی لاعلمی کو چھپانے کے لیے جومنہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں، یوں وہ خوداوردوسروں کوبھی گمراہ کرتے ہیں۔

(۱) آپ نے ناخن پالش سے وضوہوجانے سے متعلق شکیل اوج صاحب کی جس''نادر تحقیق'' کی نشاندہی فرمائی ہے، وہ کم ازکم میرے جیسے طالب علم کے لیے نئی ہے، ورنہ قرآن وسنت اورحدیث وفقہ کی روشنی میں ہروہ چیز جوپانی کے لیے جسم تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی ہو،اس کواتارے بغیر اگر وضواورغسل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ وضواورغسل نہیں ہوتا، یہ فقہ کی ابتدائی کتاب''نورالایضاح''اور''قدوری'' کا مسئلہ ہے۔اسی طرح تمام اردوفتاویٰ میں بھی یہ مسئلہ وضاحت وصراحت سے مذکور ہے،مگرنہ معلوم جناب شکیل اوج صاحب نے یہ مسئلہ کس نادرۂ روزگار کتاب سے اخذ فرمایا ہے؟اورانہوں نے اس کی تخلیق کے لیے نہ معلوم کتنی جدوجہد فرمائی ہوگی؟اے کاش! کہ جوبات شکیل اوج صاحب کوفرمانا چاہیے تھی، وہ ایک شیعہ عالم نے کہہ دی اورشکیل اوج صاحب نے ایک نئی اوپج نکال کراپنی علمیت کاناقوس بجایا۔**فیاللعجب!**

(۲) جہاں تک آپ کے دوسرے مسئلہ یعنی''چہرہ کا پردہ'' کا معاملہ ہے، یہاں بھی شکیل اوج صاحب نے اپنے رفیق مجلس کے کان کترنے کی کوشش فرمائی ہے،ورنہ''**المرأة کلھاعورة**''کامعنی ہی یہ ہے کہ چہرہ کا پردہ لازم ہے،اس لیے کہ باعث کشش اورذریعہ فتنہ عورت کا چہرہ ہی ہے،ورنہ دوسرے بدن پرتواس نے لباس پہن رکھا ہوتا ہے، پھراس لباس کوبرقع پہنانے کامعنی کیا معنی؟

قرآن کریم بھی ہمیں اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عورت کے چہرے کا پردہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''**یٰاَیُّھَاالنَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنّ**''.(الاحزاب:۵۹)

ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم !اپنی ازواج مطہرات،اپنی بیٹیوں اورمومن عورتوں سے فرمادیجئے کہ اپنے(چہروں)پرپردے لٹکالیا کریں۔

اسی طرح یہ حکم بھی چہرے کے پردے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ:

”وَاِذَا سَأَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْهُنَّ مَنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ“. (الاحزاب: ۵۳)

ترجمہ: جب ازواج مطہرات سے کچھ پوچھنا ہو تو پردے کے پیچھے سے پوچھا کریں۔

جب خیر القرون میں امہات المؤمنین جیسی پاکیزہ ومقدس ہستیوں کو یہ حکم ہوا تو پندرھویں صدی کے اس شر وفتنہ کے دور اور مادر پدر آزاد ماحول کے آزاد خیال مردوں سے عورت کو چہرہ کے پردہ کا حکم کیوں نہ ہوگا۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قافلہ سے بچھڑ جانے والے قصہ میں ان کا یہ فرمانا کہ قافلے سے پیچھے آنے والے صحابی کے ”إنا لله“ پڑھنے پر میں فوراً نیند سے بیدار ہوگئی اور اپنا چہرہ چھپالیا۔(۱) کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ عورت کے چہرے کا پردہ فرض ہے۔

مگر کیا کیجئے اس جہالت ولاعلمی کا؟ کہ اس نے اپنی ذہنی اختراعات اور خواہشات نفس کو دین وشریعت کا لبادہ اوڑھا کر رواج دینے کے لیے چہرے کے پردے کا سرے سے ہی انکار کردیا۔

اگر چہرہ کا پردہ ضروری نہیں تھا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیوں عرض کیا تھا کہ آپ کے ہاں نیک وبد سب آتے ہیں، آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردہ کا حکم کریں۔(۲)

بہرحال شکیل اوج صاحب کا مسئلہ ان کے اپنے آسمان علم کی اوج ثریا کا نتیجہ ہے، اس کا قرآن وسنت اور دین وشریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اے کاش! کہ یہاں بھی شیعہ عالم ان سے بازی لے گئے اور شکیل اوج صاحب اپنی خفت مٹانے کے لیے مسلمات دینیہ پر تیشہ چلا کر قرآن وسنت سے متصادم الگ راہ اور پگڈنڈی پر سرپٹ دوڑنے لگے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عقل وفہم نصیب فرمائے اور قارئین وناظرین کی ہدایت کا سامان فرمائے، نیز اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ٹی وی آلہ مخرب اخلاق ہے جو تخریب اخلاق کا درس تو دے سکتا ہے، مگر اس سے اصلاح کی توقع عبث وفضول ہے، لہذا ٹی وی پر بیان ہونے والے کو اسی تناظر میں دیکھا جائے۔ کتبہ سعید احمد جلالپوری، بینات۔ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ۔ (فتاویٰ بینات جلد چہارم: ۴۶۶۔۴۶۹)

ناخنوں پر ہیر کلر لگ جائے:

سوال: السلام علیکم! میری والدہ کے ہاتھوں کے ناخنوں پر ہیر کلر لگ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ گلابی رنگ کے ہوگئے ہیں، کیا نماز ہوجائے گی، جلدی جواب دیں مہربانی ہوگی؟

---

(۱) صحیح البخاری کتاب المغازی، باب حدیث الإفک: ۵۹۴/۲۔

(۲) صحیح البخاری کتاب التفسیر باب الأحزاب، باب قوله ”لاتدخلوا بیوت النبی“ الایة: ۷۰۶/۲۔

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

جی ہاں، اگر محض رنگ باقی ہے تو اس سے سائل کی والدہ کے وضواور غسل میں خلل نہیں آتا، لہذا نماز ہو جائے گی۔

کمافی الدر:(ویجب)ای یفرض(غسل)کل مایمکن من البدن بلاحرج مرة کأذن(الی قوله)(ولایمنع)الطهارة(ونیم)ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل الماء تحته(وحناء)ولوجرمه به یفتی(الی قوله)(و)لایمنع(ماعلی ظفرصباغ و)لا(طعام بین اسنانه)اوفی سنه المجوف به یفتی وقیل ان صلبامنع،وهوالاصح.الخ(۱/۱۵۲.۱۵۴) واللہ اعلم وعلمہ اتم (فتاویٰ دارالافتاء والقضاء جامعہ بنوریہ پاکستان سیریل نمبر:۸۴۵۶)

وضو کے بعد نیل پالش اور لپ اسٹک کا استعمال:

سوال: عورتوں کا وضو کرنے کے بعد نیل پالش اور لپ اسٹک کا استعمال جائز ہے کیا اس وضو کے بعد نماز درست ہے؟

ھو المصوب ــــــــــــــــــــ

وضو کے بعد نیل پالش اور لپ اسٹک کا استعمال جائز ہے اور نماز بھی پڑھ سکتے ہیں۔(۱) تحریر: مستقیم ندوی۔تصویب : ناصر علی ندوی (فتاویٰ ندوۃ العلماء:۱/۲۲۶)

بال میں گارنیر کلر لگانے کے بعد وضو:

سوال: آج کل عورتیں اور لڑکیاں اپنے اپنے بالوں میں گارنیر کلر نکھار کیلئے استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے بالوں پر پرتیں جم جاتی ہیں۔معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں نماز نہیں ہوتی؟

ھو المصوب ــــــــــــــــــــ

اگر تہہ جم جاتی ہے تو اس صورت میں وضو اور غسل نہ ہوگا۔**(قوله "بخلاف نحو عجین " أی کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضو غ متلبد ....نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة:فی العجین واستظهرالمنع لأن فیه لزوجةً وصلا بةً تمنع نفوذالماء.(ردالحتار:۱/۲۸۸)** تحریر: محمد ظہور ندوی عفا اللہ عنہ (فتاویٰ ندوۃ العلماء:۱/۲۲۶و۲۲۷)

---

(۱) (و)لایمنع(ماعلی ظفرصباغ و)لا(طعام بین أسنانه) أوفی سنه المجوف، به یفتیٰ، وقیل إن صلباً،منع،وهوالأصح"(الدرالمختارعلیٰ الرد: ۱/۱۵۲.۱۵۴،مطلب :أبحاث الغسل. انیس الرحمٰن قاسمی

پاؤں کا دھونا فرض ہے، شیعوں کا قول صحیح نہیں:

سوال: شیعہ کہتے ہیں کہ وضو میں پاؤں کا دھونا نہیں، بلکہ مسح ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب

وضو اور تیمّم دونوں منصوص حکم ہیں ہر ایک کی تشریح قرآن شریف میں مذکور ہے، اس میں قیاسات عقلیہ کو گنجائش نہیں۔ (۱) (لہٰذا وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ مسح جو شیعوں کا قول ہے، ہرگز درست نہیں ہے، ظفیر) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۲۷)

پاؤں پر مسح کے لیے آیت قرآن سے روافض کا استدلال:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ شیعہ حضرات سورۂ مائدہ کی آیت ۶،۵ سے پاؤں پر مسح کے فرض ہونے کے قائل ہیں اور صرفی ونحوی ترکیب سے مسح ثابت کرتے ہیں اور غسل رجلین کو خلاف قرآن کہتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ سنی علما تا قیامت غسل رجلین کے ثابت کرنے سے عاجز ہیں پس وہ کونسی نحوی وصرفی ترکیب ہے جس سے ہم اہل سنت غسل اور دھونا ثابت کرتے ہیں نیز دیگر دلائل و براہین سے بھی مختصراً وضاحت فرمادیں؟ بینوا توجروا۔ المستفتی اہل سنت والجماعۃ منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات۔ ۱۹۷۲/۱۲/۱۷ء۔

الجواب

اعلم أن أرجلكم معطوف على المغسول دون الممسوح يدل عليه القرآن والحديث والإجماع والعقل،أماالأول فهوقوله تعالىٰ: إلى الكعبين، ولم يقل إلى الساقين والكعب غاية الغسل دون المسح وأماالثانى فهى الأحاديث المتواترة الواردة فى عمل الغسل وترغيب الغسل والوعيد على تركه وأماالثالث فلأن الصحابة رضى الله عنهم حتى علياوابن عباس ذهبوا إلى وظيفة الغسل،وأماالرابع فإن الرجلين أقرب إلى محل الغبار والنجاسة بخلاف الرأس والعجب من أهل التشيع أنهم لم يلتفتوا إلى قراء ة النصب مع أن العطف بالنصب على

(۱) اِذَاقُمْتُمْ اِلَى الصَّلوٰةِ فَاغْسِلُوْاوُجُوْهَكُمْ ،الآية،ففرض الطهارة غسل الأعضاء الثلاثة ومسح الرأس وقدثبت فى الصحيحين من رواية عبدالله بن عمروأبى هريرةرضى الله عنهماأن رسول الله صلى الله عليه وسلم راى قوماً توضأوا وأعقابهم تلوح لم يمسها الماء فقال: ويل للأعقاب من النار،الخ وعن عطاء ماعلمتم أن أحداً من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مسح على القدمين، فهذا إجماع من الصحابة على وجوب الغسل وهويؤيده الأحاديث الصحيحة فلاعبرة بمن جوزالمسح على القدمين من الشيعة ومن شذ (غنية المستملى:۱۶۰۱۵) ظفير

المجرورلایصح إلا فی المجرور بالحرف الزائد فافهم وتدبر.(۱)وإنماکتبت الجواب بالعربیةلأنها مسئلة معضلة لایفهمها العوام . فقط (فتاویٰ دیو بند پاکستان،المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم:۹۵۔۹۶)

بغیر پیر دھوئے ہوئے وضو درست ہے یا نہیں:

سوال: یہ چند مسئلے جو بندہ نے دریافت کئے ہیں ان سے آگاہی بخشئے گا وہ یہ ہیں۔

(۱) بغیر پیر دھوئے وضو ہو جاتا ہے یا نہیں؟

(۲) بوٹ کے اوپر مسح درست ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نجس جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً ٹٹی (پائخانہ) وغیرہ میں پہنکر جانا۔

(۳) اونی موزہ کے اوپر بھی مسح درست ہے یا نہیں؟ جو کہ دبیز ہو۔

(۴) بوٹ جوتا کے اوپر مسح کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ پر ہر وقت پٹی اور بوٹ مع موزہ کے پہننے کا حکم ہے اور اتنی فرصت نہیں ہے کہ اس کو کھولا جاوے اور پیر دھو لئے جاویں۔

(۵) یہ ملک بھی برفستان ہے اور بہت ٹھنڈا ہے ہر وقت پیر دھونے سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور بغیر دھوئے بھی سوزش ہو جاتی ہے۔

(۶) اور یہ مسافری کا وقت ہے اس میں گرم پانی کا بھی انتظام نہیں ہے۔

(۷) اتنا ضرور ہوتا ہے کہ صبح کو پیر دھو لئے جاتے ہیں اور باقی وقت میں مسح کر لیا جاتا ہے۔

(۸) پاکی اور ناپاکی کی احتیاط بھی بہت کم ہوتی ہے صرف حکم خدا سمجھ کر نماز کو ادا کر لیا جاتا ہے۔

---

(۱) قال العلامةإبراهیم الحلبی:والأرجل من بین الأعضاء الثلٰثة المغسولة تغسل بصب الماء علیها فکانت مظنة للإسراف المذموم المنهی عنه فعطف علی الممسوح لاالتمسح ولکن لینبه علی وجوب الاقتصاد فی صب الماء علیها وقیل إلی الکعبین فجیء بالغایة إماطةً لظن ظان یحسبهاممسوحة لأن المسح لاتضرب له غایة فی الشریعة انتهیٰ وقدثبت فی الصحیحین من روایة عبدالله بن عمروأبی هریرة رضی الله عنهماأن رسول الله صلی الله علیه وسلم رأی قوماً توضؤاوأعقابهم تلوح لم یمسها الماء فقال: ویل للأعقاب من النار،وفی روایة لأبی هریرةرضی الله عنه ویل للعواقیب من النار،وفی صحیح مسلم عن جابررضی الله قال: أخبرنی عمربن الخطاب رضی الله عنه أن رجلاً توضأ فترک موضع ظفرعلی قدمه فأبصره النبی صلی الله علیه وسلم فقال ارجع فأحسن وضوئک وعن عائشة رضی الله عنها لأن تقطعا أحب إلی من أن أمسح علی القدمین من غیر خفین وعن عطاء ماعلمت أن أحداً من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم مسح علی القدمین فهذاإجماع من الصحابة علی وجوب الغسل وهویؤید الأحادیث الصحیحة فلاعبرة بمن جوزالمسح علی القدمین من الشیعة ومن شذ.(غنیةالمستملی المعروف بالکبیری ص۱۵،۱۶ شرائط الصلاة)

الجواب

(۱) اگر ایسا موزہ پہنے ہوئے نہ ہوں جس پر مسح درست ہوتا ہے تو پاؤں کا دھونا فرض ہے بغیر پاؤں دھوئے وضو درست نہ ہوگا البتہ اگر موزہ نہ ہو اور دھونا مضر ہو اور گرم پانی کا انتظام نہ ہو سکے یا گرم پانی سے بھی مضر ہو تو مسح یعنی بھگا ہوا ہاتھ پھیر لینا بھی کافی ہے۔**في الدرالمختار: وكذا يسقط غسله فيمسحه ولو علىٰ جبيرة إن لم يضره وإلا سقط أصلا ،في رد المحتار: وكذا يسقط غسله أى غسل الرأس من الجنابة**
(ج ۱ ص ۲۶۸)

(۲) بوٹ پر مسح درست ہے جبکہ ٹخنے سے اوپر ہو اور اس میں سے قدم نظر نہ آوے۔**في الدرالمختار : فيجوز على الزربول، في رد المحتار: ويجوز على الجاروق(إلىٰ قوله)والظاهر أنه الخف الذى يلبسه الأتراك في زماننا،**(۱ / ۲۶۹) اور اگر بوٹ نجس ہو جاوے تو وہ زمین پر خوب رگڑ دینے سے یا کسی لکڑی یا ٹھیکری وغیرہ کے ساتھ کھرچ دینے سے پاک ہو جاتا ہے۔**في الدرالمختار:(و يطهر خف ونحوه) كنعل(تنجس بذى جرم) هو كل ما يرى بعد الجفاف ولو من غير ها كخمر وبول أصابه تراب، به يفتي، بدلک يزول به أثرها (وإلا)......(فيغسل) في رد المحتار: (قوله بدلک) أى بأن يمسحه على الأرض مسحاً قوياً (ط) ومثل الدلک الحک والحت على ما في الجامع الصغير وفي المغرب: الحت القشر باليد والعود** (ج ۱ ص ۲۱۹)

(۳) دباغت کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کو بدون باندھے ہوئے اور بدون جوتے کے پہنکر تین چار میل چل سکیں اور وہ نہ گرے نہ پھٹے۔**في الدرالمختار:(أوجوربيه)ولومن غزل أوشعر (الثخينين) بحيث يمشي فرسخاًويثبت على ا لساق بنفسه الخ،في ردالمحتار:(بنفسه)أى من غيرشد.**
(ج ۱ ص ۲۷۷)

(۴) اوپر نمبر ۲ میں گذر چکا۔

(۵) اوپر نمبر ۱ میں گذر چکا۔

(۶) اوپر نمبر ۱ میں گذرا ہے۔

(۷) چونکہ یہ مدت مسح سے زائد نہیں ہے اس لئے جائز ہے مگر یہ مسح بوٹ کے اوپر کرنا چاہئے بشرطیکہ پیر دھوکر جو بوٹ پہنا ہے وہ مسح کے وقت تک اتارا نہ گیا ہو اور اگر بوٹ اتار دیا اور وضو بھی ٹوٹ گیا تو پھر بوٹ پر مسح جائز نہ ہوگا، اسی طرح بدون بوٹ کے پاؤں پر مسح درست نہ ہوگا بدون اس کے کہ دھونا مضر ہو، تفصیل نمبر ۱ میں گذری ہے۔

(۸) بوٹ کے پاک ہونے کا طریقہ نمبر۲ میں بیان کر دیا گیا ہے (البتہ اگر اس پر پیشاب کی چھینٹ لگ جاوے تو وہ بدون دھوئے ہوئے پاک نہ ہوگا، **کما مر أیضاً فی نمبر۲**، منہ) (امداد الفتاویٰ جدید جلد اول ۴۲ و ۴۳)

پیر کا دھونا وضو میں فرض ہے:

سوال: آیا وضو میں پیر کا مسح فرض ہے اور دھونا سنت ہے۔ یہ ''ازالۃ الخفاء صفحہ ۴۵۹'' میں ہے۔ یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب

وضو میں پیروں کا دھونا فرض ہے(۱) اور نص قطعی ''**وأرجلكم**'' سے ثابت ہے۔ مسح اس صورت میں ہے کہ پیروں میں موزے پہنے ہوں، **بشرائطه المذكورة فی كتب الفقه**۔(۲)

''ازالۃ الخفاء'' کو دیکھا گیا اس میں یہ مضمون کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ نے جس صفحہ کا حوالہ دیا ہے اس صفحہ تک کتاب مذکور کے دونوں مقصد نہیں پہنچے، کیوں کہ مقصد اول کے کل صفحات ۳۳۶ ہیں اور مقصد ثانی کے کل صفحات ۲۸۴ ہیں۔ شاید آپ نے ترجمہ دیکھا ہو، اصل کتاب جو فارسی میں ہے نہیں دیکھی۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۲۷)

پیر دھونے کا مسئلہ:

سوال: ۔نماز پڑھنے کے لئے وضو کرنا فرض ہے اور وضو میں چار فرض ہے: منہ دھونا، کہنیوں تک ہاتھ دھونا، سر کا مسح کرنا اور ٹخنوں تک پیر دھونا، لیکن ہم لوگ وضو کرتے وقت سر کا مسح کرتے ہیں۔ مگر پیر کو بھی ٹخنوں تک دھوتے ہیں جبکہ چھٹے پارے سورہ مائدہ کے پہلے رکوع میں خدا نے وضو کے طریقہ لکھے ہیں جس میں لکھا ہوا ہے کہ نماز کے لئے

---

(۱) ا۔وضو میں دونوں پاؤں انگلیوں کے سرے سے لے کر ٹخنے تک دھونا فرض ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) ۲۔اگر کسی کا پاؤں ٹخنے سے نیچے کٹ گیا ہو تو ٹخنے کا دھونا فرض ہوگا۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) ۳۔البتہ پاؤں اگر ٹخنے کے اوپر سے کٹ گیا ہو تو پھر وضو میں اس کا دھونا فرض نہیں ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) ۴۔اگر کسی کے پاؤں سُن ہو کر ایسے بے جان ہو گئے ہوں کہ اگر انہیں کاٹ دیا جائے اور اسے پتہ بھی نہ چلے تو ایسے شخص پر بھی وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) ۵۔اگر کسی نے پاؤں میں تیل کی مالش کی اور اس کے بعد وضو کے لیے بیٹھا مگر تیل کی وجہ سے پاؤں پر پانی نہ ٹھہرے تو کوئی حرج نہیں اسی طرح پاؤں دھوئے گا۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۴) ۶۔پاؤں کی انگلیاں ملی ہوئی ہوں تو ان کے درمیان پانی پہونچانا ضروری ہے اگر پانی ڈالنے سے تر نہ ہوئی ہوں تو انگلیوں سے ان کا خلال فرض ہوگا۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۵، ۹۶) ۷۔جاڑے کے موسم میں ہاتھ و پاؤں کو دھوتے وقت ملنا بھی چاہیے تا کہ کوئی حصہ سوکھا نہ رہ جائے۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۵، ۹۶) ۸۔پاؤں میں اگر پھٹن ہو تو اس میں پانی پہونچانا فرض ہے، البتہ اگر دوا یا چربی لگائی ہوا اور اس کو ہٹانے میں نقصان ہونے یا تکلیف بڑھنے کا گمان ہو تو صرف اس پر پانی بہالے۔(الفتاویٰ التاتارخانیة: ۱/۹۵، ۹۶) (طہارت کے احکام و مسائل: ۱۰۶، ۱۰۷۔انیس)

(۲) **أركان الوضوء أربعة الخ (غسل الوجه الخ غسل اليدين الخ والرجلين) الباديتين السليمتين فإن المجروحتين المستورتين بالخف وظيفتهما المسح الخ (الدر المختار مع رد المحتار، فرائض الوضوء: ۱/ ۸۶ تا ۹۱**. ظفیر

جاؤ تو منہ اور ہاتھ کو کہنیوں تک دھولو، سر اور پیر ٹخنوں تک مل لو۔ تو بتلایئے کہ دھونے اور ملنے میں کیا کوئی فرق نہیں ہے؟ اگر فرق نہیں ہے تو سر کو بھی کیوں نہیں دھویا جاتا ہے کیا ہمارا وضو صحیح ہوتا ہے؟

الجواب ـــــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

''وأرجلکم '' کا عطف ''رؤسکم'' پر نہیں ہے۔ بلکہ ''أیدیکم'' پر ہے لہذا جس طرح چہرہ اور ہاتھ دھویا جاتا ہے اسی طرح پیر بھی دھویا جائے گا بخلاف سر کے کہ اس کا حکم صرف مسح ہے، اس آیت کی تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے اور ہمارا وضو درست ہے، جس میں تین اعضا دھوئے جاتے ہیں اور سر کا مسح کیا جاتا ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی ۔ (حبیب الفتاویٰ جلد سوم صفحہ ۴۹ و ۵۰)

وضو سے پہلے پیر تر کرنا:

سوال: حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مواعظ علم و عمل کے صفحہ :۳۰۳ (مطبوعہ ملتان، پاکستان) میری نظر سے گذرا اس میں لکھا ہے کہ: وضو سے قبل پیر تر کرلیا جائے اور آخر میں دھویا جائے، فقہا نے مندوب کہا ہے اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ـــــــــــــــــــــــ

اچھا ہے عمل کرسکتے ہیں، مقصود پیروں کے دھونے میں مبالغہ ہے اور پیروں کو پہلے سے تر کرلینا اس کے لیے معین ہے مگر اس کو سنت طریقہ نہ سمجھا جائے۔(۲) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ :۴/ ۲۷۷)

پاؤں کے شگاف میں دوائی لگانے کے بعد وضو کا حکم:

سوال:۔ سردی کے موسم میں ہاتھ پاؤں کے اندر شگاف پڑجاتے ہیں ایسی حالت میں اگر شقوق دوائی سے بھر دیئے جائیں اور وضو کرتے وقت پانی اس میں دخل انداز نہ ہو تو اس صورت میں وضو درست ہوگا یا نہیں؟

---

(۱) أن حمرانؒ مولی عثمانؓ أخبره أنه رأى عثمانؓ بن عفان دعا بإناء ،فأفرغ علی کفیه ثلاث مرار فغسلهما،ثم أدخل یمینه فی الإناء فمضمض واستنثرثم غسل وجهه ثلاثاً ویدیه إلی المرفقین ثلاث مرار،ثم مسح برأسه،ثم غسل رجلیه ثلاث مرار إلی الکعبین،ثم قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من توضأ نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لایحدث فیهما نفسه غفرله ماتقدم من ذنبه۔(بخاری شریف :باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً ،ص ۳۲ ،نمبر ۱۵۹ /أبوداؤد شریف:باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم ،ص۲۶،نمبر۱۰۸۔) انیس الرحمٰن قاسمی۔

(۲) وقدثبت فی الصحیحین من روایة عبدالله بن عمروأبی هریرة رضی الله عنهما أن رسول الله صلی الله علیه وسلم رأى قوماً توضأوا وأعقابهم تلوح لم یمسها الماء فقال: ویل للأعقاب من النار،الخ. (غنیة المستملی:۱۵۔۱۶) انیس

الجواب

اگر زخموں کے اندر پانی پہنچنے سے نقصان کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں ہاتھ پاؤں کی جلد پر صرف پانی بہانا ہی کافی رہے گا، شقوق کے اندر پانی پہونچانا لازمی نہیں۔ ''قال ابن عابدینؒ: تحت قول الحصکفیؒ: (فی أعضاء ہ شقاق غسله إن قدر وإلامسحه الخ) ولو كان فی رجله فجعل فيه الدواء يكفيه إمرار الماء فوقه ولايكفيه المسح، (ردالمحتار علی الدرالمختار، فرائض الوضوء: ج ۱ ص ۱۰۲) (۱) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۸و۵۱۹)

سر کے مسح میں مقدار فرض کیا ہے:

سوال: سر کے مسح میں مقدار فرض کیا ہے؟ مقدار ربع راس کے، یا مقدار تین انگلی کے۔

الجواب

علامہ شامی (۲) نے لکھا ہے کہ معتبر روایت فرضیت مسح ربع رأس کی ہے۔ (۳) كماقال فی شرح قوله ومسح

(۱) ''قال إبراهيم الحلبیؒ: إذاكان برجله شقاق فجعل فيه الشحم أوالمرهم إن كان يضره إيصال الماء لايجوزغسله ووضوء ه وإن كان لايضره يجوزإذامر الماء علیٰ ظاهرذلک، (كبيری: ص۵۷، الطهارة الكبریٰ، فرائض الغسل) ومثله فی خلاصةالفتاویٰ: ج ۱ ص ۲۳۔

(۲) آپ کا نام محمد امین ہے مگر مشہور ابن عابدین کے ساتھ ہے آپ کے حاشیہ کا نام ''ردالمحتار علی الدرالمختار شرح تنویر الابصار'' ہے مگر عوام میں شامی کے نام سے مشہور ہے، حضرت مفتی علام نے جہاں لکھا ہے کہ ''شامی میں یہ ہے'' یا ''علامہ شامی نے یہ لکھا ہے'' اس سے مراد یہی ردالمحتار اور اس کے مصنف ہیں، علامہ شامی نے ۱۲۵۲ھ میں انتقال کیا ہے۔ محمد ظفیر الدین غفرلہ

(۳) ۱۔ وضو میں سر کا مسح کرنا فرض ہے مگر یہ فرضیت سر کے ایک چوتھائی حصہ پر ہے اور باقی پورے سر کا مسح سنت ہے۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۵/۱، ۹۶) ۲۔ اگر کسی نے سر کے آگے کی جانب سے مسح کرنے کے بجائے درمیان یا دائیں بائیں یا سر کے پچھلے حصہ پر تین انگلیوں سے مسح کرلیا تو فرض ادا ہوجائے گا۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۱/۱، ۹۲) ۳۔ اگر کسی کے سر پر لمبے بال ہوں جیسے عورتوں کے بال، اگر اس نے تین انگلیوں سے مسح کیا مگر اس نے پیشانی پر لٹکے بالوں یا گردن پر لٹکے بالوں کا مسح کیا تو اس سے فرض ادا نہ ہوگا کیوں کہ سر یا اس کے اوپر کے بالوں پر مسح فرض ہے۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۱/۱، ۹۲) ۴۔ اگر کسی خاتون نے لٹکی ہوئی چوٹی یا سر پر بندھی ہوئی چوٹی یا پھول پر مسح کیا تو یہ کافی نہ ہوگا۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۲/۱) ۵۔ اسی طرح اگر کسی خاتون نے مسح کرتے وقت اپنی اوڑھنی سر سے نہ ہٹائی اور اسی پر مسح کرلیا تو یہ مسح ادا نہ ہوگا، البتہ اگر پانی ہاتھ میں زیادہ ہو اور قطرے ٹپک کر اوڑھنی سے نیچے بالوں پر پہونچ جائے تو جائز ہوگا، لیکن افضل یہی ہے کہ اوڑھنی کے نیچے مسح کرے۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۲/۱، ۹۳) ۶۔ سر کا مسح کرنے کے بعد اگر بالوں کو کٹوا دے یا مونڈ والے تو اس سے حرج نہیں اور سر کا دوبارہ مسح نہیں کرے گا۔ (الفتاویٰ التا تارخانیۃ: ۹۱/۱، ۹۲) ۷۔ سر پر اگر ٹوپی یا عمامہ ہو یا مصنوعی بال ہوں اور اس پر کوئی مسح کرے تو یہ مسح ادا نہ ہوگا۔ (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۰۷، ۱۰۸۔ انیس)

حدیث میں ہے: عن عروة بن المغيرةبن شعبة، عن أبيه قال: تخلف رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم و تخلفت معه، فلما قضى حاجته .....ومسح بناصيته، وعلى العمامة، و على خفيه، (مسلم شریف، باب المسح علی الناصيةوالعمامة، ص۱۳۴ نمبر۲۷۴/۶۳۳، أبوداؤد شریف، باب المسح علی الخفين ص۲۲ نمبر۱۵۰) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پیشانی کے قریب جو بال ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس پر مسح فرمایا اور وہ چوتھائی سر کی مقدار ہے، اس لیے چوتھائی سر پر مسح کرنا فرض ہوگا۔ انیس

ربع (الرأس):واعلم أن فی مقدارفرض المسح روایات أشهرها مافی المتن، الثانیة: مقدارالناصیة، واختارها القدوری، وفی الهدایة: وهی الربع، و التحقیق أنهاأقل منه، الثالثة: مقدارثلٰثة أصابع،رواها هشام عن الإمام(إلٰی أن قال)والحاصل أن المعتمدروایةالربع وعلیها مشی المتأخرون کابن الهمام وتلمیذه ابن أمیرحاج وصاحب النهروالبحروالمقدسی والمصنف والشرنبلالی وغیرهم. (۱)فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۲۵)

عورتوں کے لئے پورے سر کا مسح:

سوال: عورتیں بھی مسح سر کا مثل مردوں کے کریں یا اور طرح؟

الجواب

عورتوں کو مسح سر کا کرنا مثل مردوں کے فرض ہے اور سب امور میں مسح سر کے عورتیں مثل مردوں کے ہیں۔(۲) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔کتبہ الاحقر رشید احمد عفی عنہ۔مجموعہ کلاں، ص:۲۳۴ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۱۴۰)

مسح راس کا طریقہ:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ وضو میں سر کے مسح کے واسطے پانی ہاتھ میں لے کر ڈال دیتے ہیں یعنی چھڑک کر مسح کرتے ہیں آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

سر کے مسح کے واسطے اس قدر لیوے کہ مسح ہو جائے چلو بھر کر مسح کرنا اسراف ہے۔اگر پانی ڈالے گا تو غسل ہو جاویگا اور وہ مسح نہیں ہے۔(۳)فقط بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ کامل:ص۲۳۸)

---

(۱) رد المحتار، کتاب الطهارة،فرائض وضو:۱/۹۲) کتاب ردالمحتار مختلف مطابع میں چھپی ہے اور ہر ایک کے صفحات الگ ہیں اسی وجہ سے باب اور فصل کا حوالہ بھی دیا گیا ہے زیر نظر فتاوی میں جس مطبوعہ ردالمحتار کے صفحات کا حوالہ ہے وہ دارالخلافہ العثمانیہ کے مطبع عثمانیہ کی چھپی ہوئی ہے، اگر آپ کو صفحات نکالنے ہوں تو مذکورہ مطبع کی چھپی ہوئی (ردالمحتار) سامنے رکھئے، حضرت مفتی اعظمؒ نے بھی بعض جگہ صفحات لکھے ہیں مگر وہ مطبع مجتبائی دہلی کے مطبوعہ نسخہ کے ہیں جواب نہیں ملتے، اس لیے وہاں بھی حاشیہ پر مطبوعہ عثمانیہ کے صفحات نقل کر دئے گئے ہیں تاکہ ہمواری باقی رہے، والموفق والمعین، محمد ظفیر الدین غفرلہ۔

(۲) **عن عمر بن یحیٰ بهذا الإسناد ..... فمسح برأسه فأ قبل بهما وأدبر بدء بمقدم رأسه ثم ذهب بهما إلیٰ قفاه ثم ردهما حتی رجع إلی المکان الذی بدء منه وغسل رجلیه (مسلم شریف، باب آخر فی صفةالوضوء**، ص۱۲۳، نمبر۲۳۵/۵۵۷/ **بخاری شریف ،باب مسح الرأس کله**، ص۳۱ نمبر۱۸۵،)انیس الرحمٰن قاسمی۔

(۳) حوالہ بالا۔اس حدیث میں ہے کہ سر کے اگلے حصے سے مسح شروع فرمایا۔انیس

سر کے مسح کے لئے نیا پانی لینا:

سوال: بحالت وضو کہنیوں تک ہاتھ دھونے کے بعد وہی پانی سر کے مسح کے واسطے کافی ہے یا علیحدہ اور پانی لے کر سر کا مسح کرنا چاہئے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــ

اس میں اختلاف ہے۔(۱) **کما فی الدر المختار: أوبلل باق بعدغسل علی المشهور، فی ردالمحتار: قوله علی المشهور، مقابله: قول الحاکم بالمنع(إلی قوله)لم یجز إلا بماء جدید لأنه قد تطهر به مرة آه وأقره فی النهر(۱/۱۰۲)** ۲/ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ، تتمہ ثالث ۹۵۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۷)

مسح کے لیے نیا پانی لینا:

سوال: اگر کوئی متوضی ہاتھ منہ دھونے کے بعد تر ہاتھ سے بغیر ماء جدید کے سر کا مسح کرے اس وضو سے نماز وغیرہ بھی پڑھ لے تو اس وضو سے نماز ہو گی یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

ایسا کرنے سے وضو اور نماز میں کچھ خرابی نہیں ہوتی۔

"ومسح ربع الرأس واللحية، المسح إصابة اليد المبتلة العضو إما بللاً يأخذه من الإناء أوبللاً باقياً في اليد بعدغسل عضو من المغسولات، شرح الوقاية: ۱/۵۵، فرائض الوضوء. (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۴-۴۵)

وگ کا استعمال اور وضو:

سوال: اگر ایک شخص بوجہ مجبوری سر پر "وگ" کا استعمال کرتا ہے تو وہ شخص وضو کے دوران سر کا مسح وگ پر ہی

---

(۱) یعنی نیا پانی لے کر مسح کرنا چاہئے، ہاتھ دھونے کے بعد جو تری بچی ہے اس سے مسح جائز ہونے میں اختلاف ہے، حاکم شہیدؒ جائز قرار نہیں دیتے اور جمہور جائز کہتے ہیں، مولانا لکھنویؒ نے سعایہ (۱/۶۷) میں بحث و تمحیص کے بعد مسئلہ کی دو صورتیں کی ہیں۔ اول ہاتھوں کے ذریعہ کسی عضو کو دھونے کے بعد ہاتھوں میں بچی ہوئی تری، دوم ہاتھوں سے کسی عضو پر پانی ڈالنے کے بعد ہاتھوں میں بچی ہوئی تری۔ پہلی قسم کی تری سے سر اور موزوں کا مسح جائز نہیں ہے کیونکہ وہ تری مغسول عضو سے لی گئی ہے اس لئے وہ "ماء مستعمل" ہے اور دوسری قسم کی تری سے مسح کرنا جائز ہے اس لئے کہ ہاتھ کسی مغسول عضو سے نہیں ملے ہیں اس لئے وہ تری "ماء مستعمل" نہیں ہے واللہ اعلم۔ سعید احمد

(۲) **(ومسح ربع الرأس مرةً) فوق الأذنين ولوبإصابة مطرأوبلل باق بعدغسل علی المشهور لابعد مسح إلاأن يتقاطر، (الدرالمختار) قال ابن عابدينؒ: (قوله أوبلل باق الخ)هذا إذالم يأخذه من عضوآخر(مقدسی)فلوأخذه من عضوآخرلم يجز مطلقاً(بحر)أی سواء كان ذلك العضو مغسولاً أوممسوحاً، درر، (ردالمحتار: ۱/۹۹، أركان الوضوأربعة، وكذافي الفتاویٰ الهندية: ۱/۶، الفصل الأول في فرائض الوضوء۔)**

کرسکتا ہے یا کہ اس کو مسح وگ اتار کر کرنا چاہیے؟

الجواب

مصنوعی بالوں کا استعمال جائز نہیں۔(۱) نہ اس کے استعمال میں کوئی مجبوری ہے۔ مسح ان کو اتار کر کرنا چاہیے، اگر ان پر مسح کیا تو وضو نہیں ہوگا۔(۲) (آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد سوم:۷۸)

صرف عمامہ پر مسح کا حکم:

سوال: "بلوغ المرام" میں لکھا ہے کہ "مسح علی العمامة" جائز ہے۔ عبارت یہ ہے "**مسح بناصيته وعلى العمامة وعلى الخفين اهـ** اس کے متعلق جواب ارشاد فرمائیں۔ حافظ عبدالجبار، مدرسہ دارالہدیٰ، خانیوال۔

الجواب

عدم جواز، نص قرآنی سے ثابت ہے "**قال الله تعالىٰ:" وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ" الآية** اور ظاہر ہے کہ مسح علی العمامة مسح علی الرأس نہیں۔

احادیث مسح علی العمامة مختلف طرق سے مروی ہیں۔ مسلم شریف میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ **ومسح بناصيته وعلى العمامة اهـ** اور بعض روایات میں صرف عمامہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا نصِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ دالّہ بروجوبِ مسح رأس کو مدنظر رکھتے ہوئے احادیث جواز کا صحیح محمل متعین کیا جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ نے ربعِ رأس پر مسح فرمایا جو مقدارِ ناصیہ کے تقریباً برابر ہے۔ لیکن عمامہ سر سے اتار کر رکھا نہیں۔ باقی سر پر عمامہ

---

(۱) عن ابن عمرأن النبى صلى الله عليه وسلم قال:لعن الله الواصلة و المستوصلة والواشمة والمتوشمة.متفق عليه.(مشكوٰةالمصابيح: ص:۳۸۱،وفى المرقاة:قوله لعن الله الواصلة أى التى توصل شعرها بشعرآخرزوراً ،قوله والمستوصلة أى التى تطلب هذاالفعل من غيرهاوتأمرمن يفعل بها ذلک و هى تعم الرجل والمرأة فأنث باعتبارالنفس أولأن الأكثرأن المرأة هى الآمرة والراضية،قال النووى:الأحاديث صريح فى تحريم الوصل مطلقاًوهوالظاهرالمختاروقد فصله أصحابنافقالوا:إن وصلت بشعرآدمى فهوحرام بلاخلاف لأنه يحرم الانتفاع بشعره وسائرأجزائه لكرامته وأماالشعرالطاهرمن غيرآدمى فإن لم يكن لهازوج ولاسيد فهوحرام أيضاً،وإن كان فثلاثة أوجه أصحهاإن فعلته بإذن الزوج والسيدجازوقال مالک والطبرى والأكثرون: الوصل ممنوع بكل شىء شعرأوصوف أوخرق أوغيرها واحتجوابالأحاديث وقال الليثى: النهى مختص بالشعرفلابأس بوصله بصوف أوغيرهاوقال بعضهم يجوزبجميع ذلک،وهومروى عن عائشة لكن الصحيح عنهاكقول الجمهور.(مرقاة شرح المشكوٰة ج:۴/ص:۴۲۰،أيضاً: شامى ج:۶/ص:۳۷۳،نظام الفتاویٰ ج:۱/۲۸۔)

(۲) لومسحت على شعر مستعار لايصح ،لأن المسح عليه كالمسح فوق غطاء الرأس وهذا لايجزى فى الوضوء.(الفقه الحنفى فى ثوبه الجديد،أحكام الطهارة ج:۱/ص:۶۹،أيضاً فى الشامية:فلومسح على طرف ذؤابة شدت على رأسه لم يجز.(ج:۱/ص۹۹،ارکان الوضوء اربعۃ، کتاب الطہارۃ۔)

کے اوپر سے ہاتھ پھیر لیا جس کو راوی نے کبھی مکمل نقل کرتے ہوئے: " **مسح بناصیته وعلی العمامة**".
ذکر کیا اور کبھی صرف عمامہ ذکر کر دیا۔

الحاصل مسح ربعِ رأس پر کیا گیا تھا۔ عمامہ پر مسح ادائے فرض کے لئے نہ تھا۔ علاوہ ازیں علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے مسح علی العمامۃ کی تمام روایات کو معلول قرار دیا ہے۔ فقط واللہ اعلم، محمد انور عفا اللہ عنہ، ۱۳۹۶/۱/۲۳ھ، الجواب صحیح: بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ (خیر الفتاویٰ: ۶۰/۲۔۶۱)

عمامہ یا ٹوپی وغیرہ پر مسح کرنے کا حکم:

سوال:۔ کیا متوضی عمامہ یا ٹوپی وغیرہ پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

مسح کا ثبوت خلاف القیاس ثابت ہے اس لئے صرف موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اس کے علاوہ عمامہ، ٹوپی اور برقع پر مسح کرنا جائز نہیں۔

لماقال الشیخ الدکتور وھبة الزحیلیؒ: "قال الحنفیةؒ: لایصح المسح علیٰ عمامة وقلنسوة وبرقع وقفازین لأن المسح ثبت بخلاف القیاس فلایلحق به غیره". (الفقه الإسلامی وأدلته، باب المسح، سادساً المسح علی العمامة: ج ۱ ص ۳۴۰) (۱) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۶۱۸)

وضو میں مسح بھول جائے تو کیا کرے:

سوال: اگر وضو کرتے وقت مسح بھول جائے تو پورا وضو کرنے کے بعد صرف مسح کرے یا وضو پھر سے دہرائے؟

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

مسح کر لینا کافی ہے، پورا وضو لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ (۲) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۴۴/۵)

---

(۱) قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالی: ولایجوزای لایصح المسح علیٰ عمامة وقلنسوة وبرقع وقفازین لأن المسح ثبت بخلاف القیاس فلایلحق به غیره". (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی، فصل المسح علی الخفین: (ج ۱ ص ۱۰۷) ومثله فی الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار، باب المسح علی الخفین (ج ۱ ص ۲۷۲)

(۲) "ومن ترک فرضاً" من وضوئه أوغسله غیرالنیة أو لمعة یقیناً أوظناً أوشکاً وکان غیرمستنکح وصلی بوضوئه أوغسله الناقص فرضاً ثم تذکره "أتی به" أی الفرض المتروک فوراً وجوباً بنیة تکمیل وضوئه أوغسله. (جواہر الاکلیل: ۱۶/۱، دارالمعرفۃ، بیروت) "ولوتوضأ ونسی مسح خفیه ،ثم خاض الماء فأصاب ظاهر خفیه وباطنها یجزیه من المسح، ولومشی فی الحشیش فابتل ظاهر الخف بالماء أو لابضر یجوز". (خلاصۃ الفتاویٰ، کتاب الطہارۃ، مسائل الخفین: ۲۸/۱، امجد اکیڈمی، لاہور۔

دوران وضو سر کا مسح یاد نہ رہا تو دوران نماز داڑھی کی تری سے مسح کا حکم:

سوال: اگر کوئی آدمی فرائض وضو میں سے ایک فرض یعنی مسح رأس کو بھول جائے پھر اس کو نماز کے ضمن میں یاد آجائے کہ میں نے مسح نہیں کیا تھا تو کیا وہ اپنی داڑھی کی تری سے نماز کے اندر ہی مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کر سکتا ہے تو اشکال یہ ہے کہ اس کی نماز کا بعض حصہ باوضو اور بعض بے وضو گزرا، تو یہ بناء صحیح علی الفاسد ہوئی۔ یہ درست نہیں۔

شق ثانی یعنی اگر نماز کے اندر مسح نہیں کر سکتا تو ان مندرجہ ذیل آثار کا صحیح محمل کیا ہے؟

(۱) عن أبی بکر بن عیاش عن مغیرة عن إبراهیم قال: إذا نسی أن یمسح رأسه وفی لحیته بلل فذکر وهو فی الصلوٰة فإن کان فی لحیته بلل فلیمسح رأسه.

(۲) عن حفص ابن غیاث عن عبد المالک عن عطاء قال: إذا نسی مسح رأسه فوجدفی لحیته بللاً أجزأه أن یمسح به رأسه .

(۳) عن أبی علیه عن یونس عن الحسن فی قوله فی الرجل یذکر فی الصلوة أنه لم یمسح رأسه وفی لحیته بلل قال یمسح رأسه من بلل لحیته.

(۴) یزید ابن هارون عن حماد بن سلمة عن قتادةعن فلاس فیمایعلم حمادعن علی قال:إذا توضأ الرجل فنسی أن یمسح برأسه فوجد فی لحیته بللاً أخذ من لحیته فمسح رأسه،فهذه الآثار مأثورة فی مصنف ابن أبی شیبه: ص ۱۷ .

ان آثار کا صحیح محمل بیان فرما کر اجر عظیم حاصل کریں؟ محمد انور کلیم لائکپوری، متعلم دورۂ حدیث، خیر المدارس، ملتان۔

الجواب

اثر ثانی و رابع میں ’’**تذکر فی الصلوٰة**‘‘ کی تصریح نہیں بلکہ مطلق تذکر ہے پس مفید نہیں۔ اور اول و ثالث میں یہ تصریح نہیں کہ ایسی صورت میں سابقہ نماز بھی درست ہوگی پس اشکال نہیں۔ ممکن ہے کہ مقصود یہ بتلانا ہو کہ اس صورت میں سارے وضو کا اعادہ نہیں بلکہ صرف مسح رأس کافی ہو جائے گا۔ اور اگر یہ تصریح مل جائے کہ صورت مذکورہ میں یہ ائمہ صحتِ صلوٰۃ سابقہ کے قائل ہیں تو اس میں تنگی نہیں۔ مسئلہ اجتہادی ہے۔ طہارت شرطِ نماز ہے۔ شروط کے لئے تقدم لازم نہیں جیسا کہ صوم، نیت متاخرہ من الشروع، سے بھی درست ہے بلکہ امام صاحب رحمہ اللہ تو آخر نماز کے بارے میں بھی جواز و صحت تاخیر نیت کے قائل ہوئے ہیں۔ یعنی اگر کسی نمازی نے تکبیر تحریمہ کے بعد نیت کر لی تو نماز درست ہو جائے گی۔ (بحر: ج۱ص۲۹۱) بندہ عبد الستار عفی عنہ۔

تیسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نسیان کی وجہ سے متروک مسح کو مؤثر اور مضر نہ سمجھا گیا ہو۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"رفع اللّٰه علی أمتی ثلثاً وذکر منها الخطاء والنسیان" یعنی تذکر سے قبل وضو کو بدیں وجہ درست تسلیم کیا گیا ہو کہ ترکِ مسح ناسیاً ہوا ہے اور نسیان معاف ہے، بنص حدیث۔ وجہ ہے کہ حدیثِ مذکور کی بنا پر امام شافعیؒ نماز میں کلام ناسیاً کو مفسد نہیں مانتے اور روزہ میں افطار ناسیاً کا مضر نہ ہونا تو اجماعی مسئلہ ہے۔ پس کوئی اشکال نہیں۔

چوتھی توجیہہ یہ بھی محتمل ہے کہ مسحِ مذکور سے مراد مسح زائد علی القدر المفروض یعنی (مسح سنت ہو) پہلے وضو میں مسح قدرِ مفروض جس کی ادنیٰ مقدار امام شافعیؒ کے نزدیک تین بال ہیں ہو چکا، پس اشکال نہیں۔ فقط۔ عبدالستار۔

پانچویں توجیہ یہ بھی محتمل ہے کہ اکثر اوقات شیطان نماز میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ تو نے مسح نہیں کیا۔ ایسی صورت میں دفع وسوسہ کے لئے داڑھی کی تری سے ہاتھ گیلا کر کے سر پر پھیر لے۔ اب یہ مسح دفعِ وسوسہ کے لئے ہوا نہ کہ تجدیدِ وضو یا اصلاحِ وضو کے لئے۔ فلا یرد علیه الإشکال. الأجوبة صحیحة، محمد عبد اللہ، غفراللہ لہ، مفتی خیر المدارس، ملتان۔ ۱۳۸۰/۴/۲۴ھ۔ (خیر الفتاویٰ: ۶۹/۲۔۷۰)

بال کے جوڑے پر مسح:

سوال: عورتیں بعض دفعہ سر کے اوپر پیچ کے حصے میں جوڑا باندھتی ہیں، اگر وہ اس جوڑے پر مسح کریں اور بال کھولیں نہیں، تو کیا وضو ہو جائے گا؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــ

وضو میں چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے، مسح کا تعلق اصل میں سر سے ہے نہ کہ بالوں سے، لہذا بال کے اس حصہ پر مسح کرنا ضروری ہے جو سر کے دائرہ میں واقع ہو۔ جوڑا کھولنے کے بعد اگر بال اتنا بڑا ہو کہ گردن اور اس کے نیچے آجائے تو بال کے اس حصہ پر مسح کرنا کافی نہیں:

"فلایصح المسح علی الذوائب المشدودة علی الرأس ...بحیث لوأرخاها لکانت مسترسلة". (۱)

ہاں؛ بال کا وہ حصہ جو خاص سر پر واقع ہو، اور بال کو نیچے گراتے وقت بھی سر ہی کے حصہ پر رہتا ہو، اگر وہ جوڑے کی شکل میں بندھا ہوا ہو، تو اس پر مسح کر لینا کافی ہوگا:

"أمالو کان تحته رأس فلاشک فی الجواز". (۲) (کتاب الفتاویٰ: ۴۵/۲)

چوتھائی سر کے مسح کی عادت ڈالنا:

سوال: جو شخص وضو میں صرف چوتھائی سر کے مسح پر اکتفا کرتا ہے اور کبھی سارے سر کا مسح نہیں کرتا تو اس کے

(۱۔۲) طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح: ۳۳۔

وضو کے اندر کچھ نقصان ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو یہ نقصان نماز تک پہونچے گا کہ صرف وہیں تک رہے گا؟

الجواب

ترک سنت ہے اس کا نماز تک یہ اثر ہوگا کہ اس کی صحت اختلافی ہوجائے گی، دوسرے اس سنت کے ترک سے طہارت میں نقصان رہے گا۔(۱) جس سے بعض جزئیات میں امامت کو مکروہ کہا ہے۔ **کما فی رد المحتار: ولعدم إمکان إکمال الطهارة أیضاً فی المفلوج والأقطع والمجبوب الخ.(ج ۱ /۵۸۷)والله أعلم**، ۲۹/ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ، تتمہ ثالث ۴۵۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/ ۳۶-۳۷)

کیا بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے؟:

سوال　ہمارے خطیب صاحب نے جمعہ کے دن مسئلہ بیان کیا کہ جو عورتیں ناخن پالش لگاتی ہیں ان کا وضو صحیح نہیں لہٰذا اگر وہ ایسے وضو سے نماز پڑھیں گی تو وہ کافر ہوجائیں گی کیوں کہ فقہاء کرامؒ نے فرمایا کہ بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے۔ تو کیا خطیب صاحب کا یہ مسئلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب

یہ درست ہے کہ اگر ناخن پالش لگی ہوئی ہو اور نیچے پانی نہ پہنچے تو وضو نہیں ہوگا اور ایسے وضو سے نماز بھی نہیں ہوگی۔ البتہ ان پر کفر کا حکم لگانا درست نہیں ہے۔ کیوں کہ بے وضو نماز پڑھنا اس وقت کفر ہے جب کہ بطور استخفاف ایسا کرے۔

وبهذا ظهر أن تعمد الصلوٰة بلا طهر غیر مکفر فلیحفظ وقد مر، آهـ (درمختار)(قوله وقد مر) أی فی أول کتاب الطهارة وقدمنا هناک عن الحلیة البحث فی هذه العلة وأن علة الإکفار إنما هی الاستخفاف. اهـ (شامیة: ۱/ ۱۸۵)فقط والله أعلم.

احقر محمد انور عفا اللہ عنہ، مفتی جامعہ خیر المدارس، ملتان (خیر الفتاویٰ: ۲/ ۴۷)

وضو میں تقاطر کا شرط ہونا:

سوال:　وضو کی صحت کے لئے تقاطر شرط ہے اور یہ مسئلہ ہے کہ اگر لمعہ رہ جاوے تو صرف تر کرنا کافی ہوتا ہے، پس اتنے عضو میں تقاطر نہ ہوا اس بنا پر وضو نہ ہونا چاہئے۔ ایسے ہی غسل ہے؟

الجواب

ایک عضو میں نقل بلہ وضو میں درست لکھا ہے اور غسل میں تمام بدن میں نقل بلہ صحیح ہے اور تقاطر کو اس میں شرط کیا ہے۔ **(وصح نقل بلة عضو إلیٰ) عضو(اٰخر فیه) بشرط التقاطر.(درمختار)صرح به فی فتح**

(۱)　طہارت میں نقصان رہنے کی وجہ سے فقہا نے بعض جزئیات میں، جیسے مفلوج، اقطع اور مجبوب کی امامت کو مکروہ فرمایا ہے۔ س

القدیر (قوله إلیٰ عضوآخر الخ) مفاده أنه لو اتحد العضو صح فی الوضوء أیضاً.(۱)اور شرط تقاطر سے معلوم ہوا کہ اس میں بھی تقاطر شرط ہے۔فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۱)

وضو کے متعلق تین مسئلوں میں تطبیق:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل تین مسائل کے بارے میں جو کہ میرے نزدیک ایک دوسرے کے متضاد ہیں، تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔

مسئلہ (الف) اگر کپڑے یا بدن پر نجاست لگ کر یاد نہ رہے اور کسی جگہ کا غالب گمان نہ ہو تو کپڑے یا بدن کو کہیں سے دھولیا جائے، سب پاک سمجھا جائے گا۔

مسئلہ (ب) وضو کے درمیان یا وضو کرنے کے بعد اگر کسی عضو کی نسبت نہ دھونے کا شبہ ہو لیکن وہ عضو معلوم نہ تو تو غالب گمان میں جو عضو یاد آوے تو اس کو دھوڈالے ورنہ پھر سے وضو کرے۔

مسئلہ (ج) وضو کے دوران اگر کسی عضو کے دھونے یا نہ دھونے میں شک ہو تو اگر یہ شک پہلی مرتبہ ہوا ہے اور ایسا شک پڑنے کی عادت نہیں ہے تو وہ عضو دھولے جس کے بارے میں شک ہوا ہے اور اگر ایسی عادت ہوگئی ہے تو اس کی پرواہ نہ کرے، جب تک گمان غالب نہ ہوجائے۔ (ردالمختار) ؟ بینوا توجروا۔ المستفتی اکرام الحق ڈی نمبر ۵۵۲، راولپنڈی، ۱۴/۵/۱۹۶۹ء۔

الجواب

مسئلہ اولیٰ، درمختار (ص ۳۰۱ جلد ا) میں مذکور ہے۔(۲) اور اس حکم کا محمل یہ ہے کہ یقین یا ظن غالب ہو، کہ یہاں نجاست ہے لیکن معین جگہ معلوم نہ ہو، اور مسئلہ ثانیہ وثالثہ، درمختار (ص ۱۱۱ جلد ا) میں مسطور ہے۔(۳) جو کہ فتاویٰ تتارخانیہ سے منقول ہے اور اس کا محمل شک اور تردد ہے نہ کہ یقین اور ظن غالب۔ **والفرق بین الشک والظن واضح.** (۴) فقط (فتاویٰ دیوبند پاکستان، المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم: ۴۷۔۴۸)

---

(۱) ردالمختار، کتاب الطهارت، أبحاث الغسل: ۱/۱۴۷۔ظفیر

(۲) قال العلامة الحصكفي رحمه اللّٰه:(وغسل طرف ثوب) أوبدن(أصابت نجاسة محلا منه ونسي)المحل(مطهرله وإن)وقع الغسل(بغيرتحرٍ)وهوالمختار.(الدرالمختارعلیٰ هامش ردالمحتار: ص ۲۴۰ جلد ا ،باب الأنجاس. انیس

(۳) قال ابن عابدين رحمه اللّٰه:(قوله شک في بعض وضوئه)أی شک في ترک عضومن أعضائه (قوله وإلالا)أی وإن لم يكن في خلاله بل كان بعدالفراغ منه وإن كان أول ما عرض له الشک أوكان الشک عادةً له، وإن كان في خلاله فلا يعيد شيئاً قطعاً للوسوسة عنه كما في التتارخانية وغيرها.(ردالمحتار: ص ۱۱۱ جلد ا ،مطلب في أبحاث الغسل.)

(۴) قال ابن عابدين رحمه اللّٰه:(قوله ظناً قوياً)أی غالباً، قال في البحرعن أصول اللامشي: إن أحدالطرفين إذا قوی وترجح على الآخرولم يأخذ القلب ماترجح به ولم يطرح الآخر فهوالظن، وإذاعقد القلب على أحدهما وترک الآخرفهوأكبرالظن وغالب الرأی.(ردالمحتارعلیٰ هامش الدرالمختار: ص ۱۸۱ جلد ا ،مطلب في الفرق بين الظن وغلبة الظن.)

سنن وضو

مسنون وضو کی ترکیب اور دعائیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اعضاء وضو مثلاً کلی کرنے، کان میں پانی ڈالنے، چہرہ دھونے، ہاتھ دھونے، مسح کرنے کے وقت دعائیں پڑھی جاتی ہیں وہ ہمیں یاد نہیں ہم سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی کیا صورت ہے؟ اگر آپ تکلیف اٹھا کر لکھ سکتے ہوں تو بڑی عنایت ہوگی، ہم آپ کے لیے دعا کریں گے۔

الجواب

کتب احادیث وکتب فقہ (شامی: ۱/۱۸۸، فتاویٰ عالمگیری: ۱/۶) میں وضو کی دعائیں موجود ہیں، احادیث اور فقہ کی عبارتیں پیش کرنے کے بجائے آپ کی سہولت کے لیے اردو کی معتبر کتاب ''ضمیمہ جدیدہ حصہ دوم عملیات مجربہ خاندان عزیزیہ'' سے نقل کیا جاتا ہے، کسی کو دعائیں یاد کرنے میں دشواری ہو تو یاد ہونے تک صرف درود شریف ہی پڑھ لینا کافی ہے، ان شاءاللہ۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''**ویصلی علی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بعدغسل کل عضو**''. (فتاویٰ عالمگیری: ص۶ / جلد۱) اب ضمیمۂ جدیدہ کی عبارت ملاحظہ کریں:

''ترکیب وضو مسنونہ''

عامل (نمازی) کو چاہیے کہ جب وضو کرے کامل کرے۔(۱)

(۱) وضو کی کل سنتیں ۱۶ ہیں، جو درج ذیل ہیں، یہ سنتیں الدر المختار مع رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۱۰۲ تا ۱۲۳ میں مذکور ہیں، (جن لوگوں نے اس سے کم یا بیش سنن کو لکھا ہے انہوں نے سنن میں مستحبات کو بھی شامل کیا ہے یا بعض سنن کو مستحبات میں شامل کیا ہے۔

(۱) وضو کی نیت کرنا (۲) اللہ کا نام لے کر شروع کرنا (۳) مسواک کرنا (۴) دھونے میں داہنے سے شروع کرنا (۵) ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے سرے سے دھونے کی ابتدا کرنا، اور سر کے مسح میں بھی پیشانی کی طرف سے ابتدا کرنا (۶) پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھونا (۷) پھر کلی کرنا (۸) ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا (۹) ہر عضو کے دھونے یا سر کا مسح کرنے میں ترتیب کو باقی رکھنا، یعنی پہلے ہاتھ گٹوں تک دھونا، پھر کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، چہرہ دھونا، دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا، سر کا مسح کرنا اور آخر میں دونوں پاؤں دھونا (۱۰) ہر عضو کو تین بار دھونا (۱۱) پورے سر کا مسح کرنا (۱۲) دونوں کانوں کا مسح کرنا (۱۳) ایک عضو کے سوکھنے سے پہلے دوسرے عضو کا دھونا (۱۴) مَل مَل کر دھونا (۱۵) منہ پر پانی زور سے نہ مارنا (۱۶) پانی استعمال کرنے میں اسراف وفضول خرچی نہ کرنا۔ (طہارت کے احکام ومسائل، مؤلفہ انیس الرحمٰن قاسمی صفحہ: ۱۰۹، ۱۱۰)

یعنی جب استنجا وغیرہ سے فارغ ہوتو قبلہ رو بلند جگہ پر بیٹھے، اول مسواک کرے، پھر یہ دعا پڑھے:

''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ تَسْوِیْکِیْ ھٰذَا تَمْحِیْصاً لِذُنُوْبِیْ وَمَرْضَاۃً لَّکَ یَارَبِّ بَیِّضْ بِہٖ وَجْھِیْ کَمَا تُبَیِّضُ بِہٖ اَسْنَانِیْ''.

فضائل مسواک میں ہے: مسواک کی دعا بنایہ میں درایہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسواک کرتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے:

''اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ فَمِیْ وَنَوِّرْ قَلْبِیْ وَطَھِّرْ بَدَنِیْ وَحَرِّمْ جَسَدِیْ عَلَی النَّارِ''.

اسی طرح علامہ نوویؒ نے شرح مہذب میں ایک دوسری دعا نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ دعا اگر چہ بے اصل ہے لیکن اچھی دعا ہے اس لیے اس کو پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے وہ دعا یہ ہے:

''اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ أَسْنَانِیْ وَشَدَّ بِہٖ لِسَانِیْ وَثَبِّتْ بِہٖ لَھَاتِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْہِ یَاأَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ''. (فضائل مسواک: ۲۷،۳۰ از مولانا اطہر حسین صاحب)

پھر نیت وضو کر کے یہ دعا پڑھے:

''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیَاطِیْنِ وَأَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ''.

پھر دونوں ہاتھ کلائی تک تین مرتبہ دھوئے اور انگلیوں میں خلال کرے اور پڑھے:

''اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُکَ الْیُمْنَ وَالْبَرَکَۃَ وَأَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشُّؤْمِ وَالْھَلَکَۃِ''.

پھر تین مرتبہ کلی کرے اور اس دعا کو پڑھے:

''اَللّٰھُمَّ أَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَتِلَاوَۃِ کِتَابِکَ''.

پھر تین بار ناک میں پانی ڈالے اور بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے ناک کے اندر کی آلائش کھجلا کر صاف کرے اور یہ دعا پڑھے:

''اَللّٰھُمَّ أَرِحْنِیْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ وَأَنْتَ رَاضٍ عَنِّیْ''.

پھر تین مرتبہ دونوں ہاتھوں سے منہ، بالوں کے اگنے کی جگہ سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور کنپٹیوں تک دھوئے اور یہ دعا پڑھے:

''اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ بِنُوْرِ وَجْھِکَ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہُ أَوْلِیَاءِ کَ، اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ بِنُوْرِ وَجْھِکَ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ''.

اگر داڑھی گنجان ہوتو انگلی سے خلال کرے انگلیوں کو ٹھوڑی کے نیچے داڑھی میں ڈال کر اوپر رخساروں کی طرف لے جائیں پھر داہنا ہاتھ کہنی سمیت تین مرتبہ دھوئے اور یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ أَعْطِنِیْ كِتَابِیْ بِيَمِيْنِیْ وَحَاسِبْنِیْ حِسَاباً يَسِيْراً".

پھر بایاں ہاتھ تین بار دھوئے اور یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ أَنْ تُعْطِيَنِیْ كِتَابِیْ بِشِمَالِیْ أَوْمِن وَّرَاءِ ظَهْرِیْ".

اگر انگشتری (انگوٹھی) ہاتھ میں ہوتو اس کو ہلا کر پانی پہونچائے پھر دونوں ہاتھوں کو تر کر کے تین تین انگلیاں دونوں ہاتھ کی خنصر اور بنصر و وسطیٰ یعنی چھنگلیاں اور اس کے پاس کی انگلی اور بیچ کی انگلی ملا کر اور دونوں انگوٹھے اور انگوٹھوں کے پاس کی انگلیاں الگ الگ کر کے پیشانی پر رکھ کر دماغ کے اوپر سے گدی تک لے جائے، پھر گدی سے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کانوں کے اوپر تک جو سر باقی رہے ملتا ہوا ماتھے تک لے جائے، اس ترکیب سے سارے سر کا مسح کرے، پھر یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ أَغِثْنِیْ بِرَحْمَتِکَ وَأَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَكَاتِکَ وَأَظِلَّنِیْ تَحتَ عَرْشِکَ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّظِلُّکَ".

پھر دونوں کانوں میں انگوٹھوں کے پاس کی انگلیاں اندر کی جانب سے کانوں کی کھائیوں میں سب طرف خوب پھیرے کہ کھائیاں کونوں کی تر ہو جائیں اور کانوں کی پشت پر انگوٹھوں کے شکم کا پانی ملے اس طرح کانوں کا مسح کرے پھر یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ".

پھر دونوں ہاتھوں کی پشت گردن پر ملے پھر یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ فَکَّ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِوَأَعُوْذُ بِکَ مِنَ السَّلاَسِلِ وَالْاَغْلاَلِ".

پھر داہنا پاؤں ٹخنوں سمیت تین دفعہ دھوئے بائیں ہاتھ کی چھنگلیاں سے خلال دونوں پیروں کی انگلیوں میں کرے مگر داہنے پیر کی چھنگلیوں سے شروع کرے اور بائیں پاؤں کی چھنگلیوں پر ختم کرے جب داہنا پاؤں دھوئے تو یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِیْ عَلَی الصِّرَاطِ يَوْمَ تَزِلُّ الْأَقْدَامُ فِی النَّارِ".

اور جب بایاں پاؤں دھو چکے تو یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ أَنْ تَزِلَّ قَدَمِیْ عَلَی الصِّرَاطِ يَوْمَ تَزِلُّ أَقْدَامُ الْمُنَافِقِيْنَ". (شامی:۱/۱۲۷، **مطلب فی مباحث الاستعانة فی الوضوء بالغیر**، عالمگیری:۱/۱۹، **الفصل الثانی فی المستحبات**، **طحطاوی علی مراقی الفلاح**: ۴۲، **فصل من آداب الوضوء أربعة عشر شیئاً**. میں دعا کے کلمات کچھ

مختلف ہیں جو یاد ہو پڑھ سکتا ہے۔)

اور جب وضو سے فراغت پائے تو کلمۂ شہادت پڑھے:

''أَشْهَدُأَنْ لَّآإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُأَنَّ مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''.

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو کوئی بعد وضو کے کلمۂ شہادت پڑھے گا اس کے واسطے بہشت کے آٹھوں دروازے کھولے جائیں گے کہ جس دروازے سے چاہے بہشت میں داخل ہو کلمۂ شہادت کے بعد یہ دعا پڑھے:

''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ الَّذِيْنَ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ''(۱)

نسائی شریف میں حدیث بیان کی ہے کہ جو شخص وضو کے بعد یہ دعا پڑھے گا حبط نہ ہوں گے پھر سورۂ قدر یعنی ''إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ '' پڑھے، پھر دو رکعت نفل تحیۃ الوضو پڑھے۔(ضمیمۂ جدیدہ حصہ دوم عملیات مجربہ خاندان عزیزیہ:۴۔۶)فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ جلد:۷/۱۳۷۔۱۳۹)

جماعت ہو رہی ہو تب بھی کامل وضو کرے یا سنن چھوڑ دے:

سوال: جماعت قریب ختم ہے تو فرائض وضوادا کر کے شریک ہونا بہتر ہے یا تمام سنن کو ادا کر کے تنہا نماز پڑھے؟

الجواب

سنن وضو کا پورا کرنا ضروری ہے اگر چہ جماعت ختم ہو جائے۔(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۱)

وضو کی سنتوں کی رعایت:

سوال:۔ایک صاحب جب مسجد پہنچے تو دیکھا کہ جماعت کھڑی ہو چکی ہے اور ابھی انہیں وضو بھی کرنا ہے، تو اب وہ

(۱) مزید دعائیں یہ ہیں: وضو کے آداب میں سے یہ ہے کہ ہر عضو کے دھوتے اور مسح کرتے وقت ''بِسْمِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى دِيْنِ الْإِسْلَامِ '' پڑھا جائے۔اسی طرح ہر عضو کے دھوتے وقت کلمۂ شہادت پڑھا جائے ''أَشْهَدُأَنْ لَّآإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُأَنَّ مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' ۔بایاں پاؤں دھوتے وقت یہ دعا بھی منقول ہے:''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ ذَنْبِیْ مَغْفُوْراً وَسَعْيِیْ مَشْكُوْراً وَتِجَارَتِیْ لَنْ تَبُوْرَ''۔ان دعاؤں کے ساتھ ہر عضو کے دھوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ وسلام بھی پڑھی جائے ''صلی اللّٰه علی النبی وسلم'' ۔طہارت کے احکام: صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹، ان دعاؤں کے لیے دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار:۱/۱۲۷، دارالفکر بیروت۔انیس

(۲) قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أسبغوا الوضوء، رواه مسلمؒ (مشکوٰۃ،باب سنن الوضوء،فصل اول)أی أتموه بإتيان جميع فرائضه وسننه أوأكملوا واجباته (مرقاۃ:۱/۳۱۰،ظفیر)

کیسے وضو کریں گے، کیا ایسی صورت میں سننِ وضو کو ترک کرنا لازم ہے اور صرف فرائضِ وضو پر اکتفا کرنا ضروری ہے، کیا ایسی صورت میں اگر کوئی سنن کی رعایت کے ساتھ وضو کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا؟

هو المصوب ــــــــــــــــ

حتی الامکان سنن کی پوری رعایت کرتے ہوئے ایسی صورت اختیار کریں کہ وضو جلد ہو جائے اور وضو کی سنتیں بھی ترک نہ ہوں اور جماعت بھی مل جائے۔(۱) اور اگر جماعت پانے کے لئے وضو کی کچھ سنتیں ترک ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تحریر: ناصر علی ندوی۔ (فتاویٰ ندوۃ العلماء: جلد ۱ صفحہ ۲۰۵)

کیا وضو کی سنت چھوٹنے سے نماز بھی مکروہ ہو جاتی ہے:

سوال: جیسے وضو کرنے میں مسواک کا کرنا سنت مؤکدہ ہے اور سنت کے چھوٹ جانے سے عمل وضو ناقص ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ وضو کرنے میں دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے تو یہ ناقص اور مکروہ صرف اس عمل کی حد تک رہتا ہے یا اس کا ناقص اور مکروہ ہونا نماز میں شامل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک صاحب نے بیان میں یوں کہا کہ جس کا وضو مکروہ اس کی نماز مکروہ، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو کی سنتیں ترک ہونے سے نماز تو مکروہ نہیں البتہ ثواب میں کمی ہوتی ہے۔(۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۲)

ابتداء وضو میں بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے:

سوال: کیا وضو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ضروری ہے اور کیا بغیر بسم اللہ پڑھے ہوئے وضو صحیح نہیں ہوگا؟

الجواب ــــــــــــــــ وباللّٰه التوفيق

---

(۱) فی الحديث: من ترک سنتي لم ينل شفاعتي، فترک السنة المؤكدة قريب من الحرام، قال ابن عابدينؒ تحت (قوله وفی الزيلعی): ومقتضاه أن ترک السنة المؤكدة مكروه تحريم لجعله قريباً من الحرام والمراد بها سنن الهدىٰ كالجماعة والأذان والإقامة فإن تاركها مضل ملوم والمراد الترک على وجه الإصرار بلاعذر. (رد المحتار على هامش الدر المختار: ۵/۲۳۷، انيس)

(۲) وحكمهما مايؤجر على فعله ويلام على تركه، وفی ردالمحتار: (ويلام) أی يعاتب -بالتاء- لايعاقب. (الدر المختار مع ردالمحتار: ۱/۱۰۴، مطلب فی السنة وتعريفها، سعيد، وكذافی البحر الرائق: ۱/۳۶، سنن الوضوء، رشيديه، وكذافی النهر الفائق: ۱/۲۵، سنن الوضوء، إمداديه)

وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔(۱)

چنانچہ درمختار میں ہے:"(وسننه)…………(البداية بالنية)…………(و)البداء ة (بالتسمية) الخ" (۲) یہ کہنا کہ بغیر بسم اللہ کے وضو صحیح نہیں خطا ہے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔عبداللہ خالد مظاہری،۲/۸/۱۴۰۲ھ(فتاویٰ امارت شرعیہ:۲/۹۹)

وضو میں اعوذ باللہ یا بسم اللہ پڑھنے کا حکم:

سوال: بہشتی زیور میں تحریر ہے کہ وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھے اور اکثر رواج ہے کہ بسم اللہ کے ساتھ اعوذ باللہ بھی پڑھ لیتے ہیں،بعض لوگ کہتے ہیں کہ وضو کرنے میں اعوذ باللہ پڑھنا بدعت ہے،صحیح حکم شرعی سے آگاہی بخشی جاوے؟

الجواب

فی رد المحتار: وقيل:الأفضل﴿ بسم الله الرحمٰن الرحيم﴾ بعد التعوذ، وفی المجتبٰی: يجمع بينهما آه(عن الفتح)وفی شرح الهداية للعينی:المروی عن رسول الله صلی الله عليه وسلم﴿ بسم الله، والحمد لله ﴾رواه الطبرانیؒ فی الصغيرعن أبی هريرةؓ بإسناد حسن آه.(۳)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ اعوذ باللہ و بسم اللہ کا جمع کرنا افضل ہے تو مذہب میں جس کو افضل کہا جاوے وہ بدعت کیسے ہوگا البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ (یعنی بسم اللّٰہ والحمد للّٰہ پڑھنے) کا اتباع زیادہ برکت کا عمل ہے۔(۴) ۱۰/جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ،تتمہ خامسہ ۳۶۱۔(امدادالفتاویٰ جدید:۱/۴۱)

(۱) نیت کے بعد وضو کی دوسری سنت پہلے "بسم الله العظيم والحمد لله علی دين الإسلام" یا "بسم الله الرحمٰن الرحيم" وغیرہ الفاظ میں اللہ کا نام لینا ہے(رد المحتار:۱/۱۰۹)جو وضو غفلت کے ساتھ اللہ کا نام لئے بغیر کیا جائے وہ ناقص و بے نور رہتا ہے،اگرچہ وضو ہوجاتا ہے مگر ایسی صورت میں جسم منور نہیں ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا کہ:

اے ابوہریرہ!جب تم وضو کرو تو بسم اللّٰہ والحمدللّٰہ پڑھ لیا کرو،جب تک تمہارا وضو باقی رہے گا اس وقت تک تمہارے محافظ فرشتے تمہارے لئے برابر نیکیاں لکھتے رہیں گے۔(طبرانی فی الصغیر)طہارت کے احکام و مسائل:۱۱۰،۱۱۱۔انیس)

عن أبی سفيان بن حويطب عن جدته عن أبيها قال: سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول:"لاوضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه"(ترمذی،باب فی التسمية عند الوضوء،ص۱۳،نمبر۲۵،أبو داؤد، باب فی التسمية علی الوضوء،ص۸،نمبر۱۰۱)

عن الحسن قال: "يسمی إذا توضأ، فإن لم يفعل أجزأه"، مصنف ابن أبی شيبه، باب فی التسمية فی الوضوء،جلد اول، ص ۱۲ ، نمبر ۱۸ ، انيس

(۲) الدر المختارعلیٰ هامش ردالمحتار:۱/۲۱۸۔۲۲۶

(۳) ردالمحتار:۱/۱۰۹، مطلب سائربمعنی باقی لابمعنی جميع ،بيروت،انیس

(۴) عن أبی هريرة قال : قال رسول اللّٰه صلی الله عليه وسلم:من توضأوذكراسم اللّٰه يطهرجسده كله،ومن توضأولم يذكراسم الله لم يطهرإلاموضع الوضوء۔(دار قطنی ج اول،باب التسمية علی الوضوء ،ص ۷۲ نمبر ۲۲۹ /سنن بيهقی ج اول ،باب التسمية علی الوضوء ،ص ۴۴،نمبر ۲۰۰ /مصنف ابن أبی شيبة،ج اول نمبر۱۷ ،انيس

وضو سے قبل اعوذ باللہ پڑھنا:

سوال: وضو سے قبل اعوذ باللہ الخ تک پڑھنا مستحب و جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ـــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے، بسم اللہ سے قبل اعوذ باللہ پڑھنے کا بھی ضعیف قول ہے راجح یہ ہے کہ نہ پڑھے۔"**قال فی الشامية: وقيل: الأفضل ﴿بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم﴾ بعدالتعوذ، وفی المجتبٰی: يجمع بينهما.** (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۹۱ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۱۰)

وضو کے درمیان بسم اللہ اوله وآخره پڑھنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص وضو کے شروع میں **بسم اللّٰه الرحمن الرحيم** پڑھنا بھول جائے تو درمیان وضو میں **بسم اللّٰه أوله و آخره** پڑھنے سے سنت ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــ

جب وضو کے شروع میں بسم اللہ بھول گیا اور درمیان میں پڑھ لی تو سنت ادا نہ ہوگی لیکن پڑھ لینا چاہیے تاکہ بقیہ وضو میں سنت کی برکت حاصل ہو جائے یا پھر شروع سے بسم اللہ پڑھ کر وضو کرے۔ ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح میں ہے: **وقال ابن همام: نسی التسمية فذكرهافی خلال الوضوء فسمی لاتحصل السنة بخلاف نحوه فی الأكل كذافی الغاية معللاً بأن الوضوء عمل واحد بخلاف الأكل.** (۲)

البحر الرائق میں ہے: **ولونسی التسمية فی ابتداء الوضوء ثم ذكرها فی خلاله فسمی لاتحصل السنة بخلاف نحوه فی الأكل كذافی التبيين معللاً بأن الوضوء عمل واحد بخلاف الأكل فإن كل لقمة فعل مبتدأ. لهذاذكرفی الخانية لوقال كلما أكلت اللحم فللّٰه علی أن أتصدق بدرهم فعليه بكل لقمة درهم لأن كل لقمة أكل. لكن قال المحقق ابن همام هوإنمايستلزم فی الأكل تحصيل السنة فی الباقی لااستدراک مافات. وظاهره مع ماقبله أنه إذانسی التسمية فإتيانه بها وعدمه مع أن ظاهرمافی السراج الوهاج أن الإتيان بهامطلوب ولفظه: فإن نسی التسمية فی أول الطهارة أتی بهاإذاذكرهاقبل الفراغ حتی لايخلوالوضوء منها.** (۳)

شامی میں ہے: **قوله (وأماالأكل) أی إذا نسيها فی ابتدائه واعلم أن الزيلعی ذكرأنه لاتحصل**

---

(۱) ردالمحتار: ۱/۱۰۱، مطلب سائربمعنی باقی لابمعنی جميع) (ردالمحتار: ۱/۱۰۹، بیروت، انیس

(۲) مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح: ۲/۱۵۵ ۴

(۳) البحرالرائق: ۱/۶۴

السنة فی الوضوء وقال بخلاف الأکل لأن الوضوء عمل واحد، بخلاف الأکل فإن کل لقمة فعل مبتدأ،......ولا یمکن الاستدراک فی الوضوء بقوله بسم اللّٰہ أوله وآخره، لأن الحدیث وارد فی الأکل ولا حدیث فی الوضوء .شامی : ۱۱۸/۱ .(۱)

طحطاوی علی الدر میں ہے: **وکمافی ابتداء الوضوء (قبل الاستنجاء وبعده) إلا حال انکشاف وفی محل نجاسة فیسمی بقلبه، ولو نسیها فسمی فی خلاله لاتحصل السنة، بل المندوب، کمافی السراج الوهاج ولفظه: إذانسی التسمیة فی أول الطهارة أتی بها إذا ذکرها قبل الفراغ حتی لایخلوالوضوء منها، فما فی أکثرالکتب من عبارة تدل علی عدم الإتیان بها ممالاینبغی وکمافی ابتداء الأکل... الخ.** (۲) واللہ اعلم (فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلداول:۵۰۷-۵۰۸)

وضو میں بسم اللہ بھول جانے کا حکم:

سوال: ایک شخص وضو کر رہا تھا تسمیہ بھول گیا درمیان وضو یاد آیا اس نے پڑھ لیا اسکو تسمیہ پڑھکر وضو کرنے کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

نہیں۔ ”**نسی التسمیة فذکرها فی خلال الوضوء فسمی لا یحصل السنة بخلاف نحوه فی الأکل لأن الوضوء عمل واحد بخلاف الأکل لأن کل لقمة عمل مستأنف**“ (۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی۔ (حبیب الفتاویٰ:۴/۴۵)

مسواک کا حکم:

سوال: کیا مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے؟

الجواب ـــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

ہاں مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ (۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۴۷)

(۱) ردالمحتار، سنن الوضوء، ۱/۱۰۹، بیروت، انیس۔
(۲) طحطاوی علی الدر المختار : ۱/ ۵.
(۳) کما فی فتح القدیر :۱/۴۴۔

۱۔ ہر وضو میں کلی کرنے سے پہلے مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۳) اگر کوئی مسواک نہ کرے گا تو گنہ گار ہوگا۔
۲۔ وضو کے علاوہ دیگر مواقع جیسے دانتوں کا رنگیلا ہو جانے، منھ میں بدبو پیدا ہونے، نیند سے بیدار ہونے، نماز کے لیے جانے (جب کہ وضو اور نماز میں فصل ہو) قرآن مجید کی تلاوت کرنے، گھر میں داخل ہونے، مجمع عام وخاص میں جانے بلکہ دیگر تمام اوقات میں مسواک کرنا مستحب ہے۔ (رد المحتار مع الدر المختار:۱/۱۱۳-۱۱۴) (طہارت کے احکام ومسائل:۱۷۰، انیس)

==

وضو میں مسواک سنت مؤکدہ ہے یا محض سنت:

سوال: وضو میں مسواک سنت مؤکدہ ہے یا محض سنت؟

الجواب

وضو میں مسواک سنت مؤکدہ ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی:۲۶۵/۲)

مسواک مسنون کے فوائد کی تفصیل:

سوال: علماء کرام سے سنا ہے کہ مسواک کرنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔اور اس کے فوائد کے بارے میں علما فرماتے ہیں کہ اس کے ستر فائدے ہیں اور جب شمار کرتے ہیں تو دو چار فوائد ہی بیان کرتے ہیں آگے کچھ نہیں فرماتے۔دوسرے فوائد کیا کیا ہیں۔

اسی طرح بعض کتب میں بھی جب مسواک کے فوائد کا بیان آتا ہے تو وہاں پر بھی چند ہی فوائد بیان کرتے ہیں۔تو عرض یہ ہے کہ اگر پورے ستر فوائد جو کہ بیان کئے جاتے ہیں کہیں ثابت ہوں تو باحوالہ پورے کے پورے ہی تحریر فرمائیں۔بینوا توجروا۔المستفتی: قاری سیف اللہ خالد قادری، لاہور

الجواب

بلا شبہ مسواک میں بہت ہی فوائد ہیں۔عارف باللہ حضرت شیخ احمد زاہد رحمہ اللہ نے ان پر مستقل ایک تصنیف لکھی ہے۔جس کا نام "تحفة السلاک فی فضائل السواک" ہے۔علامہ سید احمد طحطاوی رحمہ اللہ نے ان میں سے تقریباً ساٹھ حاشیہ مراقی الفلاح میں نقل کئے ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱: مسواک کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

== (السواک) سنة مؤكدة ......عندالمضمضة، وقيل قبلها،وهوللوضوء عندنا إلا إذا نسيه فيندب للصلوٰة (الدرالمختار: ۱/ ۱۱۳، ۱۱۴،سنن الوضوء. كذافي الفقه الإسلامي وأدلته: ۱/ ۴۵۴،المبحث الثاني السواک.المحيط البرهاني: ۱/ ۴۲، الفصل الأول في الوضوء.)

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال:"لولا أن أشق على المؤمنين و في حديث زهير:على أمتي لأمرتهم بالسواک عند كل صلوة . (مسلم شریف، باب السواک، ص۱۲۳، نمبر۲۵۲/۵۸۹/ترمذی شریف، باب ماجاء فی السواک، ص۷، نمبر۲۲ / بخاری شریف، باب السواک، ص۴۵، نمبر۲۴۴/سنن للبیہقی ، باب الدليل على أن السواک سنة ليس بواجب ، جلد اول ص۵۷، نمبر۱۴۶/سنن للبیہقی، باب الاستیاک بالأصابع، ج اول، ص۶۶، نمبر۱۷۶، انیس)

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت مشقت میں پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر وضو کے وقت مسواک کرنے کا حتمی حکم دیتا۔(صحیح بخاری ومسلم)

(والسواک)سنة مؤكدة كمافي الجوهرة عند المضمضة. (الدرالمختار مع ردالمحتار:۱/۱۱۳، انیس)

۲: اس پر ہمیشگی کرنے سے غناء اور رزق میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

۳: منہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔

۴: بلغم کی زیادتی میں فائدہ مند ہے۔

۵: اس سے دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

۶: بینائی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۷: قوت فصاحت بڑھتی ہے۔

۸: اس کی مداومت بوقتِ وفات شہادتین یاد دلاتی ہے۔

۹: لحد میں وحشت دور کرتی ہے۔

۱۰: اعمال کے ثواب کو بڑھاتی ہے۔

پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے ''طحطاوی'' ص ۳۸۔(۱) فقط واللہ اعلم، احقر محمد انور عفا اللہ عنہ مفتی جامعہ خیر المدارس، ملتان، ۲/۲/۱۴۱۱ھ۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۸۸-۸۹)

مسواک کے کچھ مستحبات:

سوال: مسواک کتنی موٹی اور لمبی ہو، پیلو کے علاوہ اور کس چیز کی مسواک بنائی جاسکتی ہے؟

الجواب

مسواک کے بارے میں مسنون ہے کہ نرم ہو، لکڑی میں گرہ نہ ہو، لمبائی ایک بالشت ہو، موٹائی انگلی کے بقدر ہو،

(۱) مسواک کے مزید فوائد درج ذیل ہیں: ۱۔ مسواک سے منہ صاف ہوتا ہے۔ ۲۔ دانت سفید رہتے ہیں۔ ۳۔ منہ کی گندگی اور بدبو دور ہوتی ہے۔ ۴۔ کھانا ہضم ہوتا ہے۔ ۵۔ معدہ قوی ہوتا ہے۔ ۶۔ پت ختم ہوتا ہے۔ ۷۔ دانتوں کا درد دور ہوتا ہے۔ ۸۔ دماغ کی رگیں ٹھیک رہتی ہیں۔ ۹۔ ملائکہ کو خوشی ہوتی ہے۔ ۱۰۔ روح آسانی سے نکلتی ہے۔ ۱۱۔ شیطان اس سے ناراض ہوتا ہے۔ ۱۲۔ بالوں میں سفیدی اور بڑھاپا دیر سے آتا ہے۔ ۱۳۔ تکلیف دور ہوتی ہے۔ ۱۴۔ پل صراط پر چلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ۱۵۔ موت کے علاوہ بہت ساری بیماریوں سے شفا ہوتی ہے (ردالمحتار: ۱/۱۱۵) ۱۶۔ بدن کو طاقت ملتی ہے۔ ۱۷۔ قوتِ حافظہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ۱۸۔ عقل بڑھتی ہے۔ ۱۹۔ فرشتے مسواک کرنے والے سے مصافحہ کرتے ہیں۔ ۲۰۔ اور جب نماز کے لئے نکلتا ہے تو فرشتے اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ ۲۱۔ اور جب مسجد سے نکلتا ہے تو حاملینِ عرش اس کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ ۲۲۔ انبیاء کرام اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ ۲۳۔ مسواک کرنے والے کو نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں ملے گا۔ ۲۴۔ قبر میں وسعت ہوتی ہے۔ ۲۵۔ جنت کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ ۲۶۔ جہنم کے دروازے اس پر بند رہتے ہیں۔ ۲۷۔ دنیا سے پاک وصاف جاتا ہے۔ ۲۸۔ حوضِ کوثر سے اس کو پینا نصیب ہوگا۔ ۲۹۔ دنیا میں زیادتی اولاد اور مال کا باعث ہے۔ ۳۰۔ ضرورتیں پوری کرنے میں معاون ہے۔ ۳۱۔ خوشحالی آتی ہے۔ ۳۲۔ تحصیل رزق میں سہولت ہوتی ہے۔ ۳۳۔ نماز کا ثواب ننانوے درجہ سے چار سو درجہ تک بڑھ جاتا ہے۔ ۳۴۔ جسم کی بیجا گرمی دور ہوتی ہے۔ ۳۵۔ کمر اور پشت مضبوط ہوتا ہے۔ ۳۶۔ اللہ کی اطاعت میں بدن کو قوی بناتا ہے (طحطاوی: ۱/۳۸) طہارت کے احکام ومسائل صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۳، انیس الرحمٰن قاسمی)

پیلو یا کسی کڑوے درخت کی ہو، کہ طبی اعتبار سے ایسی لکڑی کی مسواک زیادہ بہتر ہے۔

”والمستحب أن یکون لیناً من غیر عقد فی غلظ الأصبع وطول شبر من الأشجار المرّة المعروفة. (۱) فقط (کتاب الفتاویٰ:۲/۳۷)

مسواک اور مسواک کا طریقہ:

سوال: مسواک کس طرح کرنا چاہئے؟ مسواک کیسی ہو؟ اور مسواک رکھتے ہوئے اسے کیسے پکڑا جائے؟

الجواب

مسواک کے سلسلے میں بہتر ہے کہ نرم ہو، لکڑی میں جوڑ نہ ہو انگلی کے بقدر موٹی ہو، ایک بالشت لمبی ہو، پیلو کی ہو، یا کسی کڑوی لکڑی کی ہو، مسواک کا طریقہ یہ ہے کہ دانت کے اوپری حصہ پر بھی کیا جائے، اور نچلے حصہ پر اور ڈاڑھوں پر بھی، دائیں جانب سے مسواک کی ابتدا کرے، کم سے کم تین بار نیچے پانی کے ساتھ مسواک پھیرنی چاہئے، مسواک چوڑائی میں یعنی دائیں حصہ سے بائیں حصہ کی طرف کرنی چاہئے، طول میں مسواک کرنا بہتر نہیں، کہ اس سے مسوڑھے زخمی ہو سکتے ہیں، مستحب ہے کہ مسواک کو دائیں ہاتھ سے پکڑا جائے اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو مسواک کے نیچے حصہ میں اور انگوٹھے کو اگلے حصہ میں مسواک کے نیچے اور باقی تینوں انگلیوں کو مسواک کے اوپر رکھ کر مسواک کی جائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی طریقہ مروی ہے، (۲) لیٹی ہوئی حالت میں مسواک کرنا مکروہ ہے، اسی طرح اگر قئ کا اندیشہ ہو تو مسواک نہیں کرنی چاہئے، مسواک کے بارے میں یہ تمام تفصیلات مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے تحریر فرمائی ہے۔ (۳) فقط (کتاب الفتاویٰ:۲/۳۸)

---

(۱) البحر الرائق: ۱/۲۰.

(۲) البحر الرائق:۱/۴۲، کتاب الطہارۃ، مرتب۔

(۳) البحر الرائق:ص۲۰و۲۱۔

مسواک پکڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے اس طرح پکڑا جائے کہ چھنگلی مسواک کے نیچے ہو اور انگوٹھا اس کے سرے میں نیچے ہو اور باقی انگلیوں سے اوپر کی سطح پکڑا جائے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴)

۱۔ اس مسنون طریقہ کے خلاف مسواک مٹھی میں نہ پکڑنی چاہیے کیوں کہ اس سے بواسیر کی بیماری ہوتی ہے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴۔ رواہ أبو داؤد)

۲۔ مسواک کرنے سے پہلے اور مسواک کرنے کے بعد پانی سے دھولینا چاہیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کرتے پھر مجھے دھونے کے لیے دیدیتے تھے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴)

دھوکر نہیں رکھنے سے شیطان اس کو استعمال کرتا ہے، اور کیڑے بھی اس میں منہ لگاتے ہیں۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴۔ الطحطاوی:۳۸)

۳۔ مسواک بیٹھ کر کرنی چاہیے، لیٹ کر ہرگز نہیں کرنی چاہیے لیٹ کر مسواک کرنی مکروہ ہے۔ اوراس سے تلی بڑھنے کا مرض بھی ہوتا ہے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴)

==

مسواک کی لکڑی:

سوال: وضو میں مسواک کے لیے کونسی لکڑی استعمال کی جائے؟ رات کو سونے کے وقت اور بوقت قیلولہ تیمّم کر لینا کافی ہوگا یا نہیں؟ کس کروٹ سونا چاہیے مسنون کیا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــ

وضو میں مسواک کسی لکڑی کی ہو جائز ہے، مگر وہ لکڑیاں جن میں کڑواہٹ یا بکھٹا پن ہو وہ مفید تر ہوتی ہیں اس لیے ان کا استعمال انسب ہے، پیلو کی مسواک سب سے افضل ہے، مگر دوسری لکڑیاں بھی جائز ہیں، (۱) شب کو اور قیلولہ کے وقت میں اگر ممکن ہو تو وضو ورنہ تیمّم کر کے سوئیں، لیٹنے کے لیے یہ ہے کہ داہنی کروٹ پر قبلہ رو لیٹیں یہ حالت ابتدائی ہے، پھر جس طرح بھی انسان کروٹ بدل لے گا جائز ہوگا۔ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد:۱، م:۲۹، صفحہ:۸۳) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ:۲/۷۷)

مسواک کس لکڑی کی ہو:

سوال: وضو کرتے وقت مسواک کس لکڑی کی استعمال کرنی چاہئے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــ

وضو میں مسواک کسی لکڑی کی ہو جائز ہے۔ مگر وہ لکڑیاں جن میں کڑواہٹ یا بکھٹا پن ہو وہ مفید تر ہوتی ہیں اس لئے

== ۴۔ مسواک دانتوں کی چوڑائی میں پہلے داہنے طرف پھر بائیں طرف کرنی چاہیے اور کم از کم تین بار دانتوں پر پھیرنی چاہیے اور ہر بار مسواک کو نئے پانی میں تر کرنا چاہیے، پہلے اوپر کے دانتوں کو پھر نیچے کے دانتوں کو صاف کرنا چاہیے مگر تین بار میں دانتوں کی صفائی کا یقین نہ ہو تو اتنی دیر تک صاف کرنا چاہیے جس سے اطمینان ہو جائے کہ دانت کی گندگی اور بدبو زائل ہوگئی ہے۔ (شرح مسلم للنووی)

۵۔ دانتوں کے ساتھ مسواک سے زبان کو بھی ہلکے سے رگڑنا چاہیے اور دانتوں کو اندر اور باہر دونوں طرف سے اسی طرح دانتوں کے درمیان اگر دراڑ ہو تو اس کو اور دانت کے نوک کو بھی صاف کرنا چاہیے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴)

۶۔ داڑھوں کی کرسیوں اور اوپر والے حصے تالو وغیرہ پر بھی نرمی سے مسواک پھیرنی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک کرنے کی کیفیت کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ:

میں آپ کی خدمت میں گیا تو دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں مسواک ہے اور اسے منھ میں ڈالے ہوئے اُع اُع کر رہے ہیں گویا آپ قئے کر رہے ہوں۔ (شرح مسلم للنووی)

۷۔ مسواک کرنے پر پہلی بار جو رال منھ میں آئے (بشرطیکہ خون نہ آئے) اس کو نگلنے سے جذام وبرص اور ہر طرح کی بیماریوں سے شفا ہوتی ہے۔ البتہ دوسری بار کا لعاب تھوک دینا چاہیے کیوں کہ اس کے نگلنے سے وسوسہ کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴)

۸۔ مسواک چوسنا بھی نہیں چاہیے، اس سے آنکھ کی بینائی ختم ہونے کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ (ردالمحتار:۱/۱۱۴) (طہارت کے احکام ومسائل:۱۶۵۔۱۶۶)

(۱) و المستحب أن يكون ليناً من غير عقد فى غلظ الأصبع وطول شبر من الأشجار المرّة المعروفة. البحر الرائق:۱/۲۰، وفى النهر: ويستاك بكل عود إلا الرمان والقصب، وأفضله الإراك ثم الزيتون (شامی: ج۱ص۱۱۵) انیس

ان کا استعمال انسب ہے۔ پیلو کی مسواک سب سے افضل ہے مگر دوسری لکڑیاں بھی جائز ہیں (شامی میں ہے کہ پیلو کی مسواک افضل ہے اس کے بعد زیتون کا درجہ ہے۔ وأفضله الإراک ثم الزیتون (شامی ج۱ص۱۱۵) ومثله فی الطحطاوی علی المراقی، ص:۳۷. (مکتوبات: ج۱ص۶۷) (۱) (فتاویٰ شیخ الاسلامؒ: ص۱۸)

بانس کی قمچی سے مسواک کا حکم:

سوال: بانس کی قمچی سے مسواک کرنا کیسا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

بظاہر تو مضر ہے کہ زبان اور مسوڑھوں کو نقصان دے گی اور زخمی کر دے، مسواک کی بڑی منفعت فوت ہو جائے گی۔ (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۴۸/۵)

مسواک کی مقدار کیا ہے:

سوال: مسواک کی مقدار کیا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ

درمختار میں ہے کہ مسواک کی مقدار میں ایک بالشت ہونا مستحب ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دراصل اس کی کچھ تحدید نہیں

---

(۱) مسواک کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہترین مسواک مبارک پودا زیتون کی ہے، وہی میری مسواک ہے، اور وہ مجھ سے پہلے انبیاء کرام کی مسواک ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریحان (پھول) لکڑی کے مسواک سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ یہ جذام کی رگوں کو حرکت دیتا ہے۔ (ردالمختار: ۱۱۵/۱)

۱۔ ان احادیث کی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ ہر طرح کے پھولوں کی ڈالی کی مسواک بنانا مکروہ ہے۔ بانس کی مسواک بھی نہیں کرنی اور زہریلی لکڑیوں کی مسواک حرام ہے۔ (ردالمختار: ۱۱۵/۱)

۲۔ بلکہ افضل مسواک اراک (پیلو) اور زیتون کی ہوتی ہے ہمارے یہاں نیم اور کیکر کی مسواک بھی مفید سمجھی جاتی ہے۔

۳۔ مسواک زیادہ موٹی اور بڑی نہیں ہونی چاہیے، اس کی لمبائی ایک بالشت اور موٹائی کنگلی کے بقدر ہونی چاہیے البتہ اگر مسواک کرنے اور کانٹ چھانٹ سے بعد میں وہ چھوٹی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن ابتداء میں ایک بالشت سے زیادہ لمبی نہ ہو۔ (ردالمختار: ۱۱۵/۱)

۴۔ مسواک کو نرم ہونا چاہیے اور اس میں کجی یا گرہیں زیادہ نہ ہوں مگر زیادہ نرم بھی نہ ہو کہ استعمال کرتے وقت مڑ جائے اور نہ ہی ایسی سخت ہو مسوڑھے چھل جائیں جیسے بانس کی مسواک۔ (ردالمختار: ۱۱۴/۱) (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۶۴، انیس

(۲) اس لیے بانس کی قمچی سے مسواک نہ کی جائے۔ ویصح بکل عود إلا الرمان والقصب لمضرتهما الخ (حاشیة الطحطاوی: ۶۷/۱، کذافی ردالمحتار: ۱۱۵/۱، بیان سنن الوضوء، الحلبی الکبیر: ص۳۳، بیان فضیلة السواک

ہے جس قدر بھی کارآمد ہوسکے کافی ہے البتہ علمانے ابتداءً ایک بالشت ہونا پسندیدہ کہا ہے۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۳۰)(۲)

مسواک ابتدا میں ایک بالشت ہونا مستحب ہے:

سوال: ایک بالشت سے کم شروع میں مسواک کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــ باسم ملهم الصواب

شروع سے ہی ایک بالشت سے کم مسواک بنانا خلاف استحباب ہے، استعمال کے بعد کم ہوجائے تو کچھ حرج نہیں۔ ”**لما في العلائية: (و) ندب إمساكه (بيمناه) وكونه ليناً، مستوياً بلاعقد، في غلظ الخنصر وطول شبر، وفي الشامية: (قوله وطول شبر) الظاهر أنه في ابتداء استعماله، فلايضر نقصه بعدذلك بالقطع منه لتسويته، تأمل، وهل المراد شبر المستعمل أو المعتاد؟ الظاهر الثاني لأنه محمل الإطلاق غالباً (ردالمحتار: ۱/۱۰۷، قبيل مطلب في منافع السواك)** فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۷/رجب ۸۸ھ۔ (احسن الفتاویٰ: ۲/۱۵)

مسواک کتنی موٹی ہونی چاہیے:

سوال: کیا مسواک کی موٹائی چھنگلیاں کی موٹائی کے برابر ہونا بہتر ہے یا اس کی موٹائی اس سے کم نہ ہو زیادتی کی مقدار کا تعین کریں؟

الجواب ــــــــــــ حامداًو مصلياً

مستحب اسی کو لکھا ہے، کسی قدر اور موٹی ہوجائے تب بھی اس کو ناجائز یا مکروہ نہیں کہا جائے گا۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۷-۴۸)

(۱) ثم المستحب أن يكون السواك من شجرة الخ وأن يكون طول شبر في غلظ الخنصر (غنية المستملي: ۳۲) (والسواك) الخ وكونه ليناً، مستوياً بلاعقد، في غلظ الخنصر وطول شبر الخ ولايزادعلى الشبر الخ (درمختار) قوله طول شبر: الظاهر أنه في ابتداء استعماله فلايضر نقصه بعدذلك بالقطع منه لتسويته، تأمل، وهل المراد شبر المستعمل أو المعتاد؟ الظاهر الثاني لأنه محمل الإطلاق غالباً (ردالمحتار، كتاب الطهارة، سنن الوضوء: ۱/۱۰۶-۱۰۷) (الدرمع الرد: ج۱ص۱۱۳ تا ۱۱۵، بیروت، انیس) اس سے معلوم ہوا کہ بالشت سے کم ہوتو جائز ہے بالشت سے زیادہ لمبی ہونا اچھا نہیں، واللہ اعلم۔ ظفیر۔

(۲) أيضاً: فتاویٰ محمودیہ ۵/۴۷۔

(۳) (و) ندب إمساكه (بيمناه) وكونه ليناً، مستوياً بلاعقد، في غلظ الخنصر وطول شبر، وفي الشامية: (قوله وطول شبر) الظاهر أنه في ابتداء استعماله، فلايضر نقصه بعدذلك بالقطع منه لتسويته، تأمل، وهل المراد شبر المستعمل أو المعتاد؟ الظاهر الثاني لأنه محمل الإطلاق غالباً (ردالمحتار: ۱/۱۰۷، قبيل مطلب في منافع السواك، بيان سنن الوضو. كذافي الحلبي الكبير/۳۳، بيان فضيلة السواك، الفتاوىٰ التاتارخانية ۱/۱۰۷، الوضوء - ويصح بكل عود إلاالرمان والقصب لمضرتهما وأن يكون طول شبر مستعملة لأن الزائد يركب عليه الشيطان. (حاشية الطحطاوى علىٰ مراقى الفلاح: ۶۷/)

مسواک چبانے کا حکم:

سوال:۔مسواک استعمال کرتے وقت اگر مسواک کو نرم کرنے کے لئے دانتوں سے چبایا جائے تو کیا از روئے شرع یہ عمل جائز ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

مسواک کو دانتوں سے باریک کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں اور سنت کی ادائیگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ طبّی لحاظ سے مسواک کے چوسنے سے قوتِ بینائی متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے مسواک کا چوسنا مناسب نہیں۔

كما أخرجه البخاريؒ:عن عائشةؓ......فأخذت السواك فقضمته ونفضته وطيّبته ثم دفعته النبي صلى الله عليه وسلم.(صحيح بخارى: ج۲ ص۶۳۸ باب وفات النبى صلى الله عليه وسلم)

قال الحصكفيؒ: ولا يمصه فإنه يورث العمىٰ،(الدر المختار علىٰ صدر رد المحتار،سنن الوضوء: ج۱ ص۱۱۴)(أخرجه الزيلعيؒ:عن عائشةؓ قالت: ......فأخذت السواك فقضمته وطيبته ثم دفعته إلىٰ رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم.(نصب الراية: ج۱ ص۸۱،أحاديث السواك)قال الشيخ عبدالحي اللكهنويؒ:لا يمص السواك فإنه يورث العمىٰ.(السعاية: ج۱ ص۱۱۹،باب سنن الوضوء)(۱) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۰و۵۰۱)

پیر کی انگلی اور انگوٹھے سے مسواک پکڑنا:

سوال: وضو کے وقت مسواک کرنے کے بعد مسواک کو پیر کے انگوٹھے اور اس کے بعد کی انگلی کے درمیان دبا لینے کو مسنون کہتے ہیں اس کی سند ہے یا نہیں اگر ہے تو کہاں ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

میں نے اس کا مسنون ہونا کہیں نہیں دیکھا جو لوگ مسنون کہتے ہیں ان سے ہی سند دریافت کی جائے۔فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔حررہ العبد محمود گنگوہی عفی اللہ عنہ، معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور، ۵/صفر المظفر ۱۳۷۱ھ۔الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ، ۷/صفر المظفر ۱۳۷۱ھ۔(فتاویٰ محمودیہ:۷۶/۵)

مسواک کس وقت کی جائے:

سوال: مسواک کس وقت کرنی چاہئے۔قبل دوپہر یا بعد۔چوں کہ مسواک سے بو زائل ہوجاتی ہے۔وہ حق تعالیٰ کو پسند ہے؟

---

(۱) ومثله فى مرقاة شرح مشكوٰة: ج۱۱ ص۲۳۸،باب وفات النبى صلى الله عليه وسلم الفصل الأول.

الجواب ـــــــــــــــــــ

حنفیہ کے نزدیک رمضان شریف میں بھی ہر ایک وضو میں مسواک مستحب ہے۔(۱) روزہ میں بعد زوال کے ظہر اور عصر میں بھی مستحب ہے کیوں کہ وہ خلوف جو حق تعالیٰ کو پسند ہے بعد مسواک کے بھی رہتا ہے۔(۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱/۱۳۰)

کھڑے ہو کر مسواک کرنا:

سوال: چلتے پھرتے یا کھڑے ہونے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسواک کرنا ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیو بند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۴۹)

مسواک کے ساتھ کلی کرنے کا طریقہ اور تین بار پانی لینے کا مطلب:

سوال: مسواک میں جو ہر بار پانی لینا ہے اس سے کیا مراد ہے آیا مسواک کو دھونے کے لئے ہر بار نیا پانی لینا مراد ہے یا ایک بار مسواک کر کے پھر پانی لے کر کلی کرنا مراد ہے؟ اور کلی کس طرح مسنون ہے؟ آیا تین بار مسواک کر کے بعد میں تین بار کلی کر کے یا ہر بار مسواک کرنے کے بعد کلی کرے۔اس طرح تین بار کلی کرنے کی سنت کو پورا کرے۔یا ہر بار مسواک کے ساتھ کلی کرنے کے علاوہ آخر میں مسواک سے فارغ ہو کر پھر تین بار اور کلی کرے۔ان تینوں صورتوں میں سے کون سی صورت مسنون ہے؟ حافظ رحمت اللہ مدرسہ رائیونڈ۔

الجواب ـــــــــــــــــــ

ہر بار نیا پانی لینے سے مراد یہ ہے کہ ہر بار مسواک کرنے کے بعد اسے دھوئے اور نئے پانی سے تر کرے **(بمياه ثلثة) بأن يبله في كل مرة اهـ (شامي : ج ١ / ص ١٠٦)** تین دفعہ اس طرح مسواک کرنے کے بعد تین دفعہ کلی کرے۔ **كما يظهر من هذه العبارة: وهل يدخل أصبعه في فمه وأنفه؟ الأولىٰ نعم،**

---

(۱) والسواک سنة مؤكدة عند المضمضة وقيل قبلها وهو للوضوء عندنا (درمختار) أي سنة للوضوء .(ردالمحتار قبيل مطلب في منافع السواک : ۱/۱۰۵.ظفیر)

(۲) ولابأس بالسواک الرطب بالغداة والعشي للصائم لقوله صلى الله عليه وسلم: خير خلال الصائم السواک من غير فصل وقال الشافعي: يكره بالعشي لما فيه من إزالة الأثر المحمود وهو الخلوف فشابه دم الشهيد قلنا هو أثر العبادة و الأليق به الإخفاء بخلاف دم الشهيد لأنه أثر الظلم (ہدایہ، باب ما یجب القضاء:۱/۲۰۳،ظفیر)

(۳) صراحت کے ساتھ کوئی ثبوت تو نہ مل سکا البتہ مسواک کے لیے کوئی وقت خاص نہیں بلکہ ہر وقت کر سکتے ہیں۔قال عليه السلام :السواک مطهرة للفم ومرضاة للرب. وهو يدل على مطلق شرعيته دون تخصيص بوقت معين ولا بحالة مخصوصة فهو مسنون في كل وقت.(الفقه الإسلامي وأدلته، المبحث الثاني السواک:۱/۴۵۴)

قهستاني (درمختار) ظاهره ولو تسوك، لا حتمال أن يتحلل من أجزاء السواك شيء اهـ (شامي: ج ١ ص ١٠٨)(١) فقط، واللہ اعلم۔ بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان، ۲۸/۵/ ۱۳۸۲ھ۔ الجواب صحیح: بندہ محمد عبداللہ غفرلہ، رئیس الافتاء۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۵۷۔۵۸)

مسواک ہر نیند کے بعد مستحب ہے، رات کو سوئے ہوں یا دن کو:

سوال سوکر اٹھنے کے بعد مسواک کرنے کا ثواب صرف رات کو سوکر اٹھنے پر ملے گا یا کسی بھی وقت سوکر اٹھنے کے بعد مسواک کرنے پر بھی وہی ثواب ملے گا؟

الجواب

نیند سے اٹھنے کے بعد مسواک کرنا مستحب ہے۔(۲) حضرات فقہا نے نیند کو مطلق رکھا ہے جو بظاہر عام معلوم ہوتا ہے

(١) الدر مع الرد، مطلب في منافع السواك : ج ١ ص ١١٦، ١١٧، بيروت، انيس

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اوقات ومواقع میں مسواک کرنا منقول ہے ان میں نیند سے بیدار ہونے پر، ہر نماز کے وقت، نماز پڑھنے کے بعد، باہر سے آنے پر، گھر میں داخل ہونے کے بعد، سونے کے وقت، قرآن کی تلاوت کرنے کے وقت، جمعہ ودیگر مجامع کے لیے، روزہ کی حالت میں اور دیگر مواقع جیسے منہ میں بدبو پیدا ہوجانے یا دانتوں کے رنگ میں تغیر آجانے کے وقت ان کی صفائی کے لیے۔ ذیل میں ان کی تفصیل دی جاتی ہے:

۱۔ نیند سے بیدار ہونے پر مسواک کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ دن یا رات میں جب بھی آپ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے آپ مسواک ضرور کرتے۔ (رواہ احمد وسنن ابی داؤد)

۲۔ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لیے اٹھتے تو مسواک سے اپنے دہن مبارک کی خوب صفائی کرتے۔ (بخاری ومسلم)

۳۔ ہر وضو سے پہلے مسواک کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو ان کو ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (طبرانی)

۴۔ وضو جس طرح نماز کے لیے ضروری ہے مسواک بھی اسی طرح ضروری ہے مگر امت پر حرج کی وجہ اس میں آسانی دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر میں اپنی امت پر بار نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا جس طرح کہ وہ (ہر نماز کے لیے) وضو کرتے ہیں۔ (مسند احمد)

۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا مسواک پڑھی جائے ستر گنا فضیلت رکھتی ہے۔ (شعب الایمان۔ بیہقی)

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی رات کو دو دو رکعت تہجد پڑھتے اور ہر دو رکعت کے بعد مسواک کرتے۔ (ابن ماجہ، نسائی)

۷۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے مسواک کرنی چاہیے۔ حضرت شریح بن ہانی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں آنے کے بعد کا معمول دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے مسواک کرتے تھے۔ (مسلم)

۸۔ سونے سے پہلے مسواک کرنی چاہیے رسول اللہ صلی اللہ کوئی رات نہ گذارتے اور آپ نہ سوتے مگر مسواک کرنے کے بعد۔ (کنز العمال)

۹۔ اگر وضو ہوا اور دیر ہوگئی ہو تو بھی قرآن کی تلاوت کے لیے مسواک کرنی چاہیے بشرطیکہ مسواک کرنے سے دانتوں سے خون نہ نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے منہ قرآن کی تلاوت کے لیے (مسواک کر کے) پاک صاف رکھو۔ (بزار)

۱۰۔ جمعہ کی نماز کے لیے اور دیگر مواقع وجلسات میں جانے کے لیے بھی مسواک کرنی چاہیے۔ (مؤطا امام مالک) ==

کہ خواہ دن کے وقت ہو یا رات کے وقت۔ مراقی میں ہے۔ **ویستحب لتغیر الفم والقیام من النوم** (ص:۳۷)
فقط، واللہ أعلم، بندہ محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان۔ ۱۴۰۹/۱۲/۱۸ھ (خیر الفتاویٰ:۲/۵۵-۵۶)

جس کے دانت نہ ہوں اس کے لئے مسواک کا حکم:

سوال اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو کیا مسوڑھوں پر مسواک کرنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب

''مراقی'' میں ہے کہ۔ **وفضله يحصل ولو كان الاستياك بالأصبع أو خرقة خشنة عند فقده أي السواك أو فقد أسنانه أو ضرر فمه الخ** (ص ۳۸).

اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ دانت نہ ہونے کی صورت میں فضیلت مسواک انگلی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مسواک کا استعمال سنت نہیں رہتا۔ (۱) درمختار میں ہے: ''**ويستاك عرضاً لا طولاً**''. اس پر علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ'' **لأنه يجرح لحم الأسنان** . (شامية: ج ۱ ص ۷۸) (۲) **فقط واللہ أعلم**، بندہ محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان، الجواب صحیح: بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، رئیس الافتاء۔ (خیر الفتاویٰ:۲/۸۷)

عورتوں کے لئے مسواک کا حکم:

سوال: بہشتی زیور (حصہ اول ص ۴۵) میں وضو میں مسواک کا مسنون ہونا بھی لکھا ہے حالانکہ فقہا عورتوں کے

== ۱۱۔ روزہ کی حالت میں بھی مسواک کرنی چاہیے۔ حضرت عامر بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ روزہ سے ہیں اور مسواک کر رہے ہیں۔ (ترمذی۔ ابوداؤد)

۱۲۔ دانتوں کے صاف نہ ہونے یا پیلا یا بدبو آنے کے وقت بھی مسواک کرنی چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ایک بار فرمایا: کیا بات ہے میں دیکھ رہا ہوں تم میری مجلس میں پیلے دانتوں کے ساتھ آتے ہو (مسواک کیا کرو)۔ (بزار، بیہقی) (طہارت کے احکام ومسائل:۱۶۸-۱۷۰، انیس)

(۱) ایسا شخص جس کے دانت نہ ہوں اس کے لیے وضو کے وقت بھی مسواک کرنی سنت ہے مگر ایسا شخص لکڑی کی مسواک کے بجائے انگلیوں کو مسوڑھوں پر پھیر لے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول جس کے دانت گر گئے ہوں کیا وہ بھی مسواک کرے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، میں نے عرض کیا کہ وہ کیسے کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی انگلی منھ میں ڈال کر صفائی کرے۔ (جمع الفوائد، بزار)

ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ انگلیاں مسواک کی جگہ کافی ہو جاتی ہیں۔ (مرقات) (طہارت کے احکام ومسائل:۲/۱۷۱۔ اسی طرح اگر کسی کے مسوڑھے کمزور ہوں یا دانت کمزور ہوں اور مسواک بار بار کرنے سے نقصان ہوتا ہو تو ایسے شخص کے لیے کبھی کبھار (جیسے سو کر اٹھنے کے بعد) مسواک کر لینا کافی ہے دیگر اوقات میں وہ انگلیوں سے صفائی کر لیا کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ داہنی جانب اوپر نیچے صفائی کرے پھر انگشت شہادت سے بائیں طرف اوپر نیچے صفائی کرے۔ (طحطاوی) (طہارت کے احکام ومسائل:۲/۱۷۱، انیس)

(۲) الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۱۱۴، سنن الوضوء، قبل مطلب في منافع السواك، بیروت، انیس.

لئے علک کو قائم مقام مسواک لکھتے ہیں لیکن تخصیص رجال کی کوئی دلیل پائی نہیں جاتی، احادیث میں ترغیب وفضیلت بیان کی گئی ہے رائے عالی سے مطلع فرمایا جاوے؟

الجواب

میرے نزدیک مسنونیت مسواک کی عام ہے۔(۱)''لإطلاق الدليل'' رہا اقامۃ علک (۲) کا مقام مسواک میں میرے نزدیک معنی اس کے جواز (۳) اقامت ہے نہ وجوب اقامت جو مستلزم ہے نفی مشروعیت سواک کو لعدم دليل الوجوب . فقط، امداد ج:۱/ص۱۔(امداد الفتاویٰ جدید:۱/۲۹۔۳۰)

عورتوں کے لیے مسواک:

سوال: عورتوں کے لیے مسواک کرنا کیسا ہے؟

الجواب ــــــــــ حامداً و مصلیاً

درست ہے اگر مسوڑھے برداشت کرلیں۔(۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۴۹)

(۱) یعنی عورت اور مرد دونوں کے لئے مسنون ہے ظاهر الأخبار استواء الرجال والنساء في استنان السواك اهـ سعاية ۱/۱۸۱، ابن حجر عسقلانیؒ نے محدث احمد بن منیع کے مسند سے المطالب العالیہ ۱/۲۳ میں حدیث نقل فرمائی ہے واثلة بن الأسقع قال: كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يوثقون مساويكهم في ذوائب سيوفهم، والنساء في خمرهن :ترجمہ:واثلہؓ(جو صحابی ہیں) ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اپنی مسواکوں کو تلوار کی مٹھ کے ساتھ باندھا کرتے تھے اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں میں باندھا کرتی تھیں اھ اس حدیث سے صحابیاتؓ کا مسواک استعمال کرنا صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔سعید احمد

(۲) علک لبان کی ایک قسم ہے جیسے صنوبر اور بطم کا گوند۔غایۃ الاوطار۔س

(۳) واضح ہو کہ اصل سنت درخت کی مسواک ہے، مسواک کی موجودگی میں انگلیاں بھی مسواک کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں ولا تقوم الأصابع مقام العود عند وجوده آه ۔کبیری ۳۲۔لیکن عورت کے لئے درخت کی مسواک موجود ہوتے ہوئے بھی علک کا استعمال جائز ہے، وہ مسواک کے قائم مقام شمار ہوگا جب کہ عورت نے اس کا استعمال سنت ادا کرنے کی نیت سے کیا ہو، كما يقوم العلك مقامه للمرأة مع القدرة عليه آه. (الدر المختار: ۱/۱۵۵، دار الفكر). قوله مقامه أي في الثواب إذا وجدت النية آه . طحطاوی۔علامہ ابن نجیمؒ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے لكون المواظبة عليه تضعف أسنانها فيستحب لها فعله آه(بحر ۱/۲۱) یعنی ہمیشہ لکڑی کی مسواک استعمال کرنا عورت کے دانتوں کو کمزور کرتا ہے اس لئے گاہ بگاہ علک کا استعمال اس کے لئے مستحب ہے، معلوم ہوا کہ عورت کے لئے بھی اصل سنت درخت کی مسواک ہے۔سعید

(۴) انگلیوں سے عورتوں کے لیے مسواک کرنا مسنون ہے مگر ان کو اس کی اجازت ہے کہ مسواک کے بجائے منجن یا انگلیوں سے وضو کرتے وقت دانتوں کی صفائی کرلیا کریں۔یہ ان کے مسوڑھوں ولبوں کے کمزور ہونے کی بنا پر ہے۔(طہارت کے احکام ومسائل:۳۰/۱۷، انیس)

بچوں کی مسواک: بچوں کو بھی مسواک کی عادت ڈالنی چاہیے، اس سے ان کے دانتوں کی صفائی بھی ہوگی اور بیماریوں سے بھی محفوظ رہیں گے، بچوں کو اس کی عادت ڈالنا مستحب ہے۔(درمختار)(طہارت کے احکام ومسائل:۳۰/۱۷، انیس)

(إن العلك للمرأة يقوم مقام السواك لأنها تخاف من السواك سقوط سنها لأن سنها أضعف من سن الرجل وهو مما ينقي الأسنان. (حاشية الشلبي، تبيين الحقائق على الزيلعي ۱/۳۵، سنن الوضوء، كذا في ردالمحتار ۱/۱۵۱، مطلب في منافع السواك، الإمداد:۵۷ مطلب في السواك واستعماله)

مسواک کرنا اور استنجا میں ڈھیلا لینا، عورت کے لئے کیسا ہے:

سوال: مسواک کرنا اور ڈھیلا لینا عورت کو مستحب ہے مثل مردوں کے، اگر حاجت ہو اور ڈھیلے کی حاجت مرد کو نہ ہو تو اس کو (بھی) ضرور (ی) نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ

مسواک کرنا مستحب ہے (۱) اگر نہ ملے یا دانت میں تحمل نہ ہو، کسی دوسری شئے (سے) صاف کر لیوے مگر سنت لکڑی سے ہی حاصل ہوتی ہے، کہ فعل فخر عالم علیہ السلام کا ہے، اگرچہ صفائی دوسری شئے سے بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ (۲). مجموعہ فرخ آباد، ص:۴۳ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۱۴۰)

بجائے مسواک کے برش استعمال کرنا:

سوال: جو شخص بلا عذر بجائے مسواک کے بالوں کا برش استعمال کرے تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــ و باللّٰہ التوفیق

مسواک کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو صورت علی المواظبۃ ثابت ہے وہ یہی ہے کہ لکڑی سے مسواک کی جائے اور لکڑیوں میں بھی پیلو درخت کی لکڑی زیادہ پسندیدہ ہے (۳)) لیکن اگر لکڑی کی مسواک اتفاقاً موجود نہ ہو تو انگلی سے یا موٹے کپڑے وغیرہ سے دانت صاف کر لینا مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے۔ **قال فی الهداية: وعند فقده يعالج بالأصبع.** (۴) اس سے ظاہر ہوا کہ برش کا اصل حکم بھی یہی ہے کہ اگر اتفاقاً مسواک موجود نہ ہو تو اس کا استعمال قائم مقام مسواک کے ہوجائے گا۔ لیکن بطور فیشن اس کی عادت ڈال لینا مناسب نہیں اور نہ بلا ضرورت وہ مسواک کا قائم مقام ہوسکتا ہے بالخصوص آج کل جو برش عموماً اس کام کے لئے آتے ہیں ان میں خنزیر کے بالوں کا احتمال قوی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ برش کے استعمال سے احتراز کیا جائے، کہیں مسواک ہاتھ نہ آئے تو انگلی وغیرہ سے صاف کر لینے پر اکتفا کریں۔ (۵) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (فتاویٰ دارالعلوم یعنی امداد المفتین کامل ۲/۲۴۲ و ۲۴۳)

---

(۱) والسواك سنة مؤكدة ...وهو للوضوء عندنا (درمختار) أى سنة للوضوء. ردالمحتار: ۱/۱۱۴، قبيل مطلب فى منافع السواك، بيروت، انيس.

(۲) وفضله يحصل ولو كان الاستياك بالأصبع أو خرقة خشنة عند فقده أى السواك أو فقد أسنانه أو ضرر فمه الخ. (مراقى الفلاح: ص۳۸، انيس)

(۳) وفى النهر: ويستاك بكل عود إلا الرمان والقصب، وأفضله الإراك ثم الزيتون (شامى: ج۱ ص۱۱۵، انيس)

(۴) هدايه: ۱/۱۸، سنن الوضوء، انيس.

(۵) مسواک ساتھ رکھنی چاہیے، یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سنت ہے، وہ سفر و حضر میں مسواک کو ساتھ رکھتے تھے، اگر کبھی مسواک نہ ہو تو ایسی حالت میں کسی موٹے کپڑے یا انگلی یا منجن وغیرہ سے دانتوں کو صاف کرنا چاہیے جیسا کہ حدیث میں انگلی کو مسواک کے قائم مقام بتایا گیا ہے۔ (طہارت کے احکام و مسائل:۱۷۳، انیس)

بغیر کسی مرض کے برش استعمال کرنا:

سوال: ایک شخص بلا از چہ مرض و بلا از استعمال دوا و بلا از چہ جراحت واقعہ فی الفم ہر وقت استعمال برش می نمایدایا آں شخص درز یر حکم حدیث ''من تشبه بقوم فهو منهم'' داخل می گردد یانہ، اگر داخل نمی گردد، استعمال آں چیز مذکورہ کدام حکم از حل وحرمت واباحت وکراہت میدارد یانہ، واستعمال این چیز مذکورہ قائم مقام مسواک میگردد یانہ مع حوالہ کاملہ از کتب متداولہ این بحث را حل نمودہ زیادہ از فضائل وفواصل نباشد؟(۱)

الجواب ———— وباللہ التوفیق

برش اگر خنزیر کے بالوں کا ہے تو اس کا استعمال قطعاً حرام ہے اور اگر مشکوک ہے تو ترک اولیٰ ہے اور اگر مشکوک بھی نہیں تو اس کا استعمال جائز ہے لیکن بلاضرورت سنت مسواک کے قائم مقام نہ ہوگا، کیونکہ سنت مسواک کی لکڑی ہی سے ثابت ہے۔

البتہ اگر کسی وقت لکڑی مسواک کے قابل موجود نہ ہو تو صرف انگلی سے یا موٹے کپڑے یا برش وغیرہ سے دانت صاف کر لینا اس کے قائم مقام بضرورت ہو جاتا ہے۔ **کما فی الهداية: وعند فقده يعالج بالأصبع.** (۲) لیکن بلاضرورت اس کی عادت ڈالنا خلاف سنت ہے اور دوسری قباحت یہ بھی ہے کہ اصل شعار اہل اسلام کا نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند یعنی امداد المفتیین کامل: ۲/۲۴۳)

وضو میں بجائے مسواک کے کسی اور چیز کا استعمال:

سوال: مسواک کی جگہ پر منجن اور ٹوتھ پیسٹ کا استعمال کیسا ہے؟ برش کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

الجواب ————

وضو کرتے وقت مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ ''**والسواك هو سنة مؤكدة ووقته عند المضمضة.**'' (الجوهرة النيرة: ۱/۵) اور مسواک بانس، انار اور ریحان کے علاوہ کسی اور درخت کی ہونی چاہیے، خصوصاً کڑوے درخت کی، زیادہ اولیٰ پیلو کے درخت کی ہے پھر زیتون کے درخت کی۔ ''**قال في الحلية: وذكر غير واحد من العلماء كراهيته بقضبان الرمان والريحان آه وفي شرح الهداية للعينيؒ: روى الحارث في مسنده عن**

(۱) **خلاصہ سوال:** ایک شخص بغیر کسی مرض، اور بغیر کسی دوا کے استعمال کے، اور بغیر منہ کے زخم کے ہر وقت برش استعمال کرتا ہے، کیا وہ شخص حدیث ''من تشبه بقوم الخ'' کے تحت داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل نہیں ہے تو اس کا استعمال کیسا ہے، حلال، حرام، مباح یا مکروہ ہے یا نہیں؟ اور اس کا استعمال مسواک کے قائم مقام ہو سکتا ہے یا نہیں، متداول کتابوں سے مکمل حوالہ کے ساتھ اس بحث کو حل فرماویں؟ انیس الرحمٰن قاسمی۔

(۲) هدایه: ۱/۱۸، سنن الوضوء، انیس.

ضمیر بن حبیب قال نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن السواک بعود الریحان وقال: إنه یحرک عرق الجذام، وفی النهر: ویستاک بکل عود إلا الرمان والقصب وأفضله الإراک ثم الزیتون، شامی: ۱/۱۰۷، کبیری: ۳۲، علامہ طحطاویؒ زیتون کی مسواک کو افضل مانتے ہیں، **قلت: والحدیث یفید أفضلیة الزیتون علی الإراک.** (طحطاوی علی الدر المختار: ۱/۱۰۱)

الغرض مسواک درخت کی ہونا ضروری ہے اگر کسی وقت کسی درخت کی مسواک میسر نہ ہو تو انگلی سے دانت صاف کر کے منہ کی بو زائل کر دے اس طرح بھی سنت ادا ہو جاتی ہے، ہدایہ میں ہے: "**والسواک لأنه علیه السلام کان یواظب علیه وعندفقده یعالج بالأصبع لأنه علیه السلام فعل کذلک : ۱/۶**". (ہدایہ کتاب الطہارۃ: ۱/۱۸)

اور مسواک سنت ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کرتے تھے اور مسواک نہ ہو تو انگلیوں سے مسواک کا کام لے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کیا ہے۔ نیز ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "**الأصابع تجری مجری السواک إذالم یکن سواک**" (یعنی) جب مسواک نہ ہو اس وقت انگلیاں مسواک کا کام کرتی ہیں (طبرانی وغیرہ)۔ **عن أنسؓ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: تجزی من السواک الأصابع. (سنن بیهقی باب الاستیاک بالأصابع**: ۱/۶۶ حدیث نمبر: ۱۷۶)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل سنت درخت کی مسواک ہے وہ میسر نہ ہو یا دانت نہ ہو یا دانت یا مسوڑھے کی خرابی کی وجہ سے مسواک سے تکلیف ہوتی ہو تو ضرورتاً ہاتھ کی انگلیوں یا موٹے کھردرے کپڑے یا منجن، ٹوتھ پیسٹ یا برش سے مسواک کا کام لیا جا سکتا ہے، مگر مسواک کے ہوتے ہوئے مذکورہ چیزیں مسواک کی سنت ادا کرنے کے لیے کافی نہیں اور مسواک کی سنت کا پورا اجر حاصل نہ ہوگا "**ولا تقوم الأصابع مقام العود عند وجوده**" اور مسواک کی موجودگی میں یہ چیزیں اس کے قائم مقام نہیں بن سکتیں۔ (کبیری: ۳۲، صغیری: ۱۴، البحر الرائق: ۱/۲۱، فتاویٰ عالمگیری: ۱/۷)

جب مسواک کی موجودگی میں انگلیاں (جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور قول ثابت ہے) مسواک کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں تو برش وغیرہ کیسے مسواک کے قائم مقام ہو سکتے ہیں برش اگر سور (خنزیر) کے بالوں کا ہے تو اس کا استعمال قطعاً حرام ہے، اگر مشتبہ ہو تو بھی استعمال نہ کرے، مشکوک نہ ہو تو استعمال کر سکتا ہے، مگر بلا عذر کے مسواک کے قائم مقام نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ سنت درخت کی مسواک ہے۔ (توضیح المسائل: ۳۵) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱/۱۲۵-۱۲۶)

مسواک کی جگہ ٹوتھ پیسٹ اور برش:

سوال: مسواک کی جگہ ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

مسواک کا اصل مقصود دانت میں پیدا ہونے والی گندگی کو دور کرنا ہے، یہ مقصد جس چیز سے بھی حاصل ہو جائے، فقہا نے اس کو کافی قرار دیا ہے:

”بأی شیء استاک مما یقلع القلع ویزیل التغیر کالخرقة وغیرها أجزأها ؛لأنه یحصل به المقصود. (۱)

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوں کہ لکڑی کی مسواک استعمال فرمائی ہے، اس لئے آلۂ مسواک کی سنت اسی وقت ادا ہوگی جب لکڑی کی مسواک استعمال کی جائے اور فعل مسواک کی سنت ادا ہونے کے لئے ٹوتھ پیسٹ اور برش کا استعمال بھی کافی ہوگا۔ (کتاب الفتاویٰ:۲/۳۸۔۳۹)

ٹوتھ پیسٹ یا برش کا استعمال مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسواک کی جگہ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کیا جائے تو کیا یہ مسواک کے قائم مقام ہوگا اور مسواک کا ثواب بھی ملے گا؟

الجواب ــــــــــــــــــــ و باللّٰه التوفیق

کچھ دانت وغیرہ گر جانے کی وجہ سے اگر مسواک کا استعمال نہ ہو سکے تو کسی بھی منجن یا پیسٹ وغیرہ سے بوجہ مجبوری مسواک کا ثواب ملے گا۔ (۲) ورنہ مسواک کا ثواب نہ ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ العبد نظام الدین عفی عنہ مفتی دار العلوم دیوبند، الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ:۱/۴۳)

برش میں سور کے بال ہوں تو جائز ہے یا نہیں؟

سوال: انگریزی برش جو دانتوں پر استعمال ہوتا ہے اس میں اگر سور کے بال ہوں تو اس کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

اگر خنزیر کے بالوں کا برش ہو تو اس کا استعمال قطعاً ناجائز ہے۔ (۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد کفایت اللہ (کفایت المفتی:۲۶۴)

---

(۱) شرح المهذب:۱/۲۸۱

(۲) والسواک لأنه علیه السلام کان یواظب علیه وعندفقده یعالج بالأصبع لأنه علیه السلام فعل کذلک : ۱/ ۶“. (ہدایہ کتاب الطہارۃ:۱/۱۸، انیس۔

(۳) فتح القدیر:۱/۸۲، بدائع الصنائع:۱/۶۳، اس بارے میں فقہا احناف کا قول یہ ہے کہ اگر خنزیر کا بال ضرورتاً استعمال ہوتا ہے تو جائز ہے غالباً امام محمدؒ نے خنزیر کے بالوں کے عمومی استعمال کو ان دلائل کی بناء پر کہ بالوں میں ناپاکی کا اثر نہیں ہوتا خنزیر کے بالوں کو پاک قرار دیا ہے، ردالمحتار میں ہے: و ذکر فی الدر: أنه عند محمد طاهر لضرورة استعماله أی للخرازین. (ردالمحتار:۱/۲۰۶، انیس)

دانتوں کی صفائی کے لئے برش کا استعمال:

سوال: دانت صاف کرنے کے لئے کئی قسم کے برش ملتے ہیں، کیا ان سے دانتوں کا صاف کرنا جائز ہے؟

الجواب

دانتوں کو مسواک سے صاف کرنا مسنون ہے، برش اگر پاک ہوتو اس کا استعمال اگر چہ طریقہ مسنونہ کے موافق نہیں، تاہم مباح ہوگا۔ (۱) مگر سنا ہے کہ دانت مانجھنے کے برش خنزیر کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔ اگر صحیح ہو یا اس کا شبہ بھی ہوتو ایسے برش کا استعمال قطعاً ناجائز ہے۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی ۲/۷۲)

کسی مجبوری کی وجہ سے وضو میں کلی نہ کرنا درست ہے:

سوال: ایک شخص اگر کلی کرتا ہے تو اس کے منھ سے خون نکلتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد بند ہو جاتا ہے، تب وہ وضو ختم کرتا ہے۔ چوں کہ کلی کرنے سے وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہے اس لیے اگر وہ کلی نہ کرے اور نماز پڑھے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

ایسی حالت میں کلی نہ کرنا درست ہے، بدون کلی کے نماز صحیح ہے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۲۹)

بغیر ناک میں پانی ڈالے ہوئے وضو درست ہے مگر خلاف سنت:

سوال: وضو کے اندر اگر کوئی شخص منھ میں یا ناک میں پانی ڈالنا بھول گیا تو وضو ہوا یا نہیں۔

الجواب

وضو ہو گیا مگر ترک سنت ہوا۔ (۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۲۹)

---

(۱) والسواک لأنه علیه السلام کان یواظب علیه وعندفقده یعالج بالأصبع لأنه علیه السلام فعل کذلک: ۱/۲". (ہدایہ کتاب الطھارۃ: ۱/۱۸) انیس۔

(۲) اگر کوئی عذر نہ ہوتو تین مرتبہ کلی کرنا مسنون ہے۔ رأیت عثمان بن عفان سئل عن الوضوء فدعا بماء فاتی بمیضأة فاصغاها علی یده الیمنی ثم ادخلها فی الماء فتمضمض ثلثا واستنثر ثلثا (ابو داؤد، باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم ص ۱۶ نمبر ۱۰۸، ۱۱۲، مسلم شریف باب صفة الوضوء وکماله، ص ۱۲۳، نمبر ۲۲۶، ۵۳۸، انیس) (وغسل الفم الخ بمیاه وهماسنتان مؤکدتان (درمختار) فلوترکهاأثم علی الصحیح، سراج، قال فی الحلیة: لعله محمول علی ماإذاجعل الترک عادةً له من غیر عذر (ردالمحتار، سنن وضو، ظفیر

(۳) رأیت عثمان بن عفان سئل عن الوضوء فدعا بماء فاتی بمیضأة فاصغاها علی یده الیمنی ثم ادخلها فی الماء فتمضمض ثلثا واستنثر ثلثا (ابو داؤد، باب صفة وضوء النبی صلی الله علیه وسلم ص ۱۶ نمبر ۱۰۸، ۱۱۲، مسلم شریف باب صفة الوضوء وکماله، ص ۱۲۳، نمبر ۲۲۶، ۵۳۸) (عن طلحة عن ابیه عن جده قال دخلت یعنی علی النبی صلی الله علیه وسلم وهو یتوضأ والماء یسیل من وجهه ولحیته وعلی صدره فرأیته یفصل بین المضمضة والاستنشاق (ابو داؤد شریف، باب فی الفرق بین المضمضة والاستنشاق ص ۳۰، نمبر ۱۳۹) ==

ناک میں زخم ہو جائے تو غسل اور وضو میں کیا کیا جائے:

سوال: میری ناک میں زخم ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ پانچ دنوں تک اس میں پانی نہ ڈالو! تو غسل اور وضو میں کیا کیا جائے؟ (مستفتی نیاز نانا پیٹھ پونہ)

الجواب

ناک میں پانی ڈالنا وضو میں فرض نہیں ہے بلکہ مسنون ہے، اس لیے وضو کرتے وقت آپ ناک میں پانی نہ ڈالیے، عذر کے سبب ترک سنت کی وجہ سے وضو میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی اور آپ کا وضو ہو جائے گا، جب آپ پر غسل واجب ہو تو غسل کرتے وقت پانی ناک میں ڈالئے، بلکہ انگلی تر کرکے ناک کے اندرونی حصہ کا مسح کیجئے اگر اس طرح مسح کرنے کی وجہ سے زخم بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو غسل کے بجائے تیمّم کر سکتے ہیں۔

یمسح نحو مفتصد وجریح علی کل عصابة مع فرجتها فی الأصح إن ضره الماء أوحلها ومنه أن لایمکنه ربطها بنفسه ولایجد من یربطها انکسرظفره فجعل علیه دواءً أووضع علی شقوق رجله أجری الماء علیه إن قدروإلامسحه وإلاترکه.(الدرالمختار مع ردالمحتار: ص ۱۷۴ ج ۱)ویترک المسح کالغسل إن ضر و إلا لایترک (الدر مختارمع ردالمحتار: ص ۱۷۰۴ ج ۱)من عجزعن استعمال الماء لبعده میلاً أولمرض یشتدأویمتد بغلبة ظن أوقول حاذق مسلم... یتیمم.(الدرمختارمع رد المحتار ص ۳۹۵ ج ۱) واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ مفتی محمد شاکر خان، پونہ۔ (فتاویٰ محمد شاکر خان: ۲/۶۶۔۶۷)

داڑھی میں خلال کا طریقہ:

سوال: داڑھی میں خلال کس طرح کرے؟

الجواب

داہنے ہاتھ کو سیدھا کر کے تھوڑی کے نیچے سے داڑھی میں داخل کر دیا جائے اسی طرح داہنے اور بائیں سمت میں اندر سے

== اگر روزہ دار نہ ہو تو مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ کرے۔ (عن عاصم بن لقیط بن صبرة ... فقلت یا رسول الله ! اخبرنی عن الوضوء قال اسبغ الوضوء وخلل بین الاصابع وبالغ فی الاستنشاق الا ان تکون صائما (ابو داؤد ، باب فی الاستنثار، ص ۳۱، نمبر ۱۴۱، ترمذی شریف ، باب ما جاء فی کراهیة مبالغة الاستنشاق للصائم ، ۱۹۷، نمبر ۷۸۸، انیس) (وغسل الفم أی استیعابه ولذاعبربالغسل أوللاختصاربمیاه ثلثة والأنف ببلوغ الماء المارن بمیاه وهماسنتان مؤکدتان الخ المبالغةفیهمابالغرغرةومجاوزةالمارن لغیرالصائم(درمختار)قوله وهماسنتان مؤکدتان فلوترکهماأثم علی الصحیح الخ (ردالمحتار، کتاب الطهارةسنن الوضوء : ۱/ ۱۰۷. ۱۰۸ ، ظفیر۔

داخل کر کے باہر کی طرف کو ہاتھ لایا جائے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیو بند (فتاویٰ محمودیہ:۵۰/۵)

ہاتھ کا دھونا کہنیوں سے شروع کیا جائے:

سوال: وضو میں انگلیوں سے پانی کہنیوں تک لے جائے یا کہنیوں سے انگلیوں کی طرف گرائے؟

الجواب

احادیث سے زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنیوں سے انگلیوں کی طرف کو پانی گرے، باقی جائز دونوں طرح ہے۔(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱۳۲/۱۔۱۳۳)

ہاتھوں کے دھونے میں ابتدا کس طرف سے کی جائے:

سوال: زید کہتا ہے کہ وضو میں غسل یدین کی ابتداء اصابع سے کرے کہ مرفق کی طرف پانی جائے۔جیسا کہ قرآن میں ” إلی المرافق “ ہےاور عمر کہتا ہے کہ حدیث میں ”إدار الماء علی المرفق“ آیا ہے، لہٰذا مرفق پر پانی ڈالے کہ اصابع کی طرف جائے ”یبدأ من الأصابع“ آیا ہے یا ”من المرافق“ آیا ہے؟

الجواب

دونوں طرح درست ہے، لیکن احادیث سے مرفق سے اصابع کی طرف پانی آنا معلوم ہوتا ہے۔(۳) (فتاویٰ دارالعلوم:۱۳۳/۱)

ہاتھ اور پاؤں دھوتے وقت ابتدا کہاں سے کریں:

سوال وضو میں جب ہاتھوں یا پاؤں پر پانی ڈالا جائے تو کس حصہ سے ابتدا کی جائے؟ المستفتی ۔حافظ مقبول احمد قادر آباد فارم: ضلع ساہیوال۔

---

(۱) (وتخليل اللحية) هوتفريق شعرهامن أسفل إلىٰ فوق(بحر) وهوسنةعندأبى يوسفؒ. (ردالمحتار: ۱۱۷/۱،سنن الوضوء. كذافى البحرالرائق: ۴۵/۱،سنن الوضوء. الفتاوىٰ الهندية: ۷/۱،الفصل الثانى فى سنن الوضوء

(۲) کوئی حدیث ایسی نہیں مل سکی مگر فقہا نے صراحت کی ہے کہ سنت یہ ہے کہ دھونا انگلیوں کے سروں سے شروع کیا جائے، ومن السنن: ”البداية من رؤوس الأصابع فى اليدين والرجلين “كذافى فتح القديروهكذافى المحيط. (عالمگیری کشوری ،الفصل الثالث فى المستحبات :۷/۱)والبدء بأعلى الوجه وأطراف الأصابع ومقدم الرأس وقدمناأن الأخيرين سنة (ردالمحتار كتاب الطهارة،مطلب فى تتميم مندوبات الوضوء ،ظفیر

(۳) ومن السنن : البداية من رؤوس الأصابع فى اليدين والرجلين ،كذافى فتح القديروهكذافى المحيط. (عالمگیری کشوری، الفصل الثالث فى المستحبات : ۷/۱)ایسی حدیث جس میں صراحت ہو کہ مرفق سے انگلی کی طرف پانی بہائے نہیں مل سکی۔قرآن کے الفاظ ”إلى المرافق أو إلى الكعبين“ سے فقہا کی تائید ہوتی ہے۔واللہ اعلم۔ظفیر

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

دونوں انگلیوں سے ابتدا کی جائے۔(۱) **ومن السنن البداية من رؤس الأصابع فى اليدين والرجلين كذا فى فتح القدير اهـ (عالمگیری: جلد ۱ / ص ۴)، فقط واللّٰه تعالىٰ أعلم، احقر محمد انور عفا اللہ** عنہ، مفتی جامعہ خیر المدارس، ملتان، ۱۳/۳/۱۴۱۱ھ۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۴۷)

وضو میں دونوں ہاتھ تین مرتبہ دھوئے جائیں:

سوال: (۱) وضو میں دونوں ہاتھ ایک مرتبہ پہلے دھوتے ہیں، پھر تین مرتبہ پانی بہاتے ہیں۔ درست ہے یا کہ تین ہی مرتبہ پانی بہانا چاہئے اور دھونا نہیں چاہئے۔ یعنی چوتھی مرتبہ ہوگیا ہے کیوں کہ تین مرتبہ سے زیادہ منع ہے۔

پانی ہاتھ پر انگلی کی طرف سے بہائے یا کہنی کی طرف سے:

سوال: (۲) بعض شخص بائیں ہاتھ پر پانی کہنی کی طرف سے بہاتے ہیں یہ درست ہے یا مکروہ، یا بدعت؟

انگلیوں میں خلال کس وقت کرنا چاہئے:

سوال: (۳) خلال انگلیوں میں وقت وضو کے کرتے ہیں، وہ دھوتے وقت چاہئے۔ یا بعد دھونے کے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

(۱) تین مرتبہ دھونا چاہئے یہی سنت ہے، (۲)

---

(۱) **ان حمران مولى عثمان أخبره أنه رأى عثمان بن عفان دعا باناء، فافرغ على كفيه ثلاث مرار فغسلها، ثم ادخل يمينه فى الاناء فمضمض واستنثر ثم غسل وجهه ثلاثا ويديه الى المرفقين ثلاث مرار ثم مسح برأسه ثم غسل رجليه ثلاث مرار الى الكعبين. (بخارى شريف، باب الوضو ثلاثا ثلاثا ۳۲، نمبر ۱۵۹)**، اس حدیث میں الی المرفقین اور الی الکعبین سے اشارہ ہے کہ انگلیوں کے سرے سے شروع کرتے تھے۔ انیس)

بسم اللہ کہنے کے بعد داہنے ہاتھ سے مسواک کرنے اور پھر ہاتھ دھونے کی ابتدا کرنی چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب تم وضو کرو تو اپنے داہنے اعضاء سے ابتدا کرو۔ (مسند احمد وسنن ابوداؤد) (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۱۱، انیس)

(۲) وضو کے اعضاء کو پورے طور پر ایک بار تو دھونا فرض ہے اور تین بار دھونا سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں تین تین بار دھوتے تھے۔ (مسلم واحمد)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار وضو میں دو دو بار دھونے کے بعد فرمایا کہ یہ اس شخص کا وضو ہے جس کو دوہرا اجر ملے گا، پھر تیسری مرتبہ دھونے کے بعد فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کا وضو ہے، جو شخص اس پر اضافہ کرے یا کم کرے تو اس نے زیادتی کی اور ظلم کیا (ردالمحتار ۱/۱۱۸)

اس تاکید کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر ایک بار دھونے کی عادت بنالے تو وہ گنہ گار ہوگا۔ عذر سے مراد یہ ہے کہ پانی کم ہو، یا ٹھنڈک کا اثر ہونے کا خوف ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔ اور تین بار دھونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تین بار چلو میں پانی لے لیا جائے تو ہو جائے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ پورا عضو ایک بار مکمل دھویا جائے چاہے ایک چلو پانی سے ہو یا زائد سے۔ اسی طرح دوسری بار اور تیسری بار دھویا جائے، لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ وسوسہ کی حد تک پہونچ جائے اور بار بار پانی ڈالتا رہے۔ (ردالمحتار ۱/۱۱۸) (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۱۳، انیس)

باقی تر کرنے کے لیے ایک بار ہاتھ پھیرنا اس میں کچھ حرج نہیں ہے، بلکہ اچھا ہے، تا کہ تین مرتبہ پوری طرح پانی بہہ جاوے۔(۱)

(۲) درست ہے۔(۲)

(۳) دھوتے وقت کرے یا بعد میں ہر طرح درست ہے۔(۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱/۱۲۸)

وضو کرتے ہوئے انگلیوں میں خلال کب کرے:

سوال: وضو میں ہاتھ دھونے کے بعد مسح سے قبل انگلیوں کا خلال کرنا چاہیے یا جیسا کہ بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ سر و کان کے مسح کے بعد خلال کرتے ہیں وہ کرنا چاہیے؟

الجواب

جب ہاتھ دھوئے جبھی انگلیوں کا بھی خلال کر لے۔(۴) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ حررہ العبد محمود عفی عنہ، دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۰)

وضو میں انگلیوں کے خلال کا موقع:

سوال: وضو میں انگلیوں کا خلال کس وقت کرنا چاہیے آخر میں یا ابتدا میں یا کلائیوں کے دھونے کے بعد

الجواب

انگلیوں کے خلال کا موقع کلائیوں کے دھونے کے بعد ہے۔ ملاحظہ ہو۔ درمختار میں ہے: **(و تخليل (الأصابع) اليدين بالتشبيک والرجلين... وفی البحر ويقوم مقامه أی تخليل الأصابع الإدخال فی الماء ولو لم يكن جارياً وفيه عن الظهيرية والتخليل إنمايكون بعد التثليث لأنه سنة التثليث. (الدر المختار مع الشامی: ۱/۱۱۷)**

(۱) وتثليث الغسل المستوعب ولاعبرة للغرفات ولو اكتفى بمرة إن اعتاد أثم وإلالا، ولو زاد لطمانية القلب أو لقصد الوضوء على الوضوء لابأس به وحديث فقد تعدى محمول على الاعتقاد (درمختار) قوله وزاد الخ أشار إلىٰ أن الزيادة مثل النقصان فی المنع عنها بلا عذر (ردالمحتار، كتاب الطهارة، سنن الوضوء: ۱/۱۱۰) اس سے معلوم ہوا کہ بغیر عذر تین مرتبہ سے زیادہ ہاتھ کو دھونا منع ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ظفیر

(۲) ومن السنن: البداية من رؤوس الأصابع فی اليدين والرجلين، كذا فی فتح القدير (عالمگیری کشوری، فصل ثالث، مستحبات وضو: ۱/۷) مگر مسنون طریقہ یہ ہے کہ انگلی کی طرف سے دھونا شروع کرے۔ ظفیر

(۳،۴) وتخليل أصابع اليدين بالتشبيک والرجلين بخنصر يده اليسرىٰ (درمختار) وفيه عن الظهيرية: إن التخليل إنمايكون بعد التثليث لأنه سنة التثليث (ردالمحتار كتاب الطهارة، سنن الوضوء: ۱/۱۰۹) اس سے معلوم ہوا کہ خلال تین مرتبہ دھو چکے تو بعد میں کرے۔ ظفیر

البحر الرائق میں ہے:وفی الظھیریة والتخلیل إنما یکون بعد التثلیث لأنه سنة التثلیث. (البحر الرائق: ۱/ ۲۲)

بہشتی زیور میں ہے: تین بار داہنا ہاتھ کہنی سمیت دھوئے پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت دھوئے اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کرے۔ (بہشتی زیور حصہ اول:۶۵)

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت تین دفعہ دھوئے اس کے بعد انگلیوں کا خلال کرے۔ واللہ اعلم۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا جلد اول:۵۱۴۔۵۱۵)

وضو میں انگلیوں کا خلال سنت مؤکدہ ہے:

سوال: وضو میں انگلیوں کا خلال کرنا سنت مؤکدہ ہے یا نہیں؟ اور سنت مؤکدہ کا ترک گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ وضو میں خلال کا ترک کرنا مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

سنت مؤکدہ ہے۔(۱) اور بلا عذر مع الاصرار ترک کرنا مکروہ تحریمی ہونے کی وجہ سے گناہ کبیرہ ہے۔ "قال فی شرح التنویر: وتخلیل (الأصابع) الیدین بالتشبیک والرجلین بخنصر یده الیسریٰ بادیاً بخنصر رجله الیمنیٰ وهذا بعد دخول الماء خلالها، فلو منضمةً. قال فی الشامیة: (وقوله تخلیل الأصابع) هو سنة مؤکدة اتفاقاً، سراج، (ردالمحتار: ۱/ ۱۰۹) وفی موضع اٰخر منه: فی الحدیث: من ترک سنتی لم ینل شفاعتی، فترک السنة المؤکدة قریب من الحرام، قال ابن عابدینؒ تحت (قوله وفی الزیلعی): ومقتضاه أن ترک السنة المؤکدة مکروه تحریم لجعله قریباً من الحرام والمراد بها سنن الهدی کالجماعة والأذان والإقامة فان تارکها مضل ملوم والمراد الترک علی وجه الإصرار بلا عذر (ردالمحتار: ۵/ ۲۳۷) وفی واجبات الصلوٰة: ولها واجبات لا تفسد بترکها وتعاد وجوباً فی العمد والسهو وإن لم یعدها یکون فاسقاً آثماً، قال الشامی: (قوله یکون فاسقاً) أقول: صرح العلامة ابن نجیمؒ فی رسالته المؤلفة فی بیان المعاصی: بأن کل مکروه تحریماً من الصغائر وصرح أیضاً بأنهم شرطوا الإسقاط العدالة بصغیرة الإدمان علیها. (ردالمحتار:۱/۴۲۵، مطلب المکروه تحریماً من الصغائر) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۵/ جمادی الآخرۃ ۷۸ھ (احسن الفتاویٰ:۲/۱۳)

---

(۱) عن ابن عباسؓ أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: إذا توضأت فخلل بین أصابع یدیک و رجلیک۔ (ترمذی شریف، باب ما جاء فی تخلیل الأصابع ص۱۲، نمبر۳۹) عن عبید اللّٰہ بن أبی رافع عن أبیه أن رسول اللّٰہ ﷺ کان إذا توضأ حرک خاتمه۔ (ابن ماجة شریف، باب تخلیل الأصابع ص۶۵، نمبر۴۴۹) ان دونوں حدیث سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ انگلیوں کا خلال کرنا سنت ہے اور اگر انگوٹھی پہن رکھا ہو تو اس کو بھی حرکت دینا چاہئے۔ انیس

وضو میں انگلیوں کا خلال کس وقت اور کس طرح کرے:

سوال: (۱) وضو میں ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال گٹوں تک ہاتھ دھونے میں کرے یعنی شروع وضو میں یا کہنیوں کے دھوتے وقت کرے، سیدھی طرف سے یا الٹی طرف سے؟

(۲) چوتھائی سر کا مسح یا تمام سر کا مسح کرتے ہیں اس کی کیا دلیل ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

(۱) وضو میں انگلیوں کا خلال ابتدائے وضو میں ہاتھ دھوتے وقت کرنا چاہیے۔(۱)

(۲) حنفیہ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح فرض ہے اور پورے سر کا مسح سنت ہے پورے سر کا مسح کرنا چاہیے تاکہ فرض اور سنت دونوں ادا ہو جائیں۔(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی:۲۶۴)

سر اور گردن کے مسح کے بعد ہاتھ کی انگلیوں کا خلال کرنا:

سوال: وضو میں سر اور گردن کے مسح کے بعد ہاتھ کے انگلیوں کا خلال کرنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

سر اور گردن کے مسح کے بعد انگلیوں کے خلال کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اسے ترک کر دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی:۲۶۸)

---

(۱) انگلیوں کا خلال: دونوں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیانی حصہ کو بھی دھونا ضروری ہے اور مکمل طور پر دھونے کے لیے انگلیوں کے درمیان انگلیاں ڈال کر خلال کرنا چاہیے یہ سنت ہے۔ اس کا طریقہ ہے کہ ہر بار پانی کے ساتھ ایک انگلیاں دوسرے ہاتھ کی پشت کی طرف سے ڈال کر ملا جائے اس طرح کہ پانی کے قطرے انگلیوں سے ٹپک رہے ہوں (ردالمحتار ۱/۱۱۷،۱۱۸) اسی طرح پاؤں دھونے کے وقت پانی ڈالنے کے بعد بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے پاؤں کے اوپر سے انگلیوں کے درمیان میں داخل کیا جائے اور نیچے سے اوپر کی طرف ملا جائے، داہنے پاؤں کی چھنگلی سے شروع کیا جائے اور بائیں پاؤں کی چھنگلی پر ختم کیا جائے۔ (دارقطنی وبیہقی) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور اپنے دونوں پاؤں کی انگلیوں میں تین تین بار خلال کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے وقت اسی طرح کرتے دیکھا، جس طرح میں نے خلال کیا۔ (ابن ماجہ)

اسی طرح مستورد بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اپنی چھنگلی سے دونوں پاؤں کی انگلیوں کا خلال کیا۔ (مسلم واحمد) طہارت کے احکام ومسائل۔ انیس)

عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ قال: إذا توضأت فخلل بين أصابع يديک و رجليک ۔(ترمذی شریف ، باب ما جاء فی تخليل الأصابع ، ص ۱۲ ، نمبر ۳۹/ ابن ماجة شريف ، باب تخليل الأصابع ، ص۶۴، نمبر۴۴۶۔

ان التخليل انمايكون بعدالتثليث لانه سنةالتثليث. (ردالمحتار:۱/۱۷۷) انیس.

(۲) (ومسح كل رأسه مرة)مستوعبة فلوتركه وداوم عليه أثم. الدرالمختارمع ردالمحتار:۱/۱۲۰، انیس۔

طریقۂ مسح سر:

سوال: ایک ہاتھ سے مسح کرنا کیسا ہے؟

الجواب

مسح میں طریقۂ سنت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے کرے۔(۱)

لیکن اگر ایک ہاتھ سے کرلے گا تو مسح ادا ہوجائے گا۔مگر طریقۂ سنت کے موافق نہ ہوگا۔(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۰)

پورے سر اور کانوں کا مسح سنت مؤکدہ ہے:

سوال: ایک مسجد کے حافظ صاحب صرف آدھے سر کا مسح کرتے ہیں اور کانوں کی چاروں طرف انگلی نہیں پھراتے کہتے ہیں کہ یہ تو سنت مؤکدہ ہے اس پر بہت سے لوگوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھنی ترک کردی ہے جب ان سے کہا گیا تو نہیں مانے اور نماز انہوں نے نہیں دہرائی تو ان کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

امام صاحب کا طہارت ونماز کے مسائل سے سب سے زیادہ واقف ہونا ضروری ہے سنت مؤکدہ کے ترک ہوجانے سے فرض نماز ادا ہوجاتی ہے اس کا دہرانا واجب نہیں ہوتا ہے لیکن مستقلاً سنت مؤکدہ کو ترک کرنا بھی کوئی ہلکی اور معمولی چیز نہیں۔(۳) آئندہ ہمیشہ اس کا خیال رکھیں گذشتہ نمازوں کے دہرانے کی ضرورت نہیں پورے سر کا اور کانوں کا بھی مسح کریں اس کو ترک نہ کریں۔(۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۱)

---

(۱) فقال عبد اللّٰه بن زيدؓ نعم...ثم مسح رأسه بيديه فأقبل بهما وأدبر بدأ بمقدم رأسه حتى ذهب بهما إلٰى قفاه ثم ردهما إلٰى المكان الذى بدأ منه ثم غسل رجليه.(بخارى، باب مسح الرأس كله ،ص۳۷ نمبر ۱۸۵ ،أبوداؤد شريف ، باب صفة وضوء النبى صلى الله عليه وسلم ۲۸،نمبر۱۱۸،انیس)

(ومنها مسح كل الرأس مرةً والأظهر أنه يضع كفيه وأصابعه على مقدم رأسه ويمدهما إلىٰ قفاه على وجه يستوعب جميع الرأس. (عالمگيرى،الفصل الثانى فى الوضوء: ۱/۷،ظفير)

(۲) ومسح كل رأسه مرةً) مستوعبةً فلوتركه وداوم عليه أثم (درمختار) والأظهر أن يضع كفيه وأصابعه على مقدم رأسه ويمدهماإلى القفا على وجه يستوعب جميع الرأس (ردالمحتار،الطهارة،سنن الوضوء: ۱/۱۲۰ و ۱۲۱،انیس) ولو كان فى كفه بلل فمسح به أجزاه(عالمگيرى كشورى: ۱/۴،ظفير)

(۳) وسننه الخ)(ومسح كل رأسه مرةً)مستوعبةً فلوتركه وداوم عليه أثم.(الدرالمختار) وقال ابن عابدينؒ:(قوله مستوعبةً)هذا سنة أيضاًكماجزم به فى الفتح ثم نقل عن القنية:أنه إذاداوم على ترك الاستيعاب بلاعذرىأثم قال :وكأنه لظهوررغبته عن السنة.(ردالمحتار: ۱/۱۲۱ ،سنن الوضوء.وكذافى الفتاوىٰ الهندية: ۱/۷،الفصل الثانى فى سنن الوضوء)

(۴) عن ابن عباسؓ أن النبى صلى الله عليه وسلم مسح برأسه وأذنيه ظاهرهما وباطنهما(ترمذى، باب مسح الأذنين ==

سر کے مسح کے وقت چھوٹی انگلی کا کان میں ڈالنا:

سوال: وضو میں سر کا مسح کرنے سے پیشتر چھنگلیاں کا کان میں ڈالنا تعلیم الاسلام میں مستحب لکھا ہے کیا ایسا ہی ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

کانوں کا مسح کرتے وقت چھوٹی انگلی کو کان میں ڈالنا مستحب ہے۔(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔حررہ العبد محمود عفی عنہ ۲/۱/۸۶ھ (فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۱)

کان کا مسح:

سوال: سر کے مسح کے بعد کان کے مسح میں شہادت کی انگلی سے مسح کرنا سنت ہے یا چھوٹی انگلی سے؟

هو المصوب ــــــــــــــــ

شہادت کی انگلی سے مسح کرے (قوله "وأذنيه" أی باطنهما بباطن السبابتين وظاهرهما بباطن الإبهامين، ردالمحتار: ج ۱ ص ۲۴۳)(۲) تحریر: محمد ظہور ندوی عفا اللہ عنہ (فتاویٰ ندوۃ العلماء جلد اول صفحہ ۲۰۱،۲۰۲)

== ظاهرهما وباطنهما، ص ۱۱، نمبر ۳۶، أبوداؤد، باب صفة النبی صلی الله علیه وسلم،ص ۱۶ نمبر ۱۲۱، عن أبی أمامةؓ قال: توضأ النبی صلی الله علیه وسلم فغسل وجهه ثلاثاً ویدیه ثلاثاً،ومسح برأسه، وقال: الأذنان من الرأس، ترمذی، باب ما جاء أن الأذنین من الرأس، ص ۱۶، نمبر ۳۷، انیس) سر کے مسح میں فرض صرف اس کا ایک چوتھائی حصہ ہے۔مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں جو افضل طریقہ ثابت ہے وہ پورے سر اور کانوں کا مسح ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو پانی میں لے کر تر کیا جائے پھر پیشانی کی طرف سے سر پر دونوں ہتھیلی اور انگلیوں کو رکھ کر سر کے پچھلے حصہ کی طرف لایا جائے اور اپنے کلمہ شہادت کی انگلی وانگوٹھے سے کان کے اوپر اور اندر کے حصہ پر مسح کیا جائے۔سر اور کانوں کا ایک بار مسح کرنا سنت ہے اگر ایک سے زائد بار بھی ہاتھ پھیرا جائے تو درست ہے۔(ردالمحتار:۱/۱۲۰،۱۲۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں اپنے سر کا مسح فرمایا اور اس کے ساتھ دونوں کانوں کا بھی (اس طرح کہ) کانوں کے اندرونی حصہ کا شہادت کی انگلی سے مسح کیا اور اوپر کے حصہ کا دونوں انگوٹھوں سے۔(سنن نسائی)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو مسح کرتے ہوئے دونوں کانوں کے سوراخوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں ڈالیں۔(ردالمحتار:۱/۱۲۲)(طہارت کے احکام ومسائل۔انیس)

(۱) ومن الأدب دلک أعضائه وإدخال خنصره صماخ أذنیه. (الفتاویٰ العالمکیریه: ۱/ ۹،الفصل الثالث فی المستحبات ،وکذافی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۷۲،سنن الوضوء ،سهیل اکیڈمی، لاهور،وکذافی الدرالمختارمع ردالمختار: ۱/ ۱۲۵،بیان آداب الوضوء ،سعید.)

(۲) عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال:إن رجلاً أتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله! کیف الطهور؟فدعا بماء فی إناء فغسل کفیه ثلاثاً ثم غسل وجهه ثلاثاً ثم غسل ذراعیه ثلاثاً ثم مسح برأسه وأدخل أصبعیه السبّاحتین فی أذنیه ومسح بإبهامیه علیٰ ظاهر أذنیه وبالسبّاحتین باطن أذنیه ثم غسل رجلیه ثلاثاً ثلاثاً ثم قال هکذاالوضوء،فمن زاد علیٰ هذا أونقص فقد أساء وظلم أوظلم وأساء،أبوداؤد شریف،باب الوضوء ثلاثاً،ص ۲۹ ،نمبر ۱۳۶ ،ابن ماجة شریف،باب ماجاء فی مسح الأذنین،ص ۶۴ ، نمبر ۴۳۹،اس حدیث میں ہے کہ شہادت کی انگلی کان میں ڈالتے۔انیس الرحمٰن۔)

عطر کا پھایہ کان میں سے بوقت مسح نکالنا:

سوال: کان میں اگر عطر کا پھایہ ہو تو مسح کرتے وقت وہ پھایا نکال کر کان میں انگلی پھرانی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب

فی الدرالمختار(سنن الوضوء الخ)(وأذنيه) معاً،فی ردالمحتار:أی باطنهما بباطن السبابتين وظاهرهمابباطن الإبهامين،قهستانی.وفی الدرالمختار:(فی مستحبات الوضوء) (وإدخال خنصره) المبلولة (صماخ أذنيه) عندمسحهما. (۱) اس سے معلوم ہوا کہ اگر پھایا کان کے نرمہ میں رکھا ہو تو مسح کے وقت اس کا نکالنا سنت ہے۔(۲) اور اگر سوراخ میں رکھا ہو تو مستحب ہے۔(۳) ۹؍شعبان ۱۳۳۱ھ، تتمہ ثالثہ، ص:۶۳۔ (امداد الفتاویٰ جدید:۳۵/۱)

پاؤں دھونے کا مسنون طریقہ:

سوال: وضو میں ہر عضو کو تین مرتبہ دھونا سنت ہے تو اس میں پیروں کو تین مرتبہ دھونے کا کیا طریقہ ہے، اگر حوض پر ہے تو کیا ہاتھ سے تین مرتبہ پانی ڈالا جائے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر ہاتھ سے پانی لیکر پیر دھو رہا ہے تو تین مرتبہ پانی لیکر پیر پر بہادے اگر حوض میں پیر ڈبو کر پیر دھو رہا ہے تو تین مرتبہ ڈبودے، کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے، سنت ادا ہوگئی۔(۴) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۵۳/۵)

پیر کی انگلیوں کے خلال کا طریقہ:

سوال: پیروں کی انگلیوں کے خلال کا کیا طریقہ ہے؟

---

(۱) **الدرالمختارمع ردالمحتار، كتاب الطهارة،سنن الوضوء ومستحباته: ج ا ص ۱۲۱ تا ۱۲۵ ،بيروت،انيس**

(۲) اس لئے کہ کان کے اندر کے تمام حصہ کا مسح سنت ہے اور وہ پھایا نکالے بغیر ممکن نہیں ہے اور سنت کا موقوف علیہ سنت ہوتا ہے لہذا اس کا نکالنا سنت ہوا۔ س

(۳) اس لئے کہ کان کے سوراخ میں تر انگلی ڈالنا مستحب ہے جو بغیر پھایا نکالے ممکن نہیں ہے، لہذا نکالنا مستحب ہوا۔ سعید

(۴) **ومنها تكرارالغسل ثلاثاً....تفسيرالسبوغ أن يصل الماء إلى العضوويسيل ويتقاطرمنه قطرات،وينبغی أن يغسل الأعضاء كل مرةغسلاًيصل الماء إلى جميع مايجب غسله فی الوضوء الخ. (الفتاویٰ العالمكيريه : ۷/۱،الفصل الثانی فی سنن الوضوء،رشيديه.)**

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو داہنے پیر کی چھوٹی انگلی اور اس کے برابر والی انگلی کے درمیان اس طرح داخل کرے کہ صرف دوانگلیوں کے درمیانی حصے پر ہی نہ پہنچے بلکہ انگلیوں کے نیچے حصہ پر بھی پہنچ جائے پھر اس کے برابر والی دوانگلیوں میں خلال کرے اس طرح پوری انگلیوں کا خلال کرے، بائیں پیر کے انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی سے شروع کریں گے ، چھوٹی تک خلال کریں گے۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵۲/۵)

وضو میں ولاء اور ہر عضو پر دعا:

سوال: وضو میں جلدی کرنا مستحب ہے یا نہیں؟ اگر مستحب ہے تو ہر عضو دھوتے وقت بسم اللہ ،کلمہء شہادت اور ہر عضو کے لیے مستقل ماثور دعا ہر عضو دھونے کے بعد درود شریف علاوہ ازیں دعا "رب اغفر لی ذنبی" کیسے پڑھ سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

وضو اور غسل میں ولاء سنت ہے یعنی اتنی تاخیر نہ کرے کہ معتدل ہوا میں دوسرا عضو دھونے سے قبل پہلا عضو خشک ہوجائے ،اسی طرح مسح کے بعد اور تیمّم میں اتنی دیر کرنا کہ اس وقت اگر کوئی عضو دھویا ہوتا تو وہ اتنی دیر میں خشک ہوجاتا خلاف سنت ہے۔ (۲)

"كذا حرر العلامة ابن عابدينؒ وقال: فاغتنم هذا التحرير. (ردالمحتار: ۱۱۴/۱) ولاء کی تعریف مذکور کے تحت اتنے وقت میں تو بہت کچھ پڑھ سکتا ہے، علاوہ ازیں کتب فقہیہ میں ان دعاؤں میں سے کوئی ایک پڑھنا مذکور ہے اور حقیقت یہ کہ "اللّٰهم اغفرلی ذنبی الخ" کے سوا کوئی دعا بھی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، فضائل میں کسی ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے جواز کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے سنت نہ سمجھا جائے ،اس زمانہ

---

(۱) و) تخليل (الأصابع) اليدين بالتشبيك والرجلين بخنصر يده اليسرىٰ بادئا بخنصر رجله اليمنىٰ وهذا بعد دخول الماء خلالها، فلو منضمة فرض. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۱۱۸/۱،سنن الوضوء،سعید، وکذا فی الفتاویٰ العالمکیریہ: ۷/۱، الفصل الثانی فی سنن الوضوء، رشیدیہ، وکذا فی النہر الفائق: ۴۳/۱،سنن الوضوء، امدادیہ)

(۲) وضو کرنے میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک عضو دھونے یا مسح کرنے کے بعد دوسرا عضو دھونے یا مسح کرنے میں اتنا وقفہ نہ ہو کہ بدن اور موسم کے اعتدال کے باجود (بلا عذر) پہلا عضو سوکھ جائے۔ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ اس لیے مسنون طریقہ پر پے در پے اعضا کو دھونا چاہیے۔ البتہ اگر عذر ہو جیسے پانی ختم ہوجائے اور لانے کے لیے جانے پر عضو سوکھ جائے یا تپش ایسی ہو کہ عضو دھوتے ہی سوکھ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (ردالمحتار ۱۲۲/۱، طہارت کے احکام ومسائل: ۱۱۴۔ انیس)

میں لوگ غلبہ جہالت کی وجہ سے سنت سمجھنے لگتے ہیں لہذا ایسے امور سے احتراز کرنا چاہیے۔

قال فی الشامية: تحت (قوله والتسمية كما مر) فصار مجموع ما يذكر عند كل عضو التسمية والشهادة والدعاء والصلوٰة على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم، لكن قال صاحب الهداية فی مختارات النوازل: ويسمى عند غسل كل عضو أو يدعو بالدعاء المأثور فيه أو يذكر كلمة شهادة ويصلى على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فأتاه فی الجميع بأو، لكن رأيت فی الحلية عن المختارات: ويدعو بالواو وبأو فی البواقی فليراجع (ردالمحتار: ۱/۱۱۸) وقال العلامة الرافعیؒ: رجعت النوازل فرأيته عبر بأو فی جميع المعاطيف (التحرير المختار: ۱/۱۸).

وفی هذا البحث من العلائية: قال المحقق الشافعية الرملیؒ: فيعمل به فی فضائل الأعمال وإن أنكره النوویؒ (فائدة) شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه وأن يدخل تحت أصل عام وأن لا يعتقد سنية ذلك الحديث (ردالمحتار: ۲/۱۱۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۸/شعبان ۷۸ھ۔ (احسن الفتاویٰ: ۲/۱۴)

مستحبات وآداب وضو

گھر سے وضو کر کے مسجد میں آنا افضل ہے:

سوال: زید کہتا ہے کہ مسجد میں آ کر وضو کرنے کے بجائے گھر سے وضو کر کے آنا زیادہ ثواب ہے، کیا زید کا یہ قول صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

زید کا قول صحیح ہے گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف آنے کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

عن أبی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم : صلوٰة الرجل فی الجماعة تضعف علی صلوٰته فی بيته وسوقه خمساً وعشرين ضعفاً وذلک أنه إذا توضأ فأحسن الوضوء ثم خرج إلی المسجد لايخرجه إلاالصلوٰة لم يخط خطوةً إلا رفعت له بها درجة وحط عنه بها خطيئة فإذاصلی لم تزل الملائكة تصلی عليه مادام فی مصلاه ،أللّٰهم صلِّ عليه ،أللّٰهم ارحمه، ولايزال أحدكم فی صلوٰة ما انتظرالصلوٰة.(متفق عليه)

وعن أبی أمامة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: من خرج من بيته متطهراً إلی صلوٰة مكتوبة فأجره كأجرالحاج المحرم ومن خرج إلی تسبيح الضحیٰ لاينصبه إلاإياه فأجره كأجرالمعتمروصلوٰة علی أثرصلوٰة لا لغوبينهماكتاب فی عليين''.(رواه أحمدؒ وأبوداؤدؒ)

''وعن عبدالله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه(فی حديث طويل)ومامن رجل يتطهرفيحسن الطهورثم يعمد إلی مسجد من هذه المساجد إلاكتب الله له بكل خطوة يخطوهاحسنة ورفعه بهادرجة وحط عنه بهاسيئة''.(رواه مسلمؒ)

''وعن سهل بن حنيف مرفوعاً:من تطهرفی بيته ثم أتی مسجد قباء فصلی فيه صلوٰة كان له كأجرعمرة''.(ابن ماجه)

عقلاً بھی گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف چلنے کی فضیلت ظاہر ہے اس لیے کہ اس میں مسجد اور جماعت کا احترام

ہے۔کوئی شخص کسی دربار میں حاضر ہونا چاہے تو اس کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ گھر سے صاف ستھرا ہو کر چلے، نہ یہ کہ دربار میں پہنچ کر پانی تلاش کرے، یہ دربار کی عظمت کے خلاف ہے، جیسا کہ حرم میں داخل ہونے والے کے لیے مواقیت سے احرام باندھنے کے حکم سے بھی بیت اللہ کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ آج کل مساجد میں جا کر وضو کرنے کا جو عام دستور ہو گیا ہے یہ درست نہیں،(۱) البتہ مسافر یا معذور وغیرہ کے لیے کوئی مضائقہ نہیں۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔۲۴ / ربیع الاول ۷۸ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۱۱-۱۲)

زبان سے وضو کی نیت کرنا مستحب ہے:

سوال: وضو کرتے وقت جو نیت کرتے ہیں زبان سے کرنا ثابت ہے یا نہیں، بینوا توجروا؟

الجواب ـــــــــ باسم ملهم الصواب

مستحب ہے۔''قال في التنوير: (ومن آدابه): ...... (الجمع بين نية القلب وفعل اللسان)، وفي الشرح: هذه رتبة وسطى بين من سن التلفظ بالنية ومن كرهه لعدم نقله عن السلف''. (ردالمحتار: ۱/۱۱۸)(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔۸/ رمضان ۹۳ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۹)

دوران وضو قبلہ رخ ہونا:

سوال: کسی خاص رخ پر بیٹھ کر وضو کرنا افضل ہے یا نہیں؟

الجواب ـــــــــ وباللّٰه التوفيق

ہر سمت بیٹھ کر وضو کیا جا سکتا ہے لیکن قبلہ رخ بہتر ہے۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔محمد عثمان غنی ۳/۸/ ۱۳۷۱ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ: ۲/۶۲)

وضو میں ہر عضو پر بسم اللہ پڑھنا:

سوال: وضو میں ہر عضو پر بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ـــــــــ باسم ملهم الصواب

وضو میں ہر عضو دھوتے وقت بسم اللہ اور کلمۂ شہادت پڑھنا مستحب ہے علاوہ ازیں ہر عضو کے لیے مخصوص دعا بھی

---

(۱) یعنی مناسب نہیں ہے۔انیس

(۲) الدر المختار مع ردالمحتار، مطلب في تتميم مندوبات الوضوء، ج۱ص ۱۲۴، ۱۲۷، بیروت، انیس الرحمٰن قاسمی

(۳) (ومن آدابه)...(استقبال القبلة) (تنوير الأبصار مع ردالمحتار: ۱/۲۴۸

الدر المختار مع ردالمحتار، مطلب في تتميم مندوبات الوضوء، ج۱ص ۱۲۴، ۱۲۵، بیروت، انیس

ماثور ہے اور عضودھونے کے بعد درود شریف بھی مگران سب کا پڑھنا مرادنہیں بلکہ ان میں سے کوئی ایک دعا پڑھ لے۔"قال العلائیؒ فی آداب الوضوء: (والتسمية) كمامر (عندغسل كل عضو)وكذا الممسوح(والدعاء بالواردعنده) أى عندكل عضو، وقدرواه ابن حبانؒ وغيره عنه عليه الصلوٰة والسلام من طرق، وفي الشامية:(قوله والتسمية كمامر)أى من الصيغة الوارد ة وهى :بسم اللّٰه العظيم، والحمد للّٰه على دين الإسلام،وزاد فى المنية التشهد هناأيضاً تبعاً للمحيط وشرح الجامع لقاضى خانؒ،قال فى الحلية:وعن البراء ابن عازبؓ عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال: مامن عبد يقول حين يتوضأ بسم اللّٰه ثم يقول بكل عضوأشهدأن لاإله إلااللّٰه وحده لاشريک له وأشهدأن محمداًعبده ورسوله، ثم يقول حين يفرغ: اللّٰهم اجعلنى من التوابين واجعلنى من المتطهرين إلافتحت له ثمانية أبواب الجنة يدخل من أيهاشاء،الخ(قوله والدعاء بالوارد)فيقول بعدالتسمية عند المضمضة:اللّٰهم أعنّى علىٰ تلاوة القراٰن وذكرک وشكرک وحسن عبادتک، و عند الاستنشاق: اللّٰهم أرحنى رائحة الجنة ولاترحنى رائحة النار،وعندغسل الوجه: اللّٰهم بيِّض وجهى يوم تبيض وجوه وتسود وجوه، وعندغسل يده اليمنىٰ: اللّٰهم أعطنى كتابى بيمينى وحاسبنى حساباً يسيراً،وعندغسل اليسرىٰ: اللّٰهم لاتعطنى كتابى بشمالى و لا من وراء ظهرى ،وعندمسح رأسه: اللّٰهم أظلنى تحت عرشک يوم لاظل إلاظل عرشک، وعند مسح أذنيه: اللّٰهم اجعلنى من الذين يستمعون القول فيتبعون أحسنه، وعند مسح عنقه: اللّٰهم أعتق رقبتى من النار،وعندغسل رجله اليمنىٰ: اللّٰهم ثبت قدمي على الصراط يوم تزل الأقدام، وعندغسل اليسرىٰ: اللّٰهم اجعل ذنبى مغفوراً وسعيى مشكوراً وتجارتى لن تبور(إلى قوله)وسياتى أنه يصلى على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم بعدغسل كل عضو(إلى قوله)فأتى فى الجميع بأو. ردالمحتار: ۱/ ۱۱۸" فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔۲۵/ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ (احسن الفتاویٰ:۲/۱۰۔۱۱)

اعضائے وضو کو دھوتے وقت دعا:

سوال:۔آدابِ وضو وآدابِ اذان میں خاموش رہ کر ہر عضو کی دعا پڑھنا اوراذان کا جواب دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر اذان یا وضو کے دوران دنیا کی باتیں کی جائیں تو کیا حرج ہے؟

هو المصوب

اذان کا جواب دینا عملاً واجب اور قولاً مستحب ہے(ويجيب وجوباً،وقال الحلوانیؒ :ندباً،الواجب

الإجابة بالقدم، **درمختار مع الرد**: ج ۲ ص ۶۵) اور وضو میں جو دعائیں منقول ہیں ان کا پڑھنا مستحب ہے یا پھر خاموش رہیں، دنیاوی باتوں سے احتراز لازم ہے (**وأن يقول عند كل عضو أشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله وأن لايتكلم فيه بكلام الناس، كذا في المحيط، الفتاوىٰ الهندية**: ج ۱ ص ۸) تاہم ضروری دینی باتیں کر سکتے ہیں، امام ومصلیان کا حکم یکساں ہے۔ تحریر: محمد طارق ندوی، تصویب: ناصر علی ندوی (فتاویٰ ندوۃ العلماء: ج ۱ صفحہ ۲۰۴)

وضو کی دعا:

وضو کے اندر کونسی دعا حدیث سے ثابت ہے ہم نے پڑھا ہے کہ وضو کے بعد سورہ إنا أنزلنا پڑھنے پر چالیس سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟

الجواب ــــــــــــــــ وباللّٰه التوفيق

وضو میں ابتداءً **بسم الله العلى العظيم والحمد لله علىٰ دين الإسلام** پڑھنا(۱) اور اعضاء وضو کو دھوتے وقت **أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله** اور وضو سے فارغ ہونے کے بعد **اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين** پڑھنا(۲) مسنون ہے جس کی حدیث میں بہت زیادہ فضیلت ہے۔

حدیث میں لکھا ہے کہ اس شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جس میں چاہے داخل ہو جاوے اور اگر دھیان سے دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھ لے جو کہ مستحب ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو تو گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

قال في الحلية عن البراء بن عازب رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي ﷺ قال: ما من عبد يقول حين يتوضأ بسم اللّٰه ثم يقول بكل عضو أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده و رسوله ثم يقول حين يفرغ :اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين إلا فتحت له ثمانية أبواب الجنة يدخل من أيها شاء فإن قام من وقته ذلک فصلى ركعتين يقرأ فيهما ويعلم ما يقول انفتل من صلاته كيوم ولدته أمه ثم يقال له استأنف العمل رواه الحافظ المستغفري وقال: حديث حسن، شامي: ج ۱ ص ۳۹. (۳)

اس کے علاوہ ہر عضو کے دھونے کے وقت کی دعائیں بھی منقول ہیں انکا پڑھنا مستحب ہے وضو کے بعد'' إنا

(۱) الدر المختار على الرد: ۱/۱۰۱، مطبع عثمانیہ
(۲) رد المحتار: ۱/۱۱۸، مطبع عثمانیہ
(۳) رد المحتار: ۱/۱۱۸، مطبع عثمانیہ

أنزلنا'' کا پڑھنا آداب وضو میں سے لکھا ہے:''**ومن الآداب (إلى أن قال) وقراء ة سورة القدر''. (الدر المختار مع ردالمحتار:۱/۹۷)**

''**إنا أنزلنا**'' کے پڑھنے پر چالیس سال کے گناہ معاف ہونے کی حدیث ہماری نظر سے نہیں گذری ہے۔البتہ حدیث میں بعد وضو کے'' إنا أنزلنا'' پڑھنے کی یہ فضیلت لکھی ہے کہ جس نے ایک مرتبہ''إنا أنزلنا'' پڑھی اس کا شمار صدیقین میں ہوگا اور جس نے دو مرتبہ پڑھی اس کا نام شہداء کے رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے اور جس نے تین مرتبہ پڑھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حشر انبیا علیہم السلام کے ساتھ فرمائیں گے۔(۱) کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، الجواب صحیح: محمود عفی عنہ (منتخبات نظام الفتاویٰ:۱/۱۴۰۔۱۴۱)

وضو کے ہر ہر عضو کی دعا:

سوال: جناب حضرت مفتی صاحب زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا کہ وضو کرتے وقت سارے وضو کے دوران کچھ دعائیں پڑھتے رہتے تھے۔ مجھے بھی شوق ہے براہِ کرم وہ دعائیں لکھ دیں؟ محمد اقبال از ساہیوال۔

الجواب

عالمگیری ج ۱ ص ۵ میں آداب وضو میں لکھا ہے: کہ ہر ہر عضو کو دھوتے وقت بسم اللہ پڑھی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلی کرتے ہوئے یہ دعا پڑھے۔

۱. **اللّٰهم أعني على تلاوة القرآن وذكرك وشكرك وحسن عبادتك.**
ناک میں پانی ڈالتے وقت یہ پڑھیں

۲. **اللّٰهم أرحنى رائحة الجنة ولا ترحنى رائحة النار.**
چہرہ دھوتے وقت یہ پڑھیں۔

۳. **اللّٰهم بيض وجهي يوم تبيض وجوه وتسود وجوه.**
دایاں بازو دھوتے وقت یہ پڑھیں۔

۴. **اللّٰهم أعطنى كتابى بيمينى وحاسبنى حساباً يسيراً**
بایاں بازو دھوتے وقت یہ پڑھیں۔

۵. **اللّٰهم لاتعطنى كتابى بشمالى ولا من وراء ظهرى .**

---

(۱) **من قرأ سورة القدر مرة واحدة كان من الصديقين ومن قرأها مرتين كتب فى ليلة ديوان الشهداء ومن قرأها ثلاثاً حشرهٔ الله محشر الأنبياء.** (مراقی الفلاح الطحطاوی:۲۳)

سر کا مسح کرتے وقت یہ پڑھیں۔

۶. **اللّٰهم أظلني تحت ظل عرشک یوم لا ظل إلا ظل عرشک**

کانوں کا مسح کرتے ہوئے یہ پڑھیں۔

۷. **اللّٰهم اجعلني من الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه .**

گردن کا مسح کرتے ہوئے یہ پڑھیں۔

۸. **اللّٰهم أعتق رقبتي من النار**

دایاں پاؤں دھوتے وقت یہ پڑھیں

۹. **اللّٰهم ثبت قدمي علی الصراط یوم تزل الأقدام**

بایاں پاؤں دھوتے وقت یہ پڑھیں۔

۱۰. **اللّٰهم اجعل ذنبي مغفوراً وسعیي مشکوراً وتجارتي لن تبور**

اور پھر ہر عضو کو دھونے کے بعد درود شریف بھی پڑھیں۔ **فقط واللّٰه أعلم**، احقر محمد انور عفا اللہ عنہ، مفتی خیر المدارس، ملتان ۱۴۰۹/۵/۱۰ھ۔

ادعیہ مذکورہ کا ترجمہ:

۱: اے اللہ! تلاوتِ قرآن اور اپنے ذکر وشکر کرنے کی توفیق عطا فرما۔

۲: اے اللہ! جنت کی خوشبو نصیب فرما اور دوزخ کی بدبو سے بچا۔

۳: اے اللہ! میرا چہرہ اس دن چمک دار بنا جس دن کہ کچھ چہرے سفید اور کچھ سیاہ ہوں گے۔

۴: اے اللہ! مجھے میرا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں عطا فرمانا اور مجھ سے ہلکا پھلکا حساب فرمانا۔

۵: اے اللہ! مجھے میرا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں نہ دینا اور نہ پشت کے پیچھے سے۔

۶: اے اللہ! مجھے اس دن اپنے عرش کے سائے میں لے لینا جس دن کہ آپ کے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔

۷: اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا جو اچھی سنی ہوئی بات پر عمل بھی کرتے ہیں۔

۸: اے اللہ! میری گردن کو آگ سے آزاد فرما۔

۹: اے اللہ! مجھے پل صراط پر ثابت قدم رکھنا جس دن کہ بہت سے قدم پھسل جائیں گے۔

۱۰: اے اللہ! میرے گناہوں کو بخش دے میری کوشش کو قبول فرما اور میری تجارت کو خسارے سے بچا۔

(خیر الفتاویٰ ۲/۷۱-۷۲)

وضو کے بعد دعا کا ثبوت:

سوال: عام طور سے وضو میں جو دعا پڑھی جاتی ہے اور بعض کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے اور مکتب و جماعت وغیرہ میں کثرت سے یاد کرائی جاتی ہے تو اس کا پڑھنا کیسا ہے۔ بدعت تو نہیں ہے؟ کیونکہ میں نے ماہنامہ ''صراط مستقیم'' میں پڑھا تو اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ وضو میں کوئی دعا پڑھنا بدعت ہے اور اس میں ضروری سمجھ کر پڑھنے کی کوئی قید نہیں، صاف طور پر لکھا ہے کہ وضو میں دعا پڑھنا سراسر بدعت ہے۔ اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

هو المصوب

وضو کے وقت دعا پڑھنا بہتر ہے، البتہ لازم سمجھنا بدعت ہے: **وعن البراءؓ مرفوعاً: مامن عبد يقول حين يتوضأ بسم الله، ثم يقول عند كل عضو: أشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، ثم يقول حين فرغ: اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين، إلافتحت له ثمانية أبواب الجنة يدخل من أيها شاء، فإن قام من فوره ذلك فصلى ركعتين يقرأ فيهما ويعلم مايقول انفتل من صلوٰته كيوم ولدته أمه ثم يقال له استأنف العمل، رواه المستغفري في الدعوات، وقال حسن غريب (إعلاء السنن: ج ١ ص ٢٧، سنن الترمذي، أبواب الطهارة، فيمايقال بعد الوضوء: حديث: ٥٥، (والدعاء الوارد عنده) أي عند كل عضو، وقدرواه ابن حبانؒ وغيره عنه عليه الصلاة والسلام من طرق، قال محقق الشافعية الرمليؒ: فيعمل به في فضائل الأعمال وإن أنكره النوويؒ، درمختار: ج ١ ص ٢٥٢)** تحریر: محمد طارق ندوی، تصویب: ناصر علی ندوی (فتاویٰ ندوۃ العلماء: ج ۱ صفحہ ۲۰۴و۲۰۵)

اذان کے وقت وضو کرتے ہوئے وضو کی دعا پڑھنے کا حکم:

(۱) وضو کرتے وقت اگر اذان ہو رہی ہو تو کیا جو دعائیں وضو کے عضو دھونے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں وہ پڑھنی چاہئیں؟ یا اذان کا جواب دینا چاہئے؟

(۲) کیا تصویر (جاندار) کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے، اگر جاندار کی تصویر نکلی ہوئی نہ ہو، یعنی سامنے نظر نہ آتی ہو، لیکن کسی طرح چھپی ہوئی ہو تو ایسی تصویر دیکھنا بھی گناہ ہے (مثلاً کسی کتاب کے اندر تصویر کا ہونا اخبار کے اندر کے ورقوں پر جاندار تصویر کا ہونا وغیرہ)

(۳) انگریز لوگ جب ان کی کرسمس ہوتی ہے تو مسلمان کے گھر میں بھی اکثر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں تو کیا مسلمان کو بھی (اخلاقاً) جن انگریز نے اس کے گھر کارڈ بھیجا ہے کرسمس کارڈ بھیجنا جائز ہے؟

(۴) جب اذان میں مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو منہ کب پھیرے اور کہاں تک تفصیل سے لکھیں؟

الجواب ــــــــــــــــ و باللّٰہ التوفیق

(۱) بہتر ہے کہ کلماتِ اذان کا جواب دیا جائے۔

(۲) عزت وعظمت ومحبت یا رغبت وشہوت یا بدنگاہی کے جذبہ سے دیکھنا منع ہے۔

(۳) ہاں اپنے عید وغیرہ خوشی کے موقع میں اخلاقاً مسلمان بھی بھیج سکتے ہیں۔

(۴) جب **حی علی الصلوٰۃ** اور **حی علی الفلاح** کہنا شروع کرے تو منہ پھیرے اور پورا چہرہ کندھے تک پھیرے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱/۱۳۹۶ھ۔

(منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/۱۴۲، ۱۴۳)

وضو کے بعد آسمان کی طرف دیکھنا:

سوال: وضو کرنے کے بعد آسمان کی طرف دیکھنے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

وضو کرنے کے بعد جس طرح کچھ ادعیہ کا مستحب ہونا ثابت ہے جیسے: **اللّٰهم اجعلني من التوابين الخ** **یاسبحانک اللّٰهم وبحمدک الخ** اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ ان ادعیہ کے پڑھتے وقت نظر آسمان کی طرف ہو۔

"قال فی الرد: (تحت قوله وأن يقول بعده) وزاد في المنية أيضاً: وأن يقول بعد فراغه سبحانک اللّٰهم وبحمدک أشهد أن لاإله إلاأنت أستغفرک وأتوب إليک وأشهد أن محمداً عبدک ورسولک ناظراً إلى السماء". (ردالمحتار: ۱/۹۵، مطلب فی بیان ارتقاء الحدیث الضعیف الی مرتبة الحسن) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۵/ صفر ۸۴ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۱۶-۱۷)

وضو کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دعا مانگنا:

سوال: دعا مانگتے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا کیسا ہے، وضو کے بعد نگاہ اٹھا کر دعا مانگیں یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً ومصلیاً

دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھائے۔ (۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۵)

---

(۱) ويكره أن يرفع بصره إلى السماء لمافيه من ترك الأدب (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ۳۱۶، فصل في صفة الأذكار، قديمي، عن عقبة بن عامر الجهني رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم نحوه.... قال عندقوله "فأحسن الوضوء، ثم رفع نظره إلى السماء، (سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب مايقول الرجل إذاتوضأ: ۱/۲۶، امداديه، وكذافي الحصن الحصين: ۱۵۹، مير محمد كتب خانه، كراچی) البتہ وضو کے بعد شہادت وغیرہ پڑھتے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھائے ("وزاد في المنية أيضاً: وأن يقول بعد فراغه سبحانك اللّٰهم وبحمدك أشهد أن لاإله ألاأنت أستغفرك وأتوب إليك وأشهد أن محمداً عبدك ورسولك ناظراً إلى السماء" (ردالمحتار مطلب في بيان ارتقاء الحديث الضعيف الى مرتبة الحسن: ۱/۱۲۸، سعيد۔

وضو کے بعد کلمۂ شہادت پڑھتے وقت آسمان کی طرف انگشت شہادت اٹھانا:

سوال: وضو کے بعد کلمۂ شہادت پڑھتے وقت آسمان کی طرف انگشت شہادت اٹھانا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

بعض فقہانے اس کو ذکر کیا ہے اور بعض نے صرف آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے کو بیان کیا ہے لہذا دونوں کی گنجائش ہے، اسے ضروری نہ سمجھا جائے اور نہ کرنے والوں پر نکیر نہ کیا جائے یہ محض آداب میں سے ہے۔ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: "(**قوله والإتيان بالشهادتين بعده) ذكر الغزنوی أنه يشير بسبابته حين النظر إلى السماء**" یعنی آداب وضو میں سے ایک ادب یہ ہے کہ وضو کے بعد شہادتین پڑھے، غزنویؒ نے بیان کیا ہے کہ آسمان کی طرف دیکھتے وقت اپنے انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۴۳)

شامی میں ہے: "**وزادفی المنية أيضاً وأن يقول بعدفراغه سبحانک اللّٰهم وبحمدک أشهد أن لا إلٰه إلاأنت أستغفرک وأتوب إليک وأشهدأن محمداعبدک ورسولک ناظراًإلى السماء**" (شامی: ۱/۱۱۹، آداب الوضوء)

حصن حصین میں ہے: "**وإذافرغ من الوضوء رفع نظره إلى السماء وليقل أشهد أن لاإلٰه إلاالله ...إلى قوله ...من توضأ فقال سبحانک اللّٰهم وبحمدک أستغفرک وأتوب إليک کتب له فی رق ثم جعل فی طابع فلم يكسرإلى يوم القيامة**" یعنی وضو سے فارغ ہوکر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر تین مرتبہ کلمۂ شہادت پڑھے "**أشهدأن لاإلٰه إلاالله وحده لاشريک له وأشهدأن محمداًعبده ورسوله**" اس کے بعد یہ دعا پڑھے "**اللّٰهم اجعلنی من التوابين واجعلنی من المتطهرين، سبحانک اللّٰهم وبحمدک أشهدأن لاإلٰه إلاأنت أستغفرک وأتوب إليک**" یا یہ دعا پڑھے "**سبحانک اللّٰهم وبحمدک أستغفرک وأتوب إليک**" جو شخص وضو کرتے وقت مذکورہ بالا دعا کرتا ہے اس کے لیے (مغفرت کا) ایک پرچہ لکھ کر اور پھر اس پر ایک مہر لگا کر رکھ دیا جاتا ہے، قیامت کے دن تک اس کی مہر نہ توڑی جائے گی (اور وہ مغفرت کا حکم برقرار رہے گا) (حصن حصین عربی: ۶۸۔۶۹، حصن حصین مترجم: ۱۰۰، از حضرت مولانا ادریس صاحبؒ) ہو سکے تو قبلہ رخ ہوکر دعا پڑھے۔

بدائع میں ہے: "**ثم يستقبل القبلة ويقول أشهد........الخ** پھر قبلہ رخ ہوکر پڑھے: "**أشهدأن لاإلٰه إلاالله وأشهدأن محمداًرسول الله**". (بدائع الصنائع: ۱/۲۳، آداب الوضوء) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۱۴۰، ۱۴۱)

وضو کے بعد سورۂ قدر پڑھنا:

سوال: وضو کے بعد آسمان کی طرف نظر کر کے سورۂ قدر پڑھنا مستحب ہے؟ اس سلسلہ میں رہبری کیجئے (حکیم واسع موہانی)

الجواب

احادیث میں اس بات کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ پوری طرح وضو کرنے کے بعد "**أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله**" پڑھا جائے۔(۱)

فقہا نے لکھا ہے کہ کھڑا ہو کر اور قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھے اور بعض حضرات نے اس کو بھی مستحب قرار دیا ہے کہ اس موقعہ پر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا جائے،(۲) علامہ حصکفیؒ نے اس موقع سے سورۂ قدر کی تلاوت کا بھی ذکر کیا ہے اور علامہ شامیؒ نے اس سلسلہ میں فقیہ ابواللیثؒ کی ذکر کی ہوئی حدیثوں کا حوالہ دیا ہے۔ (۳)

ان سب کو ملا کر واضح ہوا کہ (۴) وضو کے بعد قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو، آسمان کی طرف نگاہ کرے، انگشت شہادت اٹھائے اور کلمۂ شہادت پڑھے اور سورۂ قدر کی تلاوت بھی کر لے، وضو کے افعال سے فارغ ہونے کے بعد۔ واللہ اعلم (کتاب الفتاویٰ:۲/۵۱-۵۲)

وضو کے بعد اِنَّا اَنۡزَلۡنَا پڑھنا:

سوال: آپ نے بہشتی زیور کے حصہ اول میں لکھا ہے 'بعد وضو کے "**إنا أنزلناه**" اور دعا پڑھنا چاہئے اور ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ "اس کے ثابت ہونے کی حدیث موضوع ہے اور پڑھنا اس کا خلاف سنت ہے" آیا ہم کس کے قول کو تسلیم کریں اور آپ نے کسی صحیح روایت سے لکھا ہو تو جواب دیں؟

الجواب

منیۃ المصلی میں "**إنا أنزلناه** پڑھنے کو لکھا ہے" اور شبہ کا جواب (۵) یہ ہے کہ "یہ نہیں لکھا ہے کہ اس کا پڑھنا سنت

---

(۱) "قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من توضأ فأحسن الوضوء ثم قال: أشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين، فتحت له ثمانية أبواب من الجنة يدخل من أيها شاء، عن عمر بن الخطاب رضي اللّٰه عنه. (الجامع للترمذي، حديث نمبر: ۵۵، باب ما يقال بعد الوضوء، أبواب الطهارة: ص۱۸، محشی)

(۲) ردالمحتار: ۱/۲۳۱۔

(۳) طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح: ۴۳۔

(۴) یعنی بہتر ہے کہ۔ انیس۔

(۵) حضرت مولانا مدظلہم العالی کا جواب مبنی بر تسلیم صحت بیان سائل ہے، ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کو موضوع کہا اور نہ اس پر عمل کو خلاف سنت بتلایا جیسا کہ جناب مولانا عبدالحئیؒ صاحب کی کتاب سعایہ سے یہ امر واضح ہے چنانچہ انہوں نے لکھا ہے "وفي المصنوع في معرفة الموضوع لعلي القاريؒ حديث "من قرأ في الفجر ب"ألم نشرح" و"ألم تر" لم ير مد، قال السخاويؒ لا أصل له وكذا قراءة "إنا أنزلناه". ==

یا ثواب ہے'' اور ملا علی قاری اگر خلاف سنت کہتے ہیں تو جب کہ اس کو کوئی سنت سمجھے ورنہ کوئی حرج نہیں پس تعارض نہ رہا، في رد المحتار تحت قوله: وأما الموضوع فلا يجوز العمل به بحال وأما لو كان داخلاً في أصل عام فلا مانع منه لا لجعله حديثاً بل لدخوله تحت الأصل العام اهـ. رد المحتار ۱/ ۱۳۳. (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۴ھ۔ امداد جلد اول صفحہ ۱۲۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۱-۳۲)

وضو کے وقت کلی اور ناک میں پانی دینے میں مبالغہ کرنا:

سوال: وضو کرتے ہوئے دہن اور ناک میں پانی دینے کے وقت مبالغہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب

یہ مبالغہ کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا مستحب ہے۔ (۲) واللہ اعلم۔ بدست خاص، ص: ۶۔ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۱۳۹)

== عقيب الوضوء لاأصل له وهومفوت سنة، وأرادالسخاويؒ أنه لاأصل له في المرفوع وإلا فقد ذكره أبو الليث السمرقنديؒ وهو إمام جليل وأما قوله وهو مفوت سنة أي سنة الوضوء ففيه أن الوضوء ليس له سنة مستقلة كما حققه الغزاليؒ وإنما يستحب أن يصلي بعد كل وضوء ولم يشترط أحد فورية ما بعده ولا ينافي قراءة سورة وغيرها آه'' سعاية: ۱۸۳ جلد اول. اس سے معلوم ہوا کہ اس کے موضوع کہنے کی نسبت علی قاریؒ کی طرف بالکل غلط ہے بلکہ سخاویؒ نے اس کی نسبت ایک تو ''لا أصل له'' کہا تھا (موضوع انہوں نے بھی نہ کہا تھا) پس علی قاریؒ نے ان کے قول کی توجیہ کی اور دوسرے انہوں نے اس کو ''مفوت سنہ'' کہا تھا (خلاف سنت نہ کہا تھا) علی قاریؒ نے اس کا جواب دیا پس وہ قراءۃ ''إنا أنزلنا'' کے حامی ہوئے نہ کہ مانع، اس سے سائل کے بیان کی غلطی معلوم ہوگئی، اب سنو کہ سعایہ میں ہے: في الحلية: سئل عن أحاديث ذكرها أبو الليثؒ في مقدمته في فضل قراءة سورة القدر بعد الوضوء لشيخنا الحافظ ابن حجر العسقلانيؒ فأجاب: بأنه لم يثبت منها شيء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم لا من قوله ولا من فعله والعلماء يتساهلون في ذكر الحديث الضعيف والعمل به في فضائل الأعمال. آه، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ''قراءۃ سورۃ قدر'' ضعیف ہے نہ کہ موضوع اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سخاویؒ کے قول ''لا أصل له'' سے اس کا موضوع ہونا نہیں ظاہر ہوتا جب یہ امر معلوم ہوگیا تو اب سمجھو کہ شرح منیہ میں ہے: ومن الأداب أن يقرأ بعد الفراغ من الوضوء سورة ''إنا أنزلناه'' مرة أومرتين أوثلاثاً كذا توارث عن السلف وروى في ذلك آثار لا بأس بها في الفضائل اه. اور سعایہ میں ہے: وفي المقدمة الغزنوية في فروع الحنفية: أن من المستحبات أن يقرء بعد الوضوء سورة إنا أنزلناه ثلاث مرات لقوله عليه الصلاة والسلام: من قرأ إنا أنزلناه على أثر الوضوء مرة كتب الله له عبادة خمسين سنة قيام ليلها وصيام نهارها ومن قرأها مرتين أعطاه الله ما يعطى الخليل والكليم والحبيب ومن قرأ ثلٰث مرات يفتح الله له ثمانية أبواب الجنة فيدخلها من أي باب شاء بلا حساب ولا عذاب وروى أيضاً: من قرأ ''إنا أنزلناه'' علىٰ أثر الوضوء مرة كتبه الله من الصديقين ومن قرأها مرتين كتبه الله من الشهداء ومن قرأها ثلٰث مرات يحشره الله تعالىٰ مع الأنبياء انتهى. ان تمام تصیصات کے مجموعہ سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ قراءۃ ''سورۃ انا انزلناہ'' بعد الوضوء اولیٰ ہے اور اس میں اجر کی توقع ہے، گو ثواب مذکور فی الاحادیث المذکورۃ کا اعتقاد جائز نہیں کیوں کہ یہ امر بلا نقل صاحب وحی کے معلوم نہیں ہوسکتا اور صاحب وحی سے اس کا ثبوت نہیں ہے پس بہشتی زیور پر کچھ شبہ نہ رہا، واللہ اعلم (تصحیح الاغلاط: ۳)

(۱) مطلب في بيان ارتقاء الحديث الضعيف إلى مرتبة الحسن ۔انیس

(۲) عن عاصم بن لقيط بن صبرة...... فقلت يارسول الله، أخبرني عن الوضوء قال: أسبغ الوضوء وخلل بين الأصابع وبالغ في الاستنشاق إلا أن تكون صائماً، أبوداؤد شريف ،باب في الاستنثار ،انیس

صرف داہنے ہاتھ سے وضو کرنا جائز ہے:

سوال: فقط داہنے ہاتھ سے بلا عذر وضو تمام کرے جائز ہے یا مکروہ؟

الجواب

اس کی کراہت کی نہ کوئی روایت نظر سے گذری، نہ درایت اس کی موجب معلوم ہوتی ہے بلکہ بعضے اعضا تو دونوں ہاتھ سے دھل بھی نہیں سکتے جیسے ''یدین إلی المرفقین'' اور بعضے اعضا میں تَعَسُّر (دشواری) ہے جیسے ''رجلین'' اور روایت بھی اکتفا کے جواز کی مؤید ہے، فی الدر المختار فی الآداب: **غسل رجلیه بیساره، فی ردالمحتار عن شرح الشیخ إسمٰعیل قال: یفرغ الماء بیمینه علی رجلیه ویغسلهما بیساره.** ا ھ۔ ۲۵ر محرم ۱۳۲۶ھ تتمہ اولیٰ ص:۲۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱ر۳۳)

ایک ہاتھ سے وضو کرنا درست ہے یا نہیں:

سوال: ایک ہاتھ سے وضو کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

درست ہے مگر خلاف سنت ہے بلاضرورت ایسا نہ کرنا چاہئے۔(۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱ر۱۳۲)

چہرہ کا دھونا ایک ہاتھ سے ہے یا دونوں ہاتھ سے:

سوال: شستن وجہ در وضو بدو دست باید یا بیک دست؟ (۲)

الجواب

شستن وجہ در وضو بدو دست باید، اگر عذرے نہ باشد۔(۳) **کما یظهر من قوله: ومستحبه الخ التیامن فی الیدین والرجلین لا الأذنین والخدین الخ (در مختار) قوله: لا الأذنین فیمسحهما معاً إن أمکنه الخ (شامی) قوله التیامن: أی البدء بالیمین الخ شامی.**(۴) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱ر۱۳۲)

---

(۱) عن ابن عباسؓ دخل علی علیؓ وقد أهرق الماء فدعا بوضوء ونحوه، وفیه ثم تمضمض وانتثر ثم أدخل یدیه فی الإناء جمیعاً فأخذ بهما حفنة من ماء وضرب بها علی وجهه، الحدیث،'' جمع الفوائد، صفة الوضوء: ج ۱ ص ۳۵، ظفیر۔

(۲) وضو میں چہرہ ایک ہاتھ سے دھونا چاہیے یا دونوں ہاتھ سے؟ انیس

(۳) اگر کوئی عذر نہ ہو تو دونوں ہاتھوں سے وضو میں چہرہ دھونا چاہیے۔ انیس

(۴) ردالمحتار، کتاب الطهارة، مستحبات وضوء: ۱ر۱۱۵) قال ابن عباسؓ: أتحبون أن أریکم کیف کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یتوضأ فدعا بإناء فیه فاغترف غرفة بیده الیمنیٰ فتمضمض واستنشق ثم أخذ أخریٰ فجمع بهما یدیه ثم غسل وجهه الخ (جمع الفوائد صفة الوضوء: ۱ر۳۶، ظفیر)

گردن کا مسح:

سوال: گردن پر مسح کرنے کے وقت جو انگلیاں کھینچ لیتے ہیں، یہ فعل کیسا ہے؟

الجواب

گردن کا مسح انگلیوں کی پشت کو کھینچ کر جیسا کہ معروف ہے درست ہے۔(۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱۳۲/۱)

گردن کے مسح کی تحقیق:

سوال: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گردن کا مسح کانوں سے پہلے سر کے ساتھ کرنا چاہیے "حتی بلغ القفا" کے الفاظ عام روایات میں ہیں اور کتب فقہ میں کانوں کے بعد مسحِ گردن تحریر ہے پس صورت تطبیق کیا ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

"حتی بلغ القفا" کے الفاظ سے مسح رقبہ ثابت نہیں ہوتا۔ قفا اور رقبہ میں فرق ہے، قفا سر کا جزء ہے اور رقبہ مستقل عضو ہے۔ بالفرض قفا بمعنی رقبہ لے لیا جائے تو بھی اس پر قصداً مسح کرنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ بغرض استیعاب رأس ہوا ہے، مسح رقبہ کے اثبات پر حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی قدس سرہ کا رسالہ "تحفۃ الطلبۃ فی تحقیق مسح الرقبۃ" قابل قدر ہے اس میں مندرجہ ذیل روایات بھی ہیں۔

(۱) "ذکر ابن السکنؒ فی کتاب الحروف: حدیث مصرف ابن عمرو یبلغ به عمر بن کعب رضی اللّٰه تعالی عنه قال: رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم توضأ فمسح لحیته وقفاه".

(۲) "روی أبو نعیمؒ فی تاریخ أصبهان: من حدیث ابن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من توضأ و مسح عنقه وُقی الغل یوم القیامة".

(۳) "روی الدیلمیؒ فی مسند الفردوس من حدیث ابن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما "مسح الرقبة أمان من الغل یوم القیامة".

(۴) "روی أبو عبیدؒ فی کتاب الطهور: عن عبدالرحمن بن مهدی یبلغ به موسی بن طلحة رضی اللّٰه تعالیٰ عنه أنه قال: " من مسح قفاه مع رأسه وُقی الغل یوم القیامة" قال العینیؒ فی شرح الهدایة: هذا وإن کان موقوفاً لکن له حکم الرفع لأنه لا مجال للرأی فیه انتهی".

(۵) "حکی ابن همامؒ من حدیث وائلؓ فی صفة وضوء رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثم مسح علی رأسه ثلاثاً و ظاهر أذنیه ثلاثاً و ظاهر رقبته الخ، رواه الترمذیؒ".

(۱) ومستحبه: التیامن الخ ومسح الرقبة بظهر یدیه. (الدر المختار مع رد المحتار، مستحبات الوضوء:۱۱۵/۱، ظفیر

وقال قدس سره فی حاشية رسالته المذكورة:(قوله رواه الترمذیؒ)هكذاذكرفی الفتح وتبعه الشيخ الدهلویؒ فی شرح سفرالسعادة:ولكنی لم أجده فی النسخ المتداولة من جامع الترمذیؒ وذكرالعينیؒ فی البناية والجمال الزيلعیؒ فی تخريج أحاديث الهدايةالمسمی بنصب الراية وابن حجرالعسقلانیؒ فی ملخص تخريج الزيلعیؒ المسمی بالدرايةهذه الروايةمسندةإلی البزار،آه".

ان روایات کی سند میں اگر چہ کلام ہے مگر فضائل میں ضعیف روایت پر بھی عمل جائز ہے نیز تعدد طرق کی وجہ سے روایت میں قوت آجاتی ہے اگر چہ ہر سند ضعیف ہو۔ رسالہ مذکورہ میں ''حتی بلغ القفا''اور''حتی بلغ القذال'' والی روایات بھی ہیں مگر ان سے استدلال تام نہیں، کما مر۔

مذکورہ بالا روایات میں سے روایت اولیٰ ورابعہ میں بھی اگر چہ قفا کا ذکر ہے مگر اسے مستقلاً ذکر کرنے سے ظاہر ہے کہ اس سے مسح رقبہ ہی مراد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ سلخ جمادی الآخرۃ ۹۷ھ۔ (احسن الفتاویٰ:۲/ ۱۲-۱۳)

سر کے مسح کے ضمن میں گردن کے مسح کا حکم:

سوال: جب مسح کرتے وقت سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے ہاتھ کو گردن کی طرف لے جاتے وقت بھی گردن کا مسح کر لیا جاوے یعنی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کے جو گردن کی طرف کھینچا تمام سر پر پھرا کر کے ساتھ ہی گردن پر اسی وقت پھیر لیا جائے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث **مدهما إلی القفا** کا مفہوم معلوم ہوتا ہے اسی طرح مسح کرنا بہتر ہے یا ہاتھوں کی پشت سے گردن کا مسح کرنا مستحب ہے، حدیث مذکور کا مفہوم ومطلب صحیح کیا ہے؟

الجواب

اس سے مستحب ادا نہ ہوگا، ایک تو ترتیب نہ رہی دوسرے ظہر ید سے نہ ہوا اور بظہر ید کی قید کتب فقہ **وقال الشيخ اللكنوی فی السعاية(۱/ ۱۷۸)الثابت من الأخبار المذكورة أنه صلی اللّٰه عليه وعلی اٰله وسلم مسح قفاه مع رأسه وجر يديه إلی القفا،وأخرجهما من أسفل عنقه.)**

درمختار وغیرہ میں مصرح ہے اور حدیث کا مطلب ظاہر ہے کہ اس میں مسح قفا (قفا: گدی، سر کا پچھلا حصہ، قذال کے بھی یہی معنی ہیں) آیا ہے۔ جو کہ راس کا جزو ہے اور رقبہ اس سے خارج ہے، پس اس کو مسح رقبہ سے کچھ مس نہیں اور اگر اس کا عموم فرض کر لیا جاوے تو بلوغ قذال یا مدالی القفا بمعنی الرقبۃ سے یہ لازم نہیں آیا کہ یہ قصداً تھا بلکہ استیعاب راس میں اس کا بھی مس ہو گیا اور اگر مس کو قصداً مان لیا جاوے تو ممکن ہے کہ بیان جواز پر محمول کر لیا جاوے اس سے مستحب کا ادا ہو جانا لازم نہیں آتا۔ ۸/رجب ۱۳۳۱ھ، تتمہ خامسہ ص:۱۷۱۔ (امدادالفتاویٰ جدید:۱/ ۴۰)

گردن کے مسح کا حکم:

سوال: دیر باز است کہ مسح گردن در وضو نمی کنم زیرا کہ در زاد المعاد لابن القیم ومکتوبات شریف مجدد الف ثانی بدعت نوشتہ اند ودر قاضی خان بلفظ قیل نیز موجود است اکنوں منتظر حکم عالی ہستم در بارہ خود چہ کنم ہر چہ صادر شود بجا آورم؟ (۱)

الجواب

مسئلہ اثر بر استحباب اندترک نہ کنند۔ (۲) فقط، ۸/ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ، تتمہ اولیٰ ص: ۲۱۲۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۳۹/۱)

وضو میں پاؤں بائیں ہاتھ سے دھوئے جائیں:

سوال وضو میں دونوں پاؤں یا ایک پاؤں داہنے ہاتھ سے دھونا جائز ہے یا نہیں؟ محمد شفیع کالی موری حیدر آباد۔

الجواب

بائیں ہاتھ سے پاؤں دھونا آداب وضو سے لکھا ہے لہذا دائیں ہاتھ سے پاؤں دھونا خلاف ادب ہے۔ درمختار میں آداب وضو میں لکھتے ہیں۔ وغسل رجلیہ بیسارہ اھ (درمختار علی الشامیة: ج ۱ ص ۱۲۱ فقط واللہ أعلم ، بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، الجواب صحیح۔ خیر محمد عفا اللہ عنہ (خیر الفتاویٰ ۵۳/۲)

وضو کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم:

سوال: ۔اگر کوئی شخص وضو کررہا ہو اور اسی وقت اذان شروع ہو جائے تو کیا یہ شخص وضو کی دعائیں پڑھے یا اذان کا جواب دے، شرعاً کون سا عمل افضل ہے؟

---

(۱) خلاصۂ سوال: ۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ میں وضو میں گردن کا مسح نہیں کرتا ہوں اس لئے کہ علامہ ابن القیمؒ کی کتاب زاد المعاد اور مجدد الفِ ثانیؒ کے مکتوبات شریف میں اس کو بدعت لکھا ہے، اور فتاویٰ قاضی خاں میں بھی لفظِ قیل سے لکھا ہے، اب میں آنحضور کے حکم کا منتظر ہوں کہ میں کیا کروں جو حکم دیں اس پر عمل کے لئے تیار ہوں؟ انیس

(۲) گردن کے مسح کے بارے میں علما کی تین رائیں ہیں، امام نوویؒ وغیرہ بدعت فرماتے ہیں، شرنبلالیؒ وغیرہ سنت فرماتے ہیں اور اکثر احناف اور اصحاب متون مستحب فرماتے ہیں اور یہی صحیح قول ہے، تفصیل کے لئے سعایہ (۱۷۸/۱) اور رسالہ تحفۃ الطلبہ فی مسح الرقبۃ (مصنفہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ) ملاحظہ فرمائیں۔ سعید احمد) (۱) عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی ﷺ قال: من توضأ ومسح بیدیه علی عنقه وُقی الغل یوم القیامة (التلخیص الحبیر، باب سنن الوضوء جلد اول ص ۳۴/ شرح احیاء العلوم للعلامة الزبیدی ج دوم ص ۳۶۵/ إعلاء السنن ، باب کیفیة الوضوء ، ج اول، ص ۱۲۰ (۲) عن لیث عن طلحة عن أبیه عن جده أنه رأی رسول اللہ ﷺ یمسح رأسه حتی بلغ القذال ومایلیه من مقدم العنق بمرة. قال: القذال: السالفة العنق (مسند احمد، باب حدیث جد طلحة الأیامی ، ج رابع، ص ۵۳۱، نمبر ۱۵۵۲۱) ان احادیث سے معلوم ہوا کہ گردن کا مسح کرنا مستحب ہے۔ انیس

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــ

وضو کرتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا اور اذان کا جواب دینا دونوں سنت ہیں، لہٰذا دونوں میں سے جو بھی چاہے پڑھ سکتا ہے، تاہم اذان کا جواب دینا زیادہ بہتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان سننے والے کو سلام کا جواب دینا بھی مناسب نہیں، حالانکہ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ:''ولاینبغی أن یتکلم السامع فی حال الأذان والإقامة ولایشتغل بقراءة القرآن ولابشیء من الأعمال سوی الإجابة ولوکان فی القراءة ینبغی أن یقطع ویشتغل بالاستماع والإجابة''(بدائع الصنائع،فصل مایجب علی السامعین عند الأذان: ج ا ص ۱۵۵) (ا)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۲۰۸)

وضو کرنے کا افضل طریقہ:

سوال: وضو کھڑے ہو کر کرنا چاہئے یا بیٹھ کر؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــ

وضو بیٹھ کر کرنا چاہئے، اس لئے کہ وضو کے آداب میں یہ بات ہے کہ وضو بیٹھ کر کیا جائے۔ **''ومن الآداب(أن یجلس المتوضی مستقبل القبلة عند غسل سائر الأعضاء)ومن الآداب(أن یکون جلوسه علیٰ مکان مرتفع).حلبی کبیر: ج ا ص ۳۱باب الوضوء.** (۲)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۶)

کھڑے ہو کر وضو کرنا کیسا ہے:

سوال: کیا کھڑے ہو کر وضو کرنا جائز ہے؟

الجواب ــــــــــــ وباللّٰہ التوفیق

وضو ہو جائے گا مگر یہ خلاف سنت ہے، نیز کھڑے ہو کر وضو کرنے میں چھینٹ پڑے گی جو بعض ائمہ کے نزدیک

(ا) **قال العلامة ابن عابدینؒ:''وینبغی للسامع أن لایتکلم ولایشتغل بشیء فی حالة الأذان والإقامة ولایرد السلام أیضاً لأن الکل یخل بالنظم''(ردالمحتار،باب الأذان،مطلب فی کراهة تکرار الجماعة فی المسجد: ج ا ص ۳۹۹)**

(۲) **قال الحصکفیؒ:(والجلوس فی مکان مرتفع) تحرزاً عن الماء المستعمل،وعبارة الکمال:وحفظ ثیابه من التقاطر،وهی أشمل،الدرالمختار علی صدرردالمحتار: ج ا ص۱۲۷،آداب الوضوء،ومثله فی السعایة: ج ا ص ۱۸۰،آداب الوضوء.**

نجس ہے، اس لیے اجتناب کرنا چاہیے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد عثمان غنی ۲۳/۸/۱۳۵۱ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ:۲/۶۲)

کھڑے ہوکر وضو کرنے کا حکم:

سوال: کیا نلکے وغیرہ پر کھڑے ہوکر وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

وضو کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اونچی جگہ پر قبلہ رو بیٹھ کر وضو کیا جائے۔ **فآداب الوضوء (الجلوس في مكان مرتفع) تحرزاً عن الغسالة واستقبال القبلة . اهـ (مراقی الفلاح: ص ۴۲) فقط واللّٰه أعلم**، بندہ محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان۔ ۱۳/۹/۱۴۰۹ھ، الجواب صحیح: بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ، رئیس الافتاء۔ (خیر الفتاویٰ:۲/۸۷)

وضو میں پیر کھڑے ہوکر دھونا:

سوال: بیٹھے ہوئے وضو کرکے اور کھڑے ہوکر پیر دھونا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر بیٹھ کر پاؤں دھونے میں دقت ہو یا کھڑا ہو کر ماء مستعمل سے حفاظت ہوتی ہو تو کھڑے ہوکر پاؤں دھونے میں مضائقہ نہیں بلکہ ماء مستعمل سے تحفظ کے لیے کھڑے ہوکر پاؤں دھونا بہتر ہے۔

آداب الوضوء: "الجلوس في مكان مرتفع تحرزاً عن الغسالةالمرادحفظ الثياب عن الماء المستعمل كماذكره الكمال، لايقيدالجلوس فى مكان مرتفع آه": ۴۴. (۲) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور۔ الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ، صحیح: عبداللطیف مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (فتاویٰ محمودیہ:۵/۶۷)

چپل پہن کر وضو کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص چپل پہن کر وضو کرے تو کیا اس کا وضو ہو جائے گا؟ حدیث کی روشنی میں جواب دیں؟ (محمد ندیم ذوالفقار علی، بھینسہ)

---

(۱) (ومن آدابه)...(والجلوس فى مكان مرتفع)تحرزاًعن الماء المستعمل وعبارةالكمال :وحفظ ثيابه من التقاطروهى أشمل(الدرالمختار).(قوله تحرزاًالخ)لوقوع الخلاف فى نجاسته ولأنه مستقذر. (ردالمحتار:۱/۲۵۱)

(۲) والجلوس فى مكان مرتفع)تحرزاًعن الماء المستعمل،وعبارةالكمال:وحفظ ثيابه من التقاطروهى أشمل.(الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/۱۲۷، آداب الوضوء،سعيد

الجواب ــــــــــــــــــــ

وضو میں جن اعضا کے دھونے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی چہرہ، ہاتھ اور پاؤں، ان کا دھولینا وضو کے درست ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے اگر کسی شخص نے ایسی چپل پہن رکھی ہو کہ چپل کے باوجود پاؤں کا اوپری اور نچلا حصہ پوری طرح دھل جائے اور ہر جگہ پانی پہنچ جائے تو ایسی چپل میں بھی وضو درست ہو جائے گا، آج کل جو ہوائی چپل پہنی جاتی ہے وہ اسی انداز کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارکین بھی ایسی تھیں کہ بہ آسانی پائے مبارک تک پانی پہنچ جاتا تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعلین پہنے ہوئے وضو میں پاؤں دھویا ہے۔ ”**عن عبيد بن جريج قال: قلت لعمر: رأيتک تلبس هذه النعال السبتية و تتوضأفيها، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يلبسها ويتوضأ فيها**“. (۱) نیز صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی نعلین پہنی ہوئی حالت میں پاؤں کا دھونا ثابت ہے۔ فقط (کتاب الفتاویٰ: ۴۲/۲)

چپل پہن کر وضو کرنا:

سوال: ۔ ایک وضو خانہ مسجد سے بالکل الگ ہے کیا اس میں چپل پہن کر وضو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

ھو المصوب ــــــــــــــــــــ

وضو خانہ میں چپل پہن کر وضو کر سکتے ہیں (۲)۔ تحریر: محمد طارق ندوی، تصویب: ناصر علی ندوی (فتاویٰ ندوۃ العلماء: جلد ۱ صفحہ ۲۰۷)

بیسن میں وضو کرنے کا حکم:

سوال: ۔ آج کل کے نئے دور میں منہ ہاتھ دھونے کے لئے بیسن بنائے گئے ہیں جن میں کھڑے ہو کر منہ ہاتھ دھویا جاتا ہے، کیا ان میں وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

وضو کرنا جائز ہے لیکن خلاف ادب ہے۔ ”**ومن الآداب (أن يجلس المتوضي مستقبل القبلة عند غسل سائر الأعضاء) ومن الآداب (أن يكون جلوسه على مكان مرتفع، حلبی کبیر: ج ۱ ص ۳۱ آداب الوضوء**. (۳) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۸)

---

(۱) سنن نسائی، حديث نمبر: ۱۱۷، ۱۶/۱، باب الوضوء فى النعال، كتاب الطهارة

(۲) ”عن عبيد بن جريج قال: قلت لعمر: رأيتک تلبس هذه النعال السبتية و تتوضأفيها، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يلبسها ويتوضأ فيها“. (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۱۱۷، ۱۶/۱، باب الوضوء فی النعال، کتاب الطہارۃ، انیس۔)

(۳) (قال الحصكفيؒ: والجلوس فى مكان مرتفع تحرزاً عن الماء المستعمل، وعبارة الكمال: وحفظ ثيابه من التقاطر، وهى أشمل، الدرالمختار على صدر ردالمحتار: ج ۱ ص ۱۲۷، آداب الوضوء، ومثله فى السعاية: ج ۱ ص ۱۸۰، آداب الوضوء)

واش بیسن میں وضو:

سوال: کیا کھڑے ہوکر Wash basin میں وضو کر سکتے ہیں؟ (سعید بابا، راجیونگر)

الجواب

فقہا نے اونچی جگہ بیٹھ کر وضو کرنے کو ادب بتایا ہے، لیکن اس کا مقصد پانی کی چھینٹ سے بچنا ہے۔ "**الجلوس فی مکان مرتفع تحرزاً عن الغسالة**". (۱) Wash Basin پر کھڑے ہوکر وضو کرنے میں اعضاء وضو صحیح طریقہ پر دھل جاتے ہیں، اور چھینٹ بھی نہیں پڑتی اس لئے Wash Basin پر وضو کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ (۲) فقط (کتاب الفتاویٰ: ۳۹/۲)

سردی کے موسم میں اعضاءِ وضو دھونے کا طریقہ:

سوال:۔ سردی کے مہینوں میں اعضاء وضو اتنے خشک ہوجاتے ہیں کہ اگر ان پر پانی بہایا جائے تو اس سے اندام تر نہیں ہوتا بلکہ خشک رہ جاتا ہے، اس صورت میں وضو کیسے کیا جائے؟

الجواب

سردی کے موسم میں خشکی بہت ہوجاتی ہے اور پانی اعضاء وضو کو گیلا نہیں کرتا، اس لئے فقہا نے لکھا ہے کہ دھونے سے قبل مغسولہ اندام کو تر کیا جائے پھر پانی بہایا جائے تاکہ اندام اچھی طرح دھویا جاسکے۔ "**لما قال العلامة الکاسانیؒ: عن خلف بن أیوبؒ أنه قال: ینبغی للمتوضی فی الشتاء أن یبل أعضائه شبه الدهن ثم یسیل الماء علیها لأن الماء یتجافی عن الأعضاء فی الشتاء، بدائع الصنائع: ج ۱ ص ۳ کتاب الطهارة**. (۳) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۶ و ۵۰۷)

وضو کے بعد رومال سے ہاتھ منھ پوچھنا جائز ہے یا نہیں:

سوال: وضو کر کے رومال سے بدن سکھانا درست ہے یا نہیں؟ اور بعض کہتے ہیں کہ جب ریش کا پانی زمین پر گرتا ہے تو فرشتوں کو اٹھانے میں تکلیف ہوتی ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب

اعضائے وضو کو رومال سے پوچھنا مستحب اور آداب میں سے ہے۔ درمختار میں ہے: "**ومن الآداب تعاهد**

(۱) مراقی الفلاح مع الطحطاوی: ص: ۴۲

(۲) مگر افضل و مسنون طریقہ بیٹھ کر وضو کرنا ہے۔ **ومن الآداب (أن یجلس المتوضی مستقبل القبلة عند غسل سائر الأعضاء). حلبی کبیر: ج ۱ ص ۳۱، باب الوضوء،** انیس۔

(۳) **وفی الهندیة أیضاً ج ۱ ص ۹ الفصل الثانی فی المستحبات.**

موقيه وكعبيه الخ والتمسح بمنديل الخ''. (۱) اور شامی نے اس میں زیادہ تفصیل کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رومال سے پوچھنا مکروہ نہیں ہے بلکہ جائز ہے اور منھ کا پوچھنا بھی درست ہے اور ریش کا بھی۔ اور اگر نہ پونچھا جاوے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ (۲) اور یہ قول کہ ریش کا پانی گرنے سے فرشتوں کو اس کے اٹھانے کی تکلیف ہوتی ہے، بے اصل ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۱۔۱۳۲)

وضو کے پانی کو کپڑوں سے پونچھنا:

سوال: وضو کے بعد پانی کا خشک نہ کرنا بلکہ اسی طرح مسجد میں داخل ہونا وضو کے پانی کا داڑھی اور ہاتھ وغیرہ سے ٹپکتے رہنا یہاں تک کہ دوران نماز چند رکعات میں اعضا سے وضو کا پانی ٹپکتا رہتا ہے یہ کیسا ہے؟

الجواب ـــــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو کے بعد اعضا کو پونچھنا بھی حدیث شریف سے ثابت ہے، نہ پونچھنا بھی ثابت ہے۔ (۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیوبند ۲۰/۶/۸۸ھ۔ الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ دار العلوم دیوبند ۲۰/۶/۸۸ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۷)

وضو کا بچا ہوا پانی:

سوال: وضو کرنے کے لیے ایک لوٹا پانی جو درمیان وضو کے ختم ہوگیا پھر دوبارہ پانی لے کر وضو تمام کیا تو اس بچے ہوئے پانی کو کھڑا ہو کر پینا بھی مستحب ہوگا یا نہیں؟ صرف وہی پانی پینا مستحب ہے جو ابتدائے وضو کے لیے لیا گیا ہو اور اسی میں سے بچ رہا ہو؟

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الطهارة، مطلب في التمسح بمنديل: ۱/۱۲۱۔ ظفیر

(۲) وإنما وقع الخلاف في الكراهة ففي الخانية: ولا بأس للمتوضي والمغتسل روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه كان يفعله ومنهم من كره ذلك ومنهم من كره للمتوضي دون المغتسل والصحيح ماقلنا إلا أنه ينبغي أن لايبالغ ولايستقصي فيبقى أثر الوضوء على أعضائه. (ردالمحتار كتاب الطهارة مطلب في التمسح بمنديل: ۱/۱۲۱، ظفير

(۳) (قوله والتمسح بمنديل) ذكره صاحب المنية في الغسل وقال في الحلية: ولم أر من ذكره غيره وإنما وقع الخلاف في الكراهة ففي الخانية: ولا بأس به للمتوضي والمغتسل روى عن رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: أنه كان يفعله ومنهم من كره ذلك ومنهم من كره للمتوضي دون المغتسل والصحيح ماقلنا إلا أنه ينبغي أن لايبالغ ولايستقصي فيبقى أثر الوضوء علىٰ أعضائه آه ردالمحتار: ۱/۱۳۱، مطلب في التمسح بالمنديل، سعيد) البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ قطرات سے دوسروں کو اذیت نہ ہو اگرچہ قطرات نجس نہیں کیوں کہ ہر ایک کی طبیعت یکساں نہیں ہوتی جس چیز کو قطرات لگیں گے وہ چیز بھی نجس نہیں ہوگی۔ ((وهو طاهر) ولو من جنب، وهو الظاهر... (ليس بطهور). (الدر المختار، قبيل مطلب مسئلة البئر: ۱/۲۰۰، ۲۰۱، سعيد)

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو کا بچا ہوا پانی وہ ہے جو وضو کے تمام ہونے کے بعد بچے لہذا پہلی مرتبہ لیے ہوئے پانی سے پینا (جبکہ وضو نا تمام رہے اور دوسری مرتبہ پانی لینے کی نوبت آئے) مستحب نہیں ہے، وضو کا بچا ہوا پانی پینا مطلقاً مستحب ہے خواہ کھڑا ہو کر پیئے یا بیٹھ کر" **قال ابن عابدين رحمه الله تعالى: وأن يشرب بعده من فضل وضوئه كماء زمزم مستقبل القبلة قائماً أو قاعداً، أفاد أنه مخير في هٰذين الموضعين وأنه لا كراهة فيهما في الشرب قائماً بخلاف غيرهما وأن المندوب هنا هو الشرب من فضل الوضوء لا بقيد كونه قائماً آه**". (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔ حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، الجواب صحیح: عبداللطیف، صحیح: سعید احمد غفرلہ، مفتی مظاہر علوم (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۷)

(۱) ردالمحتار: ۱/۱۲۹، مطلب في مباحث الشرب قائماً، سعيد، وكذا في التاتارخانية: ۱/۱۱۲، آداب الوضوء، ادارة القرآن، كراچی) حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ کھڑے ہو کر وضو کا پانی پینا بہتر ہے: عن أبي حيةؓ قال: رأيت علياً توضأ فأنقى كفيه ثم غسل وجهه ثلاثاً و ذراعيه ثلاثاً و مسح برأسه ثم غسل قدميه إلى الكعبين ثم قام فشرب فضل وضوئه ثم قال إنما أردت أن أريكم طهور رسول الله صلى الله عليه وسلم. (مصنف ابن أبي شيبة، باب في الوضوء كم مرة، ج اول، ص ۱۶، نمبر ۵۴، انیس

وضو کے آداب: وضو ایک عبادت ہے اور دوسری اہم ترین عبادت نماز کے لیے شرط و سبب کا درجہ رکھتا ہے، اس لیے ایک گونہ اسے نماز سے مشابہت بھی ہے، اس لیے وضو کرتے وقت مندرجہ ذیل آداب و مستحبات کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ وضو احسن طریقہ پر مکمل ہو۔

۱---وضو کی نیت دل میں کرنے کے ساتھ زبان سے بھی کرنا چاہیے۔
۲---وضو نماز کے وقت سے پہلے کرنا چاہیے، مگر یہ اس کے لیے ہے جسے وضو رکھنے میں عذر نہ آتا ہو۔
۳--- وضو کے لیے قبلہ رو بیٹھنا چاہیے۔
۴---اونچی جگہ بیٹھنا چاہیے تاکہ مستعمل پانی پاؤں و کپڑے پر نہ آئے۔
۵---وضو کا پانی خود سے لینا چاہیے کسی دوسرے سے مدد نہیں لینی چاہی۔
۶---وضو کا پانی لوٹے میں بائیں طرف رکھنا چاہیے اور اگر بڑے برتن میں ہو تو داہنے رکھنا چاہیے۔ لوٹے کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر داہنے ہاتھ میں پانی ڈالنا چاہیے۔
۷---وضو کے برتن کو صرف اپنے لیے خاص نہیں کرنا چاہیے۔
۸---وضو کا پانی ایک مد سے کم نہ ہو۔
۹---وضو کا پانی دھوپ سے گرم نہ ہو۔
۱۰---وضو کا پانی کپڑے پر نہ گرنا چاہیے۔
۱۱---وضو کرتے وقت دنیاوی باتیں نہیں کرنی چاہیے۔
۱۲---ہر عضو کے دھوتے وقت بسم اللہ یا ماثورہ دعاء پڑھنی چاہیے۔
۱۳---انگلیوں میں اگر انگوٹھی ہو اور عورتوں کے کان و ناک میں زیورات ہوں تو ان کو ہلا کر پانی پہونچانا چاہیے گرچہ بغیر ہلائے پانی پہونچتا ہو۔
۱۴---دونوں آنکھوں کے بھوؤں کے بالوں کی جڑ اور آنکھوں کے کناروں تک پانی پہونچانے کا خیال رکھنا۔
۱۵---پاؤں کے اوپر کی ہڈی اور نیچے کے تلوے کو دھونے کا خیال رکھنا۔ ==

وضو کے بعد رومالی پر پانی چھڑکنا:

سوال:　کیا فرماتے ہیں علماء دین ،مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جب وضو سے فارغ ہوتو شرمگاہ یعنی رومالی پر پانی چھڑکنا کیسا ہے آیا جائز ہے یانہیں اور یہ فرض ہے یاواجب یامستحب؟ بینوا توجروا۔(مرسلہ عصمت اللہ صاحب مرادآبادی)

الجواب

دفع وسواس کے لیے بعد وضوتھوڑا پانی رومالی پر چھڑک لینا بہتر ہے اگر نہ چھڑکا تو گناہ نہیں ہے نہ اس سے واجب فوت ہوتا ہے نہ فرض۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ کامل:۲۳۹)

==

۱۶--- پاؤں کے اندرونی حصہ کو بائیں ہاتھ سے دھونا۔

۱۷--- اورجاڑوں میں دھونے سے پہلے پانی سے تر کردینا تاکہ پانی ڈالتے وقت ہر بار پانی پورے پاؤں پر پڑے اور ڈھل جائے۔

۱۸--- ہاتھوں کو وضو کے پانی سے جھاڑنا نہیں چاہیے۔

۱۹--- کہنیوں اور ٹخنوں سے اوپر تک دھونے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۲۰--- تر انگلی کو دونوں کانوں کے اندران کے مسح کرتے وقت ڈالنا چاہیے۔

۲۱--- گردن کے اوپر والے حصہ کا دونوں ہتھیلی کے باہری حصہ سے مسح کرنا۔(طہارت کے احکام ومسائل:۱۱۵،۱۱۶۔انیس)

مکروہات وضو

مسجد میں وضو کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو مسجد میں دائمی طور پر وضو کرنے والا فاسق ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔ المستفتی محمد ثناء اللہ۔ ۷/۶/۷۶،

الجواب

اگر ابتدائے امر سے جائے وضو نہ بنائی گئی ہو تو وضو کرنا جائز نہیں ہوگا، **لما فی الهندية ص ۱۱٦ جلد ۱، وتكره المضمضة والوضوء فی المسجد إلا أن يكون ثمه موضع أعد لذلک.** (۱) وھو الموفق۔ (فتاویٰ دیوبند پاکستان، المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم، ص: ۴۱)

آبِ زمزم سے وضو و غسل کا حکم:

سوال: ۔کیا آبِ زمزم سے وضو یا غسل کرنا جائز ہے؟

الجواب

زمزم کا پانی ایک متبرک پانی ہے، اس کے آداب و احترام کا خیال رکھنا شرعی ذمہ داری ہے، اس لئے بے وضو شخص کا اس سے وضو کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ دوسرا متبادل پانی مہیا نہ ہو ورنہ بلا کراہت جائز ہے، لیکن غسلِ جنابت ہر حال میں کراہت سے خالی نہیں اور نہ اس سے استنجا بلا کراہت جائز ہے۔ تاہم اگر باوضو آدمی اس سے تبرک کے طور پر وضو کرے یا پاک بدن والا شخص اس سے غسل کرے تو بلا کراہت جائز ہے۔

”لما قال السيد أحمد الطحطاویؒ: يجوز الاغتسال والتوضؤ بماء زمزم إن كان علىٰ طهارة للتبرک فلا ينبغی أن يغتسل به جنب ولا محدث ولا فی مكان نجس ولا يستنجی به ولا يزال به نجاسة حقيقية من بعض العلماء تحريم ذلک وقيل إن بعض الناس استنجىٰ به فحصل له باسؤر، طحطاوی حاشية مراقی الفلاح: ص ۱۷ كتاب الطهارة، أقسام المياه) (۲) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۲)

(۱) فتاویٰ عالمگیری: ص ۱۱۰ جلد ۱، فصل: کره غلق باب المسجد.

(۲) قال العلامة الحصكفیؒ: يكره الاستنجاء بماء زمزم، قال ابن عابدينؒ تحته: وكذا إزالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه حتىٰ ذكر بعض العلماء تحريم ذلک، ردالمحتار، كتاب الحج، مطلب فی كراهية الاستنجاء بماء زمزم: ج ۲ ص ۶۲۵)

گرم پانی سے وضو جائز ہے:

سوال:۔گرم پانی سے وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

ہروہ پانی جو پاک ہواس سے مطلقاً وضوکرنا جائز ہے چاہے پانی گرم ہو یاٹھنڈا، تاہم دھوپ سے گرم شدہ پانی کااستعمال طبی لحاظ سے مکروہ ہے۔

"إن عمرؓ: كان يسخن له ماء في قمقمة ويغتسل به آه،إن عمرؓ قال: لاتغسلوا بالماء المشمس فإنه يورث البرص آه(دارقطني: ج ١ ص ٣٧و ٣٩،باب الماء المسخن)عن الأسلح بن شريك:......فقلت: أصابتني جنابة فخشيت البرد علىٰ نفسي فأمرتها أن يرحلها وضعت أحجاراً فأسخنت ماءً فاغتسلت به آه وعن عائشةؓ قالت:نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يتوضأ بالماء المشمس،(نصب الراية: ج ١ ص ١٠٢ و١٠٣ باب الماء الذى يجوزبه الطهارة) (١)(فتاویٰ حقانیہ جلددوم صفحہ۵۱۵)

جرمانہ کےلوٹے سے وضوکرنا:

سوال: کیافرماتے ہیں علماءدین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کےمتعلق!

جملہ پنچ صاحبان نے کسی دنیوی یادینی قصور پرزید پریہ جرمانہ کیاکہ مسجدمیں بیس عددلوٹے خرید کرلوگوں کے وضوکے لیے رکھ دو،تواب سوال یہ ہے کہ جرمانہ توحنفیہ کے نزدیک ناجائزہےمگراب جوزیدپرجرمانہ ہوااوراس نے لوٹے رکھ دیئے توان لوٹوں سے وضوکرنا بھی جائزہے یانہیں؟اورجواس وضوسے نمازپڑھی ہے یہ نماز بلاکراہت درست ہوگی یانہیں؟بینواتوجروا۔

الجواب ــــــــــــ باسم ملهم الصواب

اگرزیدلوٹے رکھنے پربشرح قلب راضی ہوجائے توان لوٹوں کااستعمال جائزہے ورنہ نہیں،بدون رضائے زید،ان لوٹوں سے وضوکرنااگرچہ گناہ ہے مگروضوہوجائے گااورنمازبلاکراہت صحیح ہوجائے گی،صرف لوٹوں کے استعمال کاگناہ ہوگا۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔۴رذی قعدہ۸۶ھ(۲)(احسن الفتاویٰ:۲/۱۷۔۱۸)

---

(١) **ومثله في السعاية: ج ١ ص ٣٣٦و٣٣٧ باب الكراهية فى الماء المشمس الخ.**

(٢) **لايحل مال امرأمسلم الابطيب نفسه.(الحديث)انيس**

لوٹے میں ہاتھ ڈال کر اس سے وضو کرنا:

سوال: لوٹے میں ہاتھ ڈال کر وضو کرنا کیسا ہے جب کہ اس میں مستعمل پانی گرتا ہے ایسے لوٹے جو نیچے اوپر سے برابر ہوتے ہیں جو آج کل مسجدوں میں پائے جاتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

ہاتھ ڈال کر وضو کرنا خلاف احتیاط ہے۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۸)

تمباکو کھانے کے بعد وضو:

سوال: گٹکھا، تمباکو، پان اور سگریٹ کے استعمال کے بعد کلی کرنے سے وضو قائم رہ جاتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے یا مکروہ ہو جاتا ہے، نیز اس حالت میں آیات قرآنی کی تلاوت کر سکتے ہیں؟ (محمد عارف اللہ، تالاب کٹہ)

الجواب ــــــــــــــــ

گٹکھا وغیرہ کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، نہ وضو میں کوئی کراہت پیدا ہوتی ہے، البتہ اس سے منھ میں بو پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے قرآن مجید کی تلاوت اور نماز کی ادائیگی سے پہلے منہ اچھی طرح صاف کرنا چاہئے اور مسواک یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا چاہئے، تاکہ بدبو کا ازالہ ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کچی پیاز اور لہسن کھانے والے کو مسجد میں آنے سے بھی منع فرمایا۔(۲) چہ جائے کہ نماز جس میں اللہ تعالی سے مومن سرگوشی کرتا ہے، اور قرآن مجید کی تلاوت، جو خاص کر منہ اور زبان کی عبادت ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۳۹و۴۰)

وضو کرتے ہوئے سلام کا جواب:

سوال: وضو کرتے ہوئے سلام کا جواب دینا کیسا ہے؟

(۱) وسنن الطهارة: غسل اليدين قبل إدخالهما الإناء إذا استيقظ المتوضى من نومه، وفي العناية: (إذا استيقظ المتوضى) نقل عن شمس الأئمة الكردريؒ: أنه شرط حتى إذا لم يستيقظ لا يسن غسلهما وقيل: وهو شرط اتفاقي، خص المصنف غسلهما بالمستيقظ تبركاً بلفظ الحديث والسنة تشمل المستيقظ وغيره وعليه الأكثرون لأنه لا يتم الواجب إلا به فهو واجب لكن تركنا الوجوب إلى السنة في الغسل لأنه صلى الله عليه وسلم علل بتوهم النجاسة وتوهمها لا يوجب التنجس الموجب للغسل فكان دليلاً على التورع والاحتياط. (فتح القدير مع العناية: ۱/۲۱، كتاب الطهارات مصطفى ألباني الحلبي، مصر، وكذا في البحر الرائق: ۱/۳۸، سنن الوضوء رشيديه، وكذا في الطحطاوي على مراقي الفلاح: ۲۶، فصل في سنن الوضوء، قديمي

(۲) الجامع للترمذي: ۲/۳، باب ماجاء في كراهية أكل الثوم والبصل۔ محشی

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

اگر وضو کی دعاؤں میں مشغول ہو تو بہتر یہ ہے کہ نہ سلام کرے نہ جواب دے۔(۱) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵۹/۵)

وضو کرتے وقت سلام یا بات کرنا:

سوال: اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے کہ وضو کرتے وقت سلام یا بات چیت کرنا کیسا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو کرتے وقت نہ دنیا کی باتیں کریں، نہ سلام کریں بلکہ وضو کی دعا پڑھا کریں۔(۲) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵۹/۵)

وضو کرنے والے کو سلام کرنا:

سوال: لوگ وضو میں مشغول ہوں، اس وقت سلام کیا جائے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ

وضو میں مشغول آدمیوں کو سلام نہ کیا جائے وضو بھی ایک عبادت اور ثواب کا کام ہے اور اس میں مصروفیت ہے اور خاص توجہ کی ضرورت، اس میں بعض اعضا ایسے بھی ہیں کہ اگر خاص توجہ نہ دی جائے تو خشک رہ جائیں اور وضو نہ ہوں، اس میں بعض فرائض، بعض سنن اور بعض مستحبات ہیں اور آداب وضو میں یہ بھی ہے کہ ہر عضو کو دھوتے وقت بسم اللہ اور کلمۂ شہادت وردِ زبان ہو اور دوسرے اوراد بھی کتابوں میں منقول ہیں، وضو میں بعض مکروہات ہیں اس کا بھی خیال رکھا جائے، لہٰذا اس موقع پر سلام نہ کیا جائے، اگر کوئی سلام کرے تو جواب دے دینا اولیٰ ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۲۴/۱)

وضو کرتے وقت دنیاوی گفتگو:

سوال: اکثر لوگ وضو کرتے وقت باتیں کرتے ہیں، کیا اس وقت باتیں کرنا مناسب ہے؟ (شیخ عبد الصمد، ناندیڑ)

---

(۱) التكلم بكلام الناس، والكراهة تنزيهية، لأنه يشغله عن الأدعية (الفقه الإسلامي وأدلته: ۴۱۱/۱، المطلب السادس، مكروهات الوضوء، رشيديه، وكذا في الدر المختار: ۱۲۶/۱، آداب الوضوء، سعيد، وكذا في الفتاوىٰ العالمگيرية: ۸/۱، الفصل الثالث في المستحبات، وكذا في البحر الرائق: ۵۸/۱، كتاب الطهارة، رشيديه.)

(۲) حوالہ سابق۔

الجواب

''وضوٗ'' نماز جیسی عبادت کے لئے ذریعہ ووسیلہ ہے، اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر کو تازہ کیا جائے: ﴿اَقِمِ الصَّلاۃَ لِذِکْرِیْ﴾. (۱) اس لئے وضو کرتے ہوئے بھی اللہ ہی کی یاد اور اسی کا ذکر خاص کرنا چاہئے، دنیاوی گفتگو نہ کرنا چاہئے فقہانے دوران وضو گفتگو کرنے کو خلاف ادب قرار دیا ہے: ''**ومن الأدب أن لا يتكلم فی أثناء الوضوء بكلام الدنيا**''. (۲) (کتاب الفتاویٰ: ۲/۵۵-۵۶)

وضو میں بات چیت اور کسی شخص کی بات کا جواب دینا کیسا ہے:

سوال: حضرت مدظلہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، از طالب الخیر والدعاء گذارش ہے کہ میں وضو کررہا تھا اور ادعیہ ماثورہ بھی پڑھا تھا کہ ایک شخص نے مجھے مخاطب کر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہا میں نے اس خیال سے کہ وضو میں بات چیت کرنا خلاف سنت ہے، ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی، وہ بول کر بھی شرمندہ ہوئے اور پھر کہنے لگے کہ تم سے اخلاقی جرم کا ارتکاب ہوا ہے، وضو میں ازخود کسی سے فضول بات کی ابتدا کرنا مکروہ ہے، اور اگر کوئی دوسرا بات کرے تو قبل اس کے کہ اس بات کی اچھائی برائی کے متعلق کوئی رائے قائم ہو اس کی بات پر کان نہ دھرنا اور متکلم کو جواب نہ دے کر شرمندہ کرنا اور وہ بھی صرف ترک مندوب کی وجہ سے یقیناً غلو فی الدین ہے، حضور سے پوچھتا ہوں کہ یہ ان کی تعریض کس حد تک صحیح ہے کیا دعا کو چھوڑ کر جواب میں مشغول ہو جاتا تو اچھا تھا یا کیا؟

الجواب

بے شک وضو میں بالکل نہ بولنا اور دوسرا شخص بات کرے تو اس کو بالکل جواب نہ دینا بوجہ کسر قلب مسلم کے مذموم ہے، ادعیۂ ماثورہ کی رعایت اتنی ضروری نہیں جتنی قلب مسلم کی رعایت ضروری ہے اس حالت میں وضو کرنے والا کم از کم اتنا ہی جواب دیدے کہ میں وضو سے فارغ ہو کر آپ کی بات سنوں گا، تو اس سے ادعیۂ ماثورہ میں خلل بھی نہ ہو، اور نہ ایسی بات وضو میں مکروہ ہے، اور اس صورت میں جب کہ دوسرا شخص آکر بات کرے اسکی تطییب قلب کی رعایت سے مختصراً جواب دینا بلا ضرورت نہیں بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ **قال فی نور الایضاح والمراقی: ويكره التكلم بكلام الناس لأنه يشغله عن الأدعية آه قال الطحطاویؒ: مالم يكن لحاجة تفوته بتركه قاله ابن أمير الحاج آه وقوله: لأنه يشغله عن الأدعية ولأجل تخليص الوضوء من شوائب الدنيا آه (ص ۴۸) قلت: والكلام فی جواب سائل هو لحاجة تفوته بتركه وهو تطييب قلب المؤمن وهو عبادة فقدروی أبوهريرة رضی الله عنه مرفوعاً ''والكلمة الطيبة صدقة'' متفق عليه، وعن**

(۱) سورۃ طٰہٰ: ۱۴۔

(۲) کبیری: ص: ۳۰۔

أبی ذرؓ مرفوعاً "تبسمک فی وجه أخیک لک صدقة" رواه الترمذیؒ وحسنه (۱)وصححه ابن حبانؒ کذافی الترغیب (ص ۴۶۸ و ۴۶۹) ۱۳/ ربیع الاول ۵۴ھ. (امداد الاحکام جلد اول ص۳۴۶و۳۴۷)

حالت وضو میں قبلہ کی طرف تھوکنا:

سوال: قبلہ رخ بیٹھ کر وضو کرتے ہیں تو اس صورت میں تھوکتے بھی ہیں ویسے قبلہ کی طرف تھوکنے سے لوگ منع کرتے ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــ باسم ملهم الصواب

قبلہ کی طرف تھوکنا مکروہ ہے اگر قبلہ کی طرف منھ ہو مگر نیچے زمین کی طرف تھوکے تو اس میں کوئی کراہت نہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ نماز میں تھوکنے کی ضرورت پیش آئے تو پاؤں کے نیچے تھوک دے حالانکہ اس وقت نمازی قبلہ رخ ہے اس کے باوجود نیچے کی طرف تھوکنے کی اجازت دی گئی ہے۔(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۵/ رجب ۹۲ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/ ۱۷)

قبلہ رخ واش بیسن:

سوال: ہمارے گھر میں واش بیسن اور شاور قبلہ کی طرف ہے، جس میں ہم ہاتھ منہ دھونے اور نہانے کے ساتھ ساتھ وضو بھی کرتے ہیں، جس میں کلی بھی کرنی ہوتی ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قبلہ کی طرف کلی نہیں کرنی چاہئے یہ کہاں تک درست ہے؟

الجوابــــــــــــ

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ قبلہ کی طرف تھوکنا خلاف ادب ہے، جہاں تک قبلہ کی طرف رخ کرکے وضو کرنے کی بات ہے تو اس کو تو فقہاء نے وضو کے آداب میں شمار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وضو کرے گا تو یہ کلی کو بھی شامل ہوگا، اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں، قبلہ کی طرف رخ کرکے غسل کرنا مکروہ تو نہیں، لیکن خلاف ادب ہے: "...فهو ترک أدب کمد الرجل إلیها". (۳) فقط (کتاب الفتاویٰ: ۲/ ۶۲)

وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونا اور مسح کرنا جائز ہے یا مکروہ:

سوال: وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونا اور سر کا مسح کرنا مکروہ ہے یا کہ نہیں؟ اگر مکروہ ہے تو کس کتاب میں لکھا ہے؟ ارشاد فرماویں۔

(۱) باب ماجاء فی صنائع المعروف: ۲/ ۱۷، مطبوعہ دیوبند۔ انیس

(۲) قال قتادة سمعت انس بن مالک قال قال النبی صلی الله علیه وسلم ان المؤمن اذاکان فی الصلوٰةفانمایناجی ربه فلایبزقن بین یدیه ولاعن یمینه ولکن عن یساره اوتحت قدمه. (صحیح بخاری: ۱/ ۵۹) انیس

(۳) طحطاوی علی المراقی ص: ۹۔

الجواب

چہرہ ایک ہاتھ سے دھونا اور سر کا مسح ایک ہاتھ سے کرنا خلاف سنت ہے، **قال فی الدر: ویسن تثلیث الغسل المستوعب، وفی البحر: السنة تکرار الغسلات المستوعبات لا الغرفات آہ قال الطحطاویؒ فی حاشیة مراقی الفلاح: ولو اقتصر علی مرة ففیه أقوال ثالثها إن اعتاده أثم وإلالااختاره صاحب الخلاصة آہ (ص ۴۲) وفی نور الإیضاح: ویسن البداءة بالمیامن فی الیدین والرجلین قال الطحطاویؒ: وهما عضوان مغسولان فخرج العضو الواحد کالوجه فلایطیب فیه التیامن والعضوان الممسوحان کالأذنین و الخفین فالسنة (غسله) ومسحهما معاًلکونه أسهل إلاإذاکان أقطع فإنه یبدء بالأیمن منها یعنی من الخدین والأذنین والخفین آہ (ص: ۴۴) ویسن استیعاب الرأس بالمسح آہ،** اور ایک ہاتھ سے غسل وجہ و مسح راس میں استیعاب نہیں ہوسکتا، جیسا مشاہد ہے اور خلاف سنت کبھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں، مگر اس کا عادی ہونا مکروہ ہے، جیسا کہ طحطاوی کی عبارت سے معلوم ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۳ر شوال ۴۷ھ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۴۷ و ۳۴۸)

گلے کا مسح بدعت ہے:

سوال: بعض لوگ گردن کا مسح کرتے ہوئے حلقوم یعنی گلے کا بھی مسح کرتے ہیں۔ آیا شرعاً یہ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

گردن کا مسح مستحب ہے مگر حلقوم کا بدعت ہے یہ نہ کیا جائے۔ ''**والثانی مسح الرقبةوهوبظهر الیدین وأمامسح الحلقوم فبدعةآهـ کذافی البحرالرائق.(عالمگیری: ج ۱ ص ۴)فقط واللّٰه أعلم.** احقر محمد انور عفا اللہ عنہ، مفتی جامعہ ہذا۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۶۵۔۶۶)

گلے کے مسح کا حکم:

سوال: بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ گردن کے مسح کے ساتھ ساتھ گلے کا مسح بھی کر جاتے ہیں، کیا گلے کا مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

آدابِ وضو میں گردن کا مسح شامل ہے، حلقوم (گلے) کا مسح اسلاف میں سے کسی سے ثابت نہیں، اس لئے گلے

کا مسح کرنا بدعت ہے۔

”لما قال ابن نجیمؒ: والثانی مسح الرقبة وهو بظهر اليدين وأما مسح الحلقوم فبدعة ، البحر الرائق: ج ا ص ۲۸ کتا ب الطهارت. (۱)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۰۵)

---

(۱) قال الحصكفيؒ: ومسح الرقبة بظهر يديه لا الحلقوم لأنه بدعة، الدر المختار على صدر ردالمحتار: ج ا ص ۱۲۴ ،مستحبات الوضوء ،ومثله في الهندية: ج ا ص ۸،الفصل الثالث في المستحبات)

دیگر مسائل، مکروہاتِ وضو: ادب ووقار کے ساتھ وضو کرنا چاہیے۔اب اگر کوئی اس کے خلاف طریقہ پر وضو کرے تو اس کا یہ عمل مکروہ تنزیہی ہوگا۔

۱۔جیسے چہرہ یا کسی اور عضو پر زور سے پانی مارنا۔

۲۔نجس جگہ پر وضو کرنا۔

۳۔مسجد کے اندرونی حصہ میں وضو کرنا، البتہ اگر کسی برتن میں وضو کرے یا مسجد کے جس حصہ میں وضو گاہ ہے وہاں وضو کرے تو حرج نہیں۔

۴۔رینٹ یا تھوک پانی میں ڈالنا۔(ردالمحتار ۱/۱۳۱،۱۳۳)

۵۔وضو کرتے وقت اس کا خیال رکھا جائے کہ وضو کے پانی استعمال کرنے میں نہ ایسی بخالت کی جائے کہ پانی سے دھونے میں بہایا نہ جائے اور قطرات نہ گریں بلکہ ایسا دھویا جائے کہ یہ گمان ہونے لگے کہ گویا تیل بدن پر مل رہا ہو۔

۶۔اسی طرح نہ اتنا زیادہ پانی بہایا جائے کہ تین بار سے زائد ہو جائے،ایسا کرنا اسراف وفضول خرچی ہوگا۔(طہارت کے احکام ومسائل:۱۲۰،انیس)

نواقض وضو

(۱) بدن سے خالص پانی نکلنے پر وضو کا حکم:

سوال: اگر بدن کے کسی حصہ سے خالص پانی نکل آئے جو خون یا پیپ سے مخلوط نہ ہو تو کیا اس سے وضو ٹوٹتا ہے؟

الجواب

اگر یہ نکلا ہوا مواد یقیناً خالص پانی ہو جو خون یا پیپ سے مخلوط نہ ہو تو اس کے نکلنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا (وضو درست رہے گا)۔

"قال الحسن بن عمارؒ: وعن الحسن أن ماء النفطة لاینقض". (مراقی الفلاح، فصل فی نواقض الوضوء: ص ۴۸) (۲) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۷ و ۵۱۸)

زکام کی حالت میں ناک سے بہنے والی رطوبت ناقضِ وضو ہے یا نہیں:

سوال: ایک مسئلہ کے متعلق متعدد کتب کو دیکھا مگر اطمینان نہیں ہوا، جناب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں جناب کی نظر وسیع میں اگر اس کے متعلق کہیں تصریح ہو تو تحریر فرما کر ممنون فرماویں، نیز اپنی رائے عالی سے بھی مطلع فرماویں، حضرت اقدس سے بھی اگر دریافت فرمایا جاوے تو نور علیٰ نور، وہ یہ ہے کہ حالت زکام میں ناک سے جو دماغی رطوبات بصورت سیلان نکلتے ہیں آیا ناقض وضو ہیں یا نہیں اور نجس ہیں یا نہیں، فقہا کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناقض وضو ہے۔

ثم الجرح والنفطة وماء الثدی والسرة والأذن إذا کان لعلة سواء علی الأصح آه. (فتح القدیر: ص ۳۴ ج ۱، البحر الرائق: ص ۳۲ ج ۱، فتاویٰ هندیة: ص ۱۰ ج ۱). ولافرق بین الرمد وغیره من الأوجاع ولابین مامن العین أوغیرها، بل کل مایخرج من علة من أی موضع کان

(۱) نواقض وضو سے مراد یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد بدن کے حصہ سے کوئی نجس چیز نکلے یا وضو کرنے والا سو جائے یا پاگل ہو جائے یا بے ہوش ہو جائے تو وضو ختم ہو جائے گا، اس وضو سے نماز وغیرہ عبادات ادا نہیں کی جاسکتی ہے۔ (طہارت کے احکام و مسائل: ۱۲۲۔ انیس)

(۲) قال ابن نجیم: وعن الحسن أن ماء النفطة لاینقض. (البحر الرائق، بحث الوضوء: ج ۱ ص ۳۲)

كالأذن والثدى والسرة ونحوها فإنه ناقض على الأصح لأنه صديد آه (كبيرى: ص ۱۳۱) وفى التبيين: والقيح الخارج من الأذن أوالصديد إن كان بدون الوجع لاينقض ومع الوجع ينقض لأنه دليل الجرح ،روى ذلك عن الحلوانى آه وفيه نظربل الظاهرإذاكان الخارج قيحاً أوصديداً ينقض سواء كان مع وجع أوبدونه لأنهمالايخرجان إلامن علة،نعم هذاالتفصيل حسن فيماإذاكان الخارج ماءً ليس غيرآه.(البحرالرائق: ج ۱ ص ۳۲)

صاحب بحر کی اس نظیر سے بھی بظاہر ناقض ہی معلوم ہوتا ہے، علامہ شامی، فتح القدیر اور بحرالرائق کی عبارت ''**ثم الجرح والنفطة**'' **الخ** کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: **وفيه اشارة الى أن الوجع غير قيد بل وجود العلة كافٍ**، (ردالمحتار ص ۱۰۴ ج ۱) لغویین اور اطبا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ زکام کی حالت میں دماغ میں کوئی جرح یا قرحہ نہیں ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی صدید وقیح تو نہیں، **الزكام بالضم والزكمة تجلب فضول رطبة من بطنى الدماغ المقدمين الى المنخرين**، (قاموس) اس کے قریب قریب اطبا نے بھی یہی تعریف زکام کی، کی ہے، جس سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف رطوبات فاضلہ ہیں، صدید وقیح نہیں۔

فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم ص ۳۷ میں ہے: ''الجواب'' آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے پاک ہے اگر چہ بعض علما نے ناپاک کہہ دیا ہے، لیکن تحقیق کے خلاف ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس کلام وجواب سے معلوم ہوتا ہے کہ زکام کا پانی بھی ناپاک نہیں ہے ورنہ مابہ الفرق کیا ہے، نیز یہ جواب بعض فقہا کی عبارات کے خلاف ہے، **وعلى هذاقالوا: من رمدت عينه وسال الماء منهاوجب عليه الوضوء آه**، (فتح القدير جلد ۱ ص ۳۴) ان عبارات کو ملاحظہ فرما کر قول فیصل تحریر فرماویں؟

الجواب

قال فى الدر: ولاينقضه قئ من بلغم على المعتمد أصلاًآه.''قال الشامى: أى سواء كان صاعداًمن الجوف أونازلاًمن الرأس ،خلافاً لأبى يوسفؒ فى الصاعد من الجوف واليه أشار بقوله على المعتمد،آه،جلد ۱ ص ۱۴۳.

قلت أطلق فى النازل من الرأس فشمل المزكوم وغيره،وفى مراقى الفلاح: و ينقضه قئ طعام وماء وان لم يتغير أوعلق أومرة اذاملأ الفم لتنجسه بمافى قعرالمعدةآه قال الطحطاوى: قوله وان لم يتغيرأشاربه الى أنه لافرق بين أنواع القيئى سواء قاء من ساعته أم لاوقال الحسن: اذاتناول طعاماًأوماءً ثم قاء من ساعته لاينتقض وضوئه وقال الزاهدى: ومحل الاختلاف اذاوصل الى معدته ولم يستقرأمالوقاء قبل الوصول وهوفى المرئى فانه لاينقض

اتفاقاًآه(ص ۵۲) قلت: وظاهر أن ماء الأنف انما ينزل من الرأس ولايصعدمن المعدة فلاينقض اتفاقا وفيه أيضاً(ص ۵۵) وهو(أى البلغم) طاهر آه.

قال الطحطاوى:أى عند همامطلقاًلأنه بزاق حقيقةً والبزاق طاهرلأن الرطوبةترقى أعلى الحلق فتصيربزاقاًوفى أسفله تغلظ فتصيربلغماًفلم يخرج من المعدةآه قلت:ولماكان ذلك حقيقةالبلغم فله حكم البزاق سواء سال من الأنف أومن الفم وفى الخلاصة:وان قاء بلغماًان نزل من الرأس فهوكالبزاق وان صعد من الجوف فكذلك عند هماوقال أبويوسفؒ ينقض ان كان ملأالفم آه(ص۵۱ ج۱)

وفى مراقى الفلاح مع الطحطاوى أيضاًعن الجوهرة:الماء الصافى اذا خرج من النفطةلاينقض،وفى التبيين: ولوكان بعينه رمد أوعمش يسيل منها الدموع قالوا: يؤمر بالوضوء لوقت كل صلوٰةلاحتمال أن يكون صديداً أوقيحاً،قال العلامة الشلبى فى حاشية عليه: قال الشيخ كمال الدين فى فصل المستحاضة:أقول هذا التعليق يقتضى أنه امراستحباب فان الشك والاحتمال فى كونه ناقضاً لايوجب الحكم بالنقض اذاليقين لايزول بالشك (الى أن قال)ومما يشهد لهذا(أى لكونه أمر استحباب)مافى الشرح الزاهدى عقيب هذه المسئلة،وعن هشام فى جامعه: ان كان قيحاً فكالمستحاضة والافكالصحيحة وأما قولهم: ماء الجرح والنفطة وماء السرةوالثدى والعين والأذن ان كان لعلةسواء "ينبغى أن يحمل على ماذا كان الخارج من العين متغيرابسبب ذلك آه(ص ۵۱)قلت :وماينزل من الماء فى الزكام ليس لعلة جرح أوقرحة كمالا يخفىٰ ومع ذلك فهو ماء صاف ليس بمتغير فكان كماء العين الصافى فلا ينقض ولايكون نجساً وقال البدرالعينى فى شرح البخارى له تحت حديث وماتنخم النبى صلى اللّٰه عليه وسلم النخامة الاوقعت فى كف رجل منهم فدلك بها وجهه وجلده:مانصه بيان استنباط الأحكام، منها:الاستدلال على طهارة البصاق والمخاط قال ابن بطال:وهو أمر مجمع عليه لانعلم فيه خلافاً الاماروى عن سلمانؓ: أنه جعله غير طاهر وأن الحسن بن حى: كرهه فى الثوب و عن الأوزاعى: أنه كره أن يدخل سواكه فى وضوءه وقال بعض الشراح: ماثبت عن الشارع من خلا فهم فهوالمتبع والحجة البالغة فلامعنى لقول من خالف آه (ص ۹۴۵ ج۱) وقال قبل ذلك بصفحة: والمخاط بضم الميم مايسيل من الأنف آه قلت :أطلقوافى طهارته ولم يقيدوه بغير المزكوم فهوطاهرمطلقاًوذكرفى البحر :وألحقوابالقئ ماء فم النائم اذاصعد من

الجوف (أى البطن) بأن كان أصفر أو منتناً وهو مختار أبى نصر وصحح فى الخلاصة طهارته وعند أبى يوسف: نجس، ولو نزل من الرأس فطاهر اتفاقاً آه (ص ۳۵) وصرح قبل ذلك بطهارة المخاط النازل من الرأس ولو كان كثيراً فاحشاً ورد على الخلاصة حيث ذكر فيه خلاف أبى يوسف وانما خلافه فى الصاعد من الجوف فليراجع، وقال قاضى خان: الماء اذا اختلط بالمخاط أو بالبزاق جاز به التوضى ويكره آه (ص ۱۰ ج ۱) أطلق فى المخاط ولم يقيده بغير المزكوم فلو كان مخاط المزكوم نجساً حدثاً لزم التقييد به والكراهة التى ذكرها للاستقذار عن مثل ذلك الماء طبعاً، بہرحال فقہا کی ان اطلاقات اور تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ رطوبات سائلہ من الانف مطلقاً طاہر ہیں، الا أن يكون دماً، واللہ اعلم۔

تتمة الكلام:

ثم رأيت الشامى قد بحث عن المسئلة صراحةً فقال تحت قول الدر: وصاحب عذر من به سلس البول أو استطلاق بطن (الى أن قال) وكذا كل ما يخرج بوجع ولو من أذن وثدى وسرة آه ما نصه: ظاهره يعم الأنف إذا زكم لكن صرحوا بأن ماء فم النائم طاهر ولو منتناً فتأمل آه (ص ۳۱۴ ج ۱، باب المعذورين) وفى التحرير: المختار قوله لكن صرحوا بأن فم النائم الخ أى فمقتضى ما صرحوا به أن لا يكون الزكام ناقضاً بالأولىٰ لانبعاثه من الرأس الذى ليس محل النجاسة وانبعاث الأول من الجوف الذى هو محلها لكن يفرق بينهما بأن الزكام خارج بعلة بخلاف ماء فم النائم ولو منتناً آه (ص ۳۹ ج ۱) قلت: إن أراد بالعلة مطلق المرض فوجوده فى الزكام مسلم ونفيه عن ماء فم النائم ممنوع لأن الماء لا يسيل عن فم النائم الا لعلة فى جوفه كحدوث الديدان فيه ونحوه وإن أراد بها الجرح والقرح فنفيه عن ماء فم النائم مسلم ولا نسلم وجوده فى الزكام فان حقيقته تجلب الفضول الرطبة من بطنى الدماغ المقدمين الى المنخرين وتجلب الفضول من بطنى الدماغ المقدمين إلى الحلق ويسمى نزلة كذا فى الكشاف للتهانوى (ص ۶۱۹ ج ۲) وسببه حرارة الدماغ أو برودته طبعيتين كانتا أو عارضتين كما فى شرح الأسباب ولم يقل أحد: ان سببه جراحة فى الدماغ أو قرحة فيه والظاهر أن المراد بالعلة فى كلام الفقهاء الجرح لا مطلق المرض والا لزم كون الدمع ناقضاً أيضاً لا سيما من ضعيف القلب فانه لا يبكى الا لعلة فى قلبه وكذا ريق من كان مبتلى بكثرة سيلانه كما يشاهد فى كثير من الناس وفيه مخالفة للنصوص الدالة على طهارته مطلقاً وعليه الاجماع كما مر وأيضاً فيه من

الجرح مالایخفیٰ وهومدفوع بالنص﴿مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾فالصحيح أن ماء فم النائم والزكام سواء بل عدم النقض فى الثانى أولىٰ كماذكره فى التحرير أولًا وأيضاًفاطلاق المتقدمين بطهارةالنازل من الرأس وعدم تعرضهم لبيان الخلاف فيه وذكرهم ذلك فيمايصعد من الجوف من البلغم يرد هذا البحث ويستأصله فلوكان فى الزكام وسوسةمالماسكتواعنه وقد ورد فى الحديث عن سلمة بن الأكوعؓ :أنه سمع النبى صلى الله عليه وسلم وعطس رجل عنده فقال له: يرحمك الله ثم عطس أخرى فقال: الرجل مزكوم،رواه مسلم وفى رواية للترمذى:أنه قال: فى الثالثة انه مزكوم آه ولم يأمره النبى صلى الله عليه وسلم بالاحتراز عما يخرج من أنفه وعن أبى هريرةؓ قال شمت أخاك ثلاثاً فإن زادفهو زكام،رواه أبوداؤد وقال: لاأعلمه إلا أنه رفع الحديث الى النبى صلى الله عليه وسلم كذافى المشكوٰة(ص ۳۴۶)ولم يردفى نص ماأنه أمره بالاجتناب عن ماء زكامه فالظاهرماقلناأنه طاهروليس بنجس ولاناقض وروى الشيخان عن أبى هريرةؓ مرفوعاً ”إن الله يحب العطاس ويكره التثاؤب“كمافيه أيضا(ص مذكور)ولايخفىٰ كثرة العطاس فى الزكام فلوكان ناقضاًونجساًلم يكن محبوباًمطلقاًبل ذكرله الشارع حداًمعلوماًوإذليس فالقول بنجاسةماء الزكام وبكونه ناقضاًللوضوء خلاف النصوص،والله تعالىٰ أعلم،حرره الأحقرظفرأحمدعفاالله عنه، ازتھانہ بھون ۲۴؍جمادی الأولیٰ ۱۳۴۵ھ، نعم التحقيق وبالقبول حقيق. اشرف علی عفی عنہ ۲۴؍جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ۔ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۱ تا ۳۵۶)

نزلہ، زکام کے قطرات نجس نہیں:

سوال: نزلہ کی شکایت مجھے عموماً رہتی ہے دوران مرض نماز میں خصوصاً رکوع وسجدہ کے دوران عموماً ناک سے اور کبھی آنکھوں سے بھی کپڑوں اور مسجد میں نزلہ، زکام کا پانی گرتا رہتا ہے اس بارے میں فتویٰ دیں؟

الجواب ـــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

ایسی حالت میں رومال یا تولیہ سامنے رکھ لیا جائے تا کہ ناک سے جو نزلہ کے قطرات گریں وہ فرش مسجد پر نہ گرے اگرچہ نزلہ کے قطرات گرنے سے وضو یا نماز میں نقصان نہیں آتا۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم

(۱) فأماالإنسان فمايخرج منه علىٰ ثلاثة أقسام قسم منه طاهر وبخروجه لاينتقض الوضوء وإن أصاب شيئاً لاينجسه وهوعشرة أشياء :وسخ الأذن ودموع العين والمخاط والبزاق الخ،النتف فى الفتاوىٰ: ۲۶،مايخرج من الإنسان،سعيد،وكذافى حاشية الطحطاوى علىٰ مراقى الفلاح: ۱۶۳،قديمى،وكذافى البدائع: ۱/ ۳۶۲،مطلب نجاسة منى،دارالكتب العلميةبيروت،وكذافى البحرالرائق: ۱/ ۱۷۴،كتاب الطهارة،رشيديه.

دیو بند،۲۰/۶/۸۸ھ،الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ دارالعلوم دیو بند،۲۲/۶/۸۸ھ(فتاویٰ محمودیہ:۴۳/۵ ۷)

بلغم نکلنے سے وضونہیں ٹوٹتا:

سوال: شخصے از مدت چارسال بعارضۂ سرفہ مبتلا ست پس بخروج بلغم کہ ہیچ خون دراں نیست وضوشکستہ میشود یانہ؟(۱)

الجواب

ازخروج بلغم مذکوروضونمی شکند کماھومصرح بہ فی کتب الفقہ ۔فقط(حاصل جواب یہ ہے کہ بلغم سے وضونہیں ٹوٹتا۔ظفیر)(۲)فقط(فتاویٰ دارالعلوم:۱۴۲/۱)

ہونٹوں سے صاف پانی نکلنے سے وضونہیں ٹوٹتا:

سوال: کیافرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرشفتین سے صاف پانی نکل جائے جومختلط بالدم یاقیح نہ ہو،نہ صدید ہو،تو کیا یہ پانی ناقض وضو ہے؟ بینواتوجروا۔(المستفتی: پیرمحمد جندری کرک، یکم شعبان۱۴۰۳/ھ)

الجواب

اگراس خارج کا ماءصافی ہونا متیقن ہوتواس سے وضونہیں جا تارہےگا۔**کما فی مراقی الفلاح** .(۳)**واللہ أعلم**(فتاویٰ دیوبند پاکستان،المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلددوم:۵۰)

آنکھ کے پانی کاحکم:

سوال: بہشتی زیورحصہ اول نواقض وضو کے ذیل میں لکھا ہے کہ اگرآنکھیں اُٹھی ہوں اورکھٹکتی ہوں توپانی بہنے اورآنسونکلنے سے وضوٹوٹ جاتاہےاوراگرآنکھیں نہ آئی ہوں،اس میں کچھ کھٹک ہوتوآنسونکلنے سے وضونہیں ٹوٹتا، آگے چل کربطورقاعدہ کلیہ درج ہے کہ جس چیز کے نکلنے سے وضوٹوٹ جاتاہے وہ چیزنجس ہوتی ہے،ایسی صورت میں جب بچوں کی آنکھیں دکھتی ہوں اوران کی آنکھوں کاپانی اکثرماں وغیرہ کے کپڑوں کوترکردیتاہے،کیااس کپڑےکوبغیردھوئےنمازجائزہے یانہیں؟

(۱) ایک شخص عرصہ چارسال سے سرفہ کے مرض میں مبتلاہے،توبلغم نکلنے کی وجہ سے جس میں خون کچھ نہیں ہوتا،وضوٹوٹتا ہے یانہیں؟انیس۔

(۲) لاینقضہ قیٔ من بلغم علی المعتمدأصلاً(الدرالمختارمع ردالمحتار،نواقض الوضوء: ۱۲۸/۱)ظفیر۔

(۳) قال العلامۃ الطحطاوی: إن ماء النفطۃ لاینقض، وفی الجوھرۃ عن الینابیع: الماء الصافی إذا خرج من النفطۃ لاینقض .(الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ص۴۸،فصل فیما ینقض الوضوء.)

الجواب ـــــــــــــــــــــــ

اس مسئلہ میں ایک قول یہ ہے جو بہشتی زیور میں منقول ہے اور قاعدہ مذکورہ بھی صحیح ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ آنکھیں دکھنے والے کی آنکھ سے جو پانی نکلے وہ ناقض وضو نہیں ہے اور اس صورت میں وہ نجس بھی نہ ہوگا، حسب قاعدہ مذکورہ شامی میں منیہ سے منقول ہے: **وعن محمدؒ اذا کان فی عینیه رمد وتسیل الد موع منها اٰمره بالوضوء لوقت کل صلوٰة لأني أخاف أن یکون ما یسیل منها صدیداً فیکون صاحب العذر آه قال فی الفتح: وهذا التعلیل یقتضی أنه أمر استحباب فان الشک والاحتمال لایوجب الحکم بالنقض إذالیقین لایزول بالشک الخ شامی.** (۱)

پس اس تحقیق کی بنا پر وہ پانی جو دکھتی آنکھ سے نکلے جب تک متغیر نہ ہو مثلاً اس میں سرخی وغیرہ نہ ہو بلکہ صاف پانی ہو تو وہ ناقض وضو نہ ہوگا اور نجس بھی نہ ہوگا۔ فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۴۳و۱۴۴)

آنسو نکلنے سے وضو کا حکم:

وضو کے بعد کسی جذبہ کے تحت آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے تو ایسی حالت میں وضو باقی رہے گا یا کہ ٹوٹ جائے گا؟

الجواب ـــــــــــــــ وباللہ التوفیق

باقی رہے گا۔(۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور۔ ۲۱/۷/۱۳۸۵ھ، الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان مفتی دارالعلوم دیوبند (منتخبات نظام الفتاویٰ جدید: ۱/۱۵۵)

آنکھ سے پانی گرنا ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: عام کتب فقہ میں مرقوم ہے کہ آنکھ اٹھی ہو، یا اس میں کوئی ضرب لگنے سے یا مٹی وغیرہ پڑ جانے سے یا آنکھ میں درد پیدا ہو جانے سے، یعنی ہمہ صورتوں میں جب درد پیدا ہونے سے پانی آجاوے گا تو وہ نجس ہے اور ناقض وضو ہے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کا فتویٰ فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم میں صفحہ ۲۷، پر عدم ناقض وضو مرقوم ہے۔ آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے پاک ہے، اگرچہ بعض نے ناپاک کہہ دیا۔ لیکن خلاف تحقیق ہے۔

الجواب ـــــــــــــــــــــــ

آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے اس میں تحقیقی قول وہی ہے جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ نے ارقام

(۱) ردالمحتار، نواقض الوضوء: ۱/۱۳۷۔ ظفیر۔
(۲) کیوں کہ ۔۔۔آنکھ سے آنسو بہنے یا گندگی یا کیچڑ نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۳۳۔ انیس)

فرمایا ہے۔(۱) اس مسئلہ کی بحث درمختار وشامی جلد اصفحہ ۱۳۷ میں اس طرح کی ہے کہ صاحب درمختار نے یہ لکھا ہے کہ وہ پانی نجس اور ناقض وضو ہے عبارت اس کی یہ ہے کہ **فدمع من بعينيه رمدأو عمش ناقض الخ.** (۲) اس پر علامہ شامی نے امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ایسی صورت میں وضو کا امر استحباباً ہے وجوباً نہیں ہے جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ وہ پانی ناقض وضو نہیں ہے۔ عبارت شامی کی یہ ہے: **قوله ناقض الخ قال في المنية وعن محمد رحمه الله: إذا كان في عينه رمد وتسيل الدموع منها آمره بالوضوء لوقت كل صلاة لأني أخاف أن يكون ما يسيل منها صديداً فيكون صاحب العذر، آه** (۳) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابن ہمام رحمۃ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ناقض وضو نہیں۔ اور یہ موافق قواعد شرعیہ کے ہے یہی راجح ہے۔ (۴) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۴و۱۳۵)

آنکھ دکھنے میں جو آنسو نکلتے ہیں اس کے مطلقاً ناقض وضو ہونے میں اختلاف ہے:

سوال: آنکھ دکھنے میں جو آنسو نکل آتے ہیں وہ پاک ہیں یا نہیں؟

الجواب

درمختار میں لکھا ہوا ہے کہ وہ آنسو یا پانی وغیرہ جو دکھتی آنکھ سے نکلے ناقض وضو ہے تو اس سے نجس ہونا معلوم ہوتا ہے مگر صاحب فتح القدیر کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک پیپ ہونا اس کا ظاہر نہ ہو ناقض وضو نہیں۔ **كما قال الفقهاء ماليس بحدث ليس بنجس . والله تعالىٰ أعلم.** (عزیز الفتاویٰ: ۱/۱۸۰، ۱۸۱)

---

(۱) **دکھتی آنکھ سے جو پانی نکلے وہ ناقض وضو نہیں:**

سوال: آنکھ دکھتی ہوئی میں جو ڈھیڈ آجاتا ہے تو زید کہتا ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ خون سے بنتا ہے۔ زید کا قول صحیح یہ یا نہیں؟ (مرسلہ میاں جی عبدالرحمٰن صاحب سہنسپور ضلع بجنور)

الجواب

آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے پاک ہے اگرچہ بعض نے ناپاک کہہ دیا ہے۔ لیکن تحقیق کے خلاف ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ کامل: ص ۲۳۷) انیس۔

(۲) **الدر المختار مع رد المحتار كتاب الطهارة، نواقض الوضوء:** ۱/۱۳۷، ظفیر۔

(۳) **رد المحتار كتاب الطهارة نواقض الوضوء:** ۱/۱۳۷۔ ظفیر۔

(۴) **قال في الفتح: وهذا التعليل يقتضي أنه أمر استحباب فإن الشك والاحتمال لا يوجب الحكم بالنقض إذ اليقين لا يزول بالشك نعم إذا علم بإخبار الأطباء أو بعلامات تغلب ظن المبتلىٰ يجب الخ وقد استدرك في البحر على ما في الفتح بقوله: لكن صرح في السراج بأنه صاحب عذر فكان للإيجاب ويشهد له قول المجتبىٰ ينتقض وضوئه. (رد المحتار نواقض الوضوء:** ۱/۱۳۷) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اختلاف کی بنیاد پانی پر ہے کہ وہ مرض کی وجہ سے آرہا ہے اور وہ پیپ ہے یا یوں ہی آرہا ہے۔ واللہ اعلم۔ محمد ظفیر الدین غفرلہ۔

درد کی وجہ سے آنکھ سے پانی آنا ناقض وضو ہے:

سوال: آنکھوں سے جو پانی درد کے ساتھ برآمد ہو وہ ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب

درمختار میں ہے: (وإن خرج به) أي بوجع (نقض) الخ. (۱) یعنی درد کے ساتھ آنکھوں سے پانی نکلنا ناقض وضو ہے۔ فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۴۱)

سرمہ کی تیزی یا اس کی سلائی کی چوٹ سے جو پانی نکلے وہ ناقض وضو نہیں:

سوال: سرمہ کی تیزی یا سلائی کی چوٹ سے جو پانی آنکھ سے نکلتا ہے وہ ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب

ناقض وضو نہیں ہے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۳۶)

آنکھ یا کان وغیرہ سے نکلنے والی اشیاء کا ناقض ہونا:

سوال: کان، ناک، ناف، آنکھ، پستان وغیرہ سے نکلنے والی اشیا سے نقض وضو ہوگا یا نہیں؟

الجواب

اگر ان جگہوں میں درد ہے تو ایسی صورت میں مرض کی وجہ سے جو کچھ نکلے گا تو وضو باقی نہ رہے گا اور اگر درد نہیں ہے تو ناقض وضو نہیں۔

شرح منیہ میں حلبیؒ بیان فرماتے ہیں:

روی عن محمدؒ أنه قال: الشیخ إذا کان فی عینیه رمد و تسیل الدموع منهما أی من عینیه اٰمره (فعل مضارع عن مقول محمدؒ) بالوضوء لوقت کل صلوٰة أی کسائر أصحاب الأعذار لأنه أخاف أن یکون مایسیل صدیداً فیکون صاحب عذر ولافرق فی ذلک بین الشیخ والشاب إلاأنه ذکر الشیخ باعتبار الأکثر ولافرق بین الرمد وغیره من الأوجاع بل کل مایخرج من العلة

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار: نواقض الوضوء: ۱/۱۳۷. ظفیر۔ یہ امر استحبابی ہے، اس لیے وضو کرنا چاہیے۔ انیس

(۲) کمالاینقض لوخرج من أذنه ونحوها کعینه وثدیه قیح ونحوه کصدید وماء سرة وعین لابوجع وإن خرج به أی بوجع نقض لأنه دلیل الجرح فدمع من بعینه رمد أوعمش ناقض فإن استمر صار ذاعذر (درمختار) قوله لابوجع تقییدلعدم النقض بخروج ذلک الخ. (ردالمحتار کتاب الطهارة نواقض الوضوء: ۱/۱۳۷) ظفیر۔

مع وجع سواء كان من العين أو الأذن أو السرة أو الثدى أو نحوها فإنه ناقض على الأصح لأنه صديد بخلاف ما إذا كان بدون وجع ،انتهى. (فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ:۱۹۵)

کان کا میل نکالنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: باوضو آدمی کان کی کھجلی کی وجہ سے انگلی سے کھجلی کرے اور کان کا موم انگلی پر لگے اور انگلی کو اپنی قمیص سے صاف کرے تو اس صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ نیز قمیص پر موم لگنے سے وہ قمیص پاک رہے گی یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

کان کے میل سے وضو نہیں ٹوٹتا، البتہ کان بہتے ہوں اور کان میں انگلی ڈالنے سے انگلی کو پانی لگ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔(۱) اور وہ پانی بھی نجس ہے۔(۲) (آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد سوم:۹۳)

کان سے نکلا ہوا گندہ پانی ناقضِ وضو ہے:

سوال: زید کو تقریباً دس سال کے عرصہ سے اب تک جب کہ عمر بیس سال کی ہو چکی ہے کان سے گندہ پانی نکلتا ہے اور کبھی کبھی سال میں درد بھی ایک دو روز کے لیے ہو جاتا ہے لیکن پانی ہمیشہ نکلتا رہتا ہے تو اس سے اس کا وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ اسے معذور قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ کیوں کہ وہ پنج وقتہ امامت بھی کرتا ہے تو اس کی امامت درست ہے یا نہیں؟ تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ وضو کرتے وقت کان کو اچھی طرح سے صاف کر لیتا ہے، گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد روئی اگر کان میں نہیں رکھتا ہے تو کان سے گندہ پانی نکل آتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

جو گندہ پانی کان سے نکلتا ہے اور درد بھی کان میں کبھی کبھی ہوتا ہے وہ ناقضِ وضو ہے اگر وہ شرعاً معذور ہے تو اس کی امامت درست نہیں ہے اور اگر غیر معذور ہے یعنی اس کو اتنا وقت ملتا ہے کہ باوضو نماز شروع کرے اور بغیر پانی نکلے نماز ادا کرے تو نماز امام اور مقتدیوں کی، سب کی درست ہوگی۔ کبیری،(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند ۱۳۹۳/۳/۳ھ (فتاویٰ محمودیہ:۶۵/۵۔۶۶)

---

(۱) (كما لا ينقض لو خرج من أذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لا بوجع وإن) خرج (به) أى بوجع نقض لأنه دليل الجرح...الخ، وفى الشامية: قال فى البحر: وفيه نظر بل الظاهر إذا كان الخارج قيحاً أو صديداً نقض سواء كان مع وجع أو بدونه لأنهما لا يخرجان إلا عن علة. (الدرالمختار مع ردالمحتار ج: ۱/ص: ۱۴۷، مطلب فى ندب مراعات الخلاف....الخ۔

(۲) كل ما يخرج من بدن الانسان ما يوجب خروجه الوضوء او الغسل فهو مغلظ. (الفتاوىٰ الهندية: ۱/ ۴۶، الباب السابع فى النجاسة واحكامها. انیس۔)

(۳) كل ما يخرج من علة من أى موضع كان كالأذن والثدى والسرة ونحوها فإنه ناقض على الأصح ==

کان یا آنکھ میں سے پانی وغیرہ نکلے تو وضوٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: اگر کان یا آنکھ میں درد وتکلیف ہو اور اس وقت کان یا آنکھ سے مواد یا پانی نکلے اور نکل کر باہر آجائے تو یہ ناقض وضو ہے یا نہیں؟ ایسی حالت میں نماز پڑھ لی ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب

اگر کان یا آنکھ میں کچھ درد وتکلیف ہو اور اس وقت کان یا آنکھ سے مواد یا پانی خارج ہو اور ایسی جگہ تک آجائے کہ جس کا وضو یا غسل میں دھونا ضروری ہے تو اس سے وضوٹوٹ جائیگا اور وضو کئے بغیر نماز پڑھنا صحیح نہ ہوگا پڑھی ہو تو اعادہ ضروری ہے اور اگر کچھ درد وتکلیف نہ ہو اور ایسے ہی پانی نکلے تو اس سے وضونہیں ٹوٹتا، درمختار میں ہے: (**لا ينقض لو خرج من أذنه) ونحوها كعينه و ثديه (قيح) ونحوه كصديدوماء سرة و عين (لا بوجع و إن خرج به) أي بوجع (نقض) لأنه دليل الجرح (درمختارمع الشامي: ١ /١٣٧**) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۱۲۸و۱۲۹)

ناک کی ریزش سے وضو:

سوال: ناک کی ریزش میں کوئی چیز منجمد آتی ہے جو پیپ کا سا رنگ رکھتی ہے تو کیا اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے یانہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریزش میں انجماد ہوگیا اور سڑ گئی۔

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر محض ریزش منجمد ہوگئی تو وہ ناقض وضو نہیں۔(۱) اگر پیپ ہے تو وہ ناقض وضو ہے کسی طبیب حاذق سے تحقیق کرلی جائے۔(۲) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور یوپی، الجواب صحیح: سعید احمد مفتی مظاہر علوم، صحیح: عبداللطیف، مدرسہ مظاہر علوم ۲۶/۲/۶۴ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۶۵)

== لأنه صديد. (الحلبي الكبير: ١٣٣، فصل في نواقض الوضوء، سهيل اكيڈمى، لاهور)، شامي. (لاينقض لوخرج من أذنه ونحوها كعينه وثديه قيح ونحوه كصديد وماء سرةوعين لابوجع وإن خرج به أي بوجع نقض لأنه دليل الجرح الخ. (الدرالمختار كتاب الطهارة مطلب فى ندب مراعاة الخلاف آه: ١/١٤٧ سعيد) اور عالمگیری میں تفصیل مذکور ہے (الدم والقيح والصديد وماء الجرح والنفطة والسرة والثدى والعين والأذن لعلة سواء على الأصح، كذافي الزاهدى، ولو صب دهناً فى أذنه مكث فى دماغه ثم سال من أذنه ومن أنفه لاينقض الوضوء. (الفتاوىٰ العالمكيرية: ١/١٠ كتاب الطهارة، نواقض الوضوء، رشيديه۔)

(۱) الرجل إذاانتثرفخرج من أنفه علق قدرالعدسة لاينقض الوضوء. (كذافى الخلاصة، الفتاوىٰ العالمكيريه: ١/١١، نواقض الوضوء، رشيديه، وكذافى التاتارخانيه: ١/١٢٧، نواقض الوضوء، إدارةالقرآن، کراچی۔)

(۲) نعم إذاعلم أنه صديدأوقيح من طريق غلبة الظن بإخبارالأطباء أوعلامة تغلب علىٰ ظن المبتلىٰ يجب. (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح: ٨٨، قدیمی۔)

گرمی دانہ کے پانی کا حکم:

سوال: موسم گرما اور برسات میں اکثر گرمی دانے نکل آتے ہیں اور کچل دینے سے ان سے پانی نکلتا ہے اس سے وضو تو نہیں ٹوٹتا؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــ باسم ملهم الصواب

اگر دانہ ٹوٹنے سے پانی ازخود نہیں بہا بلکہ ہاتھ یا کپڑا لگنے سے پھیل گیا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر پانی زخم سے ابھر کر اوپر آ گیا اور دانہ کے سوراخ سے زائد جگہ میں پھیل گیا مگر اوپر ابھرنے کے بعد نیچے نہیں اترا تو اس کے ناقض ہونے میں اختلاف ہے۔ راجح یہ ہے کہ ناقض نہیں۔ **قال فی العلائیة: "لو مسح الدم کلما خرج ولو ترکه لسال نقض وإلا لا، وقال ابن عابدینؒ: (قوله عین السیلان) اختلف فی تفسیره ففی المحیط: عن أبی یوسفؒ: أن یعلو وینحدر وعن محمدؒ: إذا انتفخ علی رأس الجرح وصار أکثر من رأسه نقض والصحیح لا ینقض آه قال فی الفتح: بعد نقله ذلک وفی الدرایة: جعل قول محمدؒ أصح ومختار السرخسیؒ الأول وهو أولیٰ آه أقول: وکذا صححه قاضیخانؒ وغیره وفی البحر تحریف تبعه علیه، فاجتنبه".** (ردالمحتار: ۱/۱۲۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۹/رجب ۹۸ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۸-۲۹)

گرمی دانوں سے نکلنے والی رطوبت سے وضو ٹوٹے گا یا نہیں:

سوال: موسم گرما میں جو اکثر لوگوں کے بدن پر گرمی دانے نکلتے ہیں ان کے پھٹ جانے سے جو پانی نکلتا ہے اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــ وباللہ التوفیق

اگر یہ پانی اتنا زیادہ ہے کہ گرمی دانوں کے اوپر سے متجاوز ہو کر بدن پر بہنے لگے تو ناقض وضو ہونا چاہئے ورنہ نہیں کیونکہ اس کا حکم بھی خون اور پیپ اور زخم کے پانی جیسا ہے۔ **قال فی الدر المختار: وینقضه خروج کل خارج نجس بالفتح ویکسر منه أی من المتوضی الحی معتاداً أولا من السبیلین أولا إلی ما یطهر الخ وفی شرح الکبیر للمنیة ص ۱۱۷. أیضاً رطوبات البدن وأخلاطه لا یعطیٰ لها حکم النجاسة إلا بالانتقال (إلی قوله) ولا تکون منتقلة إلا بالتجاوز والسیلان ثم قال نفطة وهی الجدری والبثرة قشرت فسال منها ماء خالص اجتذب من خارج والتأمت علیه أو دم أو صدید (إلی قوله) إن سال عن رأس الجرح نقض الخ.** (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند یعنی امداد المفتین: ۲/۲۴۴)

کھجلی کے دانوں کے پانی کا حکم:

سوال: کھجلی کے دانوں سے بعض اوقات مسلسل پانی بہتا ہے وہ نجس ہے یا پاک اور جس کپڑے پر وہ لگے وہ ناپاک قرار پائے گا یا نہ؟ اور اس پانی کے نکلنے سے جو پتلا پتلا نکلا کرتا ہے ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

اگر وہ پانی اپنی جگہ سے بہہ جائے تو ناقض وضو بھی ہے۔(۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم ۔حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ:۶۱/۵و۶۲)

کیا پیشاب لگنے سے وضو واجب ہے:

سوال: کسی باوضو آدمی پر بچہ پیشاب کردے، یا جانور کے پیشاب کی چھینٹیں پڑ جائیں تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ یا کپڑا اور بدن کے اس حصہ کا دھو لینا کافی ہوگا جہاں پیشاب لگا ہو؟ (محمد سیف اللہ، بابانگر)

الجواب ــــــــــــــــ

جس جگہ پیشاب لگ جائے اس کا دھو دینا کافی ہے، وضو کرنے کی ضرورت نہیں، وضو تو اس وقت ٹوٹتا ہے جب جسم کے اندر سے پیشاب خارج ہو، یا کوئی اور نجاست نکلے ۔(۲) (کتاب الفتاویٰ:۴۴/۲)

روئی کی وجہ سے قطرۂ پیشاب باہر نہ آئے تو وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: متوضی نے بخوف قطرہ احلیل میں پنبہ دیا، بعدہ نماز میں یا خارج صلوٰۃ قطرہ کا نزول مثانہ سے ہوا مگر بوجہ پنبہ بیرون نہیں نکلا، تو اس صورت میں وضو باطل ہے یا نہیں؟

(۱) بخلاف نحو الدم والقيح ولذا أطلقوا في الخارج من غير السبيلين كالدم والقيح والصديد أنه ينقض الوضوء ولم يشترطوا سوى التجاوز إلى موضع يلحقه حكم التطهير. (ردالمحتار: ۱۴۸/۱، كتاب الطهارة، مطلب في ندب مراعاة الخلاف اذا لم يرتكب مكروه مذهبه ،سعيد ،"والمعاني الناقضة للوضوء كل ماخرج من السبيلين والدم والقيح والصديد إذاخرج من بدن فتجاوز إلى موضع يلحقه حكم التطهير. (القدوري: ص ٦ ،نواقض الوضوء ،سعيد، وكذافي البحر الرائق: ۵۹/۱، مكتبه رشيديه، وكذافي غنية المستملي (الحلبي الكبير): ۱۲۷ ،نواقض الوضوء، سهيل اكيڈمی ،لاهور)اور جس کپڑے پر لگ جائے وہ بھی نجس ہوجائے گا۔(كل مايخرج من بدن الإنسان مايوجب خروجه الوضوء أوالغسل فهو مغلظ.... فإذا أصاب الثوب الأكثر من قدر الدرهم يمنع جواز الصلوٰة كذافي المحيط. (الفتاویٰ العالمكيريه: ۴۶/۱، كتاب الطهارة ،الباب السابع في النجاسة وأحكامها، رشيديه۔)

(۲) وضو کے بعد اگر پاؤں سے نجاست کو روندے تو بھی وضو نہیں ٹوٹے گا، البتہ اگر نجاست لگ جائے تو اس کو دھوڈالے۔(طہارت کے احکام ومسائل:۱۳۳) والمعاني الناقضة للوضوء كل ماخرج من السبيلين والدم والقيح والصديد إذاخرج من بدن فتجاوز إلى موضع يلحقه حكم التطهير. (قدوری: ص ۶، نواقض الوضو۔انیس)

الجواب

اگر مثانہ سے قطرہ خارج ہوا اور باہر نہیں نکلا اور روئی کے باہر کے حصہ پر کوئی اثر تری کا نہیں آیا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر روئی کے بیرونی حصہ پر اثر تری کا آ گیا تو وضو ٹوٹ جاوے گا۔ **کذافی الدر المختار** . (۱) (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۸)

پیشاب کے ظاہر ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ عضو مخصوص کے سر میں جو سوراخ ہے اگر انسان اس کو کھولتا ہے تو کھل جاتا ہے تو یہ سوراخ داخل میں سے ہے یا خارج میں سے، نیز اگر بول اس سوراخ کو آجاویں اور باہر نہ نکل جائے تو اس صورت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ (المستفتی محمد ابراہیم بلامبٹ تیمر گرہ ضلع دیر۔ ۲۵/شوال/۱۳۸۹ھ۔)

الجواب

جب تک بول ظاہر نہ ہوا ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا ہے اور جب سوراخ میں دیکھا جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اگر چہ سائل نہ ہوا ہو۔ (**شامی ص ۱۲۴، ۱۲۵ جلد ۱**) (۲) **وھوالموفق** ۔ (فتاویٰ دیوبند پاکستان، المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم: ۵۷)

درمیان نماز قطرہ آجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا:

سوال: نماز پڑھنے کی نقل و حرکت میں جب کہ قطرہ آجاتا ہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اور اب پھر وضو کر کے اپنی بقیہ نماز ادا کی جاوے، یا نماز کی ضرورت نہیں ہے اور کپڑے کو بدل دے یا اسی سے نماز ادا کرے، جب کبھی ایسا موقع ہوا ہے تابعدار نے نہ وضو دوبارہ کیا ہے، نہ پائجامہ بدلا ہے، یہ شبہ ابھی تک قائم ہے اور خیال ہوتا ہے کہ نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ لہذا امیدوار ہوں کہ مفصل جواب سے مطلع کیا جاؤں؟

الجواب

وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس لئے دوبارہ کیا جاوے، پھر خواہ برعایت شرائط بنا کی جاوے یا نماز دوبارہ پڑھ لی جاوے اور روپیہ کے پھیلاؤ میں کپڑا نجس ہو گیا ہے تو اس کو بھی بدلنا ضروری ہے، اس میں نماز نہ ہوگی اور اگر روپیہ کے برابر نجاست نہ لگی ہو تو اسی کپڑے میں نماز ہو جاوے گی، مگر عمداً اتنی ناپاکی کا بھی کپڑے میں رکھنا مکروہ تحریمی

(۱) كما ينقض لو حشا إحليله بقطنة وابتل الطرف الظاهر الخ وإذا ابتل الطرف الداخل لا ينقض (الدر المختار مع رد المحتار: نواقض الوضوء: ۱/۱۳۸) معلوم ہوا کہ پیشاب کا مثانہ سے صرف چلنا ناقض وضو نہیں ہے بلکہ عضو سے باہر آنا شرط ہے۔ ظفیر

(۲) قال العلامة الحصكفي: ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفي غيرهما عين السيلان، قال ابن عابدين: أي الظهور المجرد عن السيلان، فلو نزل البول إلى قصبة الذكر لا ينقض لعدم ظهوره، بخلاف القلفة فإنه بنزوله إليها ينقض الوضوء. (الدر المختار مع رد المحتار: ص ۹۹. ۱۰۰، جلد ۱، مطلب في نواقض الوضوء)

ہے، مگر جب کہ کثرت عذر سے کپڑے بدلنے میں حرج ہو تو مضائقہ نہیں، کما هو الظاهر. احقر عبدالکريم گمتهلوی عفی عنه. ۸ ربیع الثانی ۴۴ھ، الجواب صحیح۔ ظفر احمد عفا عنہ ۸/ ربیع الثانی ۴۴ھ۔ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۶)

قطرہ باہر آیا تو وضو ٹوٹ گیا ورنہ نہیں:

سوال: خطیب کو خطبہ پڑھتے وقت شک ہوا کہ مجھ کو قطرہ اتر آیا، بعد خطبہ اس نے آلۂ تناسل کو ہاتھ سے چھوا تو کچھ تری معلوم نہیں ہوئی تو اس نے وضو نہیں کیا اور اسی شک کی حالت میں نماز جمعہ پڑھا دی۔ بعد نماز جمعہ اس نے آلۂ تناسل کو دبایا اور تھن کی طرح سے دوہا تو ذرا سی تری معلوم ہوئی تو اب لوگوں کی نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب

اس صورت میں امام کی اور مقتدیوں کی نماز ہوگئی، کیوں کہ شبہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اور یہاں تو قطرہ کے باہر آنے کا شبہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس نے ہاتھ سے دیکھ لیا کہ تری نہ تھی، اور بعد میں جب کہ دبانے سے تری باہر نکلی تو اس سے معلوم ہوا کہ قطرہ اوپر ہی رک رہا تھا اور یہ قاعدہ ہے کہ قطرہ جب تک باہر ظاہر نہ ہو اس وقت تک وضو نہیں جاتا۔ کمافی الدرالمختار: ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور الخ. (۱) وفيه أيضاً (وإن ابتل) الطرف (الداخل) لاينقض الخ. (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۹)

قطرہ باہر نہ نکلے، اندر نظر آئے، تو وضو ٹوٹا یا نہیں:

سوال: جس شخص کو قطرہ آتا ہے، اگر سوراخ کے اندر قطرہ نظر آتا ہو تو وضو باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب

وضو باقی رہے گا، جب تک باہر کی طرف یعنی منھ پر ظاہر نہ ہوگا وضو نہ ٹوٹے گا۔ (۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۵)

قطرہ کا اثر احلیل کی روئی پر:

سوال: ایک شخص احلیل میں احتیاطاً کئی تہہ روئی کی رکھتا ہے اور وہ روئی پیشاب میں تر ہے اگر باہر کی جانب سیلابی معلوم ہو تو وضو رہے گا یا نہیں؟ اور اس روئی میں مقدار درہم کا لحاظ ہوگا یا نہیں باعتبار طول وعرض کے؟

(۱) الدرالمختار مع هامش ردالمحتار نواقض الوضوء: ۱/۱۲۵۔ ظفیر

(۲) الدرالمختار مع هامش ردالمحتار، كتاب الطهارة، نواقض الوضوء: ۱/۱۳۸۔ ظفیر

(۳) كما ينقض لوحشا إحليله بقطنة وابتل الطرف الظاهر هذا لو القطنة عالية أو محاذية وإن متسفلة عنه لاينقض الخ وابتل الطرف الداخل لاينقض. (الدرالمختار مع هامش ردالمحتار: كتاب الطهارة، نواقض الوضوء: ۱/۳۸) ظفیر

الجواب

اگرتری باہر کی سطح پر آجائے گی تو وضوٹوٹے گا اور اگرتری باہر نہ آئی تو وضو باقی ہے اور نماز صحیح ہے اور اس میں مقدار درہم کا لحاظ نہیں۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۹و۱۴۰)

احلیل میں مرض کی وجہ سے کرسف رکھے اور وہ تر ہوجائے تو کیا حکم ہے:

سوال: زید کو مرض سلسل بول ہے اس کی وجہ سے وہ احلیل میں کرسف رکھتا ہے اور کرسف سوراخ میں اس قدر اندر رہتا ہے کہ باہر سے نظر نہیں آتا، ایسی صورت میں زید ہر نماز کے وقت وضو کرے یا جس وقت قطرہ کرسف سے تجاوز کر کے باہر آجائے اس وقت وضو جدید کرے اور وہ بلا وضو تلاوت کرسکتا ہے یا نہ؟

الجواب

اس صورت میں جس وقت قطرہ کرسف سے تجاوز کر کے باہر آجاوے اس وقت وضوٹوٹے گا۔(۲) اور مس مصحف کیلئے وضو شرط ہے اور حفظ پڑھنے کیلئے وضو شرط نہیں ہے۔(۳) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۲۹۹)

پیشاب کے مریض کے لیے کرسف کا استعمال اور وضو کا مسئلہ:

سوال: زید کو بوجہ ضعفِ مثانہ قطرہ آنے کا مرض ہے، وہ پیشاب گاہ میں کرسف رکھتا ہے اور کرسف اس قدر اندر رہتا ہے کہ نظر بالکل نہیں آتا اور حشفہ سے بھی پرے رہتا ہے، ایسی صورت میں وقت کے گذرنے پر وضو جدید کرے یا اس وقت وضو کرے کہ جب قطرہ عضو سے نفوذ کر کے سپاری میں آجاوے اور چونکہ کرسف اندر رہتا ہے اس کا تر ہونا معلوم نہیں ہوسکتا کہ کس وقت تر ہوتا ہے؟

الجواب

قال فی مراقی الفلاح: ومن به عذر کسلسل بول أو استطلاق بطن وانفلات ریح ورعاف

---

(۱) لو حشا إحلیله بقطنة وابتل الطرف الظاهر هذا لو القطنة عالیة أو محاذیة لرأس الإحلیل وإن متسفلة عنه لاینقض وکذا الحکم فی الدبر والفرج الداخل وإن ابتل الطرف الداخل لاینقض ولو سقطت فإن رطبة انتقض وإلاّ لا. (الدر المختار معٰ هامش رد المحتار: نواقض الوضوء:۱/۱۳۸، ظفیر)

(۲) لو حشا إحلیله بقطنة وابتل الطرف الظاهر هذا لو کا ن القطنة عالیة أو محاذیة لرس الإحلیل و إن متسفلة عنه لا ینقض وکذا الحکم فی الدبر و الفرج الداخل و إن ابتل الطرف الداخل لا ینقض (الدر المختار مع هامش رد المحتار: کتاب الطهارة :نواقض الوضوء: ۱/ ۱۳۸، ظفیر)

(۳) لا تحل قراءة القرآن للجنب (در مختار)قید بالجنب لأن قراءة المحدث تحل بدون الطهارة (رد المحتار باب التیمم : ۱/ ۲۲۹) و لا تکره قراءة القرآن للمحدث ظاهراً أی علی ظهر لسانه بالإجماع. (غنیة المستملی ۵۷۔۵۸، ظفیر)

دائم وجرح لايرقأ ولايمكن حبسه بحشو من غير مشقة يتوضأ لوقت كل صلوٰة آه قال الطحطاوى: فيتعين عليه رده متى قدر عليه بعلاج من غير مشقة وفى المضمرات عن النصاب به سلس بول فجعل القطنة فى ذكره ومنعه من الخروج وهويعلم أنه لولم يحش ظهر البول فأخرج القطنة وعليها بلة فهو محدث ساعة إخراج القطنة فقط وعليه الفتوىٰ آه ص: ٨٥. (۱)اس سے معلوم ہوا کہ کرسف احلیل میں رکھنے سے اگر قطرہ کا اثر ظاہر کرسف پر ظاہر نہ ہوتو یہ شخص معذور نہیں ہے، اس کو ہر وقت وضو جدید کرنا لازم نہیں، لیکن اس کو چاہئے کہ کرسف اتنا لمبا رکھے کہ اس کا ایک سرا سوراخ ذکر کے متصل ہو جب تری اس سرے میں پہونچ جائے گی اس وقت وضوٹوٹ جائے گا۔۴/ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۷۱ و۳۷۲)

شرمگاہ میں انگلی داخل کرکے نکالنے سے وضوٹوٹ گیا:

سوال: زید نے اپنی زوجہ کی شرمگاہ میں مع کپڑے کے یا بغیر کپڑے کے انگلی داخل کی تو زوجہ کا وضوٹوٹ گیا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

وضوٹوٹ گیا، خواہ انگلی پر کپڑا ہو یا نہ ہو۔ اس لیے کہ جب انگلی نکلے گی تو اس پر نجاست ضرور لگی ہوگی اور خروج نجاست ناقض وضو ہے۔ البتہ اگر انگلی فرج داخل یعنی گول سوراخ کے اندر نہیں گئی تو وضو نہیں گیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۱۵/ ذی الحجہ ۸۶ھ۔ (۲) (احسن الفتاویٰ: ۲/ ۲۰)

پاخانہ کے مقام سے کیڑا نکلنا ناقض وضو ہے:

سوال: اگر دوران نماز پاخانہ کے مقام سے کیڑا باہر نکل آئے تو نماز یا وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

(۱) مراقى الفلاح ص: ۱۴۸، باب الحيض والنفاس والاستحاضة۔ انیس۔

(۲) **فرج خارج میں انگلی لگانا ناقض وضو نہیں:**

سوال: کیا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی سیلان کی مریضہ عورت نماز یا تلاوت کے دوران کچھ وقفے سے کھال کے اندر انگلی سے چھوکر دیکھ لیا کرے کہ آیا پانی نکلا ہے یا نہیں اور اگر اس نے اسی طریقہ سے دیکھا مگر جگہ بالکل پاک تھی تو اس صورت میں اس کے شرمگاہ دیکھنے اور چھونے سے وضوٹوٹے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، البتہ آگے گول سوراخ کے اندر انگلی داخل کرنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، اس لئے کہ انگلی کے ساتھ اندرونی نجاست بھی باہر آئے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۱۰/ شوال ۹۷ھ۔ (احسن الفتاویٰ: ۲/ ۲۵۔۲۶)

کیوں کہ اس صورت میں خروج من احد السبیلین پایا جارہا ہے۔ (ردالمحتار میں ہے: **لو خرجت القطنة من الاحليل رطبة انتقض لخروج النجاسة وان قلت.** (۱/ ۱۴۹، دارالفکر بیروت) انیس

الجواب ــــــــــــــــــ باسم ملهم الصواب

وضوٹوٹ جائے گا،(۱) لہٰذا نماز نہ ہوگی۔"كما في نواقض التنوير:(وريح أو دودة أو حصاة من دبر)". (ردالمحتار:۱/۱۲۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم (احسن الفتاویٰ:۲/۲۲)

پاخانہ کے مقام سے کیڑا نکلنے پر وضوٹوٹ جاتا ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص ہے وہ جب قضاءِ حاجت سے فارغ ہوجاتا ہے تو اس کی مقعد سے سخت خارش شروع ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی کیڑا وغیرہ سر کو باہر نکال کر اور کبھی داخل کرتا ہے(۱) تو کیا اس کیڑے کا سر نکالنا اور پھر داخل کرنا ناقض وضو ہے؟ اور اس شخص کے پیچھے امامت درست ہے؟ بینوا توجروا۔(المستفتی نعمت اللہ صاحب دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت)

(۱) حدیث میں ہے:عن ابن عباسؓ: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الوضوء مما خرج و ليس مما دخل. (سنن بيهقي،باب الوضوء من الدم يخرج من أحد السبيلين وغير ذلك من دودة أو حصاة أو غير ذلك: ۱/۱۸۸،نمبر ۵۶۸/مصنف عبد الرزاق، باب من يطأنتنا يابساً أو رطباً: ۱/۲۴،نمبر۱۰۰) قال عطاءؒ :فيمن يخرج من دبره الدودة،أومن ذكره نحو القملة:يعيد الوضوء.(الصحيح للبخاري،باب من لم يرالوضوء إلا من المخرجين من القبل و الدبر: ۳۵،نمبر۱۷۶) مذکورہ اثر اور حدیث میں ہے کہ سبیلین سے کوئی بھی چیز نکلے تو اس سے وضوٹوٹ جائے گا، وہ پیشاب وپاخانہ کی شکل میں ہو یا کیڑے کی شکل میں۔انیس۔

خیر الفتاویٰ میں ہے:

پیچھے کے راستہ سے کیڑا کے نکلنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے:

سوال: میں نے جب سے بواسیر کا آپریشن کرایا ہے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاخانہ میں جو سفید رنگ کے کیڑے ہوتے ہیں ان کی وجہ سے حالت نماز میں مقعد میں خارش سی محسوس ہوتی ہے مگر وہ کیڑا مقعد سے بالکل باہر نہیں آتا جب تک کہ میں خود نہ کھجلاؤں۔ہاں حالتِ نماز میں مجھے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کیڑا خروج کرتا ہے اگرچہ بالکل باہر نہیں آتا۔ایسی حالت میں وضوٹوٹ جاتا ہے؟ اور کیا نماز باقی رہتی ہے یا نہیں؟

۲: یوں بھی سمجھیں کہ پیٹ کے اندر سے تو نکلتا ہے مگر بالکل باہر نہیں آتا اگرچہ مجھے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اب خروج کرتا ہے۔(محمد سلیمان: نوال شہر ملتان۔)

الجواب ــــــــــــــــــ

جب مقعد کے سوراخ سے کیڑا باہر نکل آئے تو وضوٹوٹ جائے گا اور نماز نہ ہوگی اور سوراخ سے باہر نکلنے سے پہلے اندر اندر پھرنے سے نماز فاسد نہ ہوگی اور نہ ہی وضوٹوٹے گا۔وينقضه خروج نجس منه الخ إلىٰ قوله(و)خروج غير نجس مثل(ريح أو دودة أو حصاة من دبر)(تنوير الأبصار مع الدر المختار على الشامية : ج ۱ ص ۱۲۴ تا ۱۲۶. محمد انور عفا اللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان ۱۴/۵/۱۴۰۱ھ، الجواب صحیح۔بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ۔(خیر الفتاویٰ:۲/۶۵)

(۲) یعنی سر کو کبھی نکالتا ہے اور کبھی اندر داخل کر لیتا ہے۔

الجواب

اگر یہ حقیقت ہو اور مشاہدہ وغیرہا سے معلوم ہوا ہو کہ اس جگہ سے کیڑا سر باہر کر کے دوبارہ اندر کرتا ہے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس شخص کی امامت صحیح نہیں ہے، **في الدر المختار: (و) خروج غير نجس مثل (ريح أو دودة أو حصاة من دبر).** (۱) وهو الموفق (فتاویٰ دیوبند پاکستان، المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم: ۴۰-۴۱)

جو رطوبت باہر نہ آئے وہ ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: بواسیر کی پھنسی بعد مواد نکلنے کے مثل داد کے ہو جائیں اور ان کے اندر رطوبت ہو مگر سائل نہ ہو البتہ اٹھتے بیٹھتے کپڑے کو لگتی ہو تو اس صورت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور کپڑا ناپاک ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب

جو رطوبت زخم سے باہر نہ بہے اور سائل نہ ہو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، **كذا في كتب الفقه.** (۲) اور کپڑا بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قاعدہ کلیہ فقہا لکھتے ہیں: **"ماليس بحدث ليس بنجس".** (۳) پس جو صورت آپ نے تحریر فرمائی ہے اس میں نہ وضو ٹوٹتا ہے، نہ کپڑا ناپاک ہوتا ہے۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۶-۱۳۷)

خروج مذی ناقض وضو ہے:

سوال: میں شادی شدہ ہوں ملاعبت کے وقت جو مذی نکلتی ہے وہ معلوم نہیں ہوتی ہاں البتہ استنجا کے وقت معلوم ہوتا ہے اور ہمبستری کا ارادہ نہ ہو تب بھی کئی بار نکلتی ہے تو آیا وہ مذی پاک ہے یا ناپاک؟ اس سے غسل ضروری ہوتا ہے

(۱) الدر المختار مع رد المحتار: ص ۱۰۰ جلد ۱، مطلب نواقض الوضوء، كتاب الطهارة۔

(۲) وينقضه خروج كل خارج نجس منه الخ إلى مايطهر الخ ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور في غيرهما عين السيلان ولو بالقوة لماقالوا: لو مسح الدم كلما خرج ولو تركه لسال نقض وإلا لا كمالو سال في باطن عين أو جرح الخ (درمختار) وفي السراج: عن الينابيع: الدم السائل على الجراحة إذا لم يتجاوز وقال بعضهم هو طاهر حتى لو صلى رجل بجنبه وأصابه منه أكثر من قدر الدرهم جازت صلوته وبهذا أخذ الكرخیؒ وهو الأظهر الخ (رد المحتار: مطلب نواقض الوضوء: ۱/۱۳۴، ظفیر۔

جو رطوبت بہتی نہیں وہ ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: اگر کسی کے بدن میں زخم ہو اور اُس سے رطوبت جاری نہ ہو تو ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب

وہ رطوبت جب تک سائل نہ ہوگی ناقض وضو نہیں ہے۔ **(وينقضه خروج كل خارج نجس منه أي من المتوضى الحي معتادا أولا، من السبيلين أو لا الى ما يطهر الخ.** (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء ۱/۱۲۴) (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۳۱۷)

(۳) الدر المختار مع رد المحتار: مطلب نواقض الوضوء: ۱/۱۳۰۔ ظفیر

یا نہیں؟ وضوٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ جسم کے کسی حصہ میں لگ جائے تو پاک کرنا چاہئے یا نہیں؟ مذی لگے ہوئے جسم یا کپڑے میں نماز جائز ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مذی ناپاک ہے کپڑے اور بدن پر لگنے سے کپڑا اور بدن ناپاک ہو جاتا ہے۔اس کی مقدار کم ہوتو دھونا واجب نہیں بہتر ہے،مقدار زیادہ ہوتو دھونا ضروری ہو جاتا ہے۔(۱) غسل فرض نہیں ہوتا البتہ وضوٹوٹ جاتا ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ ۴/۲۶۳،۲۶۴)

پیشاب کی راہ سے جو سفید پانی نکلتا ہے وہ ناپاک اور ناقض وضو ہے:

سوال: ایک شخص کے پیشاب کی راہ سے سفید پانی نکلتا ہے اور پاجامہ کو لگ جاتا ہے تو وہ ناپاک ہو جائے گا ؟ اور اس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

پیشاب کی راہ سے جو سفید پانی نکلتا ہے وہ ناپاک ہے اور نجاست غلیظہ اور ناقض وضو ہے۔(۲) بدن اور کپڑے پر لگ جائے تو بدن اور کپڑا ناپاک ہو جائے گا لیکن ایک درہم کی مقدار (یعنی ہاتھ کی ہتھیلی کے برابر) معاف ہے۔اگر دھونے کا وقت نہ مل سکا اور اس کو پہن کر نماز پڑھ لی تو نماز ہو جائے گی۔بعد میں دھو لینا چاہئے۔درمختار میں ہے:((و عفی)الشارع(عن قدر درهم)وإن كره تحريماً فيجب غسله و ما دونه تنزيهاًفيسن وفوقه مبطل فيفرض.....(وهو مثقال فی نجس كثف)له جرم(عرض مقعر الكف)وهو داخل مفاصل أصابع اليد (فی رقيق مغلظة)الخ. (درمختار مع الشامی:۱/۲۹۳،هدايه: ۱ / ۵۸باب الأنجاس،مالا بد منه:ص۱۹) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ ۴/۲۶۷)

جو پانی ناپاک نکلے وہ ناقض وضو ہے:

سوال: ہندہ کے آگے کی راہ سے رینٹ کی طرح پانی آتا ہے تو آیا وہ پانی پاک ہے یا ناپاک،اس سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں؟

(۱) (و عفی)الشارع(عن قدر درهم)وإن كره تحريماً فيجب غسله و ما دونه تنزيهاًفيسن وفوقه مبطل فيفرض.....(وهو مثقال فی نجس كثف)له جرم(عرض مقعر الكف)وهو داخل مفاصل أصابع اليد (فی رقيق مغلظة)الخ. (درمختار مع الشامی:۱/۲۹۳،هدايه: ۱ / ۵۸باب الأنجاس،مالا بد منه:ص۱۹۔انیس۔

(۲) ردالمحتار مطلب نواقض الوضوء:۱/۱۳۴،دار الفکر بیروت۔انیس

الجواب ــــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وہ پانی ناپاک ہے ناقض وضو ہے۔(۱) فقط واللہ اعلم ،حررہ العبد محمود غفرلہ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۱۷-۷۲)

عورت کی شرمگاہ سے ہوا خارج ہونے سے وضو کا حکم:

سوال: ایک عورت جب نماز شروع کرتی ہے تو عموماً آگے کی راہ سے ہوا خارج ہو جاتی ہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا وضو ٹوٹ جائے گا نماز کس طرح پڑھے؟ بینوا تو جروا۔

الجواب ــــــــــــــــــــــ

صورت مسئولہ میں صحیح قول کے مطابق اس سے وضو نہیں ٹوٹتا لہذا وہ اسی حالت میں نماز پڑھ سکتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **والريح الخارجة من الذكر وفرج المرأة لا تنقض الوضوء على الصحيح إلا أن تكون المرأة مفضاة فإنه يستحب لها الوضوء "كذا في الجوهرة النيرة. (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۹،نواقض الوضوء)**

درمختار میں ہے: **ولا خروج (ريح من قبل) غير مفضاة أما هي فيندب لها الوضوء وقيل يجب وقيل لو منتنة (قوله أما هي) أى المفضاة وهي التي اختلط سبيلاها أى مسلك البول والغائط فيندب لها الوضوء من الريح وعن محمدؒ: يجب احتياطاً وبه أخذ أبو حفص ورجحه في الفتح بأن الغالب في الريح كونها من الدبر الخ. (درمختار وردالمحتار ۱/ ۱۲۶،نواقض الوضوء)**

بہشتی زیور میں ہے: مسئلہ: پاخانہ پیشاب اور ہوا جو پیچھے سے نکلے اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے البتہ اگر آگے کی راہ سے ہوا نکلے جیسا کہ کبھی بیماری سے ایسا ہو جاتا ہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (بہشتی زیور: ص۷۴ حصہ اول) فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ رحیمیہ ۹۲/۸،۹۳)

ریح سے طہارت ضروری نہیں، اس کی وجہ:

سوال: ریح کے خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، بلا طہارت دوبارہ وضو جائز ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــ

استنجا وطہارت کی ضرورت خروج ریح میں اس وجہ سے نہیں ہے کہ بدن ملوث نجاست سے نہیں ہوتا خروج ریح

(۱) "وينقضه خروج كل خارج نجس منه: أى من المتوضئ الحى معتاداً أولا، من السبيلين أولا، إلى مايطهر" الدر المختار: ۱/ ۱۳۴،مطلب: نواقض الوضوء،سعيد،وكذا في الفتاوىٰ العالمكيريه: ۱/ ۹،الفصل الخامس في نواقض الوضوء،وكذا في فتح القدير: ۱/ ۳۷،فصل في نواقض الوضوء،مصطفى البابي الحلبي بمصر.

صرف حکمی نجاست ہے اور اس کو حدث اصغر کہتے ہیں اس میں صرف وضو کافی ہے۔(۱) (فتاویٰ دار العلوم:۱۴۶/۱)

خروج ریح جس میں آواز اور بدبو نہ ہو، اس سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: جس ریح میں آواز اور بدبو نہ ہو وہ وضو کو توڑتی ہے یا نہیں۔ اگر ایسی صورت ہر رکعت میں پیش آئے تو کیا کرنا چاہئے اور ایسے عذر والے کو امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر یقین خروج ریح کا ہو، خواہ آواز ہو یا نہ ہو اور وہ شخص معذور نہ ہو، تو وضو پھر کرنا چاہئے اور اگر محض شبہ ہو اور اختلاج سا ہو تو وضو نہیں گیا، نماز صحیح ہے۔(۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱۴۸/۱)

خروج ریح ناقض وضو کیوں:

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ اگر وضو بوجہ ہوا خارج ہونے کے ٹوٹ جائے تو استنجاء کے سوا وضو کرے اس کی کیا وجہ ہے، جہاں سے گندی ہوا خارج ہو اس کو تو دھو یا نہ جائے اس کے علاوہ اور وضو کر لیا جائے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

اس کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی صرف وضو کا حکم دیا ہے۔(۳) کس کی جرأت ہے کہ اس کی وجہ دریافت کرے، یہ امر تعبدی ہے۔(۴) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ، معین مفتی مدرسہ

(۱) وقيل: سببها الحدث في الحكمية وهو وصف شرعي يحل في الأعضاء يزيل الطهارة. (الدر المختار مع ردالمحتار: كتاب الطهارة :۷۹/۱) وينقضه خروج نجس الخ وخروج غير نجس مثل ريح (درمختار) قوله مثل ريح فإنها تنقض لأنها منبعثة عن محل النجاسة لالأن عينها نجسة لأن الصحيح أن عينها طاهرة حتى لولبس سراويل مبتلة أو ابتل من أليتيه الموضع الذي تمر به الريح فخرج الريح لايتنجس الخ (ردالمحتار نواقض الوضوء :۱۲۶/۱) معلوم ہوا کہ خود ریح نجس نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے طہارت کی ضرورت پیش آئے۔ظفیر۔

(۲) وينقضه خروج نجس الخ وخروج غير نجس مثل ريح الخ من دبر الخ ولو خرج ريح من الدبر وهو يعلم أنه لم يكن من الأعلى فهو اختلاج فلاينقض. (الدر المختار مع ردالمحتار: نواقض الوضوء:۱۲۶/۱، ظفیر)۔ حدیث میں ہے: أبو هريرةؓ يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقبل صلاة من أحدث حتى يتوضأ، قال رجل من حضرموت: ما الحدث يا أبا هريرة؟ قال فساء أوضراط۔(بخاری شریف، باب لا تقبل صلاة بغير طهور ص۲۹، نمبر۱۳۵) یعنی ریح آواز والی خارج ہو یا آہستہ، بدبو ہو یا نہ ہو، بہر صورت وضو ٹوٹ جائے گا۔انیس۔

(۳) "عن علي بن طلق رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا فسا أحدكم فليتوضأ". (مشكوٰة المصابيح: ص۴۰، باب مايوجب الوضوء، الفصل الثاني، قديمي، وسنن أبي داؤد: ۲۷/۱ باب في من يحدث في الصلوٰة. سعید۔)

(۴) "لأن غسل غير موضع الإصابة أمر تعبدي فيقتصر على موردالشرع". (الهدايه: ۲۳/۱، نواقض الوضو، شركة علمية)

مظاہر علوم سہارنپور۔ الجواب صحیح: عبد اللطیف، مفتی مدرسہ ہذا، سعید احمد غفرلہ، یکم ذی القعدہ ۵۷ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۶۲/۵۔۶۳)

ریاح نکلنے کا وہم ناقض وضو نہیں ہے:

سوال: بعض وقت ایک عجیب قسم کی ریاح چلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کے اندر سے چلی اور پھر پاخانہ کے مقام تک آ کر واپس ہوتی ہے نہ ہوا خارج ہوتی ہے نہ آواز لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاخانہ کے مقام تک ریاح کا دورہ ہو گیا نماز ہوئی یا پھر سے وضو کر کے نماز پڑھے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــ

نماز ہو جائے گی۔ وہم نہ کرنا چاہئے۔(۱) (مکتوبات ۹۱/۳) (فتاویٰ شیخ الاسلامؒ: ص۲۲)

ریح خارج ہونے پر وضو کرنے کا حکم کیوں ہے:

ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ریح خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن ایک بہت ہی تعلیم یافتہ غیر مسلم کا سوال ہے کہ ریح خارج ہونے پر آپ وضو ہی کیوں کرتے ہیں، آبدست کیوں نہیں کرتے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــ وباللّٰہ التوفیق

خروج ریح میں وضو کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس سے ریح نکل کر بدن کو ناپاک کر دیتی ہے اور اس نجاست کو دور کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ سوال پیدا ہو کہ پاخانہ کے مقام پر تو ضرور ہی لگی ہوگی، پھر اس کو دھونے کا حکم کیوں نہیں ہے؟ بلکہ یہ امر تعبدی ہے اور اس کی وجہ دوسری ہے اور حکم خداوندی ہے، اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ پاخانہ پیشاب وغیرہ (غلاظت) ہر وقت ہی رہتی ہے، اور جب تک وہ غلاظت اپنے محل و مستقر میں رہتی ہے اس وقت تک اس آدمی کو نہ تو کوئی ناپاک کہتا ہے اور نہ کسی عضو کے دھونے وغیرہ کا حکم دیتا ہے، اور جب وہ غلاظت اپنی جگہ و محل وظرف سے نکل کر جسم سے باہر آ جاتی ہے تو فوراً دھونے اور پاک کرنے کا تقاضا ہو جاتا ہے اور طبیعت سلیمہ دھوتی بھی ہے، ورنہ سب کو نجس و ناپاک قرار دیتی ہے اور ناپاک و گندہ تصور کرتی ہے اور اس سے طبیعت منقبض رہتی ہے، پس ریح خارج ہونے میں اگر چہ کوئی غلاظت وغیرہ مثلاً پیشاب پاخانہ خارج نہ ہو، مگر وہ ریح پاخانہ کے محل و مستقر وظرف سے نکل کر باہر آتی ہے اور کچھ نہ کچھ اثر غلاظت کا لیکر آتی ہے، جیسا کہ اس کی بدبو وغیرہ سے اندازہ ہو جاتا ہے اور اس سے طبیعت سلیمہ کچھ اثر انداز بھی ہو جاتی ہے، اور کچھ انقباض و تکدر بھی بسا اوقات طبائع

---

(۱) ولو ایقن بالطهارة وشک بالحدث اوبالعکس اخذ بالیقین ولو تیقنهما وشک فی السابق فهو متطهر (الدر المختار) لان الغالب ان الطهارة بعد الحدث ط، لکن فی حاشیة الحموی ... من تیقن بالطهارة والحدث وشک فی السابق یؤمر بالتذکر فیما قبلهما فان کان محدثا فهو الاٰن متطهر لانه تیقن الطهارة بعد ذلک الحدث وشک فی انتقاضها. الخ (ومثله المتیمم) (الدر المختار) (ردالمحتار ۱/ ۱۵۰، ۱۵۱) انیس

سلیمہ میں پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے عقل سلیم کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جب ریح خارج ہو تو اسی وقت فوراً آب دست بھی لے اور ہاتھ منہ دھوکر تکدر طبعی وانقباض بھی دور کرلیا جائے، اور اپنی بشریت کو اعلیٰ و مرتفع کرلیا کرے، مگر چونکہ اس میں عام طبائع پر تنگی واقع ہوتی، اور ناپاکی کسی جگہ لگی نہیں ہوتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بشری کمزوری پر نظر فرما کر اور شفقت کرتے ہوئے یہ حکم تطہیر وتنظیف کا نہیں دیا۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ کم از کم جب میرے دربار میں حاضری دینا ہو اور نماز کے لئے آنا ہو، تو وہ بھی چونکہ میرے دربار کی حاضری ہے اس وقت کم از کم وضو یعنی ایک خاص طریقہ سے ہاتھ منھ، پیر وغیرہ دھوکر آیا کرو، اس سے ہم وہی انشراح دیں گے جو فوراً پوری تطہیر سے تم حاصل کرتے، بلکہ بہ نظر شفقت مزید یہ بھی آسانی فرمادی کہ اگر تم پہلے سے وضو کر چکے ہو تو اگر چہ اس سے نماز بھی پڑھ چکے ہو، وہ بھی کافی قرار دے لیں گے، اس کے علاوہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جو صرف اللہ کے علم میں ہیں، اور بہت سی حکمتیں علما نے بیان بھی کی ہیں، مثلاً اس عمل سے صفت ملکوتیت بھی پیدا ہوگی اور ملائکہ سے قربت ومناسبت بھی پیدا ہوگی، جو باعث قرب خداوندی ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور۔ ۱۳۹۵/۷/۳۱ھ۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/۱۵۳-۱۵۴)

ریح کا اخراج بہ ہیئت سجدہ:

سوال: ایک شخص کو ریاح کا مرض ہے اکثر سجدہ میں اس کا زور ہوتا ہے، بعض اوقات کھڑے، بیٹھے یا دوسری حالت میں ریح نہیں خارج ہوتی جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے، خصوصاً نماز میں بے چینی کہ جب سجدہ میں جاتا ہے زور ہوتا ہے۔ کیا ایسا شخص اس حالت میں خارج نماز سجدہ کی ہیئت بنا کر ریح خارج کرسکتا ہے اور اگر قریب میں دوسری جگہ نہ ہو کہ وہاں جا کر ایسا کرے تو مسجد میں کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیا شکل اختیار کرے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

جس ہیئت سے ریح کا اخراج ہوکر اس کو سہولت حاصل ہوسکتی ہو شرعاً اجازت ہے۔(۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دارالعلوم دیوبند۔ ۹۲/۵/۸ھ، الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ، دارالعلوم دیوبند، ۹۲/۵/۹ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۶۳/۵)

ریحِ قُبل ناقضِ وضو نہیں:

سوال رریح قبل میں جب اتنا وقت بھی نہ ملے کہ وضو کر کے دو فرض ہوسکیں تو اس کو سلسل بول پر قیاس کرنا کیسا ہے؟

(۱) البتہ مسجد میں ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں، لیکن شدید مجبوری میں معذور سمجھا جائے گا ”(ولا البول) وكذا لا يخرج فيه (في المسجد) الريح من الدبر كما في الأشباه، واختلف فيه السلف، فقيل: لا بأس، وقيل: يخرج إذا احتاج إليه، وهو الأصح، حموي عن شرح الجامع الصغير للتمرتاشي“. (ردالمحتار: ۱/۶۵۶، مطلب في أحكام المسجد، سعيد۔)

الجواب

ریح اور سلسل بول کا ایک ہی حکم ہے درمختار میں ہے۔

"وصاحب عذر (من سلسل بول) لایمکنه إمساكه (أو استطلاق بطن أو انفلات ریح أو استحاضة الخ)". (۱/ ۲۲۳ درمختار علی الشامیة)

یہ حکم ریح دبر کا ہے جو کہ عام حالات میں تو ناقض وضو ہے معذور شرعی کیلئے ناقض وضو نہیں۔

ریح قبل ناقض وضو نہیں۔ لیکن جس عورت کا پیشاب و پاخانہ کا راستہ ایک ہوگیا ہو اسے احتیاطاً وضو کر لینے کا حکم ہے۔ مراقی میں ہے: **(ماخرج من السبیلین إلا ریح القبل فی الأصح)...... فینقض ریح المفضاة احتیاطا.** (ص ۴۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ بندہ محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ، نائب مفتی۔ ۷/۳/۱۴۰۶ھ۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۴۹)

فرج سے نکلی ہوئی ہوا ناقض وضو نہیں:

سوال:۔ نماز کے دوران اگر کسی عورت کی اگلی شرمگاہ سے ہوا خارج ہوجائے تو کیا وہ عورت نماز توڑ کر دوبارہ وضو کرے گی یا وہی وضو کافی ہوگا؟

الجواب

جو ہوا دبر سے نکلے وہ ناقض وضو ہوتی ہے اور جو ہوا عورت کی فرج یا مرد کے ذکر سے خارج ہو وہ ناقض وضو نہیں، لہذا صورتِ مسئولہ میں مبتلیٰ بہ عورت کا وضو نہیں ٹوٹا اور وہ اسی وضو سے ہی نماز کو پورا کرے گی۔

لماقال العلامة أبوبکر بن علی الحدادؒ: "والریح الخارجة من الذکر وفرج المرأة لاتنقض الوضوء علی الصحیح إلا أن تکون المرأة مفضاةً فإنه یستحب لها الوضوء" (الجوهرة النیرة، کتاب الطهارة، ناقض الوضوء: ج ۱ ص ۸) (۱) (فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۶۲۳)

وضو کرتے ہوئے ریح کو دبا لے تو وضو ہوجائے گا:

سوال: اگر کوئی آدمی وضو کررہا ہے یا نماز پڑھ رہا ہے اور ہوا نکلنے لگی، اس نے روک لیا، تو وضو باقی رہی اور نماز ہوئی، یا نہیں؟

---

(۱) لماقال العلامة الحصکفیؒ: "ولاخروج ریح من قبل غیر مفضاة أما هی فیندب لها الوضوء وقیل یجب وقیل لو منتنة" الخ، (الدر المختار مع رد المحتار، باب نواقض الوضوء: ج ۱ ص ۱۲۶) ومثله فی الفتاویٰ الهندیة، باب نواقض الوضوء (ج ۱ ص ۹)

الجواب ــــــــــــــــــــــ

اگر ریح کو روک لیا اور خارج ہونے نہ دیا تو وضو باقی ہے۔(۱) اور نماز صحیح ہے۔ درمختار (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۴۵۔۱۴۶)

استنجا کرنے کے بعد ہوا خارج ہو جانے پر استنجا کا حکم:

سوال:۔اگر کسی شخص سے استنجا کرنے کے بعد ہوا خارج ہو جائے تو کیا طہارت کے لئے اسے دوبارہ استنجا کرنا پڑے گا یا نہیں؟ جبکہ اس کی مقعد ابھی تک گیلی ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــ

ہوا خارج ہونے سے اگر چہ وضو ٹوٹ جاتا ہے اور دوبارہ کرنا پڑتا ہے لیکن استنجا کرنا لازمی نہیں ہوتا چاہے مقعد گیلی ہو یا خشک، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھی اس شخص پر دوبارہ استنجا کرنا لازمی نہیں صرف وضو کرنے سے طہارت حاصل ہو جائے گی۔

لما قال العلامة عابدينؒ:(فلا يسن من ريح)لأن عنها طاهرة وإنما نقضت لانبعاثها عن مواضع النجاسة آه لأن بخروج الريح لا يكون على السبيل شيء فلا يسن من بل هو بدعة". (ردالمحتار،فصل فی الاستنجاء: ج ۱ ص ۲۴۶)(۳)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ۶۲۴)

شکم میں ریاح گھومنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: ایک باوضو شخص اس کے شکم میں ریاح گھومتی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ریاح خارج ہو جائے، اس نے لیٹ کر، ٹہل کر ریاح خارج کرنا چاہا لیکن خارج نہیں ہوئی اس حالت میں اس کا وضو باقی رہا یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــــ وباللّٰہ التوفیق

جب تک ریاح خارج نہ ہو صرف ریاح گھومنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔(۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔محمد عثمان غنیؒ، ۷/۹/۱۳۷۳ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ:۲/۶۵)

---

(۱) اس لیے کہ ریح کا نکل جانا ناقض وضو ہے: وخروج ريح. (الدرالمختار مع ردالمحتار نواقض الوضوء:۱/۱۲۶، ظفیر۔

(۲) وكذا يكره الخ وعند مدافعة الأخبثين أو أحدهما أو الريح (الدرالمختار، كتاب الصلوٰة:۱/۳۵۱، ظفیر۔

(۳) **لما قال العلامة ابن نجيمؒ:"وقد علم من تعريفه أن الاستنجاء لا يسن إلا من حدث خارج من أحد السبيلين غير الريح لأن بخروج الريح لا يكون على السبيل فلا يسن منه بل هو بدعة"(البحرالرائق،باب الأنجاس: ج ۱ ص ۲۴۰)**

(۴) **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "اذا وجد أحدكم في بطنه شيئاً فأشكل عليه أخرج منه شيء أم لا فلا يخرجن من المسجد حتى يسمع صوتاً أو يجد ريحاً. (الصحيح لمسلم باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ثم شك في الحدث فله أن يصلي بطهارته تلك:۱/۱۵۶)**

میڈیکل ٹسٹ کی ایک خاص صورت میں وضو:

سوال: میڈیکل ٹیسٹ کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ معدہ تک نلکی پہونچائی جاتی ہے، اور گوشت کا کوئی ٹکڑا مزید تجزیہ کے لئے باہر نکالا جاتا ہے، تو کیا اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ (ڈاکٹر حامد الدین، مان صاحب ٹینک)

الجواب

اگر نلکی منہ کے راستہ سے نجاست کے حصہ تک پہونچ جائے اور نجاست سے آلودہ ہو کر واپس لوٹے تو وضو ٹوٹ جائے گا، اگر نلکی پر نجاست نہ لگی ہو، یا گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا نکالا ہو اور وہ نجاست سے آلودہ نہ ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ گوشت کے ٹکڑے کا جسم سے الگ ہونا ناقض وضو نہیں ہے۔ "**فصار کمالو انفصل قطعةمن اللحم فإنه لا ينقض**". (۱) اور منہ سے نکلنے والی چیز جب تک منہ بھر نہ ہو، ناقض وضو نہیں ہوتی۔ "**لكن ماعليهاقليل لايملأالفم فلا يكون حدثاً**". (۲) اور اگر نلکی پائخانہ کے راستہ سے ڈالی اور پھر نکالی جائے، تو مطلق ناقض وضو ہے، اس پر نجاست نظر آنا ضروری نہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۴۰-۴۱)

نابالغ سے لواطت کرے اور انزال نہ ہو تو وضو ٹوٹے گا یا نہیں:

سوال: علم الفقہ جلد اول صفحہ ۸۸ مصنفہ مولانا عبد الشکور لکھنویؒ میں ہے: "اگر کسے با نابالغ فعل ناجائز یعنی لواطت کرد و منی از و خارج نہ شد ازاں وضو نہ شکند، بشرطیکہ آں نابالغ بایں قدر صغیر باشد کہ وقت دخول مشترک حصہ و خاص حصہ ملصق ...... گردد۔ ایں مسئلہ صحیح است یا نہ؟ (۳)

الجواب

جواب مسئلہ مذکورہ ہمیں است کہ از علم الفقہ نقل کردہ شد۔ (۴) **كما في الدر المختار: "ولاعندوطی بهيمةأو ميتةأو صغيرةغير مشتهاةبأن تصير مفضاةًبالوطي وإن غابت الحشفةولاينقض الوضوء فلايلزم إلاغسل الذكر.** (۵) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۴)

---

(۱) البحر الرائق: ۱/۸۲۔

(۲) کبیری: ۱۹۶۔

(۳) خلاصۂ سوال: مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کی کتاب علم الفقہ میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص نابالغ کے ساتھ ناجائز کام یعنی لواطت کرے اور اس سے منی نہ نکلے تو اس کی وجہ سے وضو نہ ٹوٹے گا، بشرطیکہ وہ نابالغ اتنا چھوٹا ہو کہ دخول کے وقت مشترک حصہ اور خاص حصہ مل جائے" تو یہ مسئلہ درست ہے یا نہیں؟ انیس۔

(۴) مذکورہ مسئلہ کا جواب وہی ہے جو علم الفقہ سے نقل کیا گیا ہے۔ انیس۔

(۵) الدر المختار مع ردالمحتار، أبحاث الغسل، قبيل مطلب في رطوبة الفرج: ۱/۱۵۴۔ یعنی وضو نہیں ٹوٹے گا۔ ظفیر) (مگر اس صورت میں گرچہ یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے، لیکن وضو نہیں ٹوٹے گا، البتہ وضو کرنا چاہیے گرچہ ضروری نہیں ہے۔ انیس)

شبہ خروج قطرہ وریح ناقض ہے یا نہیں:

سوال: زید کو گاہ گاہ قطرہ بعد وضو خارج یا داخل نماز میں آجاتا ہے اور گاہے خروج ریح کا شبہ ہوتا ہے، ذکر میں سے اور کبھی بعد شبہ ووہم خروج قطرہ دیکھا گیا کچھ بھی محسوس نہیں ہوا آپ ما بہ الفرق والامتیاز سمجھا دیں کہ کیسے یقین کیا جائے کہ قطرہ آیا یا ریح ذکر میں سے نکلی جس کی وجہ سے نیت نہ توڑی جاوے کیونکہ قطرہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ریح جو ذکر سے نکلے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور یہ وہم وشبہ بھی نہ ہوا کرے؟ فقط۔

الجواب

محض شبہ سے نیت نہ توڑی جاوے نماز پڑھ کر فوراً دیکھ لیا جاوے اور دیکھنے سے جو ثابت ہو اس کے موافق عمل کیا جائے۔ (۱) فقط، ۳۰ رذی الحجہ ۱۳۲۹ھ، تتمہ اولیٰ: ص ۸۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۳۴/۱)

دوران وضو بار بار شک کرنے والا کیا کرے:

سوال: گذارش ہے کہ میں تبخیر کا مریض ہوں جب وضو کرنے بیٹھتا ہوں تو ہوا نیچے کو یعنی خارج ہونے کی جگہ پر عموماً اور اکثر آجاتی ہے جیسے اب نکلی اب نکلی۔ کئی دفعہ وضو کرتا ہوں۔ مثلاً ہاتھ دھونے کے بعد شک پڑ جاتا ہے کہ کہیں ہوا خارج نہ ہوگئی ہو۔ پھر دوبارہ ہاتھ دھونے شروع کرتا ہوں۔ کبھی منہ تک پہنچنے کے بعد شک پڑ جاتا ہے، کبھی ایک پاؤں باقی ہوتا ہے کہ پھر نئے سرے سے وضو کرتا ہوں۔

غرض تبخیر کا مرض بھی ہے اور کوئی چیز شک بھی ڈال دیتی ہے۔ یہی حالت نماز میں پیش آتی ہے کبھی اس طرف دھیان جاتا ہے کہ ہوا خارج نہ ہوگئی ہو۔ جب اکیلا نماز پڑھتا ہوں تو کوئی چیز کبھی دل میں یہ شک ڈال دیتی ہے کہ ''**سبحانک اللّٰھم** ''نہیں پڑھی گئی۔ کبھی یہ شک پڑ جاتا ہے کہ ''**الحمد للّٰہ** ''نہیں پڑھی گئی۔ غرض طرح طرح اور موڑ موڑ پر شک پڑ جاتی ہے۔ شرعاً ایسے مریض کو کیا کرنا چاہئے وضاحت سے ارشاد فرمائیں۔

الجواب

وشک فی بعض وضوئه وهو أول ماعرض له غسل ذلک الموضع وإن کثر شکه لایلتفت إلیه وکذا لو شک أنه کبر للافتتاح وهو فی الصلوٰة أو أحدث أو مسح رأسه أم لا فإن کان أول ماعرض استقبل وإن کثر یمضی. (مراقی مع الطحطاوی: ۲۶۰)

مقعد کے قریب محض ریح کے جمع ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ اس کے نکلنے کا یقین نہ ہو محض شک کی بنا پر تجدید ہرگز نہ کریں اس سے مرض بڑھے گا۔ نماز میں بھی اگر کسی سورۃ وغیرہ کے چھوٹنے کا خیال آوے تو اس کی

(۱) الیقین الیزول بالشک. (الاشباہ والنظائر۔) انیس

طرف التفات نہ کریں جوسورۃ پہلے سے پڑھ رہے ہوں اسی کو پڑھ کر نماز پوری کرلیں ایسے خیالات کو شیطانی وسوسہ سمجھئے۔اسی طرح خروج ریح کا جب تک یقین نہ ہو محض شک کی بنا پر نماز نہ توڑیں۔ایسے شک اور وسوسہ کا علاج یہی ہے کہ اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔دفع کرنے کا بھی ارادہ نہ کریں کیونکہ اس سے یہ زیادہ چمٹے گا۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔بندہ عبدالستار عفااللہ عنہ، نائب مفتی خیر المدارس، ملتان۔(خیر الفتاویٰ:۲/۵۴-۵۵)

شک سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: ایک شخص کو بعد وضو کے شک ہوتا ہے کہ ریح نکلی یا نہیں اور کبھی اس کو خروج ریح کا احساس نہیں ہوتا تو اس کو کیا کرنا چاہئے۔کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب

شک سے وضو نہیں ٹوٹتا۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۴۳)

وضو کے بعد شک غیر معتبر ہے:

سوال: وضو کرنے کے بعد شبہ ہوا کہ وضو صحیح ہوا یا نہیں، اب اس کا کیا حکم ہے وضو کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اعادہ ضروری نہیں۔قال العلائیؒ: **شک فی بعض وضوئه أعادماشک فیه لوفی خلاله ولم یکن الشک عادةً له وإلالا، وقال ابن عابدینؒ (قوله إلالا) أی وإن لم یکن فی خلاله بل کان بعدالفراغ منه وإن کان أول ماعرض له الشک أو کان الشک عادةً له وإن کان فی خلاله فلایعید شیئاًقطعاًللوسوسة عنه کمافی التاترخانیة وغیرها .** (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔۲۱/جمادی الاخریٰ ۹۹ھ۔(احسن الفتاویٰ:۲/۲۹)

(۱) وشک بالحدث أوبالعکس أخذبالیقین. (الدرالمختار مع ردالمحتار، نواقض الوضوء:۱/۱۴۰) ومن شک فی الحدث فهوعلی وضوئه. (عالمگیری کشوری:۱/۱۲، ظفیر۔)

(۲) ۱۔شریعت میں یقین پر عمل کرنے کا حکم ہے، البتہ بعض عبادات میں شک کے پہلو کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، چنانچہ وضو جیسی عبادت میں بھی اس کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن یقین کو ترجیح بہرحال ہوگی۔۲۔مثلاً وضو کیا اور اس کا یقین ہے کہ وہ باوضو ہے اور اس بارے میں شک ہوجائے کہ کوئی حدث (وضو توڑنے والا معاملہ) پیش آیا ہے یا نہیں تو اس شک سے وضو باطل نہ ہوگا۔(ردالمحتار) البتہ اگر ظن غالب حدث لاحق ہونے کا ہو تو اس صورت میں افضل یہ ہے کہ دوبارہ وضو کرلے۔(الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۱/۱۴۵) ۳۔باوضو ہو کر لیٹا اور اسے شک ہوگیا کہ اسے نیند آئی تھی یا نہیں تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔(ردالمحتار) ۴۔باوضو تھا اور اس سے اس نے کئی رکعت نماز ادا کی اور اسے یاد نہیں کہ کوئی حدث لاحق ہوا یا نہیں، مگر دو عادل شخص کہتے ہیں کہ تم نے وضو کے بعد استنجاء کیا تھا تو پھر وضو کر کے نمازوں کی قضا کرے گا، ==

باوضو ہونے میں شک کا حکم:

سوال: صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کو طہارت کا یقین ہے بعد میں حدث کا شک ہوگیا یا اس کے برعکس کسی کو حدث کا یقین ہے لیکن وضو کرنے میں شک ہے یعنی یہ یقین نہیں کہ اس نے وضو کیا ہے یا نہیں دونوں صورتوں کا حکم کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ــــــــــــ باسم ملهم الصواب

پہلی صورت میں اس کا وضو باقی ہے، دوسری صورت میں بے وضو شمار ہوگا۔ **قال شارح التنویرؒ: لو أيقن بالطهارة وشک بالحدث أوبالعکس أخذباليقين.** (ردالمحتار:۱/۱۴۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۶/ جمادی الآخرۃ ۹۹ھ۔ (احسن الفتاویٰ:۲/۲۹)

اثنائے وضو میں حدث ہوجائے تو ازسرنو وضو کرے:

سوال: **ماقولكم رحمكم الله فى أنه رجل يتوضأ وقد أحدث فى أثناء الوضوء مثلاً أحدث بعد غسل اليدين وقبل المسح وغسل الرجلين فهل يجب عليه استيناف الوضوء أم لا؟** درمیان وضو میں حدث ہوجائے تو وضو پھر ازسرے نو کرے گا یا اس کی ضرورت نہیں ہے؟

الجواب ــــــــــــ

يجب عليه استيناف الوضوء لأن ا لحدث منافٍ للطهارة وخروج الريح ناقض للطهارةالحاصلةفإن النواقض كماتنقض الطهارةالكاملة تنقض الطهارةالناقصةأيضاً.أونقول:إن المتوضى لماغسل اليدين فقد حصل طهارة اليدين وهٰكذا إلىٰ اٰخره فلما عرض الناقض أبطل ماسبقه من الطهارة فلذايجب عليه الاستيناف(وسببهاالحدث فى الحكميةوهووصف شرعى يحل فى الأعضاء يزيل الطهارة. (۱) فقط (حاصل جواب یہ ہے کہ وضوازسرے نو کرے گا۔ ظفیر) (فتاویٰ دارالعلوم:۱۴۱)

== البتہ اگر ایک شخص کہے اور اسے یقین نہ آئے بلکہ شک ہو تو وضو کا اعادہ نہ کرے گا اور نہ قضا کرے گا۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۱/۱۴۵) ۵۔ اگر حدث لاحق ہونے کا یقین ہو اور اس بارے میں شک ہو کہ وضو کیا یا نہیں اور کسی عادل شخص نے اسے یہ بتایا کہ تم نے وضو کیا تھا تو اس کی بات کا اعتبار کرکے نماز ادا کرسکتا ہے۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۱/۱۴۵) ۶۔ الف۔ باوضو شخص کو اس بارے میں شک ہوگیا کہ وضو کے بعد وہ قضاء حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہوا تھا یا نہیں تو ایسا شخص تحری کرے گا اور ظن غالب پر عمل کرے گا۔ ب۔ لیکن اگر اسے بیت الخلا میں جانا تو یاد ہے مگر اس بارے میں شک ہے کہ وہ قضاء حاجت سے پہلے ہی واپس ہوگیا تھا یا نہیں تو ایسے شخص کو محدث سمجھا جائے گا اور وہ نماز کے لیے دوبارہ وضو کرے گا۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ:۱/۱۴۵) (طہارت کے احکام ومسائل:۱۳۶، ۱۳۷۔ انیس)

(۱) الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار کتاب الطہارۃ:۱/۷۹، ظفیر۔

اثنائے وضو میں حدث ہوجائے تو پھر شروع سے وضو کرے:

سوال: جس کا وضو نصف یا ثلث تک ہوچکا یا فقط پاؤں دھونا باقی ہے۔ پس اس کو حدث ہوا۔ کیا ازسرنو وضو کرنا پڑے گا یا باقی عضو کو دھونا کافی ہوگا؟

الجواب

ازسرنو وضو کرنا لازم ہے۔ **لأن الطهارة فرض بعدالحدث إذا قام إلى الصلوٰة كما قال تعالىٰ: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلوٰة فَاغْسِلُوْا" الآية أى وأنتم محدثون. (اِذَاقُمْتُمْ اِلَى الصَّلوٰةِ الخ وتقديره وأنتم محدثون كذاعن ابن عباسؓ الخ.** (۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۲)

درمیان وضو ناقض وضو کا تحقق ہونے سے وضو کا حکم:

سوال: ایک شخص وضو کے دوران مثلاً چہرہ اور ہاتھ دھوچکا تھا اس کے بعد خروج ریح یا خروج دم پیش آگیا ایسی صورت میں وہ شخص ازسرنو وضو کرے یا بغیر اعادہ کے وضو مکمل کرے؟ ایک فریق کہتا ہے کہ وضو مکمل نہیں ہوا تو ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا بغیر اعادہ کے وضو مکمل کرکے نماز پڑھ لے، نماز درست ہوجائے گی۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ جب نواقض وضو کامل وضو کو توڑ سکتا ہے تو دو تین رکن کو بطریق اولیٰ توڑ سکتا ہے، نیز اگر عمل مکمل ہونے کے بعد ہی باطل وفاسد ہونے کا حکم صادر کیا جائے تو پھر درمیان صلوٰۃ وضو میں کوئی فساد کی صورت پیش آئے تو فاسد و باطل نہیں ہونا چاہیے، نیز تیمّم میں صرف چہرہ کا تیمّم کیا ہے اور نواقض تیمّم میں سے کوئی چیز پیش آگئی تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ ہر دو فریق قیاس سے کام لے رہے ہیں جواب بحوالہ عنایت فرمائیں تو احسان ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً

وضو مکمل کرنے سے پہلے اگر ناقض وضو پیش آجائے تو جن اجزائے وضو کو پہلے ادا کرچکا ہے ان کا بھی نقض ہوگیا، ازسرنو وضو کرنا ضروری ہے یہ مسئلہ صریحہ جزئیہ طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح، شامی، الأشباہ والنظائر وغیرہ میں موجود ہے۔ (۲) قیاس کرنے کی ضرورت ہی نہیں تتبع کی ضرورت ہے، ماشاء اللہ کتابیں آپ کے پاس موجود

(۱) غنیۃ المستملی: ۱۴۰، ظفیر۔

(۲) **سئلت عمن أحدث أثناء وضوئه هل يكفيه إتمامه لذلک الوضوء أويلزمه الاستيناف؟ فالجواب أنه يلزمه الاستيناف كماأفتى به شيخ الاسلام على آفندى. والله أعلم. (الفتاوىٰ الكامليه: ۱۰، الطهارة، مكتبه حقانيه، لوضرب يديه فقبل أن يمسح أحدث لايجوزالمسح بتلک الضربة كمالوأحدث فى الوضوء بعدغسل بعض أعضاء وبه قال السيدأبوشجاع. (الفتاوىٰ العالمكيريه: ۱/۲۶، الفصل الأول، رشيديه، وكذافى فتاوىٰ دارالعلوم ديوبند: ۱/۱۳۰، إمداديه، ملتان، وكذافى غنيةالمستملى(الحلبى الكبير): ۱۵، سهيل اكيڈمى، لاهور، وكذافى الأشباه والنظائر: ۲/۶، إدارة القرآن، كراچى، وكذافى مراقى الفلاح: ۱۲۱، كتاب الطهارة، قديمى.)**

ہیں، تلاش کرلیں۔ یہی حکم تیمّم کا ہے، تیمّم کی ''الشـــرط الســادس'' کے ذیل میں مراقی الفلاح میں جزئیہ دیکھیں۔(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ أملاہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، ۱/۵/۶ ۱۴۰ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۶۰/۵ و ۶۱)

وضو کا یقین ہو تو شبہ کی وجہ سے وضو ضروری نہیں:

سوال: کسی شخص کا وضو ہے وہ کھیلنے گیا، بعد کھیل کے اسے اچھی طرح معلوم نہیں ہے اور خیال نہیں ہے کہ میرا وضو ہے، کیا اس کو دوسرا وضو کرنا چاہئے؟

الجواب

اگر یہ اچھی طرح یاد ہے کہ وضو ہے تو نماز پڑھ لے وضو جدید کی کچھ ضرورت نہیں اور اگر کرلیوے تو اچھا ہے اور ثواب زیادہ ہے۔(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۴۹-۱۵۰)

محض سوزش ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: احمد نامی ایک شخص کے تمام اعضا کمزور ہیں اور مرض احتلام و جریان کا عرصہ سے شکار ہے، اکثر خیالات فاسدہ آتے رہتے ہیں اور کسی بھی چیز کے دیکھنے پر شہوانی خیالات ابھر جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عضو مخصوص میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے، بغیر پیشاب کے حاجت معلوم ہوتی ہے یا عضو میں سوزش ہوتی ہے کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً و مصلیاً

محض سوزش یا پیشاب کی حاجت محسوس ہونے سے وضو ساقط نہیں ہوگا جب تک کسی چیز کا خروج نہ ہو۔(۳) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۶۹/۵)

بواسیر کے مسوں پر تیل لگاتے ہوئے تر انگلی کا اندر داخل کرلینا ناقض وضو ہے:

سوال: ایسی دوا بواسیر جو از قسم تیل ہو اور مسہ بھیتر (اندر) ہو......وہ دوا انگلی میں لگا کر بھیتر پہونچانا چاہے

---

(۱) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۱۲۱، کتاب الطهارة.

(۲) ولو أيقن بالطهارة وشک بالحدث أو بالعكس أخذ باليقين ولو تيقنهما وشک فی السابق فهو متطهر. (الدر المختار علیٰ هامش ردالمحتار، قبیل أبحاث الغسل: ۱/۱۳۹، ظفیر۔)

(۳) وفی الخلاصة: "ولو نزل البول إلیٰ قصبة الذکر لاينقض، لأنه من الباطن. (التاتار خانية: ۱/۲۲۳، إدارة القرآن، کراچی وکذا فی الفتاویٰ العالمکیریة: ۱/۹، الفصل الخامس، نواقض الوضوء، رشیدیه، وکذا فی النهر الفائق: ۱/۵۱، نواقض الوضوء، مکتبه إمدادیه، ملتان، وکذافی خلاصة الفتاویٰ: ۱/۱۶، الفصل الثالث فی الوضوء، امجد اکیڈمی، لاهور.)

اورانگلی ......دوا پہونچاتے وقت ایک گرہ سے کم بھیتر جاتی ہے، پھر انگلی نکال لی گئی، تو باوضو ہونے کی حالت میں وضوقائم رہایانہیں اور جوتیل پاخانہ کے مقام پراس عمل سے لگارہانجس ہے یانہیں اور پاجامہ کی رومالی میں وہ تیل لگ جانے سے رومالی نجس ہوئی یانہیں، اوروقتاً فوقتاً دوتین بارایسا عمل کرنے سے کیاحکم ہے؟

الجواب

قال فی الدر:"وکذالوأدخل أصبعه فی دبره ولم یغیبهافإن غیبها أو أدخلها عند الاستنجاء بطل وضوءه وصومه آه،وفی الشامیة:"قوله:ولم یغیبها،لکن الصحیح أنه تعتبر البلةأو الرائحةذکره فی المنتقی آه وفیه أیضا:وکذالوخرج الدهن من الدبربعد ما احتقن به ینقض بلاخلاف آه (ص ۱۵۴ و ۱۵۵ ج ۱)وفیه أیضا:قلت :ولکن لو أدخلها عند الاستنجا ء ینتقض وضوءه أیضاً لأنها لاتخلوعن البلة إذاخرجت کمافی شرح الشیخ اسمٰعیل عن الواقعات وکذافی التاتارخانیة لکن نقل فیهاأیضاًعن الذخیرة:عدم النقض والذی یظهرهوالنقض لخروج البلة آه .

خلاصہ یہ کہ جب انگلی کوتر کرکے دبر میں داخل کیا جاویگا تو وضو ہرحال میں ٹوٹ جائے گا، خواہ غائب ہو یا نہ ہو، اسی طرح جوتیل دبر میں لگایا گیا ہے جب وہ باہر نکل آوے گا تو وضوٹوٹ جائے گا، کیونکہ وہ تیل نجس ہے، پس رومالی میں جوتیل لگا ہوا ہے اگر وہ اندر سے آنے والا ہے تب تو رومالی ناپاک ہے اوراگر وہ تیل ہے جو اندر سے نہیں آتا بلکہ باہر ہی سے لگ جاتا ہے تو ناپاک نہیں، ہرحال میں احتیاط ضروری ہے، مریض کو چاہئے کہ جب وہ تیل لگا چکے تو فوراً کسی دوسرے کپڑے سے دبراوراس کے حوالی کواچھی طرح تیل سے صاف کردیا کرے اس کے بعدبھی اگرتیل کااثر باہرظاہرہوتووہ اندرسے آنے والا ہے جس سے یقیناً کپڑا ناپاک ہوجائے گا۔(امدادالاحکام جلداول ص ۳۴۸و۳۴۹)

خروج مَسَّہ بواسیر ناقض وضو ہے:

سوال: ایک آدمی خونی بواسیر کا مریض ہے۔نماز میں مسہ جائے مقعد سے باہر نکلامگراس کے ساتھ خون وغیرہ کچھ نہیں نکلا پھر مسہ خود بخود گم ہوگیا۔کیاوضوٹوٹ گیایانہیں؟

الجواب

اگر یہ معذورین کے حکم میں نہیں ہےتووضوٹوٹ جائے گا۔لعموم وینقض الوضوء کل ماخرج من السبیلین اھ.

عالمگیری میں ہے:وذکرالشیخ شمس الأئمة الحلوانیؒ أن بنفس الخروج من الدبرینتقض وضوءه اھ.(ج ۱ ص ۵) فقط واللّٰه أعلم، محمدانورعفااللہ عنہ،۱۳۹۶/۴/۸،الجواب صحیح:بندہ عبدالستارعفااللہ عنہ(خیرالفتاویٰ:۲/۷۵)

سبیلین سے بول و براز کے علاوہ خون یا پیپ نکلے تو ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: عاجز بہت ضعیف ہونے کے علاوہ اور مختلف امراض میں بھی مبتلا رہتا ہے بواسیر کا بھی خون اور کبھی کچھ اور مادہ کبھی کم کبھی زیادہ نکلتا ہے اور کپڑا ملوث ہوجاتا ہے، فتاویٰ شامی: ۱۲/۱ میں ایسے عذر کی حالت میں کپڑے کو ناپاک نہ ہونے کو مفتیٰ بہ بتایا ہے مگر سبیلین سے خارج ہونے کو شرح منیۃ المصلی کے ص: ۱۱۸ میں اس قاعدہ سے مستثنیٰ کیا ہے کہ سبیلین سے خارج ہونے میں جو سیلان خون و پیپ ہو یا سیلان نہ ہو مجرد ظہور سے ناقض وضو قرار دیا ہے غالباً نجس ہی ہوگا میری نظر بہت ضعیف ہوگئی فتاویٰ پڑھا نہیں جاتا، میرا خیال ہوتا ہے کہ سبیلین سے بول و براز کا اگر ظہور ہو تو یقیناً ناقض وضو اور نجس ہے اور اگر علاوہ بول و براز کے خون یا پیپ نکلے تو موافق پہلے قاعدہ مرقومہ کے شاید نجس اور ناقض وضو نہ ہو، جواب تحریر فرمائیں آپ کی تحریر مجھے اطمینان دہ ہے؟ (المستفتی نمبر ۱۳۲۴، مولوی محمد مشتاق احمد صاحب، ضلع کرنال، ۱۹/ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ، مطابق ۲/فروری ۱۹۳۷ء)

الجواب

مخدوم و مکرم حضرت مولانا دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ نے ممنون و مشکور فرمایا حق تعالیٰ آپ کے سایہ مکرمت و فیوض کو تادیر مبسوط رکھے (آمین) آپ کا وجود باعث برکات و خیرات ہے۔

سبیلین سے ہر خارج نجس و ناقض وضو ہے کم ہو یا زیادہ، سائل ہو یا نہ ہو اور رطوبتِ دبر بہر صورت نجس ہے۔

”وکذاالدودۃ والحصاۃإذاخرج من أحد هذين الموضعين لاستتباع الرطوبة وهي حدث في السبيلين وإن قلت“. (غنیۃ المستملی) اور کسی زخم سے خون یا پیپ کا تھوڑا تھوڑا نکلتا رہنا اور کپڑے کو لگتا رہنا بیشک بقول مفتیٰ بہ نہ ناقض وضو ہے اور نہ اس سے کپڑا ناپاک ہوتا ہے مگر یہ حکم سبیلین کا نہیں ہے۔ ہاں بواسیر میں مخرج سے باہر مسے اور مسوں کی جڑ میں قروح ہوجاتے ہیں ان میں سے جو خون یا رطوبت نکلتی ہے اور کپڑے پر لگتی رہتی ہے اس کا حکم دوسرے زخموں کا ہے کیوں کہ اس سے نکلنے والی رطوبت خارج من السبیلین میں داخل نہیں ہے خارج من السبیلین میں وہی رطوبت داخل ہے جو مقعد کے اندر سے باہر آئے اور جو حوالی مقعد کے بیرونی مسوں یا زخموں سے نکلے اس کا حکم مثل دیگر اجزائے جسم سے نکلنے والی رطوبت یا خون وریم کے ہوگا۔

امید کہ دعائے خیر میں خادم کو یاد فرماتے رہیں گے۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی ۱۹/ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ۔

(کفایت المفتی: ۲۶۶/۲-۲۶۷)

خون نکل کر بہہ جائے تو وضوٹوٹ جاتا ہے:

سوال: کہتے ہیں کہ خون نکلنے اور بہنے سے وضونہیں ٹوٹتا، یہ حدیث سے ثابت ہے اور امام اعظمؒ کے مذہب میں وضوٹوٹ جاتا ہے۔اس کا استدلال کہاں سے ثابت ہے؟

الجواب

اس کا استدلال آیت ''اَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً'' سے ہے۔(۱) (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۸)

خون پھیل جانے سے وضو کا حکم:

سوال:۔اگر خون یا پیپ نکل کر بہنے کی صورت اختیار نہ کرے اور یوں ہی بدن پر پھیل جائے تو کیا اس سے وضوٹوٹ جائے گا؟

الجواب

جب خون یا پیپ زخم کے منہ سے خارج ہو کر پھیل جائے تو اس سے وضو کا ٹوٹنا بہنے پر موقوف نہیں۔

''قال الحصكفیؒ: وينقضه خروج كل خارج نجس منه إلیٰ مايطهر أی يلحقه حكم

(۱) المعانی الناقضة للوضوء: كل مايخرج من السبيلين الخ والدم والقيح إذخرجا الخ ولناقوله عليه السلام: الوضوء من دم سائل الخ ''هداية''أخرجه الدارقطنی، ووجه الاستدلال: أن مثل هذاالتركيب يفهم منه الوجوب كمافی قوله صلی الله عليه وسلم: ''فی خمس من الإبل شاة'' فلاخلاف فی فرضيته وقوله عليه الصلوٰةوالسلام:'' إنما الماء من الماء'' ولاخلاف فی وجوب الغسل بسبب خروج المنی فكان معناه توضؤوامن كل دم سال من البدن وإنماعبرعنه بلفظ الخبرلكونه آكد فی الدلالةعلی الوجوب كأنه أمرفامتثل أمره فأخبرعن ذلک وهوآية كونه واجباًفإن الأمرإذاكان ممن لايكذب فی كلامه يعبرعن مطلوبه بلفظ الخبرتاكيداًللطلب لأن فی تركه تكذيباًله وهوممن لايكذب علی ماعرف فی موضعه ،فإن قيل: سلمنا،لكن يجوزأن يكون المراد به الوضوء اللغوی قلنا:ذاک مجازشرعی ولاتترک الحقيقةالشرعية فی كلام الشارع بلادليل (عنایہ علیٰ ہامش فتح القدیر:۱/۳۵،ظفیر۔ہدایہ کی شروح اربعہ مصری بھی مختلف مطابع میں چھپی ہیں، خاکسار نے عنایہ، کفایہ اور فتح القدیر کا اگر کہیں حوالہ دیا ہے تو اس میں صفحات ''مطبعہ میمنہ'' مصر کی چھپی ہوئی ہیں۔ظفیر الدین غفرلہ)فقط۔حدیث میں ہے:(۱)قال تميم الداریؓ : قال رسول الله ﷺ: الوضوء من كل دم سائل ۔(دار قطنی ، باب فی الوضوء من الخارج من البدن ص۱۶۳،نمبر۵۷۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہنے والا خون ناقض وضو ہے۔(۲)عن أبی هريرةؓ عن النبی صلی الله عليه وسلم قال:ليس فی القطرة و القطرتين من الدم وضوء إلا أن يكون دماً سائلاً۔(دار قطنی ،باب فی الوضوء من الخارج من البدن ،ج اول،ص۱۶۳،نمبر۵۷۲)(۳)عن عطاءؒ ،الشجة يكون بالرجل قال:إن سال الدم فليتوضأ،و إن ظهرولم يسل فلا وضوء عليه۔(مصنف عبد الرزاق ،باب الوضوء من الدم ،ج اول،ص۱۱۰،نمبر۵۴۵)(۴) قال لی عطاءؒ: توضأ من كل دم خرج فسال،قيح أودم أو نفطة يسيرة إذا خرج فسال فيه الوضوء قال: وإن نزعت سنا فسال منها دم فتوضأ۔(مصنف عبد الرزاق، باب الوضوء من الدم ، ج اول ،ص۱۱۱،نمبر۵۴۶،انیس۔)

التطهير. (الدرالمختار علیٰ صدرردالمحتار،نواقض الوضوء: ج ۱ ص ۱۳۴ و ۱۳۵)(۱)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۸)

انجکشن لگوانا ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ انجکشن لگوانا یا بدن میں دوا،خون،گلوکوز چڑھوانا ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ وباللّٰہ التوفیق

اگران چیزوں کے استعمال سے خون یا پیپ وغیرہ کچھ بدن سے نہ نکلے تو وضونہیں ٹوٹے گا اس لئے کہ ناقض وضوخروج نجاست ہے۔(۲)لیکن اگرانجکشن کے ذریعہ خون بدن سے نکالنا مقصد ہوتو یہ ناقض وضو ہے اس کی نظیر یہ جزیہ ہے۔**القراد إذا مص إنساناً فامتلأ دماً إن كان صغيراًلاينقض وضوء ه كمالومصت الذباب أوالبعوض وإن كان كبيراً ينقض وكذاالعلقةإذامص عضوإنسان حتى امتلأت من دمه انتقض الوضوء.** (۳)فقط واللہ اعلم بالصواب۔کتبہ العبدنظام الدین عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند(منتخبات نظام الفتاویٰ:۱/۴۴)

وریدی انجکشن ناقض وضو ہے:

سوال: حضرت والانے بیان فرمایا تھا کہ وریدی انجکشن میں خون نکلنے کی وجہ سے وضوٹوٹ جاتا ہے تو کیا ہرانجکشن میں خون نکلنا ضروری ہے۔نیز اگرخون نکلاتو وہ پچکاری میں دوا کے ساتھ مل کر دوبارہ بدن میں داخل ہوجائے گا اگراس خون کوخارج مان لیا جائے تو کیا اس صورت میں تداوی بالمحرم نہ ہوگی؟ بینواتوجروا۔

الجواب ــــــــــــــــــــ باسم ملھم الصواب

وریدی انجکشن میں سوئی کے ورید میں پہونچنے کا یقین حاصل کرنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ پچکاری میں خون آجائے جب تک پچکاری میں خون نظرنہیں آتا اس وقت تک دوابدن میں داخل نہیں کی جاتی،عضلاتی اورجلدی انجکشن میں خون نہیں نکلتا،اس لیے صرف وریدی انجکشن ناقض وضو ہے،عضلاتی اورجلدی نہیں،باقی رہا تداوی بالمحرم کا مسئلہ تو اگرچہ پچکاری میں خون نکل کر دوا کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے۔جس کی وجہ سے دوانجس ہوجاتی ہے لیکن انجکشن خارجی

(۱) "**قال إبراهيم الحلبيؒ: إذا خرج وتجاوزمكان خروجه إلىٰ موضع يلحقه أى يلحق ذلک الموضع حكم التطهير أى يجب تطهيره فى الجملة.** (كبيرى،نواقض الوضوء ص۱۳۱،ومثله فى الهندية:ج۱ص۱۰،الفصل الخامس فى نواقض الوضوء)

(۲) **الدر المختار علىٰ هامش الشامي: ۱/۹۰،نواقض الوضوء)عن ابن عباسؓ: أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: الوضوء مما خرج و ليس ممادخل.** (سنن بيهقى،باب الوضوء من الدم يخرج من أحد السبيلين وغيرذلک من دودةأوحصاة أوغيرذلک: ۱/۱۸۸،نمبر ۵۶۸ /مصنف عبد الرزاق، باب من يطأنتناً يابساً أو رطباً: ۱/۲۴،نمبر۱۰۰۔انیس۔

(۳) فتاویٰ عالمگیری ۱/۶ کتاب الطہارۃ۔

استعمال میں داخل ہے یہی وجہ ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور خارجی طور پر تداوی بالمحرم جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۴/جمادی الاولیٰ ۹۶ھ۔(۱) (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۳-۲۴)

انجکشن سے خون لینا کیا ناقض وضو ہے:

سوال: ناچیز نماز عصر کے بعد باوضو تھا اسی دوران ہسپتال میں ایک جاں بلب بیمار کو خون کی ضرورت پڑی ناچیز نے اسے اپنا خون دیا، ہسپتال سے سیدھا واپس آکر نماز مغرب تیار تھی باوضو ہونے کے خیال سے نماز میں امامت کے بعد میں نے ایک مولوی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ نماز نہیں ہوئی جبکہ دوسرے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ خون ایک رگ سے بذریعہ سوئی اور نالی بوتل میں بھرا اور اسی صورت میں دوسرے بیمار کی رگ کے ذریعہ اس کے جسم میں منتقل کیا گیا، ایک قطرہ بھی گرا نہیں اس لیے خون بہنے کا مسئلہ نہیں رہا، لہٰذا نماز ہوگئی۔

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

خون اگرچہ زمین پر نہیں گرا لیکن اگر نالی اور بوتل نہ ہوتی جس میں خون لیا گیا ہے بلکہ بذریعہ سوئی ایسے ہی نکالا جاتا تو ضرور بہہ کر زمین پر گر جاتا جیسے جونک لگادی جائے اور وہ خون چوس لے جو اس کے پیٹ میں چلا جائے زمین پر ایک قطرہ بھی نہ گرے تو وہ فقہا کے نزدیک ناقض وضو ہے اسی طرح صورت مسئولہ میں بھی ناقض وضو ہے، اس نماز کا اعادہ لازم ہے، مراقی الفلاح ص: ۵۲ میں ہے:

”وینقض الوضوء نجاسة سائلة من غيرهما: أی السبيلين لقوله عليه الصلوٰة والسلام: الوضوء من كل دم سائل“.

علامہ طحطاوی نے لکھا ہے:

”والمراد أن تتجاوز ولو بالعصر، وماشأنه أن يتجاوز لو لا المانع، كما لو مصت علقة فامتلئت بحيث لو شقت لسال من الدم كذافي حلبي“. (۲) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند۔

(فتاویٰ محمودیہ: ۵/۶۹ و ۷۰)

---

(۱) وكذاينقضه علقة مصت عضوأوامتلأت من الدم (الدرالمختار) وقال لأنهالوشقت يخرج منهادم سائل. (ردالمحتار: ۱/۱۳۹، نواقض الوضوء. انيس)

(۲) حاشية الطحطاوی علىٰ مراقی الفلاح: ۸۷ فصل نواقض الوضوء، قديمی، وكذاينقضه علقة مصت عضوأوامتلأت من الدم (الدرالمختار) وقال لأنها لوشقت يخرج منهادم سائل. (ردالمحتار: ۱/۱۳۹، نواقض الوضوء، سعيد، وكذافی الفتاویٰ العالمكيريه: ۱/۱۱، الفصل الخامس فی نواقض الوضوء، رشيديه)

انجکشن کے ذریعہ خون نکلنے سے وضو:

سوال: ڈاکٹر ٹیسٹ کے لئے انجکشن کے ذریعہ خون لیا کرتے ہیں، کیا اس سے وضو جاتا رہے گا؟ (ظفیر الدین، عنبر پیٹ)

الجواب

خون اگر اتنی مقدار میں باہر آئے کہ وہ بہنے کے درجہ میں نہ ہو، تو وضو نہیں ٹوٹتا، جیسے زخم سے باہر یا چمڑا چھیل دینے سے خون ظاہر ہو، لیکن اپنی جگہ سے آگے بڑھ نہ جائے اور اگر خون اتنی مقدار میں ہو کہ اپنی جگہ سے بہہ پڑے، تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، چنانچہ دار قطنیؒ نے تمیم داری رضی اللہ عنہ سے اور ابن عدیؒ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ بہتا ہوا خون نکلنے سے وضو واجب ہے:

"الوضوء من كل دم سائل". (۱)

فقہاء رحمہم اللہ نے انجکشن سے قریب تر ایک صورت ذکر کی ہے کہ چیچڑی اگر کسی آدمی کو چوسے، اور خون سے بھر جائے، تو چیچڑی چھوٹی ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا، یہی حکم مچھر اور مکھی کے خون چوسنے کا ہے اور اگر بڑی چیچڑی ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

"القراد إذا مص عضو إنسان فامتلأ دماً، إن كان صغيراً لا ينقض وضوءه... وإن كان كبيراً ينقض". (۲)

لہذا اگر انجکشن کے ذریعہ ٹیسٹ کے لئے یا کسی اور مقصد کے تحت خون نکالا جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا، اگر دواء پہونچانے کی غرض سے انجکشن دیا جائے اور تھوڑا سا خون ہی انجکشن کے ساتھ واپس آئے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۵۰-۵۱)

انجکشن اور جونک کے ذریعہ خون نکالنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں:

سوال: انجکشن کے ذریعہ خون نکالتے ہیں اس سے وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

اگر نکلا ہوا خون بہہ پڑنے کی مقدار ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا کبیریؔ میں ہے: **إذا فصد وخرج منه دم كثير ولم يتلطخ رأس الجرح فإنه ينقض** (صفحہ: ۱۲۹) یعنی فصد لگایا اور بہت سارا خون زخم سے نکلا اور زخم کے ظاہری حصے

(۱) نصب الرایۃ: ۱/۳۷۔

(۲) الفتاویٰ الهندية: ۱/۱۱، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، كتاب الطهارة.

پر ذرہ برابر بھی خون نہیں لگا اس سے وضوٹوٹ جائے گا۔ پہلے زمانہ میں آلہ فصد سینگی تھی آج کے جدید دور میں انجکشن اسی آلہ فصد کی بدلی ہوئی صورت ہے، جونک کے ذریعہ خون نکالا جاتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔(**وکذا ینقضه علقة مصت عضواً و امتلأت من الدم ....الخ** (درمختار ۱/۱۲۹) اور کبیری میں ہے: **أما العلق إذا مصت العضو حتى امتلأت قليلاً بحيث لو سقطت و شقت لم يسل منها الدم انتقض الوضوء و إن مصت قليلاً بحيث لو شقت لم يسل لا ينتقض** (صفحہ:۱۳۴) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(فتاویٰ رحیمیہ: ۴/۲۶۷، ۲۶۸)

جونکیں لگوانے سے وضوٹوٹے گا یا نہیں:

سوال بعض اوقات ورم کی جگہ پر اطبا جونک لگوانے کا مشورہ دیتے ہیں تو اگر وضو کی حالت میں جونکیں لگوائی جائیں تو وضو باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب

اگر جونک بڑی ہو اور اتنا خون چوس لے کہ وہ دم سائل کے حکم میں ہو تو وضوٹوٹ جائے گا۔

وكذا ينقضه علقة مصت عضوا و امتلأت من الدم اهـ (درمختار) (قوله و امتلأت) كذا في الخانية وقال لأنها لو شقت يخرج منها دم سائل اهـ والظاهر أن الامتلاء غير قيد لأن العبرة للسيلان كما أفاده اهـ (شامية: ج ١ ص ١٢٩) فقط والله أعلم، احقر محمد انور عفا اللہ عنہ، مفتی جامعہ خیر المدارس، ملتان۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۷۳)

رسنے والے خون کے ناقض وضو ہونے کی تفصیل:

سوال: ایک زخم سے خون رستا رہتا ہے اور کپڑے کو لگتا رہتا ہے مگر بہتا نہیں کیا یہ ناقض وضو ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا؟

الجواب باسم ملهم الصواب

ایک مجلس میں مختلف دفعات میں کپڑے پر لگنے والے خون کا اندازہ کیا جائے اگر یہ مجموعہ اس قدر نظر آئے کہ اگر کپڑا اس کو جذب نہ کرتا تو خون بہہ پڑتا تو وضوٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، اگر ایک مجلس میں تو اتنا خون کپڑے پر نہیں لگا مگر مختلف مجالس کا مجموعہ اتنا ہو گیا تو وہ ناقض نہیں۔"قال ابن عابدینؒ: **(قوله لو مسح الدم كلما خرج الخ) و كذا إذا وضع عليه قطناً أو شيئاً اخر حتى ينشف ثم وضعه ثانياً و ثالثاً فإنه يجمع جميع ما نشف فإن كان بحيث لو تركه سال نقض و إنما يعرف هذا بالاجتهاد و غالب الظن، و كذا لو ألقى**

عليه رماداً أوتراباً ثم ظهرثانياً فتربه ثم وثم فإنه يجمع قالوا: وإنمايجمع إذاكان فى مجلس واحدمرةً بعدأخرى فلوفى مجالس فلا. (تاترخانية، ومثله فى البحر) أقول: وعليه فمايخرج من الجرح الذى ينزدائماً وليس فيه قوةالسيلان ولكنه إذاترك يتقوى باجتماعه ويسيل عن محله فإذا نشفه أوربطه بخرقة وصاركلماخرج منه شيء تشربته الخرقة ينظرإن كان ماتشربته الخرقة فى ذلك المجلس شيئاً فشيئاً بحيث لوترك واجتمع لسال بنفسه نقض وإلالاولايجمع مافى المجلس إلى مافى مجلس آخروفى ذلك توسعة عظيمة لأصحاب القروح ولصاحب كى الحمصة، فاغتنم هذه الفائدة وكأنهم قاسوهاعلى القيء ولمالم يكن هنااختلاف سبب تعين اعتبارالمجلس، فتنبه". (ردالمحتار: ۱/۱۲۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۹/ رجب ۹۸ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۸)

پنڈلی، سینہ وغیرہ سے خون نکلنا:

سوال: اعضائے وضو کے علاوہ بدن کے دیگر اعضا مثلاً پنڈلی، سینہ وغیرہ سے اگر خون یا پیپ نکل کر بہہ پڑے تو وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

اعضائے وضو کے علاوہ سینہ، پنڈلی وغیرہ سے خون یا پیپ نکل کر بہہ جائے تب بھی وضوٹوٹ جائے گا۔ (۱) فقط واللہ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، ۲/۳/۹۳ھ، الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ، دارالعلوم دیوبند، ۲/۳/۹۳ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۷۰)

خون بغیر سیلان ناقضِ وضو نہیں:

سوال: داد ہو یا ناسور، یا آبلہ، یا زخم جو کچھ اس میں سے خارج ہوگا اس کی دوحالت ہے، یا دبا دیا جاوے یا خود نکلے ہر دوحالت میں اگر قوت سیلان نہیں ہے تو ناقض وضو ہے یا نہیں اور خاص امر استفسار طلب یہ ہے کہ جب

(۱) بخلاف نحوالدم والقيح ولذاأطلقوافى الخارج من غيرالسبيلين كالدم والقيح والصديدأنه ينقض الوضوء ولم يشترطواسوى التجاوز إلى موضع يلحقه حكم التطهير. (ردالمحتار: ۱/۱۴۸، كتاب الطهارة، مطلب فى ندب مراعاةالخلاف إذالم يرتكب مكروه مذهبه، سعيد، "والمعانى الناقضة للوضوء: كل ماخرج من السبيلين والدم والقيح والصديدإذاخرج من بدن فتجاوزإلى موضع يلحقه حكم التطهير. (القدورى: ۶، نواقض الوضوء، سعيد، وكذافى البحرالرائق: ۱/۵۹، رشيديه، وكذافى غنيةالمستملى(الحلبى الكبير): ۱۲۷، نواقض الوضوء، سهيل اكيڈمى، لاهور.)

قوت سیلان نہیں ہے اور جگہ نہیں چھوڑ ی جیسے بعض اقسام داد میں رطوبت اوپر رہتی ہے یا گاہے گاہے نکل کر وہیں رہتی ہے، یہ رطوبت اگر خود نکلی ہو تو ناقض وضو ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی ہاتھ یا کپڑے کو لگ جاوے تو وضو رہے گا یا نہیں اور وہ کپڑا یا ہاتھ نجس ہوگا یا نہ۔

الجواب

مدار نقض وضو سیلان پر ہے اگرچہ بالقوہ ہو۔ کما قالوا: **لو مسح الدم کلما خرج ولو ترکه لسال نقض وإلا لا الخ. درمختار.** (۱) اور خارج اور مخرج برابر ہیں یعنی خود نکلنے والا اور دبا کر نکلنے والا برابر ہیں '' **والمخرج والخارج سیان الخ درمختار.** (۲) پس جب کہ سیلان نہ پایا گیا نہ بالفعل نہ بالقوہ تو وضو نہ ٹوٹے گا اور وہ رطوبت جو غیر سائل زخم کے منہ پر ہے نجس بھی نہیں ہے۔ **لأنه مالیس بحدث لیس بنجس کما صرح به الفقهاء.** (۳) یعنی جس رطوبت سے وضو نہیں ٹوٹتا وہ ناپاک نہیں ہے، پس زخم کے اوپر کپڑا لگنے سے جو رطوبت کپڑے کو لگ جائے اس سے کپڑا ابھی ناپاک نہ ہوگا۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۹)

بستہ خون ناک سے آنے والا ناقض وضو نہیں:

سوال: اکثر زکام میں، بلغم میں یا فضلۂ ناک میں بستہ خون کا ریشہ آجاتا ہے، یہ بستہ خون ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب

بستہ خون جو ناک وغیرہ سے آوے ناقض وضو نہیں ہے۔ (۴) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۵۰)

خون تھوک پر غالب ہو تو ناقض وضو ہے:

سوال: ایک شخص اگر وضو کرتے وقت مسواک کرتا ہے تو منھ وغیرہ دھونے کے بعد تک اس کے دانتوں سے خون آتا رہتا ہے، آیا وہ وضو دوبارہ کرے یا نہ؟

الجواب

ایسی حالت میں وضو دوبارہ کرنا چاہئے۔ (۵) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۶)

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، نواقض الوضوء: ۱/۱۲۵، ظفیر۔

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، نواقض الوضوء: ۱/۱۲۷، ظفیر۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار، نواقض الوضوء: ۱/۱۳۰، ظفیر۔

(۴) وأما العلق النازل من الرأس فغیر ناقض (الدر المختار مع رد المحتار، مطلب نواقض الوضوء: ۱/۱۲۷) الرجل إذا استنثر فخرج من أنفه علی قدر العدسة لاینقض الوضوء کذا في الخلاصة. (عالمگیری مصری نواقض الوضوء: ۱/۱۱، ظفیر۔

(۵) وینقضه دم مائع من جوف أو فم غلب علی بزاق حکماً للغالب أو ساواه احتیاطاً الخ (الدر المختار مع رد المحتار، باب الوضوء: ۱/۱۲۸، ظفیر۔

خون زخم کی جگہ پر ہی رہے تو ناقض وضو نہیں:

سوال ایک زخم گول سا ہے درمیان میں معمولی سا سوراخ ہے جس سے خون وغیرہ نکل کر اس گول دائرہ میں جمع ہو جاتا ہے لیکن اس گول دائرے سے باہر نہیں بہتا۔ یعنی اگر چہ سوراخ سے تو بہہ پڑا ہے لیکن زخم والی جگہ سے آگے نہیں نکلتا۔ کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ عبدالمجید: مدرسہ عربی رائیونڈ

الجواب

الدم السائل على الجراحة إذا لم يتجاوز قال بعضهم هو طاهر الخ وهو الأظهر الخ ومقتضاه أنه غير ناقض الخ (شامي: ج ۱ ص ۹۵) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۷۵)

دانتوں سے خون نکل آئے:

سوال: کیا وضو کرنے کے بعد دانتوں سے خون نکلنے کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ (محمد شمس الدین التمش، مشیر آباد)

الجواب

خون کے نکلنے سے اس وقت وضو ٹوٹتا ہے، جب کہ وہ بہنے کے درجہ میں آجائے، اگر بہنے کے درجہ میں نہ ہو، خون کا تھوڑا سا اثر ہو، تو وضو نہیں ٹوٹے گا، (۱) چنانچہ فقہا نے لکھا ہے:

''اگر کسی چیز کو چبایا جائے یا مسواک کی جائے اور اس میں خون کا اثر پایا جائے تو جب تک سیلان یعنی خون کے بہنے کی کیفیت نہیں پائی جائے، وضو نہیں ٹوٹے گا'' (**''المتوضىء إذا عض شيئاً فوجد فيه أثر الدم أو استاك بسواك فوجد فيه أثر الدم لاينتقض مالم يعرف السيلان''.** (۲)

''اگر تھوک میں خون آرہا ہو تو دیکھا جائیگا کہ غلبہ خون کا ہے یا تھوک کا، اگر تھوک غالب ہو اور خون کم ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اور خون غالب یا برابر ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا'' (**''وينقضه دم من جرح بفمه غلب عليه البزاق أى الريق أو ساواه احتياطاً''.** (۳) (کتاب الفتاویٰ: ۲/۴۸)

کتھہ یا کسی اور دوا سے بہنے والا خون اگر مستور ہو جاوے تو اس کا اعتبار نہیں:

سوال: اگر کسی دانہ یا چوٹ پر چونا لگا دیا جاوے یا کتھا لگا دیا جاوے کہ خون نظر نہ پڑے اور پھر وضو کر کے

(۱) عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنه قال: الوضوء من کل دم سائل ''عن تمیم الداریؓ، سنن الدارقطنی: ۱/۵۷، محشی۔

(۲) الفتاویٰ الھندیة: ۱/ ۱۱، الفصل الخامس فی نواقض الوضوء، کتاب الطھارة. محشی۔

(۳) مراقی الفلاح مع الطحطاوی: ۴۹، محشی۔

نماز پڑھ لی جاوے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

فی الدرالمختار: لو مسح الدم کلما خرج ولو ترکه لسال نقض وإلا لا ،فی رد المحتار:وکذا إذا وضع علیه قطنة أو شیئاً اٰخر حتی ینشف ثم وضعه ثانیاً وثالثاً فانه یجمع جمیع مانشف الخ: ج ۱/ ۱۴۰.

اس سے معلوم ہوا کہ نظر نہ پڑنا کافی نہیں اگر وہ بند نہیں ہوا نکلتا رہا مگر کتھہ چونہ وغیرہ کے سبب نظر نہیں پڑا تو اس کا حکم بہنے کے مثل ہے۔ ۴/ربیع الاول ۱۳۳۳ھ، تتمہ ثالث ص: ۲۳۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۶)

زخم کے دبنے سے جو مواد نکلے وہ ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: زخم ایسے موقع پر ہے کہ نشست و برخاست سے دبتا ہے جو رطوبت دبنے کی وجہ سے نکلے وہ ناقض وضو ہوگی یا نہ؟ قصداً دبانے یا بلا قصد دبنے میں کچھ فرق ہے یا نہ؟

الجواب

دبنے یا دبانے سے اگر رطوبت سائلہ نکلے جو کہ موقع زخم سے باہر بہہ جاوے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر نکل کر زخم میں ہی رہے تو وضو نہیں ٹوٹتا۔ الغرض بلا قصد دب جانا، یا قصداً دبانا برابر ہے۔ اگر خود دب کر بہنے والی رطوبت باہر نکل آئے جو دبا کر نکالی جاوے اور بہے زخم سے باہر تک تو وضو ٹوٹ جاوے گا۔(۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۷)

زخم دبانے سے ریم نکلے تو اس سے وضو ٹوٹے گا یا نہیں:

سوال: اگر زخم کے دبانے کی وجہ سے سیلان ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب

سیلان کسی وجہ سے بھی ہو خواہ خود دبنے سے یا دبانے سے ہر حال میں وضو نہ رہے گا۔ (۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۳۱۹)

---

(۱) وینقضه خروج نجس منه إلی مایطهر الخ ثم المراد بالخروج من السبیلین مجرد الظهور أوفی غیرهما عین السیلان ولو بالقوة لماقالوا لومسح الدم کلماخرج ولوترکه سال نقض وإلالا (درمختار)عین السیلان اختلف فی تفسیره ففی المحیط عن أبی یوسفؒ: أن یعلو أوینحدروعن محمدؒ:إذاانتفخ علی رأس الجرح وصار أکثرمن رأسه نقض والصحیح لاینقض آه قال فی الفتح بعدنقله ذلک وفی الدرایة جعل قول محمدأصح ومختار السرخسی الأول وهوأولی أقول:وکذاصححه قاضیخان وغیره. (ردالمحتار مطلب نواقض الوضوء، ظفیر۔)

(۲) المخرج بعصر والخارج بنفسه مساویان فی حکم النقض علی المختار کما فی البزازیة الخ. (الدرالمختار مع ردالمحتار نواقض الوضوء ۱/۱۲۷۔)

زخم کے منہ سے پیپ وغیرہ کا نکلنا:

سوال: زید کو ایک پھنسی ہے جو ہر وقت بہتی ہے اور اس کے اوپر پھایہ لگا ہوا ہے وہ پیپ اس پھاہے میں رہتی ہے باہر نہیں نکلتی، اس صورت میں وضو رہے گا یا نہیں؟

الجواب

اگر زخم کے منہ سے پیپ باہر آجاتی ہو اگر چہ پھایہ کے اندر رہتی ہو وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن جس کا زخم ہر وقت بہتا ہو بوجہ معذور ہونے کے اس کا وضو نہ ٹوٹے گا۔(۱) ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ۔ تتمہ ثانیہ: ۲۲۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۶)

زخم کی پھایہ کے اندر جو پیپ ہو وہ ناقض وضو ہے یا نہیں، تعارض کا جواب:

سوال: تتمہ ثانیہ امداد الفتاویٰ ص: ۳۲ میں ارقام ہے۔

سوال: زید کو ایک پھنسی ہے جو ہر وقت بہتی ہے اور اس کے اوپر پھایہ لگا ہوا ہے وہ پیپ اس پھایہ میں رہتی ہے باہر نہیں نکلتی اب اس صورت میں وضو رہے گا یا نہیں؟

جواب: اگر زخم کے منہ سے پیپ باہر آجاتی ہو اگر چہ پھائے کے اندر رہتی ہو وضو ٹوٹ جاتا ہے، الخ۔

حضرت؛ ذیل کی عبارات سے تو اس صورت میں وضو کا ٹوٹنا نہیں ثابت ہوتا ہے، عین الہدایہ ترجمہ ہدایہ میں ہے: ''اگر جراحت ہو اس کو باندھا پس بندھن تر ہوا اگر تری باہر رخ کو پھوٹ آئے تو وضو ٹوٹا ورنہ نہیں''۔ (تاتارخانیہ) دوسری جگہ عین الہدایہ باب نواقض الوضوء میں ہے کہ: ''زخم کو باندھا پس بندش کے اوپر تری پھوٹے تو وضو ٹوٹ گیا'' الخ۔ اور فتاویٰ ہندیہ ترجمہ عالمگیریہ باب المسح علی الخفین میں ہے: '' اگر کسی نے زخم کو باندھا اور وہ بندھن تر ہو گیا اور وہ تری باہر تک آگئی تو وضو ٹوٹ گیا ورنہ نہیں ٹوٹا''، غرض معروض یہ ہے کہ اگر کوئی فصد کھلوائے اور اس پر پٹی باندھے پس اگر اس زخم سے خون نکلا لیکن پٹی سے باہر نہ نکلا تو وضو ٹوٹا یا نہیں اور حضور والا کے فتوے اور مذکورہ عبارات کا آپس میں تعارض ہے یا نہ۔ اصلاح فرماویں اور کیا حق ہے؟

الجواب

یہ عبارات پٹی باندھنے کے باب میں ہیں جن میں یہ احتمال ہی نہیں کہ زخم سے رطوبت نکلے اور باہر ظاہر نہ ہو اور تتمہ کا جواب پھایہ کے باب میں ہے جس میں یہ احتمال ہے کہ زخم سے رطوبت نکلے اور باہر ظاہر نہ ہو۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۶ھ۔ تتمہ خامسہ ص: ۵۷۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۷۔۳۸)

(۱) اس جواب پر ایک شبہ اور اس کا حل آگے سوال پر آرہا ہے۔ سعید

زخم کو پٹی باندھ دی جائے اور اندر اندر خون نکل کر پٹی میں پیوست ہوتا رہے تو وضو ٹوٹے گا یا نہیں:

سوال: ایک پھوڑا نکل آیا ہے اور اس سے خون پیپ نکلتا ہے اس وجہ سے اس پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دی ہے اندر اندر خون نکلتا رہتا ہے، پٹی کی وجہ سے باہر نہیں نکلتا ہے تو اس سے وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ جواب تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

اگر اتنا خون نکلے کہ اس کو روکا نہ جاتا تو زخم کے مقام سے آگے بڑھ جاتا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ کبیری میں ہے:

"وإن مسح الدم عن رأس الجرح بقطنة أوغيرها ثم خرج أيضاً فمسح ثم وثم أوألقى التراب أووضع القطن ونحوه عليه فخرج وسرى فيه ينظرفيه إن كان بحال لوتركه ولم يمسحه ولم يضع عليه شيئاً لسال نقض وإلافلا. (ص:۱۳۰)

(ولوشدالخ)قال في البدائع: ولوألقى على الجرح الرمادأوالتراب فتشرب فيه أوربط عليه رباط فابتل الرباط".

ونفذقالوايكون حدثالانه سائل وكذاقالوالوكان الرباط ذاطاقين فنفذالى احدهمالماقلناالخ. (شامي: ج ١، ص ١٢٩.) (فتاویٰ رحیمیہ:۲۶۹/۴)

زخم سے گوشت کا ٹکڑا از خود گر گیا کیا حکم ہے:

سوال: ایک شخص ایسے مرض میں مبتلا ہوا کہ گوشت کا اتصال ختم ہو چکا ہے اسکی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا از خود گر گیا اور اس سے خون نہیں بہا تو یہ ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً

ناقض وضو نہیں۔ **"والشيء تنشأ في الجرح إذا خرجت منه أولحم سقطت منه لم ينقض".** (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ:۴۷/۴)

کس کس سہارے سونے سے وضو ٹوٹتا ہے:

سوال: (۱) دوزانو بیٹھا ہوا ہے اور کہنیوں کا سہارا زانو پر دے کر سو رہا ہے وضو کا کیا حکم ہے؟

(۲) دوزانو بیٹھ کر دونوں پیر ایک طرف نکال دیئے ہیں ایک ہاتھ زمین پر رکھ کر سہارا لے کر سو گیا ہے کیا حکم ہے وضو کا؟

(۳) چہار زانو بیٹھ کر دونوں کہنیوں کو زانو پر رکھ کر ان کے سہارے سو رہا ہے وضو رہا یا نہیں؟

---

(۱) كمافي فتح القدير: ۵۴/۱۔

(۴) چہار زانو بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھ کر ان سے سہارا لے کر سو گیا ہے وضو کا کیا حکم ہے؟
(۵) دونوں گھٹنے کھڑے کر کے دونوں بازو سے گھٹنوں کو حلقہ میں لے کر سو گیا ہے وضو ٹوٹا یا نہیں؟
(۶) سہارے سے کیا مراد ہے بدن، عضو، ہاتھوں یا کہنیوں کا سہارا یا کسی دوسری چیز کا سہارا؟
(۷) کس سہارے سے وضو ٹوٹے گا کس سہارے سے نہیں ٹوٹے گا؟ فقط

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیاً

"وینقضه حکماً نوم یزیل مسکة: أی قوته الماسکة بحیث تزول مقعدته من الأرض وهو النوم علی أحد جنبیه أوورکیه أوقفاه أووجهه وإلایزول مسکة لاینقض وإن تعمده فی الصلوٰة أوغیرها علی المختار، کالنوم قاعداً ولومستنداًإلی مالوأزیل لسقط علی المذهب وساجداً، أومتورکاً، أومحتبیاً ورأسه علی رکبتیه، أوشبه المنکب الخ" درمختار: ۱. ۹۵". (۱)

(۱) یہ صورت ناقضِ وضو نہیں۔
(۲) یہ صورت بھی ناقضِ وضو نہیں۔
(۳) اس سے وضو نہیں ٹوٹا۔
(۴) اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹا۔
(۵) اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹا۔
(۶) سہارا کس عبارت میں ہے جس کا مطلب دریافت کرنا ہے وہ عبارت لکھئے۔
(۷) پانچ صورتوں کا حکم معلوم ہو گیا، ان کے علاوہ جو کچھ دریافت کرنا ہو اس کی صورت تحریر کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۶۳ تا ۶۵)

سجدہ میں کون سی ہیئت نوم ناقضِ وضو ہے:

سوال: سجدہ کی حالت میں کہنی زمین پر ہو یا گھٹنے پر ہو اور نیند آ جائے تو وضو رہے گا یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیاً

کہنی زمین پر ٹیک کر اور پیٹ کو رانوں سے لگا کر سونے سے وضو باقی نہیں رہے گا۔ (۲) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ

---

(۱) الدرالمختار: ۱/ ۱۴۱، مطلب فی نواقض الوضوء، سعید، وکذافی تبیین الحقائق: ۱/ ۵۲، نواقض الوضوء، دارالکتب العلمیة، بیروت، وکذافی مجمع الأنهر: ۱/ ۳۵، نواقض الوضوء، داراحیاء التراث العربی، بیروت.

(۲) "والهیئة المسنونة بأن یکون رافعاً بطنه عن فخذیه مجافیاً عضدیه عن جنبیه کمافی البحر قال ط: والهیئة المسنونة فی حق الرجل لاالمرأة...

==

اعلم ۔حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند ۲۸/۱/۹۲ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۱۷)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کا ناقض وضو نہ ہونا:

سوال: مشہور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقض وضو نہ تھی کیا یہ حکم آپ ہی کے لیے مخصوص تھا یا دوسرے انبیاء کی نیند کا بھی یہی حکم ہے اور امت محمدیہ میں سے کسی عارف باللہ اور ولی اللہ کی نیند کا بھی یہی حکم ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نیند کے ناقض نہ ہونے کی خصوصیت محض امت محمدیہ کے اعتبار سے ہے ورنہ دیگر انبیاء کی نیند کا بھی یہی حکم ہے کہ ناقض نہیں، مگر امت محمدیہ میں سے کوئی اس حکم میں شریک نہیں ہوسکتا، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ ''**أنموذج اللبیب فی فصل الحبیب**'' کے باب ثانی کی فصل ثالث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **وأنہ لاینتقض وضوءہ بالنوم انتھی۔**

اور علامہ قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں: **ومما یختص أیضاً أنہ لاینتقض وضوئہ بالنوم مضطجعاً انتھی** ۔علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: **والأنبیاء مثلہ فی ذلک لأن قلوبھم لاتنام فھو خصوصیۃ لہ علی الأمم لاالأنبیاء انتھی.** اور درمختار میں ہے: **والعتہ لاینقض کنوم الأنبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام انتھی.** (۱) فقط (فتاویٰ عبدالحیٔ اردو: ۱۹۴۔۱۹۵)

کون سی نیند وضو توڑنے والی ہے:

سوال: مطلق نوم ناقض وضو ہے یا کسی خاص حالت میں؟

الجواب

نوم جو ناقض وضو ہے وہ ہے جو لیٹ کر ہو، بیٹھے ہوئے اگر سو جائے یا سجدہ میں تو وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۳۵)

= = ... النقض فی مسئلۃ الذخیرۃ لارتفاع المقعدۃ وزوال التمکن وإذا نقض فی التربع مع أنہ أشد تمکناً فالوجہ الصحیح النقض ھھنا ثم أیدہ بما فی الکفایۃ عن المبسوطین من أنہ لونام قاعداً ووضع ألیتہ علی عقبیہ وصار شبہ المنکب علی وجھہ قال أبویوسفؒ: علیہ الوضوء'' (ردالمحتار: ۱/۱۴۱. ۱۴۲، نواقض الوضوء، سعید، فإنہ یشترط أن یکون علی الھیئۃ المسنونۃ لہ بأن یکون رافعاً بطنہ عن فخذیہ مجافیاً عضدیہ عن جنبیہ ...وإن سجد علی غیر ھذہ الھیئۃ انتقض وضوءہ (الفتاویٰ العالمکیریہ: ۱/۱۲، الفصل الخامس ومنھا النوم، رشیدیہ.

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، مطلب نوم الأنبیاء غیر ناقض۔

(۲) وینقضہ حکماً نوم یزیل مسکۃ أی قوتہ الماسکۃ بحیث تزول مقعدتہ من الأرض وھو نوم علی أحد جنبیہ أو ورکیہ أو قفاہ أو وجھہ (درمختار) أن النوم فی الصلوٰۃ قائماً أو قاعداً أو ساجداً لایکون حدثاً سواء غلبہ النوم أو تعمدہ الخ (ردالمحتار تحت مطلب نوم من بہ انفلات: ۱/۱۳۱، ظفیر) = =

چت لیٹنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: کیا چت لیٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب ــ

وضو نہیں ٹوٹتا۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱۴۴/۱)

بحالت مراقبہ چارزانو سونا ناقض وضو نہیں:

سوال: بحالت مراقبہ یا ورد او راد، اگر استغراق ہو جائے یا غلبۂ نوم ہو اور کسی چیز سے سہارا دے کر نہ بیٹھے تو اس صورت میں تجدید وضو کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟

الجواب ــ

اس صورت میں تجدید وضو کی ضرورت نہیں۔(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱۴۶/۱)

چارزانو سونے سے وضو نہیں جاتا:

سوال: چارزانو سو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــ

نہیں ٹوٹتا۔(۳) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱۴۳/۱)

== حدیث میں ہے: ا۔عن ابن عباس أن رسول اللّٰہ ﷺ کان یسجدوینام وینفخ ثم یقوم فیصلی ولایتوضأ،فقلت له صلیت و لم تتوضأوقدنمت؟ فقال:إنماالوضوء علی من نام مضطجعاً .زاد عثمان و هناد.فإنه إذا اضطجع استرخت مفاصله. (ابوداؤدنمبر۲۰۲)۲۔عن علی ابن أبی طالب رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ وکاء السّه العینان فمن نام فلیتوضأ. (أبوداؤد ، باب فی الوضوء من النوم ،ص۳۹،نمبر۲۰۳)۳۔ال رسول اللّٰہ ﷺ :إن الوضوء لا یجب إلا علی من نام مضطجعاً فإنه إذا اضطجع استرخت مفاصله. (ترمذی شریف ،باب الوضوء من النوم ،ص۲۰،نمبر۷۷)نیند کے ناقض وضو ہونے کی وجہ استرخاء مفاصل ہے اور یہ وجہ گہری نیند کی صورت میں ہوگا اس لیے گہری نیند سونے سے وضو ٹوٹے گا۔ہلکی نیند ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔انیس۔

(۱) أن لایزیل مسکته لاینقض إن تعمده فی الصلوٰة أوغیرهاالخ أومتورکاًالخ بأن یبسط قدمیه من جانب ویلصق ألیتیه بالأرض. (الدرالمختارعلیٰ هامش ردالمحتارنواقض الوضوء:۱۳۱/۱)إن نام متربعاًلاینقض الوضوء وکذا لونام متورکاً بأن یبسط قدمیه من جانب ویلصق ألیتیه بالأرض کذافی الخلاصة.(عالمگیری کشوری نواقض الوضوء:۱۱/۱،ظفیر)

(۲) ولونام قاعداً یتمایل فسقط فلانقض به یفتیٰ کناعس یفهم أکثرماقیل عنده والعته لاینقض کنوم الأنبیاء (درمختار)قوله کناعس أی إذاکان غیرمتمکن الخ وفی الخانیة:النعاس لاینقض الوضوء. (ردالمحتارنواقض الوضوء مطلب نوم الأنبیاء غیرناقض:۱۳۲/۱)وإن نام متربعاًلاینقض الوضوء.(عالمگیری مصری نواقض الوضوء:۱۲/۱،ظفیر۔)

(۳) إن نام متربعاًلاینقض الوضوء وکذالونام متورکاًبأن یبسط قدمیه من جانب ویلصق ألیتیه بالأرض کذافی الخلاصة.(عالمگیری کشوری نواقض الوضوء:۱۱/۱،ظفیر۔) ==

چوکڑی مار کر بیٹھنے کی حالت میں اگر سو جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا:

سوال: چار زانو بیٹھنے میں نیند اگر آ جائے تو وضو تو نہ جائے گا اور اس وضو سے ذکر یا نماز پڑھنی جائز ہوگی؟

الجواب

فی العالمگیریة نواقض الوضوء: وإن نام متربعاً لا ينقض الوضوء. (۱) اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس صورت میں وضو نہ ٹوٹے گا۔ ٦ رشوال ١٣٣٦ھ، تتمہ خامسہ: ص ٦٦۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۸)

بیٹھنے والے کی نیند کے ناقض وضو ہونے کی صورتیں:

سوال: بیٹھ کر سونے کی کونسی صورتیں ناقض وضو نہیں ان کی تفصیل مطلوب ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

قال فی الدر: (نوم يزيل مسكته) أی قوته الماسكة بحيث تزول مقعدته من الأرض وهو النوم على أحد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه و(الا) يزل مسكته (لا) ينقض وان تعمده فی الصلوة أو غيرها على المختار كالنوم قاعداً ولو مستنداً الى مالو أزيل لسقط على المذهب وساجداً على الهيئة المسنونة ولو فی غير الصلوٰة على المعتمد وذكره الحلبی أو متوركاً أو محتبياً ورأسه على ركبتيه أو شبه المنكب (إلى قوله) ولو نام قاعداً يتمايل فسقط ان انتبه حين سقط فلا نقض به يفتي وقال ابن عابدينؒ (قوله على المذهب) أی على ظاهر المذهب عن أبی حنيفةؒ وبه أخذ عامة المشايخ وهو الأصح كما فی البدائع واختار الطحاویؒ والقدوریؒ وصاحبؒ الهداية: النقض ومشي عليه بعض أصحاب المتون وهذا اذا لم تكن مقعدته زائلةً عن الأرض وإلا نقض اتفاقاً كما فی البحر وغيره.... (قوله أو شبه المنكب) أی على وجهه وهو كما فی شروح الهداية: أن ينام واضعاً أليتيه على عقبيه وبطنه على فخذيه ونقل عدم النقض به فی الفتح

== امداد الفتاویٰ میں ہے: **چار زانو بیٹھ کر سونے سے وضو کا حکم:**

سوال: چار زانو بیٹھے بیٹھے اگر چند منٹ کو نیند آ جاوے تو وضو باقی رہتا ہے یا نہیں؟

الجواب

باقی رہتا ہے۔ **فی العالمگیرية عن الخلاصة: وإن نام متربعاً لا ينقض الوضوء وكذا لو نام متوركاً بأن يبسط قدميه من جانب ويلصق أليتيه بالأرض** آه. (فتاویٰ ہندیۃ: ۱/۱۱۔) ۵/ رجب ۱۳۴۲ھ۔ تتمہ خامسہ: ۲٦۹۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۳۸)

(۱) فتاویٰ ہندیۃ: ۱/۱۱۔ انیس۔

عن الذخيرة أيضاً ثم نقل عن غيرها: لو نام متربعاً ورأسه على فخذيه نقض وقال: هذا يخالف ما في الذخيرة واختار في شرح المنية: النقض في مسئلة الذخيرة لارتفاع المقعدة وزوال التمكن وإذا نقض في التربع مع أنه أشد تمكناً فالوجه الصحيح النقض هنا ثم أيده بما في الكفاية عن المبسوطين من أنه لو نام قاعداً ووضع اليتيه على عقبيه وصار شبه المنكب على وجهه قال أبو يوسفؒ: عليه الوضوء. (ردالمحتار: ۱/۱۳۲)

تفصیل بالا سے امور ذیل ثابت ہوئے:

(۱) اگر کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگائے بغیر سویا اور گرا نہیں یا گرتے ہی فوراً بیدار ہو گیا تو وضو نہیں ٹوٹا۔

(۲) سجدہ کی ہیئت مسنونہ پر سونا ناقض وضو نہیں اگرچہ غیر نماز میں ہو۔

(۳) اگر پوری مقعد زمین پر قائم نہیں اور ٹیک لگا کر سویا، خواہ اپنی ران وغیرہ ہی پر ہو تو وضو ٹوٹ گیا، لہٰذا دو زانو بیٹھ کر ران وغیرہ پر ٹیک لگا کر سونے سے وضو جاتا رہے گا۔ اسی طرح چار زانو بیٹھ کر ران پر ٹیک لگائی اور اتنا جھک گیا کہ پوری مقعد زمین پر قائم نہیں تو بھی وضو جاتا رہا البتہ اگر پوری مقعد زمین پر قائم رہے مثلاً گھٹنے کھڑے کر کے ہاتھوں سے پکڑ لیے یا کپڑے وغیرہ سے کمر کے ساتھ باندھ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر سو گیا یا چار زانو بیٹھ کر کہنیوں سے رانوں پر ٹیک لگا کر صرف اتنا جھکا کہ پوری مقعد زمین پر قائم رہی تو وضو نہیں ٹوٹا۔

(۴) اگر پوری مقعد زمین پر قائم ہے اور ٹیک لگا کر اتنی گہری نیند سویا کہ اس چیز کو ہٹا دیا جائے تو گر جائے تو اس صورت میں اختلاف ہے عدم نقض مفتی بہ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۰؍ذی الحجہ ۹۶ھ (احسن الفتاویٰ: ۲/۲۲-۲۳)

سونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: وضو بنا کر سو گیا لوگوں نے اٹھایا نماز پڑھنے کے لئے اور اسی صورت میں نماز پڑھ لی۔ نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ و باللہ التوفیق

اس صورت میں نماز نہیں ہوئی۔ (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد عثمان غنی (فتاویٰ امارت شرعیہ: ۲/۶۳)

تنور میں پاؤں لٹکا کر سونے کا حکم:

سوال: ایک آدمی تنور پر بیٹھا اس حال میں اس نے اپنے دونوں پاؤں تنور میں لٹکا لئے پھر سو گیا، اس کا وضو ٹوٹا یا نہیں؟

(۱) اس لئے کہ نماز کی ہیئت مسنونہ کے علاوہ کسی بھی ہیئت پر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جبکہ سونے سے وضو ٹوٹ گیا اور بغیر دوبارہ وضو کئے ہوئے نماز پڑھی تو نماز بھی نہیں ہوئی۔ (مجاہد) (و) **ينقضه حكماً (نوم يزيل مسكته) أي قوته الماسكة. بحيث تزول مقعدته من الأرض وهو النوم على أحد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه.** (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار: ۱/۲۷۰، ۲۷۱۔)

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضوٹوٹ گیا۔ ''وإن قام علی رأس التنور وهو جالس قد أدنی رجليه كان حدثاً لأن ذلك سبب لاسترخاء المفاصل''. (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ: ۴/ ۴۹)

عورت کو چھونا ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: میاں بیوی بحالت وضو ایک دوسرے کے جسم پر مس کریں تو وضو قائم رہتا ہے یا نہیں؟ جب کہ کپڑا بھی حائل نہ ہو۔

الجواب ــــــــــــــــــــ

مباشرت فاحشہ جو بتماس الفرجین بلا حائل کے ہو ناقض وضو ہے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/ ۱۳۹)

مرد و عورت کے ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: مرد عورت اگر ایک دوسرے کو ہاتھ لگاویں، قصداً یا بلا قصد ہاتھ یا بدن لگ جاوے اور وہ محرم ہوں یا غیر محرم، تو وضو اور نماز رہتی ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

ہاتھ لگانے سے امام صاحب کے نزدیک وضو نہیں جاتی، احتیاط اولیٰ ہے، (۳) امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک (۴) (وضو) جاتی رہتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ بدست خاص، ص: ٦٦۔ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۱۴۰)

---

(۱) کما فی الخانية: ۱/ ۴۳۔

(۲) وينقضه خروج نجس الخ ومباشرة فاحشة بتماس الفرجين ولو بين المرأتين والرجلين مع الانتشار للجانبين المباشر والمباشر ولو بلا بلل على المعتمد. (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء: ۱/ ۱۳۶، ظفیر) (یعنی عضو خاص سے عضو خاص کا چھونا اس طرح کے درمیان میں کپڑا وغیرہ نہ ہو ناقض وضو ہے، باقی ہاتھ وغیرہ سے ننگے جسم یا جسم کا کوئی حصہ چھونا ناقض وضو نہیں ظفیر)۔ (لا ينقضه مس ذكر الخ وامرأة وأمرد. (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء: ۱/ ۱۳٦۔)

(۳) مرد کا عورت کے بدن کو چھونا یا عورت کا مرد کے بدن کو چھونا چاہے بغرض شہوت ہو یا نہ ہو وضو نہیں ٹوٹے گا، البتہ اس صورت میں دوبارہ وضو کرنا مستحب ہے۔ (رد المحتار: ۱/ ۱۴٦، ۱۴۷) (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۳۴۔) مرد و عورت کے معانقہ کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے چاہے لباس پہنے ہوں یا بے ستر ہوں۔ بوس و کنار سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے چاہے مرد و عورت ایک دوسرے کا بوسہ لیں یا بچوں کا لیں۔ (طہارت کے احکام ومسائل: ۱۳۵۔ انیس۔

(۴) امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نامحرم کے مباشرہ یعنی جسم سے جسم لگ جانے پر وضو ٹوٹتا ہے، نامحرم غیر مشتہاۃ کو ہاتھ لگانے سے نہیں ٹوٹتا ہے، جب کہ امام مالک کے نزدیک بالشہوۃ ہاتھ لگانے سے ٹوٹتا ہے۔ ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامۃ، ص: ۱۹۳ ج ۱، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ریاض ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء، نیز تحفۃ الاحوذی مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری ص: ۲۳۸ / ج ۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۸ھ، نور۔

مرد عورت کی شرمگاہوں کے ملنے سے، بغیر پانی نکلے وضو کا حکم:

سوال: ایک کتاب میں لکھا ہے کہ، اگر فرج برفرج باش......وضوشکستہ شود، آیا پانی نکلنے سے وضو جاوے گی ، یا بدون نکلنے پانی کے، فقط ایستادگی ذکر وفرج برفرج ہونے سے وضو جاتی رہتی ہے؟

الجواب

مساس سے بغیر نکلے پانی کے، وضو جاتی رہتی ہے(۱)۔ فقط۔ بدست خاص، ص:٦٦۔ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۱۴۰)

حالت وضو میں عورت پر شہوت سے نظر ڈالنا ناقض وضو نہیں:

سوال: جو شخص باوضو ہو اور اس کی نظر شہوت سے کسی عورت پر پڑ جاوے اس کا وضو رہے گا یا نہیں؟

الجواب

نظر بالشہوت سے اگر خروج مذی وغیرہ نہ ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱/۱۴۰)

عورت پر نظر پڑ جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: آج کل ہندوستان اور غیر ہندوستان میں نصاریٰ کا بہت زور ہے اور انہی کی اکثر جگہ حکومت ہے، اور نصاریٰ کے علاوہ ہندوؤں میں بھی رواج ہے کہ ان کی عورتیں خوب عمدہ لباس پہن کر نکلتی ہیں، اور ان کے علاوہ اور قومیں بھی جو بازاروں میں اور راستوں میں برابر آتی جاتی ہیں، اور خصوصاً نصرانی عورتیں جن کا لباس اس قسم کا ہے کہ ان کے ہاتھ کندھوں تک اور پاؤں گھٹنوں تک برہنہ ہوتے ہیں آگے گلا وغیرہ کھلا رکھتے ہیں، اور ان کے لباس اس قسم کے ہوتے ہیں جس میں بدن وغیرہ نظر آتا ہے، اب اس کے بعد یہ عرض ہے کہ مسلمان آج کل جتنے ہیں وہ اپنے نفس پر قادر نہیں ہیں، اور نہ ان کی ایسی حالتیں ہیں جو غیر محرم پر نظر ڈالیں تو وہ بہ نظر شہوت نہ ہو، اور بہت کم ایسے ......مسلمان بزرگ ہیں جو ایسے مجامع کو دیکھ کر اپنے نفس پر قادر رہتے ہیں، ان تمام موجودہ حالات کو دیکھ کر عرض ہے کہ اگر کوئی شخص باوضو ہووے تو اس کا وضو رہے گا یا جاوے گا، حالانکہ فقہاء کرام کا مطلب یہی ہے کہ وضو نہیں جاویگا مگر زید کیا اجازت دیتا ہے، کہ نظر شہوت پڑنے کے بعد وضو رہتا ہے یا نہیں اور ایک یہ ہے کہ لوگوں کی حالت ان حسین عورتوں کو دیکھ کر متغیر ہو جاتی ہے، اور نظر تو یقیناً شہوت کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر اس صورت میں کیا حکم ہے، اور سائل خود بھی یہ جانتا ہے کہ وضو احناف کے مسلک پر نہیں جاتا ہے، مگر زید لوگوں کو اس زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے

(۱) وینقضه خروج نجس الخ ومباشرة فاحشة بتماس الفرجين ولو بين المرأتين والرجلين مع الانتشار للجانبين المباشر والمباشرة ولو بلا بلل على المعتمد (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء:۱/۱۳۶، انیس۔)

(۲) لاينقضه مس ذكر الخ وامرأة وأمرد الخ (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء:۱/۱۳۶، ظفیر۔)

وضوکرنا اچھا بتلاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر ایسا زمانہ نازک جیسا کہ موجود ہے اگر فقہا کرام کے سامنے ہوتا تو ضرور دوبارہ وضوکرنے کی اجازت دیتے اور بہت سارے اشخاص ایسے ہیں کہ جب حسین عورت پر نظر پڑتی ہے تو وہ شہوت کے ساتھ ہوتی ہے، آج کل بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس سے محفوظ ہوں، تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب

نگاہ کا اٹھانا اور کسی کو دیکھنا امر اختیاری ہے، آنکھیں اور نگاہیں خود بخود کسی پر نہیں پڑ جاتیں لہٰذا ایسے وقت میں مردوں کو نگاہ نیچی رکھنی چاہئیں، لیکن اگر شہوت سے کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو اس سے وضو نہ ٹوٹے گا، نہ حنفیہ کے مسلک پر نہ کسی اور کے مسلک پر، ہاں اگر عمداً عورت کو دیکھا ہو تو یہ گناہ ہے اور ہر گناہ کے بعد وضوکرکے توبہ کرنا مستحب ہے اور مطلق توبہ تو واجب ہے۔ **قال فی مراقی الفلاح: وبعد کل خطیئة وإنشاء شعر الخ.** ص ۴۴، ۱۰ شعبان ۴۷ھ۔ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۷ تا ۳۵۸)

غیر محرم پر نظر پڑنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: اگر نامحرم پر نظر پڑ جائے تو کیا خاتون کے وضو پر کوئی اثر پڑے گا کیا وضو قائم رہے گا؟ آپ کی اصلاح کا منتظر؟

الجواب حامداً و مصلیاً

غیر محرم پر نظر پڑنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ **وفی الهداية: المعانی الناقضة للوضوء کل مایخرج من السبیلین.... والدم والقیح إذا خرجا من البدن فتجاوزا إلی موضع یلحقه حکم التطهیر.... آه**(۱ / ۳۳) واللہ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ دار الافتاء والقضاء جامعہ بنوریہ پاکستان سیریل نمبر: ۹۴۳۶)

بچے کو دودھ پلانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، نماز میں دودھ پیا تو نماز فاسد ہو جائے گی:

سوال: ایک عورت نے نماز کے واسطے وضو کی، پھر نماز کے اندر اس کے بچہ نے اپنی ماں کا دودھ پیا تو اس عورت کا وضو باقی رہا یا ٹوٹ گیا؟

الجواب

اگر پستان سے دودھ نکلا بھی ہو تو عورت کی نماز تو فاسد ہو جائے گی۔(۱) وضو میں نقصان نہیں آیا۔(۲) (شامی ص ۴۲۲ ج ۴) ۲۳ / رمضان ۴۵ھ۔ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۷)

(۱) فی الدر المختار فی مفسدات الصلوٰة: أو مصّ ثدیها ثلاثاً الخ وقال فی ردالمحتار: وفی المحیط: إن خرج اللبن فسدت لأنه یکون إرضاعاً وإلا فلا ولم یقیده بعدد وصححه فی المعراج (حلیه وبحر). (ردالمحتار باب مایفسد الصلوٰة ومایکره فیها: ۱ / ۵۸۷) انیس الرحمٰن قاسمی۔

(۲) وینقضه خروج کل خارج نجس منه الخ لاینقض لو خرج من أذنه ونحوها کعینه وثدیه قیح أو نحوه کصدید وماء سرة وعین. (الدرالمختار مع ردالمحتار نواقض الوضوء: ۱ / ۱۳۷) (شی نجس کا نکلنا ناقض وضو ہے اور دودھ نجس نہیں اسلئے دودھ کا پستان سے نکلنا ناقض وضو نہیں ہے: انیس الرحمٰن قاسمی)

عورت کی چھاتی سے دودھ نکلنا ناقض وضو نہیں:

سوال: عورت کا دودھ پستان سے نکلنا ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب

ناقض وضو نہیں۔ "وينقضه خروج كل خارج نجس منه". (۱) پس جو چیز نجس نہیں، خروج اس کا ناقض وضو نہیں۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۳۶)

بچہ کا حالت نماز میں دودھ پینا:

سوال: (۱) زنے نمازخواندوپسرش آمده درتشهدشيرنوشيد۔ضرورت تجديدنمازوتجديدوضوواجب گردديانه؟ (یعنی: عورت حالتِ نماز میں تھی کہ بچہ نے آکر تشہد میں اس کا دودھ پی لیا کیا حکم ہے؟)

سوال: (۲) زنے وضو نمود فرزندش راشيرنوشانيد تجديد وضو واجب گردد يا نه؟ (یعنی: وضو کرنے کے بعد عورت نے بچہ کو دودھ پلایا تو وضو رہا یا ٹوٹ گیا؟)

الجواب

دریں صورت وضو منقوض نه شودلعدم خروج النجس۔ونماز فاسد شودلحصول الارضاع۔ كذا فى الدر المختارفى مفسدات الصلوٰة: أو مصّ ثديهاثلاثاً الخ وقال في ردالمحتار: وفي المحيط: إن خرج اللبن فسدت لأنه يكون إرضاعاً وإلا فلا ولم يقيده بعدد وصححه في المعراج(حليه وبحر). (۲) جواب کا حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں وضو نہیں ٹوٹا مگر نماز فاسد ہوگئی۔ ظفیر)

جواب سوال دوم: ہم ازیں ظاہر شد کہ وضو آن زن منقوض نہ شود۔ لعدم خروج النجس. كذا في كتب الفقه. (وينقضه خروج كل خارج نجس منه الخ لاينقض لوخرج من أذنه ونحوها كعينه وثديه قيح أونحوه كصديد وماء سرة وعين. (۳) اس صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹا۔ ظفیر (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۰)

---

(۱) الدرالمختارمع ردالمحتارمطلب نواقض الوضوء: ۱/۱۲۴۔ ظفیر۔

(۲) ردالمحتارباب مايفسدالصلوٰةومايكره فيها: ۱/۵۸۷، ظفیر۔

(۳) الدرالمختارعلىٰ هامش ردالمحتارنواقض الوضوء: ۱/۱۳۷) دودھ نجس نہیں ہے لہٰذا اس کا نکلنا ناقض وضو نہیں ہوا۔ واللہ اعلم، ظفیر۔

بچہ کو دودھ پلانا ناقض وضو نہیں لیکن نماز فاسد ہو جاوے گی:

سوال: عورت دودھ والی وضو سے ہو اور وہ اپنے لڑکے کو دودھ پلا دے یا دودھ اس کا آپ سے جاری ہوا یا وہ نماز میں ہووے اور لڑکا دودھ پیوے دودھ نکلے یا نہ نکلے اس کی نماز کے واسطے اور وضو کے واسطے کیا حکم ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

دودھ پلانے سے وضو نہیں ٹوٹتا(۱) لیکن اگر نماز میں ہو اور بچہ دودھ پی لے اور دودھ نکل بھی آوے تو نماز جاتی رہے گی(۲) اور اگر دودھ نہ نکلے تو نماز نہ جاوے گی۔ **في رد المحتار عن التاتار خانية: مص صبي ثديها وخرج اللبن تفسد صلوتها. ج ۱ ص ۶۵۳** ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۵ محرم ۱۳۲۴ھ۔ امداد الفتاویٰ: ۱/۶۹۔ (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۴۱)

گھٹنا کھلنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: وضو کے بعد گھٹنا کھل جانے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ و باللّٰه التوفيق

وضو کے بعد گھٹنا یا کوئی عضو کھل جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد عثمان غنی ۱۱/۱۱/۷۰ ۱۳ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ۔ ۲/۶۳۔۶۴)

گھٹنا اور دوسرے ستر کے کھلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: (۱) مشہور ہے کہ گھٹنا کھلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور کون کون عورت کے کھلنے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

(۲) ستر کو دیکھنے یا ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہ؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

(۱) یہ مشہور غلط ہے۔ کسی عورت (ستر) کے کھلنے سے وضو نہیں جاتا۔(۴)

---

(۱) کیوں کہ وضو جسم سے کسی ناپاک چیز کے نکلنے سے ٹوٹتا ہے۔ **وينقضه خروج كل خارج نجس منه آه** (درمختار ۱/۱۳۴) اور دودھ پاک ہے لہٰذا دودھ پلانے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ سعید۔ **والشيء الطاهر إذا خرج من السبيلين انتقض الوضوء كالريح بخلاف غير السبيلين كالدمع والعرق.** (السعایۃ: ۱/۱۵۱۔ کذا فی محمود الفتاویٰ: ۱/۳۸۲)

(۲) اس لئے کہ دودھ پلانا عمل کثیر ہے جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ سعید۔

(۳) جو امور ناقض وضو ہیں، ان میں کسی عضو کا کھل جانا داخل نہیں۔ ستر عورت کی شرط نماز میں ہے، وضو میں نہیں۔ مجاہد۔

(۴) ستر کھلنا نواقض وضو میں نہیں ہے اس لیے کسی نے اس جزئیہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ظفیر۔

ستر کے کھلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا: سوال: ستر کے کھلنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

نہیں ٹوٹتا۔ (ستر کا کھلنا نواقض وضو میں داخل نہیں ہے کیوں کہ ستر کا چھپانا وضو کے لیے شرط نہیں ہے۔ ظفیر) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۳)

(۲) وضو نہیں ٹوٹتا۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۵)

زانو کھولنے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے:

سوال: کیا پوری جانگھ (ران) کھول دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب ——————— و باللہ التوفیق

نہیں۔(۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔محمد عثمان غنی، ۱۹/۳/۱۳۵۲ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ:۲/۶۴)

گھٹنا دوران وضو کھل جائے تو وضو ہوگا یا نہیں:

سوال: اگر وضو میں بلا عذر زانو کھول دے اور ران تک کپڑا رکھے تو وضو ہوگا یا نہیں؟

الجواب ———————

فی الشامی: فالرکبة من العورة الخ. (۳) پس معلوم ہوا کہ رکبہ عورت ہے ستر اس کا نماز میں ضروری ہے اور وضو میں کھلنا اس کا موجب فساد وضو نہیں ہے، کما ہو ظاہر۔(۴) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۳۷)

ستر دیکھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: اکثر آدمی گرمی میں صرف تہہ بند باندھ کر باقی جسم ننگا رکھتے ہیں اور حرکت کرنے میں بے شرمی ہو جاتی ہے آیا جو لوگ پاس بیٹھتے ہیں ان کا وضو قائم رہ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب ——————— و باللہ التوفیق

خلوت میں ایسی حالت میں رہنا بلا کراہت درست ہے اور جلوت میں مروت و وقار کے خلاف ہونے کی وجہ سے خلاف اولیٰ اور اگر واقع میں کشف عورت بھی ہو جاتا ہے تو گناہ ہے لیکن بہر حال پاس بیٹھنے والوں کے وضو میں اس سے کچھ خلل نہیں آتا۔**بعدم الناقص وهذا كله ظاهر.** (امداد المفتین:۲۴۲)

---

(۱) لاينقضه مس ذكر لكن يغسل يده ندباً وامرأة وأمرد الخ. (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطہارۃ، نواقض الوضوء:۱/۱۳۶، ظفیر۔)

(۲) جو امور ناقض وضو ہیں، ان میں ران کا کھلنا نہیں ہے (مجاہد) مگر نماز کے اندر بے ستری سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔((هـــــي) ستة .... (و) الرابع (ستر عورته) .... (وهي للرجل ما تحت سرته الى ما تحت ركبته). (الدر المختار مع رد المحتار، باب شروط الصلاۃ:۲/۷۳، ۷۶)

(۳) ردالمحتار، باب شروط الصلوٰة. مطلب في ستر العورة: ج۱ ص۳۷۷، ظفیر۔

(۴) اگر وضو کرتے وقت عذر سے یا بلا عذر کوئی زانو کھول دے اور ران تک کپڑا رکھے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، البتہ لوگوں کے سامنے بلا عذر رکھولنا سخت گناہ ہے۔وضو کے بعد کوئی بے ستر ہو جائے تو بھی وضو نہیں ٹوٹے گا۔(طہارت کے احکام و مسائل:۱۳۵۔انیس)

برہنہ غسل کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں چھپے ہوئے غسل خانہ میں برہنہ غسل کرنے سے غسل کا وضو رہ سکتا ہے اور بلا چھپے غسل خانہ میں وضو نہیں رہتا، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب

وضو دونوں حالت میں باقی رہے گا (۱)۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۴)

ستر غلیظ کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: عورت غلیظہ کو مس کرنے سے تجدید وضو کی ضرورت ہے یا اسی وضو سے نماز صحیح ہے؟

الجواب

اس صورت میں تجدید وضو کی ضرورت نہیں ہے اور اسی وضو سے نماز صحیح ہے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۶)

برہنہ غسل کرنے کے بعد اسی وضو سے نماز پڑھی جاسکتی ہے:

سوال: اگر وضو کرکے برہنہ غسل کرے، غسل خانہ یا صحن میں تو اس وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر برہنہ غسل کیا تو اس سے نماز پڑھ سکتا ہے ستر عورت الگ فرض ہے، جب غیر تنہائی میں غسل کرے۔ (۳) فقط۔

(فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۵۰)

شرم گاہ کا دیکھنا ناقض وضو نہیں:

سوال: باوضو شخص نے ایک برہنہ شخص کی شرم گاہ کو دیکھ لیا دیکھتے ہی نظر نیچی کرلی تو اس کا وضو ٹوٹا یا نہیں۔ اسی طرح اگر باوضو شخص نے اپنی شرم گاہ کو دیکھ لیا تو اس کا وضو ٹوٹا یا نہیں؟

الجواب

دونوں صورتوں میں وضو اس کا نہیں ٹوٹا۔ (۴) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۵۰)

---

(۱) برہنہ ہونا ناقض وضو نہیں اس لئے وضو باقی رہے گا: انیس۔

(۲) لاینقضه مس ذکر لکن یغسل یده ندباً. (الدر المختار مع رد المحتار نواقض الوضوء: ۱/۱۳۶، ظفیر۔

(۳) برہنہ ہونا ناقض وضو نہیں ہے۔ ظفیر۔

(۴) لاینقضه مس ذکر لکن یغسل یده ندباً (الدر المختار مع رد المحتار مطلب نواقض الوضوء: ۱/۱۳۶)من مس ذکره أوذکر غیره لیس بحدث عندنا کذافی الزاد (عالمگیری کشوری نواقض وضوء: ۱/۱۱، ظفیر

پاجامہ اگر ٹخنوں سے نیچے ہوتو وضوٹوٹتا ہے یانہیں:

سوال: پاجامہ اگر ٹخنوں سے نیچے ہوتو وضوٹوٹتا ہے یانہیں؟ بعض آدمی کہتے ہیں کہ مسلم شریف ومشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث شریف موجود ہے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہننے سے وضو باطل ہوجاتا ہے لہذا یہ حدیث شریف ہوتو اس سے مطلع فرمائیں؟

الجواب ___________________

اس امر کی کوئی معتبر دلیل نہیں کہ ٹخنہ سے نیچا پاجامہ پہننے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ٹخنہ سے نیچے پاجامہ رکھنا سخت گناہ ہے لیکن ایسا کرنے سے وضونہیں ٹوٹتا اور جو حدیث کہ ابوداؤدشریف میں ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جو ٹخنہ سے نیچے کپڑا پہنے ہوا تھا وضوکرنے کا حکم دیا، اول تو اس میں ایک راوی ابوجعفر ہے جو مجہول ہے دوسرے اس سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وضوٹوٹ جانے کی وجہ سے حکم دیا تھا ممکن ہے کہ اس کے گناہ کے کفارہ کے لحاظ سے یہ حکم دیا ہو کیوں کہ وضو سے اعضاء کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ فقط۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی: ۲۶۲/۲)

عورت کی ننگی ٹانگ دیکھنے سے وضونہیں ٹوٹتا:

سوال: اگر کوئی بغیر قصد کے کسی عورت کی ننگی ٹانگیں دیکھ لے تو کیا اس کا وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب ___________ حامداً و مصلیاً

کسی عورت کی ننگی ٹانگیں دیکھنے سے وضونہیں ٹوٹتا۔ (۱) واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ دارالافتاء والقضاء جامعہ بنوریہ پاکستان سیریل نمبر: ۷۰۱۳)

بیمار کے ستر کا حصہ دیکھنا یا ہاتھ لگانا ناقض وضو ہے یانہیں:

سوال: مسلمان ڈاکٹر اگر بیمار کے بدن کے ستر کا حصہ دیکھے اور اس کو ہاتھ لگاوے اور وہ پہلے سے باوضو ہوتو اسی وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے یانہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ___________________

صورت مسئولہ میں ستر والا حصہ دیکھنے اور اسے ہاتھ لگانے سے پیشاب کی راہ سے اگر منی، مذی، ودی وغیرہ کوئی ناپاک چیز خارج ہوتو وضوٹوٹ جائے گا محض شرم گاہ وغیرہ دیکھنے اور ہاتھ لگانے سے وضونہیں ٹوٹتا، ہاں دوبارہ

---

(۱) لاینقضہ مس ذکر لکن یغسل یدہ ندباً (وامرأۃ) وأمرد لکن یندب للخروج من الخلاف لاسیما للامام. (درمختار مع الشامی: ۱۴۶/۱ انیس)

وضو کر لینا بہتر ہے۔(لاینقضه مس ذکر لکن یغسل یده ندباً (وامرأة) وأمرد لکن یندب للخروج من الخلاف لاسیما للامام. (درمختار مع الشامی:۱/۱۳۶) فقط واللہ اعلم بالصواب۔(فتاویٰ رحیمیہ:۴/۲۶۸)

کیا شراب پینا ناقض وضو ہے:

سوال:(۱)　ایک شخص کا وضو ہے وضو کی حالت میں اس نے شراب پی لی تو کیا شراب پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

سوال:(۲)　اگر ایک شخص نے اتنی شراب پی کہ نشہ نہ ہوا اور وہ بے ہوش نہ ہوا تو کیا وہ ایسی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے؟(خواجہ عامر حسین عفی عنہ، محلّہ شاہ ولایت، سہارنپور)

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

(۱)　محض شراب پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا جب تک نشہ نہ ہو۔(۱)

(۲)　اگر ایسی حالت میں نماز پڑھے گا تو نماز ہو جائے گی۔

تنبیہ: حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو شخص شراب پیئے اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوگی پھر اگر توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی پھر شراب پیئے تو پھر چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوگی حتی کہ اگر چوتھی مرتبہ پیئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اہل دوزخ کی پیپ پلائیں گے۔(۲)

نیز شراب پینے والے پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے۔(۳) اور بھی مختلف وعیدیں آئیں ہیں اس لیے شراب سے حد درجہ دور رہنا لازم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور، ۳۰/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ، الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ (فتاویٰ محمودیہ:۵/۶۷-۶۸)

(۱)　وینقضه إغماء الخ)(وسکر)هو حالة تعرض للإنسان من امتلاء دماغه من الأبخرة المتصاعدة من الخمر ونحوه فيتعطل معه العقل المميز بين الأمور الحسنة والقبيحة الخ ردالمحتار: ۱/۱۴۴ نواقض الوضوء، سعید، وکذافی الفتاویٰ العالمکیرية: ۱/۱۲، نواقض الوضوء، رشیدیه، وکذافی البحرالرائق: ۱/۶۷، نواقض الوضوء، رشیدیه، وکذافی الحلبی الکبیر: ص ۱۴۰، نواقض الوضوء، سهیل اکیڈمی، لاهور)البتہ منہ ناپاک ہو جاتا ہے کہ شراب نجس ہے اور اس کا پینا حرام ہے۔(قال اللّٰه تعالی: يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ. الآية.(المائدة: ۹۰)

(۲)　عن عبداللّٰه بن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من شرب الخمر لم يقبل اللّٰه له صلوٰة أربعين صباحاً، فان تاب، تاب اللّٰه عليه، فإن عاد لم يقبل اللّٰه له صلوٰة أربعين صباحاً، فان تاب، تاب اللّٰه عليه فان عاد فی الرابعة لم يقبل اللّٰه له صلوٰة أربعين صباحاً فإن تاب لم يتب اللّٰه عليه وسقاه من نهر الخبال" رواه الترمذیؒ ورواه النسائیؒ وابن ماجةؒ والدارمیؒ عن عبد اللّٰه بن عمرؓ، مشکوٰة المصابيح: ۲/۳۱۷، کتاب الحدود، باب بيان الخمر ووعيد شاربها، قديمی.

(۳)　عن عبد اللّٰه بن عبداللّٰه بن عمرؓ عن أبيه أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: لعن اللّٰه الخمر، ولعن شاربها وساقيها، وعاصرها ومعتصرها، وبائعها ومبتاعها، وحاملها والمحمولة اليه وآکل ثمنها" مسندامام احمدبن حنبلؒ: ۲/۲۲۹، مسندعبداللّٰه بن عمربن خطاب رضی اللّٰه عنهما، دارإحياء التراث العربی)

شراب پینے کے بعد نشہ آجائے تو وضوٹوٹ جاتا ہے:

سوال: السلام علیکم! کیا شراب پینے سے وضوٹوٹ جاتا ہے یا باقی رہتا ہے؟ برائے مہربانی اس کے بارے میں بتائیں۔

الجواب ــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

جی ہاں، اگر شراب پینے سے نشہ آجائے تو وضوٹوٹ جاتا ہے۔ **کما فی الدر المختار فی نواقض الوضوء: و(جنون وسکر) بأن یدخل فی مشیه تمایل ولو بأکل الحشیشة. الخ. وفی الرد تحت قوله وسکر هو حالة تعرض للإنسان من امتلاء دماغه من الأبخرة المتصاعدة من الخمر ونحوه فیتعطل منه العقل الممیز بین الأمور الحسنة و القبیحة . إسماعیل عن البرجندی. (۱/۱۷۷)** واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (فتاویٰ دارالافتاء والقضاء جامعہ بنوریہ پاکستان سیریل نمبر: ۱۳۰۵۰)

شراب کی قئے ناقض وضو ہے یا نہیں:

سوال: ایک شخص نے شراب پی اور فوراً اس شراب کی الٹی ہوگئی اور شراب کے علاوہ کوئی دوسری شئی نہیں تو یہ قے ناقض وضو ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداًو مصلیاً

ناقض وضو ہے۔ ’’**ناقض للوضوء وقی خمر إن کان قلیلاً لأنه نجس بالإصالة دون قیء الطعام والماء**‘‘. (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ: ۶۳/۴)

تمباکونوشی اور نسوارکشی سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں:

سوال: تمباکونوشی اور نسوارکشی سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ

تمباکونوشی اور نسوارکشی سے وضونہیں ٹوٹتا۔ (۲) ۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی: ۲۷۲/۲)

---

(۱) کمافی الشامی: ۹۳/۱۔

(۲) عن ابن عباسؓ: أن رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم قال: الوضوء مما خرج و لیس مما دخل. (سنن بیهقی، باب الوضوء من الدم یخرج من أحد السبیلین وغیر ذلک من دودة أو حصاة أو غیر ذلک: ۱۸۸/۱، نمبر ۵۶۸۔) انیس

إن الطهارة ترتفع بضدها وهی النجاسة والقائمة بالخارج لأن الضد هو المؤثر فی رفع ضده اهـ. (ردالمحتار: ۱۴۴/۱۔) انیس

منہ میں نسوار ہوتے ہوئے وضو اور ذکر لسانی کا مسئلہ:

سوال: کیا نسوار سے وضو ٹوٹتا ہے؟ اگر وضو نہیں ٹوٹتا تو کیا نماز کے لیے پانی سے منہ صاف کرنا چاہیے؟ نیز جب منہ میں نسوار ہو تو ذکر کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا توجروا۔ (المستفتی محمد حسین نیسوات قاری ایجنسی۔ ۱۹۸۸/۵/۹ء)

الجواب

چونکہ تمباکو نہ مسکر ہے اور نہ مفتر ہے، لہٰذا اس کا استعمال ناقض وضو نہیں ہے۔(۱) اور چونکہ اس میں بدبو موجود ہے لہٰذا اس کے استعمال کے وقت ذکر لسانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔(۲) وھوالموفق (فتاویٰ دیوبند پاکستان، المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم:۵۱)

نشہ آور دوائیوں کے استعمال کی صورت میں وضو کا حکم:

سوال:۔ آج کل بعض دوائیاں ایسی ہیں جن میں نشہ ہوتا ہے، کیا ان کے استعمال سے وضو متاثر ہوگا یا نہیں؟

الجواب

دوائی اگرچہ بذاتِ خود ناقضِ وضو نہیں مگر جب اس کے نشہ کی وجہ سے انسان پر غشی طاری ہو جائے تو وضو باقی نہیں رہے گا ورنہ بغیر نشہ کے وضو متاثر نہ ہوگا۔

”قال العلامة الحصكفیؒ: وينقضه إغماء ومنه الغشی وجنون وسكر بأن يدخل فی مشيه تمايل ولو بأكل الحشيشة، وقال ابن عابدينؒ: (قوله سكراً) هو حالة تعرض للإنسان من امتلاء دماغه من الأبخرة المتصاعدة من الخمر ونحوه فيتعطل معه العقل المميز بين الأمور الحسنة والقبيحة، ردالمحتار، باب نواقض الوضوء: ج ۱ ص ۱۴۴)(۳)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۳)

حقہ پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: حقہ پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) قال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه: فإنه لم يثبت إسكاره ولا تفتيره ولا إضراره بل ثبت له منافع الخ. (ردالمحتار علیٰ الدر المختار، كتاب الأشربة: ص ۴۵۹ جلد ۵)

(۲) قال الشيخ محمد بن عبداللّٰه النقشبندی: وآداب الذكر... الثانی الغسل للذكر أو الوضوء وكان أبويزيد قدس سره يتوضأ ويغسل فمه بماء ورد كلما أراد الذكر. (البهجة السنية فی آداب النقشبندية: ص ۵۰، آداب الذكر)

(۳) وفی الهندية: والغشی والسكر قال: وحد السكر فی هذا الباب أن لا يعرف الرجل من المرأة وهو اختيار بعض المشائخ، والصحيح مانقل عن شمس الأئمة الحلوانی: أنه إذا دخل فی بعض مشيه تحرك، الفتاوی الهندية: ج ۱ ص ۱۲، الفصل الخامس فی نواقض الوضوء)

الجواب

حقہ پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔(۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۳)

حقہ یا سگریٹ پینے سے وضو کا حکم:

سوال حقہ وسگریٹ پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بدبو کی وجہ سے اگر کراہت ہو تو کلی کرنے سے یہ نقصان ختم ہوسکتا ہے یا نہیں؟ سائل محمد نواز حال مقیم شادمان لاہور۔

الجواب

وضو کرنے کے بعد جب تک کوئی نجاست وغیرہ خارج نہ ہو وضو نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا حقہ وسگریٹ پینے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ البتہ ان کا بلاضرورت پینا مکروہ ہے اور نماز سے پہلے منہ سے بدبو کو زائل کرنا ضروری ہے۔ **إن الطهارة ترتفع بضدها وهي النجاسة والقائمة بالخارج لأن الضد هو المؤثر في رفع ضده اهـ. (شامي: ج ۱ ص ۱۲۴)** فقط واللّٰہ أعلم محمد انور عفا اللہ عنہ، مفتی خیر المدارس ملتان۔ (خیر الفتاویٰ: ۲/۴۷)

گالی اور فحش گوئی سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: وضو کے بعد زبان سے گالی یا اور کوئی فحش کلمہ نکالنے سے وضو میں کیا نقص آتا ہے، کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب

وضو کے بعد گالی دینے سے وضو تو نہیں ٹوٹتا،(۲) لیکن اس کا نور کم ہو جاتا ہے اس لئے دوبارہ کر لینا بہتر ہے۔ **قال في نور الإيضاح وشرحه: وندب الوضوء (إلى أن قال) وبعد كلام غيبة وكذب ونميمة وبعد كل خطيئة (منها الشتيمة وهي السب في الوجه. ظ) وإنشاد شعر قبيح لأن الوضوء يكفر الذنوب الصغائر وقهقهة خارج الصلوٰة لأنها حدث صورةً آه (ص: ۲۹) قلت: والتعليل يفيد الندب ولو كان الرجل على وضوء لأجل تكفير هذه الذنوب وأيضاً فذكر ندبه بعد القهقهة يفيد ندبه ولو كان على وضوء حتماً فكذا قرائنها، والله أعلم ۲۵/ رجب ۴۵ھ** (۳) (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۶ تا ۳۵۷)

(۱-۲) إن الطهارة ترتفع بضدها وهي النجاسة والقائمة بالخارج لأن الضد هو المؤثر في رفع ضده اهـ. (ردالمحتار: ۱/۱۲۴: انیس۔)

(۳) فتاویٰ محمودیہ میں ہے: **گالی دینا ناقضِ وضو نہیں:**

سوال: وضو کرنے کے بعد اگر کوئی شخص گالیاں وغیرہ دیدے تو پھر اس کے لیے وضو کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی اس کا سابقہ وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

گالیاں دینے کا گناہ ہوگا مگر یہ ناقضِ وضو نہیں۔ البتہ وضو کر لینا مستحب ہے۔ (والقسم الثالث: وضوء مندوب...... بعد كلام غيبة وكذب ونميمة بعد كل خطيئة وإنشاد شعر الخ" حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ج ۱ ص ۸۴، الوضوء على ثلاثة أقسام، قديمي، وكذا في الفتاوىٰ العالمكيرية: ۱/۹، مستحبات الوضوء، رشيديه) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند، ۱۴/۸/۸۹ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۶۸)

غیبت کے بعد وضو کا حکم:

سوال: بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اسکے بعد وضو کرنا ضروری ہے، کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟ اگر درست ہے تو غیبت کی وجہ سے وضو واجب ہے یا سنت یا مستحب؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

وضو مستحب ہے ''ویستحب الوضوء بعد کلام غیبة''. (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ: ۴/۴۲)

موسیقی سننے اور دیکھنے پر وضو:

سوال: کیا ریڈیو پر موسیقی سننے یا موسیقی کے آلات بجانے، یا ٹی وی وغیرہ دیکھنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ (سمیع الدین خاں، احمد نگر)

الجوابــــــــــــــــ

ان باتوں سے وضو تو نہیں ٹوٹتا، (۲) البتہ فقہا نے لکھا ہے کہ گانا گائے تو تازہ وضو کر لینا مستحب ہے، کیونکہ زبان ایک گناہ سے آلودہ ہوتی ہے، لہذا موسیقی بجانے کے بعد وضو کرنا مستحب ہوگا، اور چونکہ موسیقی سننے یا دیکھنے میں بھی کان اور آنکھ گنہگار ہوتے ہیں اور وضو گناہوں کے لئے کفارہ ہوتا ہے، اس لئے ان صورتوں میں بھی وضو کر لینا مستحب ہے، واجب نہیں۔ (۳) (کتاب الفتاویٰ: ۲/۴۴-۴۵)

کیا ٹی وی دیکھنا ناقض وضو ہے:

سوال: کیا ٹی وی دیکھنا ناقض وضو ہے؟ (نوید عزیز، نالندہ)

الجوابــــــــــــــــ

جسم کے کسی حصہ سے کسی نجاست کا نکلنا، یا پیشاب و پاخانہ کے مقام سے کسی بھی چیز کا نکلنا ناقض وضو ہے، محض کسی خراب چیز کو دیکھنے کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا، جب تک کہ ایسی کوئی چیز جسم سے خارج نہ ہو، اس لئے ٹی وی، اور تصویریں خواہ فحش ہوں، کے دیکھنے سے وضو نہیں ٹوٹے گا، (۴) ہاں! وضو کے اندر گناہوں کے کفارہ ہونے کی صلاحیت ہے اس

---

(۱) کما فی نور الإیضاح: ۱/۴۶۔

(۲) إن الطهارة ترتفع بضدها وهی النجاسة والقائمة بالخارج لأن الضد هو المؤثر فی رفع ضده اهـ. (ردالمحتار: ۱/۱۲۴: انیس۔)

(۳) والقسم الثالث: وضوء مندوب...... بعد کلام غیبة و کذب و نمیمة بعد کل خطیئة و إنشاد شعر الخ'' حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح: ج ۱ ص ۸۴، الوضوء علی ثلاثة أقسام انیس۔

نیت سے وضو کر لینا مناسب ہوگا۔(۱)(کتاب الفتاویٰ:۴۶/۲)

فلم بینی سے وضو متاثر نہیں ہوتا:

سوال:۔ٹی وی، وی سی آر اور فلم بینی وغیرہ سے وضو پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــــــ

ٹی وی، وی سی آر یا فلم وغیرہ دیکھنا امورِ فسقیہ ہیں، اس عمل سے انسان گناہ کا مرتکب ہوجاتا ہے لیکن اس سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ مستحب یہ ہے کہ گناہ کے ان کاموں کے ارتکاب کے بعد وضو کر لیا جائے۔

"لما قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ومندوب للنوم علیٰ طهارة وإذا استيقظ منه...... وبعد غيبة وكذب ونميمة وكل خطيئة الخ،(نور الايضاح: ص ۳۴ فصل الوضوء علیٰ ثلاثة أقسام) (۲)(فتاویٰ حقانیہ جلد دوم صفحہ ۵۱۴)

کیا جمعہ کی نماز کے بعد جنازہ کی نماز پڑھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے:

سوال: ہمارے یہاں ایک امام صاحب فرماتے ہیں کہ جمعہ کی فرض نماز کے بعد جنازہ کی نماز پڑھانے سے وضو ٹوٹ جائے گا اور قصداً نماز پڑھائے گا تو کافر ہوجائے گا، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ وباللّٰہ التوفیق

آپ کے امام سخت قسم کے جاہل ہیں جو نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ پڑھانے کو کفر کہتے ہیں، اگر جنازہ آیا ہو تو نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ پڑھنا، پڑھانا فرض ہے، اس سے نہ وضو ٹوٹے گا(۳) نہ کوئی کافر ہوگا، اپنے جاہل امام سے توبہ کرائیے اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کو امامت سے علیٰحدہ کر دیجئے، مسلمانوں کو کافر بنانے والا مسلمانوں کا امام نہیں ہوسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد عثمان غنی، ۹/۵/۱۳۷۳ھ (فتاویٰ امارت شرعیہ:۲/۶۶۔۶۷)

---

(۱) ومندوب للنوم علیٰ طهارة وإذا استيقظ منه...... وبعد غيبة وكذب ونميمة وكل خطيئة الخ،(نور الايضاح: ص ۳۴، فصل الوضوء علیٰ ثلاثة أقسام)، قال قاضی خانؒ: ومندوب...... ومنها الوضوء بعد الغيبة وبعد إنشاد الشعر،(فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندية: ج ۱ ص ۳۲ باب الوضوء والغسل فيه سبعة فصول، ومثله فی الهندية: ج ۱ ص ۹، الفصل الثالث فی المستحبات) انیس۔

(۲) (قال قاضی خانؒ: ومندوب...... ومنها الوضوء بعد الغيبة وبعد إنشاد الشعر،(فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندية: ج ۱ ص ۳۲ باب الوضوء والغسل فيه سبعة فصول، ومثله فی الهندية: ج ۱ ص ۹، الفصل الثالث فی المستحبات)

(۳) إن الطهارة ترتفع بضدها وهی النجاسة والقائمة بالخارج لأن الضد هو المؤثر فی رفع ضده اهـ.(ردالمحتار: ۱۲۴/۱: انیس۔)

بعد وضو، پانی سے استنجا پاک کرنے سے، وضو کا لَو ٹا لینا اچھا ہے:

سوال: بعد وضوا گر یاد آوے کہ چھوٹا یا بڑا استنجاء پاک کرنا ہے تو پاک کرنے کے بعد وضو سابقہ باقی رہ سکتا ہے یا جدید وضو کی ضرورت ہے؟

الجواب

بہتر یہ ہے کہ پھر وضو کرے تا کہ اختلاف سے نکل جاوے۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم:۱/۱۴۲)

بچہ کا پاخانہ صاف کرنا ناقض وضو نہیں:

سوال: ایک عورت وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہونے والی تھی کہ اس کے بچہ نے پاخانہ کر دیا اس کو صاف کرنے کے بعد اس نے چاہا کہ نماز پڑھ لوں مگر ایک مولوی جی نے کہا کہ تمہارا وضو ختم ہو گیا ہے، تو کیا اس صورت میں وضو ختم ہو گیا یا باقی ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

بچہ کا پاخانہ صاف کرنا ناقض وضو نہیں ہے(۲) اسی وضو سے بلا تکلف نماز درست ہے۔(۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیو بند (فتاویٰ محمودیہ:۵/۷۴)

اثنائے وضو میں اعضا کا خشک کرتے جانا کیسا ہے:

سوال:(۱) جو شخص بلا عذر یا بعذر مرض فالج اپنے ہر ایک عضو کو مکمل طور پر دھو کر قبل اختتام وضو دُھلے ہوئے اعضا کو کسی کپڑے سے پونچھ لیتا ہے اور قبل اختتام وضو اس کے بعض اعضا خشک ہو جاتے ہیں آیا ایسے شخص کا وضو کامل متصور ہو گا یا ناقص اور ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں، ایسے وضو سے نماز ہو گی یا نہیں؟

اعضائے وضو کا کوئی حصہ خشک رہ جائے تو وضو ہوا یا نہیں:

سوال:(۲) دوران وضو میں اگر کوئی حصہ کسی عضو کا خشک رہ جاوے اور اس پر پانی نہ پہنچے تو یہ وضو درست

---

(۱) لاینقضہ مس ذکر لکن یغسل یدہ ندباً و امرأۃ و أمرد لکن یندب للخروج من الخلاف لاسیما للإمام (الدر المختار علیٰ هامش ردالمحتار نواقض الوضوء مطلب فی ندب مراعاۃ الخلاف:۱/۱۳٦، ظفیر۔

(۲) إن الطهارۃ ترتفع بضدها وهی النجاسۃ والقائمۃ بالخارج لأن الضد هو المؤثر فی رفع ضدہ اهـ. (ردالمحتار: ۱/۱۲۴) اپنے ہاتھ سے کسی نجس چیز پاخانہ، پیشاب، خنزیر، شراب یا کتا، بلی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، البتہ نجاست اگر لگ جائے تو ہاتھ دھو لینا واجب ہے۔(طہارت کے احکام ومسائل:۱۳۴۔ انیس)

(۳) گندگی کا اٹھا کر گرانا وغیرہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ خروج ناقض وضو ہے۔

ہے یا نہیں اور اگر دھلنے اور تر ہو جانے کے بعد خود بخود خشک ہو جائے تو کیا اس پر دوبارہ پانی پہونچانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب

ا۔عذر کی وجہ سے ایسا کرنا جائز بلا کراہت ہے اور وضو اس کا کامل ہے اور نماز اس سے درست ہے اور بلا عذر ایسا کرنا البتہ خلاف سنت ہے نماز پھر بھی اس وضو سے صحیح ہے۔ **كذا في الدر المختار**.(۱)

۲-اس صورت میں وضو درست نہیں ہے، ضروری ہے کہ جس حصہ عضو پر پانی نہیں پہنچا اور وہ خشک رہ گیا اس پر پانی بہاوے پھر وضو صحیح ہو جاوے گا۔(۲) اور اگر کوئی عضو یا حصہ دُھلنے اور تر ہونے کے بعد خشک ہو گیا تو اس سے وضو میں کچھ خلل نہیں آیا وضو صحیح ہے۔(۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم:۱/۱۴۷)

فضلات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نواقض وضو:

سوال: زید کہتا ہے کہ فضلات (یعنی بول و براز وریم وخون) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طاہر تھے۔آپ کے حق میں ناقض وضو وغسل کچھ نہ تھے، آپؐ کا وضو وغسل **تعليماً للأمة** تھا۔عمر اس کے مخالف ہے؟

الجواب

شامی میں منقول ہے: **صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال أبو حنيفةؒ كما نقله في مواهب اللدنية عن شرح البخاري للعينيؒ الخ**.(۴) **وأيضاً فيه من نواقض الوضوء: عن القهستاني لانقض من الأنبياء عليهم الصلوة والسلام ومقتضاه التعميم في كل النواقض لكن نقل عن شرح الشفاء لملا علي القاريؒ: الإجماع على أنه صلى الله عليه وسلم في نواقض الوضوء كالأمة إلا ما صح من استثناء النوم**.(۵)

---

(۱) والولاء غسل المتاخر أومسحه قبل جفاف الأول بلاعذر حتى لوفني مائه فمضى بطلبه لابأس به. (الدرالمختار مع ردالمحتار سنن الوضوء:۱/۱۱۴، ظفیر۔

(۲) وإن بقي من موضع الوضوء قدر رأس إبرة أولزق بأصل ظفره طين يابس أورطب لم يجز. (عالمگیری مصری:۱/۴، ظفیر)

(۳) ومنها الموالاة وهي التتابع وحده أن لايجف الماء على العضو قبل أن يغسل مابعده في زمان معتدل ولااعتبار بشدة الحر والرياح ولاشدة البرد ويعتبر أيضاً استواء حالة المتوضى كذافي الجوهرة النيرة. (عالمگیری فصل ثانی سنن الوضوء:۱/۸، ظفیر)

(۴) ردالمحتار باب الأنجاس مطلب في طهارة بوله صلى الله عليه وسلم:۱/۲۹۳۔ظفیر۔

(۵) ردالمحتار، نواقض الوضوء، مطلب: نوم الأنبياء غير ناقض:۱/۱۳۳۔ظفیر۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ راجح قول بول و براز و دیگر فضلات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں طہارت کا ہے اور نواقض وضو و موجبات غسل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثل تمام امت کے ہیں اور اس پر اجماع ہے مگر نوم میں کہ نوم سے آپ کا وضو نہ ٹوٹتا تھا اور یہ جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے ہے کہ نوم انبیاء کرام علیہم السلام ناقض وضو نہیں ہے، **كذا في الدر المختار**. (۱) فقط (فتاویٰ دار العلوم: ۱/۱۴۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کی طہارت اور آپ کے حق میں ان کے ناقض وضو ہونے کی تحقیق:

سوال: بعد ہدیۂ سنیہ وتحفۂ بہیہ مرضیہ آنکہ واعظے دراثناء وعظ گفتہ کہ فضلات یعنی بول و براز وریم وخون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طیب وطاہر بودند، وشفاء و دوا بودند، درحق شاں ناقض وضو وغسل ہم نبودند، آنچہ وضو وغسل آزاں حضرت منقول است آں تعلیماً لامتہ فرمودہ بودند، ایں مسئلہ گرفتہ مابین جہال بلکہ بعض خواص بسیار قیل وقال می شود، رائے اکثر بلکہ کل براین ست کہ آنچہ حضرت فیض درجت تحریر فرمایند عمل واعتقاد کردہ شود لہذا حضور موفور السرور را تصدیعہ دادہ می شود کہ ایں مسئلہ را از کتب صحاح وتفسیر وفقہ حنفیہ مفصل ومدلل ارقام فرمودہ تسلی فرمایند ونیز تفصیل فرمایند کہ طہارت شان لذاتہ ولغیرہ عام بود یا خاص و باز طہارت شان موقوف بوقت خاص شدہ یا علی الاطلاق، **والأجر على الله الأكبر؟**

الجواب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات تو طاہر ہیں، جمہور علما اس طرف گئے ہیں لیکن یہ کہ ان کا خروج آپ کے بارے میں ناقض وضو نہ تھا یا موجب غسل نہ تھا غلط ہے، (۲) حدیث صحیح میں جسکو بخاریؒ ومسلمؒ نے روایت کیا ہے وارد ہے کہ **أن النبي صلى الله عليه وسلم خرج وقد أقيمت الصلوة وعدلت الصفوف حتى إذا قام في مصلاه انتظرنا أن يكبر انصرف وفي رواية أبي داؤدؒ: ودخل في صلوة الفجر فكبر، قال: على مكانكم فمكثنا على هيئتنا حتى خرج إلينا ينطف رأسه ماءً وقد اغتسل آه زاد الدارقطنيؒ فقال: إني كنت جنباً فنسيت أن اغتسل.** (فتح الباری: ۲/۱۰۲) اگر آپ نے نماز شروع کردی تھی اور پھر غسل کے لئے قطع کی تو ظاہر ہے کہ جنابت آپ کے لئے موجب غسل تھی جب ہی تو نماز کو قطع کرنا جائز ہوا، ورنہ ایک امر مندوب کے

---

(۱) **والعته لا ينقض كنوم الأنبياء عليهم الصلوٰة والسلام.** (الدر المختار على هامش رد المحتار، نواقض الوضوء مطلب نوم الأنبياء غير ناقض: ۱/۱۳۳، ظفیر۔

(۲) قرآنی آیت ہے: اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا. (سورۃ المائدۃ: ۶) اس آیت میں اشارہ ہے کہ پیشاب و پاخانہ کے راستے سے جو کچھ نکلے اس سے وضو ٹوٹ جائے گا اور پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کرنا ہے، اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ انیس۔

لئے نماز قطع نہیں ہوسکتی اور اگر نماز شروع بھی نہ کی ہو تب بھی مقتدیوں کو اتنی دیر تک انتظار میں کھڑا رکھنا بدون کسی ضرورت شدیدہ کے نہیں ہوسکتا، معلوم ہوا کہ جنابت سے آپ کے ذمہ بھی غسل واجب ہوتا تھا، اور حضرت علیؓ سے مروی ہے: **كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقرئنا القرآن على كل حال مالم يكن جنباً. صححه ابن حبانؒ والترمذيؒ كذافي بلوغ المرام: ص ١٨ ج ١.** اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان احکام کے پابند تھے، ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب فرما رہے تھے، ایک شخص نے سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً جواب نہیں دیا بلکہ استبراء کے بعد دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کے بعد جواب دیا اور فرمایا: **"كرهت أن أذكر الله إلاعلى طهارة".** (رواه أبو داؤد ص ا ج ا) اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب کر کے آپ کا وضو اور طہارت بھی زائل ہو جاتا تھا، اور علما نے احکام کے متعلق قاعدہ مقرر فرمایا ہے: **لا يثبت الخصوصية إلابدليل.** اس لئے احکام نواقض وضو و موجبات غسل وغیرہ میں جملہ ائمہ اربعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے استدلال کیا ہے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ محض فضلات کے طاہر ہونے سے ان امور کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں غیر ناقض وضو یا غیر موجب غسل کہے، ہٰذا، واللہ اعلم، ۵؍ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ۔ (امداد الاحکام جلد اول ص ۳۵۰ و ۳۵۱)

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ المستفتی حضرت شیر، محطۃ الملاح، خمیس مشط سعودی عرب۔ ۱۹۸۶/۷/۶ء۔

الجواب

یہ ناقض وضو نہیں ہے، **إلا أن الوضوء أفضل خروجاً من اختلاف العلماء.** (۱) وهو الموفق (فتاویٰ دیوبند پاکستان المعروف بہ فتاویٰ فریدیہ جلد دوم: ۴۳)

---

(۱) قال العلامة محمد فريد: ذهب أحمدبن حنبل إلى وجوب الوضوء من لحم الإبل مطبوخاً كان أونيا وله فيما سوى اللحم من الكبد والطحال والكرش وغيره قولان، وقال: أي أحمد في الوضوء من لحوم الإبل حديثان صحيحان عن النبي صلى الله عليه وسلم حديث البراء وحديث جابربن سمرة كذا في المغني، وقال الشاه ولي الله: السرفي إيجاب الوضوء منها أنهاكانت محرمة في التوراة فلما أباحها اللّٰه لنا شرع الوضوء لنا شكراً لما أنعم علينا وعلاجاً لما عسىٰ أن يختلج في بعض الصدور من إباحتها بعد ماحرمها الأنبياء وذهب الجمهور إلى عدم وجوب الوضوء من لحم الإبل لحديث: الوضوء مماخرج وليس ممادخل، رواه الطبراني في الكبير، ولأن لحم الإبل من الطيبات فلا يتوضأمنه ألا ترى أن أبياً وأباطلحة أنكرا على أنس بن مالك رضى الله عنهم حين أراد الوضوء من الخبزواللحم وقالا تتوضأ من الطيبات لم يتوضأ منه من هو خيرمنك، رواه أحمد، والجواب عن حديث "توضؤوامنها" أن جمهورالصحابة والتابعين أعرضوا عن الأخذ بظاهره فهي قرينة قوية على أن المراد منه الوضوء اللغوي أي غسل اليد والفم وثبت الوضوء اللغوي في عرف الشرع ولسان الحديث كما في حديث عكراش رواه الترمذي بسندضعيف............. ==

قہقہہ کی کتنی مقدار ناقض وضو ہے:

سوال: قہقہہ جو ناقض وضو ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی آواز اسکی کتنی بلند ہو کہ اس پر قہقہہ کا اطلاق کیا جائے گا؟

الجواب ــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

قہقہہ کا اطلاق آواز پر ہوگا جس کو وہ خود سنے اور اس کے پڑوسی سن لیں۔ ''وهي ما يكون مسموعاً له ولجيرانه سواء''. (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ العبد حبیب اللہ القاسمی (حبیب الفتاویٰ: ۴/۴۴)

قہقہہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے:

سوال: رکوع سجدہ والی نماز میں بالغ مرد کے قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حالانکہ نماز میں ہنسی کا واقعہ عملاً شاید ظہور پذیر ہوتا ہے میرے علم میں تو ایسا واقعہ پیش نہیں آیا ہے پھر یہ کہ اس صورت میں کسی چیز کا جسم سے اخراج بھی نہیں ہوتا ہے کہ وضو ٹوٹ جائے اس طرح یہ ایک غیر عقلی بات ہے اس لیے لامحالہ اس کے لیے کوئی نص ہونی چاہیے جب ہی یہ عمل لائق اتباع ہوسکتا ہے؟

الجواب ــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

اس مسئلہ سے متعلق متعدد صحابہؓ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث نقل کی ہیں، امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ: ۱/۴۷ سے صفحہ: ۵۰ تک ان کو سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (۲) مراسیل ان کے علاوہ ہیں جو صفحہ: ۵۴ تک ہیں جن صحابۂ کرام نے مرفوعاً احادیث نقل کی ہیں ان کے اسماء یہ ہیں، حضرت ابوموسی اشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت

== وكما في حديث أبي أمامة ''إذا كان أحدكم على وضوء فأكل طعاما فلا يتوضأ إلا أن يكون لبن الإبل إذا شربتموه فتمضمضوا بالماء'' رواه في كنز العمال وكمافي حديث معاذبن جبل قال: نسمي غسل الفم واليد وضوءً وليس بواجب وكما في حديث عبدالله بن مسعود أنه غسل يديه من طعام ثم مسح وجهه وقال هذا وضوء من لم يحدث، أخرجها الزيلعي في نصب الراية، والحكمة فيه أن له دسماً وزهومةً ولوسلم أن المراد منه المعنى الشرعي فيكون منسوخاً لعموم قوله عليه الصلوٰة والسلام كان آخر الأمرين ترك الوضوء مماغيرت النارإياها وكذالشمول الطيبات إياها. (منهاج السنن شرح جامع السنن ص۱۹۸.۱۹۹ جلد۱، باب الوضوء من لحوم الإبل)

(۱) كمافي مجمع الأنهر: ۱/۲۰۔

(۲) ومن جملة مارواه ''روى أن أعمى تردى في بئر...والنبي صلى الله عليه وسلم يصلي بأصحابه فضحك بعض من كان يصلي معه عليه الصلوٰة والسلام فأمر النبي صلى الله عليه وسلم من كان ضحك منهم أن يعيدالوضوء ويعيدالصلوٰة''. (نصب الراية، فصل في نواقض الوضوء: ۱/۹۵.۹۲، مكتبه حقانيه، پشاور، وكذافي بدائع الصنائع: ۱/۲۵۵، فصل وأمابيان ماينقض الوضوء الخ، دارالكتاب العلميه، بيروت)

ابوالملیحؒ۔ نیز اس مسئلہ پر مستقل رسالہ ہے جس کا نام: ''السهسهة فی نقض الوضوء بالقهقهة''.(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند ۵/۱۱/۹۵ھ (فتاویٰ محمودیہ: ۳/۵-۷۴)

قہقہہ سے نماز جنازہ ٹوٹنے اور وضو نہ ٹوٹنے کی کیا وجہ ہے:

سوال: اگر باوضو شخص خارج نماز سے قہقہہ مار کر ہنسے تو وضو نہیں ٹوٹتا اور اگر نماز میں قہقہہ مار کر ہنسے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز جنازہ میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے نماز ٹوٹتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی کیا وجہ ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟

الجواب

قیاس عقلی یہ ہے کہ قہقہہ سے وضو بالکل نہ ٹوٹے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گیا کہ آپ نے ایک شخص کو قہقہہ کرنے کی وجہ سے اعادۂ وضو و نماز کا حکم فرمایا ہے، اس لیے اس حکم کا ماننا مسلمان پر ضروری ہو گیا، اگرچہ اس کے ناقص فہم میں اس کی حکمت نہ آوے، لیکن چونکہ یہ حکم قیاس ظاہری کے خلاف ہے، اس لیے جس موقع پر وارد ہوا ہے اسی پر رکھا جائے گا، دوسرے مواقع پر نقض وضو کا حکم نہ کیا جائے گا اگرچہ ان میں قہقہہ کرنا بہ نسبت اس کے زیادہ قبیح ہو۔ مثلاً نماز جنازہ میں قہقہہ کرنا، یہی قاعدہ ہے اصول کا کہ جو حکم قیاسی نہیں ہوتا اس کو اپنے موقع سے متجاوز نہیں کرتے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم: ۱/۱۴۸)

---

(۱) مجموعہ رسائل للکنوی: ۵/۳، السهسهة فی نقض الوضوء بالقهقهة، ادارة القرآن، کراچی.

(۲) المعانی الناقضة للوضوء الخ القهقهة فی صلوٰة ذات رکوع وسجود والقیاس أنها لاتنقض الخ وبمثله یترک القیاس والأثر ورد فی صلوٰة مطلقة فیقتصر علیها (هدایه فصل فی نواقض الوضوء: ۱/۳۶) فلایتعدی إلی صلوٰة الجنازة وسجدة التلاوة وصلوٰة الصبی (حاشیة هدایة: ۱/۳۶) ہدایہ بھی ہندوستان کے مختلف مطابع نے چھاپی ہیں خاکسار نے صفحات کا حوالہ مطبوعہ یوسفی سے لیا ہے۔ ظفیر)

حدیث میں ہے: عن أبی العالیة، و أنس بن مالکؓ: أن أعمی تردی فی بئر فضحک ناس خلف رسول اللہ ﷺ فأمر رسول اللّٰه صلی اللہ علیه وسلم من ضحک أن یعید الوضوء و الصلاة ۔(الدارالقطنی، باب أحادیث القهقهة فی الصلاة وعللها، ج اول، ص ۱۷۰، نمبر ۵۹۳/ سنن بیهقی، باب ترک الوضوء من القهقهة فی الصلوة، ج اول، ص ۲۲۶، نمبر ۶۷۹) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ زور سے ہنسنے سے نماز تو ٹوٹے گی ہی لیکن وضو بھی ٹوٹ جائے گا۔ انیس۔

مصادر ومراجع

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف، مؤلف	تاریخ وفات
	قرآن وتفسیر		
(۱)	القرآن الکریم	کتاب اللہ	
(۲)	جامع البیان فی تفسیر القرآن	محمد بن جریر بن یزید بن کثیر، ابوجعفر الطبری	۳۱۰ھ
(۳)	احکام القرآن للجصاص	احمد بن علی، ابوبکر الرازی	۳۷۰ھ
(۴)	تفسیر کبیر	ابوعبداللہ، محمد بن عمر بن حسین بن حسن الرازی، فخر الدین	۶۰۶ھ
(۵)	الجامع لاحکام القرآن	محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الاندلسی الانصاری	۶۷۱ھ
(۶)	تفسیر قرطبی، الجامع لاحکام القرآن	ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی	۶۷۱ھ
(۷)	تفسیر القرآن العظیم	اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر، ابوالفداء، البصروی	۷۷۴ھ
(۸)	روح المعانی	محمود بن عبداللہ، شہاب الدین، ابوالثناء الحسینی الآلوسی	۱۲۷۰ھ
(۹)	تفسیر المنار	محمد رشید رضا	۱۳۵۴ھ
(۱۰)	مناہل العرفان فی علوم القرآن	محمد عبدالعظیم الزرقانی	۱۳۶۷ھ
(۱۱)	معارف القرآن	محمد شفیع دیوبندی	۱۳۹۶ھ
(۱۲)	قرآن فہمی کے بنیادی اصول	ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مدیر ماہنامہ محدث لاہور	مدظلہ
	حدیث واصول حدیث		
(۱۳)	مؤطا مالک	امام دارالہجرہ مالک بن انس	۱۷۹ھ
(۱۴)	مصنف ابن أبی شیبۃ	حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبۃ، ابراہیم بن عثمان بن خورستی	۲۳۵ھ
(۱۵)	مسند احمد	الامام احمد بن حنبل	۲۴۱ھ
(۱۶)	صحیح بخاری	ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری	۲۵۶ھ
(۱۷)	صحیح مسلم	مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری	۲۶۱ھ
(۱۸)	سنن ابن ماجہ	حافظ ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی، ابن ماجہ	۲۷۳ھ
(۱۹)	سنن ابی داؤد	امام حافظ سلیمان بن الاشعث السجستانی الأزدی	۲۷۵ھ
(۲۰)	سنن ترمذی	ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ

(۲۱)	معجم الطبرانی الکبیر	سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطر، ابوالقاسم الطبرانی	۳۶۰ھ
(۲۲)	المستدرک علی الصحیحین	محمد بن عبداللہ بن حمدویہ، الحاکم النیسافوری	۴۰۵ھ
(۲۳)	سنن البیہقی	ابوبکر احمد بن الحسین بن علی بن موسیٰ الخراسانی البیہقی	۴۵۸ھ
(۲۴)	جامع بیان العلم	لابن عبدالبر المالکی، یوسف بن عبداللہ	۴۶۳ھ
(۲۵)	سنن الدارمی	عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام التمیمی السمرقندی الدارمی	۵۵۲ھ
(۲۶)	کنز العمال	علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی	۵۷۹ھ
(۲۷)	شرح مسلم	ابوزکریا یحیی بن شرف بن مری بن حسن نووی	۶۷۶ھ
(۲۸)	مشکوٰۃ المصابیح	ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی	۷۲۰ھ
(۲۹)	تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی	جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
(۳۰)	مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح	علی بن سلطان محمد القاری	۱۰۱۴ھ
(۳۱)	مجمع الزوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد	العلامۃ محمد بن محمد سلیمان المغربی	۱۰۹۴ھ
(۳۲)	التعلیق الممجد علی مؤطا الامام محمد	علامہ ابوالحسن محمد عبدالحی اللکنوی	۱۳۰۴ھ
(۳۳)	المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی الشریف	ارندجان فنسنک	۱۹۳۹ء
(۳۴)	فتح الملہم	علامہ شبیر احمد عثمانی	۱۳۶۹ھ
(۳۵)	انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری	مولانا سید احمد رضا بجنوری تلمیذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ	
(۳۶)	تکملہ فتح الملہم	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	مدظلہ

کتب فقہ

(۳۷)	الأم	امام محمد بن ادریس الشافعی	۲۰۴ھ
(۳۸)	القدوری	محمد بن احمد بن جعفر بن حمدان القدوری	۴۲۸ھ
(۳۹)	خلاصۃ الفتاوی	طاہر بن احمد بن عبدالرشید البخاری	۵۴۲ھ
(۴۰)	بدائع الصنائع	علامہ علاء الدین الکاسانی	۵۸۷ھ
(۴۱)	الھدایۃ	برہان الدین ابوالحسن علی المرغینانی	۵۹۳ھ
(۴۲)	المغنی	ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ المقدسی	۶۲۰ھ
(۴۳)	فتاوی ابن الصلاح	ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن بن موسیٰ تقی الدین	۶۴۳ھ
(۴۴)	المجموع شرح المھذب	ابوزکریا محی الدین بن شرف بن مری بن حسن نووی	۶۷۶ھ
(۴۵)	اعلام الموقعین عن رب العالمین	ابن القیم الجوزیۃ، محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد زرعی	۷۵۱ھ
(۴۶)	تبصرۃ الحکام	ابراہیم بن علی بن محمد بن ابی القاسم بن محمد بن فرحون مالکی	۷۹۹ھ
(۴۷)	مجموع فتاویٰ ابن تیمیۃ	ابوالعباس تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ	۸۲۸ھ
(۴۸)	معین الحکام	علامہ ابوالحسن علی بن خلیل الطرابلسی	۸۴۴ھ
(۴۹)	فتح القدیر	کمال الدین محمد بن عبدالواحد بن عبدالحمید، ابن ہمام	۶۸۱ھ

	کتاب	مصنف	سن
(۵۰)	الفتاویٰ التاتارخانیۃ	علامہ عالم بن العلاء الانصاری الدہلوی	۷۸۶ھ
(۵۱)	غنیۃ المستملی المعروف بالکبیری	ابراہیم بن محمد چلپی حنفی	۹۵۶ھ
(۵۲)	منیۃ المصلی	ابراہیم بن محمد چلپی حنفی	۹۵۶ھ
(۵۳)	البحر الرائق	ابن نجیم زین العابدین بن ابراہیم المصری	۹۷۰ھ
(۵۴)	الفتاوی الھندیہ (عالمگیریہ)	شیخ نظام الدین برہان پوری گجرات و جماعۃ من اعلام فقہاء الھند	
(۵۵)	السراج الوھاج	ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی العبادی	۸۰۰ھ
(۵۶)	الفتح الکبیر فی ضم الزیادۃ الی الجامع الصغیر	جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
(۵۷)	نہایۃ المحتاج	محمد بن احمد بن حمزہ، شمس الدین الرملی	۱۰۰۴ھ
(۵۸)	النھر الفائق شرح کنز الدقائق	علامہ عمر بن نجیم المصری	۱۰۰۵ھ
(۵۹)	شرح فقہ اکبر	علی بن سلطان القاری	۱۰۱۴ھ
(۶۰)	کشاف القناع عن متن الاقناع	منصور بن یونس بن صلاح الدین بن حسن بن ادریس البہوتی	۱۰۵۱ھ
(۶۱)	نور الایضاح	ابوالاخلاص حسن بن عمار الشرنبلالی	۱۰۶۹ھ
(۶۲)	مراقی الفلاح	ابوالاخلاص حسن بن عمار الشرنبلالی	۱۰۶۹ھ
(۶۳)	مجمع الأنھر فی شرح ملتقی الابحر	عبداللہ بن شیخ محمد بن سلیمان المعروف بشیخی زادہ	۱۰۷۸ھ
(۶۴)	الفتاویٰ الخیریۃ	خیرالدین بن احمد بن نورالدین علی ایوبی علیمی فاروقی الرملی	۱۰۸۱ھ
(۶۵)	الدر المختار فی شرح تنویر الابصار	علامہ محمد بن علی علاء الدین الحصکفی	۱۰۸۸ھ
(۶۶)	حاشیۃ الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح	علامہ السید احمد بن محمد الطحطاوی	۱۲۲۱ھ
(۶۷)	حاشیۃ الدر المختار	علامہ السید احمد بن محمد الطحطاوی	۱۲۲۱ھ
(۶۸)	رد المحتار حاشیۃ الدر المختار	علامہ محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین الشامی	۱۲۵۲ھ
(۶۹)	منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق	علامہ محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین الشامی	۱۲۵۲ھ
(۷۰)	السعایۃ شرح شرح الوقایۃ	علامہ ابوالحسن محمد عبدالحی اللکنوی	۱۳۰۴ھ
(۷۱)	المدخل الی مذھب الامام احمد بن حنبل	عبدالقادر بن احمد بن مصطفیٰ بن عبدالرحیم بن محمد، ابن بدران	۱۳۴۶ھ
(۷۲)	تکملہ الفتح الکبیر للسیوطی	یوسف النبہانی	۱۹۳۲ء
(۷۳)	موسوعۃ الفقہ الاسلامی	الشیخ محمد احمد مصطفیٰ احمد المعروف بابی زہرہ	۱۳۹۴ھ
(۷۴)	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارت اوقاف کویت	اردو
(۷۵)	اسلامی عدالت	قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	۲۰۰۲ء
(۷۶)	الفقہ الاسلامی وادلتہ	ڈاکٹر وہبہ مصطفیٰ زحیلی	مدظلہ
(۷۷)	طہارت کے احکام ومسائل	مولانا انیس الرحمٰن قاسمی	مدظلہ
(۷۸)	ثمرۃ الایضاح شرح نور الایضاح	مولانا ثمیر الدین قاسمی لندن	مدظلہ

اصول فقہ

نمبر	کتاب	مصنف	سن وفات
(۷۹)	الرسالۃ	امام محمد بن ادریس الشافعی	۲۰۴ھ
(۸۰)	منحۃ المعبود	سلیمان بن داؤد الطیالسی	۲۰۴ھ
(۸۱)	البرہان	امام الحرمین الجوینی عبداللہ بن یوسف بن محمد بن حیویہ	۴۳۸ھ
(۸۲)	اصول السرخسی	محمد بن احمد بن ابی سہیل، ابوبکر، سرخسی	۴۸۳ھ
(۸۳)	المحصول فی علم اصول الفقہ	محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین بن علی التیمی البکری الرازی	۶۰۶ھ
(۸۴)	روضۃ الناظر وجنۃ المناظر فی اُصول الفقہ	ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ المقدسی	۶۲۰ھ
(۸۵)	الاحکام فی اصول الاحکام	امام علی بن محمد بن سالم التعلبی ابوالحسن سیف الدین الآمدی	۶۳۱ھ
(۸۶)	ادب المفتی والمستفتی	ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن بن موسیٰ تقی الدین، ابن صلاح	۶۴۳ھ
(۸۷)	جمع الجوامع فی اصول الفقہ	عبدالوھاب بن علی بن عبدالکافی بن تمام السبکی الانصاری، تاج الدین	۷۷۱ھ
(۸۸)	آداب المفتی والمستفتی، مقدمہ شرح المھذب	ابوزکریا یحیٰ بن شرف بن مری بن حسن نووی	۶۷۶ھ
(۸۹)	التحریر فی اصول الفقہ	کمال الدین محمد بن عبدالواحد بن عبدالحمید، ابن ہمام	۶۸۱ھ
(۹۰)	الفروق	ابوالعباس احمد بن ادریس بن عبدالرحمٰن القرافی	۶۸۴ھ
(۹۱)	شرح المنہاج علی منہاج الوصول	عبداللہ بن عمر البیضاوی	۶۸۵ھ
(۹۲)	صفۃ الفتوی والمفتی والمستفتی	ابوعبداللہ احمد بن حمدان الحرانی الحنبلی	۶۹۵ھ
(۹۳)	نھایۃ السوٴل شرح منھاج الوصول	عبدالرحیم بن الحسن بن علی الاسنوی الشافعی	۷۷۲ھ
(۹۴)	الأشباہ والنظائر	زین الدین بن ابراہیم بن محمد، ابن نجیم المصری	۷۹۰ھ
(۹۵)	التلویح علی التوضیح	سعدالدین مسعود بن عمر بن عبداللہ التفتازانی	۷۹۱ھ
(۹۶)	البحر المحیط	محمد بن بہادر بن عبداللہ، ابوعبداللہ، بدرالدین الزرکشی	۷۹۴ھ
(۹۷)	المنقول	حجۃ الاسلام ابوالحامد محمد بن محمد الغزالی	۵۰۵ھ
(۹۸)	المستصفی	حجۃ الاسلام ابوالحامد محمد بن محمد الغزالی	۵۰۵ھ
(۹۹)	روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین	ابوزکریا محی الدین یحیٰ بن شرف النووی	۶۷۶ھ
(۱۰۰)	کشف الأسرار عن اصول فخر الاسلام البزدوی	عبدالعزیز بن احمد بن محمد علاء الدین البخاری	۷۳۰ھ
(۱۰۱)	شرح المنہاج	محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم، جلال الدین المحلی	۸۶۴ھ
(۱۰۲)	التقریر والتحریر فی شرح کتاب التحریر	ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن محمد بن محمد المعروف با بن امیر الحاج	۸۷۹ھ
(۱۰۳)	الأشباہ والنظائر	جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن سابق الدین الخضیری السیوطی	۹۱۱ھ
(۱۰۴)	الموافقات فی اُصول الشریعۃ	ابراہیم بن موسی بن محمد اللخمی الغرناطی الشاطبی المالکی	۹۷۰ھ
(۱۰۵)	شرح الکوکب المنیر المسمی بمختصر التحریر او المختصر المبتکر شرح المختصر	محمد بن احمد بن عبدالعزیز الفتوحی الحنبلی المعروف با بن نجار	۹۷۲ھ
(۱۰۶)	تیسیر التحریر علی کتاب التحریر فی اصول الفقہ	محمد امین المعروف با میر بادشاہ	۹۷۲ھ

نمبر	کتاب	مصنف	سن
(۱۰۷)	غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر	احمد بن محمد الحموی	۱۰۵۶
(۱۰۸)	حاشیۃ القلیوبی و	احمد بن احمد بن سلامہ قلیوبی	۱۰۶۹ھ
	عمیرۃ علی شرح المنہاج	احمد شہاب الدین برلسی عمیرہ	۹۵۷ھ
(۱۰۹)	مسلم الثبوت	محبّ اللہ بن عبد الشکور البہاری	۱۱۱۹ھ
(۱۱۰)	شرح مسلم الثبوت	محبّ اللہ بن عبد الشکور البہاری	۱۱۱۹ھ
(۱۱۱)	نور الانوار فی شرح المنار	احمد بن ابی سعید ملا جیون الحنفی	۱۱۳۰ھ
(۱۱۲)	عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، احمد بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور، ابو عبد العزیز	۱۱۷۶ھ
(۱۱۳)	فواتح الرحموت مع مسلم الثبوت	عبد العلیم محمد بن نظام الدین محمد الانصاری	۱۲۲۵ھ
(۱۱۴)	حاشیۃ جمع الجوامع	حسن بن محمد، عطار	۱۲۵۰ھ
(۱۱۵)	عقود رسم المفتی	علامہ محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الشامی	۱۲۵۲ھ
(۱۱۶)	ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول	محمد بن علی الشوکانی	۱۲۵۵ھ
(۱۱۷)	التوضیح فی شرح التنقیح	عبید اللہ بن مسعود المحبوبی	
(۱۱۸)	مطالب أولی النہی فی شرح غایۃ المنتہی وتجرید الزوائد الغایۃ والشرح	مصطفیٰ السیوطی الرحیبانی، حسن الشطی	۱۲۴۳ھ
(۱۱۹)	نزہۃ الخاطر العاطر شرح کتاب روضۃ الناظر وجنۃ المناظر لابن قدامۃ	علامہ عبد القادر بدران القدومی الدمشقی الحنبلی	۱۳۴۶ھ
(۱۲۰)	تھذیب الفروق والقواعد السنیۃ فی الاسرار الفقہیۃ	محمد بن علی بن حسن مفتی المالکیۃ	۱۳۶۷ھ
(۱۲۱)	اصول الفقہ	الشیخ محمد احمد مصطفیٰ احمد المعروف بابی زہرہ	۱۳۹۴ھ
(۱۲۲)	اصول الافتاء وآدابہ	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	مدظلہ

تصوف

نمبر	کتاب	مصنف	سن
(۱۲۳)	بستان العارفین	فقیہ ابو اللیث سمرقندی، نصر بن محمد بن ابراہیم السمرقندی الحنفی	۳۷۳ھ
(۱۲۴)	الرسالۃ القشیریۃ	شیخ ابی القاسم عبد الکریم القشیریؒ	۴۶۵ھ
(۱۲۵)	احیاء علوم الدین	حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالیؒ	۵۰۵ھ
(۱۲۶)	عوارف المعارف	شیخ عبد القادر السہر وردیؒ	۶۳۲ھ
(۱۲۷)	نتائج الافکار القدسیۃ فی بیان معانی شرح الرسالۃ القشیریۃ	شیخ الاسلام زکریا بن محمد الانصاریؒ	۹۲۶ھ
(۱۲۸)	خلاصہ تسہیل قصد السبیل	مولانا اشرف علی التھانوی	۱۲۸۰ھ
(۱۲۹)	تسہیل قصد السبیل	مولانا اشرف علی التھانوی	۱۲۸۰ھ
(۱۳۰)	تسہیل الوصول	مولانا اشرف علی التھانوی	۱۲۸۰ھ

(۱۳۱) التشرف — مولانا اشرف علی التھانوی — ۱۲۸۰ھ
(۱۳۲) تعلیم الدین — مولانا اشرف علی التھانوی — ۱۲۸۰ھ
(۱۳۳) روح تصوف — مولانا اشرف علی التھانوی — ۱۲۸۰ھ
(۱۳۴) قصد السبیل — مولانا اشرف علی التھانوی — ۱۲۸۰ھ

رجال وتاریخ

(۱۳۵) طبقات ابن سعد — ابوعبداللہ محمد بن سعد بن منیع الھاشمی البصری البغدادی — ۲۳۰ھ
(۱۳۶) الفہرست لابن ندیم — ابوالفرج محمد بن اسحٰق بن ابی یعقوب الندیم — ۳۸۵ھ
(۱۳۷) تاریخ بغداد — احمد بن علی بن ثابت، ابوبکر، الخطیب البغدادی — ۴۶۳ھ
(۱۳۸) کتاب الفقیہ والمتفقہ — ابوبکر احمد ابن علی الخطیب البغدادی — ۴۶۳ھ
(۱۳۹) مناقب ابوحنیفہ — الموفق بن احمد بن محمد بن سعید البکری المکی الحنفی الخوارزمی — ۷۱۰ھ
(۱۴۰) الاکمال فی اسماء الرجال — محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی — ۷۲۰ھ
(۱۴۱) سیر اعلام النبلاء — محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز، ابوعبداللہ، شمس الدین الذہبی — ۷۴۸ھ
(۱۴۲) مقدمہ ابن خلدون — عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون الحضری — ۸۰۸ھ
(۱۴۳) تقریب التہذیب — ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد الکنانی العسقلانی — ۸۵۲ھ
(۱۴۴) کتاب المیزان — ابوالمواھب عبدالوھاب بن احمد بن علی الانصاری الدمشقی المصری الشعرانی — ۹۷۳ھ
(۱۴۵) الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان — شہاب الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن علی بن حجر الھیتمی السعدی الانصاری — ۹۷۳ھ
(۱۴۶) الفوائد البھیۃ — مولانا عبدالحی فرنگی محلی — ۱۳۰۴ھ
(۱۴۷) التراتیب الاِداریۃ — عبدالحیٔ بن عبدالکبیر الکتانی — ۱۳۸۲ھ
(۱۴۸) تاریخ التشریع الاسلامی — محمد خضری بک — ۱۹۲۷ء
(۱۴۹) تاریخ التشریع الاسلامی — عبداللطیف محمد السبکی — ۱۹۶۹ء
(۱۵۰) تاریخ دارالعلوم دیوبند — سید محبوب رضوی — ۱۳۹۹ھ

لغت

(۱۵۱) الصحاح — ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری — ۳۹۳ھ
(۱۵۲) لسان العرب — علامہ ابن الفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور الافریقی المصری — ۷۱۱ھ
(۱۵۳) القاموس المحیط — مجد الدین ابوطاہر محمد بن محمد بن عمر الشیرازی الفیروزآبادی — ۸۱۷ھ
(۱۵۴) تاج العروس فی شرح القاموس — محمد بن محمد بن محمد بن عبدالرزاق الحسینی الزبیدی، ابوالفیض — ۱۲۰۵ھ